اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور
فون: 042-37652546, 37668958
www.alquraish.com email: info@alquraish.com

پیش لفظ

''دل کی دہلیز پہ'' آپ ایک عرصے تک ڈائجسٹ میں سلسلہ وار پڑھتے رہے ہیں جسے میری قاری بہنوں نے بے حد پذیرائی اور پسندیدگی سے نوازا تھا۔ ڈائجسٹ میں ہر ماہ شائع ہونے والے آپ کے خطوط میرے لئے اعزاز ہیں۔ میں اپنی ان تمام بہنوں کی شکرگزار ہوں جن کی خواہش اور فرمائش پر ''دہلیز کی دہلیز پہ'' مکمل ناول کی شکل میں حاضر ہے۔

امید ہے کہ میری یہ کاوش میرے قابل احترام قارئین کو پسند آئے گی۔

آخر میں القریش پبلی کیشنز کی مشکور ہوں کہ میری اس کاوش کو آپ تک پہنچانے کا اعزاز بخشا۔

اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

ڈُور مغرب کی اور قرمزی پہاڑیوں کی اوٹ میں سورج غروب ہونے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنیں وجاہت منزل کی اونچی دیواروں کو الوداعی بوسہ دیتی رخصت ہو رہی تھیں۔ نیلگوں آکاش پر پھیلے زرد نارنجی رنگ شفق کی سرخی میں مدغم ہوتے جا رہے تھے۔

شام کے سرمئی سائے آہستہ روی سے چہار سُو پھیلتے جا رہے تھے۔ وجاہت منزل کے در و دیوار پر اُترتی آج کی شام اپنے ساتھ ایک افسردگی اور بے کلی کا احساس بھی لے کے آئی تھی۔ عمارت کے چہار اطراف پھیلے کشادہ احاطے میں دبے پاؤں چلتی ہوا کے سبک اور نرم جھونکوں میں ایک مایوسی و اُداسی کی کیفیت رچی ہوئی تھی۔ پورا ماحول ایک کرب انگیز اضطراب میں ڈوبا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

وجاہت منزل کے مکینوں میں سے آج کوئی بھی شام کے استقبال کے لئے اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا حتیٰ کہ عاتکہ بیگم بھی سنگِ مرمر کے ٹیرس پر دھری بید کی کرسیوں میں سے اپنی مخصوص کرسی پر آ کر بیٹھی تھیں۔ وہ آج خلافِ معمول اب تک اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر موجود تھیں۔

نیم وا دریچوں سے شام کے سرمئی سایوں نے کمرے میں داخل ہو کر ہر سُو ملگجا سا اندھیرا پھیلا دیا تھا مگر عاتکہ بیگم ماحول سے بے نیاز گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے اپنی ہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں بیٹھی تھیں۔

وجاہت مرزا اور اسد میاں کے درمیان ثروت جہاں کے حوالے سے جب سے اختلاف پیدا ہوا تھا، گھر میں ایک عجیب چپقلش اور تناؤ کی فضا قائم ہو گئی تھی۔ اسد میاں، ثروت جہاں کو شریکِ حیات بنانے کے خواہاں تھے مگر وجاہت مرزا کسی بھی قیمت پر اپنی سالی ندرت جہاں کی بیٹی ثروت کو اپنی بہو بنانے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان کے انکار اور تجاہل نے اسد میاں کو ایک مخمصے اور غصے میں مبتلا کر دیا تھا۔ گو کہ وہ باپ سے گستاخی یا ان کی حکم عدولی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے مگر ان کی ضد نے اسد میاں کے اندر ایک ہٹ دھرمی سی پیدا کر دی تھی۔

''اماں بی! آپ ابا جان کو سمجھایئے پلیز۔'' یہ جملہ اسد اپنی دادی عاتکہ بیگم کو بیسیوں بار کہہ چکے تھے۔ مگر عاتکہ بیگم ہر بار محض سر ہلا کر رہ جاتی تھیں، پر بیٹے یعنی وجاہت مرزا سے کچھ نہیں کہہ پاتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ خود ثروت کے حق میں نہیں تھیں۔ لیکن وہ جانتی تھیں کہ اسد اپنے باپ وجاہت مرزا کی طرح ہی ضدی اور خودسر ہیں، آخر کار اپنی بات منوا کر دم لیں گے۔

برسوں پہلے جب وجاہت مرزا نے سطوت جہاں سے شادی کا ارادہ کیا تھا تو خود عاتکہ بیگم نے اس شادی کی پُر زور مخالفت کی تھی، مگر وجاہت مرزا نے عزیز از جان ماں کی مخالفت، ناپسندیدگی اور ناخوشی کو نظر انداز کر کے سطوت جہاں سے شادی کر لی تھی۔ اس پس منظر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہیں یقین تھا کہ اسد میاں بھی آخر کار اپنی من مانی ہی کریں گے۔ انکار اور اختلاف کر کے اپنی بات کھونے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

عاتکہ بیگم، بیٹے سے بھی خوب واقف تھیں۔ جانتی تھیں کہ انہیں بھی کچھ سمجھانا بے سود ہی ہوگا۔ اس کے باوجود انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ آج وجاہت مرزا سے ضرور بات کریں گی۔

شام کے گہرے ہوتے ہوئے سایوں نے وجاہت مرزا کے دل میں ایک عجب سا اضطراب بھر دیا تھا۔ وہ بے کل و مضطرب سے کمرے سے نکل کر بالکونی میں آ کھڑے ہوئے تھے اور ان کی افسردہ نگاہیں کوٹھی کے احاطے میں پھیلی ویرانی سے اُلجھنے لگی تھیں۔ سورج کے ساتھ نیم دائرے میں پھیلی زمین پر دُھول اُڑ رہی تھی۔ کبھی اس بے آب و گیاہ بنجر زمین پر سرسبز و شاداب گھاس کا مخملیں فرش بچھا تھا اور چہار دیواری کے ساتھ ساتھ دُور تک سرو کے بلند و بالا پیڑ سبزے کا لبادہ اوڑھے چوکنا دربانوں کی طرح کھڑے رہتے تھے۔ لان میں جابجا کیاریوں میں ترتیب کے ساتھ انواع و اقسام کے پھول مسکراتے نظر آتے تھے۔ ہوا کے نٹ کھٹ اور شریر جھونکے جب پودوں میں سے سرسراتے ہوئے گزرتے تو نوخیز کلیاں شرما کر جھک جاتیں اور نوشگفتہ غنچے کھلکھلا کر ہنس پڑتے تھے۔ سامنے والے لان کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت تالاب تھا جو موتی جیسے شفاف پانی سے لبریز رہتا تھا۔ تالاب کے دونوں کناروں پر سفید مرمر کے لمبی گردن اور لمبی ٹانگوں والے سارس پنکھ پھیلائے اُڑنے کو تیار نظر آتے۔ شفاف پانی میں ڈوبی ان کی زرد ٹانگوں کے اطراف سبز پتوں کے حصار میں گھرے کنول کے کاسنی پھول ہلکورے لیتے رہتے۔ تالاب کے بیچوں بیچ سنگِ سفید سے بنا دیدہ زیب فوارہ کسی بگلے کی طرح گردن اونچی کئے کھڑا تھا۔ فوارے سے موتی کی سی شفاف اُبلتی دھاریں ایک تواتر اور تسلسل سے تالاب میں گرتیں اور سطحِ آب پر بنتا بگڑتا تموج ایک دلفریب منظر پیش کرتا۔

وجاہت مرزا کو رات کی رانی کی خوشبو بے حد بھاتی تھی۔ سو اُن کی خواب گاہ کے پچھلے دریچوں کے نیچے دیوار کے ساتھ ساتھ دُور تک رات کی رانی کی کیاریاں تھیں اور رات بھیگنے کے ساتھ ہی چہار سُو رات کی رانی کی مدھر اور رُوح پرور مہکار کے ڈیرے سے لگ جاتے تھے۔ سرِ شام ہی عاتکہ بیگم لان میں بچھی نفیس دیدہ زیب آرام دہ کرسیوں میں سے اپنی پسندیدہ کرسی پر آ کر بیٹھتی تھیں۔

''رام پرشاد! وجاہت میاں کو اطلاع کر دو، ہم لان میں آ گئے ہیں۔''

لان کے پودوں کی کتر بیونت میں مصروف مالی، رام پرشاد کو مخاطب کر کے وہ حسبِ معمول سنجیدہ اور باوقار لہجے میں حکم صادر فرماتیں۔

''بہتر بیگم صاحبہ!'' کہتے ہوئے بوڑھا مالی اپنا کام چھوڑ کر فوری طور پر ان کے حکم کی بجا آوری کے لئے وجاہت مرزا کے کمرے کی طرف روانہ ہو جاتا۔ اور چند ہی لمحوں بعد وجاہت مرزا اپنی تمام تر وجاہتوں سمیت مسکراتے ہوئے ماں کے مقابل آ بیٹھتے۔ ان کے پہنچتے ہی شانتی، چائے کی ٹرالی دھکیلتی آ موجود ہوتی۔

چائنہ کٹ نازک و نفیس پیالیوں میں کینیا کے باغات سے حاصل شدہ اعلیٰ ترین خوشبودار چائے اور شانتی کے ہنر مند ہاتھوں سے تیار کردہ لذیذ اور خوش ذائقہ لوازمات نوش جاں کرتے وہ دونوں ہلکی پھلکی خوشگوار باتوں میں مصروف رہتے۔

اکثر وجاہت مرزا اپنے کاروباری معاملات اور واقعات ماں کے گوش گزار کرتے۔ عاتکہ بیگم نہایت توجہ اور انہماک سے ان کی باتیں سنتیں اور اگر ضرورت ہوتی تو مشوروں سے بھی نوازتی جاتیں۔

جب سے وجاہت مرزا کے والد، وراثت مرزا کا انتقال ہوا تھا، جائیداد اور کاروبار کی تمام تر ذمے داری اکلوتے بیٹے ہونے کے ناطے وجاہت مرزا کے کاندھوں پر آ گئی تھی۔ انہوں نے تمام معاملات نہایت خوش اسلوبی اور خوش سلیقگی سے سنبھال لئے تھے۔ چائے کے ساتھ بات چیت کا یہ سلسلہ مغرب کی اذان تک جاری رہتا تھا۔

قریبی مسجد سے مغرب کی اذان بلند ہوتے ہی وہ دونوں اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ ادائیگی نماز کے لئے عاتکہ بیگم اپنے کمرے کی طرف اور وجاہت مرزا مسجد کی جانب روانہ ہو جاتے تھے۔ ان دنوں زندگی کس قدر شاداں اور فرحاں تھی۔ کسی سبک رفتار ندی کی مانند میٹھے سُر الاپتی، اپنی ہی دُھن میں آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی کہ یکایک زندگی کی اس پُرسکون ندی میں ایک طغیانی سی جاگی تھی، ایک طلاطم سا بیدار ہوا تھا اور دیکھتے دیکھتے اس ہنستے بستے گھر کی ساری خوشیاں، ساری راحتیں اس طوفانِ بلاخیز کی نذر ہوگئی تھیں۔

''وجاہت منزل'' کے مکینوں کی زندگی سے بہاریں رُوٹھ گئی تھیں۔ کوٹھی کے اطراف پھیلے وسیع و کشادہ باغیوں میں خزاں نے ڈیرے ڈال لئے تھے۔ فوارے سے اُچھلتی شفاف موتیوں کی دھاریں ساکت ہوگئی تھیں۔ تالاب کی نیلگوں سطح پر تیرتے کاسنی کنول مرجھا گئے تھے اور فضائے بسیط کی طرف پرواز کے لئے ہمہ وقت تیار پنکھ پسارے سفید براق بگلوں پر کائی جم گئی تھی۔

دیواروں کے ساتھ ساتھ سر اُونچا کئے کھڑے سرو کے سبزے کو خزاں چاٹ گئی تھی۔ وجاہت مرزا کی خواب گاہ کے دریچوں تلے رات کی رانی کی کیاریاں اُجڑ گئی تھیں۔ ہر طرف ویرانی اور وحشت کا راج تھا۔ یہ سب کچھ چشم زدن میں نہیں ہو گیا تھا۔ ویرانی و وحشت نے برسوں تک و دو کی تھی، تب جا کر اس گھر کے در و دیوار پر تسلط جمانے میں کامیاب ہوئی تھی۔ جب تک رام پرشاد کے قویٰ نے اجازت دی، اس نے اپنے خونِ جگر سے سینچے باغیچوں کو خزاں کی دسترس سے محفوظ رکھنے کی حتیٰ الوسع کوشش کی۔ مگر اس کے مرنے کے بعد تو گویا ہر شجر و حجر، ہر برگ و بار پر، ہر شاخ و تنے پر خزاں اپنی تمام تر وحشتوں اور ویرانیوں سمیت مسلط ہوگئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے احاطے میں حدِ نگاہ تک پھیلے باغیچے تو کیا ''وجاہت منزل'' اور اس کے مکینوں کی زندگیاں بھی خزاں رسیدہ اور ویران ہوگئی تھیں۔ اس خزاں رسیدہ اور برباد زندگی کا آغاز شاید اسی شام سے ہو گیا تھا، جب پہلی بار وجاہت مرزا نے سطوت جہاں کو دیکھا تھا۔ سطوت جہاں، وجاہت مرزا کے دیرینہ دوست وقاص بیگ کی پھوپھی زاد تھیں۔ اس شام وقاص بیگ ان سے ملنے آئے تو باتوں باتوں میں انہوں نے اپنی پھوپھی کی شدید علالت کا بھی ذکر کیا۔

''اوہ! ان کی بیماری کا سُن کر افسوس ہوا۔'' وجاہت مرزا نے بیماری کا ذکر سن کر ازراہِ دستور پُر تاسف لہجے میں کہا۔ ''انہیں کیا بیماری ہے؟''

''دیکھا جائے تو انہیں کوئی بیماری نہیں ہے۔'' وقاص بیگ نے بغیر کسی پس و پیش کے اصل مسئلے کی نشان دہی کرتے ہوئے سادگی سے کہا۔ ''اصل میں وہ اپنی دو عدد جوان بیٹیوں کی وجہ سے سخت پریشان اور متفکر ہیں۔ لڑکیوں کی شادی کی فکر میں گھل گھل کر وہ لبِ گور جا پہنچی ہیں۔ ایک طرح سے تو ڈاکٹرز نے جواب ہی دے دیا ہے۔''

''اوہ..... ویری سیڈ۔'' یہ سب باتیں سن کر، ایک بے بس ماں کی مجبوری کا احساس کر کے واقعتاً وجاہت مرزا کو افسوس ہوا تھا۔ ''تو کیا ان لڑکیوں کے لئے خاندان میں رشتے نہیں ہیں؟'' انہوں نے سنجیدہ نظروں سے وقاص مرزا کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

اصل میں تو وہ یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ خود وقاص اب تک غیر شادی شدہ تھے۔ لہٰذا اپنی پھوپھی کو کم از کم ایک بیٹی کی فکر سے تو وہ بھی آزاد کر سکتے تھے۔ مگر وہ وقاص بیگ کی طرح بے جھجک ہو کر ہر بات کہہ دینے کے عادی نہ تھے۔ اسی لئے براہِ راست ان سے نہ کہہ سکے تھے بلکہ گول مول انداز میں سوال کیا تھا۔

''خاندان ہے ہی کتنا بڑا۔'' وقاص بیگ نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ ''ایک پھپھو جان، دوسرے ان کے اکلوتے بھائی یعنی میرے ابا جان۔ پاکستان میں بس یہی دو بہن بھائی اپنی فیملی کے ساتھ ہیں۔'' لمحہ بھر کو خاموش رہ کر

وقاص بیگ دوبارہ گویا ہوئے۔ ''اور جہاں تک خاندان میں لڑکوں کے ہونے کا تعلق ہے تو لے دے کر ایک میں ہی ہوں جو تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔'' وقاص بیگ بے دلی سے مسکرائے۔

''تو پھر تم...؟'' وجاہت مرزا نے اپنا سوال ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''اصل میں پھوپھی جان بالکل الگ مزاج اور فطرت کی مالک ہیں۔'' وقاص بیگ نے دھیمے لہجے میں وضاحت کی۔ ''پھوپھی جان کی والدہ سے کبھی بھی نہیں بنی۔ دونوں کے مابین ہمیشہ ہی ناچاقی، رنجش، دُوری اور خلیج حائل رہی۔

''اوہ اچھا۔'' وجاہت مرزا نے سٹپٹا کر سر ہلایا۔

''دراصل امی جان، پھوپھی جان سے زیادہ ندرت اور سطوت کے مزاج سے خائف ہیں۔'' وقاص بیگ نے دھیمے لہجے میں بات آگے بڑھائی۔ ''بظاہر تو لڑکیاں بہت اچھی ہیں۔ مگر ان دونوں کی عادت اور فطرت اپنی ماں پر گئی ہے بلکہ بقول امی جان، بیٹیاں ماں سے بھی دس ہاتھ آگے ہیں۔'' لحظہ بھر کو وقاص بیگ نے گہری سانس لی۔ ''اب تم خود ہی سوچو امی جان یہ بات کس طرح پسند کر سکتی ہیں کہ پھوپھی جان کی بیٹیوں میں سے کوئی ایک اُن کی بہو بنے۔ آنکھوں دیکھی مکھی بھلا کون نگلتا ہے؟'' وقاص بیگ ایک سادہ لوح اور صاف گو انسان تھے اور وجاہت مرزا سے ان کی دوستی کا کچھ اس طرح کا تعلق تھا کہ وہ نہایت بے فکری، بے تکلفی اور اعتماد کے ساتھ ان سے ہر بات کر لیا کرتے تھے۔

''پھر تو واقعی مسئلہ ہے۔'' وجاہت اس موضوع پر کسی بھی طرح کے تبصرے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے مگر وقاص کی ان پر ٹکی سوالیہ نظروں نے آخر انہیں جواب دینے پر مجبور کر ہی دیا تھا۔

''ایسی بات ہے...... اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔''

''بالکل۔'' وقاص بیگ تائید بھرے انداز میں سر ہلاتے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''ارے کہاں چل دیئے؟'' انہیں اُٹھتے دیکھ کر وجاہت مرزا نے حیرت سے کہا۔ ''ابھی تو تم آئے ہو۔ کچھ دیر تو بیٹھو۔''

''مجھے پھوپھی جان کی عیادت کے لئے ہاسپٹل جانا ہے۔'' وقاص بیگ نے وال کلاک کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ ''اور آج میری گاڑی بھی ورک شاپ گئی ہوئی ہے۔ کچھ ٹیکسی وغیرہ بھی تلاش کرنی پڑے گی۔ اس لئے سوچ رہا ہوں ذرا جلدی نکل جاؤں۔''

وجاہت مرزا بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ''چار تو بج ہی چکے ہیں۔ اب میں بھی نکلتا ہوں۔'' وہ کال بیل پر اُنگلی رکھتے ہوئے سرسری لہجے میں بولے۔ ''راستے میں تمہیں بھی ڈراپ کر دوں گا۔ اب تم کہاں ٹیکسیاں ڈھونڈتے پھرو گے؟''

تب ہی بیل کی آواز سن کر چپڑاسی، چراغ کے جن کی طرح آ موجود ہوا تھا۔

''جی صاب!''

''خیر دین! یہ فائلیں اور بیگ گاڑی میں رکھو۔'' وجاہت مرزا نے چپڑاسی کو کام بتایا اور میز کے پیچھے سے نکل آئے۔

''یار! یہ ٹیکسی لینا ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' وقاص بیگ جلدی سے بولا۔ ''میں آرام سے چلا جاؤں گا۔ اب تم کہاں بلاوجہ پریشان ہو گے؟''

''ارے بھلا اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟'' وجاہت مرزا نے دوستانہ مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ''اس بہانے لگے ہاتھوں میں تمہاری پھوپھی جان کی عیادت بھی کر لوں گا۔''

وقاص بیگ کی ماں اور پھوپھی کے درمیان کتنے ہی اختلافات کیوں نہ تھے، پھر بھی وقاص سے ان کا رشتہ تو بہر حال تھا۔ اور اس رشتے کے ناطے، وجاہت مرزا کا اخلاقی فرض بنتا تھا کہ وہ اپنے بچپن کے دوست کی قریبی عزیزہ کی

عیادت کو جائیں۔

''اگر تمہاری یہی خوشی ہے تو چلو یونہی سہی۔'' وقاص بیگ نے ہتھیار ڈالتے ہوئے جواب دیا اور وجاہت مرزا کے ساتھ دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ وہ دونوں لفٹ سے نکل کر جونہی عمارت کے ٹیرس پر پہنچے، انہیں دیکھتے ہی ڈرائیور گاڑی ٹیرس کی سیڑھیوں کے پاس لے آیا تھا۔ وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔

''سیون ڈے ہاسپٹل چلنا ہے۔'' وجاہت مرزا نے ڈرائیور کو ہدایت دی اور اس نے سر تسلیم خم کرتے کرتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی آخر کار گاڑی ہاسپٹل کے بڑے سے آہنی گیٹ کے سامنے آ رکی تھی۔ وقاص بیگ کے ساتھ وجاہت مرزا بھی گاڑی سے باہر آ گئے تھے اور دونوں ساتھ ساتھ چلتے عمارت کی پچھلی جانب واقع زینے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ زینہ چڑھ کر وہ دونوں جونہی کوریڈور میں داخل ہوئے، سامنے ایک لڑکی تیزی سے لپکتی ہوئی آئی تھی اور زینے کی طرف مڑتے ہوئے بدحواسی میں وجاہت مرزا سے بری طرح ٹکرا گئی تھی۔

انہوں نے بے ساختگی میں اسے بازوؤں سے تھام کر گرنے سے بچایا تھا۔ اس سے پہلے کہ لڑکی ان سے کچھ کہتی، وقاص بیگ لڑکی کی طرف دیکھ کر حیرانی سے بولے۔

''ندرت! کیا ہوا؟...... خیریت تو ہے؟''

''اوہ..... وقاص بھائی...... آپ......؟'' ندرت نے گھبرائے ہوئے انداز میں وقاص بیگ کی طرف دیکھا۔

''تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟'' اس کی گھبراہٹ دیکھ کر خود وقاص بیگ بھی بوکھلا گئے تھے۔ ''پھپھو جان تو ٹھیک ہیں نا؟''

''اچانک امی جان کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ میں ڈاکٹر کو بلانے ہی جا رہی تھی۔'' ندرت جہاں نے ہراساں لہجے میں بتایا۔

''اچھا تو تم ایسا کرو کہ وجاہت کو لے کر کمرے میں پھوپھی جان کے پاس جاؤ۔ میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔'' وقاص بیگ جلدی سے بولے۔

''جی اچھا۔'' ندرت نے تائید بھرے انداز میں سر ہلا کر گردن گھما کر وجاہت مرزا کی طرف دیکھا۔ اونچے لمبے، گورے چٹے، باوقار اور شاندار شخصیت کے مالک، سنجیدہ سے وجاہت مرزا پہلی ہی نظر میں اسے اچھے لگے تھے۔

''آیئے!'' اس نے سامنے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے دھیمی آواز میں ان سے چلنے کے لئے کہا اور وہ آہستگی سے اس کی تقلید میں چل دیئے تھے۔ اس ورانڈے نما پیسج کے اختتام پر داہنی جانب ایک لمبا کوریڈور تھا جس کی دونوں جانب دروازے تھے، جن پر مختلف نمبر آویزاں تھے۔ ندرت جہاں انہیں ساتھ لئے کوریڈور کے آخری سرے پر واقع کمرے کے سامنے آ ٹھہری تھی۔ لحظہ بھر کو رک کر اس نے پلٹ کر ان کی جانب دیکھا تھا، پھر آہستگی سے دروازہ دھکیلتی اندر داخل ہو گئی تھی۔ سامنے ہی صاف ستھرے بستر پر حشمت جہاں، آنکھیں بند کئے لیٹی تھیں۔ ان کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ سپید چہرے پر بھونچال کے سے آثار تھے۔ وہ بار بار منہ کھولتیں، گہری سانس لینے کی کوشش کرتیں اور بے تابانہ منہ بند کر لیتیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے سانس سینے میں سما ہی نہیں رہی۔ ندرت کے ساتھ وہ بھی بوکھلائے ہوئے آگے بڑھے تھے، تب ہی ان کی نگاہ حشمت جہاں کے سرہانے کھڑی سطوت جہاں پر ٹھہری تھی۔ ماں کی بگڑتی حالت دیکھ کر وہ حیرانی و پریشانی کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ اس کی گھنی پلکوں سے سجی ہوئی بڑی بڑی سیاہ خمار آلود آنکھوں میں ٹھہرا ایک بے نام سا خوف کسی ہراساں غزال کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ گھنے سیاہ بالوں کے حصار میں صبیح چہرہ، کالی گھٹاؤں کے بیچ دمکتے چاند کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس کے تراشیدہ شنگرفی لب دھیرے دھیرے لرز رہے تھے اور وہ اپنی نازک صندلی انگلیوں

سے ماں کے کندھے تھامے انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وجاہت مرزا کی نظریں سطوت کے حسین چہرے پر پڑیں تو گویا واپس پلٹنا ہی بھول گئی تھیں۔ پہلی ہی نگاہ میں وہ نگاہوں کی راہ سے ان کے دل میں اُترتی چلی گئی تھی۔ انہیں اپنی طرف اس طرح دیکھتے دیکھ کر سطوت کی دمکتی پیشانی پر سلوٹیں سمٹ آئی تھیں۔ تب ہی وقاص بیگ ڈاکٹر کو لئے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی وجاہت مرزا جیسے ہوش میں آ گئے تھے۔

ڈاکٹر کی چند لمحوں کی کوششوں اور دو انجکشنوں کے بعد حشمت جہاں کی طبیعت سنبھل گئی تھی اور وہ پُرسکون انداز میں گہری نیند سو گئی تھی۔ وقاص بیگ ندرت اور سطوت کو تسلی دلاسہ دے کر اور کل آنے کا وعدہ کر کے واپسی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بادل نخواستہ وجاہت مرزا کو بھی ان کے ساتھ اٹھنا پڑا تھا۔ ورنہ دل تھا کہ اس حُسنِ بے مثال کے سامنے سے ہٹنے کے لئے آمادہ ہی نہ تھا۔ وہ تو واپس لوٹ آئے تھے مگر ان کا دل وہیں رہ گیا تھا۔

''کیا بات ہے وجاہت؟ کچھ فکر مند سے لگ رہے ہو؟'' کھانے کی میز پر اُنہیں گم صم سا دیکھ کر عاتکہ بیگم نے سوال کیا تھا اور وہ ٹپٹا کو آئیں، بائیں شائیں کرنے لگے تھے۔

کھانے کے بعد وہ فوراً ہی اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ وہ اکیلے بیٹھ کر اس دلکش چہرے اور دلکش سراپے کے بارے میں سوچنا چاہتے تھے۔ تمام رات وہ بستر پر کروٹیں بدلتے رہے اور اسی کے بارے میں سوچتے رہے۔ اگلی شام وہ خود ہی وقاص بیگ کے پاس پہنچ گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تازہ پھولوں کا بڑا سا گلدستہ دیکھ کر وقاص حیران ہوئے۔

''کہاں کا قصد ہے؟''

''تمہارے ساتھ، تمہاری پھوپھی جان کو دیکھنے ہاسپٹل..... اور کہاں؟'' انہوں نے غیر محسوس طور پر وقاص سے نظریں چراتے ہوئے سرسری انداز میں جواب دیا۔

''ارے میں تو بھول ہی گیا۔'' وقاص ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وقاص کی معیت میں وہ حشمت جہاں کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ آج ان کی طبیعت پہلے کی نسبت خاصی ٹھیک تھی۔ وہ تکیوں کے سہارے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ ان کی جانب کھڑی ندرت ان کے سر میں تیل ڈال رہی تھی۔ وقاص کے ساتھ وجاہت مرزا کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مسرت کے دیپ سے جل اُٹھے تھے۔ وقاص کے ساتھ انہوں نے بھی سلام کیا تھا۔

''جیتے رہیے۔'' حشمت جہاں نے ہاتھ اُٹھا کر دعا دی۔

''وقاص میاں! کل تو تم خوب وقت پر پہنچے۔'' حشمت جہاں کے کرخت لہجے میں تشکر کی ہلکی سی آمیزش تھی۔ ''ہم تو سمجھے تھے بھائی کے بعد...... بھائی کی اولاد سے بھی ناطہ ختم۔''

''پھوپھی جان! ایسا کیوں سوچتی ہیں؟'' وقاص نرم لہجے میں گویا ہوئے۔ ''آپ تو جانتی ہیں، ایک آدھ دن کے وقفے سے میں تقریباً روز ہی آتا ہوں۔''

''ہاں میاں! احسان ہے تمہارا۔'' انہوں نے سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے اور چھنگلیا سے ہونٹ کے گوشے صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' وجاہت مرزا، گلدستہ لئے آگے بڑھے۔ حشمت جہاں نے سوالیہ نظروں سے وقاص بیگ کی طرف دیکھا۔

''یہ میرے بہت قریبی دوست ہیں، وجاہت مرزا۔ وجاہت انڈسٹریز کے مالک۔'' وقاص نے جلدی سے تعارف کروایا۔

''اچھا اچھا۔'' حشمت جہاں نے نگاہ گھما کر وجاہت مرزا کی طرف دیکھا۔

''بیٹھو بیٹا!'' اب کے ان کے لہجے میں کسی قدر شیرینی تھی۔ وجاہت مرزا کی شاندار شخصیت نے انہیں متاثر کیا تھا اور یہ جان کر کہ وہ وجاہت انڈسٹریز کے مالک ہیں، ان کی نگاہوں میں وجاہت مرزا کی قدر و قیمت اور بڑھ گئی تھی۔

وجاہت مرزا نے بیڈ کے قریب دھری کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے کمرے میں چاروں طرف ایک سرسری سی نگاہ ڈالی تھی۔ مگر وہ دشمنِ جان، کہ جس کی ایک جھلک دیکھنے کی خاطر وہ آج کھنچے چلے آئے تھے، کمرے میں موجود نہ تھی۔ ایک بے نام سی مایوسی نے ان کے دل کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔ تب ہی دروازے کو دھکیلتی سطوت جہاں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا جس میں دوائیاں تھیں۔ وہ غالباً اسٹور سے دوائیں لے کر لوٹی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کی نگاہ وجاہت مرزا پر ہی پڑی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی ان کی منتظر نگاہیں دروازے کی طرف اُٹھ گئی تھیں اور جب سطوت نے ان کی طرف دیکھا، وہ اس وقت اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بے ساختہ ان کی نگاہیں اس کی نگاہوں سے ٹکرا گئی تھیں اور نگاہوں کے اس تصادم سے دونوں ہی طرف ایک سی کیفیت جاگی۔ سطوت کا دل بے ساختہ دھڑک اٹھا تھا اور انہیں اپنی دھڑکنوں میں ایک نئی سی جھنکار سنائی دی تھی۔ اور ٹھیک اسی لمحے انہوں نے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور اگلی شام جب انہوں نے وقاص بیگ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تھا تو وہ حیران رہ گئے تھے۔ کئی لمحوں تک ساکت رہنے کے بعد وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوئے۔

''وجاہت! تمہارے اس فیصلے سے مجھے یقیناً خوشی ہوتی اگر میں تمہارا دوست نہ ہوتا۔'' دم بھر کو رُک کر، دم لے کر وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ''گو کہ دیکھا جائے تو سطوت میری سگی پھوپھی زاد ہے، اصولاً مجھے تم سے زیادہ اس کا خیر خواہ ہونا چاہئے۔ مگر سچا دوست ہونے کے ناطے مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ تمہارا فیصلہ کبھی پچھتاوا نہ بن جائے۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو وقاص!'' وجاہت مرزا نے حیران لہجے میں کہا۔ ''یہاں پچھتاوے کا کیا ذکر؟ میں تو سطوت سے شادی کی بات کر رہا ہوں۔''

''وجاہت! شادی گھڑی دو گھڑی کا کھیل نہیں۔'' وقاص بیگ نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''اس لئے یوں پلک جھپکتے میں شادی کا فیصلہ کر لینا کوئی دانش مندی نہیں ہے۔ جیون کے سفر میں کسی کو ہم سفر بنانے کے لئے شکل و صورت کے ساتھ سیرت اور مزاج و فطرت بھی بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔'' وقاص کی دھیمی آواز کچھ اور مدھم پڑ گئی۔ ''جبکہ میں تمہیں پہلے ہی ندرت اور سطوت کے مزاج کے بارے میں بتا چکا ہوں۔ اس کے باوجود تم......''

مگر وجاہت مرزا، ناصح کی کوئی بھی بات سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ سطوت جہاں کی سیاہ ساحر آنکھوں کا جادو اُن کے سر چڑھ کر بول رہا تھا اور وہ گھڑی کی چوتھائی میں ان آنکھوں کو اپنی ملکیت بنا لینا چاہتے تھے پر اس مقصد کے حصول کے لئے انہیں عاتکہ بیگم کی رضامندی اور حمایت کی ضرورت تھی۔ ندرت اور سطوت جہاں کی والدہ، حشمت جہاں کی طبیعت اب خاصی بہتر تھی اور وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر جا چکی تھیں۔ وہ ہسپتال میں تھیں تو وجاہت مرزا، وقاص کے ساتھ روز ہی ان کی عیادت کے بہانے سطوت کے دیدار کے لئے جا پہنچتے تھے۔ مگر اب حشمت جہاں ہسپتال سے گھر جا چکی تھیں۔ اور روز روز کسی کے گھر جانا ہسپتال جانے کی نسبت خاصا مشکل اور غیر اخلاقی سا عمل لگتا تھا اور وجاہت مرزا جیسے بااصول اور باوقار انسان کے لئے اس طرح کی کوئی اوچھی حرکت ناممکن تھی۔ چنانچہ روز روز سطوت کے گھر جانے کے بجائے انہوں نے اپنی والدہ سے اس کے بارے میں بات کر کے اسے ہمیشہ کے لئے اپنے گھر لے آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

''وقاص! اس سلسلے میں تم میری کوئی مدد کر سکتے ہو؟'' وہ ماں سے اس موضوع پر براہِ راست بات کرنے میں ہچکچا

اور اسی قدر شرمار ہے تھے۔

''اگر میں سطوت کی فطرت سے واقف نہ ہوتا تو ضرور تمہاری مدد کرتا۔'' وقاص بیگ نے اپنی فطری صاف گوئی سے جواب دیا۔ ''کل کو جب سطوت کا مزاج کھل کر سامنے آئے گا تو خالہ جان مجھ سے شکوہ کریں گی کہ وقاص! جانتے بوجھتے بھی تم نے مجھ سے اس کے لئے بات کی۔ تو جناب! میری طرف سے معذرت ہے۔ کنوئیں میں کودنے کا آپ کو شوق ہے تو شوق سے کود یئے۔ مگر مجھے اس معاملے سے دُور رکھئے۔''

''او کے..... میں خود امی جان سے بات کرلوں گا۔''

اور پھر اسی شام، شام کی چائے کے دوران وجاہت مرزا نے ہمت مجتمع کر کے ماں کو مخاطب کیا تھا۔ ''امی جان! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''کیا بات ہے وجیہی؟'' ان کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ عاتکہ بیگم نے چونک کر اپنے خوبرو اور نوجوان بیٹے کی طرف دیکھا تھا۔ ''تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں لگ رہے ہو؟''

''وہ..... امی جان!..... اصل میں .....'' وہ بری طرح نروس ہو گئے تھے، اُنہیں وقاص بیگ پر غصہ آرہا تھا۔ دوست ایسے ہی موقعوں پر تو کام آتے ہیں۔ ایک وہ تھے کہ دامن چھڑا کر الگ ہو بیٹھے تھے۔ انہیں کبھی کبھی وقاص کی باتوں پر حیرت ہوتی تھی کہ آخر وہ پھوپھی اور ان کی بیٹیوں کی اس قدر برائی اور مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ مانا کہ سطوت کے مزاج میں غصہ، ضد اور تیزی تھی.... تو اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ ان خامیوں کی وجہ سے اس کی دیگر خوبیوں کو نظرانداز کر دیا جاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے چاند چہرے اور ستارہ آنکھوں کے سامنے انہیں اس کی کوئی خامی اور برائی دکھائی ہی نہ دیتی تھی۔

''بولو وجیہی! کیا بات ہے؟'' عاتکہ بیگم اپنی کرسی سے اٹھ کر بیٹے کی پشت پر جا کھڑی ہوئی تھیں۔ پھر انہوں نے پیار بھرے لہجے میں ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے حوصلہ افزا لہجے میں کہا تھا۔ ''اگر تمہیں کچھ کہنا ہے تو تم اپنی ماں سے ہر بات بے جھجک کہہ سکتے ہو بیٹا!''

''وہ امی جان.....!'' وجاہت مرزا نے بے ساختہ اپنے کاندھے پر رکھے ماں کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ ''آپ بہت اچھی ہیں امی جان!''

''اچھا اب چاپلوسی چھوڑو اور اصل بات بتاؤ۔'' عاتکہ بیگم مسکراتے ہوئے بولیں اور وجاہت مرزا نے نگاہیں جھکا کر سطوت جہاں کے بارے میں اپنی پسندیدگی اور خواہش ان کے گوش گزار کر دی تھی۔ عاتکہ بیگم دوبارہ اپنی مخصوص کرسی پر آ بیٹھی تھیں۔ ان کے حسین اور باوقار چہرے پر سنجیدگی تھی اور وہ خاموشی سے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وجاہت مرزا کن اکھیوں سے ماں کے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور ان کا دل دھیرے دھیرے دھڑک رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' کئی لمحوں بعد ان کی سنجیدہ آواز اُبھری تھی۔ ''ہم کل ہی وقاص کی والدہ سے بات کرتے ہیں، پھر انہیں ساتھ لے کر حشمت جہاں کے گھر جا کر اپنی ہونے والی بہو کو دیکھ آئیں گے۔'' جملے کے اختتام کے ساتھ ہی ان کے لبوں پر مسرور مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

''اوہ امی جان!'' وجاہت مرزا خوشی سے اچھل پڑے تھے۔

اگلی صبح جب انہوں نے سطوت کے بارے میں وقاص کی والدہ سے بات کی تو لحظہ بھر کو وہ خاموش ہو گئی تھیں۔ مگر انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا اور عاتکہ بیگم کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انہیں اپنے ساتھ لے کر حشمت جہاں کے گھر گئی تھیں۔

سطوت جہاں، شکل و شباہت اور ناز و انداز میں ایسی تھیں کہ کوئی بھی دیکھتا تو انہیں پسند کیے بنا نہ رہ سکتا تھا۔ عاتکہ بیگم کو بھی سطوت شکل و صورت کے لحاظ سے تو پسند آئیں مگر ان کے گھر کی حالت، رکھ رکھاؤ، ماں بہن اور خود ان کی گفتگو کا انداز اور رہن سہن کا اطوار اُنہیں ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ گو کہ وقاص کی والدہ نے سطوت کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا مگر عاتکہ بیگم ایک پڑھی لکھی، جہاں دیدہ اور باشعور خاتون تھیں۔ وہ چند لمحوں میں ہی حقیقت بھانپ گئی تھیں اور گھر آتے ہی انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

''بے شک سطوت ایک حسین و دلکش لڑکی ہے۔ لیکن اس کے گھر اور ہمارے گھرانے کے رہن سہن اور رکھ رکھاؤ میں بے حد فرق ہے۔ مزاج اور اطوار کے لحاظ سے بھی وہ ہمارے ماحول سے مطابقت نہیں پیدا کر سکے گی۔ اس لئے بہتر ہے...... کہ سطوت کو ''وجاہت منزل'' کی بہو بنانے کا خیال، وجاہت مرزا اپنے دل و ذہن سے نکال دیں۔ ماں کے فیصلے نے وجاہت مرزا کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ وہ عشق کے اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں سے واپسی ممکن نہیں تھی۔ وقاص بیگ تو خیر اُنہیں روزِ اوّل سے ہی سمجھاتے چلے آ رہے تھے، بعد کو ان کی والدہ اور خود عاتکہ بیگم نے بھی انہیں ہر طرح سے سمجھانا چاہا تھا۔ مگر وہ تو کچھ سننے اور سمجھنے کو تیار ہی نہ تھے۔ وہ ہر قیمت اور ہر حال میں سطوت جہاں کو اپنی شریکِ زندگی بنانے کے متمنی تھے۔ عاتکہ بیگم کو اپنا اکلوتا بیٹا بے حد عزیز تھا۔ اس کی ہر خواہش کی تکمیل کو وہ اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ لیکن اُن کی اس تمنا اور خواہش کو پورا کرنے سے قاصر تھیں۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ان کی یہ وقتی خوشی عمر بھر کا روگ بن جائے گی۔ سطوت جیسی منہ پھٹ، بدزبان، بدلحاظ اور بے پرواو غیر ذمے دار لڑکیاں گھر بسانے کے بجائے گھر اُجاڑنے کا باعث بنتی ہیں اور انہیں پھولوں سے سجا اپنا یہ جنت نما گھر ''وجاہت منزل'' بے حد پیارا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وجاہت کی ہنستی مسکراتی زندگی میں زہر گھلے اور ان کی آج کی ضد کل پچھتاوا بن جائے اور وہ اس وقتی خوشی کو حاصل کر کے اپنی زندگی کی آنے والی تمام خوشیوں اور راحتوں سے محروم ہو جائیں اور ایک نہ ختم ہونے والے کرب ملال اور اذیت کے ساگر میں ڈوب جائیں۔ اور زندگی میں پہلی بار وجاہت مرزا کو ماں کے فیصلے سے اختلاف ہوا تھا اور انہوں نے ان کے اس فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

''وجیہی! میری جان! سمجھنے کی کوشش کرو۔'' عاتکہ بیگم سمجھا سمجھا کر ہار گئی تھیں مگر وجاہت مرزا کچھ سمجھنے کو تیار ہی نہ تھے۔ اکلوتے اور چہیتے بیٹے کی ضد کے سامنے آخر کار عاتکہ بیگم کو ہار ماننا ہی پڑی تھی اور وقاص بیگ کی والدہ کے ذریعے باقاعدہ رشتہ بھجوایا گیا تھا۔

❀===❀===❀
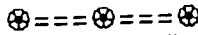
وہ مئی کی آخری تاریخوں کی ایک تپتی دوپہر تھی۔ سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ آگ برسا رہا تھا۔ تیز دھوپ میں ننگے پاؤں پھرتی ہواؤں میں بھی تپش اور تمازت کا احساس گھلا ہوا تھا۔ نرم ہوا کے تھپیڑے بھڑے ہوئے کواڑوں اور کھڑکیوں کے بند پٹوں سے سر ٹکراتے پھر رہے تھے، مبادا کوئی دریچہ کھلا ادھ کھلا مل جائے تو وہ گھڑی بھر کو سائے میں دم لے سکیں۔

تارکول کی سیاہ سڑک، دھوپ میں پگھلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دونوں سڑک پار کر کے رہائشی علاقے میں داخل ہو گئی تھیں۔ یہ ایک اعلیٰ متوسط طبقے کا رہائشی علاقہ تھا، کشادہ پختہ اسٹریٹ کے دونوں جانب 240 گز کے بنگلہ نما خوش وضع اور خوش نما گھر بنے ہوئے تھے۔ فریال اور نمو کتابوں سے بھرا بڑا سا بیگ کندھے پر سنبھالے بڑے سے دوپٹے کا بکل مارے گھروں کے سائے سائے تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ چلتے چلتے نمو نے پلٹ کر فریال کی طرف دیکھا تھا۔ فریال کے سر پر تنا مکلف سفید دوپٹہ پیشانی سے کچھ پیچھے کی جانب کھسک گیا تھا اور تیز دھوپ براہِ راست اس کے

چہرے پر پڑ رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت کے باعث اس سانولا چہرہ تمتمار ہا تھا اور اس کے رخساروں اور پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

''فری! دوپٹہ ماتھے پر ذرا آگے کی جانب کھینچ کر اس طرح شیڈ بنالو۔'' نمو نے اپنے چہرے پر جھکے دوپٹے کے چھجے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فریال کو مشورہ دیا اس طرح چہرہ دھوپ کی تپش سے بچ جائے گا۔

''جناب! بھلا دھوپ کی تپش ہم جیسے سانولے اور گندمی رنگ کے چہروں کا کیا بگاڑ سکتی ہے؟'' فریال نے حسبِ عادت شوخ لہجے میں جواب دیا۔ ''البتہ آپ کو اپنا صندلی و صبیح چہرہ اس تمازت سے بچا کر رکھنا چاہئے ورنہ آپ بھی ہماری طرح سانولی ہو جائیں گی۔''

''توبہ ہے فری! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔'' نمو جھینپ کر بولی اور اس نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر فریال کا دوپٹہ ماتھے سے ذرا آگے کھینچ دیا۔ اسے جز بز ہوتے دیکھ کر فریال جلدی سے بولی تھی۔

''میں مذاق کر رہی تھی۔ تم نے برا تو نہیں مانا؟''

''بھلا تمہاری کسی بات کا میں برا مان سکتی ہوں؟'' نمو نے فریال کی طرف دیکھتے ہوئے محبت بھرے انداز میں کہا اور فریال کے بھرے بھرے گداز لبوں پر ممنونیت بھری مسکراہٹ بکھر گئی۔

''آج واقعی دھوپ بہت زیادہ تیز ہے۔'' فریال نے بیگ کو کاندھے پر سیٹ کرتے ہوئے نیلے آکاش پر دہکتے آتشیں گولے کی طرف دیکھا۔ ''خیر، آخری دن ہے.....کل سے چین ہی چین ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' نمو نے بھی مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ''کل سے گرمیوں کی تعطیلات شروع ہونے والی ہیں۔''

سکول میں یہ ان دونوں کا آخری سال تھا۔ اگست میں سالانہ امتحان کے بعد وہ دونوں کالج میں داخلہ لینے کا خواب دیکھ رہی تھیں۔ پہلی کلاس سے لے کر دسویں جماعت تک وہ دونوں ایک ساتھ ایک ہی کلاس میں پڑھتی رہی تھیں۔ بچپن میں ایک ساتھ کھیل کر اتنی بڑی ہوئی تھیں۔ نوعمری کا وہ ساتھ اب گہری دوستی اور ذہنی ہم آہنگی کے مضبوط رشتے میں بندھ گیا تھا۔ اگلی گلی میں داخل ہوتے ہی فریال کارنر کے ایک دومنزلہ گھر کے سامنے ٹھہر گئی تھی۔ گھر کے کشادہ آہنی گیٹ کے داہنی جانب کے مرمر کے سرمئی پلر پر لگی نیم پلیٹ پر ''پروفیسر آفاق احمد'' کا نام جلی حروف میں کندہ تھا۔

''نمرہ!'' فریال نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں نمو کو مخاطب کیا۔ ''کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ کچھ دیر کے لئے تم اندر چلی چلو۔ دوپہر ڈھلتے ہی پاپا تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آئیں گے۔'' نمرہ نے ماتھے پر جھکے دوپٹے کی اوٹ سے آسمان پر چمکتے آگ برساتے سورج کی طرف دیکھا اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔

''سوری فری! تم تو جانتی ہو، شریفن خالہ انتظار کر رہی ہوں گی۔ ذرا سی بھی دیر ہو جائے تو وہ پریشان ہو جاتی ہیں۔''

''اچھا، ذرا دیر رُک کر پانی تو پی لو۔'' فریال نے ڈور بیل کے سوئچ پر انگلی رکھ کر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ گھر کے اندرونی حصے میں گھنٹی کی سریلی آواز گونجی تھی اور چند ہی لمحوں بعد گیٹ کے اس جانب تیز قدموں کی چاپ جاگی تھی اور اگلے ہی لمحے فریال کی بڑی بہن فریحہ نے گیٹ کھول کر مسکراتے چہرے کے ساتھ ان دونوں کی جانب دیکھا تھا۔

''آداب فریحہ آپی!'' نمو نے ہاتھ اٹھا کر مؤدب اور مہذب لہجے میں انہیں آداب پیش کیا۔

''جیتی رہو۔'' فریحہ نے شریر سے انداز میں بزرگوانہ لہجے میں دعا دی۔ فریال قدم بڑھا کر گیٹ سے اندر داخل ہو گئی تھی جبکہ نمو اسی طرح سے گیٹ سے باہر کھڑی تھی۔

''اندر آؤ نا۔ باہر کیوں کھڑی ہو؟'' فریحہ نے پیار بھرے انداز میں اصرار کیا۔

''بہت تیز دھوپ ہے۔ اب کھانا وانا کھا کر تم شام کو ہی گھر جانا۔''

''میں بھی تو یہی کہہ رہی تھی۔'' فریال پانی کی ٹھنڈی بوتل اور گلاس لئے دوبارہ نمودار ہوئی تھی۔ ''مگر یہ صاحبہ کسی کی بات مانیں تب نا۔''

''ہوں بولو......'' فریحہ نے سوالیہ نظروں سے نمو کی طرف دیکھا۔

''نہیں آپی! اس وقت نہیں۔'' نمو نے ملتجی لہجے میں کہا۔ ''اگر موقع ملا تو شام کو انو بھیا کے ساتھ دوبارہ آجاؤں گی۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوگا۔'' فریال نے کانچ کے نازک گلاس کو شفاف ٹھنڈے پانی سے لبریز کر کے اس کی جانب بڑھاتے ہوئے مسرور لہجے میں اس کی بات کی تائید کی۔ ''تم آجاؤ گی تو ہم مل کر آپی کی شادی کے جوڑے لگائیں گے۔''

جون کے اختتام پر فریحہ کی شادی طے تھی۔ آج کل گھر میں اس کی شادی کی تیاری زور و شور سے جاری تھی۔ نمو پانی پی کر اور شام کو آنے کا وعدہ کر کے آگے بڑھ گئی تھی۔ اب اس کی رفتار میں پہلے کی نسبت خاصی تیزی آگئی تھی۔ اکیلے ہونے کے احساس نے اسے قدرے بوکھلا سا دیا تھا۔ وہ تیز تیز قدم دھرتی کالونی کے آخری سرے پر پہنچ گئی تھی۔

بنگلہ نما صاف ستھرے پختہ اور کشادہ گھروں کی اس کالونی کے اختتام پر ایک مستطیل نما کشادہ میدان تھا۔ اور میدان کے اس پار 64 گز کے پلاٹوں والی، غریبوں کی ایک بستی آباد تھی۔ نمرہ اور انور کا باپ اکبر علی یونیورسٹی میں چپڑاسی تھا۔ اکبر علی کی ملازمت کا ایک بڑا حصہ پروفیسر آفاق احمد کے ساتھ گزرا تھا۔ آفاق احمد یونیورسٹی میں فزکس کے پروفیسر تھے۔ وہ ایک حلیم الطبع اور مخلص انسان تھے۔ ان کے دل میں انسانیت کا شدید جذبہ موجود تھا۔ وہ بنی نوع انسان کے لئے اخلاص اور اپنائیت کا احساس رکھتے تھے۔ گو کہ اکبر علی اور پروفیسر آفاق احمد کا رشتہ نوکر اور مالک کا سا تھا، مگر آفاق احمد نے کبھی اسے حقیر اور کمتر نہ سمجھا تھا بلکہ برسوں کے اس ساتھ نے ان کے دل میں اکبر علی کے لئے بھائیوں کی سی محبت پیدا کر دی تھی۔ خود اکبر علی، پروفیسر آفاق کی بے حد عزت کرتا تھا اور انہیں اپنا خیر خواہ اور محسن مانتا تھا کیونکہ کسی بھی اچھے برے وقت میں وہ ہمیشہ ہی اس کے کام آئے تھے۔

ان دنوں اکبر علی کی بیوی زلیخا پہلے بیٹے کی پیدائش کے برسوں کے بعد ایک بار پھر اُمید سے تھی۔ اس خوشی پر اکبر علی بہت خوش تھا، جبکہ زلیخا کسی قدر خجل اور پریشان سی تھی۔ ''بھلا بتاؤ۔'' وہ جز بز ہو کر کہتی۔ ''بیٹا جوان ہونے کو آیا، اب میں پھر سے ننھا سا بچہ گود میں کھلاتی کیسی لگوں گی بھلا؟ انو کیا سوچے گا؟...... سچی مجھے تو بہت شرم آتی ہے۔''

''پگلی! اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے؟'' اکبر علی، زلیخا کو سمجھاتا۔ ''یہ تو اللہ کی دین ہے۔ وہ جب چاہے، جسے نوازے۔ شرمندہ ہونے کے بجائے یہ تو شکر ادا کرنے کا مقام ہے۔ اور رہا سوال انو کا...... تو میں جانتا ہوں، اسے تو عرصے سے ننھے بھائی یا بہن کی آرزو رہی ہے۔ دیکھنا وہ یہ خبر سن کر کس قدر خوش ہوگا۔'' اکبر علی کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ اس کے سولہ سالہ بیٹے انور علی عرف انو کو جب آنے والے نئے مہمان کے بارے میں پتہ چلا تھا تو وہ خوشی سے نہال ہو اُٹھا تھا۔

''پیارے اللہ میاں! مجھے ایک پیاری سی بہن دینا۔'' اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دل کی گہرائیوں سے دعا کی تھی اور شاید وہ لمحہ شرفِ قبولیت کا تھا، اُس کی دعا قبول ہوگئی تھی اور چند ہی مہینوں بعد زلیخا نے ایک چاند سی بیٹی کو جنم دیا۔ انو نے ہی اس کا نام ''نمرہ علی'' رکھا تھا۔ گڑیا سی بہن پا کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اکبر علی بھی بیٹی کی پیدائش پر بے حد خوش تھا۔ اس نے اصلی گھی کے لڈو محلے میں بانٹے تھے اور ایک ڈبہ لئے پروفیسر آفاق احمد کے گھر پہنچا تھا۔

''اوہو...... تو تم بھی بیٹی کے باپ بن گئے۔'' پروفیسر آفاق پُرمسرت لہجے میں بولے۔ ''بھئی اکبر علی! تمہیں بہت بہت مبارک ہو۔''

''شکریہ سر!'' اکبر علی نے قدرے شرماتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔

''مگر یاد رکھو! بیٹے کی طرح تمہیں بیٹی کو بھی سکول میں داخل کروانا ہے۔ اور اسے بھی خوب پڑھانا ہے۔''

''جی بالکل۔'' اکبر علی نے تائید بھرے انداز میں سر ہلایا۔

یونیورسٹی کے ماحول میں اور پروفیسر آفاق احمد جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور قابل انسان کی صحبت میں رہ کر اکبر علی کو تعلیم کی اہمیت اور افادیت اور ضرورت کا خوب ادراک ہو گیا تھا۔ اسی لئے اس نے انو کو سکول میں داخل کروایا تھا۔ اور آج کل وہ دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔

پروفیسر آفاق احمد کی شریک حیات، ملیحہ بیگم ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، نیک طبع اور اچھی فطرت کی خاتون تھیں۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی بیٹی فریحہ چار سال کی تھی، جبکہ چھوٹی بیٹی فریال، اکبر علی کی بیٹی نمرہ کے آس پاس ہی پیدا ہوئی تھی۔ نمرہ کی پیدائش کے بعد سے زلیخا کی طبیعت بہت زیادہ خراب رہنے لگی تھی۔ پڑوس کی پرانی دایہ شریفن، زلیخا کی بچپن کی سہیلی بھی تھی۔ دونوں میں بہنوں جیسی محبت تھی۔ شریفن اپنے طور پر، اپنے تجربے کی بنا پر زلیخا کے علاج معالجے میں لگی ہوئی تھی۔ مگر مرض بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی کے مصداق زلیخا کی حالت سنبھلنے کے بجائے بگڑتی ہی جا رہی تھی۔

''شریفن! مجھے لگتا ہے اب میں نہیں بچوں گی۔'' ایک شام اس نے ننھی نمرہ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے شریفن سے کہا تھا۔ ''پر سوچتی ہوں کہ میرے بعد اس ننھی جان کا کیا بنے گا؟''

''تو بہ ہے زلیخا! کیسی باتیں کر رہی ہے؟'' شریفن نے جھڑکتے ہوئے کہا۔ ''اللہ سے اچھی امید رکھنی چاہئے۔ اس نے چاہا تو تُو جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ دیکھ میں آج ہی اکبر علی سے کہوں گی کہ تجھے کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر کو دکھا دے۔''

''پھر بھی..... اگر مجھے کچھ ہو گیا تو.....؟'' زلیخا نے مُصر لہجے میں سوالیہ نظروں سے شریفن کی طرف دیکھا۔

''نہیں ہوتا تجھے کچھ..... بے فکر رہ۔'' شریفن نے خفگی سے جواب دیا۔

''سن تو شریفن! اگر ایسا کچھ ہوا تو.....'' زلیخا نے اس کا ہاتھ تھام کر بھیگے لہجے میں سوال کیا تو شریفن نے چونک کر اس کے سنجیدہ اور ملول چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

''مجھے نمو کی بہت فکر ہے۔ اسے کون پالے گا؟''

''پالنے والا تو وہ اوپر ہے پگلی!'' شریفن نے زلیخا کا ہاتھ پیار بھرے انداز میں اپنے گداز ہاتھ میں لیتے ہوئے دلاسہ دیا۔ ''اوّل تو تجھے کچھ نہیں ہوگا، کچھ ہی دنوں میں تُو بھلی چنگی ہو جائے گی۔ اور اگر خدانہ کے ایسا کچھ ہوتا ہے تو تُو نمو کی فکر نہ کر..... کہتے ہی نا، ماں مرے موسی جیے۔ میں اسے اپنے سینے سے لگا کر اپنی اولاد کی طرح پالوں گی۔'' اور زلیخا کے متفکر چہرے پر مطمئن سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

اسی شام شریفن نے اکبر علی سے کہا تھا کہ وہ زلیخا کو کسی اچھے ہسپتال میں دکھا دے۔

''مجھے تو پتہ ہی نہیں کہ اچھا ہسپتال کون سا ہے؟'' اکبر علی نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ ''خیر میں کل صبح ہی پروفیسر صاحب سے مشورہ کر کے اسے کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔'' اکبر علی ہر بات کے لئے پروفیسر آفاق سے صلاح مشورہ ضروری سمجھتا تھا۔ اور وہ بھی اس کی ہر بات، ہر مسئلے کو بے حد توجہ اور انہماک سے سنتے اور بہترین مشورے سے نوازتے تھے۔ اور جہاں جہاں ان کی مدد کی ضرورت ہوتی، دل و جان سے اس کے کام آتے تھے۔

''بچی کی پیدائش کے بعد سے وہ آج تک پلنگ سے لگی ہوئی ہے۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' زلیخا کی بیماری کا حال سن کر پروفیسر آفاق نے تشویش بھرے لہجے میں خفگی سے کہا تھا اور اسی شام ان کی بیگم، ملیحہ بیگم، زلیخا کو اپنی گاڑی میں ایک بڑے ہسپتال میں ایک مشہور گائناکالوجسٹ کے پاس لے کر گئی تھی۔ مگر شاید کچھ دیر ہو گئی تھی، یا شاید زلیخا کا وقت ہی پورا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹرز کی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکی تھی اور بیس دن کی ننھی نمرہ کو چھوڑ کر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے

نے ملکِ عدم کو سدھار گئی تھی۔
ننھی سی بچی کے بن ماں ہو جانے پر ہر دل رحم سے بھر گیا تھا۔ نمو کی بدنصیبی پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔ اکبر علی اور انو کے غم میں سارے محلّہ دار برابر کے شریک تھے۔ خصوصاً شریفن کی تو رو رو کر آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اسے زلیخا بہن کی طرح عزیز تھی۔ اس دکھ کی گھڑی میں پروفیسر آفاق اور ان کی بیوی ملیحہ بیگم لحہ لحہ اکبر علی کے ساتھ تھے اور پل پل اس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ اب سب سے بڑا مسئلہ نمو کی پرورش کا تھا۔
گھر میں کوئی دوسری عورت موجود نہ تھی۔ اکبر علی کی طرح زلیخا بھی دنیا میں بالکل اکیلی تھی۔ قریب یا دور کا کوئی بھی اپنا نہ تھا۔ لے دے کر ایک شریفن کا دم تھا۔ شریفن ایک بیوہ عورت تھی، اولاد بھی کوئی نہ تھی۔ اپنی کفالت کے لئے اسے خود ہی محنت کرنا پڑتی تھی۔ وہ دائی گیری کے علاوہ رشتے ناطے لگانے کا کام بھی کرتی تھی۔ اسی صورت میں وہ نمرہ کی پرورش کے لئے پورا وقت نہیں دے سکتی تھی، اکبر علی کی نوکری تھی اور انو کا سکول۔ ایسے میں سوال یہ تھا کہ نمو کے کس کے پاس چھوڑا جائے؟
''اکبر علی!'' پروفیسر آفاق نے پُر خلوص لہجے میں پیشکش کی تھی۔ ''تم نمرہ کو ہمارے گھر چھوڑ جایا کرو۔ فریحہ کی والدہ، فریال کے ساتھ اسے بھی سنبھال لیں گی۔''
''شکریہ سر!'' اکبر علی نے ممنون لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ تو جانتے ہی ہیں میرا گھر ایک دور افتادہ بستی میں ہے۔ وہاں سے روز بچوں کو یہاں لے کر آنا اور شام کو واپس لے کر جانا شاید میرے لئے ممکن نہیں ہوگا۔''
''اس مسئلے کے دو حل ہیں۔'' اکبر علی کی تاویل سن کر پروفیسر آفاق نے مدبرانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔ ''ایک تو یہ کہ تم اپنی دور افتادہ بستی چھوڑ کر اس سامنے والے علاقے میں آ جاؤ۔'' انہوں نے ہاتھ سے سامنے میدان کے اس پار آباد ہونے والی نئی بستی کی طرف اشارہ کیا۔ سستا اور صاف ستھرا علاقہ ہے، وہاں سے یہ کالونی زیادہ دور نہیں ہے، پیدل ہی آسانی سے آیا جایا جا سکتا ہے۔ اور دوسرا یہ ہے کہ تم نمرہ کو مستقل ہمارے گھر میں چھوڑ دو۔ جہاں فریحہ اور فریال پلیں گی، وہیں نمرہ بھی پل جائے گی۔''
پروفیسر صاحب کی دونوں باتیں قابلِ غور تھیں۔ اس نے فوری طور پر سوچ لیا تھا کہ گھر جا کر شریفن اور انو سے مشورہ کر کے کسی حتمی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کرے گا۔
شریفن کو گھر بدلنے کی تجویز پسند آئی تھی۔ وہ خود ہی اس نئی بستی میں گھر خریدنے کے بارے میں غور کر رہی تھی، سو اس نے اکبر علی کو بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ بھی اس بستی میں گھر لے لے۔ جب تک انو سکول میں رہے گا، وہ نمو کو سنبھال لے گی۔ اکبر علی دوسری تجویز پر غور کر رہا تھا۔ زلیخا کی بیماری اور بچی کی پیدائش پر ساری جمع پونجی برابر ہو گئی تھی۔ اور جو کچھ بچا تھا وہ زلیخا کے کفن دفن میں لگ گیا تھا۔ آج کل موت بھی کچھ ایسی سستی نہ ہے۔ سو اب اتنی جلدی وہ گھر تبدیل کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ اس نے غور و خوض اور سوچ بچار کے بعد یہی فیصلہ کیا تھا کہ نمو کو پروفیسر صاحب کے گھر پر مستقل ہی چھوڑ دیا جائے۔ مگر جب انو کو باپ کے اس فیصلے کی خبر ہوئی تو وہ تڑپ اٹھا تھا۔
''کیا بات کر رہے ہو ابا.....؟ ہماری نمو کسی اور کے گھر میں لاوارثوں کی طرح پلے گی؟''
''تُو جانتا ہے، پروفیسر صاحب اور ان کی بیگم کتنے اچھے لوگ ہیں۔ وہ ہماری نمو کو ہم سے بھی زیادہ پیار سے پالیں گے۔''
''کچھ بھی کہو ابا!'' انو نے ننھی نمو کو گود میں اٹھا کر سینے میں چھپا لیا تھا۔ ''ماں کو کھو کر میں نے اس بہن کو پایا ہے۔ میں اسے خود سے ہرگز جدا نہ ہونے دوں گا۔''

''مگر انو! تو ذرا سوچ لے۔'' اکبر علی نے اسے سمجھاتے ہوئے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ ''گھر میں اسے آخر کون پالے گا؟''

''اسے میں پالوں گا ابا!'' انو نے سینہ ٹھونک کر مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''میں سکول چھوڑ دوں گا۔ پورے وقت گھر میں رہوں گا اور اس کی دیکھ بھال کروں گا۔''

''نہیں انو! تیرا میٹرک کا آخری سال ہے۔'' اکبر علی نے جلدی سے کہا۔ ''کم از کم میٹرک تو کر لے۔ سکول چھوڑ دے گا تو پڑھے گا کیسے؟''

''سکول چھوڑ کر بھی پڑھا جا سکتا ہے ابا!'' انو نے مدبرانہ انداز میں سر ہلایا۔ ''اب امتحان میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ میں خود ہیڈ ماسٹر صاحب سے بات کر لوں گا۔ اور جب امتحان ہوں گے، جا کر امتحان دے دوں گا۔''

''تجھے اپنی پڑھائی کا حرج کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' شریفن جانے کب سے دروازے میں کھڑی ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی، اندر داخل ہوتے ہوئے پُر یقین لہجے میں بولی۔ ''تُو جب سکول میں ہوگا، تب میں نمو کو دیکھ لوں گی۔ ویسے بھی مرنے والی نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ اس کے بعد اس کی اس ننھی جان کا میں خیال رکھوں گی۔'' بات ختم کرتے کرتے شریفن آبدیدہ ہو گئی تھی۔

زندگی ایک نئی ڈگر پر چل نکلی تھی اکبر علی کام پر اور انو جب سکول چلا جاتا تو شریفن، نمو کے پاس آ جاتی تھی۔ اسی طرح کئی ماہ گزر گئے تھے۔ اس دن انو ذرا جلدی گھر آ گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ نمو کمرے میں اکیلی لیٹی زار و قطار رو رہی ہے اور شریفن گھر میں موجود نہیں تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر روتی ہوئی نمو کو اُٹھا کر سینے سے لگا لیا تھا۔ اس کا محبت بھرا لمس پا کر نمو چپ ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد ہانپتی کانپتی شریفن گھر میں داخل ہوئی تھی، پتہ چلا کہ نمو سو گئی تو وہ کسی عورت کے گھر کام سے چلی گئی تھی، پیچھے نمو نے جاگ کر رونا شروع کر دیا تھا۔ انو کو احساس ہوا تھا کہ نمو کی دیکھ بھال کی وجہ سے شریفن خالہ کے کام کا حرج ہو رہا تھا، اس کا کوئی کمانے والا نہ تھا۔ وہ گھر کا کام کر کے اور کچھ رشتے وغیرہ کروا کر اپنا گزارہ کرتی تھی۔ اب نمو کی وجہ سے اس کا آدھا دن تو یہیں گزر جاتا تھا، اس وجہ سے وہ آج کل خاصی مالی بحران کا شکار ہو رہی تھی۔

اگلے دن سے انو نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ صبح باپ کے ساتھ سکول جانے کے لئے گھر سے نکلتا اور اکبر علی کے بس میں سوار ہونے کے بعد اسٹاپ سے واپس گھر آ جایا کرتا تھا۔

''انو بیٹا! اس طرح روز سکول سے ناغہ کرے گا تو..... تو تُو فیل ہو جائے گا چاند!'' ایک دن شریفن خالہ نے پُر تشویش لہجے میں کہا تھا۔

''نہیں خالہ! میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب سے بات کر لی ہے۔'' انو نے پُر یقین لہجے میں جواب دیا۔ ''انہوں نے مجھے امتحان کی اجازت دے دی ہے۔ میں خود سے گھر میں پڑھ کر امتحان دے دوں گا۔ اور اِن شاء اللہ ضرور پاس ہو جاؤں گا۔''

انو کے جواب پر شریفن خاموش ہو گئی تھی۔ وہ بھی کیا کرتی؟ اس کا لاکھ دل چاہتا تھا کہ نمو کو لحظہ بھر کو بھی خود سے دور نہ کرے مگر وہ اپنی ضرورت سے مجبور تھی۔ جسم و روح کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے اسے کام کرنا پڑتا تھا۔ اس کا گھر بھی خاصے فاصلے پر تھا۔ اگر گھر ہی قریب ہوتا تو شاید وہ انو کو کبھی سکول سے ناغہ کرنے کی اجازت نہ دیتی۔

وقت گزرتا رہا۔

امتحان ہو گئے۔ رزلٹ بھی آ گیا۔

انو تین پرچوں میں فیل ہو گیا تھا، مگر اسے فیل ہونے کا ملال نہیں تھا۔ وہ اپنی چہیتی بہن کے لئے بڑی سے بڑی

قربانی دے سکتا تھا۔ اکبر علی کو انو کی مجبوری کا اندازہ تھا، سو بغیر کسی سرزنش کے اس نے خاموشی سے انو کے سپلیمنٹری امتحان کے لئے فیس بھر دی تھی۔ پر اس بار بھی انو صرف ایک ہی پرچہ پاس کر سکا۔ دو پیپرز پھر بھی رہ گئے تھے۔

''آئندہ سال اِن شاءاللہ یہ دو پرچے بھی نکل جائیں گے۔'' اکبر علی نے پُر امید لہجے میں کہا اور انو نے اثبات میں سر ہلا کر ننھی نمو کو گود میں اٹھا لیا تھا۔

اب نمو دو سال کی ہو گئی تھی۔

''اکبر علی! ایک بات کہوں؟'' کئی دنوں تک غور کرنے کے بعد ایک شام شریفن نے اکبر علی کو مخاطب کر کے پُرسوچ لہجے میں کہا تھا۔ ''زلیخا کو گئے دو سال بیت گئے۔ تمہاری تنہائی اور بچوں کا اکیلا پن دیکھ کر دل کٹتا ہے..... اگر تم چاہو تو میں اس گھر کی ویرانی دور کر سکتی ہوں۔''

''وہ کیسے؟'' اکبر علی نے حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم جانتے تو ہو، میں رشتے کروانے کا کام کرتی ہوں۔'' شریفن نے قدرے ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں بات آگے بڑھائی۔ ''اگر تم کہو تو تمہارے لئے کوئی رشتہ دیکھوں؟...... ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟''

''ارے نہیں شریفن آپا!'' اکبر علی نے جھینپ کر جواب دیا۔ ''جوان بیٹے کے ہوتے ہوئے میں شادی کرتا کیا اچھا لگوں گا؟ سال دو سال میں اِن شاءاللہ تم انو کے لئے کوئی رشتہ دیکھنا۔''

اکبر علی کا جواب سن کر شریفن خاموش ہو گئی تھی۔ اس کے بعد بھی شریفن نے کئی بار یہ تذکرہ چھیڑا تھا مگر اکبر علی کا جواب ہمیشہ ہی انکار میں ملتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے رفتہ رفتہ یہ بات کہنی ہی چھوڑ دی تھی۔

''لو، چائے پی لو۔'' شریفن نے بھاپ اُڑاتی چائے کا مگ اکبر علی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''شکریہ آپا!'' اکبر علی تشکر بھرے لہجے میں بولا۔ ''اس وقت چائے کی سخت طلب ہو رہی تھی۔''

''مجھے معلوم تھا۔'' شریفن فخریہ انداز میں مسکرائی۔ ''آخر کو تمہاری بہن ہوں۔''

''سچ شریفن آپا! میری سگی بہن بھی ہوتی تو شاید اتنا ساتھ نہ دیتی۔'' اکبر علی کا لہجہ بے ساختہ بھیگ گیا تھا۔ ''جتنا ساتھ تم نے میرا اور میرے بچوں کا دیا ہے۔''

چائے ختم کر کے اکبر علی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ''اب کہاں چل دیئے؟'' شریفن نے حیرانی سے سوال کیا۔

''میں نے تمہیں بتایا تو تھا۔'' اکبر علی نے جواب دیا۔ ''پروفیسر صاحب کی اکلوتی بہن ارجمند بیگم، شادی کے آٹھ سال بعد اپنے دونوں بیٹوں اور میاں کے ساتھ پہلی بار انگلستان سے وطن واپس آ رہی ہیں۔''

''اچھا؟'' شریفن نے آنکھیں پھیلائیں۔

''ہاں، اسی سلسلے میں پروفیسر صاحب کو کچھ شاپنگ وغیرہ کرنی ہے۔ انہی کے ساتھ جانا ہے۔'' اکبر علی پاؤں میں سلیپر پھنساتا دروازے کی طرف بڑھا۔

''روز تو وہ یونیورسٹی سے واپسی میں ہی خریداری کر لیتے تھے۔'' شریفن نے یاد دلایا۔

''ہاں، مگر آج دوپہر میں گرمی بہت تھی، اس لئے سوچا کہ شام کو ٹھنڈے وقت بازار کی طرف نکلا جائے۔''

''اکبر علی، الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتا گھر سے باہر نکل گیا۔

پروفیسر آفاق احمد کی اکلوتی چھوٹی بہن، ارجمند بانو شادی کے فوراً بعد اپنے شوہر عالم تاب احمد کے ساتھ انگلستان میں جا بسی تھیں۔ ان کے دونوں بیٹے ظفر اور اظفر وہیں پیدا ہوئے تھے۔ اب پورے آٹھ سال بعد وہ اپنے بیٹوں اور میاں کے ساتھ بھائی بھابی سے ملنے وطن واپس آ رہی تھیں۔ آفاق احمد کے گھر میں ہفتوں سے آنے والے مہمانوں کے

استقبال اور خاطر مدارات کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

''پروفیسر صاحب اکبر یونیورسٹی سے واپسی میں بازار کا چکر لگانا نہ بھولتے تھے، ایسے میں عموماً اکبرعلی سامان وغیرہ اٹھانے میں مدد کے لئے ان کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ اس دوپہر بھی ان کا ارادہ بازار جانے کا تھا، مگر گرمی اور تپش کے باعث انہوں نے یہ کام شام تک کے لئے ملتوی کر دیا تھا۔

''سر! میں پانچ بجے آپ کے گھر پہنچ جاؤں گا۔'' اکبرعلی نے پُریقین لہجے میں کہا۔

''ارے نہیں بھئی! تم گھر جا کر بلاوجہ واپس آنے کی تکلیف اٹھاؤ گے۔'' پروفیسر آفاق جلدی سے بولے تھے۔ کچھ پولٹری اور بیکری کا سامان ہی تو لینا ہے۔ میں خود ہی جا کر لے آؤں گا۔''

پروفیسر صاحب کے منع کرنے کے باوجود اکبرعلی سرِشام ان کے گھر پہنچ گیا تھا۔ وہ اسے ساتھ لئے قریبی مارکیٹ کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ بیکری کا سامان خریدنے کے لئے اندر جانے لگے تو پروفیسر آفاق نے اکبرعلی کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

''بھئی اکبرعلی! میں جب تک یہاں خریداری کر رہا ہوں، تم ذرا لپک کر سامنے سے مرغی اور انڈے خرید لاؤ۔''

''جی بہتر۔'' اکبرعلی نے سعادت مندی سے سر ہلا کر جواب دیا اور ان کے ہاتھ سے روپے لے کر روڈ کراس کر کے سامنے کی جانب چل دیا تھا۔ ابھی بیچ روڈ پر ہی پہنچا تھا کہ سامنے سے آتی ایک تیز رفتار گاڑی چشم زدن میں اس سے آ ٹکرائی تھی اور وہ اُچھل کر فٹ پاتھ پر جا گرا تھا اور سنگی ٹائلڈ فٹ پاتھ سے ٹکرا کر اس کا سر خربوزے کی طرح چٹخ گیا تھا۔

❀===❀===❀

''ارے بھائی عبدالرشید! یہ میڈیا کی ترقی کا دور ہے۔'' اسٹاک بروکر لاکھانی نے ہاتھ کے پنجے کو ڈرامائی انداز میں گھما کر کہا۔ ''ڈرامے، سیریز، ٹیلی فلمز اور سوپ کا دور ہے۔ بس ایک سوپ کے لئے فائنانس کرو.....اور خود مالا مال ہو جاؤ۔''

''اچھا۔'' عبدالرشید کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ گو کہ وہ خود بھی ایک چالاک، عیار اور گھاگ انسان تھا، مگر اس وقت وہ کسی سادہ لوح کی طرح یونس لاکھانی کے ٹرانس میں آتا جا رہا تھا۔ ڈرامائی انداز میں کی جانے والی اس کی باتیں، رشید پر جادو کا سا اثر کر رہی تھیں۔

''سچ بولتا ہوں رشید بھائی!'' یونس لاکھانی سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنے سچے ہونے کا یقین دلاتے ہوئے پُرزور لہجے میں بولا۔ ''ہجاروں لگاؤ، لاکھوں کروڑوں کماؤ۔ اور وہ کیا کہتے ہیں، آم کے آم...... گٹھلیوں کے دام الگ۔'' اس نے معنی خیز انداز میں اپنی داہنی آنکھ کا گوشہ دبایا۔

''میڈیا انڈسٹری کی ساری پریاں.....اپسرائیں اور حسینائیں آپ کے آجو باجو، وہ الگ۔

''اچھا.....'' عبدالرشید کے شوق میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ''مگر لاکھانی بھائی! تم تو جانتے ہو، میں اس فیلڈ میں بالکل اناڑی ہوں۔''

''ارے بابا! یہ بات جانتائیں ہوتا تو میں تیرے پر اتنا ٹیم (ٹائم) کاہے کو لگاتا؟'' یونس لاکھانی پُرخلوص لہجے میں بولا۔ ''ایس آر پروڈکشن کے مالک مشہور ڈائریکٹر ایس رحمان کو میں کھوب جانتا ہوں۔ بس آج سام کو ہی ہم دونوں اس کے آفس جائیں گے اور پھر دیکھنا تُو کیسے رسید کنسٹرکسن (رشید کنسٹرکشن) کمپنی سے رسید فائنانسنگ کمپنی کا مالک بنتا ہے۔''

فائنانسنگ کمپنی کا مالک بننے سے زیادہ عبدالرشید کو فائنانس کئے جانے والے ڈرامہ سیریز اور سوپ میں کام کرنے

والی حسیناؤں میں دلچسپی تھی۔

''تو پھر ڈن؟''یونس لاکھانی نے عبدالرشید کو خیالوں میں گم دیکھ کر شام کے پروگرام کو کنفرم کرنے کے لئے سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا آگے کر کے پُر زور لہجے میں پوچھا۔

''ڈن۔''رشید نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

رشید کو باپ کے مرنے کے بعد وراثت میں خاصا مال و متاع ملا تھا۔اس کے باپ فرید کی کپڑے کی ایک چلتی ہوئی بڑی دکان تھی۔کئی دکانیں کرائے پر اُٹھی ہوئی تھیں۔دو منزلہ پختہ مکان تھا،اس کے علاوہ خاصا روپیہ کیش کی صورت میں بھی اس کے ہاتھ لگا تھا۔شروع ہی سے ماں کے بے جا لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا تھا۔باپ کی شدید خواہش کے باوجود پرائمری سے آگے نہ پڑھ سکا تھا۔باپ کبھی سختی کرنے کی کوشش کرتا تو اس کی ماں،سلطانہ درمیان میں آ جاتی۔

''کیا ہے جی۔تم تو ہر دم میرے بچے کے پیچھے ہی پڑے رہتے ہو۔''

''بیچ سے ہٹ جاؤ سلطانہ!''اس کا باپ فرید غصے سے کہتا۔''تم نے بلاوجہ اس کا پاٹ لے لے کر اسے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا ہے۔''

''کیسے باپ ہو؟......ایک ہی تو بچہ ہے۔وہ بھی تم سے نہیں دیکھا جاتا۔''سلطانہ ٹسوے بہانے لگتی۔

''سلطانہ!تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اس طرح بلاوجہ اس کا ساتھ دے کر اور اس کے کرتوتوں پر پردہ ڈال کر تم اس سے دشمنی کر رہی ہو۔اپنی اس بے وقوفی پر تمہیں ایک دن پچھتانا پڑے گا۔''

مگر اس وقت سلطانہ کی سمجھ میں بات نہیں آتی تھی۔کبھی رو دھو کر اور کبھی چیخ چلا کر یا لڑ جھگڑ کر وہ میاں کو چپ کروا دیتی تھی۔

وقت گزرتا رہا اور رشید عمر کی منزلیں طے کرتا جوانی کی وادی میں داخل ہو گیا۔اوباش قسم کے دوستوں کی صحبت نے اس کو دیکھتے ہی دیکھتے ہر برائی میں مبتلا کر دیا تھا مگر باپ کی زندگی میں وہ پھر بھی کسی قدر قابو میں تھا۔مگر اس کے مرتے ہی وہ بے نتھے بیل کی طرح آپے سے باہر ہو گیا تھا۔جوا،شراب اور شباب کے چکر میں پڑ کر باپ کی برسوں کی کمائی ہوئی دولت اس نے دنوں میں ٹھکانے لگا دی۔اب اس کی ماں سلطانہ کی آنکھیں کھلی تھیں۔اس کے بے جا لاڈ پیار نے اکلوتے بیٹے کو برباد کر کے رکھ دیا تھا۔اب وہ پچھتاتی تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟اب تو پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔

اس نے اپنے تئیں اسے راہِ راست پر لانے کی بہت کوشش کی،آخر تھک ہار کر اس نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔رشید کوڑی کوڑی کا محتاج ہوا تو دوستوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔یہ دور اس کی زندگی کا بڑا کٹھن دور تھا۔اس کو مختلف لتیں لگی ہوئی تھیں،جن کو پورا کرنے کے لئے پیسے کی ضرورت تھی،اور پیسے کی کوئی سبیل نہ تھی۔حالات سے مجبور ہو کر اس نے چھوٹی موٹی چوریاں شروع کر دی تھیں۔حوصلہ بڑھا تو پھر اسٹریٹ کرائم میں حصہ لینے لگا۔

وہ شام تیزی سے رات سے بغل گیر ہونے کے لئے آگے بڑھ رہی تھی۔شام کے سرمئی سائے رات کی سیاہیوں میں گم ہوتے جا رہے تھے۔رشید ایک گلی کے سرے پر کونے کے مکان کی دیوار سے لگا کھڑا تھا،ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول اس نے [illegible] پاٹ میں چھپایا ہوا تھا۔اسے کسی شکار کا انتظار تھا۔تب ہی ایک شخص دوسرے سرے سے گلی میں داخل ہوا تھا۔وہ جوں ہی اس سرے پر پہنچا،رشید اُچھل کر اس کے سامنے آیا اور جنگلی درندے کی طرح جھپٹ کر اس نے اس شخص کو ایک ہاتھ میں دبوچ لیا تھا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا پستول اس کی پسلیوں سے لگا دیا تھا۔

''اگر جان پیاری ہے تو تیرے پاس جو کچھ بھی ہے،خاموشی سے نکال دے۔''ہاتھ کے پنجے سے اس کا منہ دبوچتے ہوئے اس نے کانوں کے قریب منہ کر کے غرایا۔

''مم.....مم.....مم.....'' وہ شخص بے بسی سے مچلتا ہوا کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رشید نے تیزی سے دوسرا ہاتھ اس کے منہ سے ہٹا کر اس کی جیب کی طرف بڑھایا۔

''میرے پاس...... کچھ نہیں ہے۔'' منہ سے ہاتھ ہٹتے ہی وہ بلبلایا۔

''چپ۔'' رشید نے پستول کی نال اس کی پسلیوں میں چبھاتے ہوئے غرّا کر کہا۔ ''آواز نکالی تو گولی ٹھونک دوں گا۔''

وہ ایک دم سے خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی پھیلی ہوئی دہشت زدہ آنکھیں رشید پر جمی ہوئی تھیں۔ ابھی رشید نے اس کی جیب سے موبائل ہی نکالا تھا کہ سامنے سے ایک بائیک آتی دکھائی دی تھی۔ بائیک پر دو پولیس والے نظر آ رہے تھے۔ پولیس والوں کو دیکھتے ہی اس شخص میں جیسے پھرکی لگ گئی تھی۔ وہ گرفتار پرندے کی طرف پھڑ پھڑا کر بائیک کی طرف مڑا تھا اور اچانک ہی زور زور سے چیخنے لگا تھا۔

''بچاؤ..... بچاؤ..... یہ شخص مجھے لوٹ رہا ہے..... پولیس..... پولیس.....''

آہستہ روی سے چلتی ہوئی موٹر سائیکل ایک دم رُک گئی تھی۔

رشید پریشان ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے، کیا نہ کرے۔ اس نے کافی چوریاں چکاریاں کی تھیں مگر کسی کے خون سے اب تک ہاتھ نہیں رنگے تھے اور نہ ہی وہ یہ سنگین جرم کرنا چاہتا تھا۔ جانتا تھا کہ اگر کبھی چوری یا ڈاکہ زنی کرتے ہوئے دھر لیا گیا تو کچھ عرصے کی سزا اور معمولی جرمانے کے بعد چھوٹ جائے گا۔ مگر کسی کو قتل کرنے کی صورت میں پھانسی پر بھی لٹک سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے خود کو ہمیشہ ہی اس جرم سے دور رکھا تھا۔ اس وقت اس شخص کے دیوانوں کی طرح چیخنے پر ایک لمحہ کو تو اس کا دل چاہا تھا کہ کم بخت کو گولی مار کر ہمیشہ کے لئے اس کی کریہہ آواز بند کر دے۔ لیکن پولیس والوں کے سامنے کسی کو قتل کرنا، گویا خود کو براہِ راست پھانسی کے تختے پر پہنچا دینے کے مترادف تھا۔ چنانچہ اس نے شکار کو ایک طرف دھکیلا اور تیزی سے سامنے کی جانب دوڑ پڑا۔ اور جونہی وہ گلی کے دوسرے سرے پر پہنچا تو اس نے پولیس والوں کو اپنا منتظر پایا۔

❀===❀===❀
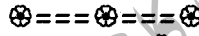
کسی نے زور سے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی تھی۔ سلطانہ نے چونک کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ ابھی ابھی کام نمٹا کر پلنگ پر آ کر لیٹی تھی، اسی لئے دروازے کی اس دستک نے اسے سخت بیزار کیا تھا۔ ابھی وہ اُٹھنے کا فیصلہ ہی کر رہی تھی کہ دوبارہ سے کنڈی بجی تھی۔

''کون کم بخت آ گیا۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی اُٹھی۔ اتنی دیر میں تیسری کنڈی کھٹکھٹائی گئی تھی۔ آنے والا سخت عجلت میں معلوم ہوتا تھا۔ وہ پیروں میں سلیپرز پھنساتی دروازے کی طرف بڑھی۔

''ارے بھئی کون ہے؟'' اس نے دور سے ہی ہانک لگائی۔

''ارے سلطانہ آپا! ذرا جلدی سے دروازہ کھولو۔ بڑی ضروری بات کرنی ہے۔'' باہر سے اسے اپنی پڑوسن قمر النساء کی آواز سنائی دی۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آئیں اور چہرے پر ناگواری کے آثار نمودار ہو گئے۔

قمر النساء اس کی گلی کے نکڑ والے گھر میں اپنے میاں وحید الدین اور اکلوتی بیٹی زیب النساء کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کا میاں وحید، فہیم وارثی نامی مشہور وکیل کے پرائیویٹ آفس میں چپڑاسی تھا۔ فہیم وارثی، وکالت کے سیاہ راستوں پر چل کر کالا دھن کمانے کے تمام ہی ہنر سے نہ صرف واقف تھا بلکہ ماہر تھا۔ خود بھی خوب حرام کمائی کرتا اور اپنے ساتھ کام کرنے والے تمام ہی لوگوں کی بھی خوب جیبیں بھرتا۔ یہی وجہ تھی کہ معمولی چپڑاسی ہونے کے باوجود وحید الدین کی مالی

پوزیشن خاصی ٹھیک ٹھاک تھی۔ شاید گلی میں سب سے اچھا مکان اُسی کا تھا۔ گھر میں آسائش کی تمام اشیاء بھی موجود تھیں۔ فریج، ٹی وی، وی سی آر، واشنگ مشین وغیرہ..... اس خوشحالی میں کچھ ریاض احمد سے حاصل کردہ ہرجانے کا بھی حصہ تھا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ تھی کہ بچپن سے ہی فلمیں ڈرامے دیکھ کر اور رومانی گانے سن سن کر وحیدالدین اور قمرن کی اکلوتی بیٹی زبین خود کو کوئی ہیروئن سمجھنے لگی تھی۔ ہر وقت خوب بنی ٹھنی رہتی، ناز و انداز سے بات کرتی اور خود کو ''زیبا'' کہلوانا پسند کرتی تھی۔ قمرن کے بے جا لاڈ پیار نے اسے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا تھا۔ کیونکہ ماں بھی خوب تیز طرار اور لڑاکا قسم کی تھی، تو یہ خوبیاں تو اُسے وراثت میں ملی ہی تھیں، باقی عشق، محبت اور آنکھ مٹکے کا شوق عشقیہ فلمیں دیکھ دیکھ کر اور رومانی نغمے سن کر ہو گیا تھا۔ سو محض 14 برس کی عمر میں وہ تھوک کے سبزی فروش ریاض احمد کے 30 سالہ بیٹے ایاز کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔

وحیدالدین روتا دھوتا اپنے مالک وکیل فہیم کے پاس پہنچا تھا۔ ساری داستان سن کر فہیم نے وحید کو دلاسا دیتے ہوئے کہا تھا۔

''وحید! تم فکر مت کرو۔ اس سبزی فروش کی اولاد کو یہ عشق بہت مہنگا پڑے گا۔ اس کا گلّہ خالی نہ کروا دیا تو میرا نام وکیل فہیم وارثی نہیں۔ مگر جو بھی ہرجانہ ملے گا، اس میں دونوں کا برابر حصہ ہوگا۔''

''ہرجانہ.....؟'' وحید نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پلکیں جھپکائیں۔ ''ہرجانہ ورجانہ کیا ہوتا ہے صاحب! مجھے تو میری زبین واپس دلوا دیں۔ وہ لفنگا اور غنڈہ ٹائپ گھاگ مرد ہے۔ وہ چند دن کھیل کر میری زبین کو آگے بیچ دے گا۔ بس صاحب! مجھے تو میری بیٹی چاہیئے۔''

''تم فکر مت کرو وحید! تمہیں تمہاری بیٹی بھی ملے گی اور کم از کم دو لاکھ روپے بھی۔ اس لفنگے ایاز کی تمام غنڈہ گردی نہ نکال دی تو کہنا۔''

مہینہ بھر بعد ہی زبین لٹ پٹ کر واپس آ گئی تھی۔ اب فہیم کا کام شروع ہوا۔ اس نے زبین اور ایاز کا جعلی نکاح نامہ بنوا کر اس کے نام نان نفقہ کا کیس، پھر طلاق کا کیس ٹھونک دیا اور چھ لاکھ حق مہر کا مطالبہ بھی۔ ایاز کے ساتھ اس کا آڑھتی باپ ریاض بھی پریشان ہو گیا۔ وہ دو کا چار بنانے والے، ہر دم 99 کے پھیر میں رہنے والے کاروباری، عدالت وکالت کیا جانتے؟ بری طرح گھبرا گئے۔ اور بڑی مشکلوں سے ہاتھ پیر جوڑ کر عدالت سے باہر معاملہ رفع دفع کرنے کی گزارش کرنے لگے۔ فہیم نے پورے چار لاکھ کے عوض یہ معاملہ رفع دفع کیا۔ جس میں سے وحید کے حصے میں پورے دو لاکھ روپے آئے۔

محلے میں یوں تو خوب تھو تھو ہوئی۔ پر سب ہی قمرن اور زبین کی بدزبانی اور لڑاکا فطرت سے واقف تھے اسی لئے منہ پر کچھ کہنے سے سب ہی ڈرتے تھے۔ خود وحید بھی ایک بدزبان اور بدمزاج آدمی تھا۔ سب ہی اپنی عزت سے ڈرتے تھے۔ کوئی بھی ان لوگوں کے منہ لگنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس حادثے کے رونما ہونے کے بعد کچھ عرصہ تو قمرن نے خوب زبان پر روک ٹوک رکھی مگر جلد ہی زبین پھر اپنی سابقہ روش پر لوٹ آئی۔ جب دیکھو چھت پر کھڑی ہے۔ کبھی دروازے سے جھانک رہی ہے، کبھی کھڑکی میں لٹکی ہے۔ گلی کے لڑکے اس کی سج دھج اور ادائیں دیکھ کر اس کی طرف راغب تو ہوتے مگر ساتھ ہی انہیں ایاز کا انجام یاد آتا، کان دبا کر بھاگ کھڑے ہوتے۔ ویسے بھی گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کے لئے کسی کے بھی دل میں اچھے تاثرات نہیں ہوتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو برس بیت گئے۔ اب قمرن کو زبین کے بیاہ کی فکر ستانے لگی۔ خاندان، کنبے اور آس پڑوس میں تو کوئی بھی زبین کے کرتوتوں کی وجہ سے اسے بیاہنے کے لئے تیار نہ تھا۔ انہی دنوں ماطانہ نے اپنا گھر بک جانے کے بعد اسی محلے میں گھر کرائے پر لیا تھا۔ رشید پر نگاہ پڑتے ہی قمرن کی رال ٹپکنے لگی

تھی۔ سلطانہ چونکہ اس محلے میں نئی تھی اس لئے وہ قمرن، وحید اور زبین کے اخلاق، کردار اور مزاج کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ اس لئے جب قمرن نے ''سلطانہ آپا، سلطانہ آپا'' کہہ کہہ کر اس کے آگے پیچھے پھرنا شروع کیا تو وہ بھی اس کے اخلاق اور محبت سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ مگر جلد ہی اسے پتہ چل گیا کہ ان سب کی نگاہ رشید پر ہے۔ اور معلوم کرنے پر جب اسے زبین کے کارناموں کا علم ہوا تو وہ ایک دم سے ہی قمرن سے اور اس کی محبت و دوستی سے بدک گئی تھی۔ مگر قمرن اور زبین ابھی پوری طرح رشید سے مایوس نہیں ہوئی تھیں اس لئے وقت بے وقت جھوٹی محبت کا مظاہرہ کرتی رہتی تھیں۔ گو کہ زبین کے خیالات بہت اونچے تھے، بے روزگار اور کنگال رشید اس کے معیار سے بہت نیچے تھا مگر اس کی ماں نے سمجھایا تھا کہ رشید دیکھنے میں چالاک اور تیز طرار لگتا ہے۔ ایک بار شادی ہو جائے تو تیرے ابا وکیل صاحب سے کہہ کر اسے کوئی نمبر دو کاروبار کروا دیں گے۔ پھر پانچوں اُنگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔ زبین کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی۔ شروع شروع میں اس نے سلطانہ کی خوب آؤ بھگت کی تھی۔ مگر اس کی طرف سے کوئی مثبت نتیجہ نکلتے نہ دیکھ کر اب اس نے براہِ راست رشید پر توجہ دینا شروع کر دی تھی۔ اس بات کا اندازہ ہوتے ہی سلطانہ چوکنا ہو گئی تھی، اور اپنے تئیں اُس نے اس گھرانے سے تعلقات تقریباً ختم ہی کر دیئے تھے۔ لیکن قمر اب بھی وقتاً فوقتاً آتی رہتی تھی، اور اس کی شکل دیکھتے ہی سلطانہ کے منہ کا ذائقہ خراب ہو جاتا تھا۔

''آئے ہائے قمرن! ایسی بھی کیا قیامت آ گئی؟ تم نے تو گھڑی بھر میں گھر سر پر اٹھا لیا۔'' سلطانہ نے بیزار لہجے میں کہتے ہوئے دروازہ کھولا تو سامنے قمرن ہونق چہرہ لئے کھڑی تھی۔

''اے سلطانہ آپا! تمہارے لئے بری خبر لائی ہوں۔ تمہارے رشید کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔'' قمرن نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بتایا۔

''اے کیا بکتی ہے؟'' سلطانہ بگڑ کر بولی۔ ''تیرے منہ میں خاک۔ جو منہ میں آیا، بکتی چلی جاتی ہے۔ جانتی بھی ہے کیا کہہ رہی ہے؟''

''اے سلطانہ آپا! قسم اللہ پاک کی...... تمہارے رشید کو پولیس لے گئی ہے۔ خود رشید نے زبین کے ابا کو فون کر کے بتایا اور کہا کہ میری ماں کو خبر کر دو اور کہو کہ وہ کسی وکیل کا انتظام کریں۔''

''ہائے اللہ!'' قمرن کا لہجہ گھونسے کی طرح سلطانہ کے کلیجے پر پڑا۔ اس نے بے تابانہ سینہ تھامتے ہوئے قمرن کی طرف دیکھا۔ ''تُو سچ کہہ رہی ہے قمرن؟''

''لو آپا! بھلا میں کوئی رشید کی یا تمہاری دشمن ہوں جو اس کے لئے ایسی غلط بات کہوں گی؟ تم تو جانتی ہو، میں نے تو ہمیشہ اسے اپنی زبین کی طرح ہی سمجھا ہے۔''

''ارے میرے مولا!...... میں کیا کروں؟'' سلطانہ نے قمرن کی بات کو نظر انداز کر کے سر تھام کر چارپائی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ہوئے دُہائی دی۔ ''بھلا وکیل جج میں کیا جانوں؟ کہاں جاؤں؟ کس سے کہوں؟'' رشید کے کرتوتوں کا اندازہ تو تھا مگر وہ اتنی جلدی پولیس کے ہتھے چڑھ جائے گا، اس بات کا اُسے یقین نہ تھا۔ اور اب اس وقت وہ خود کو بے حد بے بس اور تنہا محسوس کر رہی تھی۔

''ارے سلطانہ آپا! پریشان کیوں ہوتی ہو؟'' قمرن نے ہمدردانہ انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ دھرا۔ ''تم میرے ساتھ میرے گھر چل۔ تمہیں زبین کے ابا اپنے ساتھ اپنے وکیل صاحب کے پاس لے جائیں گے۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم اکیلی نہیں ہو۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔''

وحید الدین، سلطانہ کو اپنے ساتھ اپنے وکیل فہیم وارثی کے پاس لے گیا۔

''اچھا تو وہ اسٹریٹ کرائم کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔'' فہیم وارثی نے سب بات سن کر سلطانہ کی طرف تصدیق طلب نگاہوں سے دیکھا۔

''نن.....نہیں وکیل صاحب!.....وہ تو.......وہ تو......'' سلطانہ ہکلانے لگی۔

''دیکھو بی بی!'' فہیم وارثی نے سرد نظروں سے سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔''معالج سے بیماری اور وکیل سے حقائق چھپانے میں ہمیشہ ہی فائدے کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔اس لئے میں چاہوں گا کہ آپ بغیر کسی جھجک اور شرمندگی کے،اس کی ایک ایک بات مجھے بتا دیں۔''

''کیا بتاؤں وکیل صاحب!'' سلطانہ نگاہیں جھکائے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔''اس کا باپ برسوں کی محنت سے گھر، کاروبار، جائیداد سب کچھ اس کے لئے بنا گیا تھا۔ پر اوباش دوستوں کی صحبت میں پڑ کر اس نے لاکھ کی دولت کو دنوں میں خاک کر دیا۔اب اپنے خرچے پورے کرنے کے لئے یہ سب نہیں کرے گا تو......کیا کرے گا؟''

''کچھ پڑھا لکھا بھی ہے؟'' وکیل نے سوال کیا۔

''باپ نے تو بہت چاہا کہ کچھ پڑھ لے۔ پر مجھ بد بخت کی عقل پہ پتھر پڑ گئے تھے۔سو وہ جب بھی خفا ہوتے، میں ڈھال بن جاتی۔نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پانچ جماعتوں سے آگے نہ پڑھ سکا۔'' سلطانہ لحظہ بھر کو تھم کر دوبارہ گویا ہوئی۔''مگر وکیل صاحب! میرا رشید ہے بہت ذہین اور نڈر۔اس کا باپ کہتا تھا کہ میرے بیٹے کے سینے میں شیر کا دل ہے۔اور اللہ نے ایسا ذہن دیا ہے کہ اگر یہ اس کا صحیح استعمال کرے تو کپڑے کی اس چھوٹی سی دکان سے ٹیکسٹائل مل کا مالک بن سکتا ہے۔''

''ہوں۔'' وکیل نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔اس میں تو شک نہیں تھا کہ وہ ذہین تھا۔اس لئے اس نے گولی مار کر فرار ہونے کے بجائے گرفتار ہونا قبول کیا تھا۔''خیر!'' فہیم وارثی نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔''آپ گھر جائیے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس کے لئے کیا، کیا جا سکتا ہے۔''

''وکیل صاحب! خدا کے لئے میرے بچے کو بچا لیجئے۔'' سلطانہ نے گڑگڑاتے لہجے میں کہا۔''میں اسے اب کبھی بھی ایسا کوئی کام نہیں کرنے دوں گی۔''

''اگر وہ ذہین اور نڈر آدمی ہے تو اس کو اپنے اسٹیٹس کے مطابق کام کرنا چاہئے۔'' فہیم وارثی نے سوچتی نظروں سے سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''خیر! آپ پریشان نہ ہوں۔وہ ان شاءاللہ! دو روز میں گھر پہنچ جائے گا۔''

وحید الدین، سلطانہ کو ساتھ لئے گھر روانہ ہو گیا تھا اور بصد اصرار اسے اپنے گھر لے آیا تھا۔

دروازے پر دستک کی آواز سن کر زبین نے بیزار نظروں سے کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے باہر دروازے کی طرف دیکھا تھا اور کندھے اُچکا کر دوبارہ سے آئینے میں اپنے سراپے کا جائزہ لینے لگی تھی۔ دروازہ قمرن نے ہی کھولا تھا۔ سامنے سلطانہ کو کھڑے دیکھ کر وہ مصنوعی مسرت سے کِھل اُٹھی۔

''ارے سلطانہ آپا.....آؤ، آؤ.......اندر آؤ نا۔''

''میں انہیں ضد کر کے یہاں لے آیا کہ اب چائے وائے پی کر ہی جانا۔'' وحید نے بتایا۔

''یہ تو تم نے بہت ہی اچھا کیا۔'' قمرن نے توصیفی نظروں سے میاں کی طرف دیکھا اور سلطانہ کا ہاتھ پکڑ کر برآمدے کی طرف چلی۔''زبین دیکھے گی تو کتنی خوش ہو گی۔'' پھر وہ اندر کی طرف منہ کر کے ذرا اونچی آواز میں بولی۔

''زبین!.....اے زبین! ذرا باہر تو آ......دیکھ تو کون آیا ہے۔''

''ہزار بار کہا ہے کہ مجھے زبین نہ کہا کرو۔ زیبا کہتے کیا تمہاری زبان پر چھالے پڑتے ہیں؟'' وہ بھناتی ہوئی باہر نکلی اور سامنے سلطانہ کو کھڑا دیکھ کر سٹ پٹا کر اپنی جگہ تھم گئی۔

''لے، وہاں کیوں رک گئی؟.....قریب آ۔اپنی خالہ کو سلام کر۔'' وحید نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔
''سلام خالہ!'' وہ جھینپی سی آگے بڑھی۔ جب سے اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ اپنے بیٹے رشید کے لئے اسے قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے، تب سے اسے یہ بڑھیا زہر لگنے لگی تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی اسے کوفت ہوتی تھی، مگر اس وقت اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔
''کھڑی کیوں ہو؟......بیٹھو نا خالہ!'' سلطانہ قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔
''اچھا تو اب جا کر جلدی سے اپنی سلطانہ خالہ کے لئے اچھی سی چائے بنا لا۔'' ماں کے کام کہنے پر زبین نے قہر آلود نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا اور پیر پٹختی آنگن کے کونے میں بنے کچن کی طرف بڑھ گئی۔
''اے تمہیں کیا سانپ سونگھ گیا جو تم وہیں کے وہیں کھڑے ہو؟ اندر کیوں نہیں آتے؟'' قمرن نے بیٹی کی تیز نگاہوں کا غصہ میاں پر تیز لہجے میں اُتارا۔ وہ تب سے دروازے سے لگا کھڑا تھا۔
''میں بازار جانے کی سوچ رہا تھا۔ اب سلطانہ آپا کو کھانا کھلا کر ہی بھیجنا۔ تمہیں بازار سے کچھ منگوانا ہو تو بتا دو۔'' وحید نے جواب دیا۔
''لو اور سنو۔ تم نہ کہتے تو کیا ہم سلطانہ آپا کو بنا کھائے جانے دیتے؟ زبین تو کبھی انہیں ہلنے نہ دیتی۔'' قمرن بن کر ہنسی۔ ''تم بازار جا رہے ہو تو ایسا کرو، چھوٹے کا قیمہ لیتے آؤ۔ سلطانہ آپا پرہیزی کھانا کھاتی ہیں، میں ہلکا مصالحہ ڈال کر قیمہ بھون دوں گی ان کے لئے۔''
تب ہی دروازے پر زور کی دستک ہوئی تھی اور قمرن نے بولتے بولتے رک کر دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ وحید الدین کے چہرے پر بھی ایک سایہ سا آ کر گزر گیا تھا۔
دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی تھی۔
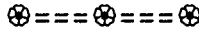
❀===❀===❀

وجاہت مرزا جیسے کروڑ پتی، اعلیٰ تعلیم یافتہ، وسیع کاروبار کے مالک وجیہہ و شکیل لڑکے کا رشتہ آنے پر حشمت جہاں کے اس چھوٹے سے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی دو بیڈ روم، ایک ڈرائنگ اور ایک لاؤنج پر مشتمل یہ چھوٹا سا اپارٹمنٹ، حشمت جہاں کے مرحوم شوہر، احمد سلطان کس جتن سے خرید پائے تھے، یہ کچھ ان کا دل ہی جانتا تھا۔ حشمت جہاں میں سلیقے قرینے، جوڑ جتھا کرنے اور گھر بنانے کی صلاحیت مفقود تھی۔ احمد سلطان محنت اور حق حلال کی راہ پر چل کر جو کچھ کما کر لاتے وہ حشمت جہاں سب کچھ پہننے اوڑھنے اور اپنے چٹورپن میں اُڑا دیتیں، اور اکثر نوبت قرض اُدھار تک پہنچتی۔ حالانکہ احمد سلطان کی اچھی خاصی تنخواہ تھی اور کوئی ایسا لمبا چوڑا کنبہ بھی نہ تھا۔ لے دے کر دو بیٹیاں اور وہ دو میاں بیوی۔
قرابت داروں کا بھی کوئی تانتا نہیں تھا۔ احمد سلطان کی ایک ہی بہن تھی، سائرہ بیگم۔ انہیں اکلوتے بھائی سے بے حد محبت تھی اور بھتیجیوں پر تو وہ جان چھڑکتی تھیں۔ مگر حشمت جہاں کو نند کی شکل سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ کبھی بھولے بھٹکے بھی ان کے گھر نہیں جاتی تھیں اور جو سائرہ بیگم بھائی اور بھتیجیوں کی محبت میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر چلی آتیں تو حشمت جہاں کی تیوریوں پر بل پڑ جاتے اور ان کے جانے کے بعد میاں سے بھی خوب لڑتیں۔
''اے میں کہتی ہوں تمہاری بہن نے ہمارے گھر کو کوئی تفریحی مقام سمجھ رکھا ہے؟......جب دل چاہا، بچوں کو سمیٹ کر چلی آئیں، ریسٹورنٹ میں لنچ ڈنر کرنے۔'' ایک آدھ بار انہوں نے سائرہ بیگم کے سامنے بھی اسی طرح کے جملے ادا کئے تو وہ اس سلسلے میں بہت محتاط ہو گئی تھیں۔ بچوں کے ساتھ کم آتیں اور اگر بچوں کے ضد کرنے پر انہیں ساتھ لے آتیں تو پھر کھائے پیئے بغیر ہی بھائی بھتیجیوں سے مل کر واپس چلی جاتیں۔ احمد سلطان مروتاً کہتے بھی.....''ارے سائرہ بی! ابھی

سے کہاں چل دیں؟ اب رات کا کھانا کھا کر ہی جانا۔'' بھاوج کی گھورتی نظروں اور بھائی کے بے بس لہجے کو محسوس کرنے کے باوجود سائرہ بالکل احساس نہ ہونے دیتیں کہ وہ سب کچھ جانتی ہیں بلکہ ممنون لہجے میں جواب دیتیں۔ ''بھائی جان! خدا آپ کی کمائی میں برکت دے، آپ کا گھر بھرا رہے، کھانے کا کیا ہے، پھر کسی دن کھا لوں گی۔ آج انہوں نے ذرا جلدی لوٹ آنے کو کہا تھا، اسی لئے بنا کھائے جا رہی ہوں۔''

پھر بالکل اچانک سائرہ کے میاں کو نائیجیریا میں نوکری مل گئی تھی اور وہ بیوی بچوں کو سمیٹ کر پردیس جا بسے تھے۔ اب کبھی کبھار خط پتر اور عید تہوار پر فون کا سلسلہ رہ گیا تھا۔ حشمت جہاں کی طبع نازک پر نند کا سال چھ مہینے بعد لکھا گیا، دو چار لائنوں کا خط اور کسی خاص موقع پر دو چار منٹ کا فون بھی ناگوار گزرتا تھا۔ بھاوج کے روّیے پر سائرہ بیگم دل مسوس کر رہ جاتیں، مگر زبان پر شکایت نہ لاتی تھیں، اپنے بھائی کی مجبوری اور بے بسی سے واقف تھیں اور اب برسوں پہلے احمد سلطان کے انتقال کے بعد سے یہ سلسلہ بالکل ہی منقطع ہو گیا تھا۔ سطوت ندرت کو تو اب یاد ہی نہیں تھا کہ ان کی کوئی پھوپھی بھی ہیں جو پردیس میں رہتی ہیں۔ اور جہاں تک حشمت جہاں کے خود اپنے میکے کا تعلق تھا تو وہاں پر بھی جھاڑو پھری ہوئی تھی۔ لے دے کر ایک بھائی ریاض بیگ اور ان کا اکلوتا بیٹا وقاص بیگ۔ وہاں انہیں نند کی شکل سے بیر تھا تو یہاں بھاوج کی صورت بری لگتی تھی۔ کبھی جو لمحے بھر کو بھی بھابی سے بنی ہو۔ ہوتے ہوتے نوبت یہ آئی تھی کہ دونوں خاندانوں میں نہ رہنے کے برابر تعلق رہ گیا تھا اور وقاص کے والد کے انتقال کے بعد تو جیسے رشتے داری ہی ختم ہو گئی تھی۔ مگر جب سے وقاص نے ہوش سنبھالا تھا اور اپنے پیروں پر کھڑے ہوئے تھے، اس ٹوٹے ہوئے رشتے کو دوبارہ سے جوڑنے کی کوشش کی تھی۔ ماں کے ناپسند کرنے کے باوجود وہ کبھی کبھار پھوپھی سے ملنے چلے جایا کرتے تھے اور ان کی بیماری میں تو ہر طرح ان کے کام آنے کی کوشش کرتے تھے۔

ان کی والدہ پڑھی لکھی اور باشعور خاتون تھیں، کچھ بیٹے کی خوشی کی خاطر، کچھ رشتے کا احساس کر کے اب وہ بھی کبھی کبھار نند کے گھر چلی جاتی تھیں۔ گو کہ اب حشمت جہاں کا وہ تن تنا نہیں رہا تھا، مگر اب بھی وہ بھاوج سے مل کر کسی خوشی اور گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کرتی تھیں۔

حشمت بیگم اور بیٹیوں کے جس انداز کے خرچ تھے، اس حساب سے تو زندگی کرائے کے گھر میں بھی گزرنی چاہئے تھی کہ احمد سلطان اپنی بیٹیوں کے لئے ایک چھت چھوڑ جانا چاہتے تھے، سو کس کس جتن سے اوورٹائم اور پارٹ ٹائم ملازمت [illegible] وہ چھوٹا سا اپارٹمنٹ خریدنے میں کامیاب ہو گئے تھے جس میں آج ان کے گزر جانے کے بعد وہ ماں بیٹیاں [illegible] سر چھپائے بیٹھی تھیں۔ گو کہ گھر کے چھوٹے اور بہت زیادہ اچھے نہ ہونے کی شکایت تینوں کو بھی تھی لیکن اس کے باوجود اطمینان سے اس چھوٹے سے فلیٹ میں رہ رہی تھیں۔ کرائے کی ادائیگی اور روز روز گھر تبدیل کرنے کے عذاب سے بچی ہوئی تھیں۔

تپتی دوپہر، سہ پہر کی آغوش میں پڑی ہانپ رہی تھی۔ گو کہ سورج کی زردی دم توڑ رہی تھی، اس کے باوجود ہواؤں میں دھوپ کی تمازت رچی ہوئی تھی۔ کونے میں پیڈسٹل گھر گھر کر کے گرم ہوا بھی پھینک رہا تھا مگر پیڈسٹل کی ہوا میں نیوار کی چارپائیوں پر لیٹی حشمت جہاں اور ندرت گہری نیند سو رہی تھیں۔ جبکہ سطوت اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے نرم و چمکیلے بالوں اور دلکش چہرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ یہ ان کا بڑا پسندیدہ مشغلہ تھا، جب فرصت ملتی، وقت بے وقت آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوتی تھیں۔

تب ہی ڈور بیل چلا اُٹھی۔

''توبہ ہے۔'' سطوت نے جھنجلا کر دروازے کی طرف دیکھا تھا، اپنا انہماک ٹوٹنے پر اسے سخت ناگواری ہوئی

تھی۔ ماں اور بہن چونکہ سو رہی تھیں اس لئے اصولاً اسے ہی جا کر دروازہ کھول کر دیکھنا چاہئے تھا کہ کون آیا ہے؟ مگر وہ حسب سابق اپنی جگہ بیٹھی اسی توجہ سے اپنے حُسن کے جائزے میں مصروف تھی۔ بیل ایک بار پھر بجی تھی۔ اب کے نسبتاً زیادہ زور سے۔

''اُف.....کون آ گیا اس وقت؟'' حشمت جہاں نے کسمساتے ہوئے کروٹ لی۔

''اے ندرت!......دیکھ تو بیٹا! کون آیا ہے؟'' انہوں نے ساتھ والی چارپائی پر لیٹی ندرت کو تھپتھپا کر جگانا چاہا۔

''اوں ہوں......کیا ہے امی.....؟'' اس نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ ''سونے دو بھئی۔''

''ندرت!.....سطوت!.....کہاں ہو بھئی؟'' بند دروازے کے اس پار سے بھاوج کی آواز سن کر حشمت جہاں منہ بناتی چارپائی سے اُٹھ بیٹھی تھیں۔

''ارے ذرا چھری تلے دم تو لو رضوانہ دلہن!'' پیروں میں سلیپر اُڑستی وہ دروازے کی طرف بڑھیں۔ دروازہ کھلتے ہی وقاص کی والدہ رضوانہ آہستگی سے گھر میں داخل ہو گئی تھیں۔

''ارے آپ لوگ تو شاید سو رہی تھیں۔'' اندر داخل ہو کر انہوں نے پنکھے کی رینج میں بچھی دونوں چارپائیوں کی طرف دیکھ کر قدرے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے بے وقت آ کر آپ لوگوں کی نیند خراب کر دی۔''

''ارے نہیں۔'' حشمت جہاں نے قدرے مروّت کا مظاہرہ کیا۔ ''سہ پہر ڈھلنے کو ہے۔ اب تو اُٹھنا ہی تھا۔'' وہ ایک بڑی سی جماہی لے کر بولی تھیں۔ ''آؤ بیٹھو! کیسے آنا ہوا؟''

''بس بات ہی ایسی تھی کہ شام ڈھلنے کا انتظار ہی نہ ہوا۔'' رضوانہ بیگم نے نند کے پیچھے قدم بڑھاتے ہوئے تمہید کا آغاز کیا۔ ''اگر ان کا بس چلتا تو وہ تو بھری دوپہر میں تمہارے دروازے پر لا کھڑا کرتے۔''

''ارے کون؟......کس کی بات کر رہی ہو؟'' ڈرائنگ روم کا بھڑا دروازہ دھڑ سے کھولتے ہوئے حشمت جہاں نے رضوانہ بیگم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''وقاص کی بات کر رہی ہو؟''

''خدانخواستہ......'' بڑی مشکل سے انہوں نے اس لفظ کو لبوں تک آنے سے روکا تھا۔ ''وقاص کی نہیں۔ میں ان کے دوست وجاہت مرزا کی بات کر رہی تھی۔''

چھوٹے سے کمرے میں دروازے کے سامنے ہی مشرقی دیوار کے ساتھ بچھی، نیچے پایوں والی چوکی پر پڑے ڈھیروں کپڑوں کے ڈھیر کو ایک طرف کھسکاتے ہوئے وجاہت مرزا کے نام پر حشمت بیگم کے ہاتھ ساکت ہو گئے تھے۔

''ہیں.....؟'' انہوں نے چونک کر بھاوج کی طرف دیکھا تھا۔ ''وجاہت مرزا؟''

''جی جناب!'' رضوانہ بیگم چوکی پر بیٹھ گئیں۔ کھڑکیاں بند تھیں، کمرے میں ملگجا اندھیرا بھرا ہوا تھا اور خوب حبس تھا۔

''اے آپا! ذرا پنکھا تو کھولیے۔'' رضوانہ بیگم نے ماتھے پر پھوٹ کر آ نکلنے والے پسینے کو پونچھتے ہوئے بلبلاتے لہجے میں گزارش کی۔

''اے لو......میں تو بھول ہی گئی۔'' حشمت جہاں نے آگے بڑھ کر سوئچ آن کر دیا تھا اور چھت کے بیچوں بیچ جھولتا پنکھا آہستگی سے شروع ہو کر بالآخر سپیڈ میں چلنے لگا تھا۔

بیل کی آواز، ماں کی تھپتھپاہٹ اور پھر ماں اور ممانی کی باتوں سے ندرت کی نیند تو پہلے ہی ٹوٹ گئی تھی، وجاہت مرزا کے نام پر پٹ سے اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ خود سطوت جہاں بھی ممانی کی اس بے وقت کی آمد پر چونک اُٹھی تھی اور آہستگی سے چلتی لاؤنج کی چوکھٹ پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ بالشت بھر کے فاصلے پر واقع ڈرائنگ روم میں ہوتی

ساری گفتگو یہیں کھڑے رہ کر باآسانی سنی جاسکتی تھی۔

حشمت جہاں نے چوکی کے درمیان تک پھیلے کپڑوں کے ڈھیر کو بے صبری سے دیوار کی طرف دھکیلا اور دھپ سے بھاوج کے قریب بیٹھ گئیں۔

''اے دُلہن! جلدی بتاؤ، سب خیریت تو ہے نا؟'' ان کی شاطر آنکھوں نے وجاہت مرزا کی آنکھوں میں سطوت جہاں کے لئے پسندیدگی کے رنگ تو بہت پہلے ہی دیکھ لئے تھے، پھر ان کی والدہ عاتکہ بیگم کی آمد نے انہیں مزید چوکنا کر دیا تھا۔ مگر ان کا سرد مہری لئے ہوئے روّیہ کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہ تھا۔ مگر اس وقت رضوانہ بیگم کی بے وقت آمد اور پہیلی بجھاتی باتوں سے ان کا ماتھا ٹھنکا تھا۔

''جی..... سب خیریت ہی ہے۔'' رضوانہ بیگم نے سوکھے منہ سے جواب دیا اور دھیمے لہجے میں وجاہت مرزا کے رشتے کی بابت بتایا۔ لحظہ بھر کو تو حشمت جہاں کو اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا۔

''اے کیا کہہ رہی ہو رضوانہ دُلہن؟'' انہوں نے تصدیق چاہی۔ ''ذرا پھر سے تو کہنا۔ کیا میں صحیح سن رہی ہوں؟''

''جی..... آپ بالکل صحیح سن رہی ہیں۔'' اس تمام عرصے میں رضوانہ بیگم پہلی بار خفیف سا مسکرائیں۔ ''ان کی والدہ، عاتکہ بیگم نے سطوت کا رشتہ مانگا ہے۔ اور وہ جلد از جلد شادی کرنا چاہتی ہیں۔''

رضوانہ بیگم کی یہ یقین دہانی جہاں حشمت جہاں کے چہرے پر مسرت بھری تمتماہٹ جگا گئی تھی، وہیں لاؤنج کی چوکھٹ سے ٹیک لگائے کھڑی سطوت کے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ کر گئی تھی۔ جبکہ ندرت کو اپنے دل کی دھڑکنیں رُکتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔

وجاہت مرزا جیسے کروڑ پتی اعلیٰ تعلیم یافتہ وسیع کاروبار کے مالک وجیہہ وشکیل لڑکے کا رشتہ آنے پر حشمت جہاں کے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ خود سطوت جہاں اپنے مقدر پر نازاں و فرحاں تھی۔ صرف ایک ندرت جہاں تھی جو اس رشتے پر خوش ہونے کے بجائے رنجیدہ ہوگئی تھیں۔ عمر میں وہ سطوت سے سال بھر بڑی تھی، بڑا ہونے کے ناطے اس رشتے کے لئے وہ خود کو زیادہ حق دار سمجھتی تھی۔ دوسرے وجاہت سے پہلے اسی کی ملاقات ہوئی اور پہلی ہی نظر میں وہ سنجیدہ، بردبار اور خوبرو نوجوان اسے بہت اچھا لگا تھا۔ اس لئے بھی اس کی خواہش تھی کہ وجاہت مرزا سے سطوت کے بجائے اس کا رشتہ طے ہوتا۔ اور اس بات کا اس نے بے دھڑک ماں سے اظہار بھی کر دیا تھا۔

''امی! رضوانہ ممانی کو سطوت سے پہلے میرے بارے میں سوچنا چاہئے تھا۔ آخر میں اس سے بڑی ہوں۔''

''آئے..... اس میں بے چاری رضوانہ دُلہن کا کیا قصور ہے؟'' شاید زندگی میں پہلی بار انہوں نے بھاوج کو کسی ناکردہ گناہ سے بری تسلیم کیا تھا۔ ''سطوت کے لئے خود وجاہت مرزا کی مرضی ہے۔''

''اچھا.....'' ندرت کے چہرے پر ایک تعجب بھرا اذیت کا احساس جاگا، پھر وہ خود کو سنبھال کر دھیمے مگر اکھڑ لہجے میں بولی۔ ''لڑکے لڑکی کی مرضی کیا ہوتی ہے؟ شرفاء کے ہاں تو وہی ہوتا ہے جو بزرگ چاہتے ہیں۔ رضوانہ ممانی کو بات تو کرنی چاہئے۔''

مگر وجاہت مرزا، سطوت جہاں کے حُسن پر ایسے فریفتہ ہوئے تھے کہ اس کے علاوہ کسی اور کا نام سننے کو بھی تیار نہ تھے۔ سو سطوت کی خوش بختی سے زیادہ ندرت کو وجاہت کے انتخاب پر غصہ تھا۔ وجاہت مرزا چاہتے تو یہ خوشی اس کا مقدر بن سکتی تھی۔ وجاہت کے غلط انتخاب اور بے انصافی پر اس کا دل کُڑھ رہا تھا۔ وہ فطرتاً حاسد طبیعت کی مالک تھی۔ مروّت، درگزر اور قربانی کے جذبوں سے اس کا دل بالکل ہی خالی تھا۔ ماں نے کبھی رشتوں کا احترام کیا ہوتا تو بیٹیاں بھی رشتوں کی اہمیت، افادیت اور ضروریات کے بارے میں جان سکتیں۔ وہ لوگ اور خصوصاً ندرت ان لوگوں میں سے تھی

جو وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ تسلیم کر لیتے ہیں اور وقت نکلتے ہی باپ کو بھی گدھا سمجھنے لگتے ہیں۔ اس کی نظ میں خونی رشتوں کی کوئی اہمیت تھی اور نہ ہی ان رشتوں کے تقاضوں سے واقفیت۔ اسی واسطے بہن کی خوشی میں شامل ہونے کے بجائے وہ جل بھن کر خاکستر ہو گئی تھی، اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طور اس رشتے کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم کروا دے۔

''اے رضوانہ دُلہن! میرے تو ہاتھ پیر پھول رہے ہیں، کیا کروں، کیا نہ کروں؟'' وجاہت مرزا کی طرف سے جلد از جلد شادی کے تقاضے کی وجہ سے حشمت جہاں حقیقت میں بوکھلا گئی تھیں اور آج کل وہ خوب دوڑ دوڑ کر رضوانہ بیگم کے گھر کے چکر لگا رہی تھیں۔ شادی ہونے تک تو انہیں رضوانہ کو اہمیت دینی ہی تھی، بعد میں ان کو دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکنے کا مصمم ارادہ تھا۔ ابھی تو رضوانہ بیگم کی ضرورت تھی، کیونکہ حشمت جہاں جانتی تھیں کہ سطوت اور وجاہت کی شادی کی یہ بیل رضوانہ کے تعاون اور مدد کے بغیر منڈھے نہیں چڑھ سکے گی۔ کیونکہ وہ جان چکی تھی کہ وجاہت کی والدہ عاتکہ بیگم تو اس رشتے کے سخت خلاف تھیں۔

عاتکہ بیگم کی ناپسندیدگی اور اختلاف کی بات جب سطوت اور ندرت کے سامنے آئی تھی تو سطوت کی شفاف پیشانی پر بل سمٹ آئے تھے۔ ''مجھ میں ایسے کون سے کانٹے لگے ہیں جو انہیں ابھی سے چبھنے لگے؟'' وہ دل جلے انداز میں نہایت بدتمیزی سے بولی تھی، اور ندرت نے چونک کر بہن کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے حسین چہرے پر پھیلے غصے کو دیکھ کر ندرت کے ذہن میں ایک نئے خیال نے جنم لیا تھا۔

''اور نہیں تو کیا؟'' وہ سطوت کی ہاں میں ہاں ملاتی ہوئی بولی تھیں۔ ''ہماری سطوت جیسی لڑکی، وہ چراغ لے کر ڈھونڈتیں تب بھی نہ ملتی۔''

ندرت کی بات پر سطوت نے چونک کر بہن کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی بڑی بڑی مخمور آنکھوں میں تیرتی بے یقینی اگلے ہی لمحے احساسِ ممنونیت میں ڈھل گئی تھی۔

''مجھے تو وہ بڑھیا بہت ہی چنڈالنی لگتی ہے۔'' سطوت کو متاثر و ممنون ہوتے دیکھ کر اس نے دل جلے انداز میں مزید کہا۔ ''ایسی مائیں، کماؤ بیٹوں کی تو شادی کرنا ہی نہیں چاہتیں۔ اور جو بیٹے خود سے کسی پر فریفتہ ہو جائیں تو یہ سو سو طریقوں سے عیب اور برائیاں نکال کر رشتے سے انکار کر دیتی ہیں۔ بھلا بتاؤ...... ہماری سطوت میں آخر برائی ہی کیا ہے جو وہ کسی طور شادی کے لئے تیار ہی نہ تھی۔''

''اے چھوڑو۔ ماں تیار تھی یا نہیں، ہمیں کیا فرق پڑتا ہے؟'' حشمت جہاں نے ہاتھ جھٹک کر لاپروائی سے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں کہا۔ ''بیٹا تو دل و جان سے ہماری سطوت کو دُلہن بنا کر لے جانے کے لئے تیار ہے۔ رضوانہ دُلہن بتا رہی تھی کہ اگر ماں مزید انکار کرتی تو وجاہت ماں، گھربار سب چھوڑ چھاڑ سطوت کو بیاہنے آجاتے۔'' ماں کے لہجے سے چھلکتا فخر سطوت کے دل میں تکبر جگا گیا تھا اور وہ عاتکہ بیگم کے لئے سخت غصہ، ناپسندیدگی اور نفرت کے احساسات دھڑکنوں میں دباتی کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ وجاہت کی وارفتگی اور دیوانگی کا حال سن کر جہاں سطوت کو اطمینان اور احساسِ مسرت ملا تھا، وہیں ندرت کے سینے میں وجاہت کے لئے بھڑکتی نفرت اور انتقام کی آگ کے شعلے مزید بھڑک اُٹھے تھے۔ وہ سطوت کے کمرے سے نکلتے ہی ماں کے قریب کھسکتے ہوئے دھیمے اور رازدارانہ لہجے میں بولی۔

''امی! مجھے تو یہ بات سن کر پریشانی ہو رہی ہے۔ ذرا بتاؤ، جو شخص چار دن کی پہچان والی لڑکی کی خاطر ماں، گھربار سب کو چھوڑنے کو تیار تھا، کل وہ بیوی کو نہیں چھوڑے گا؟''

''اے..... تم فضول اپنا دماغ نہ دکھاؤ'' حشمت بیگم لاپروائی سے ہاتھ لہرا کر بولیں۔ ''وہ شریف گھرانے کا لڑکا

ہے۔ سطوت کا وہ جتنا آج دیوانہ ہے، کل ہزار گنا زیادہ دیوانہ ثابت ہوگا۔" ماں کا جواب سن کر ندرت کے سینے پر سانپ لوٹ گیا تھا۔

جوں جوں شادی کا دن قریب آ رہا تھا، ندرت کے حسد، تڑپ اور بے بسی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کچھ بھی کر کے کسی بھی طریقے سے اس شادی کو ہونے سے پہلے ہی ختم کروا دینا چاہتی تھی۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکی اور بالآخر شادی کا دن آ ہی پہنچا۔

عاتکہ بیگم اپنے اکلوتے اور چہیتے بیٹے کی شادی بے حد دھوم دھام سے کرنا چاہتی تھیں مگر حشمت جہاں کی حالت اور حالات کے پیش نظر وہ بارات میں محض چند قریبی لوگوں کی ہی لائی تھیں۔ باقی سارے ارمان انہوں نے ولیمے کے لئے اُٹھا رکھے تھے۔ گو کہ پہلے وہ اس رشتے کے لئے تیار نہ تھیں اور اس میں بھی ان کی ذاتی پسند و ناپسند کا دخل تھا بلکہ وہ یہ سب وجاہت مرزا کے بھلے کے لئے کرنا چاہتی تھیں۔ مگر جب ان کی ضد کے سامنے انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے تو اس کے بعد پورے خلوص اور محبت سے انہوں نے ان کی محبت کو قبول کر لیا تھا اور اپنا بیش قیمت یاقوت کا زیور نکاح کے بیش قیمت عروسی جوڑے کے ساتھ لے آئی تھیں۔ بیش قیمت یاقوت کا جڑاؤ بھاری بھرکم سیٹ اور کم خواب کا چم چم کرتا دُلہن کا جوڑا دیکھ کر حشمت جہاں کے ساتھ ندرت اور خود سطوت کی آنکھیں بھی پھیل گئی تھیں۔

"یہ زیور تو بہت بھاری اور قیمتی لگتا ہے۔ ان کا خاندانی زیور ہے۔" سطوت نے آنکھوں کو خیرہ کرتے یاقوتوں کی طرف حیرت بھری پُرمسرت نظروں سے دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"اور نہیں تو کیا؟" قریب سے گزرتی حشمت جہاں لحہ بھر کو ٹھہر گئی تھیں۔ "عاتکہ بیگم کی بری کا زیور ہے۔ رضوانہ دُلہن بتا رہی تھیں، دس بارہ لاکھ سے کیا کم ہوگا۔"

"دس بارہ لاکھ کا اتنا قیمتی زیور انہوں نے......میرے لئے......دے دیا۔"

"تو......؟" سطوت نے حیران نظریں اُٹھائیں اور اس لمحاتی وقفے میں ندرت کے شاطر ذہن نے ایک کہانی گھڑ لی تھی۔ "لو......ابھی تو وقاص بھائی بتا رہے تھے کہ عاتکہ بیگم تو تمہارے لئے ایک چھلاّ دینے کو تیار نہیں تھیں، وہ تو سب لے لینے سننے پر اور خاص طور پر وجاہت کی خودکشی کی دھمکی پر بڑھیا نے تجوری سے یہ زیور نکالا ہے۔"

ساس کی اس محبت بھری سوغات کے زیر اثر سطوت کے دل میں ان کے لئے جو نرم کونپل پھوٹی تھی، ندرت نے اس ننھی سی کونپل کو اپنی عیارانہ باتوں سے لمحہ بھر میں جلا کر خاک کر دیا تھا اور اس وقت سطوت کو اپنے دل میں ساس کے لئے شدید نفرت اور دوری کے احساس جاگتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اور ندرت اس کے احساسات کو محسوس محسوس کی پوروں سے چھوتی اپنے اندر ایک تسکین اُترتے محسوس کر رہی تھی۔ پھر اس نے بظاہر بہت پیار سے اس چمچماتے زیور اور غرارے سے سطوت کو آراستہ و پیراستہ کیا تھا بلکہ ہلکے میک اپ نے اس کے حُسن کو دوآتشہ کر دیا تھا۔ آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر لحظہ بھر کو تو وہ خود بھی ہکا بکا رہ گئی تھی۔ کریم کلر کی ایمبرائیڈڈ شیروانی، علی گڑھ کٹ پاجامے، سنہری سلیم شاہی اور سنہری و کریم کلاہ میں وجاہت مرزا کسی ریاست کے راجکمار لگ رہے تھے۔ اپنی پسند کو پا لینے کی خوشی، فتح کا احساس بن کر ان کی شفاف، بے ریا آنکھوں سے چھلک رہی تھی، اور گھنی مونچھوں تلے ان کے گلابی نم لبوں پر مسرت و انبساط سے لبریز مسکراہٹ ان کی اندرونی شادمانی کی غماز تھی۔

بیٹے کو شاداب و مسرور دیکھ کر عاتکہ بیگم خود بھی خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھیں اور بار بار ان کے دل سے یہی دعا نکل رہی تھی کہ خدا کرے ان کے تمام خدشے وسوسے بے بنیاد اور بے معنی ثابت ہوں۔ اور اس لمحے پھول کی طرح شاداب وجاہت تاحیات اسی طرح خوش، مسرور اور شاد و آباد رہیں۔

عاتکہ بیگم اور وجاہت مرزا کے لاکھ منع کرنے کے باوجود رضوانہ بیگم اور وقاص نے حشمت جہاں اور سطوت سے اپنے رشتے کا لحاظ کرتے ہوئے ایک پُرتکلف ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ نکاح کے بعد ڈنر کے ساتھ ہی رخصتی عمل پذیر ہوگئی تھی۔ یاقوت کے دمکتے زیور، کم خواب کے چمچماتے لباس میں غرور سے گردن اونچی کئے سطوت جہاں جدید ماڈل کی بیش قیمت چمکتی ہوئی کار میں جب وجاہت مرزا کے پہلو میں بیٹھی تھی تو خود کو دنیا کی سب سے خوش نصیب ہستی تصور کر رہی تھی۔ آگے پیچھے چلتی دونوں گاڑیاں مین گیٹ سے گزر کر احاطے کا چکر لیتی جب پورچ میں جا ٹھہری تھیں تو رواج کے مطابق عاتکہ بیگم سب سے پہلے گاڑی سے باہر آئی تھیں اور ورانڈے کی سیڑھیاں چڑھتی تیزی سے آگے بڑھ کر انہوں نے داخلی دروازہ کھول دیا تھا۔

اب دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی اپنی بہو کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ سطوت جہاں نے نخوت سے گاڑی سے پاؤں اُتارا، وقاص کی والدہ رضوانہ بیگم نے پچھلی گاڑی سے اُتر کر جلدی سے آگے بڑھ کر سطوت کو تھام لیا تھا اور اسے شانوں سے تھامے سیڑھیاں چڑھتی اوپر پہنچی تھی جہاں عاتکہ بیگم مسرت سے دمکتا چہرہ لئے گھر اور دل کا دروازہ کھولے بہو کے استقبال کے لئے موجود تھیں۔ گو کہ وہ اس شادی سے دلی طور پر خوش نہیں تھیں مگر اس وقت انہوں نے پورے خلوص اور انتہائی محبت سے بہو کا استقبال کیا تھا۔ اپنی ممتا بھری آغوش میں سمیٹ کر بہو کی دمکتی پیشانی پر مہر محبت ثبت کی تھی، اور بے حد پیار سے تھام کر لاؤنج کی طرف چلی تھیں۔ ان کے چیدہ چیدہ قریبی رشتے دار گھر میں موجود تھے۔ لاؤنج میں دُلہن کو بٹھا کر کچھ رسمیں ادا کی گئی تھیں اور کافی دیر تک سلامیوں کا سلسلہ چلتا رہا تھا۔ عاتکہ بیگم نے اکلوتے بیٹے کی چہیتی دلہن کے لئے منہ دکھائی میں دینے کے لئے ہیروں کے جڑاؤ کنگن بنوائے تھے۔

رات گئے تک خوب ہلا گلا رہا تھا، قہقہے اُبل رہے تھے اور ہر سمت مسرت و شادمانی کا راج تھا۔ وجاہت مرزا بھی بے حد خوش تھے۔ ان کے وجیہہ اور باوقار سراپے سے مسرت کے رنگ پھوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ پہلی نظر میں جس ہستی کو دیکھ کر وہ اپنا دل ہار بیٹھے تھے، آج وہی ہستی ان کی زندگی بن کر ان کی زندگی میں چلی آئی تھی۔ انہیں اپنی خوش بختی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''بھئی اب تم لوگ یہ ہلا گلا بند کرو۔'' سطوت کو اپنی جگہ کسمساتے دیکھ کر عاتکہ بیگم نے لاؤنج میں جمع خاندان کے لڑکے لڑکیوں سے کہا تھا۔ ''دُلہن بیگم بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوں گی۔ اب انہیں ان کی خواب گاہ میں پہنچا دو۔''

وجاہت کی خالہ زاد بہن دُلہن کو سہارا دے کر بیڈ روم کی طرف لے کر چلیں۔ سجے سجائے وسیع و عریض بیڈ روم کو سطوت جہاں نے حیران نظروں سے دیکھا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر لہراتے حریری پردے، فرش پر بچھا دبیز ایرانی قالین، کمرے کے وسط میں دھرا کنگ سائز جدید طرز کا بیڈ، سامنے کی سمت ڈیوائیڈر میں ڈیک کے ساتھ ٹی وی اور وی سی آر بھی دھرا تھا۔ دائیں جانب مخملیں پوشش کے آرام دہ بیش قیمت صوفے دھرے تھے، سامنے کی جانب وارڈ روم کا دروازہ تھا۔ وارڈ روم کے ساتھ ہی باتھ روم تھا۔

ہر چیز ایسی عمدہ اور قیمتی تھی کہ ہر ہر چیز پر آنکھیں ٹھہر جاتی تھیں۔ گو کہ سطوت کی سوچیں بہت اونچی تھیں مگر حقیقت کی اُڑان اتنی بلند ہوگی، یہ تو کبھی اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ اس کا دل خوشی سے بلّیوں اُچھل رہا تھا۔ اسے تو بنا مانگے ہی سب کچھ مل گیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب، وجیہہ و شکیل شوہر، شاندار محل نما گھر، قیمتی چمچماتی گاڑیاں، نوکر چاکر، دولت کی ریل پیل۔ وہ تو اپنے مقدر پر جس قدر ناز کرتی کم تھا۔

اگلی شام عاتکہ بیگم نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں شاندار ولیمے کا اہتمام کیا تھا جس میں عزیز و اقارب کے علاوہ عمائدین شہر نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کی تھی۔ حشمت جہاں، ندرت کے ساتھ شریک ہوئی تھیں اور بے حد خوش اور

شانت دکھائی دے رہی تھیں، جبکہ ندرت یہ سب شاہانہ ٹھاٹ باٹھ اور رکھ رکھاؤ دیکھ کر دل ہی دل میں سلگ رہی تھیں۔ جانے کیوں وہ یہ سمجھتی تھیں کہ یہ سب ان کے لئے تھا۔ مگر وجاہت نے سطوت کا انتخاب کر کے یہ سب کچھ اس سے چھین لیا تھا۔ اور اسی لئے وہ اب وجاہت کو اُس کی اس غلطی کی سزا دینا چاہتی تھی۔ وہ روزِ اوّل سے سطوت کی سطحی فطرت اور کچے کانوں کی خاصیت سے واقف تھی، سو اسی لئے اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے سطوت کو استعمال کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور شادی سے پہلے ہی سطوت کے دل میں ساس یعنی عاتکہ بیگم کے لئے اس قدر نفرت اور دُوری بھر دی تھی کہ وہ اب عاتکہ بیگم کا نام بھی سننے کو تیار نہ ہوتی تھی۔ وہ اسے وجاہت کی دُلہن بنانے کو تیار نہیں تھیں۔ سطوت اُن کی اس غلطی کی سزا ہر ہر پل اور ہر ہر قدم پر دینا چاہتی تھی۔

پہلے دن سے ہی اسے ساس کی شکل سے ایسی نفرت اور دُوری تھی کہ اُس کا بس چلتا تو گھڑی کی چوتھائی میں وہ انہیں گھر سے نکال باہر کرتی۔ عاتکہ بیگم نے یہ فاصلے مٹانے کی بہت کوشش کی مگر سطوت کو تو ساس کے نام سے ہی خدا واسطے کا بیر تھا۔ ہر وہ بات اور ہر وہ چیز جو عاتکہ بیگم کو پسند تھی، سطوت جہاں اس سے نفرت کرنے لگتی تھی۔ عاتکہ بیگم صاف ستھرا، سجا سنورا گھر پسند کرتی تھیں۔ سطوت جہاں نے دھیرے دھیرے گھر کی سجاوٹ اور دلکشی مٹانی شروع کر دی تھی۔ عاتکہ بیگم کو سبزے، ہریالی اور پھولوں سے پیار تھا سو سطوت جہاں نے رفتہ رفتہ کوٹھی کے اطراف بھرے سر سبز باغیچوں کو نہایت آہستگی سے خزاں رسیدہ بنانا شروع کر دیا تھا۔

وہ ایک خود سر، ضدی، خود پسند اور خود غرض عورت تھی۔ وجاہت مرزا کو وہ بے حد عزیز تھی۔ اس کی خاطر انہوں نے اپنی قابلِ احترام ماں کے فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن ایسا نہیں تھا کہ پسندیدہ بیوی پا کر ان کے دل سے ماں کی محبت کم ہو گئی تھی، بلکہ عاتکہ بیگم نے بیٹے کی ضد اور خوشی کی خاطر جس طرح ہتھیار ڈال دیئے تھے اور پورے خلوص اور چاؤ چونچلوں سے سطوت کو بہو بنا کر گھر لے آئی تھیں۔ اُن کے اس عمل نے بیٹے کے دل میں ان کی عزت اور محبت میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ مگر اب جب وہ سطوت کا ماں کے ساتھ روّیہ دیکھتے تو پریشان ہو اُٹھتے تھے۔ شروع شروع میں انہوں نے پیار و محبت سے سطوت کو سمجھانا چاہا تھا مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ عاتکہ بیگم یعنی ساس کے ساتھ ساتھ وہ میاں سے بھی متنفر ہو گئی تھی۔ اور نفرت کی اس آگ کو بھڑکانے میں ندرت جہاں کا ہاتھ تھا۔ وہ جب بھی بہن سے ملنے آتی، اسے سو سو طریقوں سے سکھا اور بھڑکا کر جاتی۔ اور ندرت کے جانے کے بعد ہفتوں گھر میدانِ کارزار بنا رہتا۔ وجاہت مرزا کی کوئی بہن نہیں تھی، اس لئے انہوں نے ہمیشہ ندرت کو اپنی بہن ہی سمجھا تھا اور چہیتی بیوی کی چہیتی بہن ہونے کے ناطے انہیں اپنی یہ اکلوتی سالی بے حد عزیز تھی۔ مگر رفتہ رفتہ انہیں احساس ہوتا گیا تھا کہ ندرت ان کی اور سطوت کی شادی سے خوش نہیں ہے اور اس ہنستے بستے گھر کو برباد کرنا چاہتی ہے۔

✿===✿===✿
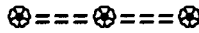
پتھریلی ٹائلز سے مزین فٹ پاتھ سے ٹکرا کر اکبر علی کا سر خربوزے کی طرح چٹخ گیا تھا اور وہ آناً فاناً دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ گو کہ یہ ایک حادثہ تھا مگر پروفیسر آفاق خود کو اس حادثے کا ذمہ دار سمجھ رہے تھے۔ نہ وہ اکبر علی کو روڈ پار کر کے سامان لانے کو بھیجتے، نہ یہ حادثہ رونما ہوتا۔ مگر جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔

اب انو اور نمرہ دنیا میں بالکل تنہا رہ گئے تھے۔ لیکن ان حالات میں پروفیسر آفاق نے لحہ لحہ انو اور نمرہ کا ساتھ دے کر اپنے ناکردہ گناہ کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہی کی کوششوں سے اکبر علی کے فنڈز وغیرہ حاصل ہوئے تھے۔ انہوں نے بھاگ دوڑ کر کے سامنے والی بستی میں ایک گھر اکبر علی کے فنڈ کے پیسوں میں اور مزید کچھ پیسے شامل کر کے انو اور نمرہ کے لئے خرید دیا تھا۔ شریفن خالہ پہلے ہی اس بستی میں گھر خرید چکی تھیں۔ خوش نصیبی سے انو اور نمرہ کا گھر بالکل

ان کے ساتھ ہی تھا۔ پھر پروفیسر صاحب کی ہی کوششوں سے انو کو اکبر علی کی جگہ نوکری مل گئی تھی۔ گھر اپنا ہو گیا تھا، نوکری بھی لگ گئی تھی۔ اب انو بہت خوش اور مطمئن تھا۔ اب اس کی پوری توجہ نمو کی تعلیم و تربیت کی طرف تھی۔ وہ نمو کو پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا۔

اب نمو چھ سال کی ہو گئی تھی۔ ایک روز انو اس کا ہاتھ تھام کر پروفیسر آفاق کے گھر پہنچا تھا۔ وہ نمو کو کسی سکول میں داخلہ دلوانے کے سلسلے میں پروفیسر آفاق سے مشورے کی غرض سے آیا تھا۔

پروفیسر آفاق چھ سالہ خاموش طبع اور سنجیدہ سی نمو کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے، تب ہی ہنستی مسکراتی فریال کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ وہ بھی نمو کی ہم عمر ہی تھی۔

''ارے بیٹا فری! ان سے ملو۔ یہ نمو ہیں۔'' آفا احمد نے نمو کا تعارف کروایا تھا اور گول مٹول سی سانولی سلونی فریال، نمو کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ یہ گوری چٹی، انتہائی دلکش سی لڑکی اسے بہت اچھی لگی تھی۔

''تم نمو ہو؟'' اس نے نمو سے سوال کیا تھا۔

''نمرہ علی۔'' نمو نے سنجیدہ اور باوقار انداز میں جواب دیا تھا۔ ''مگر میرے بھیا اور شریفن خالہ مجھے نمو کہتے ہیں۔''

''تو کیا میں بھی تمہیں نمو کہہ سکتی ہوں؟'' فریال نے سوال کیا۔

''ہاں کیوں نہیں؟'' نمو نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا تم مجھ سے دوستی کرو گی؟'' فریال نے اپنا ہاتھ نمو کی طرف بڑھایا۔

نمو نے اجازت طلب نظروں سے بھائی کی طرف دیکھا تھا اور انو نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلانے پر اس نے پُرخلوص انداز میں فریال کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''آج سے ہم دونوں فرینڈز ہیں۔'' فریال نے مسرت بھرے انداز میں اعلان کیا تھا اور تب سے آج تک ان دونوں کی مثالی دوستی قائم تھی۔ پہلی کلاس سے تا حال یعنی میٹرک تک پہنچنے تک وہ دونوں ایک ہی کلاس اور ایک ہی سکول میں پڑھتی چلی آئی تھیں۔ وہ ایک ساتھ جاتی اور ایک ساتھ ہی واپس آتی تھیں۔ فریال کا گھر آنے کے بعد نمرہ اکیلے ہی اپنے گھر کے لئے چل دیتی تھی۔ گلی کے موڑ تک پہنچتے پہنچتے نمرہ پسینے میں شرابور ہو چکی تھی۔ گلی کے سرے پر کھڑے برگد کے گھنے پیڑ کے ٹھنڈے تسکین آمیز سائے نے کچھ لمحوں کے لئے اسے اپنی شفقت بھری آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔ اس کا بچپن اسی پیڑ کے سائے میں کھیلتے ہوئے گزرا تھا۔ جانے کیوں یہ بوڑھا برگد ہمیشہ ہی اسے بہت اپنا اپنا سا لگتا تھا۔ وہ پیڑ کی مشفق چھاؤں میں ساعت بھر کو تھم کر گہری سانس لیتے ہوئے اپنے گھر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

تالا کھول کر وہ جونہی اندر داخل ہوئی، پیچھے سے ہاتھ میں سالن کا کٹورا لئے شریفن خالہ بھی آ گئی تھیں۔ آج کل انو کا ہاتھ بہت تنگ تھا۔ گھر کا آنگن کچا تھا، صفائی ستھرائی میں نمو کی پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے انو نے آفس سے کچھ ایڈوانس لے کر آنگن کا فرش پکا کروا دیا تھا۔ اب تنخواہ سے ایک مخصوص رقم ایڈوانس کی مد میں کٹ جاتی تھی۔ دوسرے نمو کے سالانہ امتحان کی فیس وغیرہ کے اخراجات کو مدنظر رکھتے ہوئے انو نے ایک چھوٹی سی کمیٹی بھی ڈال لی تھی۔ اس کی قسط بھی جاتی تھی۔ ان اضافی اخراجات کے باعث آج کل نہایت تنگی ترشی کا سامنا تھا۔

''کپڑے بدل کر جلدی سے باورچی خانے میں آ جا۔'' شریفن خالہ ان کے ہر مسئلے اور پریشانی کی ساتھی تھیں۔ موجودہ حالات کا احساس کر کے دوپہر کو نمو کے لئے وہ اپنے گھر سے ہی سالن لے آیا کرتی تھیں۔ روٹیاں تو نمو صبح ہی پکا جایا کرتی تھی۔

کپڑے تبدیل کر کے ٹینکی کے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے منہ دھو کر آنگن کے بیچوں بیچ بندھی الگنی پر لٹکتے تولیہ سے منہ

خشک کرتی جب وہ باورچی خانے میں پہنچی تھی تو شریفن خالہ چھوٹی سی دری بچھا کر اس پر سالن کا کٹورا اور روٹی کی چنگیر رکھ چکی تھیں۔

''خالہ! آپ یہ سب کیوں کرتی ہیں؟'' نمو نے قدرے شرمندہ سے لہجے میں کہا تھا۔ ''روز منع کرتی ہوں، یوں ہر روز سالن مت لایا کیجئے۔ مگر آپ سنتی ہی نہیں۔''

''میرا بس چلتا تو میں اپنی لاڈلی کو ہیرے موتی کے نوالے کھلاتی۔'' شریفن خالہ نے اس کے ناراض چہرے کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے ممتا بھرے لہجے میں کہا۔

شریفن خود بھی ایک غریب عورت تھی۔ انکم کا کوئی باقاعدہ ذریعہ نہ تھا۔ مرحوم شوہر کے فنڈز اور اپنا سب جمع جتھا لگا کر اس نے یہ چھوٹا سا گھر خرید لیا تھا۔ جہاں تک گزارے کا تعلق تھا تو اس کا گزارہ بھی بے حد کھینچ تان کر اور تنگی سے ہی ہوتا تھا۔ نمو نے غصہ بھلا کر ممنون اور محبت بھری نگاہوں سے شریفن خالہ کو دیکھتے ہوئے مشکور لہجے میں کہا۔

''آپ کے ہاتھ کی پکی ہوئی یہ دال بھی میرے لئے ہیرے موتیوں سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ اس میں آپ کی محبت اور ممتا شامل ہے۔''

شریفن خالہ نے آگے بڑھ کر اس کی شفاف صندلی پیشانی چوم لی تھی۔ ''چل اب جلدی سے کھانے بیٹھ جا۔ آج تو غضب کی گرمی ہے۔'' انہوں نے آٹے کے کنستر پر رکھا گتے کا ٹکڑا اٹھا کر پنکھا جھلتے ہوئے دال کا کٹورا نمو کی طرف کھسکایا۔ کمروں کی نسبت باورچی خانہ اس لئے بھی ٹھنڈا رہتا تھا کہ آنگن کے کونے میں کھڑے نیم کے پیڑ کا سایہ چھت پر پڑتا تھا۔ دروازہ اور پچھلے روشن دان سے ہوا بھی کراس ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں خاصی ٹھنڈک اور عافیت محسوس ہوتی تھی۔

''آج فریال اسکول آئی تھی؟'' گتے کے پنکھے کا رخ نمو کی طرف کر کے انہوں نے برسرِ تذکرہ پوچھا۔

''جی۔'' نمو نے نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا۔ ''کہہ رہی تھی، دھوپ بہت تیز ہے، رُک جاؤ، شام کو پاپا چھوڑ آئیں گے۔'' نمو لمحہ بھر کو تھمی۔ ''پر میں نے منع کر دیا۔ کہا کہ شریفن خالہ انتظار کر رہی ہوں گی، اس وقت چلی جاتی ہوں، موقع ملا تو شام کو بھیا کے ساتھ آ جاؤں گی۔ دراصل فریحہ آپی کے شادی کے جوڑے لگائے جا رہے ہیں نا۔''

''اچھا۔'' شریفن خالہ نے مسرور انداز میں سر ہلایا۔ ''شادی کی تیاریاں کہاں تک پہنچیں؟ کام کا خوب زور ہو گا۔''

''جی۔'' نمو نے تائید بھرے انداز میں سر ہلایا۔ ''اب شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔''

''شادی جون میں ہے نا؟'' شریفن خالہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

''جی۔'' نمو نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اللہ مبارک کرے۔'' شریفن خالہ نے پُرخلوص لہجے میں دعا دی۔ ''پروفیسر صاحب اور ان کی بیگم دونوں ہی بڑے بھلے مانس ہیں، خدا انہیں اور ان کی اولاد کو خوش رکھے۔''

''آمین۔'' نمرہ نے بھی اسی خلوص بھرے لہجے میں کہا اور پانی کا گلاس اٹھا لیا۔ کھانے کے بعد وہ دونوں کمرے میں آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ نمو نے پیڈسٹل فین آن کر کے دروازہ ذرا سا بھیڑ دیا تھا۔ دھوپ کو آڑ ملتے ہی کمرے میں ٹھنڈا پُرسکون سا ملگجا اندھیرا پھیل گیا تھا۔

''ذرا دیر کو لیٹ جا۔ تھک گئی ہو گی۔'' شریفن خالہ نے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کو لیٹنے کے لئے کہتے ہوئے خود سامنے پڑی چوکی سنبھال لی تھی۔ آج انہیں کہیں نہیں جانا تھا۔ اس لئے نمرہ کے پاس باتیں کرنے کو بیٹھ گئی تھیں۔ شریفن خالہ کے اکلوتے بھائی ہندوستان میں ان کے آبائی شہر کان پور میں رہائش پذیر تھے اور ایک عرصے

سے بہن کو اپنے پاس بلا رہے تھے۔'' سوچ رہی ہوں، کان پور کا ایک چکر ہی لگا لوں۔'' باتوں باتوں میں انہوں نے نمو کی طرف دیکھتے ہوئے پُرسوچ لہجے میں کہا۔'' بھلا زندگی کا کیا بھروسہ؟ جیتے جی ایک بار پھر سے ماں جائے کا منہ دیکھ آؤں۔ اٹھارہ برس بیت گئے اس کا چہرہ دیکھے۔''

'' آپ کو ضرور جانا چاہئے۔'' ان کے لہجے میں رچی یاسیت کو محسوس کر کے نمو نے فیصلہ کن لہجے میں مشورہ دیا تھا اور پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد افسردہ لہجے میں بولی تھی۔'' لیکن یہ تو ہے کہ آپ کے جانے کے بعد انو بھیا اور میں ایک دم سے اکیلے ہو جائیں گے۔''

'' میں نے اس اکیلے پن کا علاج سوچ رکھا ہے۔'' شریفن خالہ اُس کا اُداس چہرہ دیکھتے ہوئے رازدارانہ انداز میں ذرا نیچی آواز میں بولیں۔'' کئی ایک اچھی لڑکیاں میری نظر میں ہیں۔ سوچ رہی ہوں کہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ انو کا بیاہ کروا دوں۔ اب انہیں ہوگی تو بھلا پھر کس عمر میں شادی ہوگی؟''

'' انو بھیا کی شادی؟'' نمو فورِ شوق سے اُچھل پڑی۔'' سچی خالہ؟...... آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں تو کتنا کہتی ہوں مگر بھیا اس موضوع پر کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہوتے۔''

'' تُو فکر مت کر۔ میں خود اس سے بات کروں گی۔'' شریفن خالہ نے مدبرانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے مضبوط اور پُر یقین لہجے میں کہا۔'' دیکھتی ہوں کیسے نہیں سنتا۔''

باہر تپتی دوپہر، سہ پہر کے آنچل میں پناہ لیتی سرمئی شام کی اور چل دی تھی۔ اندر نمو اور شریفن خالہ، انو کی شادی کے دل خوش کن موضوع پر محوِ گفتگو تھیں۔ نمو کے ننھے سے دل میں بھائی کی شادی کے لئے کیسے کیسے ارمان مچل رہے تھے۔ چاند سی بھابی کی تمنا، ننھے منے بھتیجے بھتیجیوں کی آرزو۔ آج شریفن خالہ نے یہ ذکر چھیڑا تو اس کا دل بلّیوں اُچھلنے لگا تھا۔

'' خالہ! آج آپ ضرور بہ ضرور بھیا سے بات کیجئے گا۔''

'' آج تو میں اسے راضی کر کے ہی دم لوں گی۔'' شریفن خالہ نے پُرعزم لہجے میں کہا۔'' تُو آنے تو دے اُسے۔''

'' جانے آج اُنہیں کیوں دیر ہوگئی؟'' نمو نے دیوار پر لگی گول وال کلاک کی طرف دیکھا جس کے بیچوں بیچ ایک مشہور کمپنی کا نام لکھا ہوا تھا۔

'' پورا شہر کھدا پڑا ہے۔ جگہ جگہ ٹریفک جام ہو رہا ہے۔ کہیں وہ بھی غریب بس میں پھنسا ہوا ہوگا۔'' شریفن خالہ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ اور تب ہی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

'' لو آ گیا۔'' یک لخت شریفن خالہ نے مسرور لہجے میں کہا تھا۔'' ماشاءاللہ خوب عمر پائی ہے۔''

نمو جلدی سے اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی انو مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔

'' سلام بھیا!'' نمو نے مسرور لہجے میں سوال کیا۔

'' جیتی رہو۔ ہمیشہ کامیاب اور خوش رہو۔'' انو دل کی گہرائیوں سے دعا کے پھول برساتا نمو کے سر پر ہاتھ پھیرتا کمرے کی طرف چلا۔

'' آپ اندر چل کر بیٹھئے۔ میں چائے لا رہی ہوں۔'' نمو نے کچن کی طرف قدم بڑھائے۔

'' سلام خالہ!'' کمرے میں داخل ہوتے ہی انو کی نظر، شریفن خالہ پر پڑی تھی، جلدی سے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔

'' جیتے رہو۔ ماشاءاللہ بڑی عمر پائی ہے۔ ابھی میں اور نمو تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے۔'' شریفن خالہ نے سلام کا جواب دے کر خوشگوار لہجے میں کہا۔

'' اچھا۔'' انو بے ساختہ مسکرا دیا۔'' شریفن خالہ! میں تو اللہ سے بس اتنی زندگی مانگتا ہوں کہ اپنی نمو کو پڑھا لکھا کر

ڈاکٹر بنا کر اس کو اس کے گھر رخصت کر دوں۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''

''وہ تو اِن شاء اللہ! پڑھ لکھ کر اپنے سسرال رخصت ہو ہی جائے گی، مگر کبھی اپنے بارے میں بھی کچھ سوچا ہے؟'' شریفن خالہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''اپنے بارے میں کیا سوچنا ہے؟'' انو حیران ہوا۔

''ارے بھئی..... اپنی شادی بیاہ کے بارے میں بھی کچھ سوچا ہے؟'' شریفن خالہ زِچ ہو کر بولیں۔ شریفن خالہ کی بات سن کر انو نے ٹپٹا کر نگاہیں جھکا لی تھیں۔ ''میں جواب کا انتظار کر رہی ہوں۔'' خالہ نے قدرے خفا لہجے میں کہا۔

''خالہ! فی الوقت تو میرے سامنے صرف نمو کی پڑھائی اور اس کا استقبال ہے۔''

''بہن کے بارے میں سوچتے ہو..... یہ اچھی بات ہے۔'' شریفن خالہ تعریفی لہجے میں بولیں۔ ''مگر اب اپنے بارے میں بھی سوچنے کا وقت آ گیا ہے انو!'' لحظہ بھر کو تھم کر انہوں نے تنقیدی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''خیر سے تُو 32، 33 کا ہونے کو آیا ہے۔ اب بھی تیری شادی نہیں ہوئی تو آخر پھر کب ہو گی؟''

انو کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کیونکہ اس نے کبھی اس موضوع پر سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کی تو ہر سوچ نمرہ سے شروع ہو کر نمرہ پر ہی ختم ہو جاتی تھی۔ انو کو سوچ میں ڈوبتے دیکھ کر شریفن خالہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ تیر نشانے پر لگا ہے۔ لوہے کو گرم دیکھ کر انہوں نے اسی وقت بھرپور ضرب لگانے کا فیصلہ کیا۔

''آج کل میری نظر میں ایک بہت اچھی لڑکی ہے۔ تم کہو تو میں تمہارے رشتے کی بات چلاؤں؟''

''خالہ! پہلے نمو کی پڑھائی مکمل ہو جائے۔ اس کا کہیں شادی کا بیاہ کا سلسلہ ہو جائے..... پھر.....'' انو نے سر جھکا کر دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ''اس کے بعد..... پھر..... میں.....''

''دیکھو بیٹا!'' شریفن خالہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ ''اللہ نے چاہا تو نمو پڑھ لکھ بھی لے گی اور وقت آنے پر ان شاء اللہ اس کا بیاہ بھی ہو جائے گا۔ فی الحال تو تمہاری شادی کا ذکر ہے۔'' چند لمحوں تک خاموش رہ کر وہ دوبارہ گویا ہوئیں۔ ''خیر سے نمو اب سیانی ہو گئی ہے۔ تم دیر سویر سے آتے ہو، میں بھی بھائی کے پاس جانے کے لئے پَر تول رہی ہوں۔ نمو کا اس عمر میں گھر میں اکیلے رہنا مناسب نہیں ہے۔ گھر میں تمہاری دُلہن آ جائے گی، تمہیں بھی گھر اور نمو کی طرف سے بے فکری ہو جائے گی اور میں بھی اطمینان سے بھائی کے پاس انڈیا جا سکوں گی۔''

شریفن خالہ کے دلائل معنی رکھتے تھے مگر انو کی مجبوری اپنی جگہ اہم تھی۔

''خالہ! تم میری تنخواہ کے بارے میں تو جانتی ہو۔'' وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔ ''اس تنخواہ میں ہم دونوں کی دال روٹی ہی کس مشکل سے چلتی ہے۔ آپ سے تو کچھ چھپا نہیں۔ اب ان حالات میں، میں ایک اور کا اضافہ کر لوں؟''

''آنے والی اپنے نصیب لائے گی۔'' شریفن خالہ نے متوکل لہجے میں جواب دیا۔ ''کسی کے رزق کے لئے فکر کرنے والے ہم تم کون ہوتے ہیں؟..... اللہ سب کا رازق ہے۔ وہی بڑا بادشاہ ہے۔''

انو نے سر جھکا لیا۔

''یہی نوکری تھی..... اور تیری تنخواہ سے کہیں کم تنخواہ۔'' انو کو پگھلتا دیکھ کر شریفن خالہ نے مزید پُر زور انداز سے حملہ کیا۔ ''مانا کہ وہ اتنا مہنگا زمانہ نہ تھا مگر پھر بھی اللہ بخشے بھائی اکبر علی کو..... اس نے گھر بار، بیوی بچے سب ہی اچھے طریقے سے چلائے۔ غریبوں کی کیا شادیاں نہیں ہوتیں؟''

''وہ تو سب ٹھیک ہے خالہ! مگر.....'' انو ہتھیار ڈالنے والے انداز میں خاموش ہو گیا۔

''بس اب میں کچھ نہیں سنوں گی۔'' شریفن خالہ نے فیصلہ کُن انداز میں ہاتھ اٹھا کر دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''گھر،

گھرانہ، لڑکی مجھے سب پسند ہے۔ اب تجھے میری بات ماننی ہوگی۔''

انو سے کچھ جواب نہیں بن پڑا۔ وہ جوں کا توں سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ نمو چوکور ٹرے میں چائے کے تین مگ دھرے کمرے میں داخل ہوئی تو ہر سمت گمبھیر خاموشی محسوس کر کے سوالیہ نظروں سے خالہ شریفن کی طرف دیکھنے لگی۔ انو کی خاموشی کو نیم رضامندی پر محمول کرتے ہوئے خالہ شریفن، نمو کو مخاطب کر کے مسرت آمیز لہجے میں بولیں۔

''ذرا میں لڑکی والوں کا عندیہ لے لوں، پھر تجھے لے چلوں گی۔ تُو اپنی بھابی کو دیکھ لینا۔''

نمو کا چہرہ فرطِ مسرت سے دمکنے لگا۔ پہلے اس نے حیران نظروں سے انو کو، پھر تصدیق طلب نگاہوں سے خالہ شریفن کی طرف دیکھا۔

''سچ...... بھیا مان گئے؟'' اس کے لہجے سے بے یقینی جھلک رہی تھی۔

''لو! مانیں گے کیوں نہیں؟'' خالہ شریفن نے مسکرا کر کہا۔ ''اوپر والے نے جو وقت مقرر کیا ہوا ہے، جب وہ وقت آ جاتا ہے تو سب ہی کو سر جھکانا پڑتا ہے۔''

''سچ خالہ......!'' نمو کی آنکھوں سے مسرت روشنی بن کر پھوٹنے لگی۔ ''میں آپ کا منہ میٹھا کروانے کے لئے کچھ لاتی ہوں۔'' وہ خوشی سے اُچھلتی باورچی خانے کی طرف دوڑی اور انو نے جھینپ کر مزید سر جھکا لیا۔ شریفن خالہ کی باتوں نے آج اس کے سامنے سوچ کا ایک نیا دریچہ کھول دیا تھا۔ ایک بالکل نیا سا، انوکھا سا احساس رگ و پے میں سرسراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ دھڑکنوں میں کچھ نئی سی، انجانی سی آہٹیں جاگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور نمو نے اسی شام پروفیسر صاحب کے گھر جا کر فریال کو یہ خوشخبری سنائی دی۔

''اچھا......؟'' فریال بھی کِھل اُٹھی تھی۔ ''آخر انو بھیا شادی کے لئے مان ہی گئے۔''

''ہاں۔ لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔'' نمو نے مسرت بھری آواز میں جواب دیا۔

''تو پھر کب تک آ رہی ہیں ہماری بھابی صاحبہ؟'' فریال نے پُر اشتیاق لہجے میں سوال کیا۔

''اب دیکھو۔'' نمو نے لاعلمی کے اظہار کے لئے کندھے اچکائے۔ ''ابھی تو وہ راضی ہوئے ہیں۔''

''بس راضی ہونے میں ہی دیر لگتی ہے۔'' فریال نے شوخ لہجے میں اپنا فلسفہ بیان کیا۔ ''ورنہ تو قاضی کے آنے میں بالکل دیر نہیں لگتی۔''

فریال کی بات پر نمو بے ساختہ ہنس پڑی تھی اور فریال نے بھی ہنسی میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ پھر وہ دونوں اسی طرح ہنستی، باتیں کرتی اندر لاؤنج میں جا بیٹھی تھیں۔ فریحہ کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ آج اس کی شادی کے جوڑے لگانے کا پروگرام تھا۔ فریال نے فرش پر دری بچھا کر کپڑوں کا ڈھیر ڈال دیا تھا۔ نمو استری کا پلگ لگا کر کپڑوں پر استری کرنے کو کھڑی ہوگئی تھی۔ ہلکے گہرے رنگوں کے ریشمی، جیری، سادہ، ہلکے، بھاری سوٹ، کسی پر سلمٰی دبکے کا کام تھا تو کسی پر مروڑی اور نلکیوں کا نفیس گلا بنا تھا۔ گوٹے کناری کے دوپٹے اور تن چوئی اور بنارسی ساڑھیاں۔ وہ نہایت احتیاط، سلیقے اور قاعدے سے کپڑوں پر استری کر کے انہیں تہہ کر کے پلاسٹک کی تھیلیوں میں پیک کرتی جا رہی تھی۔ کتنے ہی مختلف اور منفرد انداز میں نت نئے طریقوں اور نوع بہ نوع انداز میں اس نے جوڑے ٹانکے تھے۔ فریحہ بیگم خود حیران رہ گئی تھیں۔

''واہ نمو! کس قدر خوبصورت انداز میں جوڑے لگائے ہیں تم نے۔ دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔'' وہ پُر ستائش نظروں سے ایک ایک جوڑا اُٹھا کر دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''غضب کا آرٹسٹک دماغ رکھتی ہو تم...... سچ! جس گھر جاؤ گی، اس گھر کو جنت بنا دو گی۔''

''شکریہ آنٹی!'' اس نے جھینپ کر شکریہ ادا کیا اور فریال کا ہاتھ تھام کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

''سچ۔ ایسے ہی لمحوں میں تو ممی کو بیٹا نہ ہونے کا ملال ہوتا ہے۔'' باہر نکلتے ہی فریال نے شریر لہجے میں کہا۔ ''اب ان کا اگر کوئی بیٹا ہوتا تو وہ تمہیں اس گھر میں لا کر، اس گھر کو جنت بنا لیتیں۔''

''یہ گھر پہلے سے ہی کسی جنت سے کم نہیں ہے۔'' نمو نے سچے لہجے میں کہا اور وہ دونوں ہنس پڑیں۔ فریحہ کی ہونے والی ساس ارجمند بانو، اس کی سگی پھوپھی بھی تھیں۔ انہوں نے بچپن میں ہی اسے اپنے بڑے بیٹے ظفریاب کے لئے مانگ لیا تھا۔ گو کہ پروفیسر آفاق بچپنے کے اس طرح کے رشتوں کے حق میں نہ تھے مگر اکلوتی اور چہیتی بہن کی خواہش کو ردّ نہ کر سکے تھے۔ اور ارجمند بانو نے جھٹ سے سونے کی ننھی سی دمکتی ہوئی انگوٹھی فریحہ کی نازک سی انگلی میں پہنا دی تھی، جس پر ظفریاب کا نام کندہ تھا۔

''مام! اس پر تو ظفر بھیا کا نام لکھا ہے۔'' سات سالہ اظفر نے حیرانی سے ماں سے سوال کیا تھا۔ ''آپ نے ان کے نام والی یہ انگوٹھی فریحہ کو کیوں پہنا دی؟''

''ظفر کے نام کی انگوٹھی پہننے سے اب یہ ہماری ہو گئی ہیں۔'' ارجمند بانو نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

''تو آپ میرے نام کی ایک انگوٹھی فری کو بھی پہنا دیں نا۔'' اظفر نے سنجیدگی سے فرمائش کی تھی۔ ''تاکہ فری بھی ہماری ہو جائے۔''

سات سالہ اظفر کو پانچ سالہ گول مٹول سی سانولی سلونی، شوخ و شریر فریال بے حد اچھی لگتی تھی، اس لئے انہوں نے اپنی اس معصومانہ آرزو کا اظہار کر دیا تھا۔ ان کی بات سن کر سب ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے اور یہ بات سمجھے بِنا ننھی فریال بھی سب کے ساتھ ہنس پڑی تھی۔ اس بات کو برسوں بیت چکے تھے۔ لڑکوں کی تعلیمی مصروفیات اور میاں کے کاروباری مسائل کی وجہ سے ارجمند بانو تب کی گئی پھر دوبارہ سے وطن نہ آ سکی تھیں۔ اب جبکہ ظفریاب تعلیم مکمل کر کے عملی زندگی میں قدم رکھ چکے تھے تو وہ برسوں بعد اب اپنی امانت کو اپنی بہو بنا کر لے جانے کے لئے آنے والی تھیں۔

''ارجمند آنٹی اور ظفر بھائی کے ساتھ وہ بھی آئیں گے نا؟'' اور گنزہ کے ارغوانی دوپٹے پر چمپا ٹانکتے ہوئے بالکل اچانک ہی نمو نے فریال سے سرگوشی سے پوچھا تھا۔

''کون.....؟'' فریال نے چونک کر بے ساختہ سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ ''عالم تاب انکل؟''

''وہ تو خیر آئیں گے۔'' نمو قدرے شوخ ہوئی۔ ''میں عالم تاب انکل کے چھوٹے صاحبزادے کے بارے میں پوچھ رہی تھی، جنہوں نے محض سات برس کی عمر میں تمہاری انگلی میں اپنے نام کی انگوٹھی پہنا کر تمہیں اپنا بنانے کی فرمائش کی تھی۔'' یہ بات بھی فریال نے ہی نمو کو بتائی تھی، اس وقت اس کے منہ سے شریر انداز میں یہ بات سن کر فریال بے ساختہ جھینپ گئی تھی اور نمو بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

❀===❀===❀
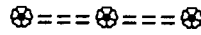
گو کہ وحید الدین کا دعویٰ تھا کہ فہیم وارثی وکیل، رشید کو دو دن میں جیل سے رہا کروا دے گا مگر رشید کو ضمانت پر رہا ہونے میں بھی پورے پانچ دن لگ گئے تھے۔ ان پانچ دنوں میں وحید اور قمر النساء نے جس طرح اس کی ماں کا خیال رکھا تھا اور وکیل وارثی کی مدد سے اس کی رہائی کے لئے جس طرح دوڑ دھوپ کی تھی، ان سب باتوں نے سلطانہ نے زیادہ اسے متاثر کیا تھا۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد وحید کے ساتھ وہ پہلے وارثی کے آفس آیا تھا۔ وارثی کو وہ خاصا کام کا آدمی دکھائی دیا تھا، اسی لئے اس نے جیل میں بھی کئی بار اس سے ملاقات کی تھی اور اس وقت بھی بہت مان اور شان سے اسے اپنے ساتھ آفس لے کر پہنچا تھا۔ وہ رشید جیسے ذہین اور نڈر لڑکے کو اپنا آلۂ کار بنا کر خود فائدہ اٹھانے کا سوچ رہا تھا۔ اسی لئے یہ سب آؤ بھگت تھی۔ مگر وحید الدین پر وہ یہی ظاہر کر رہا تھا کہ چونکہ رشید اس کا پڑوسی ہے اور وہ اپنی بیٹی کی شادی اس

سے کرنا چاہتا ہے، اسی لئے وہ رشید کو اتنی اہمیت دے رہا ہے۔

وکیل وارثی کے آفس سے وحید الدین، رشید کو اپنے ساتھ گھر لا یا تھا۔

''وحید بھائی! پہلے میں ذرا اماں سے.....'' رشید نے وحید کے دو منزلہ پختہ مکان کے سامنے رک کر گلی میں واقع اپنے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے التجا بھرے لہجے میں کہا۔ ''وہ پریشان ہو رہی ہوں گی۔''

''وہ بالکل پریشان نہیں ہو رہیں۔'' وحید مسکرایا۔ ''بلکہ مزے سے بیٹھی تمہاری خالہ اور زیبا سے باتیں کر رہی ہیں۔'' اس نے لحظہ بھر کو رک کر رشید کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ کل رات کو ہی تمہاری خالہ جا کر انہیں گھر لے آئی تھیں۔ اس وقت وہ یہیں ہیں۔'' اس نے ہاتھ سے گھر کی جانب اشارہ کیا اور آگے بڑھ کر ڈور بیل پر انگلی رکھ دی۔ اندر برآمدے میں گھنٹی زور سے بجی۔ مگر جواب میں سناٹا طاری رہا۔ وحید نے دوبارہ بٹن دبایا۔ اس بار بٹن دبانے کا یہ عمل پہلی بار کی نسبت زیادہ دیر تک چلا تھا۔

''ارے کون پاگلوں کی طرح گھنٹی بجائے جا رہا ہے؟'' دروازے کے اس پار سے اس کی بیوی قمرن کی تیز آواز سنائی دی۔ پھر اگلے ہی لمحے اس نے دھڑ سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے وحید کو کھڑے دیکھ کر یقیناً وہ اسے ڈانٹتی مگر اس کے پیچھے کھڑے رشید کو دیکھ کر اس نے بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پا کر چہرے پر مسرت کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا تھا۔

''آئے میں صدقے...... میرا رشید بابو آ گیا۔'' پھر وہ اندر کی طرف منہ کر کے زور سے بولی تھی۔ ''اے سلطانہ آپا! ذرا آ کر دیکھ تو......کون آیا ہے......اری او زیبن! ذرا تُو بھی تو باہر نکل۔''

''ارے راستہ بھی دو گی یا یونہی دروازے کے بیچ کھڑی سب کو بلاتی رہو گی؟'' وحید نے اسے ایک طرف کرتے ہوئے کہا اور رشید کو لئے اندر داخل ہو گیا۔ آواز سنتے ہی سلطانہ اور زیبا دونوں ہی باہر آ گئی تھیں۔ سلطانہ، بیٹے کی شکل دیکھتے ہی دیوانہ وار آگے بڑھی تھیں اور تقریباً دوڑتے ہوئے آگے بڑھ کر رشید کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا تھا۔

'ہونہہ......' برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑی زیب النساء نے منہ بنا کر سوچا تھا۔ 'دیکھو تو ذرا بڑھیا کو، کیسے بیٹے کا سواگت کر رہی ہے جیسے جیل سے نہیں وہ دوبئی سے پیسے کما کر لوٹ رہا ہے۔'...... ''اری تُو وہاں کیوں کھڑی ہے؟ آ کر سلام کر۔'' قمرن نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''ارے آ نا۔ کاہے سر مار رہی ہے؟'' ماں کے اصرار پر وہ نخوت سے بل کھاتی باہر آئی اور ایک ادائے ناز سے اس نے رشید کی طرف دیکھا۔ مسکراہٹوں کی بجلیاں گراتی اس کی جانب بڑھی۔

''سلام۔'' اس کی آواز پر رشید نے پہلی بار غور سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ گہرے عنابی فٹنگ والی قمیض اور چھوٹے پائنچے کی فیشن ایبل شلوار اور عنابی اور زرد لہریے دار چنے ہوئے دوپٹے میں اس کا گندمی رنگ خوب دمکتا نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر پاؤڈر اور ہونٹوں پر گہرے عنابی رنگ کی لپ اسٹک لگائے وہ کسی تیسرے درجے کی فلموں کی ہیروئن لگ رہی تھی۔ زیبا تو پہلے بھی کئی بار اس پر نظر التفات کر چکی تھی، مگر آج پہلی بار اس نے اسے گہری نظروں سے دیکھا تھا اور وہ اسے بری نہیں لگی تھی۔ قمرن نے کھانے کا بڑا اہتمام کر رکھا تھا۔

کھانے کے بعد وہ ماں کو لے کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ سلطانہ وحید الدین اور قمرن کی ہمدردی اور ساتھ دینے پر ان کی بے حد شکر گزار تھی۔ مگر اب اتنی بھی ممنون احسان نہیں تھی کہ ان کی آوارہ اور بدزبان بیٹی کو بہو بنانے کے لئے آمادہ ہو جاتی۔ اس کی طرف سے کوئی پیش رفت نہ دیکھ کر وحید نے فہیم وارثی سے گزارش کی تھی کہ کسی طرح وہ رشید کو شیشے میں اُتارنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ آج کل رشید بڑی پابندی سے وارثی کے آفس کی حاضری دے رہا تھا۔

''اب کیا سوچا ہے؟'' اسی شام رشید اس کے آفس میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ وارثی مسکراتا ہوا اس کے قریب آ بیٹھا۔
''وہی چھوٹی موٹی چوری چکاری یا.....''
''توبہ کرو یار!'' وہ جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔ ''میں نے تو کان پکڑ لئے ہیں۔''
''اچھا.....تو پھر گزر کیسے ہوگی؟'' وارثی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
''ابھی کچھ سوچا نہیں ہے۔'' رشید نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔
''ویسے میں تمہارے لئے کچھ سوچ رہا ہوں۔'' فہیم وارثی دوستانہ مسکراہٹ سے بولا۔ ''تم جیسے ٹیلنٹڈ آدمی کو ضائع ہوتے ہوئے میں نہیں دیکھ سکتا۔''
''اچھا.....'' رشید تعریف سن کر مسکرایا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''
''وہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم مجھے بتاؤ......شادی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' وارثی نے پوچھا۔
''کس کی شادی کے بارے میں؟'' رشید واقعی نہیں سمجھا تھا۔
''ظاہر ہے، تمہاری شادی کی بات ہو رہی ہے۔''
''میری شادی؟'' رشید ہنسا۔ ''آپ خوب مذاق کرتے ہیں۔ بھلا ان حالات میں شادی کے بارے میں کون سوچ سکتا ہے؟''
''تمہیں سوچنا چاہئے۔'' وارثی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''زیبا کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''
''کون زیبا؟'' رشید کی حیرت بے حد نیچرل تھی۔
''ارے بھئی! اپنے وحید کی بیٹی اور کون؟ پڑھی لکھی ہے، خوش شکل ہے۔ اور سوچو، وحید کے پاس جو کچھ ہے، آخر تو وہ سب تمہارا ہوگا۔ اور سب چیزوں کو چھوڑو، صرف گھر کو ہی لے لو تو اچھا خاصا قیمتی گھر ہے۔'' رشید حیرانی سے آنکھیں پھیلائے وارثی کی باتیں سن رہا تھا۔ ''تم کہو تو میں بات کروں وحید سے؟''
''نن.....نہیں......'' وہ گڑبڑا کر بولا۔
''کیوں؟'' وارثی نے بھنویں سکوڑتے ہوئے پوچھا۔
''شاید اماں نہیں مانیں گی۔'' رشید نے بندوق، ماں کے کندھے پر رکھ دی۔
''کیوں...... بھلا اس رشتے میں کیا قباحت ہے؟'' وارثی ایک کامیاب وکیل تھا اور جرح کے ہنر سے خوب واقف۔
''ہاں یہ تو ہے۔'' رشید نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مگر وہ جو اس کا کیریکٹر ہے۔'' رشید بات مکمل کئے بغیر درمیان میں ہی رک گیا۔
''دیکھو رشید!'' وارثی سنجیدگی سے بولا۔ ''یہ سچ ہے کہ ماضی میں اس سے ایک حماقت ہوئی ہے۔ مگر ذرا اپنی طرف دیکھو، تمہارا ماضی بھی کچھ ایسا دودھ سے دُھلا ہوا نہیں ہے۔ غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔ اور جب تک ہم ایک دوسرے کی غلطیوں سے چشم پوشی کرنا نہیں سیکھیں گے، بھلا آگے کس طرح بڑھ سکیں گے؟ زیبا کی نوعمری کی غلطی کو بھول جاؤ۔ وحید تمہیں بہت پسند کرتا ہے اور تمہیں اپنا داماد بنانا چاہتا ہے۔ اس مشکل وقت میں اس نے تمہارا اور تمہاری ماں کا جس طرح ساتھ دیا ہے، اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو، وہ ہر آڑے وقت میں تمہارے لئے کتنا بڑا سہارا ثابت ہو سکتا ہے۔'' فہیم وارثی کی باتوں میں دم تھا۔ رشید سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔
وارثی کی باتوں سے زیادہ وحید کے مکان اور جمع جتھا نے اسے متاثر کیا تھا اور سب سے بڑھ کر زیبا کے اس دن

کے جلوے نے اس کی سوچ کے زاویے بدل دیئے تھے۔
''اب کیا سوچا ہے؟'' وہ سوچوں میں گم گھر پہنچا تو سلطانہ نے سوال کیا۔
''سوچ رہا ہوں، کپڑا مارکیٹ میں کوئی دکان کرائے پر لے کر کپڑے کی دکان کھول لوں، ابا کی طرح۔''
''ارے کلموہے! تُو اپنے ابا کی طرح ہوتا تو رونا کس بات کا تھا؟'' سلطانہ تنک کر بولی۔
''تمہاری یہی بات مجھے اچھی نہیں لگتی۔'' رشید چڑ کر بولا۔ ''ہر بات پر بسورنے لگتی ہو۔ اب کام کاروبار کی بات کر رہا ہوں تو تب بھی......''
''اے! کام کاروبار...... کیا ہوا میں کرے گا؟'' سلطانہ نے ہاتھ نچا کر پوچھا۔ ''پیسہ کہاں سے آئے گا؟''
''کسی سے اُدھار لے لوں گا۔'' وہ چارپائی پر دھپ سے بیٹھتا ہوا بولا۔ ''تم ذرا وحید خالو سے پوچھو۔''
''اے۔'' سلطانہ نے ہاتھ لہرایا۔ ''وہ تو پہلے ہی سے تجھ پر نظریں جمائے بیٹھا ہے۔''
''کیا مطلب؟'' سمجھ کر بھی رشید انجان بن کر بولا۔
''وہ اپنی بدکردار اور بدزبان بیٹی کو ہمارے گلے باندھنے کی فکر میں ہے۔ یہ ساری محبتیں، عنایتیں یوں ہی بے سبب نہیں تھیں۔''
''اماں......!'' رشید نے سوچتی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ ''آج وکیل بھی یہی بات کہہ رہا تھا۔ اور اس کی بات میری سمجھ میں آئی۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟''
''اے نوج!...... وہ شہر بھر کی آوارہ، لڑاکا...... میں اسے اپنی بہو بناؤں گی؟...... اے میری چٹیا میں اتنے بال نہیں ہیں کہ میں ان ماں بیٹی سے نُچواتی پھروں۔''
''اما! میری ایک بات سنو۔'' رشید، ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''اگر وہ آوارہ تھی تو سوچو کہ تمہارا بیٹا بھی تو چور اُچکا ہے...... نہ گھر در نہ کام کاج...... اس پر بھی وہ بیٹی دینے کو تیار ہیں۔ اور سوچو کہ وحیدالدین کے پاس جو کچھ بھی ہے، کل وہ سب زیبا کے میاں کا ہی ہوگا۔ کیسا پکا مکان ہے۔ اور تو اور آج وہ وکیل بتا رہا تھا کہ دس لاکھ روپے وحید خالو نے ڈیپازٹ کروائے ہوئے ہیں۔''
''دس لاکھ؟'' سلطانہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ماں کو محض متاثر کرنے کی خاطر اس نے یہ بے نشان تیر چھوڑا تھا جو ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ سلطانہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اب بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ زیبا کے فرار کا قصہ پورے محلے میں زبان زد عام تھا۔ قمرن اور زیبا کی بدزبانی اور لڑاکا فطرت سے پورا محلّہ ڈرتا تھا۔ مگر سلطانہ ان دونوں باتوں سے خائف نہیں تھی۔ کیونکہ وہ اپنی صلاحیتوں سے بھی خوب واقف تھی۔ اگر زیبا اور اس کی ماں سیر تھیں تو وہ خود سوا سیر، ڈر تھا تو اسے صرف اس بات کا کہ کہیں زیبا اپنے ناز انداز سے اس کے ہاتھوں سے اس کا بیٹا نہ نکال لے جائے۔ ایک رشید ہی تو اس کے بڑھاپے کا سہارا ہے۔ جیسا بھی تھا، اسے بے حد عزیز تھا۔ وہ ساری رات بستر پر پڑی کروٹیں بدلتی رہی تھی اور اس موضوع کے ایک ایک پہلو پر غور کرتی رہی تھی۔
''ہاں...... کیا رہا؟'' اگلے دن صبح کو وہ وکیل وارثی کے پاس پہنچا تو اس نے پہلا سوال یہی کیا۔ آج کل وارثی، رشید کو بینک سے قرض لے کر کاروبار کے طریقے سمجھا رہا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ اس کے پاس آیا تھا۔
''اماں سے میں نے بات تو کی ہے۔ میرا خیال ہے وہ مان جائیں گی۔'' رشید نے جواب دیا۔
''شاباش!'' وارثی نے پُرجوش انداز میں اس کی پیٹھ تھپکی۔ ''تمہیں ایک بات بتاؤں۔ تم میں ایک زبردست صلاحیت ہے۔ تم کچھ بھی کرنا چاہو، ناکام نہیں ہو سکتے۔ جس طرف بھی نکلو گے، راستہ بنا لو گے۔ جو چاہو گے، حاصل کر

لو گے۔''

''اچھا؟'' رشید نے حیرانی سے وارثی کی طرف دیکھا۔ ''یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟''

''ارے جناب! ہم نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔'' وارثی کالر کو چھو کر ہنسا اور رشید حیران نظروں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ ''چلو چھوڑو یہ سب باتیں۔ اب کچھ کام کی باتیں کر لیں۔'' وارثی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''اس ہفتے بینک سے تمہارا لون سینکشن ہو جائے گا۔ تم کوئی دکان دیکھ لو۔ فی الحال تو کرائے پر لو۔ مگر مجھے امید ہے کہ جلد ہی تم وہ دکان خریدنے کے قابل ہو جاؤ گے۔''

''واقعی......؟'' رشید نے ایک بار پھر پلکیں پٹپٹائیں۔

''یار! خود پر بھروسہ کرنا سیکھو۔ اور اپنی صلاحیتوں کو پہچانو۔ تم کوئی عام آدمی نہیں ہو۔''

رشید نے اب کی بار کوئی جواب نہیں دیا۔ بس حیران اور بے یقین نظروں سے اس کی جانب تکتا رہا۔

''تمہارے لئے ایک اور کام بھی سوچا ہے میں نے۔'' وارثی اس کے قریب کھسکتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''بس ذرا ہمت پکڑنی ہوگی تمہیں۔''

❀===❀===❀
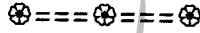
سطوت جہاں اُمید سے تھیں، یہ خبر سن کر عاتکہ بیگم خوشی سے جھوم اُٹھی تھیں۔ اُن کے سُونے آنگن میں پھول کھلنے والا تھا۔ گھر کی خاموش فضا میں زندگی سے معمور قلقاریاں گونجنے والی تھیں۔ ننھے سے، گوتھنے سے پوتے کے تصور سے ہی ان کے دل میں محبت کے سوتے سے پھوٹ پڑے تھے۔ گو کہ انہوں نے اپنی زبان پر چپ کی مُہر لگا دی تھی، سطوت کی کسی بھی دل دُکھانے والی بات اور آزار پہنچانے والی حرکت پر وہ حرفِ شکایت لبوں پر نہیں لاتی تھیں۔ مگر اس خوشخبری کے بعد سے تو جیسے ان کے دل میں جنم لینے والا کبھی کبھار کا ہلکا سا شکوہ بھی مٹ گیا تھا۔ وہ سطوت کی بدتہذیبیوں کو بھول کر اس کی دل جوئی اور ناز برداری میں لگ گئی تھیں۔ خود وجاہت مرزا بھی اس خبر سے بے حد خوش تھے۔ وہ سطوت کا خیال اب پہلے سے بھی زیادہ رکھنے والے تھے۔ گھر میں ہوتے تو تمام وقت اس کی ناز برداریوں میں لگے رہتے۔

اتنی اہمیت، اتنی محبت دیکھ کر خود سطوت بھی مسرور تھی۔ ماں بننا ہر عورت کا عزیز ترین خواب ہوتا ہے۔ اور جب اس خواب کی تعبیر سامنے آنے لگے تو مسرور ہونا لازمی امر ہے۔ سطوت کی والدہ حشمت جہاں بھی اس خبر سے مسرور ہوئی تھیں۔ صاحبِ اولاد ہونے کے بعد ہی شادی شدہ زندگی کی تکمیل ہوتی ہے۔ میاں بیوی کے درمیان اولاد ایک مضبوط زنجیر کی صورت رشتے کو مضبوط اور پائیدار بنا دیتی ہے۔ گو کہ حشمت جہاں کو سطوت کے مستقبل کی طرف سے ذرّہ بھر کوئی فکر یا پریشانی نہ تھی کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ وجاہت مرزا ایک اعلیٰ خاندان کے فرد ہیں اور خاندانی مرد کیسی بھی بیوی مل جائے، حتیٰ الوسع نبھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور بیوی کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی جدوجہد میں لگے رہتے ہیں۔ سطوت کی کج ادائیوں اور جفاکاریوں کے باوجود وجاہت مرزا کی محبت اور دیوانگی میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

اس خبر نے جہاں سب ہی لوگوں کو مسرور و شاداں کر دیا تھا، وہیں ندرت کو بے حد تکلیف اور اذیت پہنچی تھی۔ وہ بڑی ہونے کے باوجود اب تک کنواری بیٹھی تھی۔ جبکہ چھوٹی بہن نہ صرف شوہر کے دل پر اور سسرال میں راج کر رہی تھی اور اب ماں بھی بننے جا رہی تھی۔ وہ سطوت اور وجاہت مرزا کی شادی کو تو نہیں روک سکی تھی مگر اب اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ اس بچے کو دنیا میں نہ آنے دے۔

''تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو؟'' سطوت کی زبان سے یہ خوشخبری سن کر اس نے چہرے پر حیرت اور غصے کے آثار پھیلاتے ہوئے کہا تھا۔ ''ابھی تمہاری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو تم ابھی سے بچوں کے چکر میں پڑنے جا رہی

ہو۔''

''کیا مطلب؟'' سطوت جہاں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیران نظروں سے بہن کی طرف دیکھا۔

''چندا! شادی کے دو چار سال تو انسان کو سکھ شانتی میں گزارنے چاہئیں۔ پیاؤں پیاؤں کے بعد کیا سکھ، کہاں کی شانتی؟

''وہ تو ہے آپا!'' سطوت نے ندرت کے خیال سے متفق ہوتے ہوئے کہا۔ ''مگر کیا، کیا جا سکتا ہے؟ یہ تو خدا کی دین ہے۔'' آخری جملے کی ادائیگی کے ساتھ ہی سطوت کے لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ ''آپ کو نہیں پتہ، وجاہت اس خبر سے کس قدر خوش ہیں......اور میں خود بھی......اں بنے بغیر ہر عورت نامکمل اور ادھوری ہوتی ہے۔''

''ہٹاؤ یہ جاہل عورتوں والی باتیں۔'' ندرت جل کر بولی۔ ''جانتی بھی ہو، ماں بننے کے بعد عورت کا فگر کس قدر متاثر ہوتا ہے۔ یہ بڑی توند نکل آئے گی۔ یہ نازک کمر، کمرہ بن جائے گی۔ تمہارے حُسن پر وجاہت میاں شیدا اور فریفتہ ہیں نا، یہ حُسن پہلے بچے کے ساتھ ہی ندی کے بہاؤ کی طرح بہہ جائے گا......بچے کی پیدائش کے بعد شوہر کے لئے بیوی صرف بچے کی ماں بن کر رہ جاتی ہے اور بس۔''

''ہائے نہیں......'' سطوت نے دہل کر دل تھام لیا۔ اُسے اپنا حُسن بے حد عزیز تھا اور وہ کسی بھی قیمت پر اس حُسن میں کمی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ''تو آپا! بتاؤ نا......میں کیا کروں؟'' اس نے متوحش لہجے میں سوال کیا۔

''اس بڑی مصیبت کا بڑا چھوٹا سا حل ہے۔'' ندرت نے سطوت کے قریب کھسکتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ''ڈاکٹر کے پاس جاؤ اور خاموشی سے ابارشن کروا دو۔'' بہت ہی اطمینان اور سرسری سے انداز میں دیئے گئے ندرت کے اس مشورے نے سطوت سے زیادہ دروازے پر کھڑی عاتکہ بیگم کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔ کن سوئیاں لینے کی نہ ان کی عادت تھی نہ فطرت۔ اس وقت تو وہ اپنی بہو کے لئے ناریل کا حلوہ لے کر آئی تھیں کہ ندرت کی آواز نے دروازے پر ہی ان کے قدم جکڑ لئے تھے۔ ابھی کچھ ہی دن قبل انہوں نے شانتی سے کہہ کر تازہ ناریل کا حلوہ بنوایا تھا۔

''اماں بی! ناریل کا ہی حلوہ کیوں؟'' شانتی نے ناریل کدوکش کرتے ہوئے مصروفیت سے سوال کیا تھا۔

''اگر ماں ناریل کھائے تو بچے خوب گورے چٹے پیدا ہوتے ہیں۔'' عاتکہ بیگم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''آپ خود اتنی گوری ہیں، وجاہت بھائی بھی کس قدر سرخ سفید ہیں۔ اور بھابی بیگم تو خیر ہیں ہی چاند کا ٹکڑا......تو بھلا بچہ کیوں گورا چٹا نہ ہوگا؟......بھابی بیگم ناریل کھائیں نہ کھائیں، منے میاں ضرور بہ ضرور خوب صورت ہوں گے۔''

''اچھا چل کام کر۔'' شانتی کے فلسفے پر ہنستے ہوئے انہوں نے اسے کام کی طرف متوجہ کیا۔ ''جلدی سے اچھا سا حلوہ بنا دے۔ دُلہن بیگم کو میں اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گی۔'' عاتکہ بیگم کے لہجے میں پیار جھلک رہا تھا۔

''خیر سے ابھی تو ان کی بہن آئی ہوئی ہیں۔'' شانتی نے اطلاع دی۔

''کب آئیں؟'' عاتکہ بیگم نے چونک کر دریافت کیا۔

''کافی دیر سے آئی ہوئی ہیں۔ ان کے کمرے میں بیٹھی سکھانے پڑھانے میں مصروف ہیں۔'' شانتی نے برا سا منہ بنا کر بتایا۔ ندرت کی عادات واطوار سے گھر کے ملازمین بھی خوب اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔ بے خبر تھیں تو صرف سطوت جہاں۔

''ایسا نہیں کہتے شانتی!'' عاتکہ بیگم نے ٹوکتے لہجے میں کہا۔ ان کی شفاف پیشانی پر سوچ کی لکیریں مٹ آئی تھیں۔ پہلے انہوں نے ندرت کی موجودگی میں سطوت کے کمرے میں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا مگر پھر سوچا، ٹھنڈا ہو کر حلوہ بدمزہ نہ ہو جائے، سو وہ گرم گرم حلوے کی پلیٹ لئے سطوت کے کمرے کی طرف چل دی تھیں۔ مگر اس سے قبل کہ وہ

دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتیں، بند دروازے کے اس پار سے آتی ندرت کی آواز نے انہیں دہلا کر رکھ دیا تھا۔ ندرت کے مشورے پر سطوت نے کس ردِعمل کا اظہار کیا تھا، یہ جانے بغیر وہ دل تھامے تیزی سے واپسی کے لئے پلٹ گئی تھیں۔
ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس حادثے کو روکنے کے لئے کیا اقدام کریں۔ اگر وہ وجاہت مرزا سے کچھ کہتیں تو سطوت اس بات کو سکھانے پڑھانے پر محمول کرتی اور ضد میں آ کر کچھ بھی کر گزرتی۔ سطوت کی نگاہوں میں اپنی حیثیت سے وہ خوب واقف تھیں، اس لئے انہوں نے فوراً اُس سے اس موضوع پر بات کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔
تو پھر کیا، کیا جائے؟......ان کے دل میں پنکھے سے لگ گئے تھے۔ کیوں نہ میں وقاص کی والدہ رضوانہ بیگم سے بات کروں۔ اچانک اُنہیں یہ خیال آیا تھا اور وہ گاڑی نکلوا کر وقاص کے گھر کی طرف چل دی تھیں۔
''ارے عاتکہ آپا! آپ....؟'' رضوانہ بیگم اُنہیں یوں بے وقت اور اچانک دیکھ کر حیران ہوئی تھیں۔ ''سب خیریت تو ہے نا؟''
''ویسے تو اللہ کا کرم ہے۔'' عاتکہ بیگم نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''بس ایک مسئلہ درپیش تھا۔ کوئی حل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سوچا آپ کو پریشان کروں۔''
''ارے تو آپ نے زحمت کیوں کی؟.....فون کر دیا ہوتا، میں خود حاضر ہو جاتی۔'' رضوانہ بیگم اپنائیت بھرے لہجے میں بولیں۔
''خیر! تم آ ؤ یا میں، ایک ہی بات ہے۔'' عاتکہ بیگم، رضوانہ بیگم کے ساتھ چلتی ڈرائنگ روم تک آ پہنچی تھیں۔
''اب بتائیے معاملہ کیا ہے؟'' انہیں ایک آرام دہ اور گداز صوفے پر بٹھا کر خود ان کے مقابل دھرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے رضوانہ بیگم نے فکرمندی سے سوال کیا۔ ''آپ خاصی پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔''
''بات ہی کچھ ایسی ہے۔'' عاتکہ بیگم نے گہرا سانس لے کر بات کا آغاز کیا اور ساری بات من وعن ان کے گوش گزار کر دی۔
''ہاں...... بات تو تشویش ناک ہے۔'' رضوانہ بیگم بھی متفکر ہو گئی تھیں اور گہری سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ ''ان روز روز کے مسئلوں کا ایک ہی حل ہے کہ جلد از جلد ندرت کی شادی ہو جائے۔'' کئی لمحوں تک سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تھا۔ خود حشمت آپا بھی یہی چاہتی تھیں۔ ان کی صحت پہلے ہی جواب دے چکی تھی۔ سطوت کی شادی سے انہوں نے کچھ سنبھالا لیا تھا، آج کل پھر بیمار ہیں......ان کی بھی یہی خواہش ہے کہ اپنی زندگی میں ہی ندرت کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں۔''
''ایسا ہو جائے تو کیا ہی کہنا۔'' عاتکہ بیگم بولیں۔ ''مگر ایسا ہونا، اتنا آسان بھی تو نہیں ہے۔ وجاہت میاں کے کہنے پر وقاص آج کل اسی کوشش میں لگے ہیں۔ بلکہ انہوں نے ایک لڑکا دیکھا بھی ہے۔''
''اچھا۔'' رضوانہ بیگم کے انکشاف پر عاتکہ بیگم نے چونک کر پوچھا۔ ''کون ہے؟......کیا کرتا ہے؟''
''وقاص کے آفس میں جونیئر آفیسر ہے۔ ماں باپ فوت ہو چکے ہیں۔ بہن بھائی کوئی ہے نہیں۔ جانئے بالکل اکیلا ہے۔''
''یہ تو اچھا ہی ہے۔ ویسے بھی ندرت جہاں کا ساس نندوں والے گھر میں گزارہ بہت مشکل ہوتا۔'' عاتکہ بیگم نے الگ لہجے میں تبصرہ کیا۔
''وہی تو۔'' رضوانہ بیگم نے تائید بھرے انداز میں سر ہلایا۔ ''حشمت آپا کے ساتھ ہی گھر داماد بن کر رہنے کے لئے آمادہ ہے۔ اس طرح انہیں بھی سہارا رہے گا۔''

''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔'' عاتکہ بیگم نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ''ورنہ ندرت کی رخصتی کے بعد تو وہ بالکل اکیلی ہو جاتیں۔''

''جی۔ اسی لئے وقاص نے ایسا لڑکا تلاش کیا ہے جو ان کے ساتھ ان کے گھر میں رہ سکے۔ کردار، اخلاق کا بھی اچھا ہے۔ شکل و صورت بھی مناسب ہے۔ میرے خیال میں تو اسلم سے بہتر رشتہ ندرت کو مل ہی نہیں سکتا۔''

''اب حشمت جہاں اور خود ندرت کو رشتہ پسند آئے تو تب بات ہے۔'' عاتکہ بیگم نے وسوسے بھرے لہجے میں کہا۔ کیونکہ اتنے عرصے میں وہ حشمت جہاں اور خود ندرت کے مزاج و فطرت سے خوب اچھی طرح واقف ہو چکی تھیں۔ حشمت آپا اپنی صحت کی وجہ سے ندرت کی طرف سے بہت فکر مند تھیں۔ اگر انہیں لڑکا پسند آ گیا تو وہ ندرت کو زبردستی راضی کر ہی لیں گی۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' حشمت جہاں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ جانتی تھیں ایک پرائیویٹ فرم کے معمولی جونیئر آفیسر کے رشتے کے لئے ندرت کو رضامند کرنا بھی ایک مشکل مرحلہ ہو گا، اس کے باوجود انہوں نے فیصلہ کُن لہجے میں رضوانہ بیگم سے کہہ دیا تھا کہ وقاص سے کہو کسی دن وہ لڑکے کو لے کر گھر آ جائے۔ لڑکا لڑکی بھی ایک دوسرے کو دیکھ لیں گے۔ مناسب لگا تو پھر سطوت اور وجاہت مرزا کو بھی بلا کر دکھا دیا جائے گا اور رشتہ طے کر کے ہفتے دس دن میں ہی عقد کر دیا جائے گا۔

''اے آپا! آپ تو سچ مچ ہتھیلی پر سرسوں جمانے لگیں۔'' رضوانہ بیگم بن کر ہنسیں۔ ''اب ایسی بھی کیا جلدی ہے؟'' حالانکہ دل سے تو وہ بھی یہی چاہتی تھیں کہ جلد از جلد یہ معاملہ نمٹ جائے اور عاتکہ بیگم اور وجاہت مرزا کو سکون کا سانس لینا نصیب ہو۔

''رضوانہ دُلہن! تمہیں میری صحت کا اندازہ نہیں ہے۔'' حشمت جہاں نے تھکن سے چُور لہجے میں کہا۔ ''میں آنکھیں بند ہونے سے پہلے ندرت کا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں دے دینا چاہتی ہوں۔''

''چلیں ٹھیک ہے۔ میں وقاص سے کہتی ہوں کہ وہ کل شام کو ہی اسلم کو لے کر یہاں آ جائیں۔'' رضوانہ نے بات سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''تب تک آپ ندرت سے بھی بات کر لیجئے گا۔''

''ہوں۔'' حشمت جہاں نے پُرسوچ انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ ''تم دوپہر سے ہی آ جانا۔''

''آپ کہہ رہی ہیں تو ضرور آ جاؤں گی۔'' رضوانہ بیگم نے سعادت مندی سے جواب دیا اور جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''ارے کہاں چل دیں؟'' حشمت جہاں نے بھاوج کا ہاتھ پکڑ کر بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ''ابھی ندرت آتی ہو گی۔ چائے پی کر جانا۔'' کچھ عمر کا تقاضا تھا، کچھ بیماری کی وجہ سے حشمت جہاں خاصی رقیق القلب ہو گئی تھیں۔ اور رضوانہ بیگم سے بے حد التفات سے پیش آنے لگی تھیں۔ اس محبت میں شاید کچھ خود رضوانہ بیگم کے عمل کا بھی دخل تھا، جس طرح انہوں نے سطوت کی شادی کروائی تھی اور اب ندرت کے لئے جس طرح کوشاں تھیں اور اچھے برے میں ان کی خبر گیری کو نہ صرف خود بلکہ وقاص بھی دوڑے چلے آتے تھے۔ ان سب باتوں نے بھی ان کے دل کو خاصا متاثر کیا تھا اور جس بھاوج کو وہ تمام عمر نفرت اور ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی رہی تھیں، عمر کے اس آخری موڑ پر وہ اس بھاوج پر خاصی مہربان اور ملتفت ہو گئی تھیں۔

''ارے نہیں آپا!...... اب چلوں گی..... رضوانہ بیگم نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''ندرت جانے کب تک آئیں۔ اب چائے ناشتہ کل ہی ہو جائے گا، جب آپ کے دوسرے داماد صاحب تشریف لائیں گے۔''

''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔'' حشمت جہاں مسکرائیں۔ ''اور جلد ہی ندرت بھی اپنے ٹھکانے لگے۔''

''ان شاءاللہ سب اچھا ہی ہوگا۔'' رضوانہ بیگم نے قدم دروازے کی طرف بڑھائے۔

''اللہ نگہبان!'' حشمت جہاں نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور رضوانہ بیگم دروازے سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں۔ رضوانہ بیگم کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد ندرت آ گئی تھی۔ وجاہت مرزا کا ڈرائیور گاڑی میں گھر پہنچا گیا تھا۔

''اے لو..... کچھ دیر پہلے آجاتیں تو اپنی ممانی سے مل لیتیں۔'' حشمت جہاں اس کا چہرہ دیکھتے ہی بولیں۔ ''بے چاری چائے پیئے بنا ہی چلی گئیں۔''

''آج کل آپ ممانی پر کچھ زیادہ مہربان نہیں ہو رہی ہیں؟'' ندرت اکھڑے لہجے میں بولی۔ جب سے سطوت کے ماں بننے کی خبر ملی تھی، اسے کوئی بھی بات اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

''لو! چائے کے لئے پوچھ لیا تو یہ مہربانی ہوگئی۔'' حشمت جہاں رسان سے بولیں۔ ''کچھ بھی ہو، میرے مرحوم بھائی کی بیوہ ہے۔ میرے اکلوتے بھتیجے کی ماں ہے۔ اور ہم سب کے لئے کتنی محبت اور ہمدردی رکھتی ہے۔ اب یہی دیکھو، میں تمہاری شادی کے لئے کتنی فکرمند تھی۔ اور اس مشکل کا حل تلاش کیا تو انہی نے۔''

''کیا مطلب؟'' ندرت نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔

''ایک بہت اچھا رشتہ لائی تھیں تمہارے لئے۔'' حشمت جہاں نے ''بہت اچھا'' پر زور دیتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ خوب پڑھا لکھا اور قابل لڑکا ہے۔ سچ میری طرح رضوانہ بھی تمہارے لئے فکرمند ہیں۔''

''ہونہہ......'' ندرت نے تحقیر بھرے انداز میں ہنکارا بھرا۔ ''ایسی ہی ہمدرد ہیں تو اپنے بیٹے کا رشتہ نہیں لاسکتیں؟'' ندرت کے تنک کر بولنے پر حشمت جہاں جلدی سے بولیں۔

''اے...... اس میں رضوانہ دلہن کا کیا قصور ہے؟ آج کل کے پڑھے لکھے لڑکے خود ہی خاندان میں شادی کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ..... میڈیکلی یہ کچھ ٹھیک نہیں ہوتا۔'' خود حشمت جہاں کی بھی یہی خواہش تھی کہ ندرت کی شادی وقاص بیگ سے ہو جاتی مگر رضوانہ بیگم نے ایک دن بڑے قاعدے سے انہیں یہ بات سمجھا دی تھی کہ فی زمانہ کزنز کی باہمی شادیاں آگے چل کر آنے والی نسلوں کے لئے خاصی پریشان کن ثابت ہوسکتی ہیں۔ بچے ابنارمل، کمزور اور اپاہج بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے وقاص خاندان میں شادی کے لئے تیار نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ سطوت اور ندرت کے لئے میں ایک ہی تو بھائی ہوں، آپ اس رشتے کو قائم رہنے دیجئے۔ بڑا بھائی بن کر اپنی بہن ندرت کی شادی میں خود کروں گا۔ جانے کون سا لمحہ تھا کہ حشمت جہاں کی سمجھ میں یہ باتیں خوب اچھی طرح سما گئی تھیں اور اب انہیں اس بات کا ذرہ بھر ملال نہ تھا کہ گھر میں اتنے اچھے لڑکے کے ہوتے ہوئے وہ ندرت کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے پر مجبور تھیں۔

''کل شام کو وقاص میاں اور رضوانہ دُلہن، لڑکے کو لے کر یہاں آنے والے ہیں۔''

''آپ نے منع کیوں نہیں کر دیا؟'' ندرت چیخ کر بولی۔ ''امی! ایک بات کان کھول کر سن لیں۔ میں کسی بھی ایرے غیرے نتھو خیرے سے شادی کرنے کے لئے ہرگز بھی تیار نہیں ہوں گی۔''

''اے بی!..... ذرا عقل کے ناخن لو۔'' حشمت جہاں چڑ کر بولیں۔ ''میری صحت کا کچھ پتہ نہیں۔ میری آنکھیں بند ہوتے ہی دہی ہو جاؤ گی..... وجاہت مرزا کے برتے پر مت رہنا، آج کل سگے بھائی اپنے نہیں..... تو بہنوئی پر کیا اترانا۔''

''مگر امی!'' ندرت نے کچھ کہنا چاہا۔ ''بس اب میں کچھ نہیں سنوں گی۔ کل لڑکا آرہا ہے۔ اگر میری سمجھ میں آگیا تو

میں ہفتے دس دن میں تمہارا نکاح کر دوں گی۔ اللہ اللہ خیر صلاء......"

ندرت نے کچھ سخت جواب دینے کے لئے منہ کھولا تھا مگر ماں کے پژمردہ اور زرد چہرے کو دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ ان کی کہی ہوئی ایک ایک بات سچائی پر مبنی تھی۔ اس نے بے بسی سے سر جھکا لیا۔ حشمت جہاں نے نگاہ اٹھا کر اس کے مایوس اور افسردہ چہرے کی طرف دیکھا اور بے ساختہ انہیں اس پر پیار آ گیا تھا۔

"مایوس کیوں ہوتی ہے پگلی!" انہوں نے شفقت بھرے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُمید بھرے لہجے میں کہا۔ "دیکھ! پہلے ہم بالکل اکیلے تھے۔ سطوت کی شادی کے وقت ایک وقاص میاں ہی تھے اور اب تیری شادی کے وقت اللہ رکھے تیرا لاکھوں پتی بہنوئی بھی موجود ہے۔"

"مجھے اس لاکھوں پتی بہنوئی کا کوئی احسان نہیں چاہئے۔" ندرت نے بیزاری سے اپنے سر پر دھرا اماں کا ہاتھ پرے کرتے ہوئے اکھڑ لہجے میں کہا۔ "آپ جو کچھ آسانی سے کر سکتی ہیں، وہی کافی ہے۔" اس کے اکھڑ لہجے میں ایک عجب سی اذیت بھری شکایت تھی جسے حشمت جہاں محسوس بھی نہ کر سکیں۔

اگلی شام رضوانہ بیگم اور وقاص بیگ، اسلم کو لے کر حشمت جہاں کے فلیٹ پر پہنچ گئے تھے۔ اسلم ایک مہذب، شائستہ، سیدھا سادھا اور خاموش طبع سا لڑکا تھا۔ ندرت کو سب سے زیادہ اس کی یہی بات پسند آئی تھی۔ ورنہ اس کے اسٹیٹس، جاب اور تنخواہ نے اسے خاصا مایوس کیا تھا۔ مگر ماں کی خواہش کے سامنے سر جھکانے کے سوا اس کے پاس دوسرا راستہ نہ تھا۔ اس کے بعد کے مراحل نہایت تیزی سے پا گئے تھے۔ رشتے طے پانے کے ہفتے بھر بعد ہی نکاح ہو گیا تھا اور ندرت کی رخصتی ہونے کے بجائے اس کے دُولہا میاں اسلم اُن کے چھوٹے سے فلیٹ میں اُٹھ آئے تھے۔ جہاں ندرت اپنی شادی اور میاں کی مصروفیات میں گم ہو کر وقتی طور پر سطوت کے مسئلے کو بھول گئی تھی۔ وقت اپنی مخصوص رفتار میں آگے بڑھتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے نو ماہ بیت گئے اور سطوت جہاں نے چاند سے بیٹے اسد مرزا کو جنم دیا تھا۔

بیٹے کی پیدائش پر جہاں وجاہت مرزا بے حد خوش تھے، وہیں عاتکہ بیگم پوتے کو پا کر خوشی سے نہال ہو اُٹھی تھیں۔ لیکن سطوت جہاں کو ان کی خوشی کس طرح برداشت ہو سکتی تھی، سو وہ بہانے بہانے سے اسد کو اپنی ماں اور بہن کے گھر چھوڑ کے آنے لگی تھیں۔ ندرت کو جب اندازہ ہوا کہ اسد کے ان کے پاس رکنے سے عاتکہ بیگم اور وجاہت مرزا کو تکلیف ہوتی ہے تو اس نے سطوت کو اس بات کے لئے اور اُکسانا شروع کر دیا تھا۔ جس بچے کو دنیا میں آنے سے پہلے ہی وہ بے نشان کر دینا چاہتی تھی، اب ہی بچہ اسے بے حد عزیز ہو گیا تھا۔ اپنے بچے کے لئے ماں اور بہن کی محبت دیکھ کر سطوت جہاں نہال ہو کر رہ جاتی۔ وہ اب بھی یہ بات نہیں سمجھ سکتی تھیں کہ شادی ہو جانے کے بعد ندرت اب بھی انہیں آباد نہیں دیکھنا چاہتی، وہ ان کے ہنستے بستے گھر میں آگ لگا کر تماشا دیکھنے کی متمنی ہے، یہ بات وجاہت مرزا اچھی طرح سمجھ چکے تھے اور انہیں بھی سمجھانا چاہتے تھے۔ مگر سطوت کسی بھی طرح یہ بات سمجھنے کو تیار نہ تھیں۔ انہیں دنیا میں سب سے زیادہ اپنی بہن ندرت پر اعتبار تھا، اور اپنے چہیتے بیٹے اسد کے لئے انہیں سب سے بڑی ہمدرد اور خیر خواہ سمجھتی تھیں۔

ننھے سے اسد کو اس طرح روز روز حشمت بیگم اور ندرت کے پاس چھوڑ کر آنا یا ڈرائیور کے ساتھ ان کے گھر بھجوا دینا، عاتکہ بیگم کو سخت ناپسند تھا۔ جب بات برداشت سے باہر ہو گئی تو ایک دن دبے لفظوں میں انہوں نے شکایت کی تھی، اس پر سطوت جہاں نے وہ ہنگامہ برپا کیا کہ خود وجاہت مرزا حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا تھا۔ سطوت جہاں کے لئے رگ و پے میں پھیلی محبت دھیرے دھیرے پچھتاوے میں بدلنے لگی تھی۔ وہ گھر جو اُن کی ماں عاتکہ بیگم نے بے حد پیار سے بنایا تھا، بے حد چاہ سے سنوارا تھا۔ سطوت نے دیکھتے ہی دیکھتے اس گھر کو بے ترتیب و بدوضع کر دیا تھا۔ سرسبز لان میں رفتہ رفتہ خزاں کا عمل دخل بڑھتا جا رہا تھا۔ بوڑھا مالی رام پرشاد

اپنے تئیں باغیچے کو شاداب رکھنے کی تگ و دو میں لگا رہتا مگر سطوت کو جب موقع ملتا ایک آدھ پودا اُکھڑا کر پھینک دیتی تھی۔ بہو کے روّیے کو محسوس کرتے ہوئے عاتکہ بیگم نے خود کو اپنے کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ سطوت کو ان کا شام کے وقت لان میں بیٹھ کر چائے پینا سخت ناگوار گزرتا تھا، سو انہوں نے اپنے کمرے کے سامنے ٹیرس پر کرسی ڈلوائی تھی۔ ان کے ایسا کرتے ہی سطوت جہاں نے لان میں رکھی بید کی دیدہ زیب کرسیاں اور میز وہاں سے اُٹھوا کر اسٹور میں پھنکوا دی تھیں۔

اسد جب چار برس کے ہوئے تو سرمد دنیا میں آئے۔ ان چار سالوں میں خاصی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ سطوت کی والدہ حشمت جہاں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور ندرت کے شوہر اسلم نے وہ فلیٹ بیچ کر بیوی کی خوشی کی خاطر ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا تھا۔ سرمد جب دو برس کے ہوئے تو ندرت جہاں کے گھر پہلی بیٹی ثروت پیدا ہوئی تھی اور ثروت کے سال بھر بعد فروا نے جنم لیا تھا۔ ندرت کا تعلق ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حال میں خوش نہیں رہتے، اور دوسروں سے ہمیشہ موازنہ کر کے خود کو کمتر اور دُکھی سمجھ کر افسردہ رہتے ہیں اور دوسروں کی خوشیوں کو برباد کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ سو ندرت نہ اپنے گھر سے خوش تھی نہ میاں سے۔ اور تو اور اسے اس بات کا بھی بے حد ملال تھا کہ سطوت دو ذہین اور خوبرو بیٹوں کی ماں ہے جبکہ اس کے گھر یکے بعد دیگرے جنم لیا بھی تو دو بیٹیوں نے لیا۔

گزرتے وقت کے ساتھ سطوت جہاں کا اختیار بڑھتا جا رہا تھا۔ اب وہ پورے گھر پر اور اپنے شوہر وجاہت مرزا پر پوری طرح حاوی تھیں۔ عاتکہ بیگم کی دنیا ان کے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اسد تو کم ہی ان کے کمرے میں جاتے تھے البتہ سرمد کو جب موقع ملتا وہ دادی کی گود میں جا بیٹھتے تھے۔ سرمد کو ماں کی نسبت باپ سے زیادہ پیار تھا۔ اُن کی ان باتوں کو محسوس کر کے سطوت کو غیر محسوس طور پر سرمد سے ایک بے نام سی دُوری ہو گئی تھی۔ ماں کی طرف سے فاصلوں کے احساس نے سرمد کو دادی اور باپ سے کچھ اور قریب کر دیا تھا۔ فطرتاً سرمد ایک حساس دل و دماغ کے ایک صاف گو اور سادہ لوح بچے تھے۔ وہ کسی کے ساتھ بے انصافی اور زیادتی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ایک ہمدرد اور مخلص فطرت کے مالک تھے۔ ہوش سنبھالتے ہی انہیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ ان کی ماں کا روّیہ ان کے والد اور دادی کے ساتھ کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے اور جلد ہی انہوں نے یہ بات بھی محسوس کر لی تھی کہ جب ان کی خالہ ندرت ان کے گھر آتی ہیں تو ان کی والدہ سطوت جہاں کا مزاج بگڑ جاتا ہے اور وہ بات بے بات ہنگامہ برپا کیا کرتی تھیں۔

"اگر ندرت خالہ جان ہمارے گھر آ کر امی جان کو سکھاتی پڑھاتی ہیں جس کے باعث ان کا موڈ خراب ہو جاتا ہے تو آپ خالہ جان کو ہمارے گھر آنے سے منع کیوں نہیں کر دیتے؟" ایک دن انہوں نے معصومیت سے وجاہت مرزا کو مشورہ دیا تھا اور وجاہت مرزا آہ بھر کر بولے تھے۔

"کاش! میں ایسا کر سکتا۔"

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وجاہت مرزا کو ندرت کی حرکتوں کی وجہ سے اس سے شدید نفرت ہو گئی تھی، مگر وہ سطوت کی وجہ سے اس نفرت کا اظہار نہیں کر سکتے تھے نہ ہی اسے اپنے گھر آنے سے روک سکتے تھے۔ سرمد، والد کی بے بسی اور بے حد چاہنے والی دادی کی بے زبانی اور بے کسی دیکھتے تو ان کا ننھا سا دل باپ اور دادی کی محبت میں تڑپ اُٹھتا۔ وہ ان دونوں کو خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتے تھے جبکہ سطوت جہاں کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی بھی طرح ان دونوں کو پریشان اور دُکھی رکھا جائے، عاتکہ بیگم کو ستا کر اور وجاہت مرزا کا دل جلا کر شاید وہ اپنی بہن کی خوشی کا سامان کیا کرتی تھیں ورنہ تو شاید وہ خود اتنے برے دل کی مالک نہیں تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان کی تمام تر کج ادائیوں اور تغافل شعاریوں کے باوجود وجاہت مرزا کبھی ان سے نفرت نہ کر سکے تھے اور روزِ اوّل سے آخری دن تک انہیں دل کی

گہرائیوں سے چاہتے رہے تھے۔ مگر زندگی نے سطوت جہاں کے ساتھ وفا نہ کی اور وہ بالکل اچانک ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں اس جہانِ فانی سے کُوچ کر گئیں۔ اس وقت اسد سترہ برس کے اور سرمد صرف تیرہ برس کے تھے۔ یہ صدمہ جہاں وجاہت مرزا کے لئے جانکاہ تھا، وہیں اسد اور سرمد کے لئے بھی اندوہناک تھا۔ خود عاتکہ بیگم ٹوٹ کر رہ گئی تھیں۔ گو کہ سطوت جہاں کبھی بھی نہ اچھی بہو ثابت ہوئی تھیں نہ اچھی بیوی اور نہ ہی اچھی ماں، انہوں نے لاکھ کے گھر کو خاک میں تبدیل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ نہ کبھی میاں کی خدمت کی تھی، نہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی تھی اور جہاں تک ان کا تعلق تھا تو ان سے تو سطوت کو خدا واسطے کا بیر تھا۔ ان کا دل دُکھانے کا کوئی بھی موقع کبھی بھی سطوت نے ہاتھ سے جانے نہ دیا تھا۔ سطوت کو صرف اپنی ذات سے پیار تھا، ان کی ہر سوچ خود سے شروع ہو کر خود پر ہی ختم ہو جاتی تھی، البتہ ندرت نے اپنی عیاریوں اور حکمت عملی سے ان کے دائرۂ سوچ میں کسی قدر رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ بہن سے وہ بہر حال لگاؤ رکھتی تھیں اور ان کے تمام مشوروں پر بنا کسی سوچ کے من و عن عمل کرتی تھیں۔ سطوت جہاں کی یوں بے وقت اور اچانک موت نے وجاہت مرزا کو جہاں اندر سے ریزہ ریزہ کر دیا تھا، وہیں ظاہری طور پر ان کے اندر ایک سختی اور ترشی پیدا ہو گئی تھی۔

ندرت اس وقت بھی اپنی فطری کمینگی کا مظاہرہ کئے بنا نہ رہ سکی اور اُس نے اس حادثے کو وجاہت مرزا اور ان کی ماں عاتکہ بیگم کی سازش قرار دے کر ان دونوں پر سطوت جہاں کے قتل کا الزام لگا دیا تھا۔ ندرت کے اس بے ہودہ الزام نے وجاہت مرزا کے دل میں موجود اس کے لئے نفرت میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا اور انہوں نے سختی سے ندرت کو اپنے گھر آنے سے منع کر دیا تھا۔ اب وہ اس سے کسی بھی طرح کا تعلق رکھنے کے لئے آمادہ نہ تھے اور انہوں نے بچوں کو بھی سختی سے منع کر دیا تھا۔ سرمد تو خیر شروع سے ہی خالہ کی حرکتوں کی وجہ سے اُنہیں ناپسند کرتے تھے، البتہ اسد کے لئے اس حکم پر عمل کرنا قدرے دُشوار تھا۔ کیونکہ وہ باپ بھائی اور دادی کی نسبت نانی اور خالہ سے زیادہ قریب تھے۔ ایک طرح سے ان کا بچپن ننھیال میں ہی گزرا تھا، اس لئے انہیں خالہ سے ایک خاص قسم کی اُنسیت تھی، اس لئے وجاہت مرزا کے منع کرنے کے باوجود بھی کبھار چھپ چھپا کر وہ ندرت سے ملنے چلے جاتے تھے۔ ندرت اُنہیں دیکھ کر کھِل اُٹھتی تھیں، اور ان کی دونوں بیٹیاں ثروت اور فروا بھی ان سے بے حد محبت سے ملتیں خصوصاً ثروت سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ دوستی ایک نئے انداز سے ان کے دل پر اثر انداز ہوتی چلی گئی تھی اور انہیں پتہ ہی نہیں چلا کہ کب ان کی سوچوں کی پگڈنڈی پر چلتی ثروت ان کے دل کی بستی میں جا بسی تھی۔

❀===❀===❀

دُور مشرق کی اور واقع قرمزی پہاڑیوں کی اوٹ سے صبح کاذب کا مدھم سا نارنجی غبار اُبھرتا محسوس ہو رہا تھا۔ بادِ نسیم کے نرم جھونکوں میں نرمی اور لطافت کا احساس سمویا ہوا تھا۔ ادھ کھلے دریچے سے ہوا کے نرم جھونکے اور مدھم سا اُجالا کمرے کی نیم تاریک فضا میں داخل ہو کر ایک نیا سا احساس جگا رہے تھے، مگر ملیحہ بیگم صبح کی اس رعنائی و دلکشی سے بے نیاز بستر پر بے سدھ پڑی تھیں۔ پہلو میں اُٹھتی درد کی ٹیسوں کو برداشت کرتے کرتے وہ نڈھال ہو چکی تھیں۔ اس سے پہلے بھی ایک آدھ بار سینے میں چبھن سی محسوس ہوئی تھی، مگر آج جس درد سے وہ گزر رہی تھیں، ایسی اذیت پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اُن کے چہرے سے کرب و اذیت کا اظہار ہو رہا تھا اور سارا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔

''اُف......'' شدتِ کرب سے ان کے لبوں سے سسکی سی نکلی تھی۔

''ملیحہ!......کیا ہوا ملیحہ؟'' ساتھ والے بیڈ پر لیٹے پروفیسر آفاق کی سماعت تک ان کی سسکی پہنچی تو وہ بے ساختہ اُٹھ بیٹھے تھے۔ سامنے ملیحہ بیگم ہاتھوں سے پہلو دبائے درد و کرب کی تصویر بنی بے سُدھ پڑی تھیں۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' پروفیسر آفاق بے تابانہ بیوی کی طرف بڑھے۔

''یہاں......بہت درد ہے۔'' ملیحہ بیگم کے لبوں سے شکستہ سی آواز نکلی۔

''میں ابھی ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔'' وہ تیزی سے فون کی جانب لپکے۔ فون کرنے کے بعد وہ فریحہ اور فریال کے کمرے کے دروازے پر دستک دیتے واپس بیوی کے پاس چلے آئے تھے۔

''پاپا......!'' باپ کی آواز پر فریحہ نے پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔

''بیٹا! ذرا دیکھو، تمہاری ممی کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔''

دروازے کے اس پار سے یہ جملہ سنتے ہی فریحہ اُچھل کر بیڈ سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے آن کی آن ایک اچاٹ سی ہوئی نگاہ ساتھ والے بیڈ پر لیٹی فریال پر ڈالی تھی۔ وہ تکیہ میں منہ دیئے بے خبر سو رہی تھی۔ فریحہ دوپٹہ گلے میں اڑستی ہوئی کمرے سے نکل کر ملیحہ بیگم کے بیڈ روم کی طرف چل دی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر پہنچ گیا تھا۔

''میرا خیال ہے پروفیسر صاحب!'' ڈاکٹر نے معائنے اور ابتدائی طبی امداد کے بعد فکر مند لہجے میں کہا تھا۔ ''بیگم صاحبہ کو کارڈیو لے جانا پڑے گا......اور اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔''

''آپ کا خیال ہے کہ کچھ دل کا......'' آفاق صاحب متوحش لہجے میں بولے۔

''یقیناً۔'' ڈاکٹر نے پُر یقین لہجے میں جواب دیا اور کارڈیو پہنچتے ہی یہ بات ثابت ہو گئی کہ اس وقت انہیں دل کا دورہ پڑا تھا۔ دو دن تک مختلف ٹیسٹ ہوتے رہے تھے، اس کے بعد یہ اندوہناک حقیقت سامنے آئی تھی کہ ملیحہ بیگم کے دل کے تین والو بند تھے۔

''علاج......؟'' پروفیسر آفاق وحشت زدہ لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

''ظاہر ہے سرجری۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''جس قدر جلد ہو سکے بہتر ہے۔''

''فریحہ کی شادی سر پر کھڑی ہے۔ شادی سے پہلے میں کسی آپریشن کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتی۔'' ملیحہ بیگم نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا تھا۔ گو کہ اب طبیعت سنبھل گئی تھی، مگر تمام رات کی اذیت اور تکلیف، نقاہت کی صورت میں ان کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ دو ہی دن میں وہ برسوں کی مریض دکھائی دے رہی تھیں۔

''بیگم صاحبہ! آپ ایک پڑھی لکھی اور باشعور خاتون ہیں، آپ معاملے کی نزاکت کو خود سمجھ سکتی ہیں۔'' ڈاکٹر نے انہیں سمجھانا چاہا۔

''نہیں ڈاکٹر! میرے گھر کی یہ پہلی شادی ہے۔ مجھے یہ خوشی دیکھ لینے دیجئے۔'' ان کے لہجے میں ایک یاس بھری تکلیف سمٹ آئی تھی۔ سرجری کے بعد کیا ہونا ہے، کس نے دیکھا؟'' پروفیسر آفاق نے لاکھ سمجھانا چاہا کہ ظفریاب گھر کا بچہ ہے، ارجمند کوئی غیر نہیں، خود ان کی بہن ہیں۔ ان سے کہہ کر تاریخ آگے بھی بڑھائی جا سکتی ہے، یا صرف سادگی سے نکاح کر کے آپریشن کے بعد دھوم دھام سے رخصتی کی جا سکتی ہے۔ مگر ملیحہ بیگم کچھ بھی سمجھنے کو تیار نہیں تھیں۔ ان کا اصرار تھا کہ طے شدہ تاریخ کو طے شدہ طریقے سے اسی اہتمام و انصرام کے ساتھ وہ بیٹی کو رخصت کریں گی۔ پھر اس کے بعد علاج معالجہ اور سرجری و آپریشن ہوتا رہے گا۔

''پاپا! ایسے کیونکر ہو گیا؟'' فریال، باپ کے سینے سے لگی سسک رہی تھی۔ ''ممی کا نہ ویٹ زیادہ ہے نہ وہ انٹ شنٹ کھانے کی عادی ہیں...... پھر بھی یہ بیماری......''

''کوئی بھی بیماری، کسی کو بھی کسی بھی وقت ہو سکتی ہے بیٹا!'' پروفیسر آفاق کرب بھرے لہجے میں بولے۔ ''بیماریاں انسانوں کو ہی ہوتی ہیں۔ بس اللہ سے شفا کی دعا کرو۔ بے شک شفا اسی کے ہاتھ میں ہے۔''

چونکہ سکول بند تھے، اس لئے نمو اور فریال کی باہمی ملاقات کا سلسلہ بھی بند تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ملیحہ بیگم کی بیماری اور ہاسپٹلائز ہونے کی خبر پہلے انو کو ملی تھی، سو وہ فوری طور پر چھٹی لے کر گھر پہنچا تھا۔

''نمو! جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہمیں ہسپتال چلنا ہے۔'' گھر پہنچتے ہی اس نے نمو کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

''ہسپتال؟'' نمو حیران ہوئی۔ ''خیر تو ہے بھیا؟''

''بس دعا کرو...... اللہ خیر ہی رکھے۔ پروفیسر صاحب کی بیگم کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ وہ ہسپتال میں ہیں۔''

''دل کا دورہ...... ملیحہ آنٹی کو؟'' نمو نے بے تابانہ دل تھام لیا۔

''کیا ہوا؟...... خیر تو ہے؟'' دروازے سے اندر داخل ہوتی شریفن خالہ ان دونوں بھائی بہن کو حیران و پریشان دیکھ کر گھبرائی ہوئی آگے بڑھی تھیں۔

''ملیحہ آنٹی کی طبیعت خراب ہے۔'' نمو نے بتایا اور چادر لینے کے لئے کمرے کی طرف لپکی۔ ''ہم ہسپتال جا رہے ہیں۔ آپ گھر کا خیال رکھئے گا۔'' انو اور نمو، شریفن خالہ کو ہکا بکا چھوڑ کر ہسپتال کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔

''آنٹی! آپ کو کیا ہوا؟'' ملیحہ بیگم کا پژمردہ چہرہ دیکھ کر نمو کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔ اور فریال تو نمو کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

تین روز بعد ملیحہ بیگم گھر لوٹ آئی تھیں۔ شادی کی تیاریاں اب بھی جاری تھیں، مگر اب وہ گرم جوشی اور سرخوشی باقی نہ رہی تھی۔ سب ہی کے دلوں میں وسوسے دھڑک رہے تھے۔ سب کے لبوں پر ملیحہ بیگم کی لمبی زندگی اور صحت و تندرستی کی دعائیں تھیں۔

''ممی! پلیز...... شادی سے پہلے آپ سرجری کروا لیں۔'' فریحہ نے ماں کے سینے سے لگ کر التجا کی تھی۔

''خدانخواستہ اب اٹیک ہوا تو......'' اس نے خوفزدہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔
دعاؤں کے ساتھ دوائیں بھی جاری تھیں اور پرہیز بھی۔اس لئے ملیحہ بیگم بڑے اعتماد سے بولی تھیں۔''اِن شاء اللہ! اب کوئی اٹیک نہیں ہوگا۔تم میری بیماری کے بجائے اب صرف اپنی شادی کے بارے میں سوچو۔آفاق صاحب کی بہن ارجمند کو جب بھابی کی بیماری کی خبر ہوئی تو انہوں نے فون پر مشورہ دیا تھا کہ بھابی کو ان کے پاس انگلینڈ بھیج دیا جائے تاکہ زیادہ بہتر طریقے سے ان کا علاج کروایا جاسکے۔
''ارجمند! میں تو آتی رہوں گی، پہلے تم جلدی سے آجاؤ۔ میں اپنی زندگی کی یہ سب سے بڑی اور پہلی خوشی جلد از جلد دیکھ لینا چاہتی ہوں۔''
چند دنوں میں ملیحہ بیگم کی طبیعت خاصی سنبھل گئی تھی اور رفتہ رفتہ زندگی معمول پر آتی جارہی تھی۔ایک بار پھر شادی کی گہما گہمی شروع ہوگئی تھی اور اُداس چہرے پھر سے مسکرانا سیکھ گئے تھے۔ملیحہ بیگم کی طبیعت کی طرف سے کچھ تشفی ہوئی تو ایک دوپہر شریفن خالہ،نمو سے بولیں۔
''نمو! آج شام کو تم تیار ہوجانا۔ہم لوگ حسنہ کو دیکھنے لگیں گے۔''
''حسنہ......؟'' نمو نے سوالیہ نگاہیں اٹھائیں۔''کون حسنہ؟''
''ارے پگلی! تیری ہونے والی بھابی اور کون؟'' شریفن خالہ اس کے سر پر پیار سے چپت لگا کر ہنس کر بولیں۔ملیحہ بیگم کی بیماری اور فریال کی پریشانی میں ڈوب کر نمو اس مسئلے کو تقریباً بھول ہی چکی تھی۔آج شریفن خالہ نے ذکر چھیڑا تو بے ساختہ اس کے لبوں پر اشتیاق بھری مسکراہٹ بکھر گئی۔
''نام تو اچھا ہے خالہ!''
''وہ بھی بہت اچھی ہے۔اللہ رکھے پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے، پر ذرا سا جو غرور ہو، پانچ پانچ بھابیوں کے ساتھ نباہ کررہی ہے، پر کبھی جو زبان پر کسی کے خلاف کوئی شکایت ہو۔'' شریفن خالہ نے پیشہ ورانہ انداز میں تعریف کا سلسلہ شروع کردیا تھا۔
''ہمارے لئے تو ان کی یہی تعریف کافی ہے خالہ! کہ انہیں بھیا کے لئے آپ نے پسند کیا ہے۔اور اگر آپ نے پسند کیا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی پسند کیا ہوگا۔'' نمو نے دھیمے اور پُراعتماد آواز میں کہا۔اس کے لہجے میں وہ اندھا بھروسہ بول رہا تھا جو ان بہن بھائیوں کو خالہ شریفن پر تھا۔
''خدا جانتا ہے تم دونوں مجھے اپنی اولاد کی طرح عزیز ہو۔'' شریفن خالہ حلفیہ انداز میں گویا ہوئیں۔''اپنے طور پر میں نے اچھی سی لڑکی منتخب کرنے کی کوشش کی ہے، باقی اندر کا حال اللہ جانتا ہے۔پر میری دعا ہے کہ حسنہ، ان کے لئے اچھی بیوی اور تمہارے لئے اچھی بھاوج ثابت ہو۔''
''اِن شاء اللہ! ایسا ہی ہوگا۔'' نمو نے باوثوق لہجے میں کہا۔اور شام کو پہننے کے لئے کپڑوں کے انتخاب کے لئے کمرے میں چلی گئی۔ہلکے آسمانی رنگ کے جارجٹ کے سادہ سوٹ میں اس کا قمقمہ صندلی چہرہ نیلے آسمان پر دمکتے چاند کا سا منظر پیش کررہا تھا۔
''خدا نظرِ بد سے بچائے۔'' شریفن خالہ نے انگلی پر کاجل لگا کر اس کی پیشانی پر بالوں کے نیچے سیاہ ٹیکہ لگا دیا تھا۔ انہیں ہر لمحہ نمو کو نظر لگ جانے کا ڈر لگا رہتا تھا۔
''ارے کہاں کی تیاری ہے؟'' انو گھر میں داخل ہوا تو ان دونوں کو جانے کے لئے تیار دیکھ کر حیران ہوا۔
''مابدولت اپنی ہونے والی بھابی کا دیدار کرنے جارہے ہیں۔'' نمو نے فخریہ انداز سے سر اونچا کر کے شاہانہ لہجے

میں کہا تو انو بے ساختہ ہنس پڑا۔

''دیکھ انو! اگر حسنہ، نمو کو پسند آ گئی تو میں آج ہی رشتے کی بات پکی کر لوں گی۔'' شریفن خالہ نے الٹی میٹم دینے والے انداز میں کہا۔ ''آئیں بائیں شائیں نہ کریو۔''

انو نے شرمیلے انداز میں سر جھکا لیا تھا۔ حسنہ نام اسے بھی اچھا لگا تھا۔ اس کی طرف سے مکمل رضامندی پا کر شریفن خالہ کے ہونٹوں پر اطمینان بھری مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ نمو کو ساتھ لئے وہ جونہی گلی کے سرے پر واقع برگد کے پیڑ کے سائے میں پہنچی تھیں، سامنے سے ایک رکشہ آتا نظر آیا تھا اور انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے رکشہ روک لیا تھا۔ رکشہ مختلف راستوں سے گزرتا ایک عسرت زدہ بستی میں داخل ہو گیا تھا اور آخر چھوٹی چھوٹی ٹیڑھی میڑھی ناہموار گلیوں سے گزرتا ایک چھوٹے سے کچے مکان کے سامنے آ رکا تھا۔ ٹین کے دروازے پر لٹکتا بوسیدہ ٹاٹ کا پردہ اہلِ خانہ کی غربت و عسرت کی داستان سنا رہا تھا۔ رکشے والے کو کرایہ ادا کر کے شریفن خالہ رکشے سے نیچے اُتر آئی تھیں۔ نمو پہلے ہی اُتر چکی تھی اور شوق اور تجسس بھری نظروں سے ٹاٹ کے پردے سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ جلد از جلد اپنی ہونے والی بھابی کا چہرہ دیکھنے کے لئے بے چین و بے تاب تھی۔

''ارے لڈن کی بہو! کہاں ہو؟'' ٹاٹ کا پردہ اُٹھا کر کچے آنگن میں داخل ہوتے ہی شریفن خالہ نے بے تکلفی سے ہانک لگائی تھی۔ ''ذرا آؤ تو...... انو کی بہن نمو آئی ہے، اپنی حسنہ کو دیکھنے کے لئے۔''

اگلے ہی لمحے سامنے کوٹھڑی سے دو بچے کودتے ہوئے باہر نکلے تھے اور ان کے پیچھے ایک دُبلی پتلی، کالی سی عورت گود میں ایک مریل سے بچے کو سنبھالتی باہر آئی تھی۔

''سلام شریفن کھالہ!'' وہ خالہ کی طرف بڑھی۔

''جیتی رہو لڈن کی بہو!...... حسنہ کہاں ہے؟ یہ میں نمو کو لائی تھی اسے دکھانے کے لئے۔'' خالہ نے نمو کی طرف اشارہ کیا۔

''اچھا اچھا۔'' لڈن کی دُلہن نے چونک کر نمو کی طرف دیکھا۔ بے ساختہ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے تحسین و ستائش جھانکنے لگی تھی۔

''ماشاءاللہ! اتنی پیاری بہن ہے تو انو بھی اچھا ہی ہو گا۔'' اُس نے پُرشوق لہجے میں کہا اور دیوار کے ساتھ کھڑا پلنگ، آنگن میں بچھا دیا۔

''اور نہیں تو۔'' خالہ شریفن چارپائی پر بیٹھتے ہوئے فخریہ انداز میں بولیں۔ ہمارا انو بھی لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ایک ہے۔ حسنہ اور اُس کی جوڑی چاند سورج کی جوڑی لگے گی۔''

تھوڑی دیر میں ایک اور کالی اور موٹی سی عورت باہر نکل گئی۔ ''یہ حسنہ کی منجھلی بھابی ہے۔'' خالہ نے نمو سے تعارف کروایا تھا۔ کچھ دیر میں ہر سائز اور ہر رنگ کے بچے آنگن میں نکل آئے تھے اور کچھ کھیلنے کے لئے گلی میں نکل گئے تھے۔

''اس گھر میں حسنہ کے دونوں بڑے بھائی رہتے تھے۔ بقیہ تین بھائی ساتھ والے گھر میں رہتے ہیں۔'' شریفن خالہ بتا رہی تھیں مگر نمو کو ان سب باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو اپنے چہیتے بھائی کی ہونے والی دُلہن کے دیدار کے شوق میں مری جا رہی تھی۔

''خالہ! حسنہ بھابی کہاں ہیں؟ اُنہیں بلایئے نا۔'' آخر اس نے شریفن خالہ کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

''اے ہاں......'' خالہ کو بھی جیسے یاد آیا۔ ''اے منجھلی دُلہن! ذرا حسنہ کو تو بلاؤ...... کہاں چھپا کر رکھا ہے؟''

''تمہارے لئے چائے بنا رہی ہے۔ ابھی آتی ہے۔'' منجھلی دُلہن کے بجائے لڈن کی دُلہن نے جواب دیا تھا۔ اور

کچھ دیر بعد پلاسٹک کی چھوٹی سی چوکور ٹرے میں چائے کے دو مگ دھرے حسنہ سامنے والے دروازے سے برآمد ہوئی تھی۔ گوکہ نمو پہلے ہی دروازے کی سمت دیکھ رہی تھی، اس کے باوجود شریفن خالہ نے غیر محسوس طور پر اسے کہنی مار کر حسنہ کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اپنی بھابیوں کی نسبت حسنہ کہیں زیادہ خوش شکل تھی۔ سیاہ زمین پر سرخ اور زرد پھولوں والے کاٹن کے سوٹ میں اس کا گندمی رنگ دمکتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی چمکتی آنکھوں سے مکاری اور لالچ کا اظہار ہوتا تھا مگر اس وقت اُس نے آنکھیں نہیں اُٹھائی ہوئی تھیں۔ پلکیں جھکائے، شرمیلے انداز میں خالہ کے قریب آ کر دھیمی آواز میں انہیں سلام کیا تھا اور چائے کی ٹرے چارپائی کے درمیان رکھ دی تھی۔

''بیٹھو۔'' خالہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پیار بھرے لہجے میں کہا تھا اور وہ نگاہیں جھکائے چارپائی کے کونے پر ٹِک گئی تھی۔

''کیسی ہے.....؟'' شریفن خالہ نے ذرا سا نمو کی طرف مڑ کر آنکھ کے اشارے سے پوچھا۔

''اچھی ہے۔'' نمو کے لبوں پر پھوٹتی مسرت آمیز مسکراہٹ نے جواب دیا تھا۔ نمو کی منظوری پاتے ہی شریفن خالہ رشتے کے جمع توڑ میں لگ گئی تھیں۔

''انو میاں! اگر رشتہ طے ہو ہی گیا ہے تو شادی بھی کر لو۔ ہم بھی تمہارے سر پر سہرا دیکھ لیں۔'' رشتہ طے ہو جانے کی مٹھائی لیتے ہوئے ملیحہ بیگم نے حسرت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''اللہ نے چاہا تو آپ سو برس زندہ رہیں گی۔'' انو خلوص بھرے لہجے میں بولا تھا۔ ''لیکن اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو میں خالہ شریفن تک آپ کی خواہش پہنچا دوں گا۔''

شریفن خالہ کا پاسپورٹ بن گیا تھا، بس ٹکٹ خریدنے کی دیر تھی۔ اس لئے وہ بھی جلد از جلد انو کی شادی کی خواہاں تھیں۔ ملیحہ بیگم کی خواہش کا پتہ چلتے ہی گویا اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ والی بات ہوئی تھی اور انہوں نے لپک جھپک چار دن بعد کی تاریخ طے کر لی تھی۔

''ہائے ممی! اتنی جلدی سب کچھ کیسے ہوگا؟'' فریال پریشان تھی۔

''تم فکر مت کرو۔ شادی کا جوڑا تیار ہے۔'' ملیحہ بیگم نے مسکراتے ہوئے حسنہ کے لئے تیار کروایا ہوا چم چم کرتا سرخ جوڑا اور زیور کا ایک سیٹ سامنے رکھ دیا تھا۔ لڑکی والے بھی بے حد غریب تھے اور دھوم دھڑکے کے لئے انو کے پاس بھی کچھ نہیں تھا، اس لئے نہایت سادگی کے ساتھ آنے والے جمعے کو انور علی اور حسنہ کا نکاح ہو گیا تھا۔ بارات میں پروفیسر آفاق اور ملیحہ بیگم کے ساتھ فریحہ اور فریال بھی گئی تھیں۔ نمو کی خوشی کا تو ٹھکانہ ہی نہیں تھا، اپنے چاہنے والے بھیا کے لئے چاند سی دُلہن لا کر اس کے پاؤں زمین پر ہی نہ ٹکتے تھے۔

دُلہن کو گھر پہنچا کر اور چھوٹی موٹی رسموں کے بعد آفاق صاحب اپنی فیملی کے ساتھ اپنے گھر کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔

''انو بھیا کی دُلہن آپ کو کیسی لگی؟'' فریال نے اشتیاق بھرے لہجے میں ماں سے سوال کیا۔

''بظاہر تو اچھی ہے، مگر مجھے کچھ تیز طرار اور چالاک سی لگی۔'' ملیحہ بیگم نے سچائی سے اپنے احساسات کا اظہار کیا۔

''ارے بھئی! ابھی تو اس نے گھونگھٹ بھی نہیں اُٹھایا...... تم نے اُس کی طراری اور چالاکی کہاں سے دیکھ لی؟'' آفاق صاحب نے گو کہ یہ بات ہنستے ہوئے کہی تھی مگر ان کے لہجے میں چھپی ہلکی سی ناگواری ملیحہ بیگم نے محسوس کر لی تھی۔

''اصل میں نمو بہت معصوم اور سادہ لڑکی ہے۔ اس کے مقابلے میں مجھے وہ......'' ملیحہ بیگم نے قدرے شرمسار سے لہجے میں اپنی بات کی تاویل پیش کرنی چاہی مگر آفاق صاحب نے ہاتھ اٹھا کر موضوع بدل دیا۔

''بی شریفن کب جا رہی ہیں انڈیا؟''
''شاید اسی اتوار کو روانہ ہو جائیں گی۔'' ملیحہ بیگم نے جواب دیا۔
''واپسی کا کیا پروگرام ہے؟'' آفاق صاحب نے پوچھا۔
''ابھی کچھ ٹھیک پتہ نہیں ہے۔ مکان کے کاغذات انو کو دے کر جا رہی ہیں کہ ان کے آنے کا ارادہ ملتوی ہو جائے یا خدانخواستہ انہیں کچھ ہو جانے کی صورت میں گھر بیچ کر رقم ان کے بھائی کو کان پور بھیج دی جائے۔''
''اچھا.....'' آفاق صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔
''آپ بتایئے! ارجمند کب تک پہنچ رہی ہیں؟'' اچانک ہی ملیحہ بیگم کو خیال آ گیا تھا۔
''اظفر کا آخری سمسٹر ہے، سیکنڈ ویک میں امتحان ختم ہوتے ہی وہ روانہ ہو جائیں گی۔'' آفاق صاحب نے بتایا اور جانے کیوں اظفر کے نام پر فریال کو اپنے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوتا محسوس ہوا تھا۔

❂===❂===❂
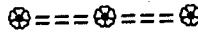
کام کی نوعیت جان کر رشید کو پسینہ آ گیا تھا۔
''وکیل صاحب! بہت مشکل کام ہے۔ مجھ سے نہیں ہوگا۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ ''اب کسی بھی ایسے کام میں ہاتھ نہیں ڈالنا، جس میں پکڑے جانے کا کھلا امکان ہو۔''
''تم ایک بااعتماد اور ذہین لڑکے ہو۔'' وارثی اس کے انکار سے متاثر ہوئے بغیر مضبوط لہجے میں بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم اتنے اعتماد سے یہ کام کرو گے کہ پکڑے جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور پھر یہاں ایئرپورٹ پر بھی اور وہاں دبئی میں بھی ہمارے لوگ موجود ہوں گے۔ تمہیں تو کچھ کرنا ہی نہیں ہے۔''
''پھر بھی..... میں اب کسی بھی ایسے جوکھم کے کام میں پڑنا نہیں چاہتا۔''
''رشید! ذرا سوچو! صرف ایک چکر میں تمہیں اتنی خطیر رقم مل جائے گی کہ تمہیں بینک سے لون لینے کی ضرورت نہیں رہے گی اور دوسرے چکر میں تم خود اپنی دکان خریدنے کے قابل ہو جاؤ گے۔''
رشید سوچ میں ڈوب گیا۔ کہاں تو وہ ایک چکر کے لئے آمادہ نہیں تھا، کہاں اس نے دوسرے چکر کی بھی حامی بھر لی تھی۔ اور شاید بار اس کی قسمت زوروں پر تھی کہ اس کے دونوں چکر کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچ گئے تھے۔ اور ہیروئن پاؤڈر کے پیکٹوں سے بھرے دو عدد بریف کیس دوبئی پہنچانے کے عوض اتنی رقم اس کے ہاتھ آ گئی تھی کہ اس نے مین بازار میں ایک دکان خرید کر کپڑے کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ سلطانہ بیٹے کے سدھرنے اور اس کی کامیابیوں پر بہت خوش تھی، مگر زیبن سے اس کی شادی کے فیصلے سے وہ زیادہ خوش نہیں تھی۔
''اب تو تیرا کاروبار بھی چل نکلا ہے، جلد ہی ہم کسی اچھی جگہ گھر لے کر اس منحوس محلے سے چلے جائیں گے۔'' ایک شام اس نے رشید سے کہا۔
''اور شادی.....؟'' رشید نے سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔
''شادی کا کیا ہے، وہ بھی ہو جائے گی۔'' سلطانہ سرسری سے لہجے میں بولی۔ ''میں تیرے لئے کسی اچھے گھرانے کی لڑکی دیکھوں گی۔''
''مگر اماں! میں نے وکیل صاحب کو زبان دے دی ہے۔'' رشید دبے لہجے میں بولا۔ ''اور پھر آخر زیبا میں ایسی کیا برائی ہے؟''
''کوئی ایک برائی ہو تو بتاؤں۔'' سلطانہ تنک کر بولی۔ ''گھر سے بھاگی ہوئی وہی بدچلن لڑکی رہ گئی ہے ہمارے گھر

کے لئے؟''

''اماں! یہ تو سراسر احسان فراموشی ہوگئی۔ ذرا سوچو! وحید بھائی اور قمرن خالہ نے برے وقت میں ہمارا کتنا ساتھ دیا تھا۔ تم کچھ بھی کہو، میں نے ہاں کہہ دی ہے بس۔''

جلد ہی رشید نے دوسرے محلے میں ایک صاف ستھرا دومنزلہ مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ اور اس گھر میں شفٹ ہوتے ہی وہ زیبن کو رخصت کروا کر لے آیا تھا۔ شادی کے بعد کے چند دن تو رنگ رلیوں میں گزرے، مگر جلد ہی سارے رنگ ہوا میں تحلیل ہوگئے۔ سلطانہ پہلے ہی اس شادی کے لئے راضی نہیں تھی۔ شادی کے بعد اس کی ناراضگی اور غصے میں اضافہ ہوا تھا۔ اسے بہو کی ایک ایک بات پر اعتراض تھا۔ اس کے کھانے پینے پر، پہننے اوڑھنے پر، بننے سنورنے پر، حتیٰ کہ رشید سے ہنسنے بولنے پر بھی وہ جلنے لگتی تھی۔ کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے، شاید یہی وجہ تھی کہ جس قدر اسے زیبن بری لگتی تھی، زیبن کو بھی اسی قدر وہ زہر لگتی تھی۔

''اماں! تم نے بھی مجھے ایک چنڈالنی کے بیٹے سے بیاہ دیا'' وہ ماں سے شکایت کرتی۔

''ارے کتنے دن زندہ رہے گی۔ قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھی ہے۔'' قمرن، بیٹی کو تسلی دیتی۔

''خوش فہمی ہے یہ تمہاری۔ بڑھیا خوب کراری ہے۔ اتنی جلدی نہیں مرنے والی۔ سب کو مار کے ہی مرے گی۔''

''ارے دفع کر اسے۔ تجھے ساس سے کیا لینا دینا؟ تُو رشید کو قابو کر...... میاں مٹھی میں ہو تو ساس نندیں خود بخود آگے پیچھے پھرتی ہیں۔''

ماں کے مشورے پر زیبن جل کر جواب دیتی۔ ''تم رشید کو اتنا بھولا نہ سمجھ کہ آسانی سے میری مٹھی میں آجائے گا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے ہے۔ جانے تمہیں اس میں کیا نظر آیا تھا، مجھے اس شرابی کبابی کے پلّے باندھ دیا۔''

''لو اور سنو! ہم نے تجھے اس کے پلّے باندھا؟'' قمرن نے ناک پر اُنگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور جو تُو لوٹن کبوتری کی طرح اس کے آگے پیچھے پھرا کرتی تھی، وہ......؟''

''تمہارے کہنے سمجھانے پر ہی میں اس کے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ وہ کبھی مجھے ایک آنکھ بھی نہ بھایا۔''

بیوی کی بے التفاتی نے جلد ہی رشید کا دل بھی اس کی طرف سے کھٹا کر دیا تھا۔ ماں اور بیوی کے روز روز کے جھگڑوں نے الگ اسے عاجز کر دیا تھا۔ شروع شروع زیبن اکیلے ہی ساس کا مقابلہ کرتی اور اکثر ہار جاتی، پھر اس نے ہر بڑے معرکے کے وقت اپنی ماں قمرن کو بلانا شروع کر دیا۔ دونوں ماں بیٹی خم ٹھونک کر میدانِ جنگ میں اُترتیں اور اکثر سلطانہ کو پسپا ہونا پڑتا۔ تب رشید کے گھر آتے ہی وہ اسے لے کر اندر کمرے میں چلی جاتی اور اپنی شکست کا دکھ اسے صلواتیں سنا کر کم کرتی۔

''اماں! میں ان روز روز کی لڑائیوں سے تنگ آچکا ہوں۔'' رشید بیزار ہو کر کہتا۔ ''باہر کے مسئلے مسائل نمٹا کر گھر آؤ تو یہاں روز ایک نیا مسئلہ کھڑا ہوتا ہے۔''

''تیرا ہی پیدا کردہ مسئلہ ہے یہ۔'' سلطانہ ہاتھ نچا کر جواب دیتی۔ ''میں تو روزِ اوّل سے منع کر رہی تھی، پر تجھے وہ اُونچا مکان نظر آرہا تھا۔ اور کہاں ہے وہ دس لاکھ کا ڈیپازٹ؟''

''کیا اماں! تم بھی روز روز وہی باتیں کر کے دل جلاتی ہو۔'' رشید نظریں چراتا ہوا قدرے شرمسار لہجے میں جواب دیتا۔

قمرن اور وحید نے کیسی چالاکی سے کھیل کھیلا ہے۔ کتنی آسانی سے ہمیں بے وقوف بنا لیا۔ نہ جہیز، نہ مکان، نہ رو.

پیسہ۔بس اپنی بدزبان اور آوارہ لڑکی ہمارے گلے باندھ دی۔لو اب ڈھول کی طرح بجاتے پھرو۔“
”اماں! وہی باتیں روز کرتی ہو۔یہی باتیں روز روز سن کر میرے کان پک چکے ہیں۔اب یہ بتاؤ،تم کیا چاہتی ہو؟“ رشید نے بیزار لہجے میں سوال کیا۔
”بس میں اُس منحوس سے نجات چاہتی ہوں‘ سلطانہ کے دل کی بات زبان پر آئی۔”تُو اُسے طلاق دے اور ناک چوٹی کاٹ کر گھر سے نکال دے۔“
”اماں! تم تو مرواؤ گی۔“ رشید ہنسا۔”طلاق تو دی جاسکتی ہے مگر ناک چوٹی نہیں کاٹی جاسکتی۔جانتی ہو،عورتوں کے حقوق کا بل پاس ہو چکا ہے۔ایسی کسی بھی حرکت پر عورتوں کی NGO's حرکت میں آجاتی ہیں۔مجھے فوراً جیل ہو جائے گی۔اور اب کے تو وارثی بھی ضمانت نہیں کروائے گا۔“
”پرے ہٹ! ہر بات مذاق میں اُڑا دیتا ہے۔“ سلطانہ برا سا منہ بنا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔رشید آہستگی سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا، جہاں زیبن منہ پھلائے بیٹھی تھی۔
”اگر ماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر شادی کی کیا ضرورت تھی؟“ وہ زہرخند سے بولی۔
”اب میں بھی اکثر یہی سوچتا ہوں کہ شادی کر کے میں نے غلطی کی۔اور خاص طور پر تم جیسی لڑکی سے شادی کر کے۔“ رشید نے کرسی پر بیٹھ کر جوتے اُتارتے جواب دیا۔
”کیا کہا.....؟“ زیبن نے آنکھیں نکالیں۔”مجھ جیسی لڑکی؟.....کیا کیڑے پڑے تھے مجھ میں؟ میں تو اپنے ماں باپ کو روتی ہوں کہ جن کی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے کہ تم جیسے شخص کے پلّے باندھ دیا“
”جب چاہو،پلّہ چھڑا کر جاسکتی ہو۔“ رشید بےزاری سے بولا۔
”مجھے بھیجنا چاہتے ہو تو دے دو تین طلاقیں۔میں کون سا یہاں رہنا چاہتی ہوں؟.....سچ تم ماں بیٹے نے مل کر میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔“
ٹھنڈے انداز سے شروع ہونے والی اس لڑائی میں رفتہ رفتہ اتنی گرمی آگئی کہ رشید نے غصے میں زیبن کو تین طلاقیں دے دیں۔سلطانہ، بیٹے کے پہلو میں بیٹھی سب تماشا دیکھ رہی تھی اور موقعے موقعے سے بیٹے کی حمایت میں لقمے بھی دیتی جا رہی تھی۔آگ بجھنے لگتی تو کبھی ہوا دیتی تو کبھی جلتی پر تیل ڈالتی۔آخر کو وہ ہو گیا، جو وہ چاہتی تھی۔زیب النساء روتی بلبلاتی، پیر پٹختی اپنے گھر چل دی اور رشید آنے والے طوفان کے مقابلے کے لئے خود کو تیار کرنے لگا۔اس موقع پر وکیل وارثی نے بہت اہم رول ادا کیا۔
”دیکھ! جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔“ اس نے وحید کو سمجھاتے ہوئے کہا۔”سانپ نکل چکا ہے، ابھی لکیر پیٹنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔طلاق ہو چکی ہے، اب عدالت میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔رہا سوال مہر کا......تو میں رشید سے مل کر اسے سمجھا بجھا کر مہر کی ادائیگی پر رضامند کرلوں گا۔بلاوجہ عدالتوں کے چکر میں پڑ کر پیسہ برباد کرنے کا کیا فائدہ؟“
بات وحید کی سمجھ میں آگئی تھی۔وارثی کے سمجھانے پر رشید بھی مہر کی ادائیگی پر آمادہ ہو گیا تھا۔سچ تو یہ ہے، زیبن سے جان چھڑا کر وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا اور خوش باش محسوس کر رہا تھا۔سلطانہ بھی خوش اور مطمئن تھی۔آخر کار اُس نے اُس چنڈالنی بہو کے جال سے اپنے بیٹے کو آزاد کروا لیا تھا۔شادی کے اس تلخ تجربے کے بعد رشید نے پھر کبھی شادی نہ کرنے کی قسم کھالی تھی۔خود سلطانہ بھی اتنی جلدی بیٹے کو پھر کسی اور کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔رشید نے اب اپنی پوری توجہ کاروبار پر لگا دی تھی۔دیکھتے ہی دیکھتے ایک سے تین دکانیں ہو گئی تھیں اور ایک صاف ستھرے متوسط طبقے کے علاقے میں بڑا سا گھر بھی خرید لیا تھا۔نیا کشادہ گھر، پھلتا پھولتا کاروبار، پیسے کی ریل پیل۔جلد ہی رشید کو گھر کا اکیلا

پن ستانے لگا۔ سُونا آنگن کاٹنے لگا۔ اور چند مہینوں بعد ایک نئی نیلی دُلہن اُن کی سُونی زندگی میں چھم سے اُتر چکی تھی۔

رضیہ ایک پڑھی لکھی اور سمجھ دار لڑکی تھی۔ اُس نے تمام معاملات کو خوش اسلوبی سے سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ سلطانہ کے ساتھ وہ ہمیشہ عزت سے پیش آتی اور اس کی جا و بے جا تنقید اور جلی کٹی کو نظرانداز کر دیتی تھی۔ اس نے رشید کی بے اعتدالیوں کو بھی اعتدال پر لانے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ ان دنوں رشید پھر ابن الوقت قسم کے دوستوں کے نرغے میں پھنس گیا تھا۔ اس لئے حسب سابق کچھ ہی عرصے میں اس کی زندگی میں اُترنے والی وہ نئی نویلی دُلہن اس کے دل سے اُتر گئی۔ اب وہ پھر سے باہر کی رنگ رلیوں میں کھو گیا تھا اور بھول گیا تھا کہ گھر میں ایک بیوی بھی ہے جو عنقریب اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔۔ اُسے اس بات سے نہ کوئی دلچسپی تھی، نہ کوئی خوشی تھی کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ دوسری طرف سلطانہ بھی فکر مند تھی کہ بچے کی پیدائش کے بعد کہیں وہ اپنی بیوی بچے میں نہ اُلجھ جائے اور ماں کو بھول جائے۔ چنانچہ اسے بھی آنے والے بچے کی کوئی خوشی نہ تھی۔ چند دنوں بعد رضیہ نے ایک لڑکی کو جنم دیا تھا۔ پہلی اولاد کی رشید کو کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی بلکہ بیٹی کے پیدا ہونے پر اسے صدمہ ہی ہوا تھا۔

''نوج!..... ہماری سات پیڑھیوں میں کسی کے گھر پہلوٹھی کی بیٹی نہیں پیدا ہوئی۔'' سلطانہ نے ناک پر اُنگلی رکھ کر اعلان کیا۔ ''اب نئی نئی باتیں ہو رہی ہیں۔''

رشید نے ان دنوں امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار شروع کیا تھا۔ اس سلسلے میں اسے تھائی لینڈ جانے کا اتفاق ہوا تھا اور وہاں جاتے ہی وہ ایک تھائی حسینہ کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔ جہاندیدہ تھائی حسینہ نے شادی کی پہلی شرط یہی رکھی کہ بیوی کو طلاق دینی ہوگی۔ سو رشید نے لمحہ بھر میں بیوی اور بیٹی سے ہمیشہ کے لئے تعلق توڑ کر تھائی دلربا سے رشتہ جوڑ لیا۔

رضیہ ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی۔ وہ اپنی بچی کی پرورش سے قاصر تھی، چنانچہ گھر چھوڑ کے جاتے وقت وہ بچی کو اس کی دادی کے پاس ہی چھوڑ گئی تھی۔ سلطانہ کو بیٹھے بٹھائے بہو سے تو نجات مل گئی تھی مگر پوتی کا پھندا اُس کے گلے میں پڑ گیا تھا۔ رشید تو تھائی لینڈ میں اپنی نئی نویلی بیوی کے ساتھ عیش کر رہا تھا اور وہ اس کی بیمار بیٹی کو پالنے پوسنے کے عذاب میں گرفتار تھی۔ بنیادی طور پر سلطانہ ایک شقی القلب اور بے رحم عورت واقع ہوئی تھی۔ اُسے نہ انسانیت کا احساس تھا، نہ خدا کا خوف..... رشید کی بیٹی پیدائشی طور پر کمزور اور بیمار تھی۔ ماں کی مہربان آغوش سے جدا ہونے کے بعد اس کی بیماری میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ رات دن پلنگ پر پڑی روتی رہتی۔ سلطانہ کبھی اسے دیکھ لیتی، کبھی نظرانداز کر دیتی۔ ناکافی خوراک اور بے توجہی کے باعث چند ہی دنوں میں بچی سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ اور جس دن رشید اپنی تھائی بیگم کے ساتھ آنے والا تھا، اس دن سے دو دن پہلے اس کی بیمار اور کمزور بیٹی اس کے گھر، اس کی دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔

رضیہ کو اطلاع ملی تو اس کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔ ''خدا ایسے مردوں کو باپ کیوں بناتا ہے جو اولاد کی ذمے داری اُٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتے؟'' اس نے چھلکتی آنکھوں سے سوچا تھا۔ اور مجھ جیسی بے بس و مفلس عورتیں جو اپنے بچوں کی پرورش نہیں کر سکتیں، آخر انہیں وہ ماں بناتا ہی کیوں ہے؟ اس نے پھر اپنی خالی گود دیکھی اور آنچل میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

رشی اپنی نئی نویلی بیوی روزا کے ساتھ گھر آچکا تھا۔ وہ اپنی اس شادی سے جس قدر خوش تھا، بعد میں اسے یہ شادی اسی قدر مہنگی پڑی تھی۔ روزا نے اسے اور اس کی ماں سلطانہ کو ایسے تگنی کے ناچ نچائے کہ وہ دونوں حواس باختہ ہو گئے۔ سلطانہ، بہو کے نام سے اور رشید شادی کے نام سے پناہ مانگنے لگا اور بڑے جتن اور لاکھوں کے نقصان کے بعد وہ اپنی تھائی بیوی سے جان چھڑانے میں کامیاب ہو سکا اور آئندہ کے لئے اس نے شادی کے نام سے توبہ کر لی۔ زندگی اطمینان سے بسر ہو رہی تھی۔ شباب کباب سب کچھ میسر تھا، کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ کاروبار خوب چمک رہا تھا، روپے پیسے کی فراوانی

تھی، خوب مزے میں کٹ رہی تھی۔ اب رشید چالیس کے پیٹے میں تھا، ماتھے سے بال اُڑ چکے تھے اور بڑی سی توند اس کے سیٹھ بن جانے کی دلیل تھی۔ حُسن پرستی ہمیشہ سے اس کی فطرت کا حصہ رہی تھی۔ مگر اس کے باوجود حُسن کو گلے کا ہار بنانے کا ارادہ بالکل ہی ترک کر دیا تھا۔ اب اس نے اپنی توجہ کاروبار پر مرکوز کر دی تھی۔

زبین کو طلاق دینے کے بعد وحید کی وجہ سے اس کے اور وکیل فہیم وارثی کے درمیان کچھ دُوری پیدا ہو گئی تھی، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ دُوری پھر دوستی میں بدل گئی تھی۔ اب وارثی کو باقاعدہ طور پر اپنا کاروباری مشیر بنا لیا تھا۔ فہیم کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے اس نے چار سو گز کے ایک پلاٹ پر سولہ فلیٹوں کا چار منزلہ اسکوائر تعمیر کر کے خود کو کنسٹرکشن کی دنیا میں متعارف کروا دیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ لاکھوں میں کھیلنے لگا تھا۔ پر اس کی یہ ساری دولت ایک نو وارد ماڈل عتیقہ کی نذر ہو گئی تھی، جس پر ان دنوں وہ دل و جان سے فدا تھا۔ دولت کے ختم ہوتے ہی یہ تعلق بھی ختم ہو گیا اور ''رشید کنسٹرکشن کمپنی'' کا پروپرائیٹر عبدالرشید ایک بار پھر کپڑے کی دکان کے تھڑے پر آ بیٹھا تھا۔ پھر بہت غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد فہیم وارثی کی فہم و فراست پر عمل کرتے ہوئے اس نے کراچی جانے کا پروگرام بنایا تھا۔

''نہ بابا! میں اپنا گھر بار اور اپنا شہر چھوڑ کر کراچی کی خاک چھاننے کیوں جانے لگی؟'' سلطانہ نے کراچی جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

''ٹھیک ہے اماں! جیسی تمہاری مرضی۔'' رشید نے لاپروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ ''تم ساتھ نہیں چلنا چاہتیں تو بے شک یہیں رہو۔ میں تو چلا کراچی۔''

کراچی میں کاروبار کے خاصے مواقع تھے، اس نے تعمیراتی کام کے لئے قرض دینے والے ایک بڑے سرکاری ادارے سے ایک بڑا قرض لے کر تعمیرات کے کام کا آغاز کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا کاروبار چل نکلا تھا اور وہ ایک بار پھر دولت میں کھیلنے لگا تھا۔ ایسے میں ہمیشہ کی طرح اس بار بھی کچھ ابن الوقت قسم کے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ انہی میں سے ایک اسٹاک بروکر یونس لاکھانی بھی تھا۔ بنیادی طور پر وہ رشید کو اسٹاک مارکیٹ میں پیسہ لگانے پر آمادہ کرنے آیا تھا مگر اس کا رجحان اس کی طرف نہ پا کر اس نے اس کی پسند اور دلچسپی کے کاروبار کی بات شروع کر دی تھی، اور شام کو اسے ساتھ لئے ایس آر پروڈکشن کمپنی کے مالک، ڈرامہ ڈائریکٹر ایس رحمان سے ملوانے جا پہنچا تھا۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی اسد نے ثروت سے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا، مگر اب سوال یہ تھا کہ ان کا یہ فیصلہ دادی اور والد تک کون پہنچائے؟...... جہاں تک خود ان کا تعلق تھا، تو کچھ لحاظ مانع تھا اور کچھ خوف۔ کیونکہ وہ اپنے والد اور خالہ کے مابین موجود دُوری اور خلیج سے واقف تھے۔ ایسے میں انہیں اپنے چھوٹے بھائی سرمد بے طرح یاد آئے تھے۔ اس وقت سرمد ان سے ہزاروں میل دور تھے۔ وہ پچھلے دو سالوں سے انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے انگلینڈ میں مقیم تھے۔ ایک لمحے کو تو اسد کا دل چاہا کہ وہ فون کر کے سرمد سے مدد کی درخواست کریں مگر پھر انہوں نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سرمد بھی وجاہت مرزا کی طرح ندرت جہاں اور ان کی فیملی کو ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ ایک شام انہوں نے خود ہی عاتکہ بیگم سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

''اماں بی! ہمیں کوئی پسند ہے، اور ہم اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' انہوں نے نیچی نگاہ اور جھکے سر کے ساتھ ایک ہی سانس میں اپنا مدعا بیان کر دیا تھا۔

''اچھا......'' عاتکہ بیگم نے حیران نظروں سے اسد کی طرف دیکھا۔ ''کون ہے وہ؟'' ان کے سوال سے تجسس اور شوق بھی جھلک رہا تھا۔

''ثروت۔'' لمحہ بھر کو نگاہ اٹھا کر انہوں نے دادی کے دمکتے چہرے کی طرف دیکھا، پھر حسبِ سابق نگاہیں جھکا کر

اپنے مطلوب کا نام لے دیا۔

''ثروت.....؟'' عاتکہ بیگم واقعی پہچان نہیں پائی تھیں۔''کون ثروت؟'' انہوں نے متعجب لہجے میں سوال کیا۔

''ندرت خالہ جان کی بڑی بیٹی، ثروت جہاں۔'' تعارف کے بعد اسد نے ایک بار پھر نگاہیں اُٹھائیں۔ عاتکہ بیگم کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔

''اماں بی!'' اسد نے دادی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر انہیں متوجہ کرنا چاہا۔''آپ ابا جان تک میرا یہ فیصلہ پہنچا دیں گی نا؟''

''اسد میرے چاند!'' اپنے شانے پر دھرے اسد کے ہاتھ پر عاتکہ بیگم نے اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بے حد دھیمی آواز میں پوچھا۔''تم اپنے اس فیصلے کو بدل نہیں سکتے؟''

''ہرگز نہیں۔'' اسد کے دھیمے لہجے میں چٹانوں کی سختی تھی۔

''تو بہتر ہو گا کہ.....اپنے ابا جان سے تم خود بات کرلو'' عاتکہ بیگم نے شکستہ لہجے میں انہیں مشورہ دیا تھا۔

اور ان کا یہ فیصلہ جب وجاہت مرزا کے کانوں تک پہنچا تھا تو ان کے دل و دماغ میں ایک بھونچال سا آ گیا تھا۔ جس عورت نے ہمیشہ ان کے گھر کی خوشیوں کو تاراج کیا تھا اور ان پر ان کی عزیز بیوی کے قتل کا گھناؤنا الزام لگایا تھا، اس ناپسندیدہ ترین ہستی کی بیٹی کو وہ بہو بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے سختی سے اس رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ ندرت کی بیٹی، سطوت کی بھانجی اور حشمت جہاں کی نواسی تھی، بلکہ اس لئے کہ انہیں یقین تھا کہ وہ ماں، خالہ اور نانی کی فطرت لے کر پیدا ہوئی ہے، اور وہ اپنی طرح، اپنے بیٹے کی زندگی تباہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ عاتکہ بیگم کا کہنا نہ مان کر، ان کے مشورے کو نظرانداز کر کے انہوں نے جو زندگی حاصل کی تھی، اس زندگی نے قدم قدم پر انہیں حماقت کا احساس دلایا تھا، اور پل پل پچھتاوؤں کی آگ میں جلایا تھا۔ اس لئے وہ اسد کو پچھتاوؤں کے گڑھے میں گرنے سے روکنا چاہتے تھے۔ مگر اسد ان کے کسی بھی ایسے فیصلے کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے، وہ ہر حال میں اور ہر قیمت پر ثروت جہاں کو اپنی شریکِ حیات بنانے کے خواہاں تھے۔

''اماں بی!.....آپ ابا جان کو سمجھائیے پلیز۔'' اسد یہ جملہ دادی سے بیسیوں بار کہہ چکے تھے، مگر وہ ہر بار محض سر ہلا کر رہ جاتی تھیں، وجاہت مرزا سے کچھ نہیں کہہ پاتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ خود ثروت کے حق میں نہیں تھیں، لیکن انکار یا اختلاف سے انہوں نے اس لئے اجتناب کیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اسد بھی اپنے باپ کی طرح ضدی اور خودسر ہیں، آخر کار اپنی بات منوا کر دم لیں گے۔ اس لئے سمجھا کر یا منع کر کے وہ اپنی بات کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ اور جہاں تک وجاہت مرزا کا تعلق تھا، وہ ان سے بھی خوب واقف تھیں کہ انہیں کچھ سمجھانا بے سود ہی ہو گا۔ اس کے باوجود آج انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ وجاہت مرزا سے اس موضوع پر بات کریں گی۔

وہ آہستگی کے ساتھ بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئیں، پیروں میں سلیپر اُڑستی دیوار کا سہارا لیتی وہ کمرے سے باہر نکل آئیں۔ کمرے کے سامنے مرمر کے کشادہ ٹیرس پر بید کی کرسیاں دھری تھیں۔ وہ آہستگی سے چلتی اپنی مخصوص کرسی پر جا بیٹھیں۔

''اماں بی!...چائے لے آؤں؟'' انہیں دیکھتے ہی تیرہ سالہ نکیتا لپک کر قریب چلی آئی تھی۔

''پہلے وجاہت میاں کو اطلاع کر دو۔'' عاتکہ بیگم نے دھیمی آواز میں کہا۔

''جی اچھا۔'' نکیتا نے مؤدب لہجے میں جواب دیا تھا اور تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی تھی۔ نکیتا، بوڑھے مالی رام پرشاد کی اکلوتی بیٹی شانتی کی آخری نشانی تھی۔ نکیتا کی ولادت کے ساتھ ہی شانتی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئی تھی۔

نومولود نواسی کو اس کے نانا رام پرشاد نے ہی پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ اس کا باپ تو بیوی کے مرتے ہی دوسری شادی کر کے کسی اور شہر میں جا بسا تھا اور کبھی بھولے سے بھی پلٹ کر بیٹی کی خبر نہ لی تھی۔ رام پرشاد کے فوت ہونے کے بعد عاتکہ بیگم نے نکیتا کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا تھا۔ اور اسی توجہ اور محبت سے اس کی پرورش کر رہی تھیں، اس کی حیثیت اس گھر میں نوکرانی سے زیادہ گھر کی بیٹی کی سی تھی۔ وہ عاتکہ بیگم کو اماں بی، وجاہت مرزا کو ابا جان، اسد میاں کو بھائی جان اور سرمد کو چھوٹے بھیا کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ سب ہی اس سے محبت کرتے تھے اور وہ خود بھی سب کو اپنا سمجھتی تھی۔

وجاہت مرزا بالکونی کی گرل پر جھکے بے آب و گیاہ احاطے کی طرف دیکھتے ہوئے ماضی کے کھنڈرات میں کھوئے ہوئے تھے، تب ہی نکیتا کی آواز پر چونک کر پلٹے تھے۔

''اوہ اچھا.....'' وہ ایک دم سیدھے ہوتے ہوئے بولے تھے۔ ماضی کی پرچھائیوں میں گم ہو کر وہ یہ بات بھول ہی گئے تھے کہ شام کی چائے وہ ماں کے ساتھ ٹیرس پر پیتے تھے، سو وہ آہستگی سے سیڑھیوں کی سمت بڑھ گئے۔ نکیتا پہلے ہی سیڑھیاں پھلانگتی تیزی سے کچن کی طرف جا چکی تھی، وجاہت مرزا آہستگی اور بے دلی سے قدم دھرتے ماں کے پاس جا پہنچے تھے۔ ان کے بیٹھتے ہی نکیتا چائے کی ٹرے لئے آموجود ہوئی تھی۔

''ہم تم سے آج اسد میاں کے سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔'' چائے کی پیالی تھامتے ہوئے عاتکہ بیگم نے بغیر کسی تمہید کے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ وجاہت مرزا نے یک لخت چونک کر ماں کی جانب دیکھا تھا، پھر سعادت مندی سے سر جھکا کر آہستگی سے گویا ہوئے تھے۔

''فرمایئے۔''

''ہم اسد میاں کی شادی کے سلسلے میں تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' عاتکہ بیگم کی آواز بے حد دھیمی تھی۔ ''وہ ثروت سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو......''

''اسد میاں نے اگر آپ سے سفارش کے لئے کہا ہے تو.....'' وہ ان کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولے۔ ''انہوں نے آپ کو یہ بھی بتایا ہو گا کہ میں نے اس شادی سے انکار کر دیا ہے۔''

عاتکہ بیگم نے نگاہ اٹھا کر بیٹے کے کرخت چہرے کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں کرب بھی تھا اور بے بسی بھی۔ پھر انہوں نے نگاہوں کے ساتھ سر بھی جھکا لیا تھا۔

''اور......اس انکار کی وجہ، آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے؟'' وجاہت مرزا کے وضاحتی سوال پر ان کا جھکا سر کچھ اور جھک گیا تھا۔

''اماں بی!.....اگر آپ کو یاد ہو تو...... برسوں پہلے میں نے اسی طرح آپ کے سامنے سطوت سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔'' دم لینے کو وہ دم بھر ٹھہرے۔ ''اور آپ نے شادی سے انکار کر دیا تھا۔''

عاتکہ بیگم نے نگاہ اٹھا کر گھڑی بھر کو وجاہت مرزا کی طرف دیکھا تھا۔

''پھر میری ضد اور میرے اصرار پر، آپ مان گئی تھیں۔'' وجاہت مرزا نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن وقت گزرنے کے ساتھ مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ آپ کا انکار درست تھا۔ پھر بارہا میں نے سوچا تھا کہ کاش آپ کسی بھی طرح نہ مانتیں، اور میں آخر کار مجبور ہو کر اپنی اس خواہش سے دستبردار ہو جاتا۔''

عاتکہ بیگم نے حیران نظروں سے بیٹے کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ ان کے اندر پچھتاوے کا احساس اس قدر شدید ہو گا، یہ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

''میں اسد کو پچھتاوے کے اس الاؤ میں جلنے سے بچانا چاہتا ہوں۔'' چند لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے اپنا

فیصلہ سنایا۔ ''اسی لئے میں نے سوچ لیا ہے کہ میں کسی بھی طرح، کسی بھی قیمت پر انہیں ثروت جہاں سے شادی کی اجازت نہیں دوں گا۔''

ٹیرس کی سیڑھیاں چڑھتے، اسد میاں کے قدم جہاں کے تہاں رک گئے تھے۔ وجاہت مرزا کے الفاظ تیر و نشتر بن کر کانوں کی راہ سے گزر کر ان کے دل میں پیوست ہو گئے تھے۔ وجاہت مرزا کا پتھریلا لہجہ اور آہنی عزم، اسد کے ارادے کو متزلزل کرنے کے لئے گو کہ بہت کافی تھا، مگر وہ بھی آخر انہی کے بیٹے تھے، اپنی بات پر قائم رہنے کے ہنر اور اپنی بات منوا کر دم لینے کے طریقوں سے خوب واقف تھے، سو اوپر آئے بنا وہیں سے واپس پلٹ گئے تھے۔ عاتکہ بیگم نے ہراساں نظروں سے پہلے جاتے ہوئے اسد کو، پھر قریب بیٹھے وجاہت مرزا کو دیکھا۔

''شاید اسد میاں نے آپ کی بات سن لی ہے۔'' ان کے مضطرب لہجے میں خدشہ دھڑک رہا تھا۔

''یہ تو اچھا ہوا۔'' وجاہت مرزا نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔ ''اب دوبارہ سے اسے بتانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔'' عاتکہ بیگم کئی لمحوں تک ان کے چہرے پر تنی چٹانوں کی سی سختی کو متوحش نظروں سے تکتی رہی تھیں، پھر تھکن سے چُور لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

''وجاہت میاں! ڈالی کو اس قدر موڑنا چاہئے جتنی اس کی لچک اجازت دے، لچک سے زیادہ موڑنے سے ڈالی ٹوٹ بھی سکتی ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ...... '' وجاہت مرزا نے بے یقین نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ ''کہ ثروت سے شادی کی خاطر اسد آپ کو، مجھے اور اس گھر کو چھوڑ کر بھی جا سکتے ہیں؟''

''جوانی کی ضد اتنی ہی خطرناک اور بدلحاظ ہوتی ہے۔'' عاتکہ بیگم کی آواز بے حد دھیمی تھی۔ ''تم اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہو...... کہ اگر...... اس وقت ہم کسی بھی طرح تمہاری اور سطوت کی شادی کے لئے رضامند نہ ہوتے..... تو کیا تم بھی کچھ ایسا ہی نہ کر گزرتے.....؟''

وجاہت مرزا نے ایسا کچھ نہیں سوچا تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایسا کچھ سوچنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ وہ ماں کی محبت سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ آخر کار عاتکہ بیگم ان کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال کر ہار مان لیں گی۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں سوچا تھا۔'' وہ پورے وثوق سے بولے۔ ''کیونکہ مجھے یقین تھا کہ آپ آخر کار مان جائیں گی۔'' جملے کا آخری حصہ ادا کرتے وقت ان کی آواز بے حد دھیمی ہو گئی تھی۔

''اور وجاہت مرزا! اتنا جان رکھو......'' عاتکہ بیگم نے بھی اسی دھیمے مگر بے حد مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اگر اسد کو یہ یقین ہو گیا کہ تم آخر کار نہیں مانو گے تو وہ سب کر گزریں گے، جس کے بارے میں تم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔''

''مگر اماں بی.....!'' وجاہت مرزا کے بے یقین لہجے میں دبا دبا احتجاج تھا۔ ''میں یہ سب کچھ اسی کے بھلے کے لئے ہی کر رہا ہوں۔''

''کسی مفکر نے کیا اچھی بات کہی ہے۔'' عاتکہ بیگم دور کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہ مرتکز کرتے ہوئے دھیمے اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولیں۔ ''اگر بچہ منع کرنے سے بھی باز نہ آئے اور آگ میں ہاتھ ڈالنے کی ضد کرے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ فطرت خود اسے سزا دے گی۔''

''بچے کی یہ سزا، اس کے بڑوں کے لئے تکلیف اور اذیت کا باعث ہو گی۔'' وجاہت مرزا کی آواز میں کرب کا احساس لرزاں تھا۔

''پھر تم کہو، اور کیا، کیا جا سکتا ہے؟'' عاتکہ بیگم نے بے بس نظروں سے بیٹے کے اُلجھے اور پریشان چہرے کی

طرف دیکھا۔ ''اسد میاں ہر قیمت پر ثروت سے شادی کا عزم کئے بیٹھے ہیں۔ تم رضامند نہ بھی ہوئے تو وہ یہ رشتہ ضرور جوڑیں گے۔''

وجاہت مرزا کئی لمحوں تک بے بس اور بے یقین نظروں سے ماں کے افسردہ چہرے کی طرف تکتے رہے، عاتکہ بیگم کی سن رسیدہ اور زمانے کی سرد و گرم چشیدہ نگاہوں نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا، آخر کار انہیں اس کی سچائی کا یقین ہو چکا تھا۔ کئی لمحوں تک وہ فیصلہ کرنے اور نہ کرنے کی کشمکش سے دوچار رہے تھے۔ اور آخر کار ایک حتمی فیصلے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

''تو ٹھیک ہے۔'' ان کے لہجے میں چٹانوں کی سختی تھی۔ ''اسد میاں سے کہہ دیجئے کہ وہ ثروت جہاں سے شوق سے رشتہ قائم کریں مگر پھر ان کا ہم سے اور اس گھر سے کوئی رشتہ، کوئی ناطہ نہ ہوگا۔'' اپنا فیصلہ سنا کر وجاہت مرزا اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ عاتکہ بیگم ہکا بکا انہیں سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھتی رہی تھیں۔ جانے اس ہنستے بستے گھر کو کس کی نظر لگ گئی تھی۔ دن بہ دن سمٹتا ہی جا رہا تھا۔ سطوت جہاں کا انتقال ہو گیا، سرمد مرزا اعلیٰ تعلیم کی خاطر انگلینڈ جا بسے اور اسد مرزا کی بھی روانگی کے سامان ہو چکے تھے۔ پہلے ہی اس گھر میں ویرانیاں اور سناٹے کیا کم تھے جو مزید ویرانیاں اس گھر کی جانب بڑھی چلی آ رہی تھیں۔ ہر سمت کیسی بے رونقی ٹپکتی تھی، گھر کی خاموشیوں میں لے دے کر ایک اسد کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی تھی، پر اب تو یوں لگ رہا تھا کہ یہ آہٹیں بھی سناٹوں میں گم ہونے کو تھیں۔ وہ وجاہت مرزا کی ضد اور اسد مرزا کی ہٹ سے خوب واقف تھیں، جانتی تھیں، نہ باپ اپنی ضد چھوڑے گا اور نہ بیٹا اپنی ہٹ سے ہٹے گا۔ آنے والے وقت کی اندوہناکی کی صورت سے ہی ان کا ننھا سا دل لرز کر رہ گیا تھا اور آپ ہی آپ پلکوں پر نمی اُتر آئی تھی۔ تب ہی نکیتا کارڈلیس فون لئے کمرے میں برآمد ہوئی تھی۔

''اماں بی! سرمد بھیا کا فون ہے۔'' اس نے فون ان کی جانب بڑھایا اور انہوں نے بے تابی سے فون تھام لیا۔

''اماں بی! آداب۔'' سرمد کی مؤدب، مہذب اور محبت سے لبریز آواز ان کے کانوں میں گونجی تو ان کا افسردہ لہجہ آپ ہی بھیگتا چلا گیا۔

''سرمد میرے لعل!..... کب آؤ گے؟''

''اماں بی! آپ رو کیوں رہی ہیں؟'' ان کی آواز کی نمی کو محسوس کر کے سرمد تڑپ اُٹھے تھے۔ ''کیا بات ہے اماں بی؟..... آپ پریشان کیوں ہیں؟''

''بس تمہاری جدائی کے خیال سے دل بھر آیا تھا'' عاتکہ بیگم نے خود کو سمجھاتے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ''تمہیں دیکھنے کو نظریں ترس گئی ہیں۔ گھر کب آؤ گے؟''

''آپ کہیں تو میں کل ہی آپ کے قدموں میں حاضر ہو سکتا ہوں۔'' سرمد نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ''آپ حکم کر کے تو دیکھیں۔''

''نہیں چندا!'' عاتکہ بیگم نے تڑپتے دل کو پہلو میں سنبھالتے ہوئے دھیرج بھرے لہجے میں کہا۔ ''دل پر پتھر رکھ کر تمہیں پردیس بھیجا ہے تو تمہاری تعلیم مکمل ہونے تک تمہارا انتظار تو کرنا ہی ہوگا۔''

''اماں بی! سب ٹھیک ہے نا؟'' دادی کے جواب سے سرمد کو تشفی نہیں ہوئی تھی، دوبارہ سوال کیا۔ ''آپ ابا جان، اسد بھائی، سب خیریت سے تو ہیں نا؟''

''ہاں بیٹا! سب ٹھیک ہے۔ اللہ کا کرم ہے۔'' عاتکہ بیگم سات سمندر پار بیٹھے سرمد کو گھر میں پھیلے تناؤ کے بارے میں بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھیں، اس لئے رسان بھرے لہجے میں بولیں۔ ''تم بے سبب پریشان ہو رہے ہو۔ یہاں

سب خیریت ہے۔"

"ابا جان کیسے ہیں؟......اسد بھائی آج کل کہاں ہوتے ہیں؟ اتنے دن ہو گئے، ان سے بات ہی نہیں ہوئی۔ کیا کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گئے ہیں؟"

"ہاں! آج کل کچھ زیادہ مصروف ہیں۔ پچھلے دنوں تو گیس فیلڈ پر گئے ہوئے تھے۔" عاتکہ بیگم نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔ "تم اپنی کہو، کیسے ہو؟"

"آپ کی دعائیں ہیں۔" سرمد دیر تک دادی سے باتیں کرتے رہے تھے۔ عاتکہ بیگم کی پُرنم آواز نے ہی انہیں بتا دیا تھا کہ کسی وجہ سے وہ کچھ متفکر اور پریشان ہیں۔ مگر وہ دادی کی عادت سے واقف تھے کہ وہ کبھی بھی ازخود اپنی پریشانی کا اظہار نہیں کریں گی، اس لئے اصرار کئے بنا ڈھیر ساری باتیں کر کے خود ہی ان کی پریشانی کا کھوج لگانے کی کوشش کی تھی مگر وہ اپنی کوشش میں ناکام رہے تھے۔ اس لئے فون بند کرنے کے بعد وہ خود بھی خاصے فکرمند اور اپ سیٹ ہو گئے تھے۔ عاتکہ بیگم آہنی اعصاب کی مالک تھیں، بڑی سے بڑی مشکل اور مصیبت کو خندہ پیشانی سے سہہ لینے کا حوصلہ رکھتی تھیں۔ سرمد نے انہیں صرف سطوت جہاں کی وفات پر روتے دیکھا تھا، مگر آج ان کی آواز کی نمی اس بات کی غماز تھی کہ یا تو بڑھاپے کے باعث اب ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں، یا پھر خدانخواستہ کوئی ایسی بات ضرور ہے، جس نے ان کے فولادی دل کو گرما دیا ہے۔ بھلا ایسی کیا بات ہو سکتی ہے؟ سرمد نے حیرانی اور پریشانی کے ملے جلے احساس کے ساتھ سوچا اور اگلے ہی لمحے موبائل اٹھا کر اسد کا نمبر ملا رہے تھے۔ رابطہ قائم ہو گیا تھا۔ بیل جا رہی تھی، مگر دوسری جانب سے کوئی رسپانس نہیں تھا، یا اسد مصروف تھے یا نیٹ ورک بزی تھا۔ جو بھی تھا، اسد سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ تھک کر انہوں نے فون بند کر دیا تھا اور تھکے تھکے انداز میں بیڈ پر دراز ہو گئے تھے۔

ابھی وہ چھوٹے ہی تھے جب انہوں نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ ان کی ماں کا رویہ دادی اور باپ کے ساتھ کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے۔ بوڑھی دادی کی خاموشی اور باپ کے ضبط کے درد کو انہوں نے بہت کم عمری میں ہی محسوس کر لیا تھا۔ اور احساس کی اس رمق نے ان کے دل کے گوشے گوشے میں دادی اور باپ کی محبت بھر دی تھی۔ سطوت جہاں کے سلوک اور ناروا باتوں نے ان کی طرف سے تو سرمد کا دل کھٹا کیا ہی تھا بلکہ یہ سب دیکھ کر عورت ذات کی طرف سے ہی ان کے دل میں ایک غلط فہمی اور ناپسندیدگی سی پیدا ہو گئی تھی۔ اپنے مشاہدے سے انہوں نے یہ اخذ کیا تھا کہ عورت سے محبت کی جائے یا اسے حد سے زیادہ اہمیت دی جائے تو وہ اپنی اوقات بھول کر سر پر سوار ہو کر ناچنے لگتی ہے۔ اپنے گھر میں تو کم از کم انہوں نے یہی دیکھا تھا۔ وجاہت مرزا جس قدر بیوی کے آگے پیچھے پھرتے تھے، ان کا مزاج اسی قدر تلخ و ترش ہوتا جاتا تھا۔ اور اس مشاہدے اور تجربے کی بنا پر وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اوّل تو شادی ہی نہ کی جائے، اور اگر ایسا کرنا کبھی ناگزیر ہو ہی جائے تو بیوی کو بالکل اہمیت نہ دی جائے اور اس سے ایک فاصلہ رکھا جائے، اسے ضرورت اور مجبوری نہ بننے دیا جائے۔ وہ اپنی بے سروپا سوچوں میں غلطاں و پیچاں یونہی لیٹے تھے کہ تب ہی دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز پر چونک اٹھے تھے۔

"یس۔" انہوں نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا اونچی آواز میں کہا۔ "دروازہ کھلا ہے، پلیز اندر چلے آیئے۔"

اگلے ہی لمحے اظفر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تھے۔

"تم اب تک بستر پر لیٹے ہو؟" انہوں نے قدرے حیران لہجے میں پوچھا تھا۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں.....طبیعت تو ٹھیک ہے۔" سرمد اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے مضمحل سے لہجے میں بولے۔ "وہاں پاکستان میں اماں بی

سے بات ہوئی تھی، وہ کچھ افسردہ سی تھیں۔اس لئے میری طبیعت بھی کچھ بوجھل ہوگئی ہے۔''

''اماں بی کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' اظفر نے پُرتشویش لہجے میں سوال کیا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے، مگر کوئی ایسی بات ضرور ہے جس کے باعث وہ فکرمند اور رنجیدہ تھیں۔'' سرمد نے پُرسوچ انداز میں جواب دیا۔ چند لمحوں تک کمرے میں گمبھیر خاموشی چھائی رہی۔

''اچھا چلو......اب جلدی سے اُٹھ کر تیار ہو جاؤ۔'' اظفر نے بالکل اچانک ہی حکم دیا۔

''کیوں؟'' سرمد نے حیرت بھری سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''ارے بھول گئے؟'' اب کے اظفر کی حیران ہونے کی باری تھی۔ ''یاد نہیں، آج رات مام نے تمہیں ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔''

''اوہ ہاں......'' سرمد کو یاد آیا۔ ''مگر اظفر!......اس وقت شاید......'' انہوں نے معذرت خواہانہ نظروں سے اظفر کی طرف دیکھا۔

''ہرگز نہیں۔'' ان کی بات کو سمجھتے ہوئے اظفر اُچھل کر بولے۔ ''کوئی ایکسکیوز نہیں چلے گا۔ تم جانتے ہو نا، تمہاری خاطر مام کس قدر اہتمام کرتی ہیں۔ تم نہیں چلو گے تو انہیں کس قدر برا لگے گا۔''

پروفیسر آفاق احمد، وجاہت مرزا کے بچپن کے دوست اور کلاس فیلو تھے۔ انٹر تک دونوں ایک ہی کلاس اور ایک ہی کالج میں پڑھے تھے۔ انٹر کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے وجاہت مرزا انگلینڈ چلے گئے تھے اور آفاق احمد نے کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ انگلینڈ میں تعلیم کے دوران وجاہت مرزا کی ملاقات عالم تاب سے ہوئی تھی۔ دونوں ایک ہی یونیورسٹی میں زیرِتعلیم تھے۔ ہم وطن اور ہم زبان ہونے کے احساس نے جلد ہی دونوں کو بے حد قریب کر دیا تھا۔ عالم تاب احمد کی شادی آفاق احمد کی بہن ارجمند بانو سے ان کی اسی باہمی دوستی اور تعلق کی بنا پر ہوئی تھی۔ تعلیم ختم ہونے کے بعد وجاہت مرزا نے والد کا کاروبار سنبھال لیا تھا۔ جبکہ آفاق احمد نے تدریس کے شعبہ کو ترجیح دی تھی اور بحیثیت استاد یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کر دیا تھا۔

عالم تاب کچھ عرصہ پاکستان میں رہے، پھر شادی کے بعد بیوی کو لے کر دوبارہ انگلینڈ میں جا بسے تھے۔ شادیوں اور بچوں کے بعد سب ہی اپنی مصروفیات اور مسائل میں اُلجھ کر رہ گئے تھے، اس لئے گو کہ اب پہلی سی ملاقاتیں اور باتیں نہ رہی تھیں، مگر دلوں میں موجود دوستی کا رشتہ سدابہار غنچے کی طرح ہر دور اور ہر موسم میں شاداب اور تروتازہ رہا تھا۔ مہینوں برسوں ملاقات نہ ہوتی، پر جب ملتے تھے تو یوں لگتا تھا کہ کبھی بچھڑے ہی نہ تھے۔ وقاص بیگ کے بعد پروفیسر آفاق احمد ہی وجاہت مرزا کے رازدار اور غمگسار دوست تھے، ہر اذیت اور کرب کے لمحے میں وہ آفاق احمد کا ہی کندھا تلاش کرتے تھے اور آفاق احمد نے بھی اپنی محبت اور اخلاص سے کبھی انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔ سرمد اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ پہنچے تو عالم تاب مع ارجمند بانو اور دونوں بیٹوں ظفریاب اور اظفر کے ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ عالم تاب اور ان کی فیملی کی تو خواہش تھی کہ سرمد ہوسٹل کے بجائے ان کے گھر میں ہی رہیں۔ مگر سرمد اس بات کے لئے آمادہ نہ ہوئے تھے۔ ہوسٹل میں رہنے کے باوجود وہ اظفر کے ساتھ اکثر ان کے گھر جاتے رہتے تھے۔ اظفر اور سرمد تقریباً ہم عمر تھے اور دونوں ایک ہی یونیورسٹی میں زیرِتعلیم تھے۔ سرمد ایک بے حد خوب صورت فطرت کے مالک تھے۔ جوں جوں ان کی خوبیاں اظفر پر عیاں ہوتی گئیں، وہ ان کے گرویدہ ہوتے چلے گئے اور جلد ہی دونوں بے تکلف اور محبت بھری دوستی کے رشتے میں بندھ گئے تو عالم تاب صاحب اور خاص طور پر ارجمند بانو کی نگاہ میں سرمد کی وقعت اور قدر و منزلت اور بڑھ گئی تھی۔ عالم تاب احمد، ارجمند بانو اور ظفریاب سب ہی سرمد کو بے حد پسند کرتے تھے۔ ان کی دل آویز شخصیت اور دل نواز فطرت کے سب

ہی گرویدہ تھے۔ جہاں تک ارجمند بانو کا تعلق تھا، وہ ایک بے حد محبت کرنے والی، مخلص خاتون تھیں۔ سرمد بھی ظفریاب اور اظفر کی طرح انہیں عزیز ہو گئے تھے، اور ان کا دل یہ سوچ کر بے حد کُڑھتا تھا کہ سرمد یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا سے یا دیگر ریسٹورنٹس سے برگر وغیرہ ٹائپ کی چیزیں کھا کر پیٹ بھرتے ہیں۔ وہ بارہا کہہ چکی تھیں کہ سرمد ان کے گھر آ کر کھانا کھایا کریں۔ مگر سرمد اس بات کے لئے آمادہ نہ تھے۔ سو اس مسئلے کا انہوں نے یہ حل نکالا تھا کہ وہ آئے دن کسی نہ کسی بہانے لنچ یا ڈنر پر انہیں انوائٹ کر لیتی تھیں اور خوب اہتمام کرتی تھیں۔

سرمد کے لئے ماں کی محبت کا یہ انداز اور کھانے کا یہ اہتمام و انصرام بالکل نیا تھا۔ کیونکہ اپنے گھر میں انہوں نے یہ سب نہیں دیکھا تھا۔ سطوت جہاں کو پکانے کھلانے سے کبھی دلچسپی نہ رہی تھی۔ جب تک شانتی زندہ تھی، ان سب کو ڈھنگ کا کھانا ملتا رہا تھا۔ اس کے گزر جانے کے بعد کچن کا نظام ہی اُلٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ آئے دن پکانے والے بدلے جاتے، پھر بھی ڈھنگ کا کھانا میسر نہ تھا۔ وجاہت مرزا اور خود عاتکہ بیگم کو مرد باورچی کے ہاتھ کا کھانا پسند نہ تھا اور اچھا پکانے والی خاتون باورچن کا ملنا محال تھا۔ آخر کار عاتکہ بیگم نے خود ہی کچن سنبھالنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن کبرسنی کے باعث وہ بہت زیادہ اہتمام نہیں کر پاتی تھیں۔ پھر نکیتا کچھ بڑی ہوئی تو اس نے ان کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سرمد اچھا اور بہت اہتمام کے ساتھ کھانے کے عادی نہ رہے تھے۔ اظفر کے گھر میں یہ سب کچھ دیکھ کر شروع شروع میں انہیں بہت حیرت ہوتی تھی، ارجمند بانو جب شوہر کے آگے پیچھے پھرتیں اور بیٹوں کا لمحہ لمحہ خیال رکھتیں تو سرمد کو یہ سب نیا نیا سا اور انوکھا سا لگتا۔ کیونکہ انہوں نے اپنے گھر میں یہ سب کب دیکھا تھا؟

''اب اُٹھ بھی جاؤ یار!'' اظفر نے زچ ہو کر ملتجی لہجے میں کہا۔ ''ماما انتظار کر رہی ہوں گی۔''

سرمد کے اصرار پر انہیں اُٹھنا ہی پڑا اور وہ تیار ہونے کے لئے باتھ روم کی طرف بڑھ گئے۔ کچھ دیر بعد نیم گرم پانی کے ساتھ شاور لے کر سیاہ پینٹ اور ہلکی نارنجی قمیض میں وہ بے حد فریش اور شاداب سے باہر نکلے تھے۔ اظفر نے انہیں پُرستائش نظروں سے دیکھا تھا۔ بڑی بڑی خمار آلود سیاہ بھنورا سی آنکھیں، ستواں ناک، گھنی سیاہ مونچھوں کے تلے گلابی نم تراشیدہ لب، کتابی چہرہ، کشادہ صندلی پیشانی پر جھکے سیاہ گھنے بال، دراز قد اور باوقار سراپا۔ وہ مردانہ وجاہت کا ایک بے مثل شاہکار تھے۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی ارجمند بانو نے کھانے کی ٹیبل لگا دی تھی۔ کھانے کے دوران خوشگوار ماحول میں ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔

''آج آفاق بھائی کا فون آیا تھا۔'' بالکل اچانک عالم تاب صاحب کو یاد آیا۔

''گھر پر بھی کر رہے تھے۔ شاید کچھ نیٹ ورک پرابلم تھی، بار بار لائن ڈس کنکٹ ہو رہی تھی۔ میں نے بھی ٹرائی کیا تھا پر بات نہ ہو سکی۔'' ارجمند بانو نے بتایا۔

''ہاں! وہ بتا رہے تھے کہ گھر کی لائن نہیں مل رہی، اس لئے تمہارے آفس میں فون کر رہا ہوں۔'' عالم تاب صاحب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''ملیحہ بھابی کی طبیعت کیسی ہے؟'' ارجمند بانو نے بے تابانہ پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ہیں۔ آج کل تو شادی کی تیاریوں میں گم ہیں۔'' عالم تاب صاحب نے مسکرا کر کہا اور شریر نظروں سے ظفریاب کی طرف دیکھا۔ ظفریاب سر جھکائے خاموشی سے کھانے میں مصروف تھے۔

''بھئی ظفریاب کے امتحان ختم ہونے کا اب کون انتظار کرے؟ ہم لوگ اظفر میاں کو چھوڑ کر اکیلے ہی نہ چل دیں۔ کیوں ظفر میاں؟'' عالم تاب احمد نے شوخ لہجے میں بیٹے کو مخاطب کیا۔

''آں ہاں.....'' ظفریاب گڑبڑا کر سیدھے ہوئے۔ ''نن.....نہیں ڈیڈ!.....اب ایک آدھ ہفتے کی تو اور بات

ہے۔ سب ساتھ ہی چلیں گے۔''
''ان کے ایگزام ہیں کہ شیطان کی آنت کی طرح پھیلتے ہی جا رہے ہیں...... ذرا سوچو! وہاں کوئی تمہارا انتظار کر رہا ہوگا بھئی۔'' باپ کے شریر لہجے پر ظفریاب بے ساختہ جھینپ گئے تھے۔
''ڈیڈ! آپ بھی نا......''
''اور آپ اظفر کو چھوڑ کر جانے کی بات کر رہے ہیں۔'' ارجمند بانو نے گفتگو میں حصہ لیا۔ ''اور جو کوئی ان کا بھی وہاں انتظار کر رہا ہو..... تو؟''
''کون بھلا؟'' عالم تاب صاحب نے حیرانی سے آنکھیں پھیلائیں۔
''ارے وہی.....'' ارجمند بانو ہنسیں۔ ''جس کے لئے انہوں نے فرمائش کی تھی، کہ ان کے نام کی انگوٹھی پہنا کر اسے بھی اپنا کر لیا جائے۔''
''ارے ہاں۔'' عالم تاب ہنسنے لگے اور اظفر شرمندہ ہونے کے بجائے خود بھی زور زور سے ہنس رہے تھے۔ سرمد کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ انہیں یوں حیرانی سے ایک ایک کا چہرہ تکتے دیکھ کر، ارجمند بانو مسکراتے ہوئے بولیں۔
''سرمد بیٹا! تمہیں میں بتاتی ہوں، تمہارے یہ دوست ہیں نا، اظفر میاں، یہ بڑے چھپے رستم ہیں۔ جانتے ہو، انہوں نے کیا کہا تھا؟'' وہ مزے لے لے کر بچپن کا وہ واقعہ سنانے لگیں۔ سرمد بھی بے ساختہ ہنس دیئے تھے۔ کھانے کے بعد اظفر، سرمد کو لے کر اپنی اسٹڈی میں جا بیٹھے تھے جبکہ عالم تاب صاحب، ظفریاب کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھ کر خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ وہ ایک ہنس مکھ اور مرنجان مرنج قسم کے انسان تھے، بیٹوں سے ان کے بے تکلف دوستوں کے سے مراسم تھے۔ وہ ظفریاب اور اظفر سے ہر موضوع پر دوستانہ انداز میں گفتگو کرنے کے عادی تھے۔ اس وقت بھی وہ دونوں کے پاکستان جانے اور وہاں کی مصروفیات، ملیحہ بیگم کی بیماری اور شادی کے بکھیڑوں کے بارے میں بات چیت کرنے لگے تھے۔ جبکہ ارجمند بانو، ڈائننگ ٹیبل صاف کرنے کے بعد کچن سمیٹنے میں مصروف تھیں۔
''تم پوچھو گے نہیں کہ یہ فری کون ہے؟'' اظفر، سرمد کی سنجیدہ طبیعت سے واقف تھے، اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ خود سے کوئی سوال نہیں کریں گے، اسی لئے کچھ دیر بعد انہوں نے خود ہی سوال کیا تھا۔
''ارجمند آنٹی نے بتایا تو تھا۔'' سرمد معصومیت سے پلک جھپک کر بولے۔ ''آفاق انکل کی چھوٹی بیٹی ہیں، فریال۔ تمہاری ماموں زاد بہن۔ ذہانت فطانت میں تم کتنے ہی آگے کیوں نہ ہو، تعلیمی میدان میں بے شک تم سب کو پیچھے چھوڑ دو مگر اس معاملے میں نرے گھامڑ ہو۔'' اظفر نے سر پیٹ لیا۔ سرمد نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس مسکراتی نظروں سے ان کی سمت تکتے رہے۔ اظفر کچھ دیر خاموش رہ کر شرماتی آواز میں گویا ہوئے۔
''وہ میری ماموں زاد ہونے کے علاوہ...... مابدولت کے شہرِ دل کی باسی بھی ہے۔ یعنی اس راج دہانی کی رانی ہے۔'' اظفر نے دل پر ہاتھ رکھ کر شاہانہ مگر رومانٹک انداز میں کہا اور سرمد حیرت بھری نظروں سے انہیں تکتے رہے۔ انہیں کبھی بھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس شوخ، نٹ کھٹ، ہر وقت ہنستے مسکراتے لڑکے کے دل کی دنیا میں کوئی بچپن سے ہی بسا ہوا ہے۔
''اور جانتے ہو۔'' اظفر گمبھیر لہجے میں گویا ہوئے۔ ''فریحہ اور ظفر بھائی کی شادی کے ساتھ ہی مام اور ڈیڈ نے فیصلہ کیا ہے کہ...... میرا اور فریال کا بھی نکاح کر دیا جائے۔''
''Congratulations'' سرمد نے بے ساختہ مسرور لہجے میں مبارکباد دی تھی۔
''Thanks!'' اظفر نے مسکراہٹ کے ساتھ شکریہ ادا کیا تھا۔ ان کی روشن آنکھوں میں آنے والے لمحوں کا احساس

دمکتے چراغوں کی صورت فروزاں تھا، اور سرمد سوچ رہے تھے کہ خدا کرے یہ روشنی ہمیشہ ان کی زندگی کو منور رکھے۔ یہ خواب کرچی کرچی ہو کر ان کی آنکھوں میں نہ چبھیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے گھر میں یہی دیکھا تھا، ان کے والد وجاہت مرزا کی چاہت، زہر آلود خنجر کی طرح ان کے دل کو ہی نہیں، روح کو بھی زخمی کر گئی تھی۔ بھلا ایسی محبت کس کام کی، جب ساتھ رہے تو دل جلاتی ہے اور جب ہمیشہ کے لئے ساتھ چھوڑ جائے تو روح تڑپاتی رہے۔ جب محبت کا حاصل پچھتاوا، کسک اور آنسو ہی ہیں تو پھر لوگ بھلا محبت کیوں کرتے ہیں؟......اپنے اس سوال کا جواب خود ان کے پاس نہ تھا۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے اب چلنا چاہئے۔'' کچھ دیر بعد وہ اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اظفر انہیں ان کی گاڑی تک چھوڑنے آئے تھے۔ سرمد الوداعی انداز میں ہاتھ لہراتے گاڑی میں جا بیٹھے تھے۔ چند لمحوں بعد ان کی گاڑی تیزی سے ہاسٹل کی سمت اُڑی جا رہی تھی۔ تب ہی بالکل اچانک کوئی ان کی گاڑی کے آگے آ گیا تھا۔ انہوں نے پوری قوت سے بریک لگائے تھے......مگر شاید دیر ہو چکی تھی۔ ان کی گاڑی کے ٹائر دل خراش آواز میں چرچرائے اور ایک زوردار جھٹکا سا لگا اور ایک انسانی چیخ چہار سُو پھیل گئی۔

❀===❀===❀
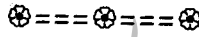
چھوٹا سا کمرہ نمو، فریال اور فریحہ نے مل کر خوب سجا دیا تھا۔ بستر پر سرخ مخملیں پلنگ پوش بچھا تھا جو شریفن خالہ نے تحفتاً دیا تھا۔ سرخ زردار غرارہ، گوٹے لچکے سے آراستہ اور گنزا کا جھل مل دوپٹہ اور ہلکا سا سونے کا سیٹ، ملیحہ بیگم کی طرف سے تحفہ تھا۔ اس وقت حسنہ وہی زرق برق جوڑا اور زیور پہنے دُلہن بنی، مخملیں چادر پر بیٹھی، ٹٹولتی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ گھر ان کے اس جھونپڑی نما گھر سے ہزار گنا بہتر تھا اور انو کی مالی پوزیشن اس کے بھائیوں کی نسبت کہیں اچھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود کو ہواؤں میں اُڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

حسنہ کا جس گھر اور کلاس سے تعلق تھا، اس ماحول میں بچپن سے ہی لڑکیوں کے ذہن میں بٹھا دیا جاتا تھا کہ لڑکی کا سسرال میں صرف شوہر سے رشتہ ہوتا ہے، اور وہ بھی اس طرح کہ اسے غلام بنا کر رکھا جائے۔ سو جب حسنہ کا انو سے رشتہ طے ہوا تو وہ اس بات سے بے حد خوش تھی کہ سسرال میں ساس سسر، دیور جیٹھ کے قضیے نہیں ہیں۔ لے دے کے ایک چھوٹی نند۔ سو اس سسرالی رشتے دار سے نمٹنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مگر جب گھونگھٹ کی اوٹ سے اس نے میاں کی آنکھوں میں چھوٹی بہن کے لئے اُمڈتا پیار دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنک کر رہ گیا تھا۔

'اگر میاں جی، بہن کو یونہی چاہتے رہے تو......بڑی مشکل ہو گی۔' اس نے جلے دل سے سوچا اور اس کی نس نس میں نمو کے خلاف نفرت اور حسد کا زہر پھیلتا چلا گیا۔ نمو، نئی نویلی بھابی کے کریہہ احساسات سے بے خبر بھائی کی خوشی میں مگن تھی۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ شریفن خالہ نے چاہا کہ نمو کو رات بھر کے لئے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جائیں، مگر ملیحہ بیگم نے فریال کی خوشی کی خاطر نمو کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت انو سے لے لی تھی۔ نمو اور فریال کی پندرہ سولہ سالہ زندگی میں بہت کم ایسے مواقع آئے تھے، جب انو نے نمو کو ان کے گھر رات کو رُکنے کی اجازت دی تھی۔ نمو کے معاملے میں وہ بے حد جذباتی اور حساس واقع ہوا تھا۔ بس وہ چاہتا تھا، نمو ہر پل اس کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ خاص طور پر رات تو وہ گھر کے باہر کہیں نہ گزارے۔

''تمہیں حسنہ بھابی کیسی لگیں؟'' کپڑے تبدیل کر کے اور عشاء کی نماز ادا کر کے نمو، فریال کے ساتھ بیڈ پر لیٹی تو اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھنے لگی۔

''انسان کی اچھائی برائی صورت سے نہیں، سیرت سے پتہ چلتی ہے۔'' فریال نے سنجیدہ لہجے اور فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔ ''بظاہر تو صورت بہت اچھی ہے، اور جہاں تک سیرت کا تعلق ہے، تو اس کے بارے میں وقت گزرنے کے

بعد ہی پتہ چلے گا۔''

''خدا کرے حسنہ بھابی، انو بھیا کے لئے بے حد اچھی بیوی ثابت ہوں۔'' نمو نے دل کی گہرائی اور پورے خلوص سے دعا مانگی۔

''آمین۔'' فریال نے ٹکڑا لگایا۔ کچھ دیر کے لئے کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔

''ارجمند آنٹی اور عالم تاب انکل کب تک آ رہے ہیں؟'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد نمو نے فریال کی طرف کروٹ بدلتے ہوئے سوال کیا۔

''اِن شاء اللہ! سیکنڈ وِیک کے اختتام تک آ جائیں گے۔'' فریال نے بتایا۔

''اظفر بھائی بھی آ رہے ہیں نا؟'' نمو شوخ ہوئی۔

''ظاہر ہے۔'' فریال نے آنکھیں نکالیں۔ سب گھر والے یہاں آ جائیں گے تو وہ بے چارے وہاں رہ کر کیا کریں گے؟''

''چچ چچ...... بڑی ہمدردی ہو رہی ہے بے چارے سے۔'' نمو شریر انداز میں مسکرائی۔ ''لگتا ہے ارجمند آنٹی کی بات آپ کے کانوں تک پہنچ چکی ہے۔''

''کون سی بات؟'' فریال حیرانی سے نمو کی طرف پلٹی۔ ''کوئی بات ہوئی ہے کیا؟...... مجھے بھی بتاؤ نا۔''

''فریحہ آپی نے مجھے سختی سے منع کیا ہے۔'' نمو اِترائی۔ ''پھر بھلا کس طرح بتلا سکتی ہوں؟''

''نمو پلیز!'' فریال نے لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔ ''بتاؤ نا پلیز۔''

''اب اتنا اصرار کر رہی ہو تو...... بتائے دیتی ہوں۔'' نمو نے شاہانہ انداز میں احسان جتانے والے لہجے میں کہا۔ ''ارجمند آنٹی نے آنٹی انکل سے تمہارے رشتے کی بھی بات کی ہے۔''

''کیا......؟'' فریال اُچھل کر اُٹھ بیٹھی۔

''ہاں۔'' نمو مسکرائی۔ ''اور یہ کہ آنٹی انکل نے یہ رشتہ قبول کر لیا ہے۔ نہ صرف قبول کر لیا ہے بلکہ نکاح کے لئے حامی بھی بھر لی ہے۔''

''کیا...... نکاح......؟'' فریال نے غیر یقینی نظروں سے نمو کے خوشی سے تمتماتے چہرے کی طرف دیکھا۔

''ہاں...... ابھی صرف نکاح...... زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' نمو اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے دھیرج بھرے لہجے میں بولی۔ ''رخصتی تمہاری تعلیم کے مکمل ہونے کے بعد۔ کم از کم چار سال بعد۔''

''یہ سب طے ہو گیا...... اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا؟'' فریال نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''اور مجھ سے کسی نے پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔''

''سب کو آپ کے دل کا حال معلوم ہے...... اس لئے......'' نمو مسکرائی۔ ''سچ کہو، یہ خبر سن کر تمہارا دل بے ساختہ خوشی سے دھڑک نہیں اُٹھا؟ اور اُس انجانے ہمسفر کی تصویر آنکھوں میں گھومنے نہیں لگی؟''

''میں نے تو انہیں برسوں سے دیکھا ہی نہیں۔ نہ تصویر، نہ فون پر رابطہ۔ ارجمند آنٹی اور پاپا دونوں ہی ان سب باتوں کو خرافات پر محمول کرتے ہیں۔ ہمارے یہ بڑے، دنیا سے سو سال پیچھے ہیں۔ ہے نا؟'' فریال نے نمو سے سوال کیا۔

''نہیں فری! بزرگوں کی تمام ہی باتیں ان کے تجربے کا نچوڑ ہوتی ہیں، اور وہ ہمارے لئے جو بھی فیصلہ کرتے ہیں، ان میں ہماری بھلائی ہی ہوتی ہے۔'' نمو نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ چند لمحوں کے لئے کمرے کی فضا میں سکوت

چھا گیا۔

''اچھا چلو، اب سوتے ہیں۔ صبح جلدی اُٹھنا ہے۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد نمو نے کہا اور شب بخیر کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔ فریال نے بھی آنکھیں بند کر لی تھیں اور آنکھیں بند کرتے ہی دھنک رنگ سپنے اس کی پلکوں پر اُتر آئے تھے۔

صبح ہوتے ہی انو، نمو کو لینے پہنچ گیا تھا۔

''انو میاں! میں ابھی غفور کے ہاتھ ناشتہ بھجوا رہی ہوں۔'' ملیحہ بیگم نے انو کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

''ارے نہیں بیگم صاحبہ!'' انو نے جلدی سے جواب دیا تھا۔ ''وہاں شریفن خالہ نے ناشتے کھانے کا انتظام کیا ہوا ہے۔ آپ بالکل زحمت نہ کریں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' ملیحہ بیگم نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ''اب اِن شاء اللہ شام کو ہی ملاقات ہوگی۔''

''جی ضرور۔'' انو نے سعادت مندی سے جواب دیا اور نمو کو لے کر خدا حافظ کہتا گھر کے لئے چل دیا تھا۔

شام کو ایک چھوٹی سی تقریبِ ولیمہ کا انتظام و اہتمام پروفیسر آفاق کی طرف سے ہی تھا۔ انو نے منع کرنا چاہا تھا۔

''سر! آپ پہلے ہی بہت کچھ کر چکے ہیں۔ مزید زیر بار ہونے کی کیا ضرورت ہے؟''

''تم اکبر علی کے بیٹے ہو انور!'' پروفیسر آفاق نے جواب دیا۔ ''اور وہ مرحوم میرے لئے بھائی کی سی حیثیت رکھتا تھا، اس حوالے سے تم میرے بھتیجے ہوئے۔ اپنوں کے لئے کچھ کر کے، انسان زیر بار نہیں ہوتا، بلکہ اسے خوشی ملتی ہے۔''

''اتنی صبح صبح اُٹھ کر کہاں چل دیئے تھے؟'' انو گھر پہنچ کر اپنے کمرے میں گیا تو حسنہ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

''نمو کو لینے گیا تھا۔ رات کو فریال اور فریحہ اسے اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔'' انو نے جواب دیا۔ ''دراصل نمو نظروں سے دور ہو تو مجھے بے چینی اور پریشانی ہونے لگتی ہے۔'' انو کا نمو کے لئے شفیق لہجہ، حسنہ کا دل جلا گیا تھا۔

''جانا تھا تو کم از کم بتا کر تو جاتے۔ میں بلاوجہ پریشان ہو رہی تھی۔'' حسنہ ٹھنک کر دل جلے لہجے میں بولی۔

''اصل میں تم سو رہی تھیں نا...... اس لئے۔'' انو شرمندہ ہوا۔ تب ہی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔

''بھیا، بھابی! چائے حاضر ہے۔'' بھڑے ہوئے کواڑوں کے اس پار سے نمو کی مترنم آواز سنائی دی تھی۔

''ارے تو اندر آ جاؤ نا نمو!'' انو نے بے ساختہ لہجے میں کہا اور اگلے ہی لمحے نمو پلاسٹک کی چھوٹی سی ٹرے میں چائے کے دو مگ دھرے کمرے میں داخل ہوئی۔

''سلام بھابی!'' کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے پُرشوق لہجے میں حسنہ کو سلام کیا تھا اور وہ محض سر کے اشارے سے جواب دے کر چائے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''تیری چائے کہاں ہے؟'' ٹرے میں دو مگ رکھے دیکھ کر انو نے نمو سے پوچھا۔

''میں بھی پی لوں گی۔'' نمو مسکرائی۔ ''پہلے آپ دونوں تو پی لیجئے۔'' چھوٹی بہن پر پیار لٹاتی انو کی نظریں اور محبت و ملائمت سے گندھا اُس کا نرم لہجہ، حسنہ کے دل پر آریاں چلا رہا تھا۔ سرِ شام فریحہ اور فریال آ گئی تھیں۔ پھر ان تینوں نے مل جل کر حسنہ کو ایک بار پھر دُلہن کا روپ دے دیا تھا۔ آج اس کا ولیمہ تھا۔ ولیمے کے بعد شریفن خالہ، نمو کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی تھیں۔

''دو چار دن میں میری انڈیا روانگی ہے۔'' انہوں نے پیار سے نمو کے بال سمیٹتے ہوئے بتایا تھا۔ ''ایک آدھ دن سے ساتھ، میرے پاس رہ لے۔ پھر جانے زندگی یہ مہلت دے نہ دے۔''

''دو چار دن میں روانگی۔'' نمو نے چونک کر شریفن خالہ کے یاس بھرے لہجے کی طرف دیکھا تھا۔ ''اتنی جلدی......؟''

''ہاں......وہ پاسپورٹ آفس کا افسر ہے نا، اس کی بہن کی کبھی میں نے شادی کروائی تھی۔ اتفاق سے اس سے ملاقات ہوگئی۔ بس اسی کے طفیل پاسپورٹ بھی جلدی بن گیا اور ویزہ بھی آسانی سے لگ گیا۔ ایک آدھ دن میں ٹکٹ آ جائے گا تو جمعہ تک اِن شاءاللہ میں روانہ ہو جاؤں گی۔''

''شریفن خالہ!'' نمو نے پیار بھری نظروں سے شریفن کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ماں کی صورت نہیں دیکھی، مگر ممتا کے شفیق اور محبت بھرے احساس کو آپ کی آغوش میں پایا ہے۔''

''تجھے اپنی گود میں بھر کر بانجھ پن کا غم بھول گئی تھی نمو!'' شریفن نے بے ساختہ نمو کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ ہندوستان جانے کا فیصلہ کر کے شاید میں نے کوئی غلطی کی ہے۔''

''بالکل نہیں۔'' نمو نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''وہاں آپ کے بھائی ہیں، برسوں سے آپ ان سے نہیں ملیں۔ آپ کو جانا ہی چاہئے تھا۔ رہا سوال میرا تو اب میری فکر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ گھر میں بھابی جو آ گئی ہیں۔''

''خدا کرے، تیری بھابی تیری ماں جیسی ثابت ہو۔'' شریفن خالہ نے نمو کا سر ایک بار پھر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے دعا دی۔

شادی کا جوڑا، سونے کا زیور اور ولیمے کا کھانا، سب کچھ ملیحہ بیگم اور آفاق احمد کی طرف سے تھا۔ فریحہ اور خاص طور پر فریال ہر کام میں نمو کے ساتھ پیش پیش تھی۔ ان سب باتوں نے حسنہ بی کو خاصا حیران کیا تھا۔

''اے شریفن خالہ!......یہ پروفیسر صاحب، انو کے کوئی رشتے دار ہیں کیا؟'' اس نے سرسری سے انداز میں سوال کیا تھا۔

''کوئی رشتہ تو نہیں ہے۔'' شریفن خالہ نے جواب دیا۔ ''پر رشتے داروں سے بڑھ کر ہیں۔ اکبر علی کی بے وقت موت کے بعد پروفیسر صاحب ساتھ نہ دیتے تو آج انو جانے کہاں ہوتا۔ یہ گھر، سرکاری نوکری، نمو کی تعلیم، یہ سب پروفیسر صاحب اور ان کی بیگم کی محبت کا ہی نتیجہ ہے۔''

''اچھا۔'' حسنہ نے معنی خیز انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔

''اور نمو سے تو وہ بالکل فریحہ اور فریال کی سی محبت کرتے ہیں۔ خاص طور پر فریال سے تو نمو کی بہنوں کی سی محبت اور دوستی ہے۔'' شریفن خالہ کا لہجہ ممنونیت کے احساس سے بھیگ گیا تھا۔

''ہوں۔'' حسنہ بی نے ایک بار پھر سر ہلایا۔ جانے کیوں اسے پروفیسر صاحب کا گھرانہ اور خاص طور پر فریال زہر لگ رہی تھی اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جلد ہی وہ اس تعلق اور رشتے کو دوری میں بدل دے گی۔

جمعہ کی شام کو شریفن خالہ انڈیا کے لئے روانہ ہوگئیں۔ پروفیسر آفاق انہیں اپنی گاڑی میں اسٹیشن چھوڑنے گئے تھے، جبکہ انو اور نمو بھی ساتھ تھے۔ روتے روتے نمو کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔

''ارے پگلی!......روتی کیوں ہے؟'' شریفن خالہ خود بھی بات بات پر آبدیدہ ہو رہی تھیں۔ ''دو چار مہینوں میں لوٹ آؤں گی۔''

مگر سب ہی جانتے تھے کہ یہ محض جھوٹا دلاسہ ہے۔ ان کا واپس آنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

❀===❀===❀
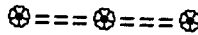
باہر شام گہری ہو رہی تھی، مگر اندر دن کا سا سماں تھا۔ چھت کے بیچوں بیچ لٹکتے بلوری فانوس نے پورے آفس کو چکا چوند کیا ہوا تھا۔ بیش قیمت پردے، ایرانی مخملیں قالین اور قیمتی فرنیچر، عبدالرشید آفس کی شان و شوکت دیکھ کر متاثر ہوا تھا۔ دروازے پر ایستادہ باوردی پیون نے گرم جوش انداز میں سلیوٹ مارا تھا۔ اور بے حد ادب سے دروازہ کھول کر انہیں

اندر جانے کا راستہ دیا تھا۔ ایس رحمان کے کمرے سے پہلے اس کی پی اے کا کمرہ تھا، اور ساتھ ہی اکاؤنٹ سیکشن تھا۔
ادھیڑ عمر کی اینگلو انڈین پی اے نے کاروباری انداز میں مسکرا کر ان کا سواگت کیا۔
''میڈم جی!.....رحمان صاحب سے ٹیم لیا ہوا ہے۔'' یونس لاکھانی نے دانت نکوستے ہوئے اطلاع دی تھی۔
''یس۔ وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' اس نے اُٹھ کر اندرونی کمرے کا دروازہ کھول کر انہیں اندر جانے کا اشارہ کیا تھا۔
''سلام صاب!'' اندر داخل ہوتے ہی لاکھانی نے زوردار سلام جھاڑا تھا۔
''ارے آؤ آؤ.....لاکھانی صاحب!.....کیسے ہیں؟'' ایس رحمان نے اُٹھ کر بڑے تپاک سے باری باری لاکھانی اور رشید سے ہاتھ ملایا تھا۔ ''تشریف رکھئے۔'' اور رشید حیران اور پسندیدہ نظروں سے آفس کی آرائش و زیبائش دیکھتا ہوا سامنے دھرے نرم صوفے میں دھنس گیا تھا۔
''کیا لیں گے؟'' ایس رحمان نے انٹرکام کا ریسیور اُٹھاتے ہوئے سوال کیا۔ ''کافی یا کولڈ ڈرنک؟''
''ابھی تو آئے ہیں رحمان بھائی!.....چائے ٹھنڈا ابھی پی لیں گے۔'' لاکھانی اس کی کنگ سائز میز کے داہنی جانب دھری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''پہلے کچھ کاروبار کی بات ہو جائے۔''
''ہاں ہاں، کیوں نہیں؟'' ایس رحمان نے سر ہلایا۔
''اپنے رسید بھائی کا تو میں نے فون پر آپ سے جکر کیا تھا۔'' اس نے رشید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ اپنے رسید بھائی میڈیا انڈسٹری میں قدم جمانا چاہتے ہیں.....ان کے لئے ایک بمباٹ قسم کا سوپ بنانا ہے آپ کو۔''
''ہاں.....وہ تو ہے.....مگر......'' رحمان نے پیشانی کھجاتے ہوئے رشید کی طرف کن اکھیوں سے دیکھا۔
''پیسے کی تم فکر مت کرنا۔'' لاکھانی اس کی بات کاٹ کر جلدی سے بولا۔ ''اپنے رسید بھائی جدی پستی (جدی پشتی) رئیس ہیں۔ ان کے پاس اوپر والے کا دیا اور بجرگوں (بزرگوں) کا چھوڑا ہوا بہت مال ہے.....بس یہ سمجھ لو کہ.....سوپ آفت ہونا چاہئے......اور ہیروئن......تو بس ایسی کہ رسید بھائی دیکھ کر ہی پھڑک اُٹھے۔''
''تم تو جانتے ہو یونس بھائی!'' ایس رحمان انکسار بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں نے ہمیشہ سوپر ڈوپر ہٹ سیریلز، سیریز اور سوپ دیئے ہیں۔''
''ہاں نا۔'' یونس نے جلدی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اسی لئے تو میں رسید بھائی کو تیرے پاس لایا ہوں۔''
''رہا ہیروئن کا سوال.....'' ایس رحمان نے رشید کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بات کا آغاز کیا تو یونس لاکھانی نے ایس رحمان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی درمیان سے اُچک لی۔
''بہتر ہوئیں گا، تُو اس سوپ کے لئے پڑوسی ملک سے ایک دو فنٹاسٹک ہیروئن بلا لے...... فائنانس کی تو پھکر (فکر) مت کر۔ رسید بھائی ساؤنڈ فائنانسر ہے۔''
''پھر تو آپ دیکھئے گا، کیسا سوپ بناتا ہوں۔'' ایس رحمان نے مسرت آمیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ اس تمام عرصے میں رشید بالکل خاموش رہا تھا، مگر پڑوسی ملک سے فنٹاسٹک ہیروئن بلانے کے فیصلے پر اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ ٹھیک اسی لمحے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔ اتنے اہم معاملات پر ڈسکشن کے دوران یہ مداخلتِ بے جا، ڈائریکٹر کو قدرے ناگوار گزری تھی۔
''مس پیٹر!.....کون ہے؟'' اس نے ذرا اونچی آواز میں سوال کیا تھا۔
''سر! مہکار میڈم ہیں۔'' مس پیٹر نے باہر سے ہی جواب دیا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے خوشبو کے معطر جھونکے کی طرح

مہکار کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''اوہ، آپ ہیں۔'' ایس رحمان نے اپنی ناگواری پر خوش اخلاقی کا ملمع چڑھاتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میں اس وقت مصروف ہوں، اس لئے فوری آپ پر توجہ نہ دے سکوں گا۔'' ایس رحمان کے معذرت خواہانہ لہجے میں ہلکی سی سرد مہری بھی شامل تھی۔

''کوئی گل نہیں جی۔'' مہکار کی مترنم آواز گونجی۔ ''جب تک آپ ان کے ساتھ مصروف ہیں......'' اس نے آنکھ سے رشید کی طرف اشارہ کیا۔ ''تب تک ہم ادھر کرسی پر خاموشی سے بیٹھ جاتے ہیں۔'' جملے کی ادائیگی کے ساتھ ہی ایس رحمان کا جواب سنے بغیر مہکار کونے میں دھری کرسی گھسیٹ کر ایک ناز بھرے انداز سے بیٹھ گئی تھی۔ اس کے آنے سے رشید کو محسوس ہوا کہ کمرہ کچھ اور روشن ہوگیا ہے۔ وہ یک ٹک اُسے دیکھے جارہا تھا۔ اُس کا چاند سا دمکتا چہرہ، خمار لٹاتی بڑی بڑی سیاہ شوخ آنکھیں، تراشیدہ گلابی لب، سانچے میں ڈھلا گداز جسم اور کانوں میں رس گھولتی مترنم آواز، وہ سرتاپا دلکشی و رعنائی کا پیکر تھی۔

''جناب! یہ مس مہکار ہیں۔'' گھاگ ڈائریکٹر نے رشید کی دلچسپی اور انہماک کو محسوس کرتے ہوئے جلدی سے مہکار کا اس سے تعارف کروایا۔ چند لمحوں پہلے تک مہکار کے لئے اس کے لہجے میں جو سرد مہری تھی، اب اس کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ بلکہ اب اس کی جگہ ایک خوشامدانہ عزت اور خوش اخلاقی نے لے لی تھی۔ ''یہ فلموں میں کام کرنے کا شوق رکھتی ہیں۔ اور بہت اچھا گاتی بھی ہیں۔''

''اچھا.....'رشید نے دلچسپی اور شوق بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ گاتی بھی ہیں؟''

''جی۔'' مہکار نے اثبات میں سر ہلا کر لئے دیئے انداز میں جواب دیا۔ وہ سامنے والے کی مالی حیثیت سے واقف ہوئے بغیر اسے لفٹ کروانے کی عادی نہیں تھی۔ ایس رحمان اُس کی اس عادت سے واقف تھا، اس لئے اس نے رشید کا تعارف کروانا ضروری سمجھا۔

''اور مہکار جی!'' وہ مؤدب انداز میں مہکار کی طرف مڑ کر رشید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ ''یہ ہمارے نئے سوپ کے فائنانسر ہیں، عبدالرشید صاحب۔ مشہور کنسٹرکشن کمپنی 'رشید کنسٹرکشن' کے مالک ہیں۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ شہر کے سارے بڑے پروجیکٹ جلد ہی ان کی کمپنی کے پاس آنے والے ہیں۔''

''اچھا جی۔'' مہکار پوری طرح دلچسپی کے ساتھ رشید کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''پھر تو یہ بہت بڑے آدمی ہوئے، ہیں جی؟''

''بالکل۔'' یونس لاکھانی نے پہلی بار اس تعارفی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے پُرتائیدانداز میں سر ہلایا۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی جی۔'' مہکار نے ایک ادائے خاص سے رشید کو مخاطب کیا اور رشید کو اپنے سینے میں ایک ہلچل سی جاگتی محسوس ہوئی۔

ناکام شادیوں کے پے درپے تجربوں نے گو کہ رشید کو بہت بد دِل اور مایوس کیا تھا، مگر حسینوں سے چھیڑ کی عادت گئی نہیں تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ اب صرف دل لگی کرتا تھا، کسی حسینہ کو دل کی دہلیز پار کر کے دل لگی نہیں بننے دیتا تھا۔ مگر جانے مہکار میں ایسی کیا بات تھی کہ اسے دیکھتے ہی اس کے دل میں کچھ انوکھے سے احساسات بیدار ہوئے تھے۔ اور برسوں بعد دل کے ویران مندر میں گھنٹیاں بجتی محسوس ہوئی تھیں۔

''مجھے بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔'' رشید نے باچھیں پھیلا کر جواب دیا۔

''اجی جناب! ابھی تو آپ نے مس مہکار کو صرف دیکھا ہے۔'' ایس رحمان سر ہلاتا معنی خیز انداز میں بولا۔ ''اور جو

کبھی انہیں گاتے ہوئے سن لیں، تو میرا دعویٰ ہے کہ کچھ دیر کو آپ خود کو بھی بھول جائیں گے۔"

"ہم تو انہیں دیکھ کر ہی خود کو بھول گئے ہیں۔" رشید نے زیرِلب کہا، پھر مہکار کی طرف قدرے جھک کر بولا۔"اگر آپ اتنا اچھا گاتی ہیں.....تو ہمیں بھی کچھ سنائیے۔"

"اس کے لئے تو آپ کو ہمارے غریب خانے پر آنے کی زحمت کرنی ہوگی۔" مہکار نے مسکراہٹوں کی بجلیاں گراتے ہوئے ناز بھرے انداز میں کہا اور رشید ایک بار پھر دل تھام کر رہ گیا۔ اس کے بعد کیا گفتگو ہوئی، سوپ کے سلسلے میں کیا طے پایا، رشید کو کچھ یاد نہیں تھا۔ اگر یاد تھا تو دو روشن آنکھیں، مسکراتے لب اور سانچے میں ڈھلا دلکش جسم۔ گھر جا کر بھی رشید کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ یونس لاکھانی اس کی بدلتی کیفیتوں کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے رشید بھائی؟" اس نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔"جب سے آپ رحمان بھائی کے دفتر سے آئے ہو، بہت پریشان لگ رہے ہو۔"

"پریشان؟" رشید چونک کر بولا۔"اس کیفیت کو پریشانی تو نہیں کہہ سکتے۔"

"کون سی کیفیت؟" لاکھانی جان کر انجان بن کر بولا۔

"ایسا لگتا ہے کہ میرا کچھ کھو گیا ہے۔ جیسے کسی نے میرا کچھ چرا لیا ہو۔" رشید نے بغیر کسی لاگ لپٹ کے سادگی سے اعتراف کیا۔

"تمہارا جو کچھ کھویا ہے، میں جانتا ہوں۔" لاکھانی کے لہجے میں یکایک شوخی چھلکنے لگی۔"اور جس نے چرایا ہے، اس کا بھی مجھے انداجا (اندازہ) ہے۔"

"کیا.....؟" رشید نے حیران نظروں سے لاکھانی کی طرف دیکھا۔

"جب سے تم نے اس کھوسبو (خوشبو) کے جھونکے کو دیکھا ہے......" لاکھانی نے بے تکلف انداز میں ایک آنکھ کو ہلکا سا دباتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔"تب سے تمہارا دل کھو گیا ہے۔"

"اب تم سے کیا پردہ؟" رشید آہ بھر کر بولا۔"یہی سچ ہے کہ جب سے میں نے اسے دیکھا ہے، اس دل کا عجب عالم ہے۔"

"وہ ہے ہی ایسی چیج (چیز) کہ اسے دیکھ کر اچھے اچھے راستہ بھول جاتے ہیں۔" لاکھانی کی بات سن کر رشید نے پُرسوچ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یونس بھائی! کیا ایسا کچھ نہیں ہو سکتا کہ اب میرے علاوہ اسے کوئی اور نہ دیکھے؟"

"اگر اس بات سے تمہارا مطلب سادی (شادی) ہے تو سمجھو یہ کام مسکل (مشکل) ہے۔" یونس لاکھانی نے فلسفیانہ انداز میں نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"خیر شادی کے بارے میں میرے تجربے بھی خاصے تلخ اور کرب انگیز ہیں۔" رشید زیرِلب بڑبڑایا۔ مگر لاکھانی اس کی بات نہ سن سکا۔ وہ اپنی ہی دُھن میں بولے جا رہا تھا۔

"وہ ان عورتوں میں سے نہیں ہے جو شادی کے چکر میں پڑتی ہیں۔ جہاں تک میرا کھیال (خیال) ہے، وہ ابھی تو ہرگج (ہرگز) ایسا نہیں سوچے گی۔ ابھی تو وہ ہیروئن بننے کے کھواب (خواب) دیکھ رہی ہے۔ اور اس کھواب کی تعبیر کے لئے وہ پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں کے گھر اور آفس کے چکر لگا رہی ہے۔"

"لیکن اب اُسے کسی کے گھر اور کسی کے آفس کے چکر لگانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔" رشید نے نسبتاً اونچی آواز اور شاہانہ انداز میں اپنا فیصلہ سنایا۔"میں ایک فلم پروڈیوس کروں گا، تاکہ اس کا ہیروئن بننے کا خواب پورا ہو سکے۔"

''ارے نہیں بابا نہیں۔'' یونس لاکھانی جلدی سے بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''رسید بھائی! تم بھی بالکل چڑیا ہو......ایسی گلتی (غلطی) بھول کر بھی نہیں کرنے کا۔''

''کیا مطلب؟'' رشید حیران ہوا۔

''فلموں میں ہیروئن بنتے ہی اسے پَر لگ جاویں گے۔'' یونس لاکھانی نے ڈرامائی لہجے میں کہا اور وہ یوں پھُر سے تمہارے ہاتھ سے نکل جاوے گی۔'' لاکھانی نے ہاتھ کھول کر چڑیا کے اُڑ جانے کا منظر پیش کیا تو رشید نے بے ساختہ حواس باختہ اپنے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھا۔

''اوہ......تو پھر......؟'' اس نے پُرتشویش انداز میں لبوں کو سمیٹ کر مدد طلب نگاہوں سے لاکھانی کی طرف دیکھا۔

''اب ایسا بھی نہیں ہے رسید بھائی! کہ آپ نے کوئی حسین، کھوبصورت چھوکری اس سے پہلے دیکھی نہ ہو۔'' لاکھانی نے معنی خیز انداز میں سر ہلا کر کہا۔

''ہاں! ایسا تو نہیں ہے۔'' رشید سر کھجا کر قدرے جھینپ کر بولا۔ ''دیسی بدیسی کئی چہرے دیکھ چکا ہوں۔ مگر تمہاری اس مہکار میں کوئی الگ سی بات ہے ضرور، جس نے مجھے ایک نگاہ میں ہی دیوانہ بنا دیا ہے۔''

''ٹھیک......'' لاکھانی کو اس کا اقرار اچھا لگا تھا۔ ''اب آپ کیا چاہتے ہو؟''

''لاکھانی بھائی!......تم بھی نا......'' رشید مسکرا کر بولا۔

''ہوں، ہوں......میں سمجھ گیا۔'' لاکھانی شوخ انداز میں ہنسا۔ ''تو اگر یہ بات ہے اور آپ جو اسے اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہو تو......'' لاکھانی نے عیارانہ انداز میں ہاتھ کی مٹھی بنا کر اپنی جانب کھینچتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''تو پھر میرے مسوروں (مشوروں) پر عمل کرنا ہوگا۔'' رشید نے اقرار بھرے انداز میں سر ہلایا۔ ''اور میرا پہلا مسورہ تو یہ ہے کہ......اسے فلم تو کیا، کسی ڈائریکٹر کے آفس کے قریب بھی نہ پھٹکنے دینا۔''

''مگر میں یہ کس طرح کر سکتا ہوں؟'' رشید حیرانی و پریشانی سے بولا۔

''بتاتا ہوں۔'' یونس لاکھانی رازدارانہ انداز میں اس کی طرف کھسکتے ہوئے بولا۔ ''اب آپ کو اپنا دوست بولا ہے تو......آپ کے کام تو آنا پڑے گا نا۔''

''شکریہ لاکھانی بھائی!'' رشید تشکر بھرے لہجے میں بولا۔

'اس بروکر کو بیچ میں ڈالے بغیر شاید اس خوشبو کے جھونکنے تک پہنچنا ممکن نہیں۔ جب تک وہ ہیرا ہاتھ نہیں آتا، اس گدھے کو باپ بنائے رکھنا پڑے گا۔' رشید نے سر جھکاتے ہوئے کن اکھیوں سے لاکھانی کی طرف دیکھ کر سوچا۔ لاکھانی خود بھی اسی قسم کی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

'اگر یہ مہکار کے چکر میں پھنس جاتا ہے تو پھر ایس رحمان کے چکر کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ ایس رحمان تو ڈرامہ بنا کر اسے کنگال کر دیتا، یہ کھوبصورت بلا تو کسی ڈرامے کے بگیر (بغیر) ہی اسے کنگلا کر دے گی......مجھے اس سے کیا، مجھے تو اپنے کمیسن (کمیشن) سے مطلب ہے......اب وہ ایس رحمان دے یا......میڈم مہکار......'

''لاکھانی بھائی! کیا سوچنے لگے؟'' رشید نے پوچھا۔

''میں تیری مشکل کا حل تلاش کر رہا ہوں۔'' اس نے اسی انداز میں پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''پہلے تو اپن کو اس کے گھر کا پتہ ایڈریس چاہئے۔ پھر اس کے گریب کھانے (غریب خانے) پر چلیں گے۔'' وہ ہنسا۔ ''آپ کو تو وہ بولی بھی تھی کہ آپ کو گانا سننے کے لئے اس کے گریب کھانے پر جانے کی جھمت (زحمت) کرنی ہوگی۔''

''زحمت کیسی؟......وہ تو عین راحت ہوگی۔'' رشید سینے پر ہاتھ رکھ کر عاشقانہ لہجے میں بولا اور لاکھانی اور زور زور

سے ہنسنے لگا۔
''یہاں دل تڑپ رہا ہے اور تم ہو کہ ہنس رہے ہو۔'' رشید نروٹھے لہجے میں بولا۔
''اب تو دیکھ، میں کل ہی تیرے کو اُس کھوسبو (خوشبو) کا پتہ ٹھکانہ لا کر دیتا ہوں۔'' وہ پُرعزم لہجے میں بولا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ لاکھانی نہ صرف مہکار کا پتہ جانتا تھا بلکہ ایک آدھ بار اس کے لئے شکار بھی ڈھونڈ کر لا چکا تھا۔
''اکیلے آئے ہو؟'' دروازہ کھولتے ہی مہکار نے سوال کیا تھا۔ ''میں تو سمجھی تھی کہ تم مرغے کے ساتھ آؤ گے۔''
''مرگا (مرغا) تو بسمل ہونے سے کل سام سے تڑپ رہا ہے۔'' لاکھانی ہنس کر بولا۔ ''مگر میں نے بولا، اسے یہاں لانے سے پہلے تیرے سے مول بھاؤ تو ہو جائے۔''
''کیسی بات کرتے ہو لاکھانی!'' مہکار ٹھنک کر بولی۔ ''تم میرے لئے پہلے بھی دو بار یہ کام کر چکے ہو۔ تمہیں کبھی مایوسی ہوئی؟''
''وہ پہلے کی بات ٹھیک تھی۔'' لاکھانی نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اب کی بات اور ہے۔ اب کے مرگا موٹا ہے۔ کمیسن بھی زیادہ ملنا چاہئے۔''
''پہلے مرغا پھنسنے تو دو۔ آ گئے حصہ بٹانے۔'' مہکار تنک کر بولی۔ ''پہلے صحیح سے پتہ تو چلے، اس کے پاس ہے کیا...... اور وہ کتنا خرچ کر سکتا ہے۔''
''ففٹی ففٹی بولے تو...... میں بات کرتا ہوں۔''
''جھلا ہو گیا ہے؟'' مہکار جھٹک کر بولی۔ ''ففٹی نہیں تو سب......''
''چل فورٹی سکسٹی......'' لاکھانی نے اپنی قیمت گھٹائی۔
''جتنا پہلے ملا تھا، اتنا ہی ملے گا۔'' وہ بالوں کو جھٹک کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''تیرا دل ٹھکتا ہے تو شام کو اسے لے آؤ...... ورنہ تیری مرضی۔''
''دیکھ مہکار!...... میرے پاس دوسری پارٹی موجود ہے...... ایس رحمان۔'' لاکھانی نے بھنوئیں اونچی کر کے وارننگ دی۔
''چل، پہلے سے کچھ زیادہ لے لینا۔'' مہکار مسکرائی۔ ''تو بھی نا...... بڑی کُتی شے ہے۔''
''کم از کم تھرٹی پرسنٹ لوں گا۔'' لاکھانی نے بولی چھوڑتے ہوئے کہا۔
''اچھا چل جیسی تیری مرضی۔'' مہکار ناز بھرے انداز میں سامنے دھرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ''سوپ کے بجائے کیا یہ فلم نہیں بنا سکتا...... جس میں مجھے ہیروئن لے لے۔''
''اس چکر میں پڑنا بھی مت۔'' لاکھانی سامنے دھری کرسی پر بیٹھتے ہوئے جلدی سے بولی۔ ''وہ فلم پروڈیوس کرنے لگا نا تو فلم نگری کی ساری پریاں اس کو چمٹ جائیں گی...... اور تم اور میں رہ جائیں گے منہ تکتے۔''
مہکار نے نیم دلی سے تائید بھرے انداز میں سر ہلایا۔
''پوری کی لالچ میں آدھی سے بھی نہ ہاتھ دھو بیٹھنا۔'' اسے متاثر ہوتے دیکھ کر لاکھانی اور زیادہ جوش سے بولا۔
''چل ٹھیک ہے۔'' مہکار بولی۔ ''تو اسے شام کو لے آ۔''
''اوکے...... ڈن۔'' لاکھانی نے انگوٹھا اونچا کر کے مسکرا کر سر ہلایا اور واپسی کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔
''لاکھانی بھائی! کہاں چلے گئے تھے؟...... دو بار ایس رحمان کا بھی فون آ چکا ہے۔'' اسے دیکھتے ہی رشید نے بے قراری سے کہا تھا۔

''میں تو تیرے ہی کام سے نکلا تھا۔'' لاکھانی نفی میں سر ہلا کر تھکن کا اظہار کرتے ہوئے نڈھال لہجے میں بولا۔ ''صبح سے دس لیٹر فیول جلا چکا ہوں، پھر کدھر جا کر اُس کھوسبو کا پتہ ملا ہے۔''

''پتہ مل گیا؟'' رشید اُچھل پڑا۔ ''غلطی میری ہی تھی۔'' لحظہ بھر بعد وہ منہ لٹکا کر بولا تھا۔ ''جب اس نے گھر آنے کی دعوت دی تھی، مجھے اسی وقت اس سے پتہ لے لینا چاہئے تھا۔ بلاوجہ تم خوار ہوتے پھرے۔''

''ارے نیں نیں.....کھواری کی کیا بات ہے؟'' لاکھانی جلدی سے بولا۔ ''اپن یاروں کے یار ہیں۔ تیری کھاتر کچھ بھی کرنا پڑے، اپن کرے گا۔''

''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، اس اجنبی شہر میں آپ کا دم غنیمت ہے۔'' رشید نے ممنون لہجے میں جواب دیا۔ ''اماں نے بھی ساتھ آنے سے منع کر دیا تھا۔''

''تیری ماں ہے؟'' یونس حیران ہوا۔

''ہاں ہے......کیوں نہیں؟......کچھ خفا تھی، اپنا شہر چھوڑنے کو تیار نہیں ہوئی۔ مگر میں جانتا ہوں، بس ایک آدھ ہفتے میں آنے والی ہیں۔'' کراچی آنے کے بعد شاید پہلی بار وہ اپنی ماں کا ذکر کر رہا تھا۔

''اگر وہ آ گئی......تو پھر یہ سب......؟'' لاکھانی پریشان ہو گیا۔

''یہ سب تو چلتا ہی رہتا ہے۔ ماں ان سب باتوں کی عادی ہے۔'' رشید ہنسا۔

''ٹھیک......تو پھر آج سام کو تیار رہنا۔ اپنے کو مہکار کے گھر چلنے کا ہے۔''

''آج شام کو ہی؟'' رشید کے لہجے میں حیرت بھری مسرت تھی۔

''ابھی میرے کو یہ مت بولنا کہ یونس بھائی! پیسے لے جاؤ اور اس کھوسبو کے جھونکے کے لئے کوئی کھوبصورت سا گفٹ کھرید لاؤ......میں بہت تھک گیا ہوں۔''

''ہاں مجھے احساس ہے۔'' رشید نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ''اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو......یہ کام میں خود......''

''ارے بابا! چریا ہے کیا؟......ضرورت ہوئی کیا مطلب؟......ضرورت ہے۔ تحفہ نہ صرف قیمتی ہے بلکہ بہت جبردست (زبردست) بھی ہونا چاہئے۔ تُو تو ایسی عورتوں کے مجاج (مزاج) کو جانتا ہے رسید بھائی! پھر ایسی بات کرتا ہے۔''

''ہاں......یہ تو ہے۔'' رشید بھائی نے تائید بھرے انداز میں سر ہلایا۔

''تو چل......پیسے نکال......میں پاک ٹاور جانے لگا ہوں۔ ساتھ چلنا ہے تو ساتھ چل۔ ورنہ میں خود ہی کوئی گفٹ کھرید لاتا ہوں۔''

''اچھا......'' رشید نے بٹوہ نکالا۔

''ابھی تو بینک کھلے ہوں گے......تُو بولے تو میں کیس (کیش) لے آتا ہوں۔'' لاکھانی اس کے بٹوے میں جھانکتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ''دیکھ! پہلی بار اس کے گھر جا رہا ہے......کھوب پیسہ لے کے چلنے کا ہے۔ وہ انگریجی میں کہتے ہیں، فسٹ امپریسن از دی لاسٹ امپریسن۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' رشید ایک دم سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''تو چلو، میں بھی چلتا ہوں۔ بینک سے پیسے بھی نکلوا لیں گے اور کوئی اچھا سا تحفہ بھی خرید لیں گے۔''

''ابھی تُو کدھر تکلیف کرے گا؟......تُو چیک کاٹ کر مجھے دے دے نا۔'' لاکھانی جلدی سے بولا۔

''نہیں لاکھانی بھائی!......تم پہلے ہی صبح سے پریشان ہو رہے ہو۔ ویسے بھی میں گھر میں اکیلا پڑا پڑا بور ہو رہا ہوں۔

اس بہانے ذرا آؤٹنگ بھی ہو جائے گی۔“

”آج آفس میں نہیں بیٹھا کیا؟“ لاکھانی نے پوچھا۔

رشید نے ایک اعلیٰ متوسط طبقے میں بنگلہ کرائے پر لے کر اس کے گراؤنڈ فلور پر آفس بنایا تھا، جبکہ فرسٹ فلور پر اس کی رہائش تھی۔

”آج تو کسی بھی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔“ رشید، لاکھانی کے ساتھ سیڑھیاں اُتر کر گیٹ کی جانب بڑھا اور گیٹ کھولتے ہی وہ اپنی جگہ تھم سا گیا۔ لاکھانی بھی حیران و پریشان نظروں سے گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

❀===❀===❀

لندن کا نیلا آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ تاحدِ نگاہ تک پھیلی چکنی سیاہ اور سپاٹ سڑک سنسان پڑی تھی۔ سٹریٹ لائٹ کی مدھم روشنی میں کار کے بالکل سامنے ایک انسانی وجود اُلٹا پڑا ہوا تھا۔ اس حادثے میں سرمد کا کوئی قصور نہ تھا۔ یکایک اُن کی کار کے سامنے آجانے میں زخمی کی خود اپنی غلطی تھی۔ مگر اب حادثہ ہو چکا تھا اور سرمد خود کو اس حادثے کا ذمہ دار تصور کر رہے تھے۔

وہ کار کا دروازہ کھول کر تیزی سے زخمی کی طرف لپکے۔ اُس کی کنپٹی پر چوٹ لگی تھی اور لہو کی سرخ باریک سی لکیر رخسار سے ہوتی گلے تک جا پہنچی تھی۔ سرمد کے قریب پہنچتے ہی وہ کراہتا ہوا سیدھا ہوا تھا۔

”آر یُو اوکے؟“ سرمد نے اسے شانوں سے تھام کر اُٹھنے میں مدد دیتے ہوئے دریافت کیا۔

”الحمدللہ۔“ زخمی نے کنپٹی پر زخم کی جگہ ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے دھیمی آواز میں جواب دیا اور سرمد کا سہارا لیتا اُٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ مسلمان ہیں؟“ سرمد نے بے ساختہ سوال کیا۔ اُن کے لہجے میں مسرت کی ہلکی سی رمق بھی شامل تھی۔

”جی۔“ اس نے غور سے سرمد کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ غالباً ایشیائی ہیں۔ انڈین یا پاکستانی؟“

”پاکستانی۔“ سرمد کے لہجے میں ہلکا سا فخر بھی شامل ہو گیا تھا۔

”میں بھی۔“ اجنبی نے مسرت بھرے انداز میں ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔

”آپ بھی پاکستانی ہیں؟“ یہ جملہ سرمد نے اُردو میں ادا کیا تھا۔

”ہم دونوں بھائی تو یہیں پیدا ہوئے ہیں، مگر ہمارے والدین کا تعلق پاکستان سے تھا۔ ویسے مجھے خود کو پاکستانی کہتے اچھا لگتا ہے۔“

”آئی ایم سوری۔“ سرمد نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے قدرے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”میری لاپروائی کی وجہ سے آپ کو یہ تکلیف اُٹھانی پڑی۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں کسی ہسپتال چلنا چاہئے تاکہ آپ کے زخم کی مرہم پٹی ہو سکے۔“

”آپ کو شرمندہ ہونے اور معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔“ اجنبی زخمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس حادثے میں سراسر میری غلطی ہے۔ مجھے تو آپ کا شکرگزار ہونا چاہئے کہ آپ نے فوری طور پر بریک لگا کر مجھے اگلے جہان جانے سے بچا لیا۔ ورنہ میں نے اپنے طور پر اوپر جانے کی پوری تیاری کر لی تھی۔

”نہیں۔ شاید میری غلطی تھی کہ......“ سرمد نے کہنا چاہا مگر اجنبی نے اسے روک دیا۔

”آپ غالباً ہسپتال چلنے کی بات کر رہے تھے......تو چلئے چلتے ہیں۔ یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر ایک اچھا ہسپتال ہے۔“

''جی ضرور۔'' آپ گاڑی میں تشریف رکھئے۔'' سرمد نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا اور اس کے گاڑی کی طرف مڑتے ہی خود بھی تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھے۔

''میں اپنے محسن کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

''مجھے سرمد کہتے ہیں۔ سرمد مرزا۔ یہاں انجینئرنگ یونیورسٹی میں طالب علم ہوں۔''

''میرا نام دانیال ہے۔'' اجنبی نے ایک بار پھر مصافحے کے لئے ان کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ ''ڈاکٹر دانیال۔ یہاں قریب ہی میری رہائش ہے۔ اور اس کی دوسری جانب ہمارا اپنا ہسپتال ہے۔ میرے والد بھی ڈاکٹر تھے۔ انہی نے یہ ہسپتال تعمیر کروایا تھا۔ میں آج کل F.R.C.S کر رہا ہوں۔''

''Good۔'' سرمد نے پُر جوش انداز میں دانیال کا ہاتھ تھامتے ہوئے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ڈاکٹر دانیال! آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ گو کہ یہ حادثہ تکلیف دہ تھا مگر اس حادثے کے طفیل سے میری آپ سے ملاقات ہو گئی۔''

''Really......تم نے تو میرے منہ کی بات لے لی۔'' دانیال مسکرائے۔ ''کیا میں آپ کو تم کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں؟''

''ہاں کیوں نہیں؟'' سرمد خوش دلی سے مسکرائے۔ ''اس طرح میں بھی ''آپ'' کے تکلف سے نجات پالوں گا۔''

''بالکل۔'' دانیال مسکرائے۔

دانیال کی رہائش گاہ تک پہنچتے تک وہ دونوں ایک دوسرے کے اچھے اور بے تکلف دوست بن چکے تھے۔

ڈاکٹر دانیال کا عالیشان گھر لندن کے پوش علاقے لبرٹی اسٹریٹ میں واقع تھا۔ پورچ میں جدید ماڈل کی دو چمچماتی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ دروازہ ادھیڑ عمر کی خوش شکل ہاؤس کیپر مسز ڈینی نے کھولا تھا۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرائی تھی۔ پھر وہ دانیال کو مخاطب کر کے متفکر لہجے میں بولی تھی۔

''یہ کیا ہوا؟......آپ کے ماتھے سے خون بہہ رہا ہے۔ خیریت تو ہے نا؟''

''سب خیریت ہے۔'' دانیال مسکرائے۔ ''آپ فرسٹ ایڈ باکس لے آئیے۔ ذرا سی چوٹ ہے۔ میں ابھی ڈریسنگ کر لوں گا۔''

مسز ڈینی فرسٹ ایڈ باکس لے آئی تھی۔ پھر دانیال نے اسے کافی بنانے کے لئے کہا تھا اور بینڈیج کے بعد سرمد کو لئے سٹنگ روم میں آبیٹھے تھے۔

ڈاکٹر دانیال کے والد ڈاکٹر افضال اپنی بیوی نگہت کے ساتھ جب انگلستان آئے تھے تو ان کی آنکھوں میں بے شمار خواب تھے۔ اس پوش علاقے میں یہ وِلا نما شاندار گھر اور دوسری جانب وسیع و عریض ہسپتال ان کے خوابوں کی تعبیر تھے۔ دانیال اور ان کے بڑے بھائی کمال، یہیں پیدا ہوئے تھے۔ والدین کے ایک حادثے میں انتقال کے بعد اب وہ دونوں بھائی خود کو بے حد تنہا محسوس کرنے لگے تھے۔ پچھلے برس کمال نے ایک ٹرکش لڑکی سے شادی کر لی تھی اور اس کے ساتھ استنبول میں جا بسے تھے۔ جبکہ دانیال FRCS کے ساتھ اپنا ہسپتال بھی سنبھال رہے تھے۔

اُس رات وہ واک کے لئے نکلے تھے اور بالکل اچانک بے خیالی میں سڑک کی طرف جا نکلے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ تیزی سے سڑک کراس کر لیں گے مگر ان کا خیال غلط نکلا تھا اور وہ سرمد کی کار سے ٹکرا کر زخمی ہو گئے تھے۔

کچھ دیر بعد سرمد جب کافی پینے کے بعد جانے کے لئے اُٹھے تو اس وقت تک وہ دونوں ایک دوسرے کے اچھے دوست بن چکے تھے۔ ڈاکٹر دانیال کم و بیش سرمد کے ہم عمر بھی تھے۔ انہی کی طرح دراز قد اور وجیہہ و شکیل بھی تھے۔ دونوں کے مزاج اور سوچ میں بھی خاصی یکسانیت تھی۔ ہم وطن اور ہم مذہب ہونے کی وجہ سے بھی اُنسیت میں اضافہ ہو

گیا تھا۔

''میں اس حادثے کا شکر گزار ہوں۔'' دانیال نے اپنے ماتھے پر موجود زخم کو چھوتے ہوئے مسکراتے لہجے میں کہا۔ ''کہ اس کے طفیل میری تم سے ملاقات ہوگئی اور میں نے تم جیسا اچھا دوست پالیا۔''

''شکریہ۔'' سرمد مسکرائے۔ ''سچ تو یہ ہے کہ میں بھی تم سے متعارف ہو کر بے حد خوش ہوں۔ اظفر بھی تم سے مل کر خوش ہوں گے۔''

''اظفر؟'' دانیال نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میرے کلاس فیلو اور دوست ہیں...... پاکستانی اور مسلمان...... ان کے والد میرے والد کے دوست ہیں۔ اظفر کے والد، عالم تاب انکل یہیں رہائش پذیر ہیں۔ کاروبار کرتے ہیں۔'' سرمد نے تفصیلی تعارف کروایا۔ ''اگر کل شام تم آ سکو.....تو تمہاری اظفر سے ملاقات ہوسکتی ہے۔''

''کیوں نہیں۔'' دانیال مسکرائے اور سرمد ہاتھ ملا کے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

❁===❁===❁
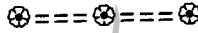
یونس لاکھانی، رشید کو لے کر مہکار کے گھر پہنچا تھا۔

گلبہار اور مہکار نے بہت محبت اور احترام سے اس کا سواگت کیا تھا۔ پروگرام کے مطابق لاکھانی اسے مہکار کے فلیٹ پر چھوڑ کر کام کا بہانہ کر کے رخصت ہوگیا تھا۔

''میں آپ کے لئے چائے کا انتظام کرتی ہوں۔'' گلبہار بھی مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ اب کمرے میں صرف رشید اور مہکار رہ گئے تھے۔ مہکار، رشید کے مقابل صوفے پر جلوہ افروز تھی۔ اس کے دمکتے وجود سے کمرے کی فضا روشن اور چمک دار لگ رہی تھی اور اس کے لباس سے اُٹھتی مہکار نے ہواؤں کو بھی مشکبار کردیا تھا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ آپ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔'' مہکار اپنی جگہ سے ایک ادائے ناز سے اُٹھی اور پھولوں بھری شاخ کی طرح لچکتی ہوئی رشید کے پہلو میں جا بیٹھی۔ ''ذرا اپنا ہاتھ تو دیجئے۔ میں چھو کر دیکھنا چاہتا ہوں...... کہ آپ سچ میں میرے سامنے ہیں یا...... میں سپنا دیکھ رہی ہوں۔''

اسے اپنے اتنے قریب بیٹھے دیکھ کر رشید پر ایک بے خودی کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں خمار بھرتا جا رہا تھا اور دل کی دھڑکنیں منتشر ہوتی جا رہی تھیں۔

❁===❁===❁
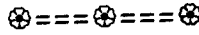
روانگی کی تیاری تو تقریباً مکمل ہی تھی۔ ارجمند بانو، گھر کے فرنیچر کو کور کر کے دیگر اشیاء کو بھی پہلے ہی سینت سنبھال چکی تھیں۔ سوٹ کیس بھی تیار رکھے تھے۔ فقط اظفر کے آخری پیپر کے ختم ہونے کا انتظار تھا۔ پیپر کے اختتام کے اگلے دن ہی روانگی طے تھی، مگر پیپر سے دو روز قبل ہی ملیحہ بیگم کے انتقال کی خبر آ گئی تھی اور ارجمند بیگم، بھائی اور بھتیجوں کے غم میں شریک ہونے کے لئے گھڑی کی چوتھائی میں وطن پہنچ جانا چاہتی تھیں۔

''بھائی جان! ہمارا انتظار کیجئے گا۔ ہم بس روانہ ہو رہے ہیں۔'' انہوں نے گلوگیر آواز میں اطلاع دی۔

''اور اظفر میاں؟'' آفاق صاحب نے چونکتے لہجے میں سوال کیا تھا۔

''جی..... ہم سب آج رات کی فلائٹ سے روانہ ہو رہے ہیں۔'' بھائی کے سوال کا مفہوم سمجھتے ہوئے انہوں نے اپنے لہجے کو حتی الوسع سرسری بنانے کی کوشش کی تھی۔

''اور ان کا پیپر......؟'' آفاق صاحب کے سوال میں تشویش بڑی نمایاں تھی۔

''پیپر کا کیا ہے...... بعد میں بھی دیا جا سکتا ہے۔''
''دیکھو ارجمند! جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا۔ جانے والا تو چلا گیا۔ اب کوئی جنازے پر پہنچے یا چار روز بعد آئے...... کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی لئے میرا مشورہ تو یہ ہے...... کہ تم اب اظفر کے پیپر کے بعد ہی آؤ تو بہتر ہے۔''
''بھائی جان! کیا ہمیں بھابی جان کی آخری بار صورت دیکھنی بھی نصیب نہ ہوگی؟'' ارجمند بانو کی آواز میں نمی اُتر آئی تھی۔
''اگر ایسا ہے تو تم لوگ آ جاؤ۔'' پروفیسر نے ہتھیار ڈالتے ہوئے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''لیکن اظفر میاں پیپر دے کر چند روز بعد آ جائیں گے۔'' پروفیسر صاحب نے اپنا فیصلہ سنا کر فون بند کر دیا تھا۔ ارجمند بیگم، بھائی سے واقف تھیں۔ جانتی تھیں کہ استاد ہونے کے ناطے وہ علم کی اہمیت اور وقعت سے خوب واقف تھے، ان کے نزدیک حصولِ علم سے زیادہ کوئی بھی بات اہم اور ضروری نہ تھی۔ سو اُن کی اس بات پر متفق ہونے کے سوا ارجمند کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔
''مگر مام! پیپر تو بعد میں بھی دیا جا سکتا ہے۔'' اظفر کے لہجے میں دبا دبا احتجاج تھا۔
''میں نے بھی یہ بات کہی تھی۔'' ارجمند بانو دھیمے لہجے میں بولیں۔ ''لیکن بھائی جان کا یہی حکم ہے کہ اظفر پیپر دے کر چار روز بعد روانہ ہوں گے۔''
''مگر مام! ذرا سوچئے تو......''
''ذرا تم سوچو...... تمہاری وجہ سے بلاوجہ سرمد کا بھی پیپر رہ جائے گا۔'' ارجمند بانو نے احساس دلایا۔
''اگر ایسا ہے تو میں سرمد کو ساتھ جانے سے روک دیتا ہوں۔'' اظفر جلدی سے بولے۔ ''وہ پیپر دے کر دو چار دن بعد آ جائیں گے...... مگر میں......''
''تم بھی ان کے ساتھ ہی آ جانا۔'' ارجمند بانو نے اپنا فیصلہ سنایا۔ ''آخر چار چھ دن کی ہی تو بات ہے۔''
اور جب یہ فیصلہ سرمد کے سامنے آیا تو وہ بھی جز بز ہوئے بغیر نہ رہے تھے۔
''آنٹی!'' انہوں نے کوئی تاویل پیش کرنی چاہی مگر ارجمند نے ہاتھ اٹھا کر انہیں بولنے سے روک دیا تھا۔
''تمہیں پیپر ڈراپ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی یہ تمہارے آخری سمسٹر کا آخری پیپر ہے۔ اسے ڈراپ کرنے کا مطلب ہے کہ تمہیں محض ایک پیپر کی خاطر اگلا پورا سمسٹر لگانا پڑے گا۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ تم دونوں پیپر دے کر ہی آؤ۔''
''مام ٹھیک کہہ رہی ہیں سرمد!'' سرمد کے پس و پیش کو محسوس کرتے ہوئے ظفریاب نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوستانہ لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی۔
''ڈیڈ......!'' اظفر نے مدد طلب نگاہوں سے عالم تاب صاحب کی طرف دیکھا۔
''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' عالم تاب صاحب نے سنجیدہ لہجے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ''یہی مناسب ہے کہ تم دونوں امتحانات سے فارغ ہو کر ہی آؤ۔'' سب ہی اس بات پر متفق تھے، اس لئے ان دونوں کو سب کے فیصلے کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ کیونکہ ارجمند تمام اشیاء کو کور کر کے پیک کر چکی تھیں، اس لئے یہ طے پایا کہ اظفر بھی سرمد کے ساتھ ان کے ہوسٹل میں ہی رہیں گے۔ اس طرح نہ صرف کمبائنڈ اسٹڈی ہو سکے گی بلکہ دونوں ایک دوسرے کے اکیلے پن کو بھی شیئر کریں گے۔ ارجمند بانو، عالم تاب صاحب اور ظفریاب کو ایئرپورٹ ڈراپ کرتے ہوئے سرمد، اظفر کو ان کے مختصر سامان کے ساتھ ہوسٹل لے آئے تھے۔ شام کو دانیال بھی آ گئے تھے۔
''گو کہ یہ سچ ہے کہ اپنوں کے غم میں شریک ہونا بھی ضروری ہے۔'' ارجمند بانو کے کہنے کے پیش نظر سرمد اور اظفر

کے پیپر دینے کے لئے رک جانے کے فیصلے پر انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''مگر شاید آنٹی نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔ یقیناً حصولِ علم سے زیادہ کوئی بات بھی اہم اور ضروری نہیں ہے۔''

''لیکن یار! ذرا سوچو......'' اظفر اب تک اس فیصلے سے متفق نہ ہو سکے تھے۔

''اب کچھ مت سوچو۔ اور اگر کچھ سوچنا ہے تو صرف پڑھائی کے بارے میں سوچو۔'' دانیال نے مسکرا کر جواب دیا۔ پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد بولے۔ ''بلکہ میرے پاس ایک اور اچھا آئیڈیا ہے۔ تم دونوں میرے ساتھ میرے گھر چلے چلو۔ کھانے وغیرہ کا بھی مسئلہ نہ ہوگا اور ہوسٹل والی پابندیاں بھی نہیں ہوں گی۔ آرام سے اسٹڈی کر سکو گے۔''

''آئیڈیا تو برا نہیں۔'' اظفر نے تائید طلب نظروں سے سرمد کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے یہیں ٹھیک ہے۔'' سرمد نے کسمساتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں دانیال کی طرف دیکھا۔ ''ویسے بھی دو تین روز کی تو بات ہے۔''

''ایز یُو وِش۔'' دانیال نے کندھے اچکا کر ہتھیار ڈال دیئے۔

❀===❀===❀

سہ پہر سست روی سے شام کی جانب بڑھ رہی تھی۔ آسمان عجیب ملگجا سا ہو رہا تھا جیسے پرانی اوڑھنی کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہو۔ بادلوں کے سرمئی فاختائی ٹکڑے پھیکے ملگجے آکاش پر ادھر اُدھر بے دلی سے ڈول رہے تھے۔

ایئرپورٹ کی عمارت پر آ کر سرمد نے مانوس نظروں سے چاروں اور دیکھا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی لگ رہا تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئے تھے۔ انہوں نے کئی گہرے سانس لے کر وطن کی ہواؤں میں بسی غیر محسوس سی خوشبو کو اپنے پھیپھڑوں میں اُتارنے کی کوشش کی۔ انہوں نے گھر میں کسی کو بھی اطلاع نہیں دی تھی، اس لئے گھر سے کسی کے آنے کا سوال ہی نہ تھا۔ ان کا ارادہ ٹیکسی لے کر گھر جانے کا تھا۔ دراصل وہ عاتکہ بیگم کو سرپرائز دینا چاہتے تھے۔ مگر اظفر نے آفاق صاحب کو فون کر دیا تھا، اسی لئے وہ عالم تاب صاحب کے ساتھ ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ انہوں نے پسندیدہ نظروں سے پہلے اظفر، پھر سرمد کو دیکھا۔ پھر باری باری دونوں کو گلے لگا کر بے حد تپاک سے ملے۔ گو کہ ان کی وجاہت مرزا سے گہری دوستی تھی۔ مگر ان کے بچوں سے شاید ہی کبھی ملنے کا موقع ملا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خود ان کے گھر میں کوئی لڑکا نہ تھا۔ اگر کوئی لڑکا ہوتا تو شاید دونوں گھرانوں کے لڑکوں کے مابین کوئی دوستی کا سلسلہ پروان چڑھتا۔ اور اس باہمی خلیج کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ دونوں کے اسٹیٹس اور اسٹینڈرڈ میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ پروفیسر آفاق ایک متوسط طبقے کے ملازمت پیشہ انسان تھے جبکہ وجاہت مرزا کی دولت اور ثروت کا کوئی حساب ہی نہ تھا۔ اس کے باوجود دونوں کی باہمی دوستی برسوں سے نہایت کامیابی کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ اور ہر خوشی اور غم کے وقت وہ اور وجاہت مرزا ایک دوسرے کے پاس موجود ہوتے تھے۔ ملیحہ بیگم کے انتقال کی خبر سنتے ہی وجاہت مرزا دوڑے دوڑے پروفیسر آفاق کے گھر پہنچے تھے اور میت کی تدفین تک انہی کے ساتھ رہے تھے۔

''تو آپ ہمارے پیارے دوست، وجاہت مرزا کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔'' پروفیسر آفاق نے تحسین و ستائش بھری نظروں سے سرمد کی طرف دیکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ وہ ندرت جہاں کے بے مثال حُسن اور وجاہت مرزا کی وجاہت کا حسین امتزاج تھے۔ آفاق صاحب دل ہی دل میں سرمد کی مردانہ وجاہت کو سراہے بغیر نہ رہ سکے۔

''آپ لوگ چلیں...... میں ٹیکسی لے لوں گا۔'' سرمد نے کہا۔

''ہمارے ساتھ نہیں چل رہے؟'' اظفر نے سوال کیا۔

''میں شام کو ابا جان کے ساتھ آؤں گا۔'' سرمد نے جواب دیا۔ ''اس وقت میں چاہ رہا تھا کہ پہلے گھر......''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' پروفیسر آفاق جلدی سے بولے۔ ''ہم تمہیں ڈراپ کر دیں گے۔''

''وہاں گھر میں سب لوگ آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہوں گے۔'' سرمد نے قدرے تامل بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں ٹیکسی لے لوں گا۔''

''ارے کچھ ہی دیر کی تو بات ہے۔ ہم تمہیں ڈراپ کرتے ہوئے چلے جائیں گے۔ تم کہاں ٹیکسی پکڑتے پھرو گے......کم آن۔'' اوران سب کے اصرار پر سرمد کو پروفیسر آفاق کی گاڑی میں بیٹھنا ہی پڑا تھا۔

پروفیسر، گھر کے پتہ سے آگاہ تھے اس لئے سرمد کو پتہ بتانے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی تھی۔ اور جب ان کی چھوٹی سی گاڑی ''وجاہت منزل'' کی پُرشکوہ عمارت کے سامنے آ کر رُکی تو اظفر نے حیران اور پسندیدہ نظروں سے شاندار قصر نما کوٹھی کو دیکھا تھا۔

''سرمد! تمہارا گھر تو بہت بڑا اور بے حد خوب صورت دکھائی دے رہا ہے۔'' اظفر نے گھر کی طرف ستائش بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے تعریفی لہجے میں کہا تھا۔

'ہاں۔ بڑا تو ہے، پر اب خوبصورت نہیں رہا۔ ہاں، کسی زمانے میں ضرور خوبصورت تھا۔ دُور تک بچھا سبزہ آنکھوں کو تراوت بخشتا تھا اور باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ کھڑے اونچے سرو کے پیڑ متعدد دربانوں کی طرح آنے والوں کا جھک جھک کر سواگت کیا کرتے تھے۔ اور احاطے کے وسیع باغیچوں میں کھلے انواع واقسام کے پھولوں کی دل نواز خوشبو، ہوا کے نرم جھونکوں میں رچی، یہاں وہاں پھرا کرتی تھی۔ سب کچھ کتنا دلفریب، کتنا دلنشین لگا کرتا تھا...... پر اب تو جیسے ہر چیز کو خزاں نگل گئی تھی۔'

سرمد یہ سوچ کر رہ گئے تھے۔ زبان سے کچھ بھی نہ کہہ سکے تھے۔

''اندر نہیں چلیں گے؟'' سرمد نے اجتماعی طور پر سب سے اور خاص طور پر پروفیسر آفاق سے سوال کیا تھا۔

''پھر کسی وقت آئیں گے۔'' پروفیسر آفاق نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا اور سرمد نے سر کے خفیف سے اشارے سے ان کی معذرت قبول کر لی تھی اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے اپنا سوٹ کیس تھامے گیٹ کی طرف بڑھ گئے تھے۔

بوڑھے چوکیدار خانو بابا نے گیٹ کھولا تو سامنے سرمد کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

''سرمد بابو!......آپ......کب......کیسے، یوں اچانک۔''

''ارے خانو بابو! آہستہ بولئے۔ آپ کی ایکسائٹمنٹ اماں بی تک پہنچ گئی تو سارا سسپنس ختم ہو کر رہ جائے گا۔'' سرمد نے مسکراتے ہوئے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چوکیدار کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا اور خانو بابا اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر خاموشی سے مسکراتے ہوئے ان کا سوٹ کیس اُٹھا کر ان کے کمرے کی طرف چلے گئے تھے۔ جبکہ ان کا رخ عاتکہ بیگم کے کمرے کی طرف تھا۔

''سرمد بھیا! آپ......؟'' جانے کس طرف سے نکل کر نکیتا بالکل اچانک ہی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ ''یہ آپ ہی ہیں نا؟'' وہ آنکھیں مل مل کر انہیں دیکھ رہی تھی۔

سرمد چلتے چلتے اچانک رک گئے تھے۔ ان کے جاتے وقت وہ نو دس سال کی چھوٹی سی بچی تھی، اب وہ تیرہ چودہ سال کی خاصی سمجھ دار لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔ اسے دیکھ کر سرمد کو یک گونہ خوشی کا احساس ہوا تھا۔ اسد اور سرمد کے نزدیک نکیتا کی حیثیت چھوٹی بہن کی ہی سی تھی۔ وہ گھر کے کسی بھی فرد کے لئے کوئی تحفہ نہ خرید سکے تھے، مگر اس وقت انہیں افسوس ہو رہا تھا کہ کم از کم نکیتا اور اماں بی کے لئے تو کچھ نہ کچھ ضرور خریدنا چاہئے تھا۔

'خیر کوئی بات نہیں......میں آج رات کو ہی کسی شاپنگ سنٹر جا کر ان دونوں کے لئے اچھے سے تحفے لاؤں گا۔' سرمد نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا اور مسکراتے ہوئے نگیتا کو مخاطب کیا۔

''ہے نگی!......کیسی ہو؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں بھیا!.....مگر یہ آپ ہی ہیں؟ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔''

''اب یقین آیا؟'' سرمد نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت رسید کی۔ ''اب بھاگ کر جاؤ اور میرے لئے مزے دار سی چائے بنا کر لاؤ۔ تب تک میں اماں بی کو سرپرائز دیتا ہوں۔''

''ہاں سچی، وہ تو حیران رہ جائیں گی۔'' نگیتا نے دلچسپی سے آنکھیں پھیلائیں۔ ''آپ ادھر جائیے، میں دو منٹ میں آپ کے لئے گرما گرم چائے لے کر آتی ہوں۔''

سرمد، ٹیرس کی چند سیڑھیاں چڑھتے عاتکہ بیگم کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ بیڈ پہ بیٹھی خالی خالی نظروں سے دریچے سے باہر دھول اُڑاتے احاطے میں اُترتی ملگجی شام کو دیکھ رہی تھیں۔ اس شام کے بعد سے اسد نے بالکل ہی چپ سادھ لی تھی۔ نہ دادی سے التجا کرتے تھے، نہ باپ کی طرف ملتجی سوالیہ نظروں سے تکتے تھے۔ سب سے الگ تھلگ ہو کر رہ گئے تھے۔ لگتا تھا کہ گھر میں رہ کر بھی گھر میں موجود نہیں ہیں۔ اکثر رات کا کھانا نہیں کھاتے......اور کھاتے تو اپنے کمرے میں ہی منگوا لیتے۔ وجاہت مرزا کا خیال تھا کہ بالآخر تھک ہار کر اسد نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور شکست خوردگی کی یہ وقتی ناراضگی جلد ہی دور ہو جائے گی۔ جبکہ عاتکہ بیگم حالات کا درست ادراک رکھتی تھیں اور اسد کی فطرت سے خوب واقف تھیں۔ اُن کی اس خاموشی کو وہ طوفان سے پہلے والی خاموشی پہ محمول کر کے حقیقتاً خاصی خوفزدہ تھیں، ایسے میں اُنہیں اپنے چہیتے سرمد کی بے طرح یاد آتی تھی۔

''اماں بی!'' ہوا کے دوش پر غیر مرئی قدموں سے سفر کرتی سرمد کی نرم اور شیریں آواز ان کی سماعت سے یکبارگی آ ٹکرائی تھی۔

'سرمد.....' اُن کا دل بے ساختہ دھڑکا تھا۔ 'نہیں بھلا وہ کہاں؟' مایوسی نے ان کی لمحاتی خوشی کا گلا گھونٹا۔ 'یہ میری سماعت کا دھوکا ہے، اور کچھ نہیں۔'

وہ گردن موڑ کر دیکھنے کے بجائے بدستور کھڑکی سے باہر تکتی رہیں۔ سرمد بے آواز چلتے ان کے بالکل پیچھے آ کھڑے ہوئے تھے، پھر آگے بڑھ کر انہوں نے اپنے ہاتھوں سے ان کی آنکھیں ڈھانپ دی تھیں۔

''کک......کون......؟'' عاتکہ بیگم کی لرزیدہ سی آواز اُبھری۔

''آپ بتائیے۔'' سرمد ان کی طرف دیکھ کر جھک کر شوخ لہجے میں بولے۔

''سرمد!......میرے بچے!......میرے لعل!'' عاتکہ بیگم نے دیوانہ وار ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے ہٹا کر پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔ ''یہ تم ہی ہو نا سرمد؟......میری آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہیں؟'' انہوں نے ہکا بکا نظروں سے سرمد کو تکتے ہوئے پوچھا اور بے اختیارانہ آگے بڑھ کر ہاتھوں کے پیالے میں سرمد کا چہرہ بھر لیا۔ ''میرے بچے!......میرے سرمد!'' وہ دیوانہ وار اُن کی پیشانی اور اُن کے سر کے بوسے لئے جا رہی تھیں۔ پھر انہوں نے ان کا سر اپنے سینے میں چھپا لیا تھا اور آپ ہی آپ ان کی پلکوں پر نمی اُتر آئی تھی۔

برسوں بعد اس ممتا بھرے سینے سے لگ کر سرمد کو کیسا سکون ملا تھا، یک گونہ تسکین اور راحت کا احساس ہوا تھا۔

'ہم گھر سے، وطن سے دور رہ کر یقیناً بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں، مگر اپنوں سے دُور رہ کر، ان کی محبتوں اور رفاقتوں سے اپنا کس قدر زیاں کرتے ہیں۔' سرمد، دادی کے مہربان سینے میں سر چھپائے سوچ رہے تھے۔ 'کاش! ہم اپنوں

سے کبھی دُور نہ جائیں۔''

''تم یوں کیسے..... بالکل اچانک.....؟'' کتنی ہی دیر سرمد کو سینے سے لگائے رکھنے کے بعد جب ان کے بے چین دل کو کسی قدر قرار آیا تو انہوں نے سرمد کو شانوں سے تھام کر سامنے کرتے ہوئے سوال کیا۔''نہ کوئی فون..... نہ کوئی خبر۔''

''خبر دے کر آتا تو آپ کو بھلا یہ خوشی ملتی، جو مجھے یوں اچانک اپنے سامنے پا کر ملی ہے؟'' سرمد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ تب ہی نکیتا ٹرالی دھکیلتی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''بھیا جی کے لئے چائے ناشتہ سب حاضر ہے۔'' کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے ہاتھ اوپر کر کے اعلان کیا۔

''اے پگلی! یہ سب کیا اُٹھا لائی؟'' سرمد نے حیران نظروں سے مختلف لوازمات سے پٹی ٹرالی کی طرف دیکھا۔''اس وقت میں صرف چائے پیوں گا۔ اور وہ بھی اپنی پیاری اماں بی کے ساتھ۔'' انہوں نے پیار سے بازو عاتکہ بیگم کے شانوں پر پھیلا کر انہیں اپنے ساتھ لگاتے ہوئے ناز بھرے انداز میں کہا اور عاتکہ بیگم بے اختیار مسکرا دیں۔

''ابا جان.....؟'' سرمد نے چائے کا کپ اُٹھاتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

''ابھی فیکٹری سے نہیں لوٹے۔'' عاتکہ بیگم نے چائے کے کپ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''اور اسد بھائی؟'' سرمد کے دوسرے سوال پر بے ساختہ ان کا ہاتھ لرز گیا تھا اور چائے کا کپ ان کے بوڑھے اور ناتواں ہاتھوں میں کپکپا کر رہ گیا تھا۔

''وہ بھی فیکٹری گئے ہیں کیا؟'' سرمد نے دوبارہ پوچھا۔

''ہاں شاید۔'' عاتکہ بیگم نے نظریں چرائیں۔

''کیا آج کل وہ بہت مصروف ہیں؟..... نہ فون نہ خبر..... انٹرنیٹ پر بھی آن لائن نہیں ہوتے۔''

''ہاں! کچھ ایسا ہی ہے۔'' وہ جس قدر اسد کے ذکر سے بچنا چاہ رہی تھیں، سرمد اسی قدر ان کا تذکرہ کئے جا رہے تھے۔''تم سناؤ..... امتحان ہو گیا ہے؟'' انہوں نے بات گھمائی۔

''جی..... آپ کی دعا سے ہو گیا۔'' سرمد نے جواب دیا۔

''اب تو نہیں جاؤ گے؟'' عاتکہ بیگم نے تصدیق چاہی۔

''اگر ایم ایس کا ارادہ ہوا تو جانا پڑے گا۔'' سرمد نے جھوٹے دلاسے کے بجائے سچائی کا اعتراف کیا۔''لیکن ابھی فوری طور پر ہرگز نہیں۔ درمیان میں کئی مہینے ہیں۔''

چائے کے بعد سرمد فریش ہو کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے اور عاتکہ بیگم رات کے کھانے کی تیاری کے سلسلے میں کچن میں آ گئی تھیں۔ کوئی سال بھر سے ایک باورچی موجود تھا، کھانا بھی ٹھیک ٹھاک بنا لیتا تھا۔ مگر آج سرمد کے لئے وہ خود اپنے ہاتھ سے کچھ بنانا چاہتی تھیں۔ نکیتا لپک جھپک کر ان کے قریب آئی تھی۔ اس کے چہرے پر خوشی پھوٹ رہی تھی۔ خود عاتکہ بیگم بھی اس اچانک آ جانے والی خوشی سے بے حد مسرور تھیں۔ کچن کی خاموش فضا گنگناتی محسوس ہو رہی تھی۔

❀===❀===❀
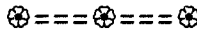
پروفیسر آفاق احمد اور انو کے گھرانے میں ایک واضح فاصلہ تھا۔ مگر اس فاصلے کو کبھی کسی نے محسوس ہی نہیں کیا تھا پروفیسر آفاق نے انو اور نمو کو ہمیشہ اپنے بچوں کی طرح ہی سمجھا تھا۔ فریال اور نمو کی باہمی دوستی اور فریحہ کو نمو بھی فریال کی طرح ہی عزیز تھی۔ دونوں گھرانے لحہ بہ لحہ ایک ساتھ تھے ہر خوشی اور غم میں ایک دوسرے کے شریک تھے۔ انو کے ہر آڑے وقت میں آفاق صاحب نے کسی مہربان بزرگ کی طرح ہی اس کا ساتھ دیا تھا۔ انو کی نوکری، نمو کی تعلیم اور اب اس کی شادی..... ہر چیز میں کہیں نہ کہیں آفاق احمد صاحب کا مخلصانہ رویہ اور احساس شامل تھا۔ جسے کبھی بھولے سے بھی

انہوں نے نہ جتایا تھا۔ لیکن اس کے باوجود انو اُن کا احسان مند تھا اور اُن کی بے حد عزت کرتا تھا۔ اس قدر شیر و شکر خاندان میں فاصلہ ہونے کا احساس سب سے پہلے حسنہ نے انو کو دلایا تھا۔ کیونکہ گھونگھٹ اُٹھاتے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ آفاق صاحب اور ان کے خاندان کے ہوتے وہ اپنی نند کے ساتھ روایتی قسم کی سخت گیری اور ظالم بھابی کا روّیہ نہ روا رکھ سکے گی۔ اسی لئے اس نے پہلی فرصت میں انو کے کان بھرنے شروع کر دیئے تھے۔

پھر بالکل اچانک ہی ملیحہ بیگم کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس ناگہانی افتاد پر سب ہی بوکھلا گئے تھے۔ خود انو کو بھی بے حد صدمہ تھا۔ سو اسی وقت اس نے نمو کو سوئم تک کے لئے آفاق صاحب کے گھر چھوڑ دیا تھا۔ آنسو بہانے کے لئے فریال کے پاس ایک نمو کا ہی تو کاندھا تھا۔ نمو کو اتنے دنوں کے لئے آفاق صاحب کے گھر چھوڑ دینے پر حسنہ کو سخت غصہ تھا۔

''سگے رشتوں میں ہمارے بھائیوں نے ہمیں کبھی کہیں ایک رات رُکنے کی بھی اجازت نہیں دی۔ ایک تم ہو..... غضب خدا کا..... بالکل غیر، انجانے..... نہ کوئی رشتہ ناطہ، نہ کوئی ذات برادری.....اور جوان جہان لڑکی کئی دن ان کے گھر پڑی رہے۔ ہم نے تو اپنے خاندان میں کہیں ایسا نہیں دیکھا۔''

دراصل نمو نے ہی گھر کی ساری ذمہ داری اُٹھائی ہوئی تھی۔ کھانا پکانے سے لے کر صاف صفائی، کپڑوں کی دُھلائی، سارے ہی کام نمو کے ذمے تھے۔ نمو کے گھر میں نہ ہونے سے حسنہ کو ہاتھ پیر ہلانے پڑتے تھے جس سے ظاہر ہے تکلیف ہونا لازمی تھی۔ اسی لئے اس کی کوشش ہوتی تھی کہ نمو لمحہ بھر کو بھی گھر سے کہیں نہ جانے پائے اور رات دن گھر کے کام کاج میں جتی رہے۔ کبھی رات کو وہ کتابیں لے کر بیٹھتی تو حسنہ کو یہ بھی برا لگتا تھا۔

''لو بتاؤ..... امتحان کہیں جا کر اگست میں ہوں گے اور تم ابھی کتابوں میں منہ دے کر بیٹھ گئیں۔'' وہ جلے بھنے لہجے میں کہتی اور نمو خاموشی سے حیران نظروں سے اسے دیکھتی رہ جاتی۔ حسنہ اکثر انو کے ساتھ گھومنے پھرنے نکل جاتی یا اپنے عزیز اقرباء کے ہاں ملنے چلی جاتی..... مگر وہ کبھی بھولے سے بھی نمو کو ساتھ نہ لے جاتی تھی۔ شروع شروع میں انو کو خیال بھی آیا مگر حسنہ نے یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیا۔

''جوان جہان خوبصورت لڑکی کو ساتھ لئے پھرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اللہ رکھے ہمارے پانچ پانچ بھائی تھے..... مگر مجال ہے جو ہم کبھی کسی کے ساتھ گھومنے نکلے ہوں۔''

سوئم کے بعد گھر آنے کے بعد نمو کو دوبارہ آفاق صاحب کے گھر جانے کی فرصت ہی نہ ملی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہفتہ بیت گیا۔ اتنے دن گزر جانے کے باوجود آفاق صاحب کے گھر میں سوگ کی فضا جوں کی توں قائم تھی۔ آفاق صاحب مرد تھے۔ ملیحہ بیگم کے ساتھ اک عمر کی رفاقت تھی۔ ان کی دائمی جدائی، آفاق صاحب کے لئے کسی حادثے سے کم نہ تھی۔ مگر انہوں نے بچیوں کی خاطر خود کو سنبھال لیا تھا۔ جہاں تک فریال کا تعلق تھا، وہ ایک سمجھ دار، باشعور اور مضبوط دل و دماغ کی مالک لڑکی تھی..... سو اس المناک سانحے کو اس نے بڑی مضبوطی سے برداشت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے سوا چارہ بھی تو نہ تھا۔ مگر فریحہ ہی تھی کہ اس کا ننھا سا نازک دل جدائی کے اس لمحے کو نہ سہہ سکا۔ کسی طور اسے قرار نہ آتا تھا۔ ہر دم اس کی آنکھیں اشکبار رہتیں۔ اس کا کھانا پینا چھٹ گیا تھا۔ رات دن ماں کی تصویر کے سامنے بیٹھی آہ و بکا میں مصروف رہتی۔ اس کی کیفیت سے سب ہی پریشان تھے۔ آخر یہ طے پایا تھا کہ دسویں کے فوراً بعد فریحہ کا نکاح کر کے رخصتی کر دی جائے۔ شاید خوشی کا یہ نیا رشتہ پرانے غم کے زخم کو مندمل کرنے میں معاون ثابت ہو سکے۔

''انور میاں!..... کل شام کو تم اپنی بیگم اور نمو کے ساتھ آ جانا۔ فریحہ کا نکاح ہے۔'' پروفیسر آفاق نے انو کو دعوت دی تھی۔

''نکاح؟..... مگر ابھی تو.....'' انو حیران ہوا۔

''دراصل فریحہ کی طبیعت کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔'' آفاق صاحب نے افسردہ لہجے میں وضاحت کی۔''اور ویسے بھی یہ کام تو کرنا ہی تھا۔ آخر ارجمند بانو یہاں کب تک بیٹھی رہیں گی؟ جلد یا بدیر انہیں جانا ہی ہے۔ تو جو کام جتنی جلد ہو جائے، بہتر ہے۔''

''جی...... کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی انو نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اور جب اس نے حسنہ کو اس نکاح اور رخصتی کی خبر دی تو وہ تنک کر بولی تھی۔

''لو بتاؤ..... ماں کا ابھی کفن بھی میلا نہیں ہوا اور یہاں نکاح بیاہ ہونے لگا۔ سچ ان بڑے لوگوں کا کوئی دین دھرم، کوئی تعلق رشتہ نہیں ہوتا۔ ہم تو نہیں جانے والے ایسی شادی بیاہ میں۔''

''مگر وہ..... نمو..... وہ تو.....'' انو نے دبے لہجے میں کہنا چاہا۔

''وہ تو نہیں مانے گی نا...... یہی کہنا چاہ رہے ہو نا؟'' حسنہ نے ہاتھ اٹھا کر میاں کے منہ کی بات لی۔''تو اسے بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟..... کون سے ہمارے رشتے دار ہیں۔ ان کے گھر نکاح بیاہ ہو یا طلاق جدائی..... ہمیں کیا لینا دینا ان سے؟''

نکاح کی یہ رسم نہایت سادگی سے ادا کی گئی تھی۔ غیروں میں سے صرف وجاہت مرزا اور سرمد شریک ہوئے تھے۔ نکاح کے بعد رخصتی بھی عمل میں آ گئی تھی۔ اور فریحہ بیگم گراؤنڈ فلور کے اپنے اور فریال کے مشترکہ بیڈروم سے رخصت ہو کر فرسٹ فلور کی اس آراستہ خواب گاہ میں اُٹھ آئی تھیں، جو ارجمند بانو نے بے حد پیار سے ان کے اور اپنے لاڈلے بیٹے ظفریاب کے لئے ڈیکوریٹ کیا تھا۔

سب کچھ بخیر و عافیت ہو گیا تھا۔ گو کہ ارجمند بانو ہر کام میں پیش پیش تھیں مگر پھر بھی زیادہ ذمہ داری فریال کے نازک کندھوں پر ہی تھی۔ بے حد مصروف ہونے کے باوجود اس کی نگاہیں گیٹ کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

''پاپا! نمرہ کیوں نہیں آئی؟'' یہ سوال کوئی دس بار وہ پروفیسر صاحب سے کر چکی تھیں۔''آپ نے انو بھیا سے کہا تھا نا.....؟''

''ہاں بھئی۔ اور اس نے آنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ پر خدا جانے کیا ہوا؟..... تم کہو تو میں کسی کو بھیج دوں؟''

''نہیں..... خدا جانے کیا وجہ ہے۔'' فریال نے مایوس لہجے میں جواب دیا۔ جس فریحہ کی شادی کی تیاریوں میں نمو قدم قدم پہ شریک تھی، آج اسی کی شادی میں وہ شامل نہیں ہو سکی تھی۔

اگلی شام ارجمند بانو نے قریبی اعزاء کے اعزاز میں دعوتِ ولیمہ کے نام پر ایک چھوٹے سے لیکن پُرتکلف ڈنر کا اہتمام کیا تھا اور اس ڈنر میں شرکت کے لئے فریال نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ خود جا کر نمرہ کو لائے گی۔

''ارے تم..... یوں اچانک......؟'' نمو، فریال کو دیکھ کر حیرت بھری مسرت سے بولی تھی۔

''کیا مطلب؟'' فریال حیران ہوئی۔''جیسے تمہیں پتہ نہیں..... تم کل کیوں نہیں آئیں؟..... پتہ ہے نکاح کے وقت آپی تمہیں کس قدر یاد کر رہی تھیں۔''

''نکاح؟'' نمرہ نے حیرانی سے پلکیں جھپکیں۔''کس کا نکاح؟''

فریال نے جب ساری بات بتائی تو نمرہ سے حیرت سے کہا۔''مگر بھیا نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔''

''ہو سکتا ہے بھول گئے ہوں۔'' فریال نے حسنہ کی گھورتی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے رسان بھرے لہجے میں کہا تھا۔''مگر اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ آج ارجمند آنٹی نے ایک ڈنر رکھا ہے۔''

''وہ ابھی تک گھر نہیں آئے ہیں۔'' حسنہ نے سرد لہجے میں کہا۔''اور ان کی اجازت کے بغیر یہ کس طرح جا سکتی ہے؟''

''مگر بھابی.....!'' نمرہ نے کچھ کہنا چاہا۔
''اگر مگر تو میں کچھ نہیں جانتی۔'' حسنہ نے تڑختے لہجے میں کہا۔ ''میں نے جو کہنا تھا، کہہ دیا۔'' اب جو تمہارے دل میں آئے، سو کرو۔'' یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختی اندر چلی گئی تھیں۔
''مجھے لگتا ہے حسنہ بھابی ہم لوگوں سے تمہارا گھلنا ملنا پسند نہیں کرتیں۔'' فریال نے بے حد دھیمے لہجے میں اظہار کیا تھا۔
''نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔'' نمرہ جلدی سے بولی تھی۔ ''دراصل آج کل بھابی کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے کچھ...... چڑچڑی ہو رہی ہیں۔ تم رُکو، میں ابھی تیار ہوتی ہوں۔''
''نہیں نمو!'' فریال رسان بھرے لہجے میں بولی۔ ''اگر ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو تمہیں میرے ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انو بھیا کے آنے کے بعد اگر وہ پسند کریں تو ان کے ساتھ آ جانا...... اور اگر نہ آ سکو...... تو بھی کوئی بات نہیں۔''
''ناراض ہو گئیں؟'' نمرہ نے گھبرائے لہجے میں پوچھا۔
''بالکل بھی نہیں۔'' فریال مسکرائی۔ ''جب حالات بدلتے ہیں تو ہمیں ان حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے کی صلاحیت پیدا کرنی چاہئے۔'' اس نے پیار سے نمو کے رخسار تھپتھپائے اور بااعتماد انداز میں قدم اٹھاتی داخلی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ نمو کی سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ وہ بس پلکیں جھپک جھپک کر ادھ کھلے دروازے کی طرف تکتی رہ گئی تھیں۔ حالات بدل رہے تھے، تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں، مگر نمو اپنی فطری سادگی اور معصومیت کے باعث کچھ بھی محسوس نہیں کر پا رہی تھی۔

❀===❀===❀
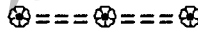
شام کے سرمئی سائے آہستگی سے ''وجاہت منزل'' کو اپنے حصار میں سمیٹتے جا رہے تھے۔ آج عاتکہ بیگم سرشام ہی ٹیرس پر دھری کرسیوں سے اپنی پسندیدہ مخصوص کرسی پر آ بیٹھی تھیں۔
''اماں بی! چائے لے آؤں؟'' انہیں دیکھتے ہی نگینا لپکتی ہوئی قریب چلی آئی تھی۔
''پہلے ذرا دیکھ لو، اگر سرمد میاں آ گئے ہیں تو انہیں بھی بلا لو۔'' عاتکہ بیگم کا حکم سنتے ہی نگینا تیزی سے سرمد کے کمرے کی طرف دوڑ گئی اور کچھ ہی دیر بعد سرمد مسکراتے ہوئے دادی کے مقابل آ بیٹھے تھے۔
وجاہت مرزا آج کل فیکٹری لگانے میں مصروف تھے، اس لئے پرانے آفس کی تمام تر ذمہ داری دونوں بیٹوں کے سپرد کر دی تھی۔ خود وجاہت مرزا بھی آج کل بے حد مصروف تھے اور اکثر رات گئے گھر واپس لوٹتے۔ اسد کا تو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کب جاتے اور کب لوٹتے ہیں۔ البتہ سرمد، عاتکہ بیگم کے اکیلے پن کے خیال سے سرشام ہی گھر لوٹ آتے تھے۔ اور اکثر ان کے ساتھ شام کی چائے پیتے اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف رہتے۔ ابھی نگینا چائے لے کر بھی نہیں آئی تھی کہ وجاہت مرزا بھی آ گئے تھے۔ انہیں سیڑھیوں سے چڑھ کر ٹیرس کی طرف آتا دیکھ کر سرمد باپ کے احترام میں اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور مؤدب انداز میں سلام کیا تھا۔
''جیتے رہو۔'' وجاہت مرزا کے لبوں پر مشفقانہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ وہ انہیں بیٹھنے کا اشارہ کر کے ماں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔
''اماں بی! آپ کیسی ہیں؟''
'اپنے سرمد کے آنے کے بعد تو لگتا ہے کہ دوبارہ جی اُٹھی ہوں۔'' عاتکہ بیگم نے محبت پاش نظروں سے سرمد کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا اور وجاہت مرزا کی آنکھوں میں بھی اپنے بیٹے کے لئے پیار کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ انہیں اپنا یہ بیٹا بے حد عزیز تھا اور جانتے تھے کہ ان کا یہ بیٹا ہی انہیں دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر محبت کرتا ہے۔

سرمد جب لندن میں تھے تو ارجمند بانو انہیں اکثر ڈنر پر انوائٹ کرتی رہتی تھیں۔ اس گھر میں انہیں اپنوں کا سا پیار ملا تھا۔ اب وہ لوگ ان کے شہر میں موجود تھے تو سرمد بھی محبتوں کے اس قرض کو اُتارنے کی آرزو رکھتے تھے۔ شروع شروع تو وہ لوگ ملیحہ بیگم کی ناگہانی موت کے صدمے میں اتنے ڈوبے ہوئے تھے کہ انہیں کسی اور بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ اب اس غم کو گزرے کافی دن ہو گئے تھے۔ ظفریاب اور فریحہ کی شادی کے بعد کرب کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں شادمانی کی بے نشان سی کرنیں پھوٹنی شروع ہوئی تھیں، تو موقع غنیمت جان کر سرمد نے ان سب کو اپنے گھر پر ڈنر پر انوائٹ کرنے کا پروگرام بنالیا تھا۔

''سرمد میاں! تم نے تو میرے منہ کی بات لے لی۔'' ان کی بات سن کر وجاہت مرزا مسرور لہجے میں بولے۔ ''میں بھی ایسا ہی کچھ سوچ رہا تھا۔''

''یہ تو بے حد خوشی کی بات ہے کہ تم دونوں باپ بیٹا ایک ہی انداز میں سوچتے ہو۔'' عاتکہ بیگم خوش دلی سے بولیں۔ ''اور جب یہ طے ہو گیا ہے کہ ان سب کو انوائٹ کرنا ہے تو اس ہفتہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''جیسا آپ پسند کریں۔'' وجاہت مرزا اور سرمد نے یک زبان ہو کر کہا اور اس یکسانیت پر بے ساختہ ہنس پڑے۔

''ذکریا، اچھا باورچی ہے۔'' عاتکہ بیگم نے کھانے کی تیاری کے سلسلے میں بات آگے بڑھائی۔ ''میں خود بھی اس کے ساتھ لگ جاؤں گی سب کچھ وقت پر تیار ہو جائے گا۔''

''ارے آپ کہاں پریشان ہوں گی؟'' وجاہت مرزا جلدی سے بولے۔ ''کسی بھی فائیو اسٹار ہوٹل کی سروسز حاصل کی جاسکتی ہیں۔''

اس سے قبل بھی ہمیشہ ہی ایسا ہوتا رہا تھا۔ وجاہت مرزا کاروباری دعوتیں عموماً ہوٹلز میں ہی رکھتے تھے۔ مگر ناگزیر صورتحال میں اگر گھر پر ڈنر رکھنا ہوتا تو وہ عموماً کسی اچھے ہوٹل سے ہی کھانا منگوالیا کرتے تھے۔ سرمد کو بھی وجاہت مرزا کی تجویز پسند آئی تھی۔

مغرب کی اذان سن کر وہ تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ نمازِ مغرب کی ادائیگی کے بعد سرمد جونہی کوٹھی میں داخل ہوئے تھے، اسد کے کمرے میں روشنی دیکھ کر اس طرف بڑھ گئے تھے۔ اسد کا کمرہ تیز روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ وہ اس وقت کمپیوٹر پر مصروف تھے۔ ان کی مخروطی انگلیاں کی بورڈ پر متحرک تھیں اور آنکھیں مانیٹر پر جمی ہوئی تھیں۔ دروازے پر ہلکی سی دستک نے بھی ان کے انہماک میں کوئی فرق نہ آنے دیا تھا۔

''یس۔'' اپنے کام میں منہمک وہ بنا مڑے بولے تھے اور اگلے ہی لمحے سرمد آہستگی سے دروازہ دھکیلتے اندر آ گئے تھے۔

''اوہ سرمد! تم ہو......؟'' سرمد کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اسد نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ ''آؤ......کوئی کام ہے؟''

''کیا کام کے بغیر میں آپ کے پاس نہیں آسکتا؟'' سرمد کے لہجے میں بے نام سا شکوہ تھا۔

''ارے نہیں۔'' اسد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ''دراصل یہاں سب لوگ اتنے مصروف ہیں کہ بنا کام کے کوئی کسی کے پاس جاتا ہی نہیں۔'' کمپیوٹر کو شٹ ڈاؤن کرتے ہوئے انہوں نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ ''اوروں کا تو پتہ نہیں، لیکن لگتا ہے کہ آپ بے حد مصروف ہو گئے ہیں۔ میں جب سے آیا ہوں، آپ سے شاید صرف دو بار ہی ملاقات ہوئی ہے۔'' کئی دنوں سے دل میں پلتا شکوہ آخر سرمد کے لبوں پر آ گیا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ اسد شروع سے ہی نانی، خالہ اور

ماں کی سنگت میں رہ کر دیگر اہلِ خانہ سے کچھ الگ تھلگ رہنے کے عادی ہو گئے تھے۔ مگر اس دُوری میں آج کل کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو گیا تھا۔

''کسی بات پر مجھ سے ناراض ہیں کیا؟'' اسد کو خاموشی سے سر جھکائے سوچوں میں گم دیکھ کر سرمد نے دوسرا سوال کیا تھا۔

''نن..... نہیں..... ایسا تو کچھ نہیں ہے۔'' اسد نے سٹپٹا کر جواب دیا اور نگاہ اٹھا کر اپنے اس وجیہہ اور محبت کرنے والے بھائی کی طرف دیکھا۔

''اماں بی نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟'' چند لمحوں بعد دھیمے لہجے میں انہوں نے سوال کیا۔ وجاہت مرزا سے تو نہیں البتہ عاتکہ بیگم سے انہیں پوری توقع تھی کہ سرمد کے آتے ہی وہ ثروت کے مسئلے کو اس سے ضرور ڈسکس کریں گی۔

''نہیں تو......'' سرمد کی حیرت بے حد نیچرل تھی۔ ''کیا کوئی مسئلہ ہے؟'' ان کے سوال پر بے نام سی پریشانی بھی حلول کر گئی تھی۔

''مسئلہ تو نہیں تھا لیکن بنا دیا گیا ہے۔'' اس کے لہجے میں نمایاں شکایت تھی۔ ''خیر چھوڑو، تم کہاں ان چکروں میں پڑ گئے؟''

''کیا میں اس مسئلے کے بارے میں کچھ جان سکتا ہوں؟'' بھائی کے شکایتی اور کرب بھرے لہجے نے انہیں اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔

''اماں بی سے پوچھنا'' اسد کرب بھرے انداز میں مسکرائے۔ ''وہی تمہیں تفصیل سے بتائیں گی۔'' ایک لمحے کو تو اسد کا دل چاہا تھا کہ وہ بھائی کو اپنے درد میں شامل کر لیں مگر پھر انہیں خیال آیا تھا کہ وجاہت مرزا اور عاتکہ بیگم کی طرح سرمد بھی ندرت جہاں اور ان کی فیملی کو ناپسند کرتے تھے، چنانچہ اپنے منہ سے انہیں کچھ بتانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ''میں ذرا خالہ جان کی طرف جا رہا ہوں۔''

''شوق سے جایئے۔ مگر پہلے میری ایک گزارش سن لیجئے۔'' سرمد خوش دلی سے مسکرائے۔ ''ہفتہ کی رات ڈنر پر ابا جان کچھ لوگوں کو انوائٹ کر رہے ہیں۔ ارجمند آنٹی اور ظفر نے وہاں لندن میں میرا بہت خیال رکھا تھا۔ میری خواہش ہے کہ آپ بھی ان سے ضرور ملیں۔''

''ضرور ملیں گے۔'' خلافِ توقع اسد نے فراخ دلانہ انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔ ''ڈنر کس وقت ہے؟''

''ہفتہ کی رات 9 بجے۔'' سرمد نے میکانکی انداز میں جواب دیا۔

''خادم حاضر ہو جائے گا۔'' اسد نے سر جھکا کر سینے پر ایک ہاتھ رکھ کر جواب دیا تو سرمد بے اختیار ہنس دیئے تھے۔

❀===❀===❀
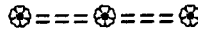
ویزے کے سلسلے میں کچھ کاغذی کارروائی کے لئے فریحہ اور ظفریاب کو اسلام آباد جانا تھا، اسی لئے نکاح کے فوراً بعد ارجمند بانو بیگم نے ان دونوں کو اسلام آباد بھیج دیا تھا۔ ان کے پیش نظر ایک خیال یہ بھی تھا کہ فریحہ اس افسردہ اور سوگوار ماحول سے دُور جائے گی تو کچھ بہتر محسوس کرے گی اور یہ کہ کچھ وقت اس نوبیاہتا جوڑے کو اکیلے میں ساتھ رہنے کو مل سکے گا۔ اس طرح سے غیر اعلانیہ طور پر فریحہ اور ظفریاب کا یہ ہنی مون ٹور تھا۔ دو ہفتے بعد جب ظفریاب اور فریحہ، اسلام آباد مری وغیرہ سے گھوم پھر کر واپس لوٹے تھے تو فریحہ پہلے کی نسبت خاصی کھلی کھلی اور شاداب لگ رہی تھی۔ گھر کے افسردہ ماحول سے دُوری اور ظفریاب جیسے چاہنے والے شریکِ حیات کی سنگت نے اس پر بے حد خوشگوار اثرات مرتب کئے تھے۔ اسی رات سرمد کے گھر ڈنر پر سب ہی لوگ گئے تھے اور سب کو ہی وجاہت منزل بے حد پسند آئی تھی۔ فائیو اسٹار

ہوٹل سے منگوایا گیا کھانا بھی بے حد لذیذ تھا۔
گزرتے وقت نے ملیحہ بیگم کی جدائی کے زخم کو مندمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ ارجمند بانو اوران کی فیملی کی واپسی کا وقت قریب آرہا تھا۔ اب کے واپسی پر فریحہ بھی ان کے ساتھ جانے والی تھی۔ ارجمند بانو کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔
روانگی سے ایک دن قبل اظفراور فریال کا نکاح ہونا قرار پایا تھا۔ اظفراور فریال اپنی اپنی جگہ بے حد خوش تھے۔ گوکہ یہ طے تھا کہ فی الحال صرف نکاح ہونا تھا، رخصتی دو سال بعد ہونا تھی، اس کے باوجود یہ رشتہ ان دونوں کی نوعمری کے خوابوں کی تعبیر تھا۔
نمو گھر کے بکھیڑوں میں اتنی اُلجھ گئی تھی کہ اب فریال کے پاس اس کا آنا تقریباً ختم ہی ہو چکا تھا۔ فریال تو پہلے ہی اس طرف کم جاتی تھی اور اب جب سے اس نے محسوس کیا تھا کہ شاید اس کے جانے سے حسنہ کچھ اُلجھن سی محسوس کرتی ہے تو اس نے جانا اور بھی کم کر دیا تھا۔ دوسرے گھر میں مہمانوں کی وجہ سے ویسے بھی فرصت بھی کہاں تھی۔ سکول جانا ہوتا تھا تو روز ملاقات ہو جاتی تھی۔ سکول کے چھٹنے سے ملاقات کا یہ سلسلہ بھی جاتا رہا تھا۔ حتیٰ کہ نمو، فریحہ کے نکاح پر بھی نہ آ سکی تھی۔ مگر فریال کی یہ دلی خواہش تھی کہ اُس کی اس خوشی کے موقع پر اس کی عزیز دوست نمو ضرور موجود ہو۔ اسی لئے اس نے پہلے سے ہی آفاق صاحب سے کہہ دیا تھا۔
''پاپا! نمرہ کے لئے انو بھیا سے کہہ دیجئے گا۔''
''ارے ہاں بھئی! مجھے یاد ہے۔'' آفاق صاحب مسکرا کر بولے۔ ''یہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے؟''
''پر فریحہ آپی کی دفعہ تو انو بھائی، نمرہ کو بتانا بھول گئے تھے نا؟'' فریال کے لہجے میں غیر محسوس سا شکوہ تھا۔
''اب کے ہم نے سوچا ہے کہ ہم خود جا کر اسے لے آئیں گے۔'' فریال کو خوش کرنے کی خاطر آفاق صاحب نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا اور فریال واقعی کھل اُٹھی۔
''یہ تو بہت اچھا آئیڈیا ہے پاپا! آپ دوپہر کو ہی جا کر اسے لے آیئے گا۔''
اور جب آفاق صاحب خود نمرہ کو لینے پہنچے تھے تو حسنہ کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود انو انکار کی جرأت نہ کر سکا تھا اور نمو، فریال کے نکاح کی تقریب میں شرکت کے لئے آ پہنچی تھی۔ نمو کو دیکھتے ہی فریال دوڑ کر اس کے گلے جا لگی تھی۔ آج کتنے دنوں بعد ان دونوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ فرطِ مسرت سے دونوں کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔ فریحہ، فریال کو سجانے سنوارنے کی ذمہ داری نمو کو سونپ کر خود نیچے کے انتظامات دیکھنے چلی گئی تھی۔ بہت ہی چھوٹے پیمانے پر تقریب کا انعقاد کیا گیا تھا۔ صرف قریبی لوگ مدعو کئے گئے تھے۔ وجاہت مرزا کے ساتھ سرمد بھی اظفر کی اس خوشی میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے۔ ارجمند بانو بیگم، فریال کے لئے عنابی رنگ کا نفیس کام کا بے حد خوبصورت سوٹ اور ہم رنگ جیولری گولڈ سیٹ اپنے ساتھ لائی تھیں۔ نمو نے وہ سوٹ پہنا کر سرِ شام ہی فریال کو دُلہن کا روپ دے دیا تھا۔
''ماشاءاللہ!'' فریحہ کمرے میں داخل ہوئی تو فریال کو اس روپ میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں توصیف بھری چمک جاگ اُٹھی تھی۔ ''سچ! بہت پیاری لگ رہی ہو۔'' اس نے جھک کر اس کی پیشانی پر مہرِ محبت ثبت کرتے ہوئے کہا تھا۔
''اب نمو! تم بھی جلدی سے تیار ہو جاؤ۔'' فریحہ نے سرمئی رنگ کے کامدانی کے خوبصورت سوٹ کو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔
''یہ کیا ہے؟'' نمو نے حیرت سے سوٹ کی طرف دیکھا۔
''میری شادی پہ پہننے کے لئے امی نے تمہارے لئے سلوایا تھا۔ اس وقت تو تم نہیں آ سکی تھیں، اس لئے آج پہن

لو۔" ماں کے ذکر پر فریحہ افسردہ ہوگئی تھی۔ نمو اور فریال کے چہروں پر بھی ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔

نمو نے بنا کچھ کہے سوٹ تھام لیا تھا۔ سوٹ پہن کر جونہی وہ باتھ روم سے برآمد ہوئی تھی، فریال نے حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ سرمئی رنگ کے لباس میں بغیر میک اپ ہی اُس کا شاداب چہرہ بادلوں میں چاند کا سا منظر پیش کر رہا تھا۔

عصر اور مغرب کے درمیان نکاح کی رسم ادا کی گئی تھی۔ اس کے بعد ایک پُرتکلف ڈنر کا اہتمام تھا۔

پہلی منزل کا یہ کمرہ بالکونی کے ساتھ کچھ اس طرح سے بنا ہوا تھا کہ کمرے کے وسط سے ہی کھڑکی کے وسیع گیٹ کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ نمو اور فریال بیڈ پر بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں اور جب موقع ملتا باہر کی جانب بھی نگاہ ڈال لیتی تھیں۔ فریحہ نیچے مہمانوں میں مصروف تھی۔ ڈنر کے بعد سارے لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

"میرا خیال ہے اب چلنا چاہئے۔" وجاہت مرزا نے اجازت طلب نظروں سے عالم تاب صاحب اور پروفیسر آفاق کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ دیر اور بیٹھو یار!" عالم تاب صاحب نے بے تکلفی سے وجاہت مرزا کا ہاتھ پکڑ کر اصرار بھرے لہجے میں کہا تھا" کل صبح ہم چلے جائیں گے۔ پھر جانے زندگی پھر کبھی ملاقات کی اجازت دے، نہ دے۔"

تب ہی فریحہ نے کمرے میں جھانک کر اعلان کیا تھا" انکل! ابھی مت جایئے گا۔ میں چائے بھجوا رہی ہوں۔"

"آپ بہت نیکی کا کام کریں گی۔" عالم تاب صاحب مسکرا کر بولے تھے اور فریحہ تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ "نمو! ذرا کچن میں آنا۔" اس نے سیڑھیوں کے قریب رک کر اوپر کی طرف چہرہ کر کے نسبتاً اونچی آواز میں نمو کو پکارا تھا۔

"جی آئی۔" آواز سنتے ہی نمو اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اظفر اور سرمد مہمانوں کو الوداع کہنے گیٹ تک گئے تھے۔ مہمانوں کو رخصت کر کے وہ دونوں جونہی سیڑھیوں کے سامنے پہنچے تو اوپر سے تیزی سے اُترتی نمو بے ساختہ سرمد سے آ ٹکرائی تھی۔ شاید غلطی سرمد کی ہی تھی، وہ بالکل اچانک ہی سامنے آ گئے تھے اور تیزی سے زینے پھلانگتی نیچے اُترتی نمو اپنی ہی جھونک میں سرمد پر آ گری تھی۔ سرمد نے بے اختیارانہ اپنے بازو پھیلا کر اسے تھام کر نیچے گرنے سے روکنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں دونوں کی پیشانیاں باہم ٹکرا گئی تھیں۔

"اُف!" مخروطی انگلیوں سے ماتھا تھامتے ہوئے نمو کے لبوں سے کراہ نکلی۔

"اوہ..... آئی ایم سوری۔" اسے بازوؤں میں تھامے، اس کے چہرے کی طرف تکتے ہوئے سرمد نے معذرت خواہانہ انداز میں سٹپٹا کر کہا تھا۔

"معذرت تو مجھے کرنی چاہئے۔" نمو نے حیران نظروں سے اس خوبرو اور نرم خو نوجوان کی طرف دیکھا۔ "میں ہی بہت تیزی سے اُتر رہی تھی۔" اور کسمسا کر خود کو ان کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کروالیا۔

"اوہ سوری....." سرمد کو احساس ہی نہ ہوا تھا کہ وہ اب تک اسے تھامے کھڑے تھے، اس کے کسمسا کر الگ ہونے پر وہ بری طرح شرمسار ہو کر اظفر کی طرف پلٹے تھے، جو گہری دلچسپ نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"یقیناً غلطی میری ہی تھی، جو میں آپ کو دیکھ نہ سکا۔" سرمد، اظفر کی طرف سے کوئی مدد نہ پا کر دوبارہ سے معذرت بھرے لہجے میں بولتے نمو کی طرف متوجہ ہوئے۔

گہرے سرمئی رنگ کے سلور کامدانی والے جارجٹ کے فٹنگ والے دیدہ زیب سوٹ میں اس کا صبیح دمکتا چہرہ بادلوں میں گھرے چودھویں کے چاند کی یاد دلا رہا تھا۔

''پھر تو آپ کی یہ حسین آنکھیں بے مصرف ہی ہوئیں جو انہیں نہ دیکھ سکیں۔'' اظفر نے آگے بڑھ کر قدرے شوخ لہجے میں ''انہیں'' پر زور دیتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا تھا۔ ان کی بات کا مفہوم سمجھ کر نمو اور سرمد دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر مجوب ہو کر رہ گئے تھے۔

''نمو!'' کچن سے فریحہ نے اسے پکارا تھا اور وہ حیا سے گلابی پڑتے چہرے اور منتشر دھڑکنوں کو سمیٹتی آنچل سنبھالتی سرمد اور اظفر کے درمیان سے گزرتی کچن کی طرف لپک گئی تھی۔ سرمد کی نظریں بھی بے اختیارانہ اس کے ساتھ ہی مڑی تھیں۔ وہ اسے چھوٹے پینچ میں گم ہوتے دیکھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ایسا مکمل بھرپور اور معصوم حُسن انہوں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ آج دیکھا تو حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کی اس کیفیت پہ خود اظفر بھی حیران ہوئے تھے۔

''فریال کی کلاس فیلو اور بچپن کی فرینڈ ہیں۔'' سرمد کی آنکھوں میں حیرت بھری ستائش کو محسوس کرتے ہوئے اظفر نے شریر لہجے میں اس کا تعارف کروایا تھا۔ ''نمرہ علی..... عرف نمو۔''

''تم سے کس نے پوچھا ہے؟'' سرمد بری طرح نروس ہوتے ہوئے کسمساتے ہوئے لہجے میں بولے اور ڈرائنگ روم کی طرف مڑ گئے۔

''جانتا ہوں کہ تم نہیں پوچھو گے، اسی لئے تو خود سے بتا رہا ہوں۔'' اظفر مسکراتے ہوئے ان کے پیچھے لپکے۔

''ڈفر! اس کے سامنے بھی تم جانے کیا بے تکا بول رہے تھے۔ وہ انجان لڑکی بھلا کیا سوچے گی؟'' سرمد کی پیار بھری خفگی والے لہجے میں ہلکا سا پچھتاوے کا احساس بھی ہلکورے لے رہا تھا۔

''تم کسی کی طرف دیکھو، وہ لڑکی اپنی خوش بختی پر ناز کرنے کے علاوہ اور کیا سوچ سکتی ہے؟'' اظفر کے لہجہ میں بڑی سچائی تھی۔

''اوہ اظفر.....!'' سرمد زِچ ہو کر بولے۔ ''تم بات کا بتنگڑ کیوں بنا رہے ہو؟''

''کیونکہ میں نے کوئی بہت الگ سی، بالکل مختلف سی بات تم میں محسوس کی ہے۔'' اظفر کے لہجے میں حیرت بھری مسرت چھلک رہی تھی۔

''یہ سب آپ کی خام خیالی ہے..... سمجھے؟'' سرمد نظریں چراتے ہوئے بولے۔

''واقعی؟'' اظفر نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

'اوہ، اب تمہیں میں کیا بتاؤں؟' سرمد ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ 'میں نے اپنے گھر میں اپنی ماں کے ہاتھوں اپنے ابا جان، اپنی اماں بی اور اپنے پیارے گھر کا جو حشر ہوتے دیکھا ہے، اس کے بعد میرے دل میں کسی کی آرزو ہے نہ گنجائش..... کیونکہ میں اپنی اور اپنے پیاروں کی زندگی کے لئے کوئی عذاب خریدنے کا ہرگز کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔'

''خاموشی نیم رضا۔'' سرمد کو خاموشی سے سوچتے دیکھ کر اظفر نے انہیں پھر چھیڑا۔

''آپ اپنی چونچ بند کریں گے پلیز؟'' سرمد نے پلٹ کر ملتجی لہجے میں کہا اور اندر داخل ہو گئے۔

''سرمد! یہاں آجاؤ۔'' انہیں کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ظفریاب نے پیار بھرے لہجے میں انہیں پکارا تھا۔ وجاہت مرزا اور سرمد کے علاوہ باقی تمام مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ اس وقت ڈرائنگ روم میں عالم تاب احمد، وجاہت مرزا اور پروفیسر آفاق سامنے کی جانب ساتھ ساتھ بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ جبکہ دروازے کے عین سامنے ظفریاب بیٹھے ہوئے تھے۔ اظفر اور سرمد بھی انہی کے پاس جا بیٹھے تھے۔

❀===❀===❀

نمو تقریباً دوڑتی ہوئی کچن میں داخل ہوئی تھی۔
''کیا ہوا نمو؟'' اس کے گلابی رخسار اور دھڑکتی کیفیت کو محسوس کر کے فریحہ نے چونک کر پوچھا تھا۔
''نن...... نہیں...... کچھ نہیں۔'' نمو واقعی بوکھلائی ہوئی تھی۔
آج زندگی میں پہلی بار اس نے ایسا وجیہہ و شکیل چہرہ دیکھا تھا۔ ایسی ملائم اور مسحور کُن آواز سنی تھی۔ اور وہ آنکھیں...... اس پر اظفر کے شوخ جملوں نے واقعی اسے بری طرح کنفیوز کر دیا تھا۔ اس کے رخسار تپنے لگے تھے اور دل ایک نئے انداز سے دھڑک رہا تھا۔
''چائے تو دم ہو چکی ہے۔'' چولہے پر چڑھی کیتلی کی شوں شوں نے فریحہ کو اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ ''بس تم ٹرالی پر چائے کے برتن رکھ دو۔''
''جی بہتر۔'' نمو سعادت مندی سے جواب دیتی سائیڈ بورڈ کی طرف بڑھ گئی تھی۔
''کتنے کپ لگاؤں؟'' نمو نے ٹی سیٹ نکالتے ہوئے سوال کیا۔
''صرف گھر کے ہی لوگ ہیں۔'' فریحہ نے ماربل کی سفید براق کیتلی میں قہوہ اُنڈیلتے ہوئے جواب دیا۔ ''پاپا، عالم تاب انکل، وجاہت انکل، یہ...... اظفر اور سرمد......''
''سرمد......؟'' یہ نام نمرہ کے لئے بالکل نیا تھا۔ ان دنوں اس گھر میں آنا تو تقریباً موقوف ہی ہو چکا تھا۔ اگر کہیں پہلے والا زمانہ ہوتا تو اب تک یہ نام یقیناً اس کے لئے اس قدر اجنبی اور انجان نہ ہوتا۔ کیونکہ پچھلے دنوں سرمد تواتر اور تسلسل سے اظفر سے ملنے آتے رہے تھے اور اب تو اس گھرانے کے ایک فرد کی سی حیثیت حاصل کر چکے تھے۔
''ارجمند آنٹی؟'' نمرہ نے پوچھا۔
''وہ غفور کے ساتھ مسجد میں چراغ جلانے گئی ہیں۔''
''جی اچھا۔'' نمرہ خاموش ہو کر ٹرالی میں کپ لگانے لگی تھی۔ شوگر پاٹ اور ملک پاٹ کے ساتھ ہی فریحہ نے قہوے کی کیتلی بھی ٹرالی پر رکھ دی تھی۔
''اب چندا! ذرا جلدی سے یہ ٹرالی ڈرائنگ روم میں پہنچا دو۔'' فریحہ دوبارہ سے چولہے پر دھری چائے کی کیتلی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''تب تک میں اپنے، تمہارے اور فری کے لئے چائے بناتی ہوں۔''
''مم...... میں...... ڈرائنگ روم میں......'' نمرہ نے استعجاب بھرے لہجے میں پوچھا۔
''سب گھر کے لوگ ہیں۔'' فریحہ اس کے تذبذب کو محسوس کئے بنا چائے کے تین مگ اسٹینڈ سے اُتارتے ہوئے بولی۔ ''چائے دے کر فٹافٹ واپس آ جاؤ۔ ہم اوپر چل کر فری کے ساتھ ہی چائے پئیں گے۔''
''جی بہتر۔'' نمو سلیقے سے دوپٹہ سر پر جماتے ہوئے ٹرالی دھکیلتی ڈرائنگ روم کی طرف چلی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کی نگاہ سرمد پر ہی پڑی تھی کیونکہ وہ سامنے ہی بیٹھے تھے اور اس وقت دروازے کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ اس کی نظریں بے ساختہ سرمد کی نظروں سے جا ٹکرائی تھیں اور نگاہوں کے اس تصادم پر اسے اپنے پورے وجود میں ایک ارتعاش سا جاگتا محسوس ہوا تھا۔
''اوہو...... ہماری نمرہ بٹیا چائے لائی ہے۔'' آہٹ پر پروفیسر آفاق اس کی طرف دیکھتے ہوئے خوش دلی سے گویا ہوئے تھے۔ ''ظاہر ہے غفور میاں تو موقع پاتے ہی کھسک گئے ہوں گے...... ہے نا......؟''
''جی وہ آنٹی کے ساتھ کہیں گئے ہیں......'' نمو نے دھیمی آواز میں جواب دیا اور چائے بنانے لگی۔
''وجاہت!...... یہ نمرہ ہے...... اسے تم میری تیسری بیٹی ہی سمجھو۔'' وجاہت مرزا کو نمو کی طرف پسندیدہ نظروں

سے دیکھتے دیکھ کر پروفیسر آفاق نے اس کا تعارف کروایا۔ ''بہت ذہین، بہت پڑھنے والی اور بہت پیاری بچی ہے۔''

''وہ تو نظر ہی آ رہا ہے۔'' وجاہت مرزا کے لہجے میں پیار سمٹ آیا تھا۔ جانے کیوں یہ اجنبی، انجان لڑکی انہیں بہت اپنی، بہت پیاری لگی تھی۔

بزرگوں کو چائے سرو کر کے وہ نوجوانوں کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

''تھینک یُو......!'' اظفر اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولے تھے۔ ''اب آپ زحمت نہ کریں۔ بقیہ کام میں خود کرلوں گا......اصل میں ہمارے گھر میں کوئی بہن نہیں ہے نا، تو اس طرح کے تمام کام کرنے کے ہم دونوں بھائی خوب عادی ہیں۔'' نمرہ کی طرف جھک کر سرگوشی میں کہے گئے اس جملے پر سب ہی کے لب متبسم ہو گئے تھے اور نمرہ آہستگی سے مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

فریحہ چائے کے مگ ٹرے میں رکھ کر اوپر جا چکی تھی۔ چنانچہ نمو بھی سیڑھیاں چڑھتی فریال کے کمرے میں آ گئی تھی۔ چائے کے بعد وجاہت مرزا اور سرمد جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ فریحہ اُنہیں خدا حافظ کہنے نیچے چلی گئی تھی۔

''سرمد بھائی! آنٹی سے ملے بغیر جا رہے ہیں؟'' فریال نے دریچے سے نیچے گیٹ کی جانب نگاہ کرتے ہوئے زیر لب کہا تھا۔

''سرمد.....؟'' نمرہ کے لبوں پر بے ساختہ سوال آ گیا تھا۔ ''یہ کون ہیں؟...... پہلے کبھی تو اُنہیں نہیں دیکھا۔'' اس نے اپنے لہجے کو بے حد سرسری بنائے رکھنے کی کوشش کی تھی۔

''وجاہت انکل کے بیٹے ہیں۔'' فریال نے بدستور گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''بابا کے بچپن کے دوست ہیں۔ سرمد بھائی تعلیم کے لئے انگلینڈ گئے تھے۔ وہیں اظفر کے ساتھ ان کی دوستی ہوئی۔ بہت ہی اچھے انسان ہیں۔''

''ہوں۔'' نمرہ نے چور نگاہوں سے دریچے کے اس پار گیٹ پر کھڑے سرمد کی طرف دیکھا۔ گیٹ کے پلرز پر لگے مرکری لیمپوں کی دودھیا روشنی میں ان کا دلفریب اور باوقار سراپا خاصا نمایاں نظر آ رہا تھا۔ وجاہت مرزا باری باری عالم تاب صاحب اور پروفیسر آفاق سے گلے ملے تھے اور ظفریاب، اظفر اور فریحہ کے سر پر شفقت بھرے انداز میں ہاتھ پھیر کر اپنی شاندار جدید ماڈل کی شیورلیٹ میں بیٹھ گئے تھے۔ ان کے ساتھ ہمیشہ ہی باوردی ڈرائیور ہوتا تھا۔ مگر جب کبھی سرمد ان کے ساتھ ہوتے تھے تو وہ خود ہی ڈرائیونگ کرتے تھے۔ سو وہ سب کو الوداع کہہ کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھے تھے۔

''نمو......!'' فریال نے اسے یک ٹک سرمد کی طرف دیکھتے دیکھ کر حیرت سے پکارا۔ ''نمو!.....کیا ہوا؟''

''کک......کیا ہوا؟'' نمو اس قدر محو تھی کہ فریال کے سوال پر چونک اُٹھی تھی۔

''یہ تم......سرمد بھائی کے بارے میں کیوں پوچھ رہی تھی؟''

''وہ......سیڑھیاں اُترتے وقت......میں ان سے ٹکرا گئی تھی۔'' نمو نے نگاہیں جھکا کر سارا واقعہ اس کے گوش گزار کر دیا اور فریال کئی لمحوں تک خالی خالی نظروں سے نمرہ کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔ نمرہ کے کھوئے کھوئے انداز میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے فریال کو چونکا دیا تھا۔

''نمو......! سرمد بھائی بہت اچھے ہیں۔ مگر ان کا تعلق ایک بہت ہی دولت مند گھرانے سے ہے۔ وجاہت انکل سے پاپا کی بے حد دوستی ہونے کے باوجود ان کے اور ہمارے گھرانے میں ہمیشہ ہی دُوری اور فاصلہ رہا۔ اسی لئے تم نے کبھی اس سے پہلے سرمد اور ان کے بھائی اسد کو اس گھر میں نہیں دیکھا۔ اگر اظفر سے ان کی بے حد دوستی نہ ہوتی تو شاید اب بھی وجاہت انکل اکیلے ہی آتے۔ اور انہیں اب بھی نہ دیکھ پاتیں۔''

''وہ.....اصل میں......'' فریال کی وضاحت پر نمرہ بری طرح نروس ہوگئی تھی۔ سرمد ایک بے حد دولت مند گھرانے کے بیٹے ہیں، اس خبر نے اس کے ننھے سے دل پر ایک چرکہ سا لگا دیا تھا اور کرب کی ایک بے نام سی کیفیت اس کے معصوم اور حسین چہرے پر بکھر گئی تھی۔ فریال لحہ بہ لحہ بدلتی اس کے چہرے کی کیفیت دیکھ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کی جھیلوں میں ایک بے چہرہ سا خواب ہچکولے لیتا صاف نظر آرہا تھا۔

'ایسے خواب دیکھنے سے کیا حاصل جن کی کوئی تعبیر نہ ہو۔' فریال نے دکھی دل سے سوچا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ وہ اپنی اس چہیتی دوست کے پہلے پہلے نئے نکور سپنے کو حقیقت کے تیشے سے توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ سو دوبارہ سے گیٹ کی طرف دیکھنے لگی۔

❀===❀===❀
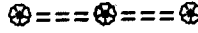
بظاہر تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ رشید بالکل ہی سدھر گیا ہے۔ اب وہ اپنے کاروبار پر بھی توجہ دے رہا تھا اور پوری ذمہ داری سے ماں کا بھی خیال رکھ رہا تھا۔ وہ صبح سویرے تیار ہو کر نچلی منزل میں واقع اپنے آفس میں جا بیٹھتا اور دوپہر میں ایک چکر سائٹ کا بھی ضرور لگاتا تھا۔ اس کے دو پروجیکٹ تو تقریباً مکمل ہو چکے تھے اور تیسرے کا اسٹرکچر تیار تھا۔ سہ پہر کو گھر آ کر وہ کچھ دیر آرام کرتا تھا اور پھر نہا دھو کر، سج دھج کے ساتھ خوشبوئیں لگا کر مہکار سے ملنے چل دیتا۔ گو کہ اس روز کے معمول سے اب وہ خاصا اوب گیا تھا۔ اب تو کبھی کبھی اس کا دل مہکار سے بھی اُچاٹ ہونے لگا تھا۔ وہ مہکار پر اپنے دونوں پراجیکٹس کا منافع لٹا چکا تھا اور نئے پروجیکٹ میں بھی اس کے نام ایک اپارٹمنٹ بک کر دیا تھا۔ تیزی سے کم ہوتے بینک بیلنس کو مدنظر رکھتے ہوئے اب اکثر وہ مہکار کے گھر جانے کا ناغہ بھی کرنے لگا تھا۔ ایسے میں مہکار، لاکھانی کو بھیج کر اسے زبردستی بلا لیتی تھی۔ وہ اس سونے کا انڈا دینے والی مرغی کے پیٹ سے آخری انڈا تک نکال لینا چاہتی تھی۔

جب سے سلطانہ آئی تھی، لاکھانی نے اوپر آنا چھوڑ دیا تھا۔ اسے اس خرانٹ بڑھیا سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اسی لئے اب وہ جب بھی آتا، نیچے آفس میں ہی بیٹھ کر چلا جاتا تھا۔

مہکار دونوں ہاتھوں سے رشید سے روپیہ سمیٹ رہی تھی۔ شروع میں لاکھانی کو بھی اس کا حصہ ملتا رہا تھا مگر گزرتے وقت کے ساتھ اسے یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ مہکار اس کے ساتھ بے ایمانی کر رہی ہے اور اس شبہ کا آغاز اس وقت سے ہوا تھا، جب رشید نے اپنے نئے پروجیکٹ میں مہکار کے نام پر ایک لگژری اپارٹمنٹ بک کیا تھا اور مہکار نے کوشش کی تھی کہ لاکھانی کو اس کی بھنک بھی نہ پڑنے پائے۔ مگر وہ بھی ایک گھاگ ہی تھا۔ اپنے تئیں آنکھیں اور کان کھلے رکھتا تھا۔ جلد ہی اُس تک اس اپارٹمنٹ کی بکنگ کی خبر پہنچ گئی تھی۔ وہ غصے سے بھرا مہکار کے پاس پہنچا تھا۔

''رسید نے تیرے لئے اپارٹمنٹ بک کیا ہے؟'' اس نے کڑوے لہجے میں پوچھا۔

''تجھے کس نے خبر دی؟'' مہکار نے چونکتے ہوئے سوال کیا۔

''اس بات کو تُو چھوڑ......یہ بتا، یہ کھبر (خبر) صحیح ہے کہ نہیں؟''

مہکار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ تمام تر احتیاط کے باوجود لاکھانی کو پتہ چل چکا ہے، اس لئے اب مزید چھپانا فضول ہے۔

''اگر صحیح بھی ہے، تو......؟'' مہکار نے چہرہ اوپر کر کے جارحانہ لہجے میں سوال کیا۔

''تو......تو......'' لاکھانی کو مہکار سے اس سینہ زوری کی توقع نہ تھی۔ لحظہ بھر کو تو وہ ٹپٹا ہی گیا، پھر سنبھل کر غصیلے لہجے میں بولا۔ ''تو......میرا حصہ کدر ہے؟''

''لے، جھلّے کی گل سن۔'' مہکار بے ساختہ ہنس پڑی۔ ''وے کملیا! ابھی تو صرف بکنگ ہوئی ہے۔ ابھی پلاٹ پر

سرف اسٹرکچر کھڑا ہوا ہے..... قبضہ ملے گا تو..... تجھے بھی حصہ ملے گا..... میں نے کب منع کیا ہے؟'' اس نے رک کر لاکھانی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اپنی بات کا خاطر خواہ اثر ہوتے دیکھ کر وہ لہجہ بدل کر قدرے نخرے سے بولی۔ ''نا تُو اب مجھے یہ بتا..... کہ تُو نے مجھ پہ شک کیا تو کیسے؟..... میں نے کبھی تیرا حق مارا ہے۔''

اگر اس نے اس کا حق مارا بھی تھا تو کم از کم یہ بات اس کے علم میں نہ آسکی تھی۔ اس لئے وہ نفی میں سر ہلانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے نروٹھے لہجے میں بولا تھا۔

''تیری نیت سالم تھی تو پھر مجھ سے یہ بات چھپانے کی جرورت کیا تھی؟..... مجھے بتاتی..... تو..... کہ.....''

''لے، تجھے کیا بتاتی؟'' مہکار نے درمیان میں ہی اس کی بات اُچک لی۔ ''نہ سُوت نہ کپاس، جولاہوں میں لٹھم لٹھا..... کوئی چیز ہاتھ میں ہوتی تو تجھے بتاتی نا۔'' ایک بار پھر رک کر اس نے لاکھانی کے چہرے کا جائزہ لیا اور اسے قائل ہوتے دیکھ کر قدرے خفا لہجے میں بولی۔ ''اور ہاں! اب تُو کان کھول کر میری بھی ایک گل سن لے..... اگر فیر کبھی اس طرح کی بے اعتباری دکھائی نا..... تو تیرا میرا ایک ساتھ دھندا کرنا مشکل ہو جائے گا..... ہاں نئیں تو.....'' وہ سانس لینے کو رُکی۔

''ایس رحمان نے کوئی نیا مرغا پھنسایا ہے۔ اگر تُو اسی طرح شبہ کرتا رہا نا تو میں تیرے اس کنجوس فائنانسر کو چھوڑ کر ایس رحمان کی پارٹی میں شامل ہو جاؤں گی۔''

''کنجوس؟..... تُو رسید کو کنجوس بولتی ہے؟'' لاکھانی کو اپنے فائنانسر کی توہین برداشت نہیں ہوئی۔ ''اب تک تُو اس سے کتنا کما چکی ہے، تیرے کو کچھ کھبر بھی ہے؟..... حساب بتاؤں تیرے کو؟''

''اوئے ہوئے..... آج تو تُو بڑا اُس کی فیور میں بول رہا ہے۔'' مہکار اس کے تنکنے پر مسکرا کر بولی۔ ''آخر چکر کیا ہے؟''

''تُو ایس رحمان کے نئے فائنانسر کی دھمکی دے سکتی ہے تو میں بھی اپنی پارٹی کو کہیں اور لے جا سکتا ہوں۔'' لاکھانی کو واقعی غصہ آ گیا تھا۔

''ہائے!..... جھلّے تو نہیں ہو گئے تم دونوں؟'' مہکار کی بڑی بہن گلبہار کمرے میں داخل ہوئی۔ ''کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو؟..... کتے بلی کی طرح لڑ رہے ہو..... مل کر ہو گے تو بانٹ کر کھا سکو گے..... ورنہ تو دونوں کے ہاتھ میں کچھ نہیں آئے گا۔''

''وہی تو میں کہہ رہا ہوں۔'' لاکھانی نے نروٹھے لہجے میں کہا۔ ''مگر یہ ایس رحمان کے نئے مرغے کی دھمکی دے رہی ہے۔''

''ہیں.....؟'' گلبہار نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ ''نی رحمان کے پاس کون سا نیا مرغا آیا ہے، جس کی مجھے خبر نہیں؟''

''ایسے ہی اُڑتی اُڑتی خبر سنی تھی۔'' مہکار کسمسا کر بولی۔ ''میں نے تو سوچا تھا یہ آئے گا تو اسے وہاں بھیجوں گی۔ مگر یہ تو آتے ہی لڑنے.....''

''لڑائی کی بات میں نے کی تھی..... یا تُو نے کی تھی؟'' لاکھانی جلدی سے بولا۔

''دبس..... گلبہار نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''اب ختم کرو یہ لڑائی بھڑائی۔'' اور آؤ تم دونوں میرے پاس۔ ساتھ بیٹھ کر آگے کی پلاننگ کرو۔'' مہکار منہ پھلائے پھلائے قریب آ بیٹھی تھی۔ لاکھانی بھی اکڑا اکڑا سا بیٹھا تھا۔

''تو بتا لاکھانی!'' گلبہار نے لاکھانی کے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے پوچھا۔ ''تیرے پاس کوئی اور پارٹی ہے؟''

''ہاں......ایک ہے تو......لیکن یہ رسید......'' لاکھانی نے قدرے ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''ارے رشید کی ایسی کی تیسی۔'' گلبہار بھڑک کر بولی۔ ''مہک نے اس کے ساتھ کوئی نکاح تو نہیں نا پڑھوالیا جو تُو ایسے ڈر رہا ہے۔ اور ویسے بھی جلد ہی اس کے غبارے سے ہوا نکلنے والی ہے۔'' گلبہار کی بات پر لاکھانی دل ہی دل میں اُچھل پڑا تھا۔

''آ اِدھر قریب آ۔'' گلبہار نے بالکل اپنے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کر کے لاکھانی کو قریب آنے کا حکم دیا۔ لاکھانی قریب کھسک آیا تھا۔ گلبہار کے لباس سے اُٹھتی تیز خوشبو اس کے تھکے ہوئے اعصاب کو سکون بخشتی محسوس ہو رہی تھی۔

''اب کان کھول کر سن...... میں جو کہہ رہی ہوں، اسی میں ہم سب کا فائدہ ہے۔ رشید جیسے بندے تو روز آتے جاتے رہتے ہیں، ہم سب کو تو اِدھر ہی رہنا ہے......ساتھ ساتھ۔'' وہ لاکھانی اور مہکار کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنائیت بھرے انداز میں ہنسی۔ مہکار اور لاکھانی دونوں کے چہروں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ پھر وہ تینوں دیر تک اسی طرح سر جوڑے آنے والے وقت کی حکمتِ عملی کے بارے میں غور کرتے رہے تھے۔

مہکار گھر سے نکلتے وقت یونس لاکھانی خاصا مطمئن اور خوش دکھائی دے رہا تھا، مگر دلی طور پر اس کی تشفی نہیں ہوئی تھی اور اس کے اندر کہیں خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب مہکار کے ساتھ یہ کاروباری شرارت زیادہ دن نہیں چل سکتی۔ اب اسے یہ سوچنا تھا کہ ان حالات میں اسے اب کیا کرنا چاہئے۔ اسی سوچ میں ڈوبا وہ رشید کے گھر کی طرف چل دیا تھا۔ سلطانہ نے اسے اپنے کمرے کی کھڑکی سے گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ جب سے لاہور آئی تھی، ہر چیز کا بہ نظر غائر جائزہ لے رہی تھی۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک نظر آ رہا تھا۔ رشید کا شادی بیاہ کا کوئی ارادہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا، اور نہ ہی کسی سے کوئی چکر چلتا محسوس ہو رہا تھا۔ رشید کاروبار پر بھی پوری توجہ دے رہا تھا۔ باقاعدگی سے آفس میں جا کر بیٹھتا تھا اور پروجیکٹ کی سائٹ کا بھی ہر روز خود معائنہ کرنے جاتا تھا۔ ماں کا بھی بے حد خیال رکھنے لگا تھا۔ بظاہر شک کرنے یا فکرمند ہونے والی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی، اس کے باوجود سلطانہ بے حد متفکر تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ اور اس دال میں کالے کا احساس ہوتے ہی اس کے دل و دماغ میں عجیب سی کھچڑی پکنی شروع ہو گئی تھی۔

سب کچھ ایک صیغۂ راز تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس راز سے کیونکر پردہ اُٹھائے، کس سے پوچھے، کس سے معلومات حاصل کرے؟ جہاں تک رشید کا تعلق تھا، وہ اسے اچھی طرح کھنگال چکی تھی مگر اس کے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا تھا۔ چنانچہ اب اس نے رشید سے متعلق دوسرے لوگوں کو ٹٹولنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے گھر کے اوپر کے کام کرنے والے لڑکے چھوٹو سے پوچھا تھا۔

''کیوں رے چھوٹو! جب میں یہاں نہیں تھی تو یہاں کوئی آتا تھا کیا؟''

''ہاں نا......'' چھوٹو نے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔

''کون؟......کون؟......مجھے بتا کون آتی تھی؟......میرا مطلب ہے کون آتا تھا؟'' سلطانہ خاصی ایکسائیٹڈ ہو گئی تھی۔

''یہ ہے نا اپنا...... یونس لاکھانی...... یہی بہت آتا تھا۔'' چھوٹو نے انکشاف کیا۔

''ارے اس کا تو مجھے پہلے سے پتہ ہے۔'' سلطانہ بے مزہ ہوئی۔ ''کسی اور کا بتا......کوئی اور آتا تھا؟......شام کو، رات کو؟ ......بول......سوچ...... یاد کر بیٹا!''

چھوٹو ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر سوچنے میں مصروف ہوگیا تھا۔ سلطانہ اب خاصی پُراُمید نظر آ رہی تھی۔

''شام میں یا رات میں کوئی آتا ہوگا تو مجھے کس طرح پتہ چل سکتا ہے؟...... میں تو چار بجے ہی گھر چلا جاتا ہوں۔''

چھوٹو نے سلطانہ کی امیدوں پر پوری طرح پانی پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہاں، البتہ چوکیدار آپ کو کچھ بتا سکتا ہے۔''

سلطانہ کو مایوس ہوتے دیکھ کر چھوٹو نے مشورہ دیا۔ وہ دن رات گیٹ پر ہی ہوتا ہے نا، اس لئے۔''

''ارے ہاں! یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا؟'' سلطانہ چونک کر سیدھے ہوتے ہوئے بولی۔ ''جا ذرا دوڑ کر زمرد خان کو بلا لا۔''

''ابھی لیجئے۔'' چھوٹو چٹکی بجا کر بولا اور اُچھلتا کودتا سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ اور کچھ ہی دیر بعد زمرد خان اپنی بڑی بڑی نوکیلی مونچھوں کو بل دیتا آ موجود ہوا تھا۔

''اماں جی!...... ام کو بلایا؟''

''ہاں زمرد خان! تم سے ایک کام ہے۔'' سلطانہ سنجیدگی سے بولی۔

''حکم کرو۔'' چوکیدار کاندھے پر پڑا انگوچھا ہوا میں جھٹک کر دوبارہ سے کاندھے پر ڈالتے ہوئے بولا۔

''ارے تُو کھڑا کیوں ہے؟...... یہاں آ کر بیٹھ کے آرام سے بات کر۔'' سلطانہ نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

''میں تو تجھے، چھوٹو کو، ریاض کو سب کو اپنے رشید کی طرح ہی سمجھتی ہوں۔''

''اس میربانی کے لئے آپ کا میربانی......'' چوکیدار نے مشکور لہجے میں کہا۔ ''اب جلدی کام بولو۔ اُدھر گیٹ خالی پڑا ہے..... ام کو اُدھر جا کر بیٹھنا اے۔''

''ارے ہاں......'' سلطانہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''دراصل مجھے تجھ سے ایک بات پوچھنی تھی۔''

''حکم کرو۔''

''میں یہ پوچھ رہی تھی کہ...... میں جب یہاں نہیں تھی تو کوئی..... لڑکی وڑکی تو...... نہیں آتی تھی یہاں؟...... میرا مطلب ہے، کوئی عورت وغیرہ؟'' سلطانہ نے اپنے لہجے کو بے حد سرسری بناتے ہوئے براہِ راست مطلب کی بات دریافت کر لی تھی۔ کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ پٹھان چوکیدار سے اشاروں کنایوں میں بات کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

''لڑکی...... لڑکی لوگ...... عورت لوگ......'' زمرد خان سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ وہ سیدھے ہاتھ کی مٹھی ماتھے پر دھیرے دھیرے مارتے ہوئے مسلسل سوچتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔

''عورت لوگ...... کون کون آتا تھا؟'' سلطانہ پُراُمید نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ہاں یاد آیا......'' زمرد خان نے شہادت کی انگلی اونچی کر کے زور سے کہا۔

''کون...... کون...... جلدی بتا۔'' سلطانہ نے بے تاب اور پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔ ''کون اوپر آتی تھی؟''

''اِدھر اوپر تو نہیں...... مگر نیچے فلیٹ کی بکنگ کے واسطے کام خراب ہوا تو جھگڑے کے واسطے..... کبھی پے منٹ کے واسطے...... بہت عورت لوگ آتا تھا۔''

''ارے میں یہ نہیں پوچھ رہی۔''

''تو پھر آپ کیا پوچھ رہی ہیں؟''

''میں پوچھ رہی تھی کہ یہاں...... اوپر...... میرا مطلب ہے......''

''ام بولا نا، اوپر کوئی نہیں آتا تھا...... لڑکی لوگ، عورت لوگ سب کا سب نیچے آتا ہے۔ آفس میں...... ریاض کے پاس۔''

''چل جا......اپنا گیٹ سنبھال۔'' سلطانہ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ اس کے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا تھا۔ وہ بیزار سی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی رشید اپنی حرکتوں سے باز آ گیا ہے؟ مگر اس کا دل یہ بات ماننے کو تیار نہ تھا۔ وہ ماں تھی، اس نے رشید کو جنم دیا تھا۔ وہ اس کی نس نس سے واقف تھی۔ جانتی تھی چور چوری سے جائے پر ہیرا پھیری سے نہ جائے...... مگر اس کے ہاتھ کوئی سرا نہیں لگ رہا تھا...... وہ بیزار نظروں سے گلی میں آتی جاتی گاڑیوں کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ تب ہی اس کی نگاہ لاکھانی پر پڑی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ سلطانہ کے ذہن میں ایک دم سے بجلی سی کوندی۔

''ارے رے چھوٹو!......ذرا سن تو۔'' اس نے چھوٹو کو پکارا۔

''کیا ہے اماں جی؟'' چھوٹو چراغ کے جن کی طرح اگلے ہی لمحے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ سلطانہ کی اس جاسوسی مہم کا حصہ بن کر وہ بے حد لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''ذرا نیچے جا کر اُس لاکھانی کو تو بلا لا۔''

''اب آپ......اُس سے انویسٹی گیشن کرو گی؟'' چھوٹو پُر اشتیاق لہجے میں بولا۔

''ہیں......؟'' سلطانہ نے آنکھیں پھیلائیں۔ ''یہ انویسٹی گیشن کیا ہوتا ہے رے؟''

''وہی جو تم صبح سے کر رہی ہو۔'' بارہ سالہ لڑکا شریر انداز میں بولا اور اُچھلتا ہوا نیچے لاکھانی کو بلانے چلا گیا۔

''آپ کو اوپر اماں جی نے بلایا ہے۔'' چھوٹو کی زبانی یہ پیغام سنتے ہی لاکھانی گھبرا گیا تھا۔

''کیوں......کیوں بلایا ہے؟''

''مجھے کیا پتہ؟'' چھوٹو نے لاعلمی کے طور پر کندھے اچکائے۔ ''آپ اوپر جا کر خود ہی معلوم کر لو۔''

''مگر......میں......اوپر کیوں جاؤں......؟'' لاکھانی کے لہجے میں دبا دبا احتجاج تھا۔

''وہ تو آپ کو جانا ہی پڑے گا۔ کیونکہ آپ کو صاب کی اماں جی نے بلایا ہے۔ اور آپ نہیں جانتے کہ وہ......''

''جانتا ہوں......وہ بہت کھترناک (خطرناک) ہے۔ تب ہی تو اوپر جانے سے ڈر رہا ہوں.....کھیر (خیر) چلتا ہوں۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مرے مرے قدموں سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ ''آج کا دن ہی منحوس ہے......کھدا (خدا) معلوم میں نے آج صبح کس کی سکل دیکھی تھی۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''آپ نے یقیناً آئینہ دیکھا ہوگا۔'' نٹھ کھٹ چھوٹو شوخ لہجے میں بولا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر چلا گیا۔

''سلام ماں جی!'' کمرے میں داخل ہو کر اس نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ ''آپ نے بلایا؟''

''ہاں بیٹا لاکھانی! مجھے تجھ سے ایک کام ہے۔'' سلطانہ میٹھے لہجے میں بولی۔ ''آ، یہاں اندر آ کر بیٹھ......چھوٹو! جا تو لاکھانی کے لئے چائے بنا کر لا۔''

لاکھانی حیران نظروں سے سلطانہ کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

'یا خدا! کیا چکر ہے؟'

✿===✿===✿

اوائل تاریخوں کا ننھا سا مہین ہلال جانے کب منظر سے غائب ہو چکا تھا۔ اب صرف چند تارے نیلے آسمان پہ پلکیں جھپکتے نظر آ رہے تھے۔ رات آہستگی سے سفر کرتی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ ندرت جہاں کا 240 گز کا چھوٹا سا ایک منزلہ مکان اس وقت تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ لوہے کے سرمئی رنگ کے کشادہ گیٹ کے سامنے کی جانب واقع چھوٹے سے ورانڈے کی چھت کے بیچوں بیچ لگے کم پاور کے بلب کی زردی مائل ملگجی روشنی ماحول کی تاریکی چھانٹنے میں بری طرح ناکام محسوس ہو رہی تھی۔

ورانڈے میں دو دروازے نظر آ رہے تھے۔ ایک ڈرائنگ روم کا اور دوسرا سامنے واقع لاؤنج میں کھلتا تھا۔ لاؤنج کے سامنے والے حصے میں دونوں بیڈ رومز کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ ایک بیڈ روم میں ثروت اور فروا سوتی تھیں، جبکہ دوسرا بیڈ روم ندرت اور اس کے میاں اسلم کا تھا۔ اس وقت اس بیڈ روم میں زیرو پاور کی سبز لائٹ بلب کی تسکین آمیز روشنی بکھری ہوئی تھی۔ چھت کے بیچوں بیچ لٹکتا پرانا پنکھا گھر گھر کی آواز کے ساتھ تیز رفتاری سے چل رہا تھا۔ کمرے کے وسط میں دھرے ڈبل بیڈ پر ایک جانب ندرت جہاں گہری نیند سو رہی تھی جبکہ دوسری جانب اس کا شوہر اسلم احمد لیٹا تھا۔ اس کی نیند سے خالی آنکھوں سے عجیب سا کرب اور اضطراب جھانک رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر ہی قبل بالکل اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ پہلو میں ایک شدید درد کی ٹیس سی اُٹھی تھی۔ اس نے پہلو کے بل لیٹ کر درد کو دبانے کی کوشش کی تھی، پر اپنی کوشش میں بری طرح ناکام رہا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ درد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

''ندرت.....!'' اس نے بیوی کو پکارنے کی کوشش کی تو آواز حلق میں پھنستی ہوئی محسوس ہوئی۔ چنانچہ بصد مشکل ندرت کی جانب ذرا سا کھسک کر اس نے ندرت کے بازو کو ہلایا۔

''ہوں ہوں.....'' ندرت نے نیند میں ڈوبے، بازو جھٹک کر بیزار انداز میں ہنکارہ بھرا تھا۔

''ندرت اُٹھو!'' اسلم احمد نے اب کی بار نہ صرف اس کے بازو کو ہلایا تھا بلکہ لرزتی آواز میں اسے آواز بھی دی تھی۔

''کیا ہے؟'' ندرت نے کسمساتے ہوئے غصیلے اور بیزار لہجے میں سوال کیا۔

''مم.....میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' اسلم نے پہلو کے درد کو ہاتھوں سے دباتے ہوئے دھیمی آواز میں التجا کی۔ ''پلیز.....ذرا دیکھو.....کہ.......''

''اوں ہوں.....ابھی سو جاؤ۔'' ندرت نے کروٹ بدلی۔ ''صبح دیکھوں گی۔''

''ارے میری جان نکل رہی ہے۔'' اسلم کی آواز میں دبا دبا احتجاج اور بڑی نمایاں بے بسی شامل تھی۔ میرے سینے میں سخت درد ہو رہا ہے۔''

''اُف.....'' ندرت نے انتہائی بیزاری سے آنکھیں کھولیں۔ ''ایک تو یہ تمہاری روز روز کی بیماریوں نے میری ناک میں دم کر رکھا ہے۔ جب دیکھو کہیں نہ کہیں درد ہی ہو رہا ہوتا ہے۔'' اس نے ذرا سی گردن موڑ کر اسلم کی طرف دیکھا۔ وہ

پہلو دبائے انتہائی تکلیف کے عالم میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا اور آنکھوں سے عجب سی وحشت ٹپک رہی تھی۔

''کیا ہوا......؟'' وہ بے ساختہ پوچھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟''

''درد......درد ہو رہا ہے...... یہاں سینے میں۔'' اسلم نے پہلو مسلتے ہوئے کہا۔

''رات کے اس پہر بھلا کون ڈاکٹر ملے گا؟'' ندرت نے سامنے دیوار پر آویزاں گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے فکرمند لہجے میں کہا۔

''کچھ کرو......پلیز......مم......میں......'' تکلیف کے بعد اسلم اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکا۔

''اچھا ٹھہرو......میں لڑکیوں کو جگاتی ہوں۔'' وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

''ثروت!......فروا......!'' اس نے دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارتے ہوئے لڑکیوں کو آواز دی۔

''کیا ہوا امی؟'' کچھ دیر بعد اندر سے فروا کی نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی تھی۔

''تمہارے پاپا کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ ذرا ڈائری سے ڈاکٹر کا نمبر لے کر اسے فون کرو۔'' ندرت نے تیزی سے کہا۔

''بھلا اس وقت کون سا ڈاکٹر ملے گا؟'' فروا نے وال کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا اور اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

''کیا ہوا پاپا کو؟'' دروازہ کھول کر دروازے پر کھڑی ندرت کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''پتہ نہیں کیا ہوا ہے۔'' ندرت نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''سینے میں درد رہتا ہے۔ تم ثروت کو بھی جگا دو۔ اور اس سے کہو کہ ذرا اسد کو فون کر کے بلا لے۔'' ندرت، فروا کو ہدایت دیتی دوبارہ سے اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی تھی اسلم اسی طرح پہلو دبائے گٹھڑی سا بنا بستر پر پڑا تھا۔ اس کی تکلیف میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔

''ثروت!......ثروت! اُٹھو۔'' فروا نے ثروت کو جھنجوڑتے ہوئے پکارا تھا۔

''کیا ہے؟'' ثروت نے انتہائی بیزاری سے فروا کے ہاتھ دھکیلتے ہوئے نیند سے مخمور آواز میں کہا۔ ''کون سی قیامت آ گئی ہے جو تم مجھے اس طرح جنگلیوں کی طرح جگا رہی ہو؟''

''ارے بابا کی سخت طبیعت خراب ہے۔'' فروا نے اطلاع دی۔

''کون سی نئی بات ہے۔'' ثروت نے کروٹ بدلی۔ ''ان کی طبیعت تو اکثر ہی خراب رہتی ہے۔''

''امی نے کہا ہے کہ تم ذرا اسد کو فون کر کے بلا لو۔ شاید پاپا کو ہسپتال لے جانا پڑے۔''

''اسد کا موبائل آؤٹ آف آرڈر ہے۔ ان سے بات نہیں ہو سکتی۔'' ثروت کے جواب پر فروا نے مشورہ دیا۔

''تو ان کے گھر کے نمبر پر بات کر لو۔ پاپا کی طبیعت سخت خراب ہے۔''

''بھئی میں نہیں اُٹھ رہی اس وقت۔'' ثروت نے فیصلہ سنایا۔ ''فون کے پاس ڈائری پڑی ہے، تم خود ہی کر لو۔''

''توبہ ہے ثروت!'' فروا ماتھے پر ہاتھ مارتی کمرے سے باہر نکل آئی۔ سامنے ہی لاؤنج میں لوہے کے اسٹینڈ پر ٹیلی فون سیٹ رکھا تھا۔ اسٹینڈ کے نچلے حصے میں ایک ڈائریکٹری اور ایک لمبوتری ڈائری رکھی تھی۔ فروا نے ڈائری کھول کر پہلے محلے میں رہائش پذیر ڈاکٹر کو مبین کو فون کیا تھا۔ باپ کی کیفیت بتا کر اس نے جلد آنے کی استدعا کی تھی۔

''تم فکر مت کرو...... میں ابھی آ رہا ہوں۔'' ادھیڑ عمر مہذب، شائستہ اور نرم گو ڈاکٹر نے مشفقانہ لہجے میں جواب دیا۔ محلے میں رہنے کے باعث اس کی اسلم سے اچھی خاصی دوستی تھی۔ اکثر سرِ راہ وہ کافی دیر رک کر آپس میں باتیں کیا

کرتے تھے۔اور کبھی کبھار ایک دوسرے کے گھر بھی آنا جانا تھا۔
''شکریہ ڈاکٹر انکل!'' فون رکھ کر وہ اسلم اور ندرت کے مشترکہ بیڈروم کی طرف بڑھ گئی۔ ندرت، میاں کے کندھے پر ہاتھ دھرے اس کے قریب بیٹھی تھی۔ فروا کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر جلدی سے بولی۔
''کیا ہوا؟......ڈاکٹر سے بات ہوئی؟''
''جی۔ مبین انکل کو میں نے فون کیا ہے۔ بس وہ آنے ہی والے ہیں۔''
''ثروت نے اسد کو فون کیا؟'' ندرت نے دوسرا سوال کیا۔
''اسد کا موبائل خراب ہے۔'' فروا نے مختصر جواب دیا۔''اور ویسے بھی اتنی رات گئے انہیں پریشان کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟''
''مجھے تمہارے پاپا کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' ندرت کی آواز میں ایک بے نام سی تشویش چھلک رہی تھی۔
''اگر ہسپتال لے جانا پڑا تو......''
''اگر ضرورت پڑی تو میں ان کے گھر فون کرلوں گی۔'' فروا نے جواب دیا اور باپ کی طرف متوجہ ہوگئی۔
کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر آ گیا اور آتے ہی اس نے اعلان کیا کہ شدید قسم کا دل کا دورہ پڑا ہے، فوری طور پر کارڈیو پہنچانا بے حد ضروری ہے۔''
''جاؤ اسد کو فون کرو۔'' ندرت نے فروا کی طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ایسے لمحوں میں اسے قدرت کی بے انصافی پر بہت دکھ ہوتا تھا۔ آج ایک بیٹا ہوتا تو بھلا کسی اور کو بلانے کی ضرورت ہی کیوں ہوتی؟ 'سطوت کو تُو نے دو دو بیٹے دیئے تھے اور مجھے ایک بھی نہیں......واہ اللہ میاں!' ہمیشہ ہی لبوں پر رہنے والا شکوہ آج برسوں بعد دوبارہ ہونٹوں پر آ گیا تھا۔
''تو امی! اسد بھائی بھی تو کوئی غیر نہیں ہیں۔'' فروا نے ماں کی مایوسی دور کرنے کی کوشش کی۔''کل کو ان کی ثروت سے شادی ہو جائے گی تو وہ......''
''اچھا چھوڑو سب باتیں۔'' ندرت بیزاری سے بولی۔''فون کرو جا کر۔''
''اچھا'' فروا تیزی سے لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔ ڈائری کھول کر اس نے اسد کے گھر کا نمبر نکالا تھا، پھر فون ملانے لگی تھی۔ رابطہ مل گیا تھا۔ فون کی سریلی گھنٹی وقفے وقفے سے گونج رہی تھی۔ وہ ریسیور کانوں سے لگائے دوسری طرف فون اٹھائے جانے کا انتظار کرنے لگی۔
'خدا جانے ان کا ٹیلی فون کس جگہ رکھا ہوگا......کسی کے بیڈروم میں یا ہماری طرح لاؤنج میں۔'
وقت گزاری کی خاطر فروا نے سوچا اور نگاہ اٹھا کر سامنے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھنے لگی۔ رات کے سوا تین بج رہے تھے۔
'اس وقت تو اس کے گھر میں سب ہی گہری نیند سو رہے ہوں گے۔'' فروا نے لائن ڈس کنکٹ کر کے دوبارہ سے نمبر ملایا۔ ایک بار پھر دوسری جانب کہیں گھنٹی گنگنانے لگی۔ اسد کے گھر کا دھندلا سا نقشہ فروا کے ذہن میں اب بھی محفوظ تھا۔ اس محل نما کوٹھی میں سطوت کی موت کے بعد ان کے لئے دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ اس بات کا ندرت کے علاوہ اس کی دونوں بیٹیوں ثروت اور فروا کو بھی ملال اور قلق تھا۔ مگر اب جب سے ثروت اور اسد کے مابین ایک نئے رشتے کی بنیاد پڑی تھی، دوبارہ سے وجاہت منزل کے دروازے وا ہونے کی امید بندھ چلی تھی۔
گھنٹی مسلسل بج رہی تھی مگر کسی نے بھی فون نہیں اٹھایا تھا۔ کتنے ہی لمحے بیت چکے تھے۔ وہ مایوس ہو کر فون بند کرنے

ہی والی تھی کہ دوسری جانب سے کسی نے فون اٹھالیا تھا۔
''ہیلو......'' کسی کی نیند میں ڈوبی خمار آلود اور مسحور کُن سی آواز فروا کی سماعت سے ٹکرائی۔ اسد کی آواز کو وہ پہچانتی تھی۔ یہ اسد کی آواز تو نہیں تھی۔
''آ.....آپ کون؟'' اس کے گڑبڑائے ہوئے لہجے میں تجسّس کے ساتھ شوق بھی شامل تھا۔
''سرمد۔'' دوسری جانب سے جواب ملا۔ ''سرمد مرزا۔''
''سرمد......'' فروا نے حیرت اور بے خود سے لہجے میں سرمد کا نام دہرایا اور اسے اپنے دل کی دھڑکنوں میں ایک عجیب سی، بالکل انوکھی اور نئی سی کیفیت جاگتی محسوس ہوئی تھی۔

❀===❀===❀
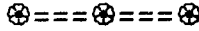
آکاش کی نیلی جھیل میں چودھویں کا چاند کنول کی طرح ہچکولے لے رہا تھا۔ ہر سمت پگھلے ہوئے سونے کی طرح چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ ہواؤں کے نرم اور لطیف جھونکوں میں ایک تسکین آمیز خنکی رچی ہوئی تھی۔ نیچے گیٹ سے قدرے دائیں جانب نیم کا گھنا پیڑ چھت کے ایک پورے گوشے کو اپنے احاطے میں لئے کھڑا تھا۔ پیڑ کی گھنی شاخوں میں چڑیاں آنکھیں موندے ساکت بیٹھی تھیں۔ تقریباً چار فٹ اونچی باؤنڈری وال پر ایک فٹ اونچی لوہے کی گرِل لگی تھی اور دیوار کے ساتھ ساتھ سیمنٹڈ گملوں میں لگے گلاب کے پودوں میں رنگ رنگ کے گلاب کھلے ہوئے تھے اور چھت کی پوری فضا ان کی مسحور کُن خوشبو میں ڈوبی ہوئی تھی۔ نکاح کے عنابی زردوزی کے نفیس کام والے سوٹ اور یاقوت سے جڑے گولڈ سیٹ میں فریال غضب کی حسین لگ رہی تھی۔ اُس کی گداز کلائیوں میں عنابی اور سنہری کانچ کی چوڑیاں کھنک رہی تھیں اور گلابی ہتھیلیاں مہندی کے گُل بُوٹوں سے مہک رہی تھیں۔ کل صبح کی فلائٹ سے ارجمند بانو اپنے میاں عالم تاب احمد، تینوں بیٹوں ظفریاب، اظفر اور اپنی نئی نویلی بہو فریحہ کے ساتھ روانہ ہونے والی تھیں۔ اسی لئے مہمانوں کے جمگھٹے کے چھٹنے کے بعد انہوں نے بھائی سے اظفر اور فریال کی کچھ دیر کے لئے تنہائی میں ملاقات کی اجازت لے لی تھی۔ فریال اب ظفر کی منکوحہ تھی، اسی لئے پروفیسر آفاق نے بھی بغیر کسی پس وپیش کے اجازت دے دی تھی۔ اور اس اجازت کے طفیل اس وقت اظفر، فریال کے ساتھ چھت کے اس خاموش اور تنہا گوشے میں موجود تھے اور کتنی ہی دیر سے یک ٹک فریال کا چہرہ تکے جارہے تھے۔
''اظفر!'' فریال کسمسا کر جز بز ہوتے ہوئے بولی تھی۔ ''بھلا ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟''
''آسمان پہ دمکتا وہ چودھویں کا چاند دیکھ رہی ہو؟'' اظفر نے چاند کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے فریال سے پوچھا۔
''ہوں.....تو؟'' فریال حیران ہوئی۔
''میں اس چاند سے تمہارے چہرے اور ان تاروں سے تمہاری آنکھوں کا موازنہ کر رہا تھا۔'' اظفر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
''تو نتیجہ کیا نکلا؟'' فریال مسکرائی۔
''ظاہر ہے۔ وہ چاند اور دو تارے اس چہرے اور ان آنکھوں سے بھلا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں؟'' اظفر نے دوبارہ سے اپنی نظریں فریال کے چہرے پر جمادی تھیں۔ ''میں تمہارا حسین چہرہ آنکھوں میں چھپا کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔''
''صرف آنکھوں میں؟'' فریال نے شریر لہجے میں سوال کیا۔

''دل میں تو تم برسوں سے بسی ہوئی ہو۔ اب تو بس اس وقت کا انتظار ہے کہ جب تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے گھر میں آبسو گی۔'' فریال نے اپنی دمکتی آنکھوں کے دریچوں پر پلکوں کی ریشمی چلمن گرالی تھی۔ اور اس کے تراشیدہ شنگرفی لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

''خدا جانے یہ دو برس کیسے بیتیں گے۔'' اظفر نے آہ بھرتے ہوئے نیم کے گھنے پیڑ کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے ماہِ کامل کی طرف دیکھا۔ ''اب تو وہاں سرمد بھی نہیں ہوں گے۔''

''کیوں؟ کیا وہ ایم ایس کرنے واپس نہیں جائیں گے؟'' فریال نے چونکتے ہوئے سوال کیا۔ سرمد کے نام پر بے اختیارانہ اسے نمو کا خیال آ گیا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار سرمد کے نام پر نمو کے حسین چہرے پر قوسِ قزح بکھرتی دیکھی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ وجاہت انکل اب چاہیں گے کہ سرمد ان کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ ویسے بھی ان کی چاہنے والی دادی انہیں اب اپنی نظروں سے اوجھل ہونے نہیں دینا چاہتیں۔''

''یہ..... سرمد بھائی کیسے انسان ہیں؟'' فریال نے سوچتی ہوئی نظروں سے اظفر کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''بہت...... بہت...... بہت ہی اچھے انسان ہیں'' اظفر نے پُر جوش لہجے میں جواب دیا۔ ''تمہیں بتاؤں ان کے ساتھ رہ کر میں بھی اچھا بن گیا۔ ورنہ پہلے.....'' اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر انہوں نے معنی خیز نظروں سے فریال کی طرف دیکھا۔

''ورنہ پہلے کیا؟'' فریال نے چونک کر سوال کیا۔

''پہلے میں ہر وقت تمہارے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔'' اظفر نے شوخ نگاہیں فریال کے متجسس چہرے پر جماتے ہوئے شریر لہجے میں کہا۔ ''اور پتہ نہیں..... کیا کیا سوچا کرتا تھا۔'' وہ خود ہی جھینپ کر ہنسنے لگا۔ ''مگر..... اب.....''

''مگر اب.....؟'' فریال ان کی بات کا مفہوم سمجھتے ہوئے قدرے محجوب ہو کر بولی۔ اس کا لہجہ بے حد دھیما تھا۔ ''اب نہیں سوچیں گے کیا؟''

''اب تو سوچنے کا استحقاق حاصل ہے۔'' دھیمے اور جذباتی لہجے میں جواب دیتے ہوئے اظفر نے دیوار پر دھرے فریال کے نرم و نازک ہاتھ پر اپنی سلگتی ہوئی ہتھیلی رکھ دی تھی۔ اور فریال نے اپنے ہاتھ کھینچنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اظفر کے سچے جذبوں کی تپش اس لمس کے ذریعے فریال کے پورے وجود میں ایک بے نام سا ارتعاش جگا رہی تھی۔ ''فون تو کرو گی نا؟'' اظفر نے سرگوشی کی۔

''ہوں.....'' عنابی لپ اسٹک سے رنگے تراشیدہ لبوں میں جنبش ہوئی۔ اظفر اس کے اور قریب کھسک آئے تھے۔ اس پل زندگی کتنی خوب صورت اور شاداب لگ رہی تھی۔ وقت کی نبض تھم سی گئی تھی۔ گزرتے لمحوں کی آہٹیں بے وقعت اور بے معنی ہو کر رہ گئی تھیں۔ فریال نے اپنا سر اظفر کے کاندھوں پر رکھ دیا تھا۔ یہ شخص اس کی آنے والی زندگی کی خوشیوں کا امین تھا۔ زندگی کے کڑے سفر میں اس کا ہم سفر تھا، اس کی منزل تھا۔ چاہتوں کے یہ لمحے کتنے انمول اور کس قدر حسین ہوتے ہیں، اس کا آج اسے پہلی بار ادراک ہوا تھا۔ کسی کو چاہنا اور آخر کار پا لینا...... کس قدر خوش کن اور دلفریب ہوتا ہے...... یہ احساس آج اظفر کو پا کر اسے ہوا تھا۔ کتنی ہی ساعتیں اس بے خودی کے عالم میں گزر گئی تھیں۔

''یہ سرمد بھائی.....'' فریال کو بالکل اچانک ہی ایک بار پھر نمو کا خیال آیا تھا۔ اور اس خیال کے ساتھ ہی سرمد کے لئے ایک سوال اس کے لبوں پر آ گیا تھا۔ ''اتنا عرصہ وہاں انگلینڈ میں رہے..... تو وہاں کوئی لڑکی وغیرہ؟''

''یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟'' اظفر حیران ہوئے۔

''بس یونہی۔'' فریال جھینپ کر بولی۔

''یہ سوال تو تمہیں میرے بارے میں کرنا چاہئے تھا۔'' اظفر شریر لہجے میں گنگنائے۔

''تمہیں جانتی ہوں۔'' فریال اعتبار بھرے لہجہ میں بولی۔ ''اس لئے تمہاری طرف سے میں چنداں فکرمند نہیں ہوں پر وہ.....سرمد بھائی.....؟''

''اگر تم یہ سوال بار بار اس لئے کر رہی ہو کہ وہ شام کو تمہاری دوست نمو سے ٹکرا گئے تھے.......تو یقین کرو......وہ محض اتفاق تھا۔ ورنہ تو سرمد بالکل بھی اس ٹائپ کے انسان نہیں ہیں کہ جان بوجھ کر لڑکیوں سے ٹکراتے پھریں......اور سچ تو یہ ہے کہ غلطی تمہاری دوست کی ہی تھی۔'' اظفر کے آخری جملے نے فریال کا دل جلا کر رکھ دیا تھا۔

''تو تمہارا خیال ہے کہ نمو اس ٹائپ کی لڑکی ہے جو جان بوجھ کر لڑکوں سے ٹکراتی پھرتی ہے؟'' فریال نے خفگی بھرے لہجے میں کہا اور اظفر کے ہاتھ کے نیچے دبا اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''ارے بابا! یہ میں نے کب کہا؟'' اظفر گڑبڑا کر بولے۔ ''مجھے معلوم ہے کہ وہ تمہاری بچپن کی اور بہت ہی پیاری دوست ہے......اور تمہاری ہی طرح بہت......بہت اچھی لڑکی ہے۔''

''واقعی وہ ہر لحاظ سے ایک بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔'' فریال نے دھیمے اور کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد پُرتجسس اور پُراشتیاق لہجے میں سوال کیا۔

''کیا وہ سرمد بھائی کو بھی اچھی لگی؟''

''کیا مطلب؟'' اظفر حیران ہوئے۔

''مم......میرا مطلب ہے......'' اب کے فریال کے گڑبڑانے کی باری تھی۔ ''میرا مطلب تھا کہ وہ اتنی پیاری ہے.....جو دیکھتا ہے، تعریف کے بِنا نہیں رہ پاتا۔''

''سرمد اس طرح کی عامیانہ سوچ رکھنے والے انسان نہیں ہیں۔'' اظفر نے فریال کے سوال کا مفہوم سمجھتے ہوئے ٹھہرے ہوئے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''دوسرے ان کے اور نمو کے اسٹیٹس میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔''

''یہی تو۔'' فریال افسردہ لہجے میں بولی۔ ''یہی بات تو میں نے نمو کو بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔''

''کیا؟......نمو نے ایسی کوئی بات کی تھی؟'' اظفر نے اشتیاق بھرے لہجہ میں سوال کیا۔

''نہیں۔'' فریال نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''مگر ان کے نام پر اس کے چہرے پر بکھرتی دھنک نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ اور بس......ہوسکتا ہے میرا تجزیہ غلط ہو۔ اور اگر یہ غلط نہیں ہے تو......؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اظفر کی طرف دیکھا۔ ''تو......پھر نمو کے لئے صرف دعا ہی کی جاسکتی ہے۔ اور کچھ نہیں۔''

''آخر معجزے بھی تو ہوتے ہیں۔'' فریال نے پُراُمید لہجے میں کہا۔

''ہاں! اگر ایسا ہو جائے تو یہ ایک معجزہ ہی ہوگا۔''

تب ہی سیڑھیاں قدموں کی چاپ سے جاگ اُٹھی تھیں۔

''اگر اجازت ہو تو ہم اوپر آجائیں؟'' سیڑھیوں کی جانب سے فریحہ کی ہنستی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ارے آپی!......آیئے نا......بھلا اس میں اجازت لینے کی کیا بات ہے؟'' فریال اپنا آنچل سنبھالتی اظفر سے ذرا دور کھڑے ہوتے ہوئے جلدی سے بولی تھی۔ اور اگلے ہی لمحے فریحہ اور ظفریاب مسکراتے ہوئے چھت پر نمودار ہوئے تھے۔

''تخلیے میں مخل ہونے کے لئے معذرت خواہ ہیں۔'' ظفریاب نے پہلے فریال کو اور پھر اظفر کو دیکھتے ہوئے معذرت

خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''مگر کیا کِیا جائے.....مجبوری ہے۔ ہماری صبح فلائٹ ہے......آدھی سے زیادہ رات گزر چکی ہے۔ اب اگر کچھ دیر آرام کرلیا جائے تو کیسا رہے گا؟''

''بالکل ٹھیک۔'' اظفر نے بادل نخواستہ جواب دیا اور سب واپسی کے لئے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

اس گھر میں فریحہ کی یہ آخری رات تھی۔ اگلی صبح وہ پیا دیس سدھارنے والی تھی۔ اس کا بچپن، بچپنے سے جڑی ڈھیر ساری یادیں، اس کے پیارے اور یہ پیارا گھر.....کل صبح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے والے تھے۔ ایک اجنبی کا ہاتھ تھام کر وہ اپنے سارے پرانے مانوس رشتے چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے ساتھ جانے کے لئے بخوشی راضی و تیار تھی۔ کیونکہ اب آنے والی پوری کی پوری زندگی اسی شخص کے نام سے وابستہ تھی اور اس وابستگی پہ وہ بے حد خوش تھی۔ پیچھے رہ جانے والوں سے بچھڑ جانے کا دکھ تو تھا مگر آنے والی خوشیوں کے احساس نے اس کے دل و دماغ میں مسرت و انبساط کے اَن گنت دیپ روشن کر دیئے تھے۔ ایک عجب سا آس بھرا سرور انگیز احساس تھا جو خوشی بن کر اس کے ننھے سے دل میں دھڑک رہا تھا۔

❀===❀===❀
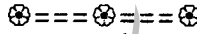
گزرتے وقت کا ہر پل اس کے لئے نت نئے نتائج لے کر آ رہا تھا۔ مگر وہ لمحہ بہ لمحہ ہوتی ہوئی ان تبدیلیوں سے ہراساں ہونے کے بجائے پلکیں جھپک جھپک کر ان تبدیلیوں کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ زندگی گویا ایک تھی بنتی جا رہی تھی۔ ہر بات اُلجھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی سرا ہاتھ ہی نہ آتا تھا۔ اب تک کی اس کی زندگی انو کی بے حد حساب محبت، شریفن خالہ کی ممتا بھری شفقت اور فریال کی بے لوث دوستی کے سائے میں شاد و شاداب گزر رہی تھی۔ لیکن وقت کمال ہوشیاری سے اس کے ساتھ کھیل کھیل رہا تھا اور سارے چاہنے والے رشتے ایک ایک کر کے گیلی ریت کی طرح اس کی مٹھی سے پھسلتے جا رہے تھے۔ شریفن خالہ دُور دیس جا بیٹھی تھیں۔ فریال سے بھی ناطہ ٹوٹ کر رہ گیا تھا اور انو......انو اور اس کی محبت کے درمیان حسنہ آ کھڑی ہوئی تھی۔ نمو کا چہرہ دیکھ دیکھ کر زندہ رہنے والے انو کو اب کئی کئی دن نمو کی طرف دیکھنے کا بھی خیال نہیں آتا تھا۔ بس رات کے کھانے پر اسے ان دونوں کے ساتھ چند گھڑی بیٹھنے کا موقع ملتا تھا۔ مگر اس عرصے میں بھی وہ تمام وقت حسنہ کی ہی طرف متوجہ رہتا تھا۔

''حسنہ!......سالن اور لو.....ارے یہ کیا؟.....تم نے ہاتھ کیوں کھینچ لیا؟ ابھی تو تم نے کچھ کھایا ہی نہیں......چلو آدھی روٹی اور کھاؤ۔''

کبھی کبھی تو یوں لگتا کہ وہ ان دونوں کے ساتھ دستر خوان پر موجود ہی نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو وہ خود کو بے حد غیر ضروری اور غیر اہم سمجھنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ پھر ایک شام سے ساتھ کھانا کھانے کا سلسلہ بھی موقوف ہو گیا۔

''نمو! تمہاری بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم کھانا کمرے میں لے آؤ۔'' انو نے باورچی خانے میں جھانک کر حکم دیا تھا۔

''جی اچھا۔'' نمو نے جلدی سے جواب دیا تھا۔ ''ابھی لاتی ہوں۔'' اور کچھ دیر بعد کھانے کو ٹرے میں سجا کر وہ کمرے میں لے آئی تھی۔

''ہم ذرا دیر سے کھانا کھائیں گے۔'' میز پر ٹرے رکھ کر نمو کو سائیڈ میں دھری کرسی پر بیٹھتے دیکھ کر حسنہ نے سرد لہجے میں کہا تھا۔ ''اگر تمہیں بھوک لگی ہے تو تم باورچی خانے میں جا کر کھا لو۔''

''نہیں۔ ابھی تو مجھے بھی ایسی کوئی خاص بھوک نہیں ہے۔'' نمو نے معصومیت سے جواب دیا تھا۔ ''میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہی کھا لوں گی۔''

اس کے جواب پر جز بز ہو کر حسنہ نے میاں کی طرف دیکھا تھا اور انو ایک دم سے نمو کی طرف پلٹ کر بولا تھا۔
''کیا مصیبت ہے نمو! تم اکیلے کھانا نہیں کھا سکتیں؟.....ضروری ہے کہ تم ہر وقت ہمارے سر پر سوار رہو؟'' عجب سرد و عجب اجنبی سا لہجہ تھا۔ عجب انجانا اور بیگانہ سا انداز تھا۔ نمو کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ آواز اس کے چہیتے اور بے حد پیار کرنے والے بھائی انو کی ہی تھی۔ وہ کمرے سے نکل کر خاموشی سے کچن میں آ بیٹھی تھی۔ جانے کتنی ہی دیر وہ یونہی گم صم اور خاموش بیٹھی رہی تھی۔ پھر اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس نے کتابیں نکالیں اور پڑھنے کی کوشش میں لگ گئی۔ امتحان سر پر کھڑے تھے اور اس کا دل تھا کہ اب پڑھائی میں بالکل بھی نہ لگتا تھا۔ کتاب کھول کر بیٹھتی تو عجب عجب سوچیں اور خیالات چاروں طرف سے اسے گھیر لیتے تھے۔ کبھی حسنہ کی دل جلانے والی باتیں، کبھی انو کا بدلتا، سرد پڑتا روّیہ......اور کبھی......وہ روشن خمار آلود آنکھیں......وہ دلکش کتابی چہرہ......اور وہ سحر انگیز سی مخمور آواز......وہ اپنی اس کیفیت کو کوئی نام نہ دے پا رہی تھی۔ سرمد کے تصور سے ہی دل میں ایک بے نام سا انتشار جاگتا تھا۔ اور وہ حیران ہو کر سوچا کرتی تھی، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ آخر وہ اجنبی چہرہ میرے دل سے، میری سوچوں سے محو کیوں نہیں ہو جاتا؟ اس نے اپنے تئیں اس چہرے کو بھلانے کی بے حد کوشش کی تھی، مگر اپنی اس کوشش میں وہ بری طرح ناکام رہی تھی۔ کئی بار اس کے جی میں آیا تھا کہ وہ فریال کو اپنی اس کیفیت سے آگاہ کرے، مگر پھر وہ خود ہی خاموش ہو بیٹھتی تھی۔ ایک تو اب فریال سے ملاقات ہی کب ہوئی تھی؟ دوسرے وہ سرمد کا نام اس کے سامنے لینے میں عجیب سی ہچکچاہٹ اور گھبراہٹ سی محسوس کرتی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتی تھیں، اس کے باوجود نمو سوچتی تھی کہ یہ سب باتیں سن کر جانے فریال میرے بارے میں کیا سوچے گی؟......ویسے بھی اسے اپنی اوقات کا اچھی طرح علم تھا۔ یہ پروفیسر آفاق کا بڑا پن اور انسانیت تھی جو انہوں نے کبھی اسے اپنی بیٹیوں سے کم نہیں سمجھا تھا۔ ورنہ حقیقت میں تو وہ ایک معمولی چپڑاسی کی بیٹی اور نائب قاصد کی بہن ہی تھی۔ کتنے ہی دن گزر گئے تھے، فریال سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی۔
''بھیا! آپ کہیں تو میں آج فریال سے مل آؤں؟'' انو اور حسنہ کے سامنے ناشتہ لگاتے وقت اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ ''اس سے ملے بہت دن ہو گئے ہیں۔''
''تو کون سی قیامت آ گئی؟'' انو کے جواب سے پہلے ہی حسنہ چیخ کر بولی تھی۔ ''کوئی رشتے داری، عزیز داری تھوڑی نا ہے کہ ملنا ضروری ہے......ویسے بھی آج تم کس طرح جا سکتی ہو؟ آج تو ہمیں ہسپتال جانا ہے۔''
''ہسپتال؟'' نمو نے سوالیہ نظریں اُٹھائیں۔
''ہاں۔ تمہاری بھابی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'' انو چائے کا سپ لیتے ہوئے گویا ہوا۔ ''آج چیک اپ کے لئے ہسپتال لے کر جا رہا ہوں۔''
''کیا ہوا بھابی کو؟'' نمو چند لمحوں پہلے کا حسنہ کا زہریلا لہجہ بھلا کر بے تابانہ پوچھ رہی تھی۔ ''آپ ٹھیک تو ہیں نا بھابی؟.....کیا ہوا آپ کو؟''
''ابھی کچھ پتہ نہیں۔'' انو زیر لب مسکرایا تھا۔ ''اب ہسپتال جا رہے ہیں، چیک اپ کے بعد ہی کچھ پتہ چلے گا۔''
اور ہسپتال سے واپس آتے ہی انو نے نمو کو یہ خوشخبری سنا دی تھی۔
''نمو!.....تو پھوپھی بننے والی ہے۔''
''پھوپھی؟'' لحظہ بھر کو نمو کچھ سمجھی ہی نہیں تھی اور جب بعد میں بات سمجھ میں آئی تو فرطِ مسرت سے اس کا گلابی چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ''سچ بھیا...؟'' اس نے خوشی سے لرزتی آواز میں یقین دہانی چاہی تھی۔
''ہاں......بالکل سچ۔'' انو نے فخریہ نظروں سے حسنہ کی طرف دیکھا جو آنکھوں پہ بازو دھرے بستر پر لیٹی تھی۔

''کب.....کب بھیا!......کب میں پھوپھی بنوں گی؟'' نمو نے بے تابانہ لہجے میں پوچھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسی وقت پل کے پل اس کی گود میں اس کا پیارا سا بھتیجا یا بھتیجی آ جائے۔

''ارے کوئی مجھے دو گھونٹ پانی پلا دو...... حلق خشک ہو رہا ہے۔'' حسنہ نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر نقاہت بھرے لہجہ میں کہا تھا۔ جب سے ہسپتال سے لوٹی تھی، بستر پر پڑی تھی۔

''میں ابھی دودھ لاتی ہوں۔'' نمو جواب دیتی تیزی سے کچن کی جانب چلی گئی تھی۔

❀===❀===❀
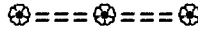
''آپ کون......؟'' دوسری جانب سے نسوانی آواز میں سوال کیا گیا تھا۔

''سرمد۔'' سرمد نے قدرے حیران لہجہ میں جواب دیا تھا۔ کیونکہ آواز ان کے لئے قطعاً نامانوس اور انجانی تھی۔ 'آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟''

''اسد......'' دوسری جانب سے سرعت کے ساتھ جواب آیا۔ ''اسد بھائی ہیں؟''

''جی ہیں۔'' سرمد نے قدرے تحمل سے جواب دیا۔ ''مگر اس وقت......''

''جی اسی وقت بات کرنی ہے۔ یہ بہت ضروری ہے۔''

''او کے۔'' سرمد نے گہرا سانس لیا۔ ''آپ ہولڈ کیجئے۔ میں انہیں بلاتا ہوں۔''

''آپ کے لئے فون ہے۔'' سرمد نے اسد کے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دے کر اطلاع دی تھی۔ ''کوئی خاتون آپ سے بات کرنا چاہ رہی ہیں۔''

''اوہ......'' اسد ایک دم سے بستر سے اُٹھ بیٹھے تھے۔ آج دوپہر سے ان کا موبائل کچھ گڑبڑ کر رہا تھا۔ اس لئے ثروت سے بات نہ ہو سکی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ثروت نے ہی اس وقت فون کیا ہو گا۔ چنانچہ وہ سلیپر پاؤں میں اُڑستے تیزی سے کمرے سے باہر آ گئے تھے۔ سرمد انہیں لاؤنج کی طرف جاتے دیکھ کر اپنے کمرے کی طرف لوٹ گئے تھے۔

''کون......؟ فروا......؟'' اسد کو فروا کی آواز سن کر حیرت ہوئی۔ ''کیا ہوا؟......خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت ہی تو نہیں ہے اسد بھائی!'' دوسری جانب سے فروا کی متفکر آواز سنائی دی۔ ''پاپا کی اچانک طبیعت خراب ہوئی ہے۔ ڈاکٹر مبین کا کہنا ہے کہ انہیں اسی وقت کارڈیو لے کر جانا بے حد ضروری ہے۔ اور اسی لئے......''

''اوہ، اچھا.....اچھا......'' اسد نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔'' فون رکھتے ہی وہ تیزی سے چینج کرنے کے لئے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے تھے۔ پھر کچھ دیر بعد وہ تیزی سے پورچ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''خانو بابا!.....گیٹ کھولیے۔'' انہوں نے گیٹ سے ملحقہ چوکیدار کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے نسبتاً اونچی آواز میں کہا۔

''آپ اس وقت کدھر جا رہے ہیں؟'' بوڑھا چوکیدار حیران نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''ضروری کام سے جانا ہے۔ بس آپ جلدی سے گیٹ کھول دیں۔'' اسد نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا تھا۔ اور گیٹ کھلتے ہی بہ عجلت تمام گاڑی باہر نکال کر چلے گئے تھے۔ سرمد اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑے انہیں اس وقت اس تیزی سے جاتے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اسد ہمیشہ سے ہی الگ تھلگ رہنے کے عادی تھے۔ بچپن میں تو ان کا زیادہ وقت نانی اور خالہ کے گھر میں ہی گزرتا تھا۔ وہ دادی، باپ اور چھوٹے بھائی کی نسبت نانی، خالہ اور اپنی ماں سے زیادہ مانوس تھے۔ ماں کی اچانک ناگہانی موت نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس پر ستم یہ ہوا تھا کہ وجاہت مرزا نے سالی کے

گھرانے سے ہر ربط، ہر تعلق توڑ لیا تھا۔ اور دونوں گھرانوں کے مابین راستے مسدود کر دیئے تھے۔ اسد کے لئے وہ کڑا وقت تھا۔ ایسے میں اپنے گھرانے کے قریب آنے کے بجائے وہ کچھ اور دور ہو گئے تھے۔ خود کو اپنے کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ پھر جونہی کچھ عرصے بعد ان کا ندرت جہاں کے گھر آنا جانا شروع ہوا تو وہ کسی قدر نارمل ہو گئے تھے۔ انہیں جب بھی موقع ملتا، وہ چھپ چھپا کر خالہ کے گھر پہنچ جاتے تھے۔ انہیں خالہ اور ان کی لڑکیوں میں رہ کر خوشی اور راحت ملتی تھی۔ فروا انہیں چھوٹی بہن کی طرح عزیز تھی۔ اس کے چہرے میں ان کی والدہ سطوت کی شباہت پائی جاتی تھی جس کے باعث وہ انہیں بہت عزیز تھی۔ جبکہ ثروت سرتاپا انہیں پسند تھی۔ اور بچپن کی اس پسند نے جوانی کی وادی میں قدم رکھتے ہی محبت کا روپ دھار لیا تھا۔ اور اب وہ کسی بھی قیمت پر اسے اپنا جیون ساتھی بنانے کے آرزومند تھے۔ دادی اور باپ کے انکار کے بعد انہوں نے اپنے تئیں آنے والے وقت کی کچھ پلاننگ کی تھی۔ وہ ایک فارن کوالیفائیڈ انجینئر تھے، چنانچہ انہوں نے کچھ ملٹی نیشنل فرمز میں جاب کے لئے اپلائی کر دیا تھا۔ اب انہیں کسی فرم کی طرف سے آفر لیٹر کا انتظار تھا۔ نوکری ملتے ہی انہوں نے گھر اور گھر والوں کو چھوڑ کر ثروت سے شادی کر کے اپنی الگ دنیا بسانے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔

❀===❀===❀
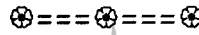
ارجمند بانو اپنے دونوں بیٹوں ظفریاب، اظفر، میاں عالم تاب احمد اور نئی نویلی چہیتی بہو فریحہ کے ساتھ واپس جا چکی تھیں۔ ان سب کے جانے کے بعد پروفیسر آفاق کا گھر گویا ایک دم سے خالی ہو گیا تھا۔ پہلے ہی کون سی لمبی چوڑی فیملی تھی۔ دو میاں بیوی اور دو بیٹیاں۔ ملیحہ بیگم کے انتقال اور فریحہ کی رخصتی کے بعد اب گھر میں صرف وہ اور فریال رہ گئے تھے۔ جس گھر میں کبھی ملیحہ بیگم کے قدموں کی چاپیں اور فریحہ و فریال کے قہقہے اُبلتے تھے، اب وہاں ہر سُو سناٹے گونجا کرتے تھے۔ آفاق صاحب کے یونیورسٹی جانے کے بعد گھر میں صرف فریال اور اوپر کے کام کرنے والا تیرہ سالہ غفور رہ جاتا تھا۔ فریال نے تنہائی اور وحشتوں کی ان گھڑیوں کے لیے خود کو پہلے سے ہی تیار کر رکھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سب کے جانے کے بعد وہ نیم پاگل ہو کر بولائی بولائی سی اکیلے گھر میں پھرا کرے گی۔ اور اکیلے پن کا احساس گھن کی طرح اس کی سوچوں کو چاٹ جائے گا۔ مگر اس وقت اسے حیرت ہوئی تھی جب ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اظفر کے ساتھ قائم ہونے والے نئے، انوکھے اور انجانے رشتے نے پیچھے رہ جانے والے اور بچھڑ جانے والے ہر رشتے کی یاد معدوم کر دی تھی۔ اس نے رشتے کا فسوں اسے ہر لمحے مضبوطی سے تھامے رکھتا تھا۔ اظفر کی یاد اَن گنت چراغوں کی طرح اس کے دل کے تاریک گوشوں میں روشنی کیے رکھتی۔ وہ تنہا ہو کر بھی تنہا نہ تھی۔ اظفر کی پیار بھری سرگوشیاں ہر لمحہ اس کے کانوں میں گونجا کرتیں اور اس کے لب شرمیلے انداز میں متبسم رہتے۔

کبھی کبھی اسے نمرہ کی بے طرح یاد آتی تھی۔ مگر وہ سمجھ چکی تھی کہ اب وہ پہلے والے حالات نہ رہے ہوں گے۔ اس لئے وہ نمرہ کے پاس جانے یا اسے اپنے پاس بلانے سے گریز کرنے لگی تھی۔ نمرہ کا خیال آتا تو دل مسوس کر رہ جاتی تھی۔ اب اسے شدت سے امتحانوں کا انتظار تھا۔ کیونکہ اس دوران نمرہ سے ملاقات یقینی تھی۔ آفاق صاحب بھی اب زیادہ وقت فریال کے ساتھ ہی گزارتے تھے۔ انہیں اس کے اکیلے پن کا شدت سے احساس تھا۔

''میری فری بہت بہادر ہے۔'' یہ بات ملیحہ بیگم اکثر کہا کرتی تھیں۔ اور اب آفاق صاحب کو احساس ہوا تھا کہ وہ بالکل درست کہتی تھیں۔ فریال نے جس طرح خود کو سنبھال کر گھر اور تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف کر دیا تھا، اسے دیکھ کر آفاق صاحب کو یک گونہ سکون ملتا تھا۔ امتحان شروع ہوئے اور ختم بھی ہو گئے۔ مگر زندگی جہاں کی تہاں ٹھہری کی ٹھہری ہی رہی تھی۔ پرچوں کے دوران نمرہ سے مختصر ملاقاتیں پیاس اور تشنگی اور بڑھا گئی تھیں۔ مگر صبر کے سوا کچھ چارہ بھی تو نہ تھا۔ نمرہ آج کل گھر اور بھاوج کی خدمت گزاری میں اس قدر گم ہو کر رہ گئی تھی کہ امتحان کی تیاری بھی بمشکل تمام کر سکی تھی۔

حسنہ پہلے ہی کون سے کام کو ہاتھ لگاتی تھی، مگر جو کبھی کبھار میاں کے کچھ چھوٹے موٹے کام کر لیتی تھی، اب اس نے اس سے بھی ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ اب وہ سارا وقت بستر پر لیٹی سناتی رہتی تھی اور انو کے آتے ہی اس کے کہیں نہ کہیں درد شروع ہو جاتا تھا۔ اور انو سب کچھ بھول کر اس کی دلجوئی اور تیمارداری میں لگ جاتا۔

نمرہ تو صبح سے شام تک پہلے ہی حسنہ کی خدمت گزاری میں مصروف رہتی تھی۔ کبھی کپڑوں پر استری کر رہی ہے، کبھی نہانے کے لئے پانی گرم کر رہی ہے، اچھے سے اچھا کھانا پکا کر پیش کر رہی ہے، کبھی سُوپ، کبھی چائے حاضر کر رہی ہے۔ مگر حسنہ بی تھیں کہ ان کے مزاج ہی نہ ملتے تھے۔ تیوری پر بل اور چہرے پر نخوت لئے اپنے کمرے میں پڑی رہتی، یا تیار ہو کر میاں کے ساتھ میکے کے لئے یا کہیں گھومنے پھرنے چلی جاتی۔ نمرہ گھر میں اکیلے رہنے کی عادت تھی، اور نہ ہی اسے گھومنے پھرنے کا ایسا کوئی شوق تھا، یا یہ کہیے کہ وہ انو کی محدود آمدنی سے واقف تھی۔ اس کی لگی بندھی آمدنی نے کچھ اتنی اجازت ہی نہ دی تھی کہ کہیں گھومنے پھرنے یا تفریح کے لئے گنجائش نکلتی۔ مگر اب انو کے ساتھ حسنہ کو گھومنے پھرنے کی خاطر نکلتے دیکھتی تو کبھی کبھی نمو کا بھی جی چاہتا کہ بھیا اس سے بھی پوچھیں۔ اور وہ بھی گھر کی تنہائی اور مشقت بھری زندگی سے نجات حاصل کر کے چند لمحے کسی تفریحی مقام پر گزار سکے۔ مگر جب وہ حسنہ کے منہ سے بسوں کے کرایوں اور مہنگائی کا واویلا سنتی تو اپنی خواہش دل میں ہی دبا کر خاموش ہو بیٹھتی تھی۔ اسے اپنے بھیا کی غربت پر دکھ ہوتا تھا۔ وہ کبھی کبھی سوچتی کہ بھیا اسے ساتھ نہ لے جا کر دل ہی دل میں دُکھی ہوتے ہوں گے۔ یہ بات سوچ کر وہ اور بھی دُکھی ہو جاتی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے دو مہینے بیت گئے۔ آج کل میں رزلٹ آنے والا تھا۔ رزلٹ کے تصور سے ہی نمو کا دل دھڑکنے لگتا تھا۔

''بھیا! آج میں فریال کے ہاں جا کر رزلٹ کا معلوم کر آؤں؟'' اس شام انو اور حسنہ کے سامنے چائے رکھتے ہوئے اس نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا تھا۔

''رزلٹ آ گیا کیا؟'' انو نے بے ساختہ چونکتے ہوئے پوچھا تھا۔

''لو، ابھی کہاں آیا؟'' انو کا یوں چونک کر سوال کرنا حسنہ کو اچھا نہیں لگا تھا، اسی لئے نمو کے جواب سے پہلے ہی چیخ کر بولی۔ ''رزلٹ اخبار میں آتا ہے۔ اور جب اخبار میں آئے گا تو سب ہی کو پتہ چل جائے گا۔ بھلا اس میں فریال کے گھر جا کر معلوم کرنے والی کون سی بات ہے؟'' حسنہ کا تیکھا اور بدتمیز لہجہ نمو کو ناگوار گزرا تھا۔ مگر اس نے نظرانداز کر دیا تھا۔ اب وہ حسنہ کے اس لب ولہجہ کی عادی ہو چکی تھی۔ دوسرے اس کا خیال تھا کہ طبیعت نہ ٹھیک رہنے کے باعث حسنہ کچھ چڑچڑی ہو گئی ہے۔ اسی لئے وہ اس کی کسی بھی بات کا برا مانے بغیر سر تسلیم خم کر لیتی تھی۔ اس کے لئے یہ بات بہت اہم تھی کہ حسنہ کچھ عرصے بعد اس کے ننھے منے بھتیجے یا بھتیجی کی ماں بننے والی ہے۔ آنے والے ننھے مہمان کے تصور سے ہی نمو ہر بات بھلا کر بے اختیار مسکرا اُٹھتی تھی۔

اس صبح انو یونیورسٹی میں داخل ہوا ہی تھا کہ سامنے سے پروفیسر آفاق کی گاڑی آتی نظر آئی تھی۔ اس نے نظر بچا کر نکلنا چاہا تھا مگر پروفیسر آفاق نے اسے دیکھتے ہی گاڑی روک لی تھی۔

''ارے انو میاں!'' ان کی مسرور آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو اسے ہاتھ اُٹھا کر سلام کرنا ہی پڑا۔

''سلام سر......!''

''جیتے رہو۔ بھئی آپ کی بڑی عمر ہے۔ ہم ابھی آپ کو ہی تلاش کر رہے تھے۔'' آفاق صاحب نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ''آؤ بیٹھو۔''

''جی......وہ......'' انو نے پس وپیش کا مظاہرہ کیا۔

''ارے آؤ بھئی......تمہیں خوشخبری دینی ہے۔'' آفاق صاحب نے خوشی سے کھنکتی آواز میں کہا۔

''خوشخبری؟'' انو حیران ہوا۔
''ہاں! کچھ پتہ بھی ہے، فریال اور نمرہ کا رزلٹ آ گیا ہے۔''
''واقعی؟'' لحظہ بھر کو انو کا دل دھڑکا۔ ''کب.....کہاں؟.....میرا مطلب کیا ہوا؟''
''مٹھائی کھلانے کا وعدہ کرو تو بتائیں۔'' آفاق صاحب مسکرائے۔
''کک.....کیا ہوا؟'' انو نے ڈیش بورڈ پر دھرے اخبار کی طرف دیکھا۔ ''نمو..... پاس تو ہو گئی؟''
''پاس......'' آفاق صاحب نے فخریہ انداز میں اخبار اٹھایا۔ ''ارے بھئی! نمو نے پورے بورڈ میں پوزیشن لی ہے.....پہلی پوزیشن۔''
''پہلی پوزیشن؟'' انو نے بے یقینی سے آفاق صاحب کی طرف دیکھا۔
''اپنے گھر جا کر دیکھو ذرا.....تمام میڈیا کے نمائندے نمرہ کے خیالات جاننے، اس کے انٹرویو کے لئے تمہارے دروازے پر جمع ہیں۔'' آفاق صاحب نے کہا اور ہاتھ بڑھا کر انو کا ہاتھ تھام کر اسے گاڑی میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔
راستے میں آفاق صاحب نے گرما گرم گلاب جامن اور پھولوں کے گلدستے خریدے تھے اور انو کے گھر کی جانب روانہ ہو گئے تھے۔ حسنہ کے لئے یہ سب کچھ ناقابل برداشت اور تکلیف دہ تھا۔
''لو بتاؤ.....ہم نے بھی پانچ جماعتیں پڑھی ہیں۔'' وہ بیزار لہجہ میں کہہ رہی تھی۔ ''ہم نے تو کبھی ایسے چونچلے نہیں دیکھے۔ لو بتاؤ، کچھ اور نہیں تو.....اخبار والے گھر تک دوڑے چلے آئے۔''
مستقبل میں آپ کیا کرنا چاہتی ہیں؟'' اس نے اخباری نمائندے کی نقل اُتارتے ہوئے برا سا منہ بنا کر کہا۔
''اے بھیا! لڑکیاں چولہے جلانے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی ہیں؟''
''میرے بھیا کی خواہش ہے کہ میں مستقبل میں ڈاکٹر بنوں۔'' نمو کے جواب نے حسنہ کا دل جلا کر رکھ دیا تھا۔
''ڈاکٹر بنے گی......ہونہہ.....'' وہ منہ بنائے سوچ رہی تھی۔ 'بڑی آئی ڈاکٹر بننے والی۔'
''بیٹا! بہت مبارک ہو۔'' پروفیسر آفاق، نمرہ کے سر پر شفقت بھرے انداز میں ہاتھ دھرے کہہ رہے تھے۔ ''مجھے تم سے ایسی ہی کچھ اُمید تھی۔ تم نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔''
''شکریہ انکل!'' نمو کے لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ''آپ لوگوں کی دعاؤں کے طفیل مجھے یہ کامیابی ملی ہے۔'' خود اسے کب اُمید تھی کہ وہ اتنی شاندار کامیابی حاصل کر لے گی۔
''مجھے تو ہمیشہ سے پتہ تھا کہ تمہاری کوئی نہ کوئی پوزیشن ضرور آئے گی۔'' فریال پُر یقین لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''اب تم پہلی پوزیشن ہی حاصل کر لو گی، یہ نہیں پتہ تھا۔''
''خود مجھے کب پتہ تھا؟'' نمو کے آواز میں احساسِ تشکر نمی بن کر اُتر آیا۔ ''یہ اللہ کا کرم ہے اور بھیا کی دعاؤں کا اثر ہے۔''

❀===❀===❀
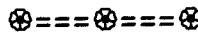
''اماں جی! مجھے بلایا آپ نے؟'' یونس لاکھانی مرے مرے قدموں سے چلتا سلطانہ کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔
''ارے ہاں.....تُو اتنا ڈر کیوں رہا ہے؟'' سلطانہ نے آنکھیں نکالیں۔ ''میں کوئی چڑیل ہوں جو تجھے کھا جاؤں گی؟''
''ارے اماں جی! توبہ توبہ.....میں بھلا آپ کو چڑیل سمجھ سکتا ہوں؟'' لاکھانی ہاتھوں سے کان پکڑتے ہوئے بولا۔ ''آپ تو میری ماں جیسی ہو۔''
''اچھا۔'' سلطانہ مکاری سے مسکرائی۔ ''سچ کہوں، تُو بھی مجھے میرے رشید جیسا ہی لگتا ہے۔''

''سکر یہ اماں جی!......مہربانی آپ کی۔'' لاکھانی جلدی سے بولا۔ ''حکم کرو اماں جی! میرے لائق کوئی کھدمت؟''
''ہاں بیٹھ تو...... مجھے تجھ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' سلطانہ نرم اور بے تکلفانہ لہجے میں بولی۔ ''یہاں بیٹھ میرے پاس۔'' پھر وہ کچن کی طرف منہ کر کے بولی۔ ''ارے او چھوٹو...... ذرا میرے بچے کے لئے ایک کپ چائے تو لا۔''
''آپ کا بچہ......؟'' چھوٹو حیرانی سے آنکھیں پھیلائے دوڑا چلا آیا۔ ''یہ آپ کا بچہ کب سے ہو گیا؟''
''اچھا جا...تُو جا کر چائے بنا۔'' سلطانہ اسے جھڑک کر بولی۔ ''آج سے یہ میرا بچہ ہی ہے۔ بیٹھ میرے لعل!''
''سکر یہ ماں جی!'' لاکھانی، سلطانہ کے پہلو میں دھری کرسی پر ٹکتے ہوئے بولا۔ ''اب حکم کرو۔ کیا کام ہے؟''
''پہلے تُو مجھے یقین دلا کہ میں جو پوچھوں گی، تُو سچ سچ بتائے گا۔ مجھ سے غلط بیانی نہیں کرے گا۔''
''اماں جی! یقین کرو...... قسم اوپر والے کی...... میں جھوٹ بولتا ہی نہیں۔ آپ کسی سے بھی پوچھ لو۔''
''اچھا! تو پھر یہ بتا، آج کل رشید کا کس سے چکر چل رہا ہے؟''
''رسید کا چکر......؟'' لاکھانی یوں اُچھلا جیسے اُسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بڑھیا نے اسے یہ بات معلوم کرنے کے لئے بلایا ہے۔ ''ارے ماں جی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ''رسید بھائی، سریف آدمی ہیں...... بھلا اُن کا کسی سے کیسے چکر چل سکتا ہے؟''
''دیکھ لاکھانی! مجھے سب پتہ ہے۔'' سلطانہ نے کمر پر ہاتھ رکھ کر مستحکم لہجہ میں کہا۔ ''بس تیری زبانی سننا چاہتی ہوں۔''
''ابھی میں آپ کو کیا بتاؤں؟'' لاکھانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، کیا نہ کرے۔
''سب کچھ سچ سچ بتا دے...... بول...... کون ہے وہ عورت؟''
''کک...... کون...... عورت؟...... وہ اپنی مہکار؟'' لاکھانی سٹپٹا کر بولا۔
''اچھا...... تو مہکار ہے نام اُس کا۔'' سلطانہ نے سر ہلایا۔
''نن...... نہیں...... میرا مطلب ہے...... ہاں......''

⊛===⊛===⊛

''مجھے نہیں لگتا کہ لاکھانی مطمئن ہوا ہے۔'' گلبہار نے مہکار کی طرف دیکھتے ہوئے اظہار خیال کیا۔
''مجھے تو شروع سے ہی یہ برا لگتا ہے۔'' مہکار بیزار لہجے میں بولی۔ ''میسنا کہیں کا۔ لالچی نہ ہو تو۔ پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ اب کوئی اس سے پوچھے کہ اگر رشید نے فلیٹ بک کیا ہے تو تجھے کیوں پیٹ میں مروڑ اُٹھ رہے ہیں۔''
''نہ نہ...... غصہ نہ کیا کر...... سو بار کہا ہے کہ بلاوجہ غصہ کرے گی تو وقت سے پہلے چہرے پر جھریاں پڑ جائیں گی۔'' گلبہار نے اسے غصے میں کھولتے دیکھ کر سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میری طرف دیکھ...... کبھی دیکھا تُو نے مجھے غصے میں؟...... تیری بڑی بہن سمجھتے ہیں سب، کوئی یقین کر سکتا ہے کہ میں تیری بہن نہیں، ماں ہوں۔''
''اس گل کا تو خود مجھے بھی یقین نہیں۔'' مہکار مسکرائی۔
''تجھے نہیں تو نہ سہی۔'' گلبہار اس کے مسکرانے پر مسکرائی۔ ''اب یہ بتا، آگے سوچا کیا ہے؟''
''سوچنا کیا؟ جب تک گڈی چل رہی ہے، چلنے دو۔ بعد کی بعد میں دیکھیں گے۔'' مہکار بے نیازی سے کندھے اُچکا کر بولی۔
''تُو رشید سے بول کے تو دیکھ کہ وہ کوئی فلم شروع کر دے۔''
''نہ...... میرا نہیں خیال کہ اب اس کے پاس اتنا پیسہ ہے۔'' مہکار نے پُرسوچ نظروں سے گلبہار کی طرف دیکھا۔
''تُو کہہ کے تو دیکھ۔'' گلبہار نے اصرار کیا۔

''لو.....تو تمہارا کیا خیال ہے کہ میں کہتی نہیں ہوں گی؟'' مہکار نے سوالیہ نظروں سے گلبہار کی طرف دیکھا۔''مگر یا تو اس کے پاس واقعی پیسہ نہیں ہے یا وہ فلم میں لگانا ہی نہیں چاہتا۔''

''ہوں.....'' گلبہار نے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔ تب ہی اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی تھی۔ گلبہار چونکہ بالکل فون کے قریب بیٹھی تھی، اسی لئے اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا تھا۔

''ہیلو.....'' اس نے مصنوعی آواز میں ماؤتھ پیس میں کہا۔

''آپ کون؟'' دوسری طرف سے ہچکچاہٹ بھری آواز اُبھری۔''آپ مہکار جی ہیں کیا؟''

''نہ جی.....'' گلبہار بے ساختہ مسکرا اُٹھی۔''میں اُس کی بہن، گلبہار.....آپ کون؟''

''لیجئے گلبہار جی! یہ تو آپ ہم سے زیادتی کر رہی ہیں۔'' دوسری طرف سے ڈائریکٹر ایس رحمان کی آواز اُبھری۔ ''ہم تو آپ کے پرانے قدردان ہیں۔ اب آپ ہمیں بھی نہیں پہچانیں گی۔''

''اوہ.....ایس رحمان صاحب!'' گلبہار نے بھنوؤں سے فون کی طرف اشارہ کر کے مہکار کی طرف دیکھا۔ وہ پُر اشتیاق نگاہوں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''نہیں جی۔ آپ جیسے مہربانوں کو کون بھول سکتا ہے؟ کبھی گھر تشریف لائیں نا۔''

''میں آج کل خاصا مصروف ہوں۔'' ایس رحمان سنجیدہ ہوتا ہوا بولا۔''ایک فلم کی کاغذی تیاری میں مصروف ہوں۔''

''اچھا جی.....'' گلبہار بیگم کے لہجہ کی مٹھاس میں اضافہ ہوا۔''یہ تو بڑی خوشی کی گل ہے۔ آپ کو مبارک ہو جی۔''

''شکریہ۔'' ایس رحمان نے جواب دیا۔''دراصل میں نے اس وقت اس لئے فون کیا ہے کہ میرے سامنے فلم کے پروڈیوسر کلیم اللہ صاحب بیٹھے ہیں۔ میں مہکار کو ان سے ملوانا چاہ رہا تھا۔''

''تو جی آپ انہیں ساتھ لے کے گھر آ جائیں نا۔'' گلبہار جلدی سے بولی۔ وہ بے بی سے مل لیں گے اور ہمارا غریب خانہ بھی دیکھ لیں گے۔''

مہکار نے دروازے کی طرف اشارہ کر کے زور زور سے نفی میں سر ہلایا مگر گلبہار نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔

''اچھا۔'' ایس رحمان نے گہری سانس لی۔''اگر آپ کا یہی حکم ہے تو ہم کچھ دیر میں حاضر ہوتے ہیں۔''

''آ وَ جی، سو بسم اللہ۔'' گلبہار مسرور لہجہ میں بولی۔''کتنی دیر میں تشریف لے آئیں گے؟''

''بس یہی کوئی گھنٹے سوا گھنٹے میں آپ کے در دولت پر حاضری دینے آ موجود ہوں گے۔''

''ہم بے چینی سے آپ کا انتظار کریں گے جی۔'' گلبہار نے شہد ٹپکاتے لہجہ میں کہا اور خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔

''لو.....اُسے گھر کیوں بلالیا؟'' اس کے فون رکھتے ہی مہکار جلدی سے بولی۔''اگر اس دوران رشید آ گیا تو؟''

''اوّل تو وہ اس وقت آتا نہیں ہے۔'' گلبہار نے ہاتھ اٹھا کر یقینی لہجہ میں کہا۔''اور اگر آتا ہے تو آ جائے.....وہ کوئی تیرا گھر والا تو نہیں ہے جو تُو اس طرح ڈر رہی ہے۔''

''گھر والے سے کون ڈرتی ہے؟'' مہکار کھلکھلائی۔

''اچھا، تُو اب مخول چھوڑ اور کان کھول کر میری بات سن.....'' گلبہار نے ہاتھ اٹھا کر اسے متوجہ کرتے ہوئے سنجیدہ لہجہ میں کہا۔''ایس رحمان بتا رہا تھا کہ اسے کوئی پروڈیوسر مل گیا ہے اور اس نے فلم پر کام شروع کر دیا ہے۔''

''اچھا.....'' مہکار کے چہرے پر شوق چھلکنے لگا۔''کون ہے؟''

''کوئی ہے..... کلیم اللہ نام کا شخص۔'' گلبہار نے جواب دیا۔ ''وہ ابھی اسے اپنے ساتھ لے کر یہاں آ رہا ہے، تجھے اس سے ملوانا چاہ رہا ہے۔''

'ہائے نی!...... میں صبح سے سوچ رہی تھی کہ بانو سے کہوں کہ میرے بالوں میں مہندی لگا دے۔ مہندی سے بالوں میں کیسی شائننگ پیدا ہو جاتی ہے۔''

''سوواری تجھ سے کہا ہے کہ یہ سارے کام تُو بیوٹی پارلر میں ہی نمٹا لیا کر...... اب بھلا تُو گھر میں سر پر مہندی تھوپ کر بیٹھتی کوئی اچھی لگے گی؟'' گلبہار خفا لہجے میں بولی۔

''اچھا! اب میں وہیں سے لگوالوں گی، خوش؟''

''اچھا چل، اب اُٹھ کر ذرا فریش ہو جا۔ وہ آدھے گھنٹے میں پہنچنے والا ہے۔''

گلبہار کے کہنے پر مہکار اُٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔

کلیم اللہ ایک بہت بڑے صنعت کار عبید اللہ کا بیٹا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے ساری دولت و جائیداد اس کے اختیار میں آ گئی تھی۔ وہ بتیس چونتیس سال کا ایک خوش شکل انسان تھا۔ لاہور کی مشہور یونیورسٹی سے اس نے ایم بی اے کیا تھا اور بڑی ذمہ داری سے کاروبار چلا رہا تھا۔ آرٹ سے اسے ہمیشہ سے دلچسپی رہی تھی۔ اور وہ شروع سے ہی کوئی آرٹ مووی بنانا چاہتا تھا۔ سو یہی خواب لے کر وہ ایس رحمان کے پاس آیا تھا۔

رحمان نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ کہیں شکار ہاتھ سے نکل نہ جائے، اس خوف سے اس نے اسے فوری طور پر مہکار سے ملوانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور اسے امید ہی نہیں، پورا یقین تھا کہ وہ اگر مہکار اور گلبہار کے جال میں پھنس گیا تو اُس کا اُڑنا ناممکن ہو جائے گا۔ سو وہ کلیم اللہ کو لے کر مہکار کے گھر کے لئے روانہ ہو گیا۔ دروازہ ادھیڑ عمر گنجے اور ٹھگنے طیلچی، طیفے نے کھولا تھا اور بے حد عزت و احترام کے ساتھ مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں لے آیا تھا۔

''آداب عرض ہے۔'' ڈرائنگ روم کے دروازے پر رک کر ایس رحمان نے سامنے صوفے پر بیٹھی گلبہار کی خدمت میں جھک کر آداب پیش کیا۔

''آؤ جی، بسم اللہ۔'' گلبہار ایک دم سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''سو بسم اللہ...... اندر تشریف لائیے۔'' اس نے نووارد پروڈیوسر کلیم اللہ کا جائزہ لیتے ہوئے شیریں لہجے میں کہا اور ہاتھ سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ایس رحمان، کلیم اللہ کو ساتھ لیے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کلیم اللہ نے سرسری سی نگاہ سے کمرے کی آرائش کا جائزہ لیا اور اس کی آنکھوں سے پسندیدگی کا احساس جھلکنے لگا۔ باوقار اور خوبرو گلبہار سے بھی وہ متاثر ہوا تھا۔

''تشریف رکھئے۔'' گلبہار نے سامنے دھرے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اجتماعی طور پر رحمان اور کلیم اللہ سے کہا۔ مگر حقیقت میں اس کا مخاطب کلیم اللہ ہی تھا۔

''بہت نوازش۔'' وہ دونوں ساتھ ساتھ صوفے میں دھنس گئے۔ اگلے ہی لمحے طیفہ، گلبہار کی پشت پر آ کھڑا ہوا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اس نے مہمانوں سے پوچھا۔

''کیا پسند کریں گے؟..... چائے، کافی یا ٹھنڈا؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' رحمان نے کلیم کی طرف دیکھ کر ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''دراصل میں بہت جلدی میں ہوں۔ آپ بے بی کو بلا لیں۔'' آخری جملہ ادا کرتے کرتے اس کے لہجہ میں ہلکی سی گزارش بھی شامل ہو گئی تھی۔

''طیفے! ذرا جلدی سے جا کر مہکار کو تو بلا۔'' گلبہار نے ذرا سا گردن کو خم دے کر طیفے کو حکم دیا اور اگلے ہی لمحے طیفا مؤدب انداز میں سر ہلاتا کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ اور چند لمحوں بعد ہی مہکار پردہ سرکا کر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ہر سُو روشنی سی بکھر گئی تھی۔ آتشی گلابی رنگ کے فٹنگ والے جارجٹ کے نفیس سوٹ میں اس کا سانچے میں ڈھلا بدن بے حد خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔ لباس سے ہم رنگ جیولری اور تیز میک اپ میں وہ شعلہ جوالہ دکھائی دے رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی رحمان اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کی دیکھا دیکھی کلیم اللہ بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

''آداب.....'' قریب آ کر مہکار نے اپنا گورا اور مخروطی انگلیوں سے سجا نرم و نازک ہاتھ اٹھا کر سلام پیش کیا تھا۔

''آپ لوگ بیٹھیں نا۔'' وہ ممنون لہجے میں بولی۔ ''بھلا اس طرح کھڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ بھی رحمان صاحب! تکلف بہت کرتے ہیں۔''

''مہکار! ان سے ملو..... یہ ہیں کلیم اللہ صاحب۔''

مہکار نے کٹاری سی آنکھوں سے کلیم اللہ کی طرف دیکھا۔

''یہ میری نئی فلم کے پروڈیوسر ہیں۔''

''اوہ اچھا.....'' مہکار نے اس طرح حیرت اور مسرت بھرے انداز میں کہا جیسے یہ خبر ابھی ابھی اسے ملی ہو۔ ''یہ تو بڑی اچھی گل ہے۔''

''انہیں ایک نئے چہرے کی تلاش ہے۔'' رحمان نے بات آگے بڑھائی۔ ''یا یوں کہہ لو کہ میں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ میں فلم نئے چہروں کے ساتھ بنانا چاہتا ہوں۔ خاص طور پر ہیروئن نئی کاسٹ کرنا چاہتا ہوں۔'' بحیثیت ڈائریکٹر اس نے اپنی اہمیت جتائی۔

''تو.....؟'' مہکار نے ادا سے پوچھا۔

''تو بس..... نوازش ہے کلیم صاحب کی..... انہوں نے اوکے کر دیا تو میں نے سوچا کہ تم سے ملوا دوں..... شاید.....''

''شاید کلیم اللہ صاحب کو ہم جیسے ناچیز لوگوں پر رحم آ جائے۔'' مہکار مسکراتی ہوئی کلیم اللہ کے قریب آ بیٹھی۔ ٹھیک اسی لمحے دروازے پر دستک سنائی دی۔ مہکار اور گلبہار نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔

✿===✿===✿
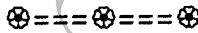
ٹی وی اور اخبار کے نمائندے جا چکے تھے۔ اور انہیں دیکھ کر محلے کے کچھ بچے اور عورتیں جو جمع ہو گئی تھیں، وہ بھی رخصت ہو چکی تھیں۔ نمو کی اس شاندار کامیابی کی خبر سن کر انو کو حیرت بھری مسرت تو ہوئی تھی مگر پروفیسر آفاق کی گاڑی کا رخ اپنے گھر کی طرف دیکھ کر وہ اس خیال سے خائف ہو گیا تھا کہ پروفیسر اور فریال کو دیکھ کر حسنہ کا پارہ چڑھ جائے گا۔ اور حسنہ کی خفگی کے احساس تلے نمو کی کامیابی کی خوشی کہیں دب کر رہ گئی تھی۔

پروفیسر آفاق اور فریال کی صورت دیکھتے ہی حسنہ اپنے کمرے میں جا گھسی تھی، جبکہ نمو نے بے حد تپاک سے ان دونوں کا استقبال کیا تھا۔ فریال نے بے ساختہ نمو کو گلے سے لگا کے اس کی کامیابی کی مبارکباد دی تھی اور آفاق صاحب نے آگے بڑھ کر اس کے گلے میں پھولوں کا مہکتا ہار ڈال دیا تھا۔

''یہ لو مٹھائی۔'' فریال نے مسکراتے ہوئے مٹھائی کا ڈبہ آگے بڑھایا تھا۔ ''اور جلدی سے ہم سب کا منہ میٹھا کرواؤ۔''

نمو لپک کر کچن سے ایک پلیٹ لے آئی تھی۔

''ارے بھئی دُلہن بیگم کہاں ہیں؟'' پروفیسر آفاق نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑا کر انو سے پوچھا۔ ''انہیں بھی تو مٹھائی

کھلاؤ۔''

''جی.....اصل میں.....ان کی کچھ طبیعت خراب ہے.....اس لئے.....وہ.....'' انو نے ہکلاتے ہوئے بات بنائی۔ آفاق صاحب، انو کے ساتھ دروازے کے پاس پڑی چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے جبکہ صحن میں نمو کے پاس اس وقت صرف فریال موجود تھی۔

''کل کالج چلیں؟'' فریال نے پُر شوق لہجہ میں نمو سے مشورہ طلب کیا۔

''اتنی جلدی؟'' نمو کے لہجہ میں حیرت بڑی نمایاں تھی۔

''چلو کل نہ سہی، دو دن بعد۔ سوموار کو چلتے ہیں۔'' فریال نے فیصلہ سنایا۔

''سوموار سے کیا کلاسز شروع ہو جائیں گی؟'' نمو نے معصومیت سے پلکیں جھپکتے ہوئے سوال کیا۔

''ابھی تو فارم ملنا شروع ہوں گے۔'' فریال نے اس کی معصومیت پر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''پھر فارم جمع ہوں گے.....پھر فیس.....کلاسز شروع ہونے میں تو ابھی مہینہ لگے گا.....ابھی تو سکول سے جا کر مارک شیٹ بھی لانی ہوگی۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' نمو نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو پھر.....کل مارک شیٹ لینے سکول نہ چلیں؟'' فریال نے سوال کیا۔

''آج تو رزلٹ آیا ہے.....مارک شیٹ آنے میں دو چار دن تو لگیں گے۔'' نمو نے اظہارِ خیال کیا۔ سوموار کو فارم لینے کالج جائیں گے تو واپسی میں سکول سے مارک شیٹ کا بھی پتہ کر لیں گے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' فریال اثبات میں سر ہلاتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''ابھی سے کہاں؟'' نمو نے حیرانی سے آنکھیں پھیلائیں۔ ''اتنے دنوں بعد تو آج تم آئی ہو۔''

''بس اب چلیں گے۔'' فریال نے دروازے کے قریب جانے کے لئے تیار کھڑے آفاق صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پاپا جانے کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں۔''

''ہاں بیٹا! اب اجازت چاہیں گے۔'' پروفیسر آفاق، نمو کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''ایک بار پھر دلی مبارک......Keep it up۔'' انہوں نے آگے بڑھ کر نمو کے سر پر شفقت بھرے انداز میں ہاتھ پھیرا۔ ''ہماری دعا ہے کہ تم زندگی کے ہر امتحان میں اسی طرح شاندار کامیابیاں حاصل کرتی رہو۔''

''شکریہ انکل!'' نمو نے تشکر بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''اور میری طرف سے بھی ایک بار پھر مبارک۔'' فریال آگے بڑھ کر اس کے گلے لگ گئی تھی۔ ''میں تو سب سے زیادہ اس بات پر خوش ہوں کہ کالج جانے لگیں گے تو کم از کم ہم روز مل تو سکیں گے۔ سچ، میں تو تمہاری صورت کو ترس گئی۔'' گلے لگے لگے فریال نے سرگوشی کی تھی اور نمو محض سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

فریال اور پروفیسر آفاق کے جاتے ہی حسنہ نے آواز دے کر انو کو اندر بلا لیا تھا۔ کمرے کے دروازے سے ذرا ہی فاصلے پر کھڑی تھی۔ وہ اس بات کی توقع کر رہی تھی کہ آفاق صاحب کو رخصت کر کے انو اس کی طرف آئے گا اور اُس کی اس شاندار کامیابی پر اسے مبارک دے گا۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ اس کی کامیابی انو کے لئے کسی بڑی مسرت سے کم نہ ہوگی، وہ خوشی سے نہال ہو اُٹھیں گے۔ پورے محلے میں مٹھائی تقسیم کریں گے۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس سے قبل کہ انو اس کی طرف متوجہ ہوتا، حسنہ نے آواز دے کر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی تھی۔

''میں نے کہا.....اجی سنتے ہو.....ذرا اندر تو آؤ۔'' بیوی کی آواز سنتے ہی انو، نمو کو نظر انداز کرتا تیزی سے کمرے کی طرف مڑ گیا تھا اور نمو اپنی جگہ حیرت اور تاسف کی تصویر بنی کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ درحقیقت وہ اپنی اس کامیابی کی

وجہ انو کو ہی سمجھتی تھی۔ کیونکہ اس کی یہ کامیابی انو کی محبتوں اور محنتوں کی ہی مرہون منت تھی۔ انو کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے نمو نے رات دن محنت کی تھی۔ یہ کامیابی نمو کی نہیں بلکہ انو کی اس سوچ کا نتیجہ تھی جو وہ ہمیشہ نمو کو دیتا رہتا تھا کہ اسے بے حد محنت سے بہت اچھا پڑھنا ہے اور لکھ پڑھ کر ڈاکٹر بننا ہے۔ لیکن کتنی حیرت انگیز اور ناقابل یقین بات تھی کہ انو نے نمو کی اس شاندار کامیابی پر اسے آج مبارکباد تک نہ دی تھی۔ وہ تو انو کی طرف سے تعریف و تحسین کے بول سننا چاہتی تھی، ستائش کے پھول چننا چاہتی تھی۔ مگر انو تو مبارکباد کا وہ عام سا لفظ بھی کہنا بھول گیا تھا جو ایسے موقعوں پر ایرے غیرے بھی ادا کر دیتے ہیں۔ نمو بے یقین نگاہوں سے حسنہ کے کمرے کا ہلتا ہوا پردہ دیکھ رہی تھی، جسے ابھی ابھی انو سرکا کر اندر داخل ہوا تھا۔

''کیا ہوا؟..... طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' انو ہراساں لہجہ میں سوال کرتا آگے بڑھا۔

''دوپہر سے گھر میں دھما چوکڑی مچی ہے۔'' حسنہ نے ہاتھ نچا کر بات کا آغاز کیا۔ ''میں کہتی ہوں..... ایسا دنیا سے اوپر کون سا انوکھا کام ہو گیا تھا؟ پاس نہ ہوئی، قیامت آ گئی۔ ہم نے بھی پانچ جماعتیں پڑھی ہیں۔ پاس بھی ہوئے۔ مگر مجال ہے جو کبھی ایسا تماشا مچا ہو۔''

''ہاں وہ اصل میں.....'' انو نے سر کھجاتے ہوئے تاویل پیش کرنی چاہی۔

''اور ہاں..... تم یہ بتاؤ..... یہ مٹھائی کس سلسلے میں آئی ہے؟ اتنی سی بات پر اتنا بڑا ڈبہ اُٹھا لائے۔ ہار پھول الگ..... اللہ رکھے ہمارے پانچ پانچ بھائی ہیں۔ ہم نے بھی خیر سے پانچویں کا امتحان پاس کیا تھا مگر جو کبھی کسی بھائی نے یہ چونچلے کیے ہوں۔ نہ کبھی مٹھائی کھٹائی آئی، نہ ایسا میلہ تماشا لگا۔ لو بتاؤ..... ٹی وی والے..... اخبار والے..... محلے والے، سب دوڑے چلے آئے۔ کم بختوں کو اور کوئی کام ہی نہیں۔''

''وہ مٹھائی اور ہار پھول تو پروفیسر صاحب لائے تھے۔'' انو رنے چور لہجہ میں وضاحت کی۔

''ایک تو میں تمہارے ان پروفیسر صاحب سے سخت عاجز ہوں۔'' حسنہ نے ماتھے پر ہاتھ مار کر بیزار لہجے میں کہا۔ ''اپنی دولت کی نمائش کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ہمارے ہاں ٹن بھی ہوتا ہے تو وہ مٹھائی کھٹائی لے کر پہنچ جاتے ہیں۔ ارے کوئی ان سے پوچھے..... ہمارے گھر خوشی غمی کچھ بھی ہو..... تم کیوں ہر دم ہمارے سر پر سوار رہتے ہو؟..... میں صاف کہے دیتی ہوں..... تم سمجھا لو اپنے ان پروفیسر صاحب کو..... ورنہ کسی دن میری کھوپڑی گھوم گئی نا..... تو پھر.....''

''ارے ارے..... حسنہ! تم بلاوجہ غصہ کر رہی ہو'' انو لپک کر قریب آتے ہوئے چاپلوسی والے لہجہ میں بولا۔ ''وہ تو پہلے بھی بہت کم آتے ہیں۔ اور اب تو ان کا آنا بالکل ہی ختم ہو گیا ہے۔ ہاں البتہ کبھی کبھار فریال.....''

''یہ فریال تو مجھے ان سے بھی زیادہ بری لگتی ہے۔'' حسنہ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں آج صاف کہے دیتی ہوں..... مجھے اُس کا اس گھر میں آنا بالکل پسند نہیں۔ تم صاف لفظوں میں اسے منع کر دو..... ورنہ.....''

''منع کر دوں گا..... کر دوں گا.....'' انو پچکارتے لہجے میں بولا۔ ''تم بلاوجہ غصہ کر کے اپنی طبیعت مزید خراب مت کرو۔ یاد ہے نا، ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ اس حالت میں تمہیں زیادہ سے زیادہ خوش رہنا چاہئے۔''

''یہ خوشی بھی کیا چیز ہے.....؟'' صحن میں اپنی جگہ ساکت کھڑی نمو سوچ رہی تھی۔ جب تک کسی اپنے سے یہ خوشی بانٹی نہ جائے تو اس کا رنگ کیسا پھیکا پڑ جاتا ہے..... کتنے ہی لوگ آئے تھے، سب ہی نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔ آفاق انکل اور فریال تو مٹھائی اور پھول بھی لائے تھے۔ سب ہی لوگوں نے اسے مبارکباد دی تھی، اس کی ذہانت اور محنت کو خراجِ تحسین پیش کیا تھا..... مگر ایک بھیا کی خاموشی نے جیسے اس کی ساری خوشی پر پانی پھیر دیا تھا۔ کیسے دل بجھ کر رہ گیا تھا۔ وہ تھکے

تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ آج اُسے شریفن خالہ ٹوٹ کر یاد آئی تھیں۔ آج وہ ہوتیں تو کس قدر خوش ہوتیں۔ محلے بھر میں مٹھائی بانٹتی پھرتیں۔ پر اس پل اُس کے پاس نہ شریفن خالہ تھیں، نہ ہی انو...... وہ اپنے نیم تاریک کمرے میں تنہا بیٹھی دل کی ریت اُڑاتے صحرا میں اپنی کامیابی کی خوشی سے نخلستان کو تلاشنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی ہر کامیابی پر خوشی انو سے وابستہ تھی۔ انو کی بے اعتنائی کی سِل تلے اس کی خوشی کا احساس کہیں دب کر رہ گیا تھا۔ اور چاہنے کے باوجود مسکراہٹ اس کے لبوں تک نہ آسکی تھی اور آنسوؤں کا ریلہ پلکوں کی باڑ توڑ کر رخساروں پر بہہ نکلا تھا۔

کئی لمحوں تک آنسو بہا لینے کے بعد دل کا بوجھ کم ہوا تو اس نے نئے انداز سے سوچنا شروع کیا۔

'بھلا اتنی سی بات پر رونے کی کیا ضرورت تھی؟...... بھیا اگر بن مبارکباد دیئے چلے گئے تو اس میں اتنا افسردہ اور دُکھی ہونے کی کیا ضرورت ہے؟' اس نے بستر پر بیٹھ کر خوش فہمی کا کوئی سرا تلاش کرنے کی کوشش کی۔

'ہوسکتا ہے جلدی میں بھول گئے ہوں...... ورنہ تو...... کس قدر خوش دکھائی دے رہے تھے...... اپنے ہاتھ سے آفاق انکل کو مٹھائی کھلائی تھی...... نمو! تم بھی نا...... کچھ زیادہ ہی حساس ہوتی جارہی ہو۔ حد ہوتی ہے حماقت کی بھی۔' اس نے خود کو سرزنش کرتے ہوئے اپنے سر پر ہلکی سی چپت لگائی اور تکیہ پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

❁===❁===❁
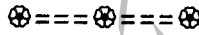
''مجھے لگا، انو بھیا اس قدر خوش نہیں تھے اس خبر پر، جتنا اُنہیں خوش ہونا چاہئے تھا۔'' فریال نے سوچوں میں ڈوبے لہجہ میں بالکل اچانک ہی اپنے خیال کا اظہار کیا۔ نمو کے گھر سے نکل کر گاڑی میں بیٹھنے تک اور گاڑی کے گھر کی طرف روانہ ہونے کے بعد تک فریال بالکل خاموش تھی۔ آفاق صاحب نے بھی اُس کی خاموشی کو محسوس کیا تھا مگر وہ کچھ بولے نہیں تھے۔ مگر کچھ دیر بعد ہی فریال نے خود ہی اپنے خیالوں کو لفظوں کا پیرہن پہنا دیا تھا۔ ''میرا تو خیال تھا، نمو کی اتنی بڑی کامیابی پر انو بھیا تو خوشی سے ناچ اُٹھیں گے۔''

''ارے بھئی! اب وہ اتنا چھوٹا بھی نہیں ہے کہ خوشی سے ناچتا پھرے۔'' آفاق صاحب ہلکے سے ہنس کر بولے۔ ''اب وہ ایک شادی شدہ انسان ہے۔ کچھ عرصے بعد باپ بھی بننے والا ہے، تو لامحالہ اب وہ کچھ سنجیدہ ہوگیا ہے۔'' گوکہ خود آفاق صاحب کو بھی انو کی خاموشی اور لیے دیے رہنے والے انداز پر حیرت ہوئی تھی، مگر وہ اپنی حیرت کا اظہار کر کے فریال کی تشویش بڑھانا نہیں چاہتے تھے، اسی لئے مسکرا کر بولے۔ ''مجھے تو وہ اچھا خاصا پُرجوش دکھائی دے رہا تھا۔''

فریال گوکہ باپ کی بات سے متفق نہ تھی مگر اس نے اختلاف رائے کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔

گھر آکر، ہارن کی آواز پر غفور نے گیٹ کھولا تھا اور آفاق صاحب گاڑی اندر لئے چلے گئے تھے۔ وارنڈے کے بیچوں بیچ لٹکتی فینسی لائٹ کی مدھم سی روشنی پورچ تک آرہی تھی اور چہار سُو خاموشی کی آغوش میں سمٹا عجب اُداس سا تاثر پھیلا ہوا تھا۔

'اگر آج ملیحہ بیگم ہوتیں تو کیا اتنی ہی خاموشی اور اُداسی ہوتی؟' آفاق صاحب نے سلگتے ذہن سے سوچتے ہوئے فریال کی طرف دیکھا۔ اس کی پلکوں پر اُترتی نمی اس بات کی غماز تھی کہ وہ بھی ملیحہ بیگم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ایسے ہی خوشی اور غم کے لمحوں میں تو اپنوں کے نہ ہونے کی کسک اور خلش جاگتی ہے۔

''ارے بھئی غفور!...... یہ کیا پورے گھر میں اندھیرا کر رکھا ہے؟'' وہ اپنے دل کا درد چھپا کر کھنکتی آواز میں گویا ہوئے۔ ''مانا کہ بجلی بھی بچانا چاہئے مگر کسی خوشی کے موقع پر تو دو چار بلب جلا کر چراغاں کیا جاسکتا ہے۔ ارے بھئی ہماری فریال بٹیا اے ون گریڈ میں پاس ہوئی ہے...... چلو، پورے گھر کو روشنیوں سے نہلا دو۔''

اور غفور نے چٹاچٹ سوئچ دبا کر یہاں سے وہاں تک روشنیوں کا سیلاب بہا دیا تھا۔

''ارے پاپا! آپ بھی......'' فریال بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔ آفاق صاحب نے ارجمند بانو، فریحہ اور دیگر لوگوں کو یونیورسٹی سے بھی فون کر کے فریال اور نمو کے رزلٹ کی اطلاع دے دی تھی۔ چنانچہ ان کے گھر پہنچتے ہی مبارک کے فونز کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

''اے ون گریڈ مبارک ہو۔'' اظفر کی خوشی سے لبریز آواز میں مبارک سنتے ہی فریال کو خوشی کے ایک انوکھے احساس نے آ گھیرا تھا۔ ''اور ہاں! تمہاری اس دوست کے لئے بھی مبارکباد۔ اس کی تو پوزیشن ہے۔''

''جی جناب!'' فریال اترائی۔ ''اور وہ بھی فرسٹ پوزیشن۔''

''کسی حسین لڑکی کو پہلی بار اتنا ذہین دیکھا ہے۔'' اظفر مسکرائے۔ ''اینی وے......اب تمہارا آگے کا کیا پروگرام ہے؟''

''ظاہر ہے......کالج میں داخلہ لیں گے۔'' فریال نے خیالی کالر کو اونچا کرتے ہوئے اِترا کر جواب دیا۔

''مجھ سے پوچھو تو......میرے لئے تو تمہاری اتنی ہی تعلیم کافی ہے۔'' ظفر دھیمے اور قدرے جذباتی لہجہ میں گویا ہوئے۔ ''بس فری!......جلدی سے میرے پاس چلی آؤ۔''

''اور پڑھائی کا کیا بنے گا؟'' فریال مسکرائی۔

''پڑھنا چاہو تو یہاں بھی پڑھ سکتی ہو۔'' اظفر نے تجویز پیش کی۔ ''آج کل میں میرا بھی رزلٹ آنے والا ہے۔ رزلٹ آتے ہی جاب......اور جاب ملتے ہی میں مام سے کہوں گا کہ دو سال کا وہ معاہدہ ختم کریں اور تمہیں جلدی سے لے آئیں۔''

''ارے پاگل ہوئے ہو کیا؟'' اظفر کے سنجیدہ لہجہ پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

''واقعی میں پاگل ہو رہا ہوں۔'' اظفر نے اعتراف کیا۔

''پاگل ہو جاؤ یا دیوانے......دو سال تو تمہیں انتظار کرنا ہی پڑیگا۔''

''آخر اس دو سال کی قید کیوں؟'' اظفر نے ضدی لہجے میں سوال کیا۔ ''دو سال بعد تم انٹر کر کے ایسا کون سا پہاڑ سر کر لوگی؟ اور اگر ایسا ہی ہے تو تم یہاں آ کر پڑھ لینا۔''

''تمہیں کیا ہو گیا ہے اظفر؟'' اس کے ہٹیلے لہجہ کو محسوس کرتے ہوئے فریال نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''ذرا سوچو! وہاں تمہارے پاس تو اتنے لوگ موجود ہیں۔ یہاں پاپا کے پاس تو صرف ایک میں ہی ہوں۔''

''یہ تو ہے فری!'' اظفر نے تائید بھرے لہجے میں سر ہلایا۔ ''مگر سوچو! ایک نہ ایک دن تو ایسا ہونا ہی ہے......ابھی نہ سہی تو دو سال بعد۔''

''ابھی امی کی جدائی کے نقوش اتنے دھندلے نہیں ہوئے ہیں۔'' فریال نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ ''فریحہ آپی بھی ابھی کچھ ہی مہینوں پہلے گئی ہیں۔ اگر فوری طور پر میں بھی یہاں سے چلی گئی تو......شاید پاپا اکیلے پن کے غم کو سہہ نہ سکیں۔ ان دو سالوں میں پہلے بچھڑنے والوں کا دکھ کسی قدر کم ہو جائے گا......اور پاپا میری جدائی برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔''

''تو ایسا کیوں نہیں کرتے......ماموں جان بھی انگلینڈ کیوں نہیں آ جاتے؟'' اظفر نے ماموں کے اکیلے پن کے کرب کو محسوس کرتے ہوئے تجویز پیش کی۔ ''تمہارے بعد ان کا وہاں اور کون ہوگا؟......اور کوئی عزیز اقرباء بھی تو نہیں ہیں۔ یہاں کم از کم ان کی اکلوتی بہن......ہم سب اور ان کی دونوں چہیتی بیٹیاں ہوں گی۔'' اظفر کی اس آفر پہ فریال لحظہ بھر کو چپ کی چپ رہ گئی تھی۔

''کہو! کیسی ہے میری تجویز؟'' اظفر نے دادطلب انداز میں سوال کیا۔
''تجویز تو بری نہیں۔ مگر میں جانتی ہوں کہ پاپا اس پر عمل نہیں کریں گے۔''
''کیوں......؟'' اظفر کے سوال میں حیرت بہت نمایاں تھی۔
''کیونکہ پاپا روایتی سوچ رکھنے والے ایک مشرقی انسان ہیں۔ وہ بیٹیوں یا بہن کے گھر میں جا کر رہنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ اور ویسے بھی ابھی پاپا کی ریٹائرمنٹ میں کافی سال باقی ہیں۔ اور انہیں اپنے پروفیشن سے عشق ہے۔ وہ یونیورسٹی، اپنا شہر اور اپنا ملک کبھی بھی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔''
''اوہ.....'' اظفر گہرا سانس لے کر رہ گئے۔ ''پھر کیا، کیا جائے؟''
''صبر کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟'' فریال بے ساختہ ہنس پڑی۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی اظفر کو تائیدی انداز میں ہنسنا پڑا۔

❀===❀===❀
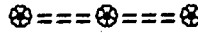
سہ پہر آہستگی سے شام کی سمت قدم بڑھا رہی تھی۔ ندرت جہاں دوپہر کی نیند پوری کر کے بیدار ہو چکی تھیں۔ اس نے پلنگ سے اُٹھ کر ساتھ والی مسہری پر لیٹے اسلم احمد کی طرف دیکھا۔ وہ اب تک سوئے ہوئے تھے۔ وہ آہستگی سے اُٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔ چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مار کر، تولیہ سے منہ پونچھتی جب وہ باہر نکلی تو دیکھا، اسلم احمد بھی جاگ چکے ہیں۔
''چائے پیو گے؟'' اس نے نرم لہجہ میں سوال کیا۔
''ابھی نہیں...... کچھ دیر کے بعد۔'' اسلم احمد نے اُٹھتے ہوئے جواب دیا۔
''کچھ اور کھانے کو دل چاہ رہا ہو تو لے آؤں؟'' ندرت جہاں نے دوسرا سوال کیا۔ جب سے اسلم احمد بیمار ہو کر ہسپتال گئے تھے، ان کے واپس آنے کے بعد سے ندرت جہاں کا روّیہ خاصا تبدیل ہو گیا تھا۔ اسے اسلم احمد کے وجود کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ہو گیا تھا۔
''نہیں۔ اس وقت کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔'' اسلم احمد چپلوں میں پاؤں ڈالتے واش روم کی طرف بڑھ گئے۔
ندرت نے گردن آگے بڑھا کر کھلے دروازے سے لاؤنج اور پھر لاؤنج سے آگے نیچی چھت والے برآمدے کی طرف دیکھا، جہاں بید کی کرسیوں میں سے ایک پر ثروت بیٹھی کسی رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد فروا دونوں ہاتھوں میں چائے کے مگ تھامے برآمدے میں وارد ہوئی تھی۔
''آپی!..... چائے۔'' اس نے ثروت کے سامنے دھری میز پر ایک مگ رکھتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا اور سامنے دھری کرسی پر بیٹھ گئی۔
''اوہو...... یہ چائے...... اور یہ آپی...... خیر تو ہے؟'' فروا عموماً اس کا نام بھی لیتی تھی مگر کبھی جب بہت لاڈ میں ہوتی تو ''آپی'' کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ یا کبھی کوئی کام ہوتا، تب بھی وہ چاپلوسی کے طور پر اسے آپی کہتی تھی۔
''کوئی کام ہے کیا؟'' اس نے رسالہ بند کر کے میز پر رکھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے فروا کی طرف دیکھا۔
''نہیں...... ایسا کوئی خاص کام تو نہیں۔'' وہ تجاہل سے بولی۔
''مطلب..... کام ہے......؟'' ثروت نے مصنوعی غصے سے گھور کر دیکھا۔
''ہاں..... ہے تو۔'' فروا چائے کا مگ میز پر رکھ کر ثروت کی کرسی کے بازو پر آبیٹھی۔ ''اب مجھے کوئی کام ہو گا تو میں اپنی پیاری آپی سے نہیں کہوں گی، تو پھر کس سے کہوں گی؟'' اس نے پیار بھرے انداز میں اپنے بازو ثروت کی گردن کے

گرد پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''آخر کو تم میری اکلوتی بہن ہو۔''

''اب تو واقعی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' ثروت نے خوف زدہ ہونے کی کامیاب ایکٹنگ کی۔ ''جلدی بتاؤ! بھلا ایسا کیا کام ہے جس کی وجہ سے تم بالکل شہد کی طرح میٹھی ہوگئی ہو؟''

فروا چند لمحوں تک ثروت کی طرف تولتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی، پھر سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی کہ بات کرے یا نہ کرے۔ مگر اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی تو نہ تھا۔ سو اُس نے ثروت کو اپنے راز میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''جس رات ابو کی طبیعت خراب ہوئی تھی، اور میں نے اسد بھائی کے گھر فون کیا تھا.....تو جانتی ہو کہ فون کسی نے اُٹھایا تھا؟'' فروا نے سوالیہ نظروں سے ثروت کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کس نے؟'' ثروت نے سر کے اشارے سے پوچھا۔

''سرمد نے۔'' فروا نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''سرمد؟'' ثروت حیران ہوئی۔ ''وہ تو انگلینڈ میں تھا۔''

''مگر اب آ گیا ہے۔'' فروا نے بدستور دھیمی آواز میں کہا۔ ''تمہیں اسد بھائی نے نہیں بتایا؟''

''بھلا بتانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟'' ثروت نے لاتعلقی میں کہا۔ ''وہ جانتے ہیں کہ ان کے گھر والوں کو جس طرح ہم لوگوں سے دلچسپی نہیں، اسی طرح ہم لوگوں کو بھی ان سے کیا لینا دینا ہے؟ ہمارا بھلا کیا تعلق ان سے؟''

فروا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے ان لفظوں کا چناؤ کرتی رہی، جن کے ذریعے وہ اپنی دلی کیفیت بہن پر آشکار کر سکتی۔

''کیا بات ہے فروا؟'' اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے ثروت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تم کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہو۔''

''اس رات سرمد کی آواز سن کر، اس سے گھڑی بھر بات کر کے..... مجھے اپنا آپ بھی بدلا بدلا لگ رہا ہے۔'' فروا نے بغیر کسی تمہید کے اصل بات اُگل دی۔ ''سچ کہوں ثروت! سرمد کی آواز سن کر مجھ پر عجب کیفیت طاری ہو گئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' ثروت نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے کچھ پتہ نہیں، اس بات کا کیا مطلب ہے۔ مگر میری سماعت ہر پل وہ خمار آلود آواز سننے کی آرزومند ہے۔ میری آنکھیں اس انجانے اجنبی چہرے کو دیکھنا چاہتی ہیں۔''

''فروا! تجھے اس سے کہیں محبت تو نہیں ہو گئی؟'' ثروت نے حیران لہجہ میں پوچھا۔

''شاید۔'' فروا نے کھوئے کھوئے لہجہ میں سچائی کا اعتراف کیا۔ ''اس دیوانگی کا نام اگر محبت ہے تو شاید مجھے اس سے.....''

''ہائے بے چارے وجاہت خالو...... کیا اتنے ہی بدنصیب ہیں؟'' ثروت ماتھے پر ہاتھ مار کر بولی کہ ان کے دونوں بیٹے ان کی دشمن ندرت جہاں کی بیٹیوں کے ہاتھوں لگ جائیں۔''

''ابھی کہاں؟'' فروا مایوسی سے بولی۔ ''میں نے اسے اور اس نے مجھے کبھی دیکھا تک نہیں۔ بھلا ابھی سے محبت اور شادی کا ذکر کیا؟''

''دیکھنے کا کیا ہے؟'' ثروت جلدی سے بولی۔ ''آج اسد آئیں گے تو میں ان سے کہہ دوں گی کہ اگلی بار اپنے ساتھ سرمد کو بھی لیتے آئیں۔''

''اور جیسے وہ اُسے لے ہی آئیں گے۔'' فروا منہ بنا کر بولی۔

''ارے میں کہوں گی تو کیسے نہیں لائیں گے؟'' ثروت سینہ تان کر بولی۔ ''اور ایک بار وہ آ جائے تو تم دیکھو، میں کیسے گھیرتی ہوں اسے اپنی اکلوتی بہن کے لئے۔''

''سچ آپی!...... کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے؟'' فروا نے بے یقین لہجہ میں سوال کیا۔

''ہو کیوں نہیں سکتا؟'' ثروت پُر یقین لہجے میں بولی۔ ''اگر اسد مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں تو سرمد تم سے شادی کے لئے بھلا کیوں آمادہ نہ ہوگا۔''

''اسد بھائی کی بات اور ہے...... وہ بچپن سے اس گھر میں پلے بڑھے ہیں..... مگر سرمد.....'' فروا نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''پتہ نہیں وہ کیا سوچتے ہیں..... کیا پسند کرتے ہیں؟...... سنا ہے وہ بھی اپنی دادی اور باپ کی طرح ہم سب کو ناپسند کرتے ہیں۔''

''دیکھو! محبت کے اس کھیل میں سامنے والے کی نہیں، اپنی پسند کی اہمیت ہوتی ہے...... اور پھر ذرا سوچو..... وجاہت خالو کی بے تماشا دولت اسد کے ساتھ سرمد کے حصے میں بھی آئے گی۔ کوئی اور لڑکی اس کی دُلہن بن کر اس دولت پر عیش کرے...... اس سے بہتر نہیں ہے کہ میری بہن اس گھر کی دوسری بہو بنے...... مجھے حیرت ہے یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا؟''

''چلو، دیر آید درست آید۔'' فروا اس دوران پہلی بار مسکرائی۔ ''تمہاری باتوں نے تو مجھے بہت حوصلہ دیا ہے آپی!...... تم آج ذرا اسد بھائی سے اصرار کے ساتھ سرمد کو ساتھ لانے کے لئے کہنا۔''

''ہاں ضرور۔'' ثروت نے اثبات میں سر ہلایا۔

ندرت جہاں کمرے سے دونوں بہنوں کو باہم راز و نیاز کرتے دیکھ رہی تھیں۔ ثروت کے ساتھ ساتھ فروا بھی اب شادی کے لائق ہو گئی تھی۔ ثروت کے لئے تو خیر اسد کا رشتہ موجود تھا۔ مگر کافی دنوں سے اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ اسد نے اپنی دادی اور باپ سے ثروت سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور حسبِ توقع ان دونوں نے انکار کر دیا تھا۔ اسد کا اصرار دیکھ کر وجاہت مرزا نے تو اس گھر اور گھر والوں سے ناطہ توڑ کر چلے جانے کی دھمکی بھی دے دی تھی اور اسد اس کے بعد خاموش ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ ندرت جہاں کو اسد پر پورا بھروسہ تھا۔ مگر سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ جب سے اسلم احمد کو دل کا دورہ پڑا تھا، ندرت ثروت اور فروا کی طرف سے ایک دم سے فکرمند ہو گئی تھی۔ نہ صرف ثروت بلکہ فروا کے لئے بھی اب وہ متفکر تھی۔ اور آج اس نے سوچا تھا کہ اسد کے آنے کے بعد وہ اس سے اس کے فیصلے کے بارے میں بات کرے گی۔ اب وہ جلد از جلد ثروت کے فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتی تھی۔

فروا جب مگ اُٹھا کر کچن میں رکھنے گئی، تب ہی ڈور بیل بج اُٹھی تھی۔ فروا نے کچن کی کھڑکی سے جھانک کر گیٹ کی طرف دیکھا تھا۔ ثروت گیٹ کھول رہی تھی، اور اس کی توقع کے مطابق اسد مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔ اسد لمبے قد کے ایک خوبرو جوان تھے۔

'کیا سرمد بھی ایسے ہی ہوں گے؟' فروا نے کھوئے کھوئے انداز میں سوچا اور اسد کے لئے چائے کا پانی چولہے پر رکھنے لگی۔ اسد، ثروت سے علیک سلیک کے بعد خالہ خالو کو سلام کرنے اندرونی کمرے کی طرف چلے گئے تھے۔

''السلام علیکم!'' انہوں نے کمرے کے کھلے دروازے پر ہلکی سی دستک کے ساتھ اونچی آواز میں دونوں کو مشترکہ طور پر سلام کیا تھا۔

''جیتے رہو۔'' ندرت جہاں حسبِ معمول بھانجے کو دیکھ کر کھل اُٹھی تھی۔

''اب خالو جان کی طبیعت کیسی ہے؟'' اسد، اسلم احمد کی طرف متوجہ ہوئے۔
''اللہ کا کرم ہے۔'' اسلم احمد نے دھیمے قناعت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ تب ہی فروا ایک چھوٹی گول ٹرے میں چائے کے تین مگ دھرے کمرے میں چلی آئی تھی۔
''آداب اسد بھائی!'' آج اُس کے لہجہ میں مٹھاس تھا۔ ''آپ کو دیکھتے ہی میں نے چائے کا پانی رکھ دیا تھا۔''
''اوہ شکریہ......'' اسد بے اختیار مسکرا دیئے۔ ''میرا دل ابھی چائے پینے کو نہیں چاہ رہا۔'' اسلم احمد نے چائے کے مگ کو تھامنے سے انکار کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔
''تو چلئے آپ کے حصے کی چائے ہم پی لیتے ہیں۔'' فروا نے مسکرا کر چائے کا مگ تھام لیا۔
''آیئے اسد بھائی! ہم ورانڈے میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔''
''اسد! تم ذرا میرے ساتھ آؤ۔'' ندرت نے اُٹھتے ہوئے اس کو مخاطب کیا۔
''فروا! تم ذرا ثروت کے پاس جا کر بیٹھو۔ مجھے اسد سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' وہ اس کا ہاتھ تھامتے ساتھ والے کمرے میں چلی آئی تھی۔
''بیٹھو بیٹا!'' سامنے دھری کرسیوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے اسد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دوسری کرسی پر خود بیٹھ گئی۔
''فرمایئے خالہ جان؟'' ندرت کو خیالوں میں ڈوبے دیکھ کر آخر اسد نے خود ہی سوال کیا تھا۔
''اسد! تم اپنے خالو جان کی حالت تو دیکھ ہی رہے ہو۔'' ندرت نے بات کا آغاز کیا۔ ''کون جانے کب دوسرا دورہ پڑ جائے......اور خدانخواستہ وہ جان لیوا ثابت ہو۔''
''خدا نہ کرے۔'' اسد جلدی سے بولا۔ ''آپ ایسا کیوں سوچ رہی ہیں؟ خالو جان اِن شاء اللہ! جلد ہی بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔''
''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔'' ندرت نے دعائیہ انداز میں کہا۔ ''مگر بیٹا! اب میں ان کی طبیعت کے پیشِ نظر جلد از جلد ثروت کے فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتی ہوں۔ وہ ایک بیٹی کو تو اپنے ہاتھ سے رخصت کر دیں۔''
''جی......'' اس کا جھکا سر کچھ اور جھک گیا۔
''تم نے اس سلسلے میں کیا سوچا ہے؟'' اسد کو مسلسل خاموش دیکھ کر ندرت نے براہِ راست سوال کیا۔ ''تمہارے والد کا کیا ارادہ ہے؟''
''ان کا فیصلہ اور ارادہ تو سب پہلے ہی آپ کو بتا چکا ہوں۔'' اسد نے گہری سانس لی۔ ''وہ کسی بھی قیمت پر اس شادی پر آمادہ نہیں ہیں۔''
''تو ایسی صورت میں اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟'' ندرت نے سوالیہ نظروں سے اپنے وجیہہ و شکیل بھانجے کی طرف دیکھا۔
''ابا جان کا فیصلہ میرے ارادے کو متزلزل نہیں کر سکتا۔'' اسد نے پُرعزم لہجہ میں کہا۔ ''میں نے دو تین اداروں میں جاب کے لئے اپلائی کیا ہوا ہے۔ ایک دو جگہ سے تو انٹرویو لیٹر بھی آ گئے ہیں۔ جیسے ہی مجھے جاب ملی، میں گھر چھوڑ دوں گا۔''
''کیا مطلب؟'' ندرت واقعی بات نہیں سمجھی تھی۔ ''تم گھر کیوں چھوڑ دو گے؟''
''ابا جان نے ثروت سے شادی کی یہی قیمت رکھی ہے۔'' اسد دھیمے لہجے میں بولے۔ ''میں گھر چھوڑ کر کہیں کرائے کا گھر لے کر ثروت سے فوری طور پر شادی کر لوں گا۔''

''لو بتاؤ.....ایسے محل نما گھر کے ہوتے ہوئے تم کرائے کے مکان میں رہو گے؟'' ندرت کو اسد کے فیصلے سے دھچکا پہنچا تھا۔ وہ تو اپنی بیٹی کو ''وجاہت منزل'' میں راج کرتے دیکھنا چاہتی تھیں۔ اور یہ اسد تھے کہ وہ قصر چھوڑنے کی بات کر رہے تھے۔

''اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔'' اسد بے بسی سے بولا۔ ''ابا جان کسی بھی طور ثروت کو اپنی بہو کے روپ میں قبول کرنے اور اپنے گھر میں جگہ دینے کو تیار نہیں ہیں۔'' ندرت، وجاہت مرزا کی ضد سے واقف تھیں۔

''اب آپ ہی بتایئے، میں اور کیا کر سکتا ہوں؟'' ندرت کے پاس اسد کے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ اسد کے اس فیصلے سے گو کہ زیادہ خوش نہیں تھی، مگر اس کے لئے یہ بات تسکین آمیز تھی کہ اسد، ثروت کی خاطر گھر، والد اور دادی کو چھوڑنے پر آمادہ تھے۔ اور جہاں تک وجاہت مرزا کی کروڑوں کی جائیداد اور دولت اور محل نما ''وجاہت منزل'' کا تعلق تھا.....تو بہر حال ہر چیز میں اسد کا آدھا آدھا حصہ تھا۔ آج نہیں تو کل دولت و جائیداد کا آدھا حصہ بہر حال اسد کو ملنا ہی تھا۔

''تم جو کچھ مناسب سمجھ کرو۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ جو کچھ کرنا ہے، جلد کر لو۔ تمہارے خالو کی حالت تو تمہارے سامنے ہی ہے۔''

''جی۔ مجھے احساس ہے۔'' اسد جلدی سے بولے۔ ''آپ بالکل فکر نہ کریں۔ اِن شاء اللہ جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ارے بیٹا! تم دونوں باتوں میں لگ گئے......اور تمہاری چائے ٹھنڈی ہو گئی۔'' بالکل اچانک ہی ندرت جہاں کی نظر سامنے دھری چائے پر پڑی تھی۔ ''تم ٹھہرو، میں تمہارے لئے دوسری چائے بنواتی ہوں۔''

''ارے نہیں خالہ جان!......رہنے دیجئے۔'' اسد اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ''اب میں چلوں گا۔''

''ارے ایسے کیسے؟'' ندرت جہاں لاڈ بھرے لہجہ میں بولی۔ ''کھانا کھا کر جانا.....آج فروا تمہاری پسندیدہ ڈش بنا رہی ہے۔''

''نہیں خالہ جان! آج نہیں۔'' اسد معذرت خواہانہ لہجے میں بولے۔ ''آج میں ذرا جلدی میں ہوں۔ آپ پلیز میری معذرت قبول کر لیں۔''

''باہر جاؤ۔ وہاں ثروت سامنے بیٹھی ہے۔ جا کر اسی کو معذرت پیش کرو۔ اگر وہ قبول کر لے تو چلے جانا۔ ورنہ وہیں بیٹھ جانا۔'' ندرت ہنستے ہوئے بولی اور اسد مسکراتے ہوئے باہر ورانڈے میں نکل آئے۔

''آؤ بیٹھو۔'' ثروت نے سامنے دھری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''ثروت! آج میں ذرا جلدی میں ہوں۔'' اسد نے معذرت خواہانہ لہجہ میں بات کا آغاز کیا۔

''کیا مطلب؟......ذرا سی دیر بھی نہیں بیٹھو گے؟'' ثروت نے اپنی بڑی بڑی کجراری آنکھوں میں حیرت بھر کر سوال کیا۔ ''دو گھڑی تو بیٹھو۔''

''وہ دراصل......'' اسد نے تاویل پیش کرنی چاہی، مگر اس کی زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ وہ ثروت کی کسی بھی بات کو رد کرنے کا خود میں حوصلہ نہ رکھتے تھے۔ اسی لئے آہستگی سے سامنے دھری کرسی سے ٹِک گئے۔

''چائے پی لی؟'' ثروت نے مسکرا کر سوال کیا۔

''ٹھنڈی ہو گئی تھی.....اسی لئے.....''

''تو اس میں کیا ہے؟.....فروا دوسری بنا لائے گی۔'' روت نے اسد کا جملہ درمیان میں ہی اُچکتے ہوئے فروا کو آواز

دے کر دوسری چائے لانے کا آرڈر دے دیا تھا۔

''ارے بلاوجہ اس بے چاری کو کیوں تکلیف دے رہی ہو۔'' اسد جز بز ہوتے ہوئے بولی۔ ''اس وقت میرا چائے پینے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔''

''میرا تو ہے۔'' ثروت ناز بھرے انداز میں بولی۔ ''اسی بہانے آپ کے ساتھ ہم بھی چائے پی لیں گے۔''

''او کے بابا!'' اسد نے حسبِ عادت آخر کار ہتھیار ڈال دیئے۔

''سنا ہے سرمد انگلینڈ سے لوٹ آئے ہیں؟'' ثروت نے بات کا آغاز کیا۔

''ہاں! کافی دن ہوگئے۔'' اسد کا لہجہ بے حد سرسری تھا۔

''اب تو خاصے بڑے ہوگئے ہوں گے۔'' ثروت نے لہجے میں حسرت سمیٹتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔ ''بچپنے میں انہیں دیکھا تھا۔ اب تو ان کی صورت بھی یاد نہیں۔''

''یہ اچانک آج بیٹھے بٹھائے تمہیں سرمد کا خیال کیسے آ گیا؟'' اسد، ثروت کی فطرت سے واقف تھے، اس لئے قدرے حیرانی سے سوال کرنے لگے۔

''بس یونہی۔'' ثروت نے لاپروائی کے اظہار کے لئے کاندھے اُچکائے۔ ''تم ایک کام کیوں نہیں کرتے؟ اب کے جب یہاں آؤ تو سرمد کو بھی اپنے ساتھ لیتے آنا۔ ہم بھی اپنے دیور جی سے مل لیں گے۔'' سرمد کو ثروت کے ''دیور جی'' کہنے پر اسد بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔ اگر چند سال پہلے ثروت یہ فرمائش کرتی تو وہ شاید منع کر دیتے، مگر اب جب سے سرمد پردیس سے واپس لوٹے تھے، خاصے بدلے ہوئے لگنے لگے تھے۔ اسی لئے اسد نے انہیں ساتھ لانے کی حامی بھر لی تھی۔ فروا نے سنا تو اس کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا۔

''کب لانے کو کہا ہے؟'' اس نے بے تابانہ سوال کیا تھا۔

''اب دیکھو۔'' ثروت نے جواب دیا۔ ''کہہ رہے تھے کہ کل شام کو آئے تو سرمد کو بھی ساتھ لیتے آئیں گے۔''

''سچ......؟'' فروا کا دل ایک نئے انداز سے دھڑک رہا تھا۔

⊛===⊛===⊛

ڈائریکٹر ایس رحمان نئے پروڈیوسر کلیم اللہ کو مہکار اور گلبہار کے حوالے کر کے چلا گیا تھا۔ اس کی دولت کی تفصیلات سے متاثر ہونے کے بعد گلبہار کے ساتھ مہکار کی بھی اس سے دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ اور وہ خود بھی مہکار کی مہکتی شخصیت سے متاثر ہوا تھا۔ ابھی بات شروع ہی ہوئی تھی کہ بیرونی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ گلبہار کو ڈور بیل سے چڑ تھی۔ وہ کہتی تھی، پانچ کمروں کے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں بیل کی آواز گونجتی ہے تو لگتا ہے پورا فلور لرز اٹھا ہے۔ اسی لئے اس نے داخلی دروازے پر پیتل کا ایک بے حد دیدہ زیب نوک ناب لگوایا تھا، جسے ہلانے سے دستک کی مسحور کن سی آواز پیدا ہوتی تھی، جو کانوں کو بھلی لگتی تھی۔ دستک کی آواز پر گلبہار اور مہکار نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ پھر مہکار نے طبلچی طیفے کو ایک خاص اشارے سے دروازہ کھولنے کے لئے روانہ کر دیا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی طیفہ گڑبڑا گیا تھا۔ سامنے رشید کھڑا تھا۔

''جی......وہ......آپ......جی السلام علیکم!''

''ارے بھئی! راستہ چھوڑو۔ یہ کیا ہے دروازہ روک کر کھڑے ہو۔'' رشید نے قدرے ناگواری سے اسے ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے کہا اور وہ جلدی سے ایک طرف ہوتے ہوئے بولا۔

''آیئے......آیئے سرکار!......لاؤنج میں تشریف لے چلئے......اُدھر ڈرائنگ روم کی صفائی ہو رہی ہے۔ پردے

تبدیل کیے جا رہے ہیں۔"

"اوہ اچھا۔" رشید ڈرائنگ روم کی طرف بڑھتے ہوئے لاؤنج کی طرف پلٹ گیا۔ "چھوٹی بی بی کہاں ہیں؟" رشید نے مہکار کے بارے میں پوچھا تھا۔

"وہ..... تو..... جی شاید باتھ روم میں ہیں..... غسل کر رہی ہیں۔ میں بڑی بی بی کو بلاتا ہوں۔ آپ تشریف رکھیے۔" کمرے سے نکلتے وقت وہ دروازہ بھیڑنا نہیں بھولا تھا۔ ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر رک کر اس نے ہلکی سی آہٹ پیدا کر کے گلبہار کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور اشارے سے رشید کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ رشید کی آمد کی خبر سن کر گلبہار گو کہ پریشان ہوگئی تھی مگر اس نے اپنے کسی بھی انداز سے اپنی پریشانی کا اظہار نہ ہونے دیا تھا اور مسکراتے ہوئے کلیم اللہ کو مخاطب کر کے بولی تھی۔

"لو جی..... آپ دونوں باتیں کریں۔ میں ذرا آپ کے لئے چائے پانی کا انتظام کرتی ہوں۔ بلکہ میں تو کہہ رہی ہوں، اب رات ہونے میں دیر ہی کتنی ہے۔ آپ ہمارے ساتھ رات کا کھانا کھا کر ہی جائیے گا۔"

"ارے! آپ اس تکلیف میں نہ پڑیں۔ کھانا ہی کھانا ہوگا تو ہم سب کہیں باہر چل کر کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانا کھالیں گے۔" کلیم اللہ اُس کی بات سن کر مشکور لہجہ میں بولا۔

"چلیں بھئی! جیسا آپ کا حکم۔" گلبہار شہد بھرے لہجے میں بولی۔ "ہم تو آپ کے حکم کے بندے ہیں۔ پر چائے تو آپ کو پینی ہی پڑے گی۔" وہ اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ "میں ابھی آپ کے لئے چائے بھجواتی ہوں۔" وہ تیزی سے کمرے سے باہر آ گئی۔

"اب بتا مرن جوگے!..... کن آیا ہے؟" اس نے دانت پیستے ہوئے دبی آواز میں طیفے سے سوال کیا۔

"وہ..... رشید....." طیفے نے ہاتھ پیچھے کی طرف کر کے لاؤنج کی طرف اشارہ کیا۔ "میں نے اسے لاؤنج میں بٹھا دیا ہے۔ کہا کہ ڈرائنگ روم کے پردے تبدیل کیے جا رہے ہیں، صفائی ہو رہی ہے۔"

"یہ تو اچھا کیا تُو نے۔" گلبہار نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ "پر تُو نے اُسے اندر بلایا ہی کیوں؟ باہر کے باہر رخصت کر دیتا..... کہہ دینا تھا کہ دونوں بیبیاں بازار گئی ہیں۔" گلبہار دھیمے لہجے میں کہتی لاؤنج کی طرف بڑھی۔ "چرس کی لت نے تیرا دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔" کچھ دیر پہلے کی تعریف کو بھول کر وہ غصیلے انداز میں بڑبڑاتی ہوئی لاؤنج کی طرف چلی۔ گلبہار بیگم جب لاؤنج میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ رشید ابھی تک کھڑا تھا۔

"لو جی..... آپ سرکار آئے ہیں۔" گلبہار اپنا لہجہ بدلتے ہوئے خوش دلی سے بولی۔ چند لمحے قبل طیفے کو صلواتیں سناتے وقت اس کے لہجے میں جس قدر کڑواہٹ تھی، اس پل اسی قدر شیرینی تھی۔ "سو بسم اللہ۔ ادھر کیوں رُک گئے؟..... اندر آ جانا تھا۔"

"وہ طیفا بولا کہ ادھر کچھ صفائی وغیرہ چل رہی ہے۔"

"ہاں! اُدھر کچھ ایسا ہی چل رہا ہے..... مٹی پاؤ..... آپ اِدھر ہی رُکیں۔ ارے آپ کھڑے کیوں ہیں؟ تشریف رکھیے نا۔"

"وہ..... مہک.....؟" رشید نے صوفے پر ٹکتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ تو ذرا ڈاکٹر کی طرف گئی ہے۔ کئی دن سے سر میں درد کی شکیت (شکایت) کر رہی تھی۔ میں بولی کہ آج جا کر دکھا آ ڈاکٹر کو۔"

"اچھا..... رشید حیران ہوا۔ "پر وہ طیفا تو کہہ رہا تھا کہ شاید وہ غسل کر رہی ہے۔"

''ارے آپ طیفے کی تو بہت ہی نہ کریں جی۔'' گلبہار سٹپٹا کر بولی۔ ''جانتے تو ہیں، چرس کے نشے نے اس کی مت مار چھوڑی ہے۔ رات دن پینگ میں پڑا رہتا ہے...... موالی کہیں کا۔'' وہ بن کر ہنسی۔

''مہک کب تک واپس آئے گی؟'' رشید کے لہجے میں مایوسی ٹپک رہی تھی۔

''آپ تشریف رکھیں...... وہ بھی آ جائے گی۔ دراصل وہ ہمارے پرانے محلے کے ڈاکٹر کو دکھاتی ہے۔ بڑی شفا ہے جی اس ڈاکٹر کے ہاتھ میں۔ بے شک جانے آنے میں دو اڑھائی گھنٹے لگ جاتے ہیں مگر...... ایک چکر میں ہی بیماری غائب ہو جاتی ہے۔''

''راستے میں دو اڑھائی گھنٹے لگیں گے؟'' رشید نے سوال کیا۔

''اُدھر رش بھی تو ہوتا ہے۔ گھنٹہ ڈیڑھ تو اُدھر بھی لگتا ہے۔ خیر آپ فکر نہ کریں۔ دس ایک تک وہ ضرور لوٹ آئے گی۔''

''نہیں...... دس بجے تک تو میں نہیں رک سکوں گا۔'' رشید ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ ''دیکھیں، وقت نکال کر اس کی عیادت کو آ سکا تو دوبارہ آ جاؤں گا۔''

''سو بسم اللہ!'' گلبہار بھی جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''آپ کا گھر ہے، جب دل چاہے تب آئیں۔ سو بار آئیں۔ آپ اس کی عیادت کو آئیں گے تو آپ کے پھول اور گفٹ دیکھ کر تو وہ ویسے بھی کھل اُٹھے گی۔ آپ کو دیکھتے ہی بھلی چنگی ہو جائے گی۔'' گلبہار کو رشید کی پتلی ہوتی مالی حالت کا خوب اندازہ تھا۔ اسی لئے اس نے گفٹ کا ذکر کیا تھا تاکہ نہ وہ گفٹ خرید سکے گا اور نہ ہی دوبارہ آئے گا۔

''اچھا تو میں چلتا ہوں۔'' گلبہار کے پھل اور گفٹ کے تذکرے نے رشید کے منہ کا ذائقہ خراب کر دیا تھا۔ وہ گلبہار کی لالچی طبیعت سے سخت عاجز تھا۔ ان دونوں نے مل کر اسے تقریباً کنگال کر دیا تھا۔ اس کے باوجود ان کی فرمائشوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ بلکہ اب تو اکثر گلبہار کے لہجہ میں خاصی رُکھائی بھی جھلکنے لگی تھی۔ آج کئی دنوں بعد وہ اس سے اتنے شیریں لہجے میں گویا ہوئی تھی۔ وہ اُس کے لہجہ کی مٹھاس کی وجہ پر غور کرتا داخلی دروازے سے باہر نکل گیا۔ گلبہار کے اشارے پر طیفے نے لپک کر دروازہ بند کر لیا تھا۔

جب سے رشید کی مالی پوزیشن کمزور ہونی شروع ہوئی تھی، گلبہار اور مہکار کی اس میں دلچسپی کم ہوتی جا رہی تھی۔ فلیٹ کا معاملہ نہ ہوتا تو انہوں نے کب کا اسے باہر کا راستہ دکھا دیا ہوتا۔ مگر ابھی اس فلیٹ کا قبضہ نہیں ملا تھا، جسے رشید نے مہکار کے نام سے اپنے ایک پروجیکٹ میں بک کیا تھا۔ رشید، مہکار کے گھر سے نکل کر اپنے گھر کی طرف چل دیا تھا جہاں اس وقت اس کی ماں سلطانہ، یونس لاکھانی کو شیشے میں اُتارنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی اور نہایت ہوشیاری سے اس نے لاکھانی سے مہکار کا نام اُگلوا لیا تھا۔

''اچھا! تو آج کل رشید کا مہکار کے ساتھ چکر چل رہا ہے۔'' سلطانہ نے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے لاکھانی کی طرف دیکھا۔ ''کون ہے یہ؟''

''اماں جی! آپ میرے سے قسم لے لو...... جو میں اسے جانتا ہوں..... بس دو چار بار رسید بھائی کھود ہی مجھے اس سے ملوانے لے گئے تھے۔''

''کیسی ہے؟'' سلطانہ نے دوسرا سوال کیا۔

''کون؟...... مہکار؟'' لاکھانی سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ارے اماں جی! پری کی مافک کھوبصورت ہے۔ کسی فلمی ہیروئن کی مافک چیخ مٹخ والی ہے۔''

''اچھا......'' سلطانہ نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔ ''تو کیا رشید سے شادی کے خواب دیکھ رہی ہے؟......میرا مطلب ہے کہ کیا رشید سے شادی کے چکر میں ہے؟''

''جہاں تک میں اسے جانتا ہوں، ہرگز بھی نہیں۔'' لاکھانی نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ تو فلموں میں ہیروئن بننا چاہتی ہے۔ بھلا رسید بھائی کی وائف کیوں بنے گی؟''

''اوہ اچھا......'' لاکھانی کے جواب سے سلطانہ کو یک گونہ اطمینان ملا تھا۔ پھر بھی مزید تشفی کے لئے بولی۔ ''اور رشید؟......رشید کیا چاہتا ہے؟''

''ہاں! رسید بھائی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔'' سلطانہ کے مطمئن انداز میں سانس لینے پر لاکھانی نے فوری طور پر پینترا بدلا تھا۔

''ابھی میں کیا بولوں......یہ ہو بھی سکتا ہے کہ رسید بھائی اُس سے سادی کر لیوے۔''

''ہیں؟......ابھی تو تُو کہہ رہا تھا کہ وہ رشید سے شادی نہیں کرے گی۔'' سلطانہ بے چینی سے بولی۔ ''وہ نہیں کرے گی تو رشید کیا زبردستی اس سے شادی کرے گا؟''

''ہاں! یہ تو ہے۔'' لاکھانی سٹپٹا کر سر کھجانے لگا۔ ''مگر ماں جی! اس سلسلے میں حتمی طور پر تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہ تو پھر ہے کہ رسید بھائی اسے بہت لائک کرتے ہیں۔'' سلطانہ کا چند لمحوں قبل والا اطمینان ہوا ہو چکا تھا۔ ایک چیخ مٹخ والی پری جیسی ہیروئن نما بہو کے تصور سے ہی اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

''لاکھانی! تُو میرا ایک کام کرے گا؟'' کچھ دیر گہری سوچ میں غرق رہنے کے بعد اس نے پُرسوچ انداز میں لاکھانی کو مخاطب کیا۔

''جی ماں جی! حکم کرو۔'' لاکھانی میکانکی انداز میں بولا۔

''میں چاہتا ہوں، رشید کا اس عورت سے یہ چکر ختم ہو جائے۔''

''مگر ماں جی......'' لاکھانی نے کچھ کہنا چاہا مگر سلطانہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

''اگر مگر کچھ نہیں۔ تجھے میری خاطر کام کرنا ہوگا۔ اور اس کے لئے میں تجھے انعام بھی دوں گی۔''

''انعام......؟'' لاکھانی کی بجھی ہوئی آنکھوں میں یکا یک چمک جاگ اُٹھی۔

''دس، بیس، پچاس......جتنا تُو کہے گا......میں تجھے روپے دوں گی۔ مگر......''

''مگر کیا ماں جی!......رسید بھائی میرے لئے بھائی جیسے ہیں۔ اس ناطے آپ بھی میری ماں ہوئی۔ میں آپ کے لئے کیا اتنا سا کام بھی نہیں کروں گا؟'' لاکھانی فوری طور پر تیار ہو گیا تھا۔

مہکار کے نام فلیٹ والی بات کے کھلنے سے لاکھانی سخت بددل ہوا تھا۔ گو کہ گلبہار نے معاملہ رفع دفع کر دیا تھا مگر لاکھانی کا دل صاف نہیں ہوا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اس کام کے لئے فوراً ہی تیار ہو گیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ آج گلبہار کے لہجے سے وہ بھانپ گیا تھا کہ رشید کی مالی پوزیشن اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ جلد ہی وہ اسے لات مار کر رخصت کرنے والی تھی۔ اگر وہ خود سے ایسا نہ بھی کرتی تو مہکار کے پہلو میں کسی اور لکھ پتی سیٹھ کو بیٹھے دیکھ کر رشید خود ہی اس دروازے کو لعنت بھیج دے گا۔ ہر دو صورت میں رزلٹ وہی آتا جو سلطانہ چاہ رہی تھی۔ تو اس مسئلے کے حل کے لئے اسے کچھ بھی نہ کرنا پڑتا اور وہ آسانی سے سلطانہ سے چند ہزار روپے کھینچنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ حالانکہ اسے اندازہ تھا کہ سلطانہ جیسی کائیاں عورت سے روپیہ نکلوانا کچھ آسان نہ ہوگا مگر وہ اپنی صلاحیتوں سے بھی خوب واقف تھا۔ سو اُس نے اس ڈیل کی حامی بھر لی تھی۔

''لو ماں جی! اب اجازت؟'' کچھ دیر بعد اس نے اجازت طلب نظروں سے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ ''میں اصل میں ایک کام سے رسید بھائی کے پاس آیا تھا۔ مگر ان کا تو اب تک کوئی پتہ ہی نہیں ہے۔ اس لئے......اب میں چلتا ہوں۔''

''اچھا'' سلطانہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''لیکن دیکھو! میں نے تم سے جو کام کہا ہے۔''

''ارے ماں جی! آپ اس کام کی پھکر ہی نہ کریں۔ اب سب کچھ اپنے اس بیٹے پر چھوڑ دیں۔''

''مگر تم کرو گے کیا؟'' سلطانہ نے متجسس لہجہ میں سوال کیا۔

''ابھی میں اگر جلدی میں نہیں ہوتا تو آپ کو جرور بتاتا......میں نے ایسے فنٹاسٹک ترکیب سوچی ہے کہ بس......''

''اچھا'' سلطانہ کی عیار آنکھوں میں دلچسپی بھری چمک جاگی۔ ''کچھ مجھے بھی تو بتا۔ آخر تُو نے سوچا کیا ہے؟''

''نہیں ماں جی! ابھی میرے کو جانا ہوگا۔'' لاکھانی بے بسی سے بولا۔ ''آج آدھا مہینہ گزر گیا۔ پر میں اب تک اپنے فلیٹ کا کرایہ نہیں دے سکا۔ اسی کے لئے رسید بھائی کے پاس آیا تھا......مگر......'' سلطانہ اس کی بات کا مطلب سمجھنے کے باوجود انجان بنتے ہوئے بولی۔

''ارے تو کیا تُو کرائے کے فلیٹ میں رہتا ہے؟......دیکھ میں آج ہی رشید سے کہہ کر تیرے لئے ایک فلیٹ بُک کرواتی ہوں۔''

''سکریہ ماں جی!'' لاکھانی ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''مگر جب فلیٹ بُک ہوگا، دیکھا جائے گا۔ میرے کو پانچ ہجار کی ابھی جرورت ہے۔''

''پانچ ہزار؟'' سلطانہ نے اتنے زور سے کہا کہ لاکھانی اُچھل پڑا۔ لحہ بھر کو تو اسے گمان ہوا کہ کہیں غلطی سے اس نے پانچ کی جگہ پچاس ہزار تو نہیں کہہ دیئے۔ ''پانچ ہزار کے کرائے کے فلیٹ میں رہتا ہے تُو؟''

''ارے ماں جی! یہ کراچی ہے۔ اِدھر دو کمروں کے فلیٹ کا کرایہ بھی اب دس ہجار سے کم نہیں ہے۔ میں تو پہلے سے اسی فلیٹ میں رہ رہا ہوں، اسی لئے مالک نے میرے ساتھ تھوڑی رعایت کی ہوئی ہے۔'' لحظہ بھر کو رک کر اس نے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ ''اب تھوڑا احسان آپ بھی کر دو۔'' سلطانہ کو لیت ولعل اور تجاہل عارفانہ برتتے دیکھ کر اس نے براہِ راست سوال کر ڈالا تھا۔ ''ماں جی! اگر آپ انعام کی پہلی قسط کے طور پر اگر اس گریب کو پانچ ہجار روپے دے دیں تو......بڑی کرم نوازی ہوگی۔''

''دیکھ بھئی لاکھانی!'' سلطانہ کو کام کے آغاز میں ہی منہ پھاڑ کر لاکھانی کا پیسوں کا تقاضا ناگوار گزرا تھا۔

''میں مافی چاہتا ہوں ماں جی......مگر آپ نے نہیں دیئے تو مجبوراً مجھے مہکارسے......''

''اچھا دیکھتی ہوں۔'' سلطانہ بادل نخواستہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور لاکھانی کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

❀===❀===❀
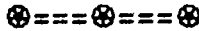
اظفر اور سرمد کا بھی رزلٹ آ گیا تھا۔ دونوں نے بھی شاندار نمبروں کے ساتھ کامیابی حاصل کی تھی۔ عاتکہ بیگم کے ساتھ وجاہت مرزا بھی اس خبر سے نہال ہو اُٹھے تھے۔ پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اظفر نے سرمد کو ہی نہیں، عاتکہ بیگم اور نگینا کو بھی مبارکباد دی تھی۔ جبکہ عالم تاب صاحب نے وجاہت مرزا کو فون پر بیٹے کی شاندار کامیابی کی مبارکباد دی تھی۔ دانیال نے بھی سرمد کو فون کیا تھا۔

''دوست! کامیابی مبارک ہو۔''

''بہت بہت شکریہ۔'' سرمد نے مشکور لہجہ میں جواب دیا۔

''اب آگے کیا پروگرام ہے؟'' دانیال نے پوچھا تھا۔
''ابا جان کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ آگے بھی یہی سلسلہ چلے گا۔''
''ارے تو ایم ایس کرنے نہیں آ رہے؟'' دانیال کے لہجہ میں حیرت بڑی نمایاں تھی۔
''آج کل ابا جان کی طبیعت کچھ زیادہ ٹھیک نہیں رہتی۔'' سرمد نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ''اتنے بڑے کاروبار کو سنبھالنا اب ان اکیلے کے بس کی بات نہیں رہی۔ اسی لئے فی الحال میں نے ملک سے باہر جانے کا ارادہ کینسل کر دیا ہے۔ ایم ایس کا پروگرام بنا تو یہیں سے کر لوں گا۔ اپنے ملک میں بھی بہت اچھی یونیورسٹیز موجود ہیں۔''
''ہاں! وہ تو ہے۔'' دانیال نے بحث سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''اور سب کیسا چل رہا ہے؟''
''اللہ کا کرم ہے۔'' سرمد نے ہموار لہجے میں جواب دیا۔ ''تم سناؤ، تمہاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟''
''Excellent'' دانیال نے جواب دیا۔ ''تم بہت یاد آتے ہو۔ پڑھنے نہ سہی، ویسے ہی کبھی ملنے چلے آؤ۔''
''یہی بات تو میں تمہیں ابھی کہنے والا تھا۔'' سرمد مسکرائے۔ ''کچھ دنوں کے لئے تم یہاں آ جاؤ۔ سچ، اماں بی تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔''
''یقیناً مجھے بھی ان سے، انکل وجاہت سے اور اسد بھائی سے مل کر بے حد خوشی ہو گی۔ مگر فوری طور پر تو آنا ممکن نہیں ہو گا۔ اگلے ہفتے سے ایگزامز ہو رہے ہیں۔ لیکن میری خواہش ہے کہ کم از کم ایک بار اپنے وطن، اپنے شہر کو ضرور دیکھنے آؤں گا۔''
''مجھے اس وقت کا انتظار رہے گا۔'' سرمد نے جواب دیا اور خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔
نکیتا نے عاتکہ بیگم کے کمرے کے سامنے ٹیرس پر دھری میز پر چائے لگا دی تھی۔ عاتکہ بیگم کے باہر آتے ہی سرمد بھی دادی کے پاس جا بیٹھے تھے۔
''اماں بی! سرمد بھیا کے پاس ہونے کی خوشی میں ایک اچھی سی پارٹی ہونی چاہئے۔'' نکیتا نے خوشی سے لبریز آواز میں مشورہ دیا۔
''ہاں کیوں نہیں۔'' ٹیرس کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے وجاہت مرزا کے کانوں تک نکیتا کی خواہش پہنچ چکی تھی، چنانچہ وہ وہیں سے جواب دیتے ہوئے ماں اور بیٹے کی طرف بڑھے۔ ''بھئی! ہمیں نکیتا کے مشورے سے صد فیصد اتفاق ہے۔ کیوں اماں بی؟'' انہوں نے تائید طلب نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔
''بھئی جیسی تم سب کی مرضی۔'' عاتکہ بیگم مسکرا کر بولیں۔ ''مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ برسوں بعد اس گھر میں خوشی کا یہ موقع آیا ہے۔''
''اب انشاء اللہ اور مواقع بھی آئیں گے۔'' باورچی زکریا ایک چھوٹی ڈش میں گرما گرم گلاب جامن لئے میز کی طرف بڑھتا ہوا گویا ہوا تھا۔ ''اب اسد میاں کی، پھر سرمد میاں کی شادی ہو گی۔ شہنائی بجے گی...... بارات سجے گی...... خوشیاں ہی خوشیاں......''
''ارے یہ گلاب جامن کہاں سے اُٹھا لائے؟'' اسد کی شادی کے ذکر کے ساتھ ہی وجاہت مرزا کو ندرت جہاں اور ثروت کا خیال آ گیا تھا۔ اور اس خیال کے آتے ہی ان کے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا تھا۔
''اُٹھا لائے کیا مطلب؟'' زکریا قدرے برا مان کر بولا۔ ''سرمد میاں کے پاس ہونے کے موقع پر یہ گرما گرم گلاب جامن خود ہم نے بنائے ہیں۔ آپ منہ میٹھا کیجئے۔''
''ہاں ہاں...... میں ذکر کرنا بھول گئی۔ زکریا بہت ہی عمدہ گلاب جامن بناتا ہے۔'' عاتکہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ ''لو

سرمد بیٹا! تم بھی کھا کر دیکھو۔"
"جی بہتر۔" سرمد نے جلدی سے جواب دیا اور نگینا چھوٹی پلیٹوں میں سب کے لئے گلاب جامن نکالنے لگی۔
"واقعی بہت عمدہ ہیں۔" وجاہت مرزا منہ میں گلاب جامن رکھتے ہی خوش دلی سے بولے۔ گلاب جامن کی مٹھاس نے چند لمحوں قبل ان کے منہ میں گھلی کڑواہٹ کو مٹا دیا تھا۔
"لو بھئی! ہماری طرف سے یہ انعام لو۔" وجاہت مرزا نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کافی نوٹ نکال کر زکریا کی طرف بڑھائے، جسے اس نے لپک کر تھامتے ہوئے مسرور لہجے میں کہا۔
"شکریہ سرکار!......بہت بہت شکریہ۔"
"اسد بھائی کیا اس وقت گھر میں نہیں ہیں؟" اسد کو بے ساختہ بھائی کی یاد آ گئی تھی۔
"دوپہر میں تو گھر آئے تھے۔" نگینا نے اسد کے کمرے کی طرف دور سے نگاہ ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ "دیکھوں ان کے کمرے میں......"
"نہیں، رہنے دو۔" سرمد کے جواب سے پہلے ہی وجاہت مرزا نے جواب دیا تھا۔ سرمد کو باپ کا رُوکھا سا لہجہ بڑا عجیب لگا تھا۔ وہ جب سے آئے تھے، اسد اور وجاہت مرزا کے درمیان ایک غیر محسوس سا تناؤ محسوس کر رہے تھے۔ عاتکہ بیگم بھی اکثر کھوئی کھوئی اور پریشان سی دکھائی دیتی تھیں۔ مگر ان کے پوچھنے کے باوجود آج تک کبھی انہوں نے کوئی واضح جواب نہیں دیا تھا۔ چائے کے بعد وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے تھے۔ کمرے میں جا کر وہ کمپیوٹر آن کر کے بیٹھ گئے تھے۔ دوسری جانب اظفر اور دانیال آن لائن تھے۔ وہ ان سے چیٹنگ میں مصروف ہو گئے تھے۔
"اب آگے کیا سوچا ہے؟" اظفر کا سوال تھا۔
"تم سناؤ۔" جواب کے بجائے سرمد نے سوال کیا تھا۔
"میں تو فری کو راضی کرنے میں لگا ہوا ہوں کہ کالج کا ارادہ چھوڑ کر یہاں آ جائے۔" اظفر نے جواب دیا۔
"اچھا......کالج میں داخلہ لے رہی ہیں؟" سرمد نے یونہی سوال کر لیا۔
"میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ اے ون گریڈ سے پاس ہوئی ہیں۔"
"آں ہاں...... یاد آیا......" سرمد جلدی سے بولے۔
"فریال جو پاس ہوئیں، سو ہوئیں......مگر ان کی دوست نے تو پالا ہی مار لیا۔" اظفر فخریہ لہجے میں بولے۔ "جانتے ہو پوزیشن لی ہے اس نے۔ اور وہ بھی فرسٹ پوزیشن۔"
"کس نے؟" سرمد واقعی سمجھ نہیں سکے تھے۔
"ارے بھول گئے کیا؟" اظفر اچنبھے سے بولے۔ "میں فریال کی دوست نمرہ کی بات کر رہا ہوں۔ ارے وہی لڑکی، سیڑھیوں کے پاس جس سے تم ٹکرا گئے تھے۔" اظفر کی ہنستی ہوئی آواز میں ہلکی سی شرارت بھی گھلی ہوئی تھی۔
"اوہ......اچھا......" سرمد کو اچانک ہی وہ واقعہ یاد آ گیا اور وہ معصوم اور دلکش چہرہ بے اختیارانہ نگاہوں میں گھوم گیا تھا۔
"جانتے ہو، وہ بعد میں فریال سے تمہارے بارے میں پوچھ رہی تھی۔" انہیں پُر خیال انداز میں خاموش ہوتے دیکھ کر اظفر نے مزید بات آگے بڑھائی۔ "خیر! اس میں اس کا کچھ ایسا قصور بھی نہیں ہے۔ تم ہو ہی ایسے کہ......کوئی بھی لڑکی تمہیں دیکھے گی تو سوچے گی ضرور۔"
"اظفر! تمہاری یہ فضول عادت کبھی جائے گی نہیں......ہے نا؟" سرمد کسمسا کر بولے۔ اور بالکل اچانک ہی ایک حیرت انگیز خیال ان کے ذہن میں آیا تھا۔

''کیا واقعی وہ اجنبی، انجان لڑکی ان کے بارے میں سوچتی ہوگی؟'

''کیا سوچنے لگے؟'' انہیں خاموش پا کر اظفر نے سوال کیا۔ تب ہی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی اور اظفر نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ سیاہ پینٹ اور لائٹ پنک شرٹ میں اپنی تمام تر وجاہتوں سمیت اسد اُدھ کھلے دروازے میں کھڑے تھے۔

''اسد بھائی!'' سرمد بے اختیار کھڑے ہو گئے۔ آیئے آیئے''

''تمہارا دروازہ کھلا دیکھا تو اس طرف چلا آیا'' اسد کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔

''بھئی بہت بہت مبارک ہو۔'' انہوں نے بازو پھیلائے اور سرمد آگے بڑھ کر ان کے کھلے بازوؤں میں سما گئے۔

''آپ کو بھی مبارک ہو''

''مجھے تو ابھی نکیتا نے بتایا۔ سچ بہت خوشی ہوئی۔'' وہ سرمد سے الگ ہوتے ہوئے بتا رہے تھے۔

''میرا خیال تھا کہ اماں بی نے آپ کو بتا دیا ہوگا۔'' سرمد نے جواب دیا اور بیٹھ گئے۔

''مصروف ہو کیا؟'' اسد سرمد کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کمپیوٹر کی طرف جھانکتے ہوئے بولے۔

''نہیں۔ بس ذرا اظفر سے بات ہو رہی تھی۔'' سرمد نے جواب دیا اور آہستگی سے کمپیوٹر آف کر دیا۔

''اچھا تو اگر کوئی خاص مصروفیت نہیں ہے...... تو چلو، ہم تمہیں ایک جگہ گھمانے لے چلتے ہیں۔'' اسد نے بازو پھیلا کر فراخدلانہ انداز میں آفر کی۔ ''اسے تم اپنے رزلٹ کا گفٹ کہہ سکتے ہو۔'' اسد معنی خیز انداز میں مسکرائے۔

''اچھا......'' سرمد کے تجسس میں دلچسپی بے حد نمایاں تھی۔ ''تو چلئے۔'' وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''پوچھو گے نہیں کہاں؟'' اسد کو اُن کے یوں غیر مشروط طور پر رضامند ہو جانے پر حیرت ہوئی تھی۔

''نہیں۔'' سرمد پُر اعتماد انداز میں مسکرائے۔ ''آپ کے ڈسپوزل پر ہوں۔ جہاں چاہیں لے چلئے۔''

''او کے۔'' اسد کندھے اُچکا کر مسکرائے۔ ''تو آؤ۔'' وہ سرمد کو ساتھ لئے راہداری سے نکلتے پچھلی جانب سے پورچ کی طرف بڑھ گئے تھے۔ سامنے کی جانب سے آتے ہوئے انہیں خدشہ تھا کہ راستے میں وجاہت مرزا یا عاتکہ بیگم نہ ٹکرا جائیں۔ اس لئے وہ سرمد کو لئے پچھلی جانب سے اپنی گاڑی تک چلے آئے تھے۔ خانو بابا نے انہیں دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا تھا اور وہ گاڑی گیٹ سے نکالتے چلے گئے تھے۔ گاڑی کلفٹن سے نکل کر مختلف راستوں سے ہوتی نارتھ ناظم آباد کے علاقے میں داخل ہو گئی تھی۔ سرمد کے لئے یہ سارے راستے غیر مانوس اور اجنبی سے تھے۔ وہ اس جانب اس سے پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ اس کے باوجود وہ خاموش بیٹھے دلچسپی سے باہر کی جانب دیکھتے رہے تھے۔ اسد سے کسی بھی طرح کا کوئی سوال کرنے کی انہوں نے ضرورت نہ محسوس کی تھی۔ گاڑی مختلف گلیوں سے گزرتی آخر ندرت جہاں کے گیٹ پر آ رُکی تھی۔

''اُترو......'' اسد نے گاڑی بند کرتے ہوئے سرمد سے کہا اور ان کے باہر نکلتے ہی خود بھی گاڑی سے باہر آ گئے۔ سرمد سیاہ رنگ کے گیٹ کے دائیں جانب ایستادہ زرد اسٹون کے پلر پر لگی نیم پلیٹ کو غور سے پڑھ رہے تھے، جس پر ''اسلم احمد'' کا نام جلی حروف میں جگمگا رہا تھا۔ اسد نے آگے بڑھ کر نیم پلیٹ کے نیچے لگا ڈور بیل کا بٹن دبایا تھا۔ گھر کی اندرونی جانب کہیں گھنٹی کی تیز آواز گونجی تھی اور چند ہی لمحوں بعد گیٹ کے اس پار قدموں کی آہٹیں جاگی تھیں جو گیٹ کے قریب آ کر تھم گئی تھیں۔

''کون......؟'' اندر سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

''فروا! گیٹ کھولو۔ میں اسد ہوں۔'' اسد نے نسبتاً اونچی آواز میں جواب دیا اور اگلے ہی لمحے گیٹ کھل گیا۔ سامنے

گہرے نیلے رنگ کے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس فروا کھڑی تھی۔ اس کی نظریں اسد سے ہوتی ان کے پیچھے کھڑے سرمد پر جا ٹھہری تھیں۔

'ہو نہ ہو، یہ سرمد ہے۔' اس کے دل نے سرگوشی کی تھی اور بے اختیارانہ اس کا دل دھڑک اُٹھا تھا۔

''السلام علیکم!'' اس نے نروس سے انداز میں اسد کو سلام کیا۔

''جیتی رہو۔'' اسد بزرگانہ انداز میں مسکرائے۔ ''اب اندر بھی آنے دو گی یا یونہی گیٹ کے بیچ میں راستہ روکے کھڑی رہو گی؟''

''اوہ سوری۔'' فروا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ''آپ لوگ اندر آئیں نا پلیز۔'' وہ ایک جانب ہوتے ہوئے خوش اخلاقی سے بولی اور اسد، سرمد کو ساتھ لئے اندر داخل ہو گئے۔

''کون آیا ہے فروا؟'' اندر سے ندرت جہاں کی آواز سنائی دی تھی۔

''آپ خود دیکھ لیجئے۔'' فروا نے شیریں لہجے میں پُر اشتیاق انداز میں جواب دیا اور ندرت تیزی سے باہر آ گئی۔ سامنے ہی اسد کے ساتھ سرمد کھڑے حیران نظروں سے انہی کی سمت دیکھ رہے تھے۔

''سرمد......؟'' ندرت جہاں نے حیرت بھری مسرت سے سرمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ نے کیسے پہچانا؟'' اسد حیران ہوئے۔

''لو بتاؤ۔ میری بہن کا لختِ جگر ہے۔ اس کے بچپن میں اسے گودوں میں کھلایا ہے...... کیسے نہیں پہچانوں گی؟'' اس نے آگے بڑھ کر سرمد کا چہرہ تھام کر ان کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

''تم نے تو نہیں پہچانا ہوگا۔'' سرمد کو حیران نظروں سے تکتے دیکھ کر انہوں نے قدرے افسردہ لہجے میں پوچھا۔

''پہچانو گے بھی کیسے؟...... برسہا برس سے شکل تک نہیں دیکھی...... میں تمہاری خالہ ہوں..... ندرت خالہ...... اب پہچانا؟''

''جی۔'' سرمد بے ساختہ چونک اُٹھے تھے۔ ندرت میں اس کی والدہ سطوت جہاں کی شباہت آتی تھی۔ اس وقت انہیں دیکھ کر سرمد کو ایک عجب خوشگوار سا احساس ہوا تھا۔ ایک مدت کے بعد ماں جیسا چہرہ نظر آیا تھا۔

''اوہ.....، اسد آئے ہیں۔'' ثروت مسکراتی ہوئی برآمدے میں وارد ہوئی اور سامنے اسد کے ساتھ سرمد کو دیکھ کر اپنی جگہ پر ٹھٹک کر رک گئی۔

''آؤ آؤ ثروت!..... ذرا پہچانو تو..... کون آیا ہے۔'' ندرت جہاں نے مسکراتے لہجہ میں پہیلی بوجھی۔

''سرمد کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟'' ثروت دلنشین انداز میں مسکراتے ہوئے آگے بڑھی۔ ''میں نے تو اسد سے کہا تھا کہ اب کے آنا تو سرمد کو بھی ساتھ لانا...... ہم بھی تو دیکھیں، ہمارے انگلینڈ پلٹ کزن کتنے بڑے ہو گئے ہیں۔''

سرمد حیران نظروں اور مسکراتے چہرے کے ساتھ حسین و رعنا ثروت کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ پہلی ہی نظر میں وہ انہیں بہت اچھی لگی تھی۔

❀===❀===❀
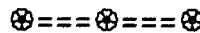
آسمان کا رنگ عجب ملگجا سا ہو رہا تھا۔ رنگ اُڑی پرانی اوڑھنی کی طرح پھیکے آسمان پر سیاہی مائل سرمئی اور بھوری خاکستری بدلیاں بے دلی سے یہاں وہاں ڈول رہی تھیں۔ شام کا سلونا روپ آج بھی بے حد بے رونق اور پھیکا سا لگ رہا تھا۔ ہواؤں کے مدھم جھونکوں میں عجب سی اُداسی اور مایوسی رچی ہوئی تھی۔

نمو نے برتن دھو کر سمیٹ کے ریک میں رکھ دیئے تھے اور رات کے کھانے کے لئے دال چننے بیٹھ گئی تھی۔ انو کے

آنے کا وقت ہو گیا تھا، سو اس نے چائے کے لئے چولہے پر پانی رکھ دیا تھا۔ دوسرے چولہے پر دال چڑھا کر وہ باورچی خانے سے باہر آ گئی تھی۔ باہر آنگن میں ہر سمت شام کے اُداس سائے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ آنگن کے بیچوں بیچ بندھی الگنی پر جھولتے سوکھے کپڑے اُتار کر تہہ کرنے لگی۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ اس نے بے ساختہ چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازے تک پہنچتی، حسنہ دروازہ کھول چکی تھی۔ انو اندر داخل ہوا تھا اور سامنے کھڑی نمو پر ایک نگاہِ غلط ڈالے بنا وہ حسنہ کے ساتھ کمرے میں چلا گیا تھا۔ انو کے اس طرح نظر انداز کرنے کے انداز کی اب وہ عادی ہوتی جا رہی تھی۔ اس لئے بنا کسی احساس کے وہ کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

چولہے پر دھری کیتلی میں پانی سنسنانے لگا تھا۔ اس نے پلاسٹک کی برنی سے چائے کی پتی کیتلی میں ڈالی اور اسٹینڈ سے چائے کے مگ اُتارنے لگی۔ اور مگ میں چائے انڈیلتے سمے اسے بے ساختہ وہ شامیں یاد آ گئی تھیں، جب انو آفس سے آنے کے بعد سیدھا کچن میں چلا آتا تھا۔

''کیا کر رہی ہے میری گڑیا رانی؟'' وہ باورچی خانے میں جھانک کر کہتا تھا۔

''آ گئے بھیا!'' نمو خوشی سے کِھل اُٹھتی تھی۔ ''آپ کپڑے بدلیں۔ میں چائے لا رہی ہوں۔''

اکثر شریفن خالہ بھی آ جاتی تھیں۔ پھر وہ تینوں مزے مزے کی باتوں کے دوران چائے پیتے تھے۔ نمو دن بھر کی رُوداد انو کے گوش گزار کرتی تھی۔ اور انو بے حد محبت اور توجہ سے اس کی باتیں سنے جاتا تھا۔

''آج سکول میں پڑھائی کیسی رہی؟'' ان باتوں کے بیچ کوئی دس بار یہ سوال کیا کرتا اور وہ مسکرا کر پُراعتماد لہجے میں ایک ہی جواب دیتی۔

''فنٹاسٹک۔ آپ فکر مت کریں بھیا! میں خوب دل لگا کر پڑھتی ہوں۔''

''شاباش میری گڑیا! خوب دل لگا کر خوب اچھا پڑھو۔ تمہیں پڑھ لکھ کر ایک کامیاب ڈاکٹر بننا ہے۔'' اور اب جبکہ وہ خوب محنت کر کے خوب دل لگا کر پڑھ کر بہت اچھا رزلٹ لے آئی تھی تو بھیا کو اسے مبارکباد دینے کا بھی خیال نہیں آیا تھا۔ رزلٹ آئے کتنے ہی دن بیت چکے تھے۔

کالجوں میں داخلے شروع ہو چکے تھے۔ مگر اسے تو اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ سکول میں جا کر اپنی مارک شیٹ بھی لے آتی۔ فریال اپنی مارک شیٹ لینے گئی تو اس کی مارک شیٹ بھی لے آئی تھی۔ جبکہ کلاس ٹیچر اور خود ہیڈ مسٹریس نے بھی کہا کہ نمرہ علی کو خود مارک شیٹ لینے آنا چاہئے تھا۔ اتنی شاندار کامیابی پر ہم سب اسے مبارکباد دینا چاہتے ہیں۔

''بس مس! آج کل وہ کچھ مصروف ہے۔ اصل میں اُس کے بھیا کی شادی ہوئی ہے......اور......'' فریال نے ہیڈ مسٹریس اور ٹیچر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔

''اگر ایک دن سکول آ کر وہ مارک شیٹ نہیں لے سکتی تو بھلا روزانہ کالج کس طرح جائے گی؟'' ٹیچر نے قدرے ناخوشگوار لہجے میں سوال کیا۔ یہ سوال خود فریال کو بھی تنگ کر رہا تھا۔ نمرہ تو کالج سے فارم بھی لینے نہ جا سکی تھی۔ رات دن گھر کے کاموں میں اُلجھی رہتی۔ گھر کا تمام کام وہ پہلے بھی کرتی تھی، مگر اب ایک فرد کا اضافہ ہو گیا تھا تو ظاہر ہے کام بھی بڑھ گیا تھا۔ حسنہ تو ہل کر پانی بھی نہ پیتی تھی۔ ویسے بھی اب وہ اُمید سے ہو چکی تھی تو اس کے نخرے سوا ہو گئے تھے۔ وہ تو اس بات کے حق میں ہی نہ تھی کہ نمو کالج میں داخلہ لے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جب بھی فارم لینے کے لئے کالج جانے کا ارادہ کرتی، حسنہ کسی نہ کسی بہانے اسے روک دیتی تھی۔

یہ صورتِ حال دیکھتے ہوئے فریال اپنے لئے فارم لینے گئی تو نمو کے لئے بھی لیتی آئی۔ اس دوپہر نمو، حسنہ کے لئے گرم گرم چپاتیاں ڈال رہی تھی، تب ہی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ حسنہ اپنے کمرے میں بستر پر پڑی تھی۔ چنانچہ نمو

چولہا دھیما کر کے دروازہ کھولنے گئی تھی اور سامنے فریال کو دیکھ کر کِھل اُٹھی تھی۔

''ارے فری! تم؟......آؤ نا۔ اندر آؤ۔'' اس نے فریال کو دروازے پر ہی ایستادہ دیکھ کر راستہ دیتے ہوئے اندر آنے کو کہا۔

''نہیں نمو! اس وقت میں ذرا جلدی میں ہوں۔'' فریال نے کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے حسنہ کو خونخوار نظروں سے گھورتے دیکھ لیا تھا۔ ''تمہارے لئے فارم لائی تھی، یہ لے لو۔''

''اچھا۔'' نمو فارم دیکھ کر حیرت بھری مسرت سے بولی۔ ''تھینک یو فری! میں تو کب سے سوچ رہی تھی، پر وقت ہی نہیں مل رہا تھا۔''

''ہوں۔'' فریال نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اسی لئے میں اپنے لئے فارم لینے گئی تو تمہارے لئے بھی لیتی آئی۔ اب اسے جلدی سے بھر کر فیس کے ساتھ جمع کروا دینا۔''

''ہاں۔'' نمو نے بے بس انداز میں سر ہلایا اور فریال نے واپسی کے لئے قدم بڑھا دیئے اور نمو چاہتے ہوئے بھی اسے روک نہ سکی۔ فریال کو دیکھتے ہی حسنہ کے ماتھے پر بل پڑ جاتے تھے اور منہ بن جاتا تھا۔ وہ پروفیسر آفاق اور فریال کو سخت ناپسند کرتی تھی۔ فریال نے ایک آدم بار نمرہ سے کہا بھی۔

''نمو! شاید بھابی میرا آنا پسند نہیں کرتیں۔''

''پاگل ہوئی ہو کیا؟'' نمرہ معصومیت سے جواب دیتی۔ ''بھلا تمہیں وہ کیوں ناپسند کریں گی؟......اصل میں بھابی کچھ کم گو ہیں۔ اور دوسرے آج کل ان کا جی بھی اچھا نہیں رہتا۔'' نمرہ کے لہجہ میں بھابی کے لئے پیار سمٹ آتا اور تصور میں ایک ننھا سا بھتیجا یا بھتیجی مسکرانے لگتے۔ اور اس رات کھانے کے بعد اس نے فارم انو کے سامنے رکھا تو وہ حیرانی سے پوچھنے لگا۔

''یہ کیا ہے؟''

''کالج کے داخلہ کا فارم ہے۔'' نمو نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ''داخلے شروع ہو گئے ہیں بھیا!''

''اچھا اچھا......'' انو نے بے دلی سے سر ہلایا۔ ''فیس کتنی ہے؟'' انو کا لہجہ فکرمندانہ تھا۔

نمو نے فارم پر جس جگہ فیس کا اندراج تھا، انگلی رکھی۔

''ہیں......؟ یہ تو بہت زیادہ ہے۔'' انو کی جگہ حسنہ بولی۔ ''بھلا اتنے روپے کہاں سے آئیں گے؟......ہم تو خود اپنی ضرورتوں کو رو رہے ہیں۔ یہ ایک اور بڑی ضرورت سر پر آ کھڑی ہوئی۔'' وہ اپنی قمیض کا دامن کھینچ کر پھیلاتے ہوئے بولی۔ ''میرے سارے کپڑے تنگ ہو گئے ہیں۔ سوچ رہی تھی، لون کا ایک آدھ کرتہ بنا لوں۔ شادی والی دونوں چپلیں اونچی ایڑی کی ہیں۔ ایک بغیر ہیل کی چپل بھی چاہئے......مگر سوچ کر رہ جاتی ہوں......اتنی گنجائش ہی نہیں ہے۔'' حسنہ کی لمبی چوڑی تمہید پر انو کا جھکا سر کچھ اور جھک گیا۔ نمرہ کے دل میں کسک سی ہوئی۔ حسنہ نے جو کچھ کہا، اپنی جگہ وہ سب درست اور ضروری تھا۔ مگر داخلہ بھی تو ضروری تھا۔ یہ تو انو کا خواب تھا۔ وہ تو اس کے ہی خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے دن رات محنت کرتی رہی تھی۔ گو کہ انو کا اس سارے عرصے میں روّیہ خاصا بدل چکا تھا، اس کے باوجود جانے کیوں نمو اس کے سامنے فارم رکھتے وقت یہ توقع کر رہی تھی کہ وہ فارم دیکھ کر خوش ہو گا۔ حسبِ عادت اسے محنت سے اور خوب اچھا پڑھنے کی تاکید کرے گا اور اسے یاد دلائے گا کہ اسے ڈاکٹر بننا ہے۔ مگر انو اُس کی توقعات کے برخلاف بِنا کچھ جواب دیئے دسترخوان سے اُٹھا اور پاؤں چپل میں اڑسنے لگا۔ وہ متوقع نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے واضح طور پر انو کو خود سے نظریں چراتے محسوس کیا تھا۔

''اچھا دیکھو...... کچھ کرتا ہوں۔'' انو کے لہجہ میں ایک عجب سی بیزاری تھی۔ نمرہ حیرانی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

'بھیا کیا کچھ بدل گئے ہیں؟' اس نے بے یقینی سے سوچا۔

'توبہ ہے نمو! تم بھی......' دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو سرزنش کی۔ 'بھیا کی آمدنی سے تو تم واقف ہی ہو۔ اور اب تو خرچ میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ بے چاری بھابی کو بغیر ایڑی والی جوتی اور ڈھیلے کرتے چاہئیں۔ بھیا وہ تک تو خرید نہیں پا رہے..... پھر بھلا اتنی ڈھیر ساری فیس کی رقم......' بھائی کی کسمپرسی پر اس کا دل دُکھ کر رہ گیا۔ وہ بھائی کی غربت میں اُس کا ساتھ دینا چاہتی تھی۔ مگر وہ کرتی تو کیا کرتی؟ بھلا ایک میٹریکولیٹ لڑکی کر بھی کیا سکتی ہے؟ اسی لئے تو وہ آگے پڑھنا چاہتی تھی۔ بہت بڑی اور قابل ڈاکٹر بن کر وہ اپنے بھیا کی غربت کو دور کرنے میں مدد کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لئے خوشیاں خریدنا چاہتی تھی۔ اس پوری دنیا میں ایک بھیا ہی تو اس کے اپنے تھے۔ وہ ان کی محبتوں اور عنایتوں کا حق ادا کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لئے پڑھنا بے حد ضروری تھا۔ سو اُس نے داخلہ نہ لینے کے خیال کو دل سے نکال دیا اور ایک نئے عزم سے سوچا کہ وہ بہت پڑھے گی اور اپنے بھیا، اپنی بھابی اور ان کے بچوں کے لئے دنیا کی تمام خوشیاں ڈھیر کردے گی۔ ان کے قدموں میں خوشیوں کے انبار لگا دے گی۔ اس نے تصور ہی تصور میں بھابی کے لئے ڈھیر سارے جوڑے، چپلیں اور نہ جانے کیا کیا خرید ڈالا۔ اس نے دسترخوان سے برتن سمیٹے اور کچن کی طرف چل دی۔ حسنہ پہلے ہی انو کے پیچھے کمرے میں جا چکی تھی۔

پورا ہفتہ بیت گیا۔ اس نے انو سے فیس کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ اسے پتہ تھا، بھیا اس کی فیس کے لئے پریشان ہیں، بار بار پوچھ کر مزید پریشان کرنے سے کیا فائدہ؟ جب انتظام ہو جائے گا تو بھیا خود ہی بتا دیں گے۔

اس شام خود آنے کے بجائے فریال نے غفور کو اس کے پاس بھجوا دیا تھا۔

''فریال بی بی نے پوچھا ہے..... فارم بھر لیا ہو تو کل کالج چل کر جمع کروا دیں۔'' دروازہ نمو نے ہی کھولا تھا۔ نمو کو دیکھتے ہی غفور نے فریال کا پیغام دے دیا تھا۔ ''کل فریال بی بی کالج جائیں گی، فارم جمع کروانے کے لئے۔''

''اوہ...... اچھا......'' نمو نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ فارم تو بھر چکی تھی، مگر فیس کا ابھی تک کچھ انتظام نہیں ہوا تھا۔ انتظام ہو جاتا تو یقیناً انو اُسے بتایا۔ انو نے کوئی جواب نہیں دیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اب تک کوئی انتظام نہیں ہو سکا تھا۔

''بی بی نے کہا تھا کہ اگر آپ مصروفیت کے باعث نہ جا سکیں تو فارم دے دیں...... وہ جمع کروا دیں گی۔'' اسے کشمکش کا شکار دیکھ کر غفور نے تجویز پیش کی۔

''مگر...... اب تک...... وہ فیس......'' نمو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ غفور کو کیونکر بتائے کہ فارم تو ریڈی ہے مگر فیس کا کچھ بندوبست نہیں ہو سکا۔

''ارے پہلے تو صرف فارم جمع ہوتا ہے۔'' غفور جلدی سے بولا۔ ''پھر جو لوگ ایڈمیشن کے کرائٹ ایریا پر پورا اُترتے ہیں، ان کے ناموں کی لسٹ لگتی ہے۔ پھر جا کر کہیں فیس جمع ہوتی ہے۔'' غفو کی معلومات نے اس وقت نمو کو بڑی تقویت دی تھی۔

''تو غفور بھائی! آپ میرا فارم لے جائیے۔ کل اپنے ساتھ فریال میرا بھی فارم جمع کروا دے گی۔'' نمو نے اندر جا کر جلدی سے اپنا فارم نکالا، جسے اس نے پہلے ہی دن بے حد احتیاط سے پُر کر لیا تھا۔ فارم ایک خاکی لفافے میں رکھ کر اس نے غفور کے حوالے کر دیا تھا اور غفور خدا حافظ کہتا روانہ ہو گیا تھا۔

کالج میں ایڈمیشن کے لئے میرٹ لسٹ لگ چکی تھی اور نمو کا نام لسٹ میں اوّل نمبر پر تھا۔

لسٹ میں جن لڑکیوں کے نام تھے، تقریباً سب ہی فیس جمع کروا چکی تھیں۔ صرف ایک ہی باقی بچی تھی۔ ایڈمیشن کی آخری تاریخ میں صرف دو روز باقی بچے تھے۔ وہ حیران و پریشان نظروں سے انو کی طرف دیکھتی اور انو نظریں چرا لیتا۔

کل رات انو اپنی تنخواہ سے ایڈوانس نکلوا کر لایا تھا۔

''یہ لو..... صبح نمو کو دے دینا۔'' اس نے روپے بیوی کو تھماتے ہوئے تھکے تھکے لہجہ میں کہا۔

''روپے؟'' حسنہ نے حریص نگاہوں سے روپوں کو دیکھا۔ ''کس لئے؟'' اس نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔

''ارے بھئی! اسے کالج میں داخلے کے لئے فیس دینی ہے۔'' انو پلنگ پر بیٹھ کر جوتے اُتارنے لگا۔

''تم بھی حد کرتے ہو۔ وہی مثل ہے، گھر میں نہیں دانے، اماں چلیں بھنانے۔'' حسنہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''اے میں کہتی ہوں اس نے بہت پڑھ لیا۔ دس جماعتیں کافی نہیں ہیں کیا؟ ہم تو اللہ رکھے باوا اور پانچ پانچ بھائیوں کے ہوتے پانچ جماعت سے آگے نہ پڑھ سکے۔ اس لحاظ سے ایک بھائی کے دم پر نمو نے بہت پڑھ لیا۔ میں تو کہتی ہوں جی، بس اتنی ہی تعلیم کافی ہے۔ کسی داخلے واخلے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''پاگل ہوئی ہو؟'' انو نے شادی کے بعد ان سات مہینوں میں پہلی بار بیوی کی کسی بات سے اختلاف کی جرأت کی۔ ''نمو بہت پڑھنے والی اور ذہین اسٹوڈنٹ ہے۔ میٹرک میں اُس کی اوّل پوزیشن ہے۔ پتہ ہے، اُسے کالج میں داخلہ لینا ہی چاہئے۔''

''اور تمہیں بھی کچھ پتہ ہے؟'' بہن کا ساتھ دینے پر حسنہ ایک دم سے سلگ اُٹھی تھی۔ ''میری بھی کچھ ضرورتیں ہیں۔ یہ دیکھو، ایڑی والی چپل پہن پہن کر میرے پاؤں سوج کر کیسے کُپا ہو گئے ہیں۔ اور اسے بھی چھوڑو...... ابھی جو چار مہینوں بعد ہسپتال کا بڑا خرچ آنے والا ہے، مانا ہسپتال فری ہے، مگر اوپر کے بھی سو خرچ ہوتے ہیں۔ یہ روپیہ اسی میں کام آئے گا۔'' حسنہ نے ہاتھ میں پکڑے روپوں کو میاں کی آنکھوں کے سامنے لہرا کر مٹھی میں دبوچ لیا۔

''اور جہاں تک داخلے کا تعلق ہے۔'' اس نے رسان بھرے لہجہ اور دھیمی آواز میں بات آگے بڑھائی۔ ''تو اگر نمو ایسی ہی ذہین اور اوّل کلاس پاس طالبہ ہے تو اس کا داخلہ خود بخود ہو جائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ پڑھنے والے ذہین بچوں کے لئے سکولوں کالجوں میں سب جگہ رعایت ہوتی ہے۔''

انو نے سر جھکا لیا۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

واقعی حسنہ کے لئے چپل چاہئے تھی، ڈھیلے ڈھالے جھبلے چاہئے تھے۔ اور آنے والے خرچ کے لئے روپیہ درکار تھا۔ نمو تو فرسٹ پوزیشن ہولڈر تھی۔ اس کا داخلہ تو بغیر فیس کے بھی ہو سکتا تھا۔ اور اگر نہیں ہوتا تو...... حسنہ ٹھیک کہتی ہے، دس جماعتیں بہت ہیں...... وہ آخر یتیم بہن کی خاطر کب تک قرض اُدھار کرتا پھرے۔

اور اگلے روز جب وہ آفس جانے لگا تو حسبِ معمول نمو نے خاموش سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ لمحے بھر کو تو اس کا دل ڈول کر رہ گیا تھا۔

''وہ تم...... آج فریال کے ساتھ...... کالج چلی جاؤ...... اور پرنسپل سے مل کر ذرا بات کر کے دیکھو۔ شاید کوئی سورت نکل آئے...... میں تو کوئی انتظام نہیں کر سکا۔'' انو بہن سے نظریں چراتے ہوئے چپ چاپ دروازے سے باہر نکل گیا اور نمو کو بے اختیار پچھلا برس یاد آ گیا۔ جب اس کی امتحانی فیس جانے والی تھی اور انو کوئی بندوبست نہیں کر پا رہا تھا۔ تب نمو نے دبے لہجہ میں اس سے کہا تھا کہ اگر وہ ٹیچر سے بات کرے تو سکول کے زکوٰۃ فنڈ سے اس کی فیس کا انتظام ہو سکتا ہے۔ اُس کی یہ بات سن کر انو تڑپ اُٹھا تھا

''ابھی میں زندہ ہوں...... میں تیری فیس بھر سکتا ہوں۔ میں مر جاؤں تو..... تو زکوٰۃ فنڈ سے فیس سے لینا..... اور

آج......انو خود اُسے مشورہ دے رہا تھا کہ وہ پرنسپل سے مل کر اس سلسلے میں بات کرے۔

'تو کیا بھیا اب میرے لئے زندہ نہیں ہیں؟' اپنے اس خیال پر وہ خود تڑپ اُٹھی تھی۔ 'لاحول ولا قوۃ۔' اس نے اپنے سر پر چپت لگائی۔ خدا بھیا کو سو برس کی زندگی دے......میں کیسی باتیں سوچنے لگی......مجبوری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔'

اور اگلے دن وہ فریال کے ساتھ کالج جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔

''تم کہاں چلیں؟'' حسنہ نے چبھتے لہجے میں پوچھا۔ اس نے بھیا کی طرف دیکھا۔ انو سر جھکائے کھڑا تھا۔ اب اسے ہی جواب دینا تھا۔

''بھابی! وہ فریال آنے والی ہے۔'' اس نے ہچکچاتے لہجہ میں جواب دیا۔ ''مجھے اس کے ساتھ کالج جانا ہے۔ آج داخلے کی آخری تاریخ ہے۔''

''دیکھو! یہ فریال مجھے اچھی لڑکی نہیں لگتی۔'' حسنہ زہر خند سے بولی۔ ''اس کے ساتھ تمہارا گھومنا پھرنا مجھے پسند نہیں۔ وہ تو پوری آوارہ لگتی ہے مجھے۔''

''نہیں۔ فریال تو بہت اچھی لڑکی ہے۔ میرے بچپن کی سہیلی ہے۔ اور پھر فریال کے پاپا، آفاق انکل تو میرے اور بھیا کے لئے باپ کی جگہ ہیں۔ ہر اچھے برے وقت پر کسی اپنے کی طرح وہ ہمارے کام آئے ہیں۔'' اس نے مدد طلب نگاہوں سے انو کی طرف دیکھا مگر وہ اب بھی خاموش تھا۔

''آپ پلیز آئندہ کبھی فریال کے لئے ایسے الفاظ مت کہئے گا۔ وہ سنے گی یا انکل کو پتہ چلے گا تو انہیں برا لگے گا اور دکھ بھی ہوگا۔''

''ارے واہ!'' حسنہ تڑخ کر بولی۔ ''ہم جو محسوس کریں گے، سو بار کہیں گے۔ کسی کو دکھ ہو یا برا لگے، ہماری بلا سے......اور ہاں......ایک بات کان کھول کر سن لو۔ آئندہ سے میرے سامنے اس طرح لُتر لُتر زبان چلائی تو اچھا نہ ہوگا۔ مجھے یہ زبان درازی بالکل پسند نہیں۔'' آج پہلی بار نمو کا جواب دینا حسنہ کو سخت ناگوار گزرا تھا۔ ''ہمارے ٹکڑوں پر پل رہی ہو......اور ہمارے ہی سامنے غرّا رہی ہو۔ ہماری بلی ہم ہی کو میاؤں......اے بی!......خوب......'' حسنہ نے گم صم کھڑے انور کو کندھے سے ہلایا۔

''سن رہے ہو تم؟......ابھی کالج میں داخلہ نہیں ہوا تو یہ حال ہے، آگے آگے دیکھو، ہوتا ہے کیا۔

''نمو......!'' انو کی پیشانی پر سلوٹیں سمٹ آئیں۔ ''مجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی۔''

نمو آنکھوں میں حیرت لئے انو کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''اور ہاں......آج تم کسی کالج والج نہیں جاؤ گی۔ آج حسنہ کو خریداری کے لئے بازار جانا ہے۔ اگر تمہیں جانا ہے تو کل چلی جانا۔''

حسنہ اپنی زبان کے تیر و نشتر سے اس کا دل چھلنی کر کے اندر جا چکی تھی۔ اسی کے پیچھے پاؤں پٹختا انو بھی کمرے میں چلا گیا تھا۔ نمو کو خود فریبی کے وہ الفاظ نہیں مل رہے تھے، جنہیں وہ زخمی دل پر مرہم بنا کر رکھ سکتی۔ حسنہ سے زیادہ اسے بھیا کی باتوں اور لب و لہجہ پر حیرت تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ بھیا اس طرح بھی اسے مخاطب کر سکتے ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد حسنہ، انو کے ساتھ گھر سے نکل گئی تھی۔ جاتے وقت انو نے خدا حافظ کہنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ اور نہ ہی دروازہ بند کر لینے کی تاکید کی تھی۔ بس دروازہ بھیڑ کر اس طرح لے گئے تھے جیسے اس سے کوئی رشتہ، کوئی ناطہ ہی نہ ہو۔

فریال آئی تو وہ اپنی جگہ پتھر کے بت کی طرح گم صم بیٹھی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، اس لئے وہ اندر چلی آئی تھی۔

''اے نمرہ بیگم!......کہاں ہو؟'' فریال نے اس کی آنکھوں کے سامنے اُنگلیاں نچائیں تو وہ یوں چونکی جیسے اب تک سوتی رہی ہو۔

''اوہ......تم آگئیں فریال؟''

''جی جناب! آپ کا حکم تھا، سو بندی حاضر ہوگئی ہے۔ اب آپ تیار ہو جائیں تو یہ حقیر پُرتقصیر کالج تک آپ کی ہم سفری کا شرف حاصل کرلے۔'' فریال نے سر جھکا کر ایک ہاتھ کمر پر پچھلی جانب اور دوسرا ہاتھ سینے پر رکھ کر قدرے جھکتے ہوئے غلاموں کے سے انداز میں کہا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اُس کے اس انداز پر وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی۔ مگر آج اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''نمو!......کیا ہوا؟......خیریت تو ہے؟'' فریال حیرت زدہ ہونے کے ساتھ پریشان بھی ہو اُٹھی۔ عام حالات میں نمو کسی کو بھی کوئی ایسی بات بتانے سے اجتناب برتتی تھی، جس سے بات سننے والے کو تکلیف پہنچنے کی اُمید ہو۔ اور یہ تو اس کی عزیز از جان دوست فریال کا معاملہ تھا۔ وہ اسے کیسے بتا سکتی تھی کہ حسنہ اس کے بارے میں کیسے خیالات رکھتی ہے۔ یا اپنے دل پر لگا تازہ چرکا دکھا کر وہ اُسے دُکھی نہیں کرسکتی تھی۔ مگر اس وقت وہ اپنی زندگی کی پہلی قیامت سے دوچار تھی۔ اس وقت اُسے کسی کاندھے کی ضرورت تھی، جس پر سر رکھ کر وہ روسکتی۔ اُسے ان مہربان ہاتھوں کی ضرورت تھی، جو اس کے آنسو پونچھ سکتے۔ وہ پوری دنیا میں خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اس وقت اسے کسی کی ضرورت تھی۔ سو وہ بے اختیارانہ فریال کے سینے سے جا لگی اور پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

انو اور حسنہ شاپنگ کے لئے جا چکے تھے۔ اس لئے بے کھٹک وہ روتی چلی گئی۔ اور ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان ایک ایک بات فریال کے گوش گزار کر دی۔ فریال نے بغیر کسی تاثر کے تمام بات سنی، پانی لا کر اسے پلایا، اس کے آنسو خشک کیے اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''پگلی! اتنی سی بات اور اتنا رونا دھونا؟'' وہ ہنس پڑی۔

''اتنی سی بات؟'' نمو نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ ''خوب کھل کر رو لینے اور اپنے دکھ میں کسی کو شامل کر لینے سے اس کا جی ہلکا ہو گیا تھا۔

''ہاں اور نہیں تو کیا؟'' فریال دوبارہ ہنسی۔ ''میں تو تمہیں بہت بہادر سمجھتی تھی۔

''میں بھی یہی سمجھتی تھی۔'' نمو دھیمی آواز میں بولی۔ ''مگر آج مجھے پتہ چلا ہے کہ میری انرجی، میری بہادری سب بھیا کے دم سے تھی۔ بھیا آج الگ ہوتے محسوس ہوئے تو لگا میرے جسم میں جان ہی نہ ہو۔ کیسی بہادری......کہاں کی حوصلہ مندی؟''

''دیکھو نمو!'' فریال اسے سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''تمہیں حقیقت پسندی سے کام لینا ہوگا۔ بیٹا ہو کہ بھائی، شادی کے بعد اس کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ اس وقت تمہارے بھائی کی اوّلین ذمہ داری اس کی بیوی اور آنے والا بچہ ہے۔ تم خود ہی سوچو، فلیٹ چپل نہ ہونے کے باعث ہیل والی چپل سے بھابی کہیں گر سکتی ہیں اور آنے والے بچے کو کسی بھی طرح کا نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''اللہ نہ کرے۔'' نمو کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''تو بولو......'' فریال مسکرائی۔ ''داخلہ زیادہ ضروری ہے یا بھابی؟......اور جہاں تک بھابی کے رویّے کی بات ہے تو وہ جس ماحول کی پروردہ ہیں، اس کو دیکھتے ہوئے ان سے اسی طرح کے رویّے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اور ویسے بھی وہ اس وقت جس حال میں ہیں، ایسی صورت میں اکثر خواتین چڑچڑی اور کٹ کھنی ہو جاتی ہیں۔'' فریال نے دانت کچکچا کر

اور ہاتھ کا پنجہ آگے بڑھا کر ''کٹ کھنی'' کا منظر پیش کیا تو بے ساختہ نمو کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔
''اب تم بے فکر ہو کر بیٹھ جاؤ۔'' فریال نے کندھوں سے تھام کر نمو کو چارپائی پر بٹھاتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ''آج تمہیں کالج جانے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی کلاسیں تو اگلے ہفتے سے شروع ہوں گی۔ اور جہاں تک فیس کا تعلق ہے..... تو تم جانتی ہو، پاپا نے تمہیں کبھی بھی مجھ سے الگ نہیں سمجھا۔ اس لئے فیس کوئی مسئلہ نہیں ہے...... سمجھیں؟''

نمرہ نے تشکر بھری نظروں سے فریال کی طرف دیکھا۔
''اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بھابی میرا اس گھر میں آنا پسند نہیں کرتیں، تو اب میں محتاط رہوں گی۔ ویسے بھی اب مجھے تمہارے گھر روز روز آنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اب تم پوچھو گی، کیوں؟'' فریال مفکرانہ انداز میں مسکرائی۔ ''تو جناب! وہ اس لئے کہ یہاں میں صرف تم سے ملنے آتی ہوں۔ تو اب کالج میں اِن شاءاللہ روز ہی ہماری ملاقات ہو جایا کرے گی۔ پھر گھر آنے کی ضرورت ہی کیا ہے...... کیسا؟'' بات ختم کر کے فریال نے فرضی کالر اونچا کرتے ہوئے فخریہ انداز میں سوال کیا اور نمو بے اختیار ہنس دی۔

❀===❀===❀

شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ ڈرائنگ روم کی کھلی کھڑکیوں سے ہوا کے نرم اور مدھم جھونکے کمرے میں داخل ہو کر فضا میں شام کی نرماہٹ کا احساس جگا رہے تھے۔ ڈرائنگ روم کی پچھلی دیوار کے ساتھ کھڑکیوں تلے رکھے موگرے، گلاب اور موتیا کے گملوں میں کھلے پھولوں کی خوشبو بھی ہوا میں شامل ہو کر مشام جان کو تازگی بخش رہی تھی۔
اس وقت اسد اور سرمد کے ساتھ ندرت جہاں کے گھر کے سب ہی افراد موجود تھے۔ اسلم احمد، سرمد جیسے خوبرو، شائستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص سے مل کر بے حد متاثر ہوئے تھے۔ خود ندرت جہاں اور ثروت کو بھی سرمد بے حد پسند آئے تھے۔ اور جہاں تک فروا کا تعلق تھا تو وہ تو سرمد کو دیکھ کر بے خودسی ہو گئی تھی۔ سرمد کی آواز سن کر اس نے خیال ہی خیال میں ان کا پیکر تراشا تھا مگر ان کا اصل وجود فروا کے خیالی پیکر سے کہیں بڑھ کر وجیہہ وشکیل اور شاندار تھا۔
ندرت بیگم نے آج اپنے ہاتھوں سے بھانجے کے لئے گرما گرم چٹ پٹے پکوڑے بنائے تھے۔ ثروت نے چائے بنائی تھی اور اس وقت سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے چائے اور پکوڑوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ دلکش اور کسی قدر خودسری ثروت، سرمد کو اچھی لگی تھی۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ اس میں سطوت جہاں کی بے حد شباہت تھی۔
فروا بہت زیادہ گوری چٹی نہیں تھی، مگر اس کے گندمی رنگ میں ایک انوکھی کشش تھی۔
چائے اور باتوں کے دوران کئی بار سرمد کی نگاہیں فروا کی طرف اُٹھی تھیں اور ہر بار انہوں نے اسے خود کو تکتے ہوئے پایا تھا۔ پہلی بار جب انہیں اپنے چہرے پر کسی کی نظروں کی تپش کا احساس ہوا تھا تو انہوں نے بے ساختہ پلٹ کر فروا کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کا اس طرح یک ٹک دیکھنا انہیں بڑا عجیب لگا تھا اور دل میں کہیں ناگواری کا ہلکا سا احساس بھی جاگا تھا۔ مگر اس ایک گھنٹے کی سٹنگ کے دوران وہ اس کی نظروں کے خوگر سے ہو گئے تھے۔ وہ کونے والی کرسی پر بیٹھی ثروت کی آڑ لئے سب سے نظریں بچا کر مسلسل انہیں تکے جا رہی تھی۔ مگر اب انہیں اُلجھن نہیں ہو رہی تھی۔ ان کا خیال تھا، شاید وہ ہر نئے آنے والے کو اسی طرح تکتے رہنے کی عادی ہے۔
''کیا خیال ہے...... اب چلنا چاہئے۔'' کوئی گھنٹے بھر بعد اسد نے سوالیہ نظروں سے سرمد کی طرف دیکھتے ہوئے مشورہ طلب کیا۔
''ہاں، کیوں نہیں؟'' سرمد نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ارے کچھ دیر اور بیٹھو۔'' ندرت جہاں نے ممتا بھرے لہجے میں کہا۔ ان کی جہاں دیدہ نظروں سے فروا کی دلچسپی چھپی نہیں رہی تھی اور وہ اس تصور سے ہی بے حد خوش ہوگئی تھیں کہ فروا کے لئے اگر سرمد جیسا شاندار لڑکا ہاتھ لگ جائے تو کہنا ہی کیا؟ اسی لئے وہ محبت کے ڈونگرے بڑی فراخ دلی سے سرمد پر لنڈھا رہی تھی۔

''بلکہ بھئی میں تو یہ کہہ رہی ہوں......اب تم دونوں کھانا کھا کر ہی جانا۔''

''اور نہیں تو کیا؟'' فروا کے بے ساختہ کہنے پر سرمد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ ''پلیز کچھ دیر اور رُک جایئے نا۔'' اس نے بے حد دھیمے لہجہ اور سرگوشی والے انداز میں سرمد سے التجا کی تھی۔

''وہ......اصل میں......اماں بی انتظار کر رہی ہوں گی۔'' سرمد سٹپٹا کر بولے۔

''اماں بی کے ساتھ تو آپ لوگ روز ہی کھانا کھاتے ہیں۔ آج ہمارے ساتھ کھالیں گے تو کون سی قیامت آجائے گی۔'' ثروت کے لہجے میں ایک غیر محسوس سا اکھڑ پن تھا، جسے اسد نے محسوس کیا تھا۔

''نہیں ثروت!......آج نہیں......'' ان کے لہجہ کی نرمی اور اپنے پن پر سرمد نے بے ساختہ چونک کر بھائی کی طرف دیکھا تھا۔ وہ آنکھوں میں جہاں بھر کا پیار سمیٹے ثروت سے معذرت کر رہے تھے۔ ''دراصل آج سرمد کا رزلٹ آیا ہے اور تم تو جانتی ہی ہو کہ ایسے موقعوں پر اماں بی خاص طور پر کھانے کا اہتمام کرتی ہیں۔ اگر آج سرمد ڈنر پر موجود نہ ہوئے تو انہیں اچھا نہیں لگے گا۔''

اب اصرار کا کوئی جواز باقی نہ بچا تھا۔ اس لئے ثروت اور ندرت جہاں کو خاموش ہو جانا پڑا تھا۔ فروا نے خاموش شکایتی نظروں سے سرمد کی طرف دیکھا تھا اور سرمد نے جز بز ہو کر نظریں جھکا لی تھیں۔

''پھر کب آؤ گے؟'' ثروت نے اخلاص بھرے انداز میں سوال کیا۔

''اب دیکھو......'' اسد کے جواب پر وہ مسکرا کر سرمد کی طرف پلٹی تھی۔

''میں نے تم سے پوچھا تھا......''

''مجھ سے؟'' سرمد گڑبڑا کر جلدی سے بولے۔ ''میں......اب دیکھئے......''

''اے بیٹا! اب آئے ہو تو آتے جاتے رہنا۔'' ندرت جہاں نے آگے بڑھ کر پیار سے ان کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری یہ بوڑھی خالہ کتنے دن جیئے گی؟ اب زندگی کے دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ پر جتنے دن بھی ہیں، میں تم سب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتی ہوں۔'' سرمد، ندرت کے محبت بھرے اس وعظ سے متاثر نظر آرہے تھے۔

''جی آپ کہہ رہی ہیں تو......پھر کبھی......دوبارہ آؤں گا۔''

''اور ہم نے جو کہا تھا؟'' ثروت نے ناز بھرے انداز میں پوچھا۔

''اور اگر ہم بھی گزارش کریں تو؟'' فروا نے آنکھوں میں رعنائی بھر کر سوال کیا اور سرمد بری طرح گڑبڑا گئے۔

''وہ......دیکھیں اب......''

''دو روز بعد اتوار ہے۔'' ثروت نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔ ''اتوار کو سرمد اپنے رزلٹ کی خوشی میں ہم سب کو ڈنر پہ لے جا رہے ہیں۔ کیوں اسد؟''

''بھئی مجھ سے کیا پوچھتی ہو؟'' اسد خوش دلی سے مسکرائے۔ ''سرمد سے پوچھو۔''

''آپ کیا کہتے ہیں؟'' فروا نے ناز بھرے انداز میں پلکیں جھپکا کر سوال کیا۔

''اگر آپ لوگوں کی یہی خواہش ہے تو موسٹ ویلکم۔'' سرمد، اسد کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھ کر

بولے۔ ''خالہ جان! آپ بھی ساتھ چلیں گی نا؟''

سچ تو یہ تھا کہ سرمد، ندرت جہاں سے مل کر واقعی بے حد خوش ہوئے تھے۔ آج ان سے بات کر کے، مل کر انہیں احساس ہو رہا تھا کہ شاید اماں بی، ابا جان اور وہ خود غلطی پر تھے۔ ان لوگوں نے ندرت کو جس قدر برا سمجھا تھا، شاید وہ اس قدر بری نہیں تھیں۔ یا شاید حالات اور بڑھتی ہوئی عمر نے انہیں تبدیل کر دیا تھا۔ جو بھی تھا، سرمد ندرت سے مل کر، ثروت کو دیکھ کر اور فروا کی نگاہوں کے حصار میں گھر کر خوش ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ انہیں بہت اچھا لگا تھا۔ زندگی کے خالی پن کے کم ہونے کا احساس جاگا تھا۔

''ارے بیٹا! میں کہاں جاؤں گی؟'' ندرت جہاں نے معذرت خواہانہ انداز میں جواب دیا۔ ''تم بچے مل کر چلے جانا۔ اور وہ ڈنر میری طرف سے ہوگا، تمہارے پاس ہونے کی خوشی میں۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' اسد جلدی سے بولے۔ ''وہ ڈنر میری طرف سے ہوگا۔''

''کسی کی طرف سے بھی ہو، یہ طے ہوگیا کہ پرسوں ہم سب ڈنر پر جارہے ہیں۔'' ثروت نے بحث سمیٹتے ہوئے ہاتھ اوپر کر کے اعلان کرنے والے انداز میں کہا اور سب ہی مسکرا دیئے۔ واپسی پر دونوں خاموش تھے۔ سرمد کو اپنے ساتھ لے جا کر اور ان سب سے ملوا کر اسد کو اچھا لگا تھا۔ خاص طور پر ثروت اور فروا کا سرمد کے ساتھ محبت اور اپنائیت سے پیش آنا اسد کو پسند آیا تھا۔ اپنی جگہ سرمد بھی خوش دکھائی دے رہے تھے۔ اتنے عرصے بعد خالہ اور خالہ زاد بہنوں سے مل کر انہیں بہت اچھا لگا تھا۔ پردیس جا کر انہیں اپنوں کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ہوا تھا۔ وہاں کے باسیوں کی تنہا اور ویران زندگیاں دیکھ کر انہیں اپنے کلچر، رشتے داری اور قرابت داری کے اس نظام کی اہمیت کا اندازہ ہوا تھا۔ اور اپنوں سے ملتے جلتے رہنے اور اپنوں کو اپنے ساتھ جوڑے رکھنے کی خوشی اور لذت کا علم ہوا تھا۔ ان کی سوچ کا دھارا اگر اس طرح تبدیل نہ ہوا ہوتا تو شاید وہ آج اسد کے ساتھ ندرت کے گھر جانے اور اس کی فیملی سے ملنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

''ان سب سے مل کر تمہیں کیسا لگا؟'' ایک موڑ مڑتے ہوئے اسد نے سرسری سے لہجہ میں سوال کیا۔

''بہت اچھا لگا۔'' سرمد نے سچائی سے اعتراف کیا۔ ''میرا خیال ہے ندرت خالہ جان پہلے کی نسبت اب بہت اچھی ہوگئی ہیں۔''

''تم ان سے دُور رہے، اس لئے انہیں سمجھ نہیں سکے۔ مجھ سے پوچھو، میں ہمیشہ ہی ان سے قریب رہا۔ وہ مجھے ہمیشہ سے ہی ایسی ہی اچھی لگتی ہیں۔'' اسد کی بات سن کر سرمد سر ہلا کر رہ گئے تھے۔ منہ سے کچھ نہیں بولے تھے۔ گاڑی کی فضا ایک بار پھر بوجھل خاموشی تلے دب گئی تھی۔

''تمہیں ثروت کیسی لگی؟'' بالکل اچانک ہی اسد نے سوال کیا تھا۔

''ثروت؟'' سرمد اس اچانک اور غیر متوقع سوال پر گڑبڑا اُٹھے تھے۔ ''اچھی ہے...... بہت اچھی ہے..... مجھے اچھی لگی۔'' سرمد نے سچائی کا اظہار کیا۔ حقیقت میں انہیں ثروت اچھی لگی تھی۔

''مجھے بھی بہت اچھی لگتی ہے۔'' اسد سامنے سڑک پر نگاہ مرکوز کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولے۔ ''مجھے وہ شروع سے ہی اچھی لگتی ہے...... مم...... میں اسے بے حد پسند کرتا ہوں۔'' اسد، بھائی کو اپنے راز میں شریک کرنا چاہ رہے تھے، مگر سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بتائیں تو بتائیں کیسے؟

''تم سمجھ گئے نا؟..... میں ثروت سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''شادی؟'' سرمد اُچھل پڑے۔ ''آپ ثروت سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟''

''تمہارے خیال میں مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے؟''
''نن.....نہیں......میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔'' سرمد، اسد کی پہلی بات سے ہی نہیں سنبھلے تھے کہ ان کے اس چبھتے ہوئے سوال پر بری طرح سٹپٹا اُٹھے تھے۔
''اب تم بتاؤ......کیا میں غلطی پر ہوں؟''
''نہیں۔ ایسا تو نہیں ہے۔'' سرمد سنبھلتے ہوئے گویا ہوئے۔ ''کسی کو پسند کرنا اور جیون ساتھی بنانے کے لئے انتخاب کرنا کچھ ایسا غلط تو نہیں ہے......اور پھر ثروت تو ہماری ہی فیملی کی لڑکی ہے......ندرت خالہ کی بیٹی ہے۔''
''یہی تو اس کی بدنصیبی ہے۔'' اسد افسوس بھرے انداز میں سر ہلا کر بولے۔ ''ابا جان کو اسی بات پر تو سب سے زیادہ اعتراض ہے۔''
''کک......کیا مطلب؟'' سرمد نے ہراساں لہجہ میں سوال کیا۔
''آپ نے ابا جان سے بات کی تھی؟''
''ہاں۔ اور انہوں نے ثروت سے رشتہ کرنے سے سختی سے انکار کر دیا۔'' اسد نے جواب دیا۔ ''وہ ندرت خالہ کے ماضی کی تلخیاں اب تک نہیں بھول سکے ہیں۔ ان باتوں کو بنیاد بنا کر انہوں نے اس شادی سے منع کر دیا۔''
''آپ نے اماں بی سے بات کی؟'' سرمد نے جلدی سے پوچھا۔
''ہاں۔'' اسد نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مگر ابا جان ان کی بھی سننے کو تیار نہیں۔ بلکہ مجھے تو ایسا لگتا ہے، خود اماں بی بھی اس شادی کے حق میں نہیں ہیں۔''
''ایسا کیوں سوچتے ہیں؟'' سرمد جلدی سے بولے۔ ''اماں بی کے نزدیک ہماری خوشیوں سے بڑھ کر اور کوئی بات اہم نہیں ہو سکتی۔''
''ہو سکتا ہے تمہاری بات درست ہو۔'' اسد نے بے نیازی کے اظہار کے طور پر کندھے اُچکائے۔ ''مگر اس معاملے میں وہ بھی میری کوئی مدد نہیں کر سکیں۔''
''اگر آپ کہیں تو میں ابا جان سے بات کروں؟'' سرمد نے سوالیہ نظروں سے بھائی کے چہرے کی طرف دیکھا۔
''میرا خیال ہے تمہاری کوشش بھی رائیگاں ہی جائے گی۔'' اسد نے مایوس لہجے میں جواب دیا۔ ''ابا جان کسی بھی طرح ندرت خالہ کا ماضی بھُلانے کو تیار نہیں ہیں۔ انہوں نے مجھ سے صاف کہہ دیا ہے کہ اگر ثروت سے شادی کرنی ہے تو اس گھر سے اور گھر والوں سے تمام رشتے ناطے توڑنے ہوں گے۔''
''مطلب؟'' سرمد نے پریشان لہجہ میں سوال کیا۔
''مطلب صاف ظاہر ہے۔'' اسد بے بسی سے مسکرائے۔ ''مجھے گھر اور گھر والوں سے تمام ناطے توڑ کر ثروت سے رشتہ جوڑنا ہوگا۔''
''تو آپ نے کیا سوچا ہے؟'' سرمد نے متوحش لہجہ میں سوال کیا۔ جہاں انہیں یہ خبر سن کر خوشی ہوئی تھی کہ اسد، ثروت کو پسند کرتے ہیں اور اس سے شادی کا ارادہ رکھتے ہیں، وہیں باپ کی ناراضگی اور انکار کا سن کر وہ خاصے خوف زدہ ہو گئے تھے۔
''سوچنا کیا ہے؟'' اسد نے لاپروائی سے ایک بار پھر کندھے اُچکائے۔ ''میں نے دو چار جگہ جاب کے لئے اپلائی کیا ہے۔ ایک آدھ جگہ سے انٹرویو کے لئے کال بھی آ گئی ہے۔ جاب ملتے ہی گھر چھوڑ دوں گا اور ثروت سے شادی کر کے زندگی کے نئے سفر کا آغاز کر دوں گا۔''

''آپ گھر چھوڑ دیں گے؟'' سرمد کو دھکا سا لگا۔ ''اپنا وہ گھر..... جس میں آپ کا بچپن گزرا، جوانی کے اتنے برس بِتائے...... وہ ''وجاہت منزل'' آپ چھوڑ دیں گے؟...... اماں بی، ابا جان اور مجھے اکیلا چھوڑ کر چل دیں گے؟''

''تم ہی کہو...... اور کیا کروں؟'' سرمد کے لہجہ کی اذیت نے ان کے دل کو چھو کر انہیں قدرے شرمندہ کیا تھا۔ اسی لئے مجبور سے لہجے میں بولے۔ ''ابا جان کسی بھی قیمت پر ثروت کو اس گھر میں بہو کے طور پر قبول کرنے کو تیار نہیں۔ تو پھر ایک یہی راستہ رہ جاتا ہے کہ اگر ثروت کو اپنانا ہے تو گھر چھوڑنا پڑے گا۔''

سرمد کا دل چاہا کہ وہ سوال کریں کہ ''کیا آپ ثروت کو نہیں چھوڑ سکتے؟'' مگر وہ یہ سوال نہ کر سکے۔ مگر شاید اسد نے ان کی آنکھوں میں یہ سوال پڑھ لیا تھا، تب ہی تو بے بس لہجہ میں بولے۔

''سرمد! یہ مت کہنا کہ میں ثروت کو چھوڑ دوں...... میں چاہوں بھی تو اسے نہیں چھوڑ سکتا..... میں اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں۔ اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

'پھر وہی بے بسی۔' سرمد نے سلگتے ذہن سے سوچا۔ ابا جان بھی تو اسی محبت کے ہاتھوں امی جان کے سامنے مجبور ہو جاتے تھے، بے بس ہو جاتے تھے۔ یہ عورتیں جانے کیا جادو پھیرتی ہیں کہ ہم مرد دیوانے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کا حل یہی ہے کہ ہر عورت کے سائے سے بھی دور رہا جائے۔ نہ محبت کی جائے، نہ انہیں خود پر حاوی ہونے دیا جائے۔ کافی دنوں بعد ایک بار پھر ان کی پرانی سوچ لوٹ آئی تھی۔

''خیر ابھی سے آپ گھر چھوڑنے کے بارے میں نہ سوچیں۔'' چند لمحوں بعد سرمد نے دھیمے لہجے میں سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''کوئی موقع دیکھ کر میں اماں بی سے اور خود ابا جان سے بھی بات کروں گا۔ شاید میں انہیں رضامند کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔''

''امید تو نہیں ہے۔'' اسد مایوسی سے مسکرائے۔ ''خیر تم بھی ایک کوشش کر کے دیکھو۔''

باقی راستہ خاموشی سے کٹ گیا تھا۔

گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے اسد اپنے کمرے کی طرف چلے گئے تھے۔ جبکہ سرمد، عاتکہ بیگم کے کمرے میں چلے آئے تھے۔

''کون؟'' دستک کی مخصوص آواز پر عاتکہ بیگم نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ ''اندر چلے آؤ سرمد بیٹا!'' ان کے لہجہ میں ممتا گھل گئی تھی۔

''آداب اماں بی!'' سرمد مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ سامنے ہی عاتکہ بیگم بیڈ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں۔

''کیسی ہیں آپ؟'' سرمد کشن کھینچ کر ان کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ ''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''یہ اچانک تمہیں میری طبیعت کا کیسے خیال آ گیا؟'' عاتکہ بیگم مسکراتے ہوئے بولیں۔ ''جب سے تم آئے ہو، میں خود کو ہر طرح صحت مند اور توانا محسوس کرتی ہوں۔''

''مگر میں نے اکثر آپ کو پریشان اور متفکر پایا اور لاکھ کوشش کے باوجود اس کی وجہ نہیں جان سکا۔ مگر آج...... مجھے وجہ معلوم ہو گئی ہے۔'' سرمد، دادی کی گود میں سر رکھ کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کے وجود میں بسی ممتا کی مہک نے سرمد کو سرتاپا اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

''کیا کہہ رہے ہو سرمد؟'' عاتکہ بیگم نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔

''آپ کو معلوم ہے آج میں کہاں گیا تھا؟'' سرمد نے گود سے سر اٹھا کر دادی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''آج میں ندرت خالہ کے گھر گیا تھا۔''

''ندرت؟'' عاتکہ بیگم کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا۔ ''کیا اسد کے ساتھ گئے تھے؟'' انہوں نے ٹھہرے لہجہ اور بے حد دھیمی آواز میں سوال کیا۔

''جی...... شاید وہ مجھے ثروت سے ملوانے لے گئے تھے۔'' سرمد نے وضاحت کی۔ ''وہ ثروت سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''مگر تمہارے ابا جان اس شادی کے لئے راضی نہیں ہیں۔''

''کیوں؟'' سرمد نے زیرلب سوال کیا۔

''وہ ندرت کے گزشتہ روّیے کی وجہ سے اس رشتہ کے حق میں نہیں ہیں۔''

''ہوسکتا ہے، ندرت خالہ کا روّیہ پہلے درست نہ ہو۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ واقعی پہلے ان کا روّیہ درست نہیں تھا تو غلط نہ ہوگا۔'' سرمد نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''مگر کل رات ان سے اور ان کی فیملی سے ملنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اب ان کا روّیہ خاصا بدل گیا ہے۔ اب پہلے والی غصیلی، حاسد اور بی جمالو قسم کی ندرت خالہ کی جگہ ایک سنجیدہ، تدبر والی، خوش اخلاق اور بے حد محبت کرنے والی خاتون نے لے لی ہیں۔ اگر اب آپ ان سے ملیں گی تو آپ بھی ان کے بارے میں یہی رائے قائم کریں گی۔''

''وہ سب ٹھیک ہے مگر......'' عاتکہ بیگم نے کچھ کہنا چاہا مگر سرمد نے درمیان میں ہی ان کی بات کاٹ دی۔

''اماں بی! آپ جانتی ہیں کہ ندرت خالہ کی نیچر کی وجہ سے میں بھی انہیں ناپسند کرتا تھا۔ اور چھوٹے پن کے باوجود میں چاہتا تھا، ابا جان انہیں ہمارے گھر آنے سے منع کر دیں۔ اور جب امی جان کے انتقال کے بعد ابا جان نے ان سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر لئے تو مجھے ایک طرح سے خوشی ہوئی تھی......'' سرمد دم لینے کو دم بھر کو رُکے۔

''مگر پردیس جا کر، اپنوں سے دُور رہ کر میں نے آپ سب کے بارے میں سوچا۔ لحہ لحہ سوچا۔ اور جب اپنوں کا خیال آتا تھا تو ندرت خالہ اور ان کی فیملی کا بھی خیال آتا تھا۔ کچھ بھی ہو، ان میں لاکھ برائیاں سہی، پر ہیں تو وہ ہماری رشتے دار۔ امی جان کی وہ اکلوتی بہن ہیں۔ کہیں گوشت سے ناخن کو بھی نوچ کر الگ کیا جا سکتا ہے؟ اور پھر اب تو وہ بہت بدل چکی ہیں، ان کی نیچر تبدیل ہوگئی ہے۔ آپ ملیں گی تو آپ بھی حیران ہوں گی۔''

''بیٹا! میں...... میں تو......'' عاتکہ بیگم کا جملہ اس بار بھی ان کے منہ میں ہی رہ گیا۔ سرمد نے ان کے قریب بیٹھ کر ان کے ہاتھ تھام لئے تھے۔

''حالات، وقت اور عمر نے شاید انہیں تبدیل کر دیا...... وہ پہلے والی ندرت خالہ اب بالکل بھی نہیں رہیں۔ سچ کہہ رہا ہوں۔''

''ہوسکتا ہے تمہاری بات درست ہو۔ مگر بزرگوں سے یہی سنا ہے، کھٹائی سوکھنے کے بعد بھی اپنی کھٹاس اور تلخی نہیں ختم کرتی۔ بڑھتی ہوئی عمر، عادتوں کو مزید پختہ کر دیتی ہے، نہ کہ فطرت تبدیل کر دیتی ہے۔ میں کبھی بھی نہیں مان سکتی کہ ندرت جہاں کی فطرت تبدیل ہوگئی ہے۔''

''اماں بی!'' سرمد نے بے بسی سے دادی کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ ''آپ سمجھنے کی کوشش کریں نا۔ اسد بھائی، ثروت سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''میں یہ بات جانتی ہوں۔'' عاتکہ بیگم نے کھوئے کھوئے لہجہ میں جواب دیا۔ ''اور یہ بھی جانتی ہوں کہ اسد کسی کے بھی منع کرنے سے مانیں گے نہیں۔''

''تو پھر آپ ابا جان سے کیوں نہیں کہتیں کہ وہ مان جائیں؟''

''میں ان سے کہہ کر دیکھ چکی ہوں۔'' عاتکہ بیگم کے دھیمے لہجے میں کرب شامل ہو گیا تھا۔ ''مگر وہ بھی اپنی ضد کے پکے ہیں۔ وہ کسی بھی قیمت پر ثروت کو اس گھر کی بہو بنا کر لانے کو تیار نہیں۔''

''اوہ......'' سرمد سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو اس سلسلے میں میں خود ابا جان سے بات کر کے دیکھوں؟'' سرمد نے ہچکچاہٹ بھرے لہجہ میں پوچھا۔

''کیوں نہیں۔'' عاتکہ بیگم نے بے ساختہ جواب دیا۔ ''شاید تمہاری بات ان کی سمجھ میں آ جائے۔''

سرمد ہر حال میں اور کسی بھی طرح سے اپنے چھوٹے سے آشیانے کے تنکے بکھرنے سے روکنا چاہتے تھے۔ گھر میں افراد ہی کتنے تھے۔ وہ ان چار افراد پر مشتمل گھرانے کا شیرازہ بکھرنے سے بچانے کے خواہاں تھے۔ اتنے بڑے محل نما گھر کے ہوتے ہوئے اسد اپنی بیوی کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہیں اور باپ کی لاکھوں کروڑوں کی دولت اور پورے ملک میں پھیلے ہوئے کاروبار کے ہوتے ہوئے وہ کسی اور فرم یا ادارے میں ملازمت کریں..... یہ سب باتیں سوچ کر ہی سرمد ہراساں ہو جاتے تھے۔ اور ان کے خیال میں اسد کی خواہش کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ انہیں اپنا جیون ساتھی چننے کا حق تو مذہب نے بھی دیا تھا۔ اب ان کا انتخاب اس خاتون کی بیٹی تھی، جس سے وجاہت مرزا شدید نفرت کرتے تھے۔ تو اس میں بھلا ان کا کیا قصور تھا۔ سو سرمد نے خود وجاہت مرزا سے مل کر اسد کی وکالت کا فیصلہ کیا تھا۔

دروازے پر ہلکی سی دستک پر وجاہت مرزا نے دروازے کی طرف دیکھے بنا ہی دروازے پر موجود شخص کو اندر آنے کا عندیہ دے دیا تھا۔

''آداب ابا جان!'' سرمد کی نرم اور سحر خیز آواز سنتے ہی انہوں نے فائلوں پر جھکا سر اُٹھا کر سامنے کی طرف دیکھا تھا جہاں سرمد لبوں پر دلکش مسکان سجائے کھڑے تھے۔

''ارے سرمد!.....تم؟'' ان کے لہجہ سے حیرت بھری مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''آؤ آؤ.....آج اس طرف کیسے نکل آئے؟'' انہوں نے سامنے دھری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''بیٹھو!''

''شکریہ۔'' سرمد کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

''آج کل کام اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وجاہت مرزا اکثر فائلوں کا انبار گھر اُٹھا لاتے تھے اور رات گئے تک انہی فائلوں میں سر دیئے بیٹھے رہتے تھے۔ اس وقت بھی وہ فائلوں کی ہی ورق گردانی میں مصروف تھے۔

''میں آپ سے ایک بات کرنے آیا ہوں۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد سرمد نے ہچکچاتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔ ''ایک بے حد ضروری بات تھی۔''

''ہاں ہاں بولو۔'' وجاہت مرزا نے فائل بند کرنے سے پہلے ایک طائرانہ نگاہ فائل پر ڈالتے ہوئے سرمد سے کہا۔

''میں اسد بھائی کی شادی کے سلسلے میں......'' سرمد جملہ ادھورا چھوڑ کر باپ کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھنے لگے۔

''کیا انہوں نے تم سے کہا کہ تم مجھ سے بات کرو؟'' وجاہت مرزا کی کشادہ پیشانی پر سمٹ آنے والی سلوٹیں بے حد نمایاں تھیں۔

''جی نہیں۔'' سرمد نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''میں اپنے تئیں آپ سے اس موضوع پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ کل شام وہ مجھے ندرت خالہ کے گھر لے گئے تھے۔ وہاں میں نے ثروت کو دیکھا۔ وہ ایک اچھی لڑکی ہے اور......''

''وہ لاکھ اچھی ہو، مگر ہے تو ندرت جہاں کی بیٹی۔'' وجاہت مرزا کے لہجہ میں کڑواہٹ ہی کڑواہٹ تھی۔ ''ہمیشہ یاد رکھو! سانپ کے بچے سنپولیے ہی ہوتے ہیں۔ اور سانپ کو جتنا بھی دودھ پلا لو......ڈسنا ہی اس کی فطرت ہے۔''

''وہ تو ہے۔'' سرمد سٹپٹا کر بولے۔ ''مگر ابا جان!......اب......''

''اب اور آئندہ......تا حیات میرا فیصلہ وہی رہے گا۔ اسد کی شادی ثروت سے ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی۔'' وجاہت مرزا کے لہجہ میں چٹانوں کی سختی تھی۔ سرمد کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس سلسلے میں اتنے جارحیت پسند اور ضدی ثابت ہوں گے۔ لیکن اب بات شروع ہو ہی چکی تھی تو وہ اپنا نقطہ نظر بیان کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

''مگر آپ جانتے ہیں کہ اسد بھائی، ثروت سے ہر حال میں شادی کے خواہاں ہیں۔ اور اس شادی کی خاطر وہ آپ کو، اماں بی کو، مجھ کو اور اس گھر کو چھوڑ کر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

''کیا؟'' وجاہت مرزا نے بے یقین نظروں سے سرمد کی طرف دیکھا۔ ''کیا کہا تم نے؟''

''جی ابا جان! جلد ہی اسد بھائی یہ گھر اور ہم سب کو چھوڑ کر جانے والے ہیں۔'' اپنی بات کا اثر ہوتے دیکھ کر سرمد نے اور زیادہ تاثر بھرے لہجے میں کہا۔ ''وہ نوکری کی تلاش میں ہیں۔ نوکری ملتے ہی وہ ہم سب کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔''

وجاہت مرزا کے بوڑھے مگر وجیہہ چہرے پر ایک متوحش سی کیفیت پھیلی ہوئی تھی۔ وہ آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی لئے سرمد کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ تو اپنے تئیں یہ یقین کئے بیٹھے تھے کہ اسد نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں...... مگر......

انہیں اپنے سینے میں ایک ہلچل سی مچتی محسوس ہو رہی تھی۔ پورے وجود میں ایک بھونچال سا جاگتا محسوس ہو رہا تھا۔

''سرمد! کیا یہ سب سچ ہے؟'' انہوں نے ڈوبتے لہجہ میں سوال کیا۔

''جی امی جان!'' سرمد جلدی سے بولے۔ ''اگر اسد بھائی اپنا ارادہ بدلنے کو تیار نہیں ہیں تو آپ بھی اپنے فیصلے میں کچھ لچک لا کر اس گھر کو بکھرنے سے بچا لیجئے۔'' وجاہت مرزا جو کہ سرمد کی بات کے آغاز پر کرسی سے کھڑے ہو گئے تھے، دھپ سے کرسی پر بیٹھ گئے۔

❀===❀===❀

اگلے دن یونس لاکھانی، ایس رحمان کے دفتر پہنچا۔
''اوہو.....لاکھانی! کہاں ہو بھئی تم آج کل؟'' ایس رحمان نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا تھا۔
''بس سر! جی رہے ہیں، آپ کے سہر میں۔'' لاکھانی نے دانت نکالتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ کیا کر رہے ہیں آج کل؟''
''اب بھئی آج کل میں نئی فلم شروع کرنے والا ہوں۔'' ایس رحمان نے خوشی سے مہکتے لہجہ میں کہا۔
''اچھا.....؟'' لاکھانی کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ ''کب.....کیسے؟.....میرا مطلب ہے خود ہی فنانس کر رہے ہیں..... یا.....''
''نہیں.....ایک اچھا پروڈیوسر مل گیا ہے۔'' ایس رحمان مسکرایا۔ ''تمہارا وہ فنانسر.....کیا نام ہے اُس کا.....؟''
''رسید۔'' لاکھانی نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔
''ہاں، وہی عبدالرشید.....وہ تو بالکل ہی بیکار نکلا۔ فلم بنانے کے بجائے مہکار کی زلف گرہ گیر کا قیدی ہو کر رہ گیا تھا۔ مگر اب مجھے ایک کام کا آدمی ملا ہے۔ پیسہ بھی ہے اور فلم بنانے کا جذبہ بھی۔''
''اچھا.....'' لاکھانی نے سر ہلایا۔ ''فلم کی ہیروئن؟''
''فلم کی ہیروئن.....؟'' ایس رحمان نے سوالیہ نظریں اُٹھائیں۔
''میرا مطلب تھا، فلم میں کسے ہیروئن لے رہے ہیں؟'' لاکھانی نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔
''میں نے کلیم اللہ کو نئی لڑکیاں دکھائی تھیں۔'' ایس رحمان نے جواب دیا۔ ''مگر اُسے مہکار پسند آئی ہے۔''
''مہکار؟'' لاکھانی نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔
''ہاں.....اسی لئے میں نے اسے سائن بھی کر لیا ہے۔''
''اچھا.....'' لاکھانی نے ایک بار پھر سر ہلایا۔ یہ خبر اس کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوئی تھی۔ وہ ایس رحمان کے دفتر سے نکل کر سیدھا عبدالرشید کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ رشید کو بھی اس خبر کی خبر ہے یا نہیں۔ چنانچہ اس نے رشید کو یہ سب بتانے کا فیصلہ کیا تھا۔
''کچھ معلوم بھی ہے رسید بھائی!'' رشید کے آفس پہنچتے ہی اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''مجھے تو سن کر جھٹکا لگا تھا۔''
''کیا ہوا؟'' رشید نے فائلوں سے سر اٹھا کر لاکھانی کی طرف دیکھا۔ آج کل وہ بڑی سنجیدگی سے کاروبار پر توجہ دے رہا تھا۔ جب سے مالی پوزیشن خراب ہونی شروع ہوئی تھی، وہ خاصا فکرمند ہو گیا تھا۔ جہاں تک مہکار کا تعلق تھا، اسے کبھی بھی اس سے سنجیدہ محبت نہیں ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں وہ اسے بہت اچھی لگی تھی۔ اور فطری حُسن پرستی کے باعث وہ اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ اس کی فریفتگی اور دیوانگی میں کمی آتی جا رہی تھی۔ اُدھر مہکار اور خاص طور

پر گلبہار کا روّیہ بھی اب خاصا تبدیل ہو گیا تھا۔ اس لئے بھی رشید خاصا بددل ہوا تھا۔

''ایس رحمان فلم بنا رہا ہے۔'' لاکھانی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا۔

''تو.....؟'' رشید کو ایس رحمان سے ایسی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

''اُس نے ایک موٹا مرگا (مرغا) پروڈیوسر کے طور پر پکڑا ہے۔'' لاکھانی نے بات آگے بڑھائی۔ ''فلم کی سب کاگذی تیاری مکمل ہوگئی ہے۔ دو چار روز میں وہ فلم سروع کرنے والا ہے۔''

''لاکھانی!.....اگر ایسا کچھ ہو رہا ہے.....تو مجھے کیا؟'' رشید نے تحمل بھرے لہجہ میں جواب دیا۔

''ارے رسید بھائی!.....آگے تو سنو۔'' لاکھانی جلدی سے بلا۔ ''ابھی پوچھو، اس فلم کی ہیروئن کون ہے؟''

''ہیروئن؟'' رشید چونک کر سیدھا ہوتا ہوا بولا۔ ''کون ہے ہیروئن؟''

''وہ اپنی مہکار......وہی فلم کی ہیروئن ہے۔ اس نے فلم سائن بھی کر لی ہے۔ اور ایڈوانس بھی پکڑ لیا ہے۔''

''اچھا۔'' رشید نے بے یقین نظروں سے لاکھانی کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں کس نے بتایا؟''

''کھود (خود) ایس رحمان نے.....'' لاکھانی جلدی سے بولا۔ ''ابھی میں اسی کے پاس سے آ رہا ہوں۔ بول رہا تھا کہ اس نے کلیم اللہ کو اور بھی کئی لڑکیاں دکھائی تھیں مگر اس کو مہکار ہی پسند آئی۔ آج کل وہ مہکار کے گھر کا چکر لگا رہا ہے اور دونوں ہاتھوں سے دولت اس پر لٹا رہا ہے۔''

''اوہ اچھا۔'' رشید نے پاؤں آگے کی طرف پھیلا کر پشت کرسی سے ٹکا دی۔ ''یہ سب کب سے ہو رہا ہے؟''

''کھدا (خدا) معلوم کب سے ہو رہا ہے؟.....میں تو اُدھر جاتا ہی کم تھا۔ آپ ہی روز جاتے تھے.....آپ کو جیادہ معلوم ہونا چاہئے۔''

''نہیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔'' رشید نے نفی میں سر ہلایا۔

''آپ کو اس کے روّیے سے بھی کچھ اندازہ نہیں ہوا؟'' لاکھانی نے پوچھا۔

''ہاں۔ روّیے سے تو اندازہ ہوا.....مگر میں نے سوچا، شاید میری پتلی مالی حالت کی وجہ سے یہ سب ہو رہا ہے۔'' رشید نے پُرسوچ انداز میں جواب دیا۔

''بس رسید بھائی! اس ٹائپ کی عورتیں بس ایسی ہی ہوتی ہیں۔ بندے کو کنگال کر کے راستہ بدل لیتی ہیں۔'' لاکھانی نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔ مگر رشید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''اب آپ نے کیا سوچا ہے؟'' اسے خاموش دیکھ کر لاکھانی نے سوال کیا۔

''سوچنا کیا ہے؟'' رشید نے لاپروائی کے اظہار کے طور پر کندھے اُچکائے۔ ''تم رُوٹھے، ہم چھوٹے.....'' وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔ ''میں نے کون سا اس سے نکاح پڑھوا لیا تھا جو پریشان ہوتا پھروں...... بھاڑ میں جائے میری طرف سے۔''

''اوہ......'' لاکھانی کو رشید سے اس قدر لاتعلقی کی توقع نہیں تھی۔ اسے حیرت ہوئی۔ رشید تو مہکار سے بھی زیادہ ہرجائی ثابت ہوا تھا۔

''مگر رسید بھائی! سوچو! آپ اس پر کتنا روپیہ برباد کر چکے ہو۔''

''ہاں! وہ تو ہو چکا۔'' رشید ایک بار پھر مسکرایا۔

''تو جو برباد ہو چکا، ہو چکا۔ جو بچا ہے، اسے تو بچا لیجئے۔'' لاکھانی آواز میں تاثر پیدا کرتا ہوا بولا۔ ''آپ کم از کم وہ فلیٹ بھی کینسل کر دیجئے جو آپ نے مہکار کے نام بُک کیا تھا۔''

''کون سا فلیٹ؟'' رشید نے حیران نظروں سے لاکھانی کی طرف دیکھا۔
''آپ نے اپنے پروجیکٹ میں اس کے نام پر ایک فلیٹ بک کیا تھا؟''
''نہیں.....ایسا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ بس میں نے اُسے ایسے ہی کہہ دیا تھا۔''
''مگر اُس کے پاس تو شاید فائل بھی تھی۔'' لاکھانی کو حیرت ہو رہی تھی۔
''ارے لاکھانی بھائی! ہم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ میں نے تو بس ایسے ہی اسے ذرا خوش کر دیا تھا۔ ورنہ کوئی فلیٹ ولیٹ نہیں بک کیا تھا۔''
''اچھا۔'' لاکھانی کی حیران آنکھیں کچھ اور پھیل گئی تھیں۔ وہ تو مہکار کو ہی عیار سمجھتا تھا، مگر یہ رشید تو اس سے اور خود اس سے بھی دو ہاتھ آگے ثابت ہوا تھا۔ وہ کئی لمحوں تک صدمے سے دوچار رہا۔ بلاوجہ فلیٹ کو بنیاد بنا کر مہکار سے جھگڑا مول لیا تھا۔
''اچھا تو......پھر اب......؟'' کافی دیر بعد اس نے مری ہوئی آواز میں سوال کیا۔
''اب کیا......کچھ بھی نہیں۔'' رشید مطمئن انداز میں مسکرایا۔ ''اللہ اللہ خیر سلاّ۔''
''سچی رسید بھائی! آپ بھی کسی سے کم نہیں ہو۔''
''شکریہ لاکھانی بھائی!'' رشید مسکرایا۔ ''چائے پیو گے؟''
''نہیں......ابھی میں جرا جلدی میں آیا ہوں۔'' لاکھانی اُٹھ کھڑا ہوا۔ رشید کے آفس سے نکل کر وہ چپکے سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔ مہکار اور رشید کا چیپٹر از خود کلوز ہو گیا تھا۔ اس خبر کے مشتہر ہونے سے پہلے ہی وہ سلطانہ کے پاس پہنچ کر آخری قسط کے طور پر اس سے کچھ روپیہ اینٹھ لینے کی آخری کوشش کر لینا چاہتا تھا۔
''ارے ارے.....ادھر کدھر؟'' اسے سر اُٹھا کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر چھوٹو نے حیرانی سے بازو پھیلاتے ہوئے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔
''ماں جی کہاں ہیں؟'' لاکھانی کو چھوٹو کا اس طرح راستے میں روکنا ناگوار گزرا تھا۔ ''میں اُنہی سے ملنے آیا ہوں۔''
''ماں جی ابھی سو رہی ہیں۔'' چھوٹو نے رُکھائی سے جواب دیا۔ ''شام کو آنا۔''
''چھوٹو! کیسی باتیں کر رہا ہے؟......مجھے پہچانتا نہیں کیا؟'' لاکھانی نے قدرے غصیلے لہجے میں سوال کیا۔
''میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔'' چھوٹو تدبر سے مسکرایا۔ تب ہی ایسی باتیں کر رہا ہوں۔ بھولی بھالی ماں جی کو بے وقوف بنا کر پیسے اینٹھتے ہو؟''
''ارے میرے باپ!.....ماں جی اور بھولی بھالی؟'' لاکھانی نے سر پیٹتے ہوئے کہا۔ ''تیرے اور میرے جیسوں کو ماں جی بجار (بازار) میں لے جا کر بیچ دیوے اور کسی کو کھبر بھی نہ ہووے۔'' لاکھانی کی آواز بے حد دھیمی تھی۔
''ارے چھوٹو!.....کون ہے؟'' اندر سے سلطانہ کی آواز سنائی دی۔
''میں ہوں ماں جی!'' لاکھانی چھوٹو کو ہاتھ سے ایک جانب ہٹاتا ہوا لپکتا ہوا اندر کی طرف بڑھا۔ ''آپ کو سلام کرنے آیا تھا۔''
''اچھا اچھا، تو ہے۔'' سلطانہ اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''کافی دنوں بعد آیا ہے......کہاں تھا؟ اور وہ میرے کام کا کیا بنا؟''
''آپ کے کام میں ہی تو لگا ہوا تھا۔'' لاکھانی جلدی سے بولا۔ ''اسی بھاگ دوڑ میں کئی دنوں سے میں اِدھر بھی نہ آسکا۔

''اچھا...کیا ہوا؟'' سلطانہ نے بے تابی سے پوچھا۔ ''تیری بھاگ دوڑ کا کچھ نتیجہ بھی نکلا یا نہیں؟''

''ارے نکلا نا۔'' لاکھانی قریب کھسکتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔ ''ماں جی! سمجھو تمہارا کام ہو گیا۔ رسید بھائی نے مہکار سے پیچھا چھڑانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''اچھا......'' سلطانہ نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ''تجھے کیسے پتہ چلا؟''

''میں نے ہی تو یہ سب چکر چلایا ہے۔'' لاکھانی فخریہ انداز میں مسکرایا۔ ''وہ فلم میں ہیروئن بننا چاہتی تھی، میں نے ایک پروڈیوسر ڈھونڈ کر اسے دے دیا۔ اب وہ فلم میں کام کرے گی۔ بھلا اُسے اب رسید بھائی سے چکر چلانے کی کدھر فرصت ہے؟''

''اچھا.....تو گویا.....اس سے رشید کی جان چھوٹ گئی۔'' سلطانہ نے مسرت بھرے لیکن کسی قدر بے یقین لہجہ میں پوچھا۔

''جی.....آپ کو کھود جلد ہی پتہ چل جائے گا۔ اب رسید بھائی پوری توجہ اپنے کاروبار پر دے گا۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' سلطانہ نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے۔

''وہ......ماں جی!......آپ نے انعام کا وعدہ کیا تھا۔'' کچھ دیر بعد لاکھانی نے ہچکچاتے لہجہ میں کہا۔ ''اب جبکہ کام ہو گیا ہے تو......''

سلطانہ نے لاکھانی کی طرف دیکھا۔

''بھئی یہ بات تو تُو کہہ رہا ہے......ابھی ثابت کب ہوا ہے کہ......ایسا ہو گیا ہے۔''

''آپ کو میری جبان (زبان) پر بھروسہ نئیں؟'' لاکھانی نے بے بسی سے سوال کیا۔

''نہیں۔'' سلطانہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ اور بے چارہ لاکھانی حیرت اور صدمے سے پلکیں جھپکا کر رہ گیا۔

⊛===⊛===⊛

تیز رفتار بس آہستہ ہوتے ہوتے آخر کار رک گئی تھی۔

''کالج.....کالج.....'' کنڈیکٹر نے چلّا کر اسٹاپ کی نشاندہی کی اور بس کے رُکتے ہی کالج کی طالبات بس سے اُترنے لگیں۔ فریال بھی نمو کا ہاتھ پکڑے بس سے باہر آ گئی۔ ان دونوں کا سکول گھر سے واکنگ ڈسٹنس پر تھا اور وہ ہمیشہ پیدل ہی اسکول جایا کرتی تھیں۔ یا کبھی کبھار پروفیسر آفاق انہیں اپنی گاڑی میں چھوڑ آتے تھے۔ اسی لئے انہیں بسوں میں سفر کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اور آج کے بس کے اس سفر نے اسے خاصا ہراساں و پریشان کر دیا تھا۔ مگر اس نے چہرے کے تاثرات سے اس بات کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔ اور نہ ہی زبان پہ حرفِ شکایت لائی تھی۔ بس خاموشی سے لباس درست کرتی، دوپٹہ سنبھالتی فریال کے ساتھ کالج کی سمت چل دی تھی۔

جولائی کے وسط سے برسات کا موسم لگ جانے کے باعث کراچی کا موسم خاصا خوشگوار ہو جاتا تھا۔ خصوصاً اگست کی ان اوائل تاریخوں میں تو عموماً آسمان بادلوں سے گھرا رہتا تھا۔ آج بھی کچھ ایسا ہی موسم تھا۔ نیلگوں آکاش سرمئی اودی بدلیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہوا کے نرم جھونکوں میں بے نام خنکی اور مبہم سی سرشاری کی کیفیت رچی ہوئی تھی۔ ہوا کی مدھر لَے پر سڑک کے کنارے لگے اِکا دُکا پیڑ مسحور کُن انداز میں جھومتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ موسم کی خوشگواریت کا فریال کے مزاج پر بھی اثر ہوا تھا اور وہ خاصی خوش اور چونچال دکھائی دے رہی تھی۔

''نمو! لگتا ہے آج تو بارش ہو گی۔'' اس نے آسمان کی سمت دیکھتے ہوئے پُر امید لہجے میں کہا۔ چند لمحوں کے توقف

کے بعد نمو کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے خود ہی اپنی بات آگے بڑھائی۔
''بھلا بتاؤ، ساون کا مہینہ جا نکلا ہے.....اور.....ایک ہمارا شہر ہے کہ.....''
''ساون کا مہینہ؟'' نمو نے آنکھوں میں حیرت بھر کر سوالیہ نظروں سے فریال کی طرف دیکھا۔
''ہاں، ساون کا مہینہ۔'' فریال اپنی معلومات پر فخریہ انداز میں مسکرائی۔ ''جانتی ہو، پہلے زمانے میں ساون کو بڑے اہتمام سے منایا جاتا تھا۔ دھانی، اودی اوڑھنیاں رنگی جاتیں، پیڑوں پر جھولے ڈالے جاتے۔ اور طرح طرح کے پکوانوں کے ساتھ ساون کے رسیلے گیت الاپے جاتے۔ اب تو سب ہی کچھ بدل گیا۔ نہ پہلے جیسا ساون، یعنی برسات کا موسم آتا ہے اور نہ پہلے جیسا اہتمام ہوتا ہے۔ بس آسمان پر سرمئی بادل چھاتے ہیں اور بِن برسے اُڑ جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھا برس کر، جل تھل کر کے برسوں کے لئے راستوں، سڑکوں، الیکٹرک اور ٹیلی فون کے نظام کو درہم برہم کر جاتے ہیں۔''
نمو نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ بس تائید بھرے انداز میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ آج وہ پہلی بار کالج جا رہی تھی، اس لئے خاصی نروس ہو رہی تھی۔ اس شام نمو سے ملنے کے بعد گھر جا کر فریال نے اپنے سارے حالات پروفیسر آفاق کے گوش گزار کر دیئے تھے۔
''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟'' آفاق صاحب نے پُرتشویش لہجے میں کہا تھا۔
''مجھے تو خود آج ہی سب کچھ پتہ چلا ہے۔'' فریال کے افسردہ لہجے میں اپنی بے خبری پر پچھتاوے کا ہلکا سا احساس بھی شامل تھا۔ ''مجھے تو لگتا ہے پاپا! کہ حسنہ بھابی چاہتی ہی نہیں ہیں کہ نمو کالج میں داخلہ لے.....اور جہاں تک انو بھیا کا تعلق ہے، تو وہ بیوی کی رائے سے اختلاف کے بارے میں شاید سوچ بھی نہیں سکتے۔''
''نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔'' پروفیسر آفاق نے فریال کی مایوسی کم کرنے کی کوشش کی۔ ''ہوسکتا ہے مالی حالات کی وجہ سے اس لیت و لعل کی نوبت آئی ہو۔ ورنہ ایسا نہیں ہے کہ انو، نمو کی تعلیم کے خلاف ہو۔ اور اگر خدانخواستہ کبھی ایسا ہوا تو میں خود انو سے بات کروں گا۔ نمو ایک بہت لائق اور ہونہار طالبہ ہے۔ اسے اپنی تعلیم جاری رکھنے کا موقع ملنا ہی چاہیے۔''
اور اگلے ہی دن آفاق صاحب نے نمو کی ایڈمیشن فیس جمع کروا دی تھی۔ نمو کا داخلہ فارم پرنسپل صاحبہ کے سامنے پہنچا تو انہوں نے فوری طور پر فریال کو اپنے کمرے میں بلوا لیا تھا، اور نمو کو ساتھ لا کر ان سے ملوانے کی درخواست کی تھی۔
سڑک کا موڑ مڑتے ہی کالج کی دومنزلہ شاندار عمارت سامنے آ گئی تھی۔ فریال، نمو کا ہاتھ تھامے پرنسپل کے رُوم کی طرف بڑھ گئی تھی۔ پرنسپل کے آفس کے سامنے برآمدے میں خاکی وردی میں ملبوس پیون کو نمرہ کے نام کی چٹ دے کر وہ دونوں سامنے حدِ نگاہ تک پھیلے سرسبز و شاداب لان کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔ گھاس کے سبز مخملیں فرش پر لڑکیاں بیٹھی بے فکری سے خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ کونے میں بنی کینٹین کے سامنے کوک کی بوتلیں ہاتھوں میں تھامے دو لڑکیاں زور زور سے ہنس رہی تھیں۔ یہ سب کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ ہر سمت زندگی ہی زندگی تھی۔
''آیئے۔'' پیون نے دروازے سے جھانک کر نمرہ اور فریال کو مشترکہ طور پر مخاطب کیا۔ اور وہ دونوں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ پرنسپل سے اجازت لے کر فریال، نمرہ کا ہاتھ تھامے کمرے میں داخل ہوئی۔
یہ ایک کشادہ مستطیل نما ہوادار روشن کمرہ تھا۔ کھڑکیوں پر ہلکے ہلکے رنگ کے پردے لٹکے ہوئے تھے۔ پردوں کے ہم رنگ مگر قدرے گہرے رنگ کا قالین فرش کی زینت بڑھا رہا تھا۔ بائیں جانب کی دیوار کے ساتھ دھرا ایک بڑا شوکیس مختلف قسم کی ٹرافیز، شیلڈز سے بھرا پڑا تھا۔ ان انعامات سے اس کالج کی بہترین کارکردگی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ کمرے کے وسط میں دھری کنگ سائز میز کی دوسری جانب ریوالونگ چیئر پر براجمان ادھیڑ عمر کی خوش شکل اور باوقار خاتون، نمرہ اور فریال کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی سیٹ سے کھڑی ہو گئی تھیں۔

''آیئے آیئے۔'' انہوں نے نمرہ کو مخاطب کیا۔ ''مس نمرہ علی! میں آپ کو اپنے کالج میں خوش آمدید کہتی ہوں۔'' انہوں نے پُرخلوص انداز میں پہلے نمرہ اور پھر فریال سے ہاتھ ملایا۔ ''تشریف رکھئے۔'' ان دنوں کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنی کرسی سنبھال لی۔ ''آپ جیسی ہونہار، فرسٹ پوزیشن ہولڈر طالبہ کا ہمارے کالج میں داخلہ لینا ہمارے کالج کے لئے کسی اعزاز سے کم نہیں۔'' پرنسپل صاحبہ نے ممنون نظروں سے نمرہ کی طرف دیکھتے ہوئے تعریفی لہجہ میں کہا۔ ''اب یہ آپ کا کالج ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ آپ حسبِ سابق اپنے شاندار تعلیمی نتائج سے اس کالج کا بھی نام روشن کریں گی۔''

''جی ضرور۔'' نمو نے دھیمے مگر مؤدب لہجہ میں جواب دیا۔

پھر پرنسپل صاحبہ ان دونوں کو اسٹاف روم میں لے کر گئی تھیں۔ اور اپنے تمام اسٹاف ممبرز سے اس کا تعارف کروایا تھا۔

اور اگلے دن سے باقاعدہ کلاسز شروع ہوگئی تھیں۔ نمرہ کے شاندار تعلیمی ریکارڈ کی وجہ سے اس کی ٹیوشن فیس معاف کردی گئی تھی اور گورنمنٹ کی طرف سے ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کیا گیا تھا۔ یونیفارم اور کتابوں کا مسئلہ آفاق صاحب نے حل کردیا تھا۔ فریال کے ساتھ ہی اس کے لئے بھی تین عدد یونیفارم سلوا دیئے تھے اور کتابیں کاپیاں وہ فریال اور نمرہ کو ساتھ لے جا کر اُردو بازار سے خرید لائے تھے۔ اب بظاہر تمام مسائل حل ہو چکے تھے۔ نمو کی زندگی ایک مخصوص ڈگر پر چل نکلی تھی۔

وہ صبح صبح اُٹھتی، نماز اور تلاوتِ کلام اللہ سے فارغ ہوکر گھر کی صفائی کرتی، ناشتہ بناتی اور دوپہر کے لئے سالن تیار کرتی اور پھر خود تیار ہوکر کالج کے لئے روانہ ہو جاتی۔ اسٹاپ پر فریال اس کی منتظر کھڑی ہوتی۔ اور یوں دنوں ایک ساتھ بس میں سوار ہوکر کالج چل دیتیں۔ کالج سے واپسی پر یونیفارم اُتارتے ہی وہ باورچی خانے میں گھس جاتی۔ آٹا گوندھ کے گرم گرم روٹیاں ڈالتی اور حسنہ کو کھانا پیش کرتی۔ پھر کالج کا کام لے کر بیٹھ جاتی۔ شام ڈھلے انو آ جاتا۔ وہ اسے اور حسنہ کو چائے بنا کر دیتی اور رات کے کھانے کے لئے ہانڈی چڑھا کر ٹیوشن کے لئے آئے ہوئے بچوں کو پڑھنے بیٹھ جاتی۔ پروفیسر آفاق کی مہربانی سے چند بچے اس کے پاس ٹیوشن پڑھنے آنے لگے تھے، جن کی ٹیوشن فیس کی وجہ سے اس کا بس کا کرایہ اور اوپر کا چھوٹا موٹا خرچ پورا ہو جاتا تھا۔ انو تو اس دن کے بعد سے گویا کہ اسے بھول ہی گیا تھا۔ ایڈمیشن فیس کا کیسے انتظام ہوا، یونیفارم اور کتابیں کیونکر خریدی گئیں؟ وہ ہر چیز سے بالکل ہی لاتعلق ہوگیا تھا۔ لگتا تھا اس گھر میں موجود وہ نمرہ کے وجود کو بھی بھول بیٹھا ہے۔ نمرہ نے بھی اسے کچھ یاد دلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تنہا ہی زندگی کے تپتے صحرا میں آبلہ پا چل دی تھی۔

حسنہ تو پہلے ہی کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتی تھی۔ اب تو پورے دن سے تھی، اس کے نخرے اور چڑچڑا پن عروج پر تھا۔ انو غلاموں کی طرح اس کے آگے پیچھے پھرتا، ہر آواز پر لبیک کہتا۔ نمو حتیٰ الوسع کوشش کرتی کہ کوئی بات بھی اس کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔ ہر چیز وقت سے پہلے وہ تیار رکھتی تھی اور کسی زر خرید لونڈی کی طرح ہر وقت الرٹ اور مستعد رہتی۔ مگر حسنہ کی تیوری کے بل کم نہ ہوتے۔ بات بات پر چیختی چلاتی، برتن اٹھا اٹھا کر پھینکتی۔ حتیٰ کہ اسے گالیاں دینے سے بھی گریز نہ کرتی۔ اگر وہ بے زبان گائے کی طرح بے ضرر اور خدمت گزار نہ ہوتی تو حسنہ جانے کب کا اسے گھر سے باہر کر چکی ہوتی۔ سب سے زیادہ نمو کے کالج سے اسے چڑ تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ کسی طرح اس کا کالج چھڑا دے۔

یونہی کچھ اور وقت بیت گیا۔ اب حسنہ ایک بیٹی کی ماں بن چکی تھی۔ بیٹی کی پیدائش پر جہاں انو بے حد خوش تھا، وہیں نمرہ کی خوشی کا بھی کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ننھی سی گڑیا کو دیکھ کر وہ خوشی سے نہال ہو اُٹھی تھی۔ پروفیسر آفاق کو پتہ چلا تو وہ حسبِ

عادت مٹھائی لے کر پہنچے تھے۔
''بھئی انو! بیٹی کی پیدائش بہت بہت مبارک ہو۔'' انہوں نے مسرور اور پُر خلوص لہجے میں مبارکباد دی۔ ''نمو کی طرح اپنی بیٹی کو بھی خوب اچھی تعلیم دینا...... سمجھے؟'' انو کا کندھا تھپکتے ہوئے انہوں نے پیار بھری نصیحت کی۔ اور جانے کیوں، نمو کے ذکر پر انو کچھ چور سا ہو گیا تھا۔

گڑیا کے آ جانے سے نمو کا کام اور بڑھ گیا تھا۔ اب اس کی ذمے داریوں میں گڑیا کو سنبھالنا اور اس کی دیکھ بھال بھی شامل تھی۔ مگر وہ اس اضافی کام پر پریشان ہونے کے بجائے بے حد خوش تھی۔ سانولی سلونی، گل گوتھنی سی گڑیا اسے دیکھ کر مسکراتی، یا اس کی گود میں آنے کے لئے ہمکتی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور اس کی تمام تھکن ڈھل جاتی۔ رفتہ رفتہ انو، نمو سے بالکل ہی لاتعلق ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ اب وہ اس سے بات تک نہ کرتا تھا۔ حسنہ اس سے کیسا سلوک روا رکھے ہوئے ہے، کس طرح زیادتیاں کرتی ہے، نمو کتنی کسمپرسی اور کرب و اذیت کی زندگی بسر کر رہی ہے..... انو کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ نمو کے پاس سے اکثر یوں گزر جاتا جیسے اسے جانتا ہی نہ ہو۔ کبھی جو بھولے سے اس کی نگاہ نمو کی طرف اُٹھ بھی جاتی تو ان نگاہوں میں اس قدر اجنبیت اور سرد مہری ہوتی کہ نمو کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر اُترتی محسوس ہوتی۔ اُس کا ننھا سا دل انو کے روّیے پر لہو لہو ہو جاتا اور وہ اپنے آپ کو بھی اجنبی لگنے لگتی۔ اس نے کب سوچا تھا۔ اتنا چاہنے والا، جان دینے والا بھائی یوں غیر اور اجنبی سا ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھی وہ سوچتی، کاش! بھیا نے اسے اتنا پیار نہ دیا ہوتا...... اتنا بے حد و حساب خیال نہ رکھا ہوتا...... ان کا ہمیشہ سے ہی ایسا ہی سرد اور بے رُخی والا روّیہ ہوتا تو اسے آج اسے کرب اور اذیت کے صحرا سے تو نہ گزرنا پڑتا۔

فرسٹ ایئر کے امتحان ختم ہو چکے تھے اور سیکنڈ ایئر کی کلاسز شروع ہو چکی تھیں۔ سب ہی کو فرسٹ ایئر کے رزلٹ کا انتظار تھا۔ رزلٹ آیا تو حسبِ توقع نمرہ نے ہر مضمون میں بہترین مارکس حاصل کئے تھے۔

''مجھے یقین ہے کہ انٹر میں بھی پوزیشن تمہاری ہی ہو گی۔'' فریال نے مسرت بھرے لہجے میں کہا تو جانے کیوں نمرہ کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ اس راہ پر تو بھیا نے اس کی انگلی پکڑ کر اسے چلانا سکھایا تھا۔ کامیابیاں حاصل کرنے اور آگے ہی آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا تھا۔ اور اب جبکہ وہ کامیابی کے سفر پر روانہ ہو گئی تھی، تو بھیا نے اس کے ہاتھ سے اپنی انگلی چھڑا لی تھی۔ شاید انہوں نے سوچا تھا کہ اب نمرہ کو اس کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ مگر نمرہ جانتی تھی کہ اسے تو قدم قدم پر بھیا کے سہارے کی، ان کے حوصلہ دلاتے لفظوں کی اور اس کی کامیابی پر ان کے چہرے پر بکھری خوشی کی روشنی کی ضرورت تھی۔ ان کی ہمدردی اور حوصلہ افزائی کا ایک جملہ اس کی روح پر چھائی ساری تھکن دھو سکتا تھا۔ اس کے مرجھائے ہوئے دل کو نو شگفتہ گلاب کی طرح کھلا سکتا تھا۔ مگر انو تو اسے یکسر فراموش کر بیٹھا تھا۔

گھر میں کام مزید بڑھ گیا تھا۔ کیونکہ حسنہ ایک بار پھر اُمید سے تھی۔ اور اب حسنہ کی یہی خواہش اور کوشش کی تھی کہ کسی بھی طرح نمرہ کا کالج چھڑا کر اسے رات دن اپنی خدمت گزاری اور بچی کی دیکھ بھال کے لئے وقف کر دے۔ پہلی بار جب اس نے انو کے سامنے نمو کے کالج چھڑوانے کا مسئلہ رکھا تو اسے تھوڑی سی حیرانی ہوئی۔ وہ نمو سے لاکھ لاتعلق اور غافل سہی مگر رہتا تو اسی گھر میں تھا۔ وہ جانتا تھا، نمو بے زبان جانور کی طرح رات دن گھر کے کاموں میں جتی رہتی ہے۔ گھر کی اور گڑیا کی تمام ذمے داریاں نبھا کر اگر وہ چند گھنٹوں کے لئے کالج چلی جاتی ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ حقیقت تو یہ تھی کہ اس کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں آج بھی یہ آرزو پنہاں تھی کہ نمو پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بنے۔
''ارے میں کہتی ہوں، کچھ سن بھی رہے ہو؟..... جانے کن سوچوں میں گم ہو۔'' اسے خاموش سوچوں میں گم دیکھ کر حسنہ نے ٹہوکا دیا۔

"آں..... ہاں....." انو چونک کر سیدھا ہوا۔ "بولو..... کیا کہہ رہی ہو؟"

"لو.....اور سنو....." حسنہ نے بے بس انداز میں ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "پوچھ رہے ہو، کیا کہہ رہی ہوں؟ اور جو ہم گھنٹے بھر سے بپتا سنا رہے تھے.....وہ تمہارے سر سے گزر گئی؟"

"نن.....نہیں.....وہ.....نمو کے.....کالج کے لئے کہہ رہی تھیں۔"

"اور نہیں تو کیا؟" حسنہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "میں کہتی ہوں، دس جماعتیں پڑھ لیں تو گیارہویں بھی پاس کر لی۔ کیا اتنی پڑھائی کافی نہیں ہے؟ اللہ رکھے ہمارے پانچ پانچ بھائی تھے۔ مگر پانچ جماعتوں کے بعد ہماری تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ کہا کہ بس لڑکی بالی کے لئے اتنی پڑھائی کافی ہے.....ہم نے چپ سادھ لی.....قسم اللہ پاک کی جو چوں بھی کی ہو۔"

"ہاں وہ تو ہے.....مگر....." انو، حسنہ کی رائے سے اتفاق نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اختلاف کی بھی اس میں اہمیت نہ تھی۔

"اے، اگر مگر کیا کر رہے ہو؟.....میں کہتی ہوں بس بہت ہو چکی نمو کی پڑھائی لکھائی.....گیارہ جماعتیں بھی کچھ کم نہیں ہوتیں۔ ہم نے تو صرف پانچ جماعتیں پڑھی ہیں اور دیکھو کس خوش اسلوبی سے گھر چلا رہے ہیں۔ بچی پال رہے ہیں۔"

"ہاں، یہ تو ہے.....پر....." انو نے سر کھجاتے ہوئے کہنا چاہا۔

"اے لو.....پھر وہی اگر مگر، لیکن ویکن، پر ور....." حسنہ غصیلے لہجے میں بولی۔ "میں صاف کہے دیتی ہوں، تم اپنی بہن سے کہہ دو کہ وہ شرافت سے کالج چھوڑ دے.....ورنہ....."

"بہن....." انو کی سماعت کو یہ لفظ بہت غیر مانوس سا لگا۔ وہ تو جانے کب سے اس رشتے کو بھلائے بیٹھا تھا۔ آج مہینوں بعد یاد آیا تو حسنہ کی رائے سے اختلاف کی اپنے آپ میں ہمت در آئی۔

"حسنہ! سیکنڈ ایئر کے امتحان ہونے میں اب دن ہی کتنے باقی ہیں؟ جہاں وہ اب تک کالج جاتی رہی ہے، وہاں چند دن اور سہی۔ اس کے بعد تو یہ سلسلہ ختم ہونا ہی ہے۔"

حسنہ نے کھا جانے والی نظروں سے میاں کی طرف دیکھا مگر انو کے لہجے میں جانے ایسی کیا بات تھی کہ وہ مزید اصرار کی خود میں ہمت نہ پا سکی اور گہری سانس لے کر چپ ہو گئی۔

"میری حالت دیکھ رہے ہو تم؟" اس نے ٹانگیں پھیلا کر اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چند لمحوں بعد پھر سے بات کا آغاز کیا۔ "اس حال میں چھوٹی سی بچی کو سنبھالنا کتنا مشکل ہے، کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں؟"

"مگر گڑیا کو تو نمو ہی سنبھالتی ہے۔" بے خیالی میں سچ انو کی زبان پر بے ساختہ آ گیا تھا۔

"اے تو وہ کالج سے آنے کے بعد ہی سنبھالتی ہے نا۔" اپنی بات سے اختلاف اور نمو کی حمایت پر حسنہ کا دل جل کر خاکستر ہو گیا تھا، تڑخ کر بولی۔ "صبح سے تین بجے تک.....اس کے کالج سے آنے تک کیا تمہاری اماں سنبھالتی ہیں بچی کو؟.....یا تم نے نوکرانی لگا کر رکھی ہوئی ہے؟.....میں بھی ہانڈا سا پیٹ لئے اسے ہگاتی متاتی رہتی ہوں، تمہیں کیوں احساس ہونے لگا میری تکلیف کا۔"

"نہیں حسنہ! تم تو جانتی ہو، ایسی بات نہیں ہے۔" انو چاپلوسانہ لہجے میں بولا۔ "چند دنوں کی بات اور ہے.....پھر تو....."

"اے میں کہتی ہوں، امتحان تک کالج چھٹ نہیں سکتا تو کم از کم کچھ دنوں کی چھٹی تو لی جا سکتی ہے۔" حسنہ نے انو کی

بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اونچی آواز اور پُرشور لہجے میں کہا۔ ''ہر دوسرے تیسرے دن ہسپتال جانا ہوتا ہے۔'' انو کو خاموش ہوتے دیکھ کر حسنہ نے مزید پُرتاثیر آواز میں بات آگے بڑھائی۔ ''اب تم کہاں روز روز آفس سے چھٹی کرتے پھرو گے۔ وہ گھر میں ہوگی تو میں اسی کے ساتھ ہسپتال چلی جایا کروں گی۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' انو کو اس کی تجویز پسند آئی۔ ''تو تم نے کہہ دیا ہوتا نمو سے۔''

''اے وہ کالج میں پڑھنے والی میم صاب ہماری بات سنے تب نا۔ ہماری بھی خیر سے پانچ بھابیاں تھیں...... مگر مجال ہے جو کبھی کسی بھابی کے حکم پر ''نہ'' کی ہو۔ مگر ایک یہ ہے کہ......''

''اچھا اچھا...... تم پریشان نہ ہو...... میں خود اس سے کہہ دوں گا۔'' انو بحث سمیٹتے ہوئے جلدی سے بولا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

صحن دھو کر اس نے دو چار پائیاں بچھا دی تھیں اور ایک چار پائی پر گڑیا کا بستر لگا کر اسے لٹا دیا تھا۔ پھر وہ گڑیا کے پھلیے اور پوتڑے دھونے بیٹھ گئی۔ انو اور حسنہ کے کپڑے بھی تھے۔ کپڑے دھونے میں پورا ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔ کپڑے دھو کر بالٹی میں ڈال کر وہ چھت پر پھیلانے چلی گئی تھی۔ گیلے ہاتھوں کو چہرے پر پھیر کر اس نے چہرے پر جھولتی لٹوں کو کس کر جُوڑا سا باندھا اور پوری آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔

کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا۔ گلی کے کونے پر ایستادہ برگد کے پیڑ کی اونچی شاخ پر ٹکا کوؤں کا گھونسلا، بجلی کے تاروں پر جھولتی چڑیا، گلی میں کھیلتے دوڑتے بچے...... کچھ عرصہ پہلے تک یہ سب کچھ کتنا مانوس، کتنا اپنا سا لگتا تھا..... ایک عجب سا احساسِ ملکیت تھا۔ یہ گھر، یہ محلّہ، گلی میں کھیلتے بچے، برگد کا تناور پیڑ، بجلی کے تاروں پر چہکتی چڑیاں، غل مچاتے کوّے، صحن میں بچھی چار پائیاں..... دبے پاؤں چلتی ہوائیں...... اور سب سے بڑھ کر بھیا...... بھیا اپنے تھے تو یہ سب کچھ بھی اپنا تھا۔ ایک بھیا کے اجنبی بن جانے سے ہر چیز انجانی، اجنبی سی ہوگئی تھی۔ احساسِ ملکیت جاتا رہا تھا۔ ہر شے پر حسنہ کا قبضہ ہوگیا تھا۔ اب سب ہی کچھ حسنہ کا تھا۔ گھر، شوہر، محلّہ...... وہ ایک بیکار سا سامان بن کر رہ گئی تھی۔ ایک بے مایہ، بے وقعت سی، غیر ضروری چیز...... جو گھر کے کسی کونے میں پڑی رہے یا گھر سے نکال کر کہیں باہر پھینک دی جائے...... کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

آپ ہی آپ اُس کی آنکھیں بھیگتی چلی گئیں۔ اس نے ذرا جھک کر بھیگے دامن سے آنکھیں پونچھیں اور الگنی پر کپڑے پھیلانے لگی۔ کپڑے پھیلا کر وہ بالٹی لئے جونہی نیچے اُتری، انو کی آواز نے اس کے قدم پکڑ لئے تھے۔

''نمو......!'' شاید کئی مہینوں بعد آج انو کی زبان پر اس کا نام آیا تھا۔

''جی بھیا!'' وہ تیزی سے پلٹی۔

''یہ تمہاری بھابی کیا کہہ رہی ہیں؟'' انو کے لہجے میں عجب کڑوا پن تھا۔ نمو نے حیرانی بھری سوالیہ نظروں سے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی حسنہ کی طرف دیکھا۔

''تمہاری بھابی نے تمہیں کالج سے چھٹیوں کے لئے کہا تھا۔'' انو نے کرخت اور تلخ لہجے میں بات آگے بڑھائی۔ ''پھر تم نے کالج سے چھٹیاں کیوں نہیں لیں؟''

''چھٹیاں؟...... مگر کس لئے؟'' نمو کے لہجے میں حیرت بڑی نمایاں تھی۔

''دیکھ رہی ہو کہ تمہاری بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' انو نے وضاحت کی۔ ''تمہارے کالج جانے کے بعد گڑیا کو سنبھالنا اس کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ اور پھر ہر دوسرے تیسرے دن ہسپتال بھی جانا ہوتا ہے۔ تم جانتی ہو...... میں تو روز روز آفس کی چھٹی نہیں کرسکتا۔ مگر تم تو کالج سے چھٹی کرسکتی ہونا۔''

''مگر بھیا! آج کل پریکٹیکل......'' نمو منہ ہی منہ میں منمنائی۔
''اے میں کہتی تھی کہ یہ چار دن کی چھٹی نہیں کرے گی.....اس کی تو مستقل ہی چھٹی کروا دو۔'' حسنہ دانت کچکچا کر بولی اور انو کے چہرے کے نقوش کچھ اور کرخت ہو گئے۔
حسنہ کی طبیعت بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ ایسی حالت میں تھوڑی بہت کسلمندی تو ہوتی ہی ہے مگر شاید حسنہ کو وہ بھی نہ تھی۔ مزے سے کئی کئی بار کھاتی اور ٹھاٹ سے پاؤں پھیلا کر سوتی۔ گھر کے کام کاج اور بچی کی دیکھ بھال کی ذمے داری تو نمو نے نہایت خوش اسلوبی سے سنبھالی ہوئی تھی۔ بس وہ چند گھنٹے، جب نمو کالج میں ہوتی تھی، اسے بچی کو دیکھنا پڑتا تھا۔ یہ بات بھی اس کے لئے تکلیف دہ تھی۔ اصل تکلیف تو اس بات کی تھی کہ نمو تعلیمی مدارج طے کرتی جا رہی تھی اور لاکھ کوششوں کے باوجود وہ اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کر پا رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ پڑھ لکھ کر نمو کہیں اس کی غلامی سے انکاری نہ ہو جائے یا اپنے حق کے لئے آواز اُٹھانے کی جرأت نہ کر بیٹھے۔ وہ چیونٹی کے کاٹنے سے پہلے مسل دینے کے اصول پر عمل کرنا چاہتی تھی۔
''کیا کہتی ہو؟'' انو نے سرد نظروں سے نمو کو گھورا۔
''جی اچھا......میں کل کالج جا کر چھٹی کی درخواست دے دوں گی۔'' نمو کی دھیمی آواز میں آنسوؤں کی نمی بھی رچی ہوئی تھی۔ مگر بے بسی و بے کسی کے تاروں سے بنے اس کے کرب کے آنچل کو تھامنے والا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ انو بیوی کے ساتھ کمرے میں جا چکا تھا اور صحن میں چارپائی پر لیٹی ننھی گڑیا گہری نیند سو چکی تھی۔

❀===❀===❀

لندن گہری دُھند کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب ایستادہ فلک بوس عمارتوں کے نقوش کہرے کے غبار میں لپٹ کر دُھندلا سے گئے تھے۔ ٹھٹھرا دینے والا جاڑا اپنے عروج پر تھا۔ مگر سینٹرل ہیٹنگ سسٹم کی وجہ سے پورے گھر میں تسکین آمیز حرارت پھیلی ہوئی تھی۔ فریحہ نے کھڑکی پر جھولتے بھاری پردے کو سرکا کر شیشے کے اس پار دُھند کی چادر اوڑھے لیٹی سنسان سڑک کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر گہرے کی تنی گاڑھی دُھندلاہٹ کے اس پار کچھ بھی دیکھنا ممکن نہ تھا۔ اس نے گہرا سانس لے کر پردہ برابر کر دیا۔ اسے بے ساختہ اپنے شہر کی دوپہریں یاد آ گئیں۔ نیلے آسمان پر دہکتا سورج کا ارغوانی گولا، جسم کو چھیدتی دھوپ کی تمازت اور چہرے کو جھلساتے لُو کے گرم تھپیڑے......لیکن وہ سلگتا موسم کتنا اپنا سا لگتا تھا......کسی بھی چیز سے کبھی شکایت نہیں ہوتی تھی۔ وہ شہر جیسا بھی تھا، اپنا تھا۔
ایک یہ شہر تھا۔
اس شہر میں اسے آئے دو سال ہونے کو آئے تھے۔ کیسے پلک جھپکنے میں بیت گئے تھے یہ دو برس کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ یہ ملک اور شہر اور اس شہر کا رگوں میں لہو جما دینے والا سرد موسم، دو برس گزرنے کے باوجود وہ ان سب چیزوں سے پوری طرح اپنا تعلق نہ بنا پائی تھی۔ برف باری کے موسم میں اکثر اسے اپنے ملک کی سلگتی دوپہریں یاد آ جاتی تھیں۔ لیکن جہاں تک اس گھر اور گھر کے باسیوں کا تعلق تھا......وہ سب ہمیشہ ہمیشہ سے اس کے اپنے تھے۔ اس گھر میں اسے بہو سے زیادہ بیٹی کا درجہ ملا تھا۔ ارجمند بانو اور عالم تاب صاحب دونوں ہی اسے بیٹی کی طرح چاہتے تھے۔ ارجمند بانو اکثر کہا کرتی تھیں۔
''خدا نے ہمیں بیٹی نہیں دی مگر فریحہ کی صورت میں بہو دے کر اس نے یہ کمی پوری کر دی۔''
ارجمند بانو کی محبت نے اس کے دل سے ماں کے داغِ مفارقت کا غم بھلا دیا تھا۔ اظفر اسے بہن اور بھابی سے زیادہ سالی کے رشتے سے پیار کرتے تھے۔ آخر کو وہ ان کی چاہت فریال کی بہن تھی۔ مگر ان سب سے بڑھ کر ان دونوں کے

مابین بے حد اچھے اور راز دار دوستوں کا رشتہ قائم تھا۔ اور پھر ظفر یاب تھے...... روح کی گہرائیوں سے چاہنے والے، ایک بے حد اچھے اور باوفا شوہر کہ جنہیں پا کر وہ خود کو بھی بھول گئی تھی۔

اظفر کی انجینئرنگ مکمل ہونے کے بعد عالم تاب صاحب نے دونوں بیٹوں کے ساتھ مل کر ایک نئی انجینئرنگ فرم قائم کی تھی۔ خدا کے فضل و کرم سے دیکھتے ہی دیکھتے وہ فرم خوب چل نکلی تھی۔ عالم تاب اس کامیابی کا کریڈٹ بھی فریحہ کے کھاتے میں ڈالتے تھے اور کہتے تھے۔

''یہ ہماری فریحہ بٹیا کے دم قدم کی برکت ہے۔''

پچھلے دو دنوں سے ارجمند بانو کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ جسم و جان پر عجب سی تھکن اور آلکسی سی چھائی رہتی جس کے باعث وہ حسبِ عادت صبح اُٹھ نہیں پا رہی تھیں۔ اسی لئے آج کل فریحہ صبح ہی اُٹھ جاتی تھی اور سسر، دیور اور میاں کے لئے ناشتہ تیار کرتی تھی۔ ان تینوں کے جانے کے بعد وہ ارجمند بانو کے اُٹھنے تک بلاوجہ ہی پورے گھر میں چکراتی پھرتی۔ ایسے میں اسے بڑی شدت سے اپنی خالی گود کا خیال آتا تھا۔ شادی کو دو برس بیت گئے تھے مگر اس کی گود اب تک خالی کی خالی ہی تھی۔ جب سے فریال کے انٹر کے امتحان شروع ہونے کی خبر آئی تھی۔ ارجمند بانو نے اس کی رخصتی کی تیاریاں شروع کر دی تھی۔ اب انتظار ان کے بس کی بات نہیں رہا تھا۔ وہ گھڑی کی چوتھائی میں فریال کو اظفر کی دُلہن بنا کر اپنی اس چھوٹی سی دنیا میں لے آنا چاہتی تھیں۔ شاید اس تگ و دو میں وہ کچھ زیادہ ہی تھک گئی تھیں اور دو روز سے بستر پر پڑی تھیں۔ فریحہ نے کہا بھی تھا۔

''پھوپھی جان! آپ کہیں تو میں دانیال بھائی کو بلوا لوں؟''

''نہیں بیٹا! رہنے دو۔'' ارجمند بانو نے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ ''تھوڑی سی تھکن ہی تو ہے۔ تھوڑا آرام کروں گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور ویسے بھی آج کل اس کے FRCS کے امتحان چل رہے ہیں۔ بلاوجہ پریشان ہوگا۔''

فریحہ خاموش ہو گئی تھی۔ مگر دو دن گزرنے کے باوجود ان کی طبیعت سدھرنے کے بجائے مزید گرتی جا رہی تھی۔

فریحہ نے ان کے بیڈ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھول کر اندر جھانکا۔ آہٹ پر انہوں نے سر گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔

''گڈ مارننگ مام!'' فریحہ انہیں پھوپھی جان ہی کہتی تھی مگر کبھی روانی میں یا کبھی بے حد لاڈ میں انہیں مام کہہ کر مخاطب کرتی تھی، جسے سن کر ارجمند بانو نہال ہو جاتی تھیں۔ ''آپ کے لئے کافی لے آؤں؟''

''لے آؤ......'' ارجمند بانو بیڈ کی پشت کا سہارا لے کر اُٹھتے ہوئے بولیں۔ ''سب لوگ چلے گئے کیا؟''

''جی...... آج آپ بہت دیر تک سوئیں۔'' فریحہ نے ان کے سلیپرز سامنے کرتے ہوئے جواب دیا۔

''سُکھی رہو...... سدا سہاگن رہو۔'' انہوں نے سلیپرز میں پیر ڈالتے ہوئے اسے دعا دی۔ شروع شروع فریحہ کی اس عادت پر وہ بگڑتی تھیں۔

''یہ کیا سلیپرز پہنانے لگتی ہو...... میں تمہیں جوتیاں سیدھی کرنے کے لئے تو نہیں لائی ہوں...... مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''مگر مجھے تو اچھا لگتا ہے نا'' فریحہ بدستور ان کے پیروں میں جوتیاں پہناتے ہوئے جواب دیتی۔ ''اس کے بدلے آپ مجھے دعائیں دے دیا کریں نا...... حساب برابر ہو جائے گا۔''

ارجمند بانو چپلوں میں پاؤں اڑس کر جوں ہی کھڑی ہوئیں، بے اختیارانہ چکرا کر دوبارہ بیڈ کی طرف لڑھک گئیں۔ اگر فریحہ لپک کر انہیں سہارا نہ دیتی تو وہ یقیناً بستر پر گر گئی ہوتیں۔

''کیا ہوا پھوپھی جان؟'' فریحہ ہراساں لہجے میں پوچھ رہی تھی اور وہ اپنے چکراتے سر کو تھام دھپ سے بستر پر بیٹھ گئی تھیں۔ کئی لمحوں تک وہ اسی طرح بے سدھ لیٹی رہی تھیں۔ فریحہ لپک کر پانی لے آئی تھی۔ کئی گہرے گہرے سانس لینے اور دو گھونٹ پانی پینے کے بعد وہ کچھ بولنے کے قابل ہوئی تھیں۔

''خدا جانے کیا ہوا...... ماغ ایک دم چکرا سا گیا اور آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔''

''میرا خیال ہے کمزوری بڑھ گئی ہے۔'' فریحہ نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ''آپ کچھ کھاتی پیتی بھی تو نہیں ہیں۔'' اس نے ارجمند بانو کے زرد پڑتے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔ ''اور آج تو آپ کو ضرور ڈاکٹر کو دکھا لینا چاہئے۔ دانیال بھائی مصروف ہیں تو ہم کسی اور ڈاکٹر کو دکھا سکتے ہیں۔'' اس فیملی کے جب سے ڈاکٹر دانیال سے تعلقات ہوئے تھے، وہ اس فیملی کے فیملی ڈاکٹر بن گئے تھے۔ خدا نے ان کے ہاتھوں میں شفا بھی بہت دی تھی اور ان کے دل میں اس فیملی کے افراد کے لئے محبت بھی بے حد تھی۔ کسی کی بھی ناسازیٔ طبع کی خبر ملتے ہی وہ از خود دوڑے چلے آتے تھے اور ہسپتال کی ضرورت کی صورت میں ان کا شاندار ہسپتال بھی موجود تھا۔

اظفر کی دانیال سے دوستی سرمد کی وجہ سے ہوئی تھی۔ دانیال اور سرمد ایک سی سوچ اور ایک سی نیچر کے مالک تھے۔ اسی وجہ سے ان دونوں کے مابین غضب کی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ اظفر ان دونوں کے مشترکہ دوست تھے۔ سرمد کے جانے کے بعد بھی ان کی دانیال سے دوستی نہ صرف قائم تھی بلکہ روز بروز اس کی پائیداری میں اضافہ بھی ہوتا جا رہا تھا۔ ارجمند بانو واش روم سے باہر نکلیں تو فریحہ ان کے لئے گرما گرم کافی لئے کھڑی تھیں۔ کافی پی کر انہیں خاصی تقویت کا احساس ہوا تھا۔ دوپہر ڈھلتے ہی سب سے پہلے اظفر ہی گھر میں داخل ہوئے تھے۔

''مام کہاں ہیں؟'' لاؤنج میں اپنی مخصوص کرسی پر ارجمند بانو کو نہ پا کر انہوں نے فریحہ سے سوال کیا۔

''اپنے کمرے میں ہیں۔'' فریحہ کچن سے نکل کر اظفر کے قریب چلی آئی۔

''اظفر! میں محسوس کر رہی ہوں کہ دو تین دن سے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ چہرے کی رونق معدوم ہو گئی ہے اور خوراک بھی بے حد کم رہ گئی ہے۔'' فریحہ نے فکر مند لہجے میں اپنے اندر سر اُٹھاتے اندیشوں کا سب سے پہلے اپنے دوست نما دیور اظفر سے ہی اظہار کیا تھا۔ ''بظاہر تو کوئی تکلیف نہیں ہے مگر میں محسوس کر رہی ہوں کہ دن بہ دن ان کا وزن بھی تیزی سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور جانتے ہو آج تو وہ بستر سے اُٹھتے وقت چکرا کر گرنے لگی تھیں۔

''اوہ.....'' اظفر کے چہرے پر بھی فکر مندی کے آثار نمایاں ہوئے۔ ''آپ نے ظفریاب بھائی یا ڈیڈ سے ذکر کیا؟''

''نہیں۔ ابھی تو صرف تم سے ہی کہہ رہی ہوں۔'' فریحہ نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ''مگر اظفر! میرا دل کہہ رہا ہے..... کہیں کچھ بہت غلط ہونے والا ہے۔ میرے اندر خطرے کی سی گھنٹی بج رہی ہے۔'' اظفر نے چونک کر اس کا فق ہوتا چہرہ دیکھا اور تیزی سے ماں کے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ عالم تاب اور ظفریاب بھی ارجمند بانو کی طبیعت کی وجہ سے خاصے پریشان ہو گئے تھے۔ اظفر نے دانیال کو فون کر دیا تھا اور دانیال اپنی تمام مصروفیات چھوڑ چھاڑ، بھاگے چلے آئے تھے۔ دانیال نے پوری توجہ اور باریک بینی سے ارجمند بانو کا معائنہ کیا تھا اور ان کی شفاف پیشانی پر فکر کی لکیریں گہری ہو گئی تھیں۔

''آنٹی! آپ کی طبیعت کب سے خراب ہے؟'' دانیال نے ایک کاغذ پر کچھ لکھتے ہوئے سوال کیا۔

''طبیعت کہاں خراب ہے۔'' ارجمند بانو نے مسکرانے کی کوشش کی مگر اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''مگر میرا نہیں خیال کہ ایسا ہے۔'' دانیال سنجیدگی سے بولے۔ ''آپ کچھ کمزوری محسوس کر رہی ہیں؟''

"ہاں، یہ ضرور ہے۔" ارجمند بانو نے سوچتی نظروں سے دانیال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پچھلے دنوں سے میں کچھ کمزوری محسوس کر رہی ہوں۔ ہاتھ پیروں میں عجیب سی سنسناہٹ ہوتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی سر چکراتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا تن جاتا ہے۔"

"میرا خیال ہے آنٹی کا تھورو چیک اپ کروالیا جائے۔" ساری بات سننے اور کئی لمحوں تک گہری سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد دانیال نے اپنا فیصلہ سنایا۔ "اظفر! تم آج شام آنٹی کو لے کر میرے ہسپتال پہنچ جاؤ۔"

"او کے...... میں پہنچ جاؤں گا۔" اظفر نے تائید بھرے انداز میں سر ہلایا۔

"ارے بیٹا! مجھے کچھ نہیں ہوا ہے...... تم بلا وجہ پریشان ہو رہے ہو۔" ارجمند بانو نے دانیال کے چہرے پر فکر کے تاثرات پھیلتے دیکھ کر جلدی سے کہا۔ "اصل میں اظفر اور فریال کی رخصتی کی تیاریوں کے سلسلے میں، میں پچھلے دنوں بہت بھاگی دوڑی ہوں۔ یہ سب اسی تھکن کا شاخسانہ ہے۔ دو چار دن آرام کروں گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"آپ کی بات اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ مگر چیک اپ کروا لینے میں حرج ہی کیا ہے؟" ظفریاب نے متفکر لہجے میں اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"میرے خیال میں تو اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اگر تم سب کا یہی مشورہ و فیصلہ ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟" وہ ہتھیار ڈالنے والے انداز میں مسکرائیں۔

"فریحہ بیٹا! اسی بات پر اچھی سی کافی ہو جائے۔" عالم تاب صاحب خوش ہو کر بولے۔ انہیں بالکل توقع نہیں تھی کہ ارجمند بانو اتنی آسانی سے مان جائیں گی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے اندر ڈیولپ ہوتی تبدیلیوں کو خود بھی محسوس کر رہی تھیں۔

"جی ڈیڈ!...... ابھی لائی۔" فریحہ نے تیزی سے کچن کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جسے وہ سب تھکن اور معمولی کمزوری سمجھ رہے ہیں، درحقیقت ایک بڑی بیماری کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ ارجمند بانو بیگم کو جگر کا کینسر لاحق تھا۔ اس اندوہ ناک خبر نے گھر کے ہر فرد کو اپنی جگہ سُن کر کے رکھ دیا تھا۔ جبکہ ارجمند بانو نے بڑے حوصلے سے اپنی بیماری کی یہ خبر سنی تھی اور اسی طرح حوصلہ مندی سے ایک ایک کا حوصلہ بندھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"ارے بیماریاں انسان کو ہی ہوتی ہیں۔ تم لوگ اس قدر پریشان کیوں ہو گئے؟" وہ بیٹیوں، بہو اور شوہر کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر کہتیں۔ "علاج ہو گا اور دیکھنا میں پہلے کی طرح بھلی چنگی ہو جاؤں گی۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" عالم تاب کے لبوں سے آہ کی صورت الفاظ نکلے۔

"ایسا ہی ہو گا۔" انہوں نے شوہر کے بجھے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بااعتماد لہجے میں کہا۔ "وہ اس لئے کہ اس رب تعالیٰ نے مجھے بے حد خوش نصیب بنایا ہے۔ اس رب نے مجھ پر کس قدر عنایتیں کی ہیں...... آپ جیسا اچھا، محبت کرنے والا، باوفا شوہر..... ظفریاب اور اظفر جیسے فرمانبردار، نیک صالح بیٹے اور فریحہ جیسی بہو عطا کی، جس نے بیٹی کی کمی پوری کر دی۔" ارجمند بانو نے فرداً فرداً سب کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب میرے دل میں صرف ایک ہی آرزو رہ گئی ہے کہ جلد از جلد فریال کو اظفر کی دُلہن بنا کر رخصت کروالاؤں۔" گو کہ ان کے دل میں ظفریاب اور فریحہ کے بچے کھلانے کی بھی آرزو تھی مگر انہوں نے اپنی اس خواہش کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ ہر شادی شدہ عورت کی طرح فریحہ کے دل میں بھی ماں بننے کی شدید تمنا ہے مگر شاید ابھی قدرت کی طرف سے دیر تھی۔ لیکن پھر بھی جانے کیوں، بچوں کے ذکر پر فریحہ رنجیدہ ہو جاتی تھی۔ ارجمند بانو اس وقت اپنی اس خواہش کا اظہار کر کے اسے

رنجیدہ نہیں کرنا چاہتی تھیں، اسی لئے انہوں نے صرف فریال اور اظفر کی رخصتی کی آرزو کا اظہار کیا تھا۔

''اور مابدولت آپ کی اس آرزو کو اسی ہفتے پوری کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' عالم تاب صاحب نے آگے بڑھ کر شاہانہ انداز میں بھاری آواز کے ساتھ ڈرامائی لہجے میں کہا تو ارجمند بانو کے مرجھائے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ کی کلیاں چٹخ اُٹھیں۔

''آپ مذاق سمجھ رہی ہیں؟'' انہیں یوں بے یقینی سے مسکراتے دیکھ کر عالم تاب پُر یقین لہجے میں بولے۔ ''دیکھئے فریال کے امتحان ہو چکے ہیں...... میری آفاق بھائی سے بات ہو چکی ہے۔ وہ بھی رخصتی کے لئے ہمہ تن تیار ہیں...... وہ بھی اگلے ہی ہفتے۔''

''کیا واقعی؟'' اب بھی ارجمند بانو کے لہجہ میں بے یقینی چھلک رہی تھی۔

''ہاں، واقعی۔'' عالم تاب صاحب ایک بار پھر پُر یقین انداز میں مسکرائے۔ ''چاہو تو ظفریاب سے پوچھ لو...... ان کی بھی بات ہوئی تھی آفاق بھائی سے۔'' پھر ذرا کی ذرا رک کر وہ ظفریاب سے مخاطب ہوئے۔ ''بھئی ظفر! اپنی مام کو بتاؤ نا!...... کہ تمہارے ماموں جان سے تمہاری کیا بات ہوئی تھی؟''

''سب ہی جانتے تھے، اپنے بڑے بیٹے ظفریاب کی طرح وہ اپنے چھوٹے اور چہیتے بیٹے اظفر کا گھر بھی اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ہاتھوں سے بسا ہوا دیکھنا چاہتی تھیں۔ کچھ فریال کی پڑھائی کی وجہ سے اور کچھ بھائی کی تنہائی کے خیال سے انہوں نے یہ دو سال خاموشی اور صبر سے گزار لئے تھے۔ فریال کے امتحان ختم ہوتے ہی وہ گھڑی کی چوتھائی میں پاکستان جا کر اپنی امانت اپنے ساتھ لے آنا چاہتی تھیں۔ عام حالات میں شاید تیاری اور اہتمام میں کچھ وقت صرف ہوتا، مگر اب ان کی بیماری اور روز بروز بگڑتی ہوئی حالت کے پیشِ نظر عالم تاب صاحب اور ظفریاب نے فوری طور پر آفاق صاحب سے رابطہ کیا تھا۔ آفاق صاحب بھی اکلوتی چھوٹی بہن کی بیماری کی وجہ سے فکرمند اور پریشان تھے۔ ویسے بھی امتحان کے بعد رخصتی تو ناگزیر تھی، سو انہوں نے فوری طور پر آمادگی دے دی تھی۔ یہ خبر ارجمند بانو کے لئے بے حد خوش کن تھی۔ ان کا پژمردہ چہرہ فرطِ مسرت سے دمکنے لگا۔

''پھر کب جا رہے ہیں ہم لوگ پاکستان؟'' انہوں نے پُر اشتیاق لہجے میں سوال کیا۔ ارجمند بانو کی کمزوری اور دن بدن خراب ہوتی صحت اور علاج کی وجہ سے دانیال نے انہیں سفر سے روک دیا تھا۔ آفاق صاحب لمحہ لمحہ رابطے میں تھے۔ اس خبر کے ملتے ہی انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اگلے ہفتے وہ خود فریال کو لے کر لندن آ جائیں گے۔ اس طرح بیمار بہن کی مزاج پرسی بھی ہو جاتی اور سفر کی کلفت سے بھی محفوظ رہ سکتیں۔

''ہم لوگ پاکستان نہیں جا رہے ہیں۔'' عالم تاب صاحب نے سسپنس والے انداز میں پہلے سب کی طرف، پھر ارجمند بانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ آفاق بھائی، فریال کو لے کر اگلے ہفتے خود یہاں پہنچنے والے ہیں۔''

''کیا؟'' ارجمند بانو نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ''آفاق بھائی آ رہے ہیں؟''

''ہاں بھئی، ہم نے اصرار کیا کہ ایک بار آپ بھی آ کر لندن دیکھ جایئے۔'' عالم تاب صاحب نے تجاہلِ عارفانہ سے جواب دیا۔

''تو...... تو...... وہ آ رہے ہیں؟'' ارجمند بانو کے دھیمے لہجے میں ماں جائے سے ملنے کی خوشی کی کھنک تھی۔

''جی...... بالکل آ رہے ہیں۔'' اظفر آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔ ''نہ صرف ماموں جان آ رہے ہیں، بلکہ آپ کی چھوٹی بھتیجی جو آپ کے چھوٹے بیٹے کی منکوحہ بھی ہے، وہ بھی آ رہی ہے۔ تمام کاغذی کارروائی مکمل ہو چکی ہے۔ آئندہ ہفتے کو 10 بجے کی فلائٹ سے وہ لوگ روانہ ہونے والے ہیں۔''

ارجمند بانو کے زرد بیمار چہرے پر مطمئن مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ اس خبر نے انہیں بے طرح خوش کر دیا تھا۔ ارجمند بانو کی سنگین بیماری کی وجہ سے گھر کے سب ہی افراد اپنی جگہ فکر مند اور پریشان تھے۔ مگر آفاق صاحب اور فریال کی آمد کی اس خبر نے وقتی طور پر سب کو ہی خوش کر دیا تھا۔ اب سب کو ہی آنے والے مہمانوں کا انتظار تھا۔

❀===❀===❀
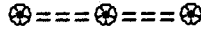
کوئی پرندہ زور سے پھڑ پھڑا کر اُڑ رہا تھا، یا دروازے پر دستک ہوئی تھی، یا شاید سیڑھیوں سے کوئی اوپر آیا تھا۔ جانے کیسی آہٹ ہوئی تھی، بے ساختہ سلطانہ کی آنکھ کھل گئی تھی۔ بہار کے موسم کی آمد آمد تھی۔ درختوں کی لچکیلی شاخوں پر نئی نکور کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، اور پھول دار پودے نوخیز کلیوں، غنچوں اور پھولوں سے بھر گئے تھے۔ آسمان پر اکثر سفید سرمئی بادل کے ننھے منے ٹکڑے منڈلاتے نظر آتے تھے جن کے باعث موسم کچھ اور خوب صورت اور خوشگوار محسوس ہوتا۔ سلطانہ دوپہر کا کھانا کھا کر لاؤنج میں پڑی سیٹی پر قیلولے کی غرض سے جا لیٹی تھی۔ مغربی دریچوں سے آتے ٹھنڈی ہوا کے نرم جھونکوں نے اسے تھپک تھپک کر سلا دیا تھا۔ کہنے کو تو وہ گھڑی بھر کو کمر سیدھی کرنے کی خاطر لیٹی تھی مگر سونے کے بعد اسے وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ دوپہر نے سہ پہر سے ہم آغوش ہو کر شام کی جانب قدم بڑھا دیئے تھے مگر وہ بے خبر سوئی پڑی تھی۔ تب ہی کسی آہٹ پر پٹ سے اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اس نے کھوجتی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر اُٹھ بیٹھی۔ تب ہی دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی تھی۔

''کون.....؟'' سلطانہ نے چونک کر سیڑھیوں کی جانب کھلنے والے دروازے کی طرف دیکھا اور تکیے کے قریب پڑے اپنے دوپٹے کو اٹھا کر گلے میں ڈال لیا۔

''میں ہوں ماں جی!...... لاکھانی۔'' یونس لاکھانی باچھیں پھیلائے ہوئے دونوں ہاتھ باہم ملائے دروازے پر نمودار ہوا۔ ''اجاجت ہو تو اندر آ جاؤں؟''

''تم ہو.....'' سلطانہ کے چہرے پر غیر محسوس سی ناگواری کی لکیریں کھنچ گئیں۔ ''لو......میں تو ڈر ہی گئی تھی......کیسے چوروں کی طرح آ گئے ہو۔''

''توبہ توبہ ماں جی!...... چوروں کی طرح کیوں آؤں گا؟'' لاکھانی سامنے دھری کرسی پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ ''کھدا نہ کرے جو میں کبھی چوری کروں...... جرورت ہو گی تو میں اپنی ماں جی سے مانگ لوں گا...... مگر چوری..... نہ نہ......توبہ توبہ۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''اچھا چل......بس اب رہنے بھی دے۔'' سلطانہ بیزاری سے بولی۔ ''اب اور کتنا مانگے گا؟ پہلے بھی میں تجھے ہزاروں روپے دے چکی ہوں۔''

''تو ماں جی! اس ناچیج (ناچیز) نے کام بھی تو اتنا بڑا کیا ہے۔'' لاکھانی نے فخریہ انداز میں گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔ ''مہکار جیسی کانٹے دار جھاڑی سے رسید بھائی کا دامن چھڑانا کوئی آسان کام تو نہیں تھا نا ماں جی!'' اس نے ہاتھ اُٹھا کر سوالیہ انداز میں ہلاتے ہوئے اپنے دعویٰ کی تصدیق چاہی۔ ''نہ صرف میں نے مہکار سے ان کا پیچھا چھڑایا بلکہ پچھلے دو سال سے انہیں کہیں اور اُلجھنے بھی نہیں دیا۔ ورنہ تو آپ رسید بھائی کے منیجر سے تو واقف ہیں۔'' سلطانہ گو کہ منہ سے کچھ نہیں بولی تھی مگر دل ہی دل میں لاکھانی کی بات سے قائل ہو گئی تھی۔

''اچھا چھوڑ یہ سب باتیں...... چائے پیئے گا؟'' اس نے بڑا سا منہ کھول کر جماہی لیتے ہوئے لاؤنج کے دائیں جانب بنے کچن کی طرف جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ کچن میں چھوٹو کچھ کھٹ پٹ کرنے میں لگا ہوا تھا۔

''پلا دیں گی تو آپ کی مہربانی ہو گی۔'' لاکھانی حسبِ عادت لجاجت بھرے لہجے میں بولا اور سلطانہ نے وہیں سے

ہانک لگا کر چھوٹو کو حکم صادر کیا۔
''ہے رے چھوٹو!.....ذرا جلدی سے دو کپ چائے تو بنالا۔''
چھوٹو نے کچن کے دروازے سے جھانک کر لاؤنج کی طرف دیکھا۔ لاکھانی پر نظر پڑتے ہی اس کے منہ کا بھی ذائقہ خراب ہو گیا تھا۔ وہ منہ بنا کر چائے بنانے لگا۔
''ابھی تک تو رسید بھائی نہیں آئے؟'' لاکھانی نے بر سبیل تذکرہ پوچھا۔
''دونوں پروجیکٹ مکمل ہو چکے ہیں۔ پوزیشن دی جارہی ہے، آج کل اسی میں مصروف ہے۔'' سلطانہ نے جواب دیا۔
''ویسے یہ بات تو ہے.....ان دونوں پروجیکٹوں میں رسید بھائی نے کھوب کمائی کی ہے۔'' لاکھانی سر ہلا کر رشک بھرے لہجے میں بولا۔
''اے خاک.....'' سلطانہ ہاتھ جھٹک کر بیزاری سے بولی۔ ''اس کم بخت مہکار نے اسے کنگال کر کے تو چھوڑا تھا۔ گائے کا بچھڑا بھینس کے نیچے، بھینس کا بچھڑا گائے کے نیچے کر کے تو اُس نے جانے کس مصیبت اور مشکل سے یہ پروجیکٹ پورے کیے ہیں۔ سچ کہتی ہوں، اس کے اکاؤنٹ میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔''
''تو ابھی لوگ قبضہ لیں گے تو پے منٹ کریں گے نا.....ماں جی! آپ پھکر کیوں کرتی ہیں؟''
''اے مجھے کاہے کی فکر.....'' سلطانہ دونوں ہاتھوں کو سر پر پھرا کر بکھرے بالوں کو سمیٹ کر چھوٹا سا جوڑا باندھتے ہوئے بیزاری سے بولی۔ ''میں آج ہوں، ابھی مری، کل دوسرا دن.....وہ اپنا مال یوں مال زادیوں پر لٹائے گا تو آپ پچھتائے گا.....ہمارا کیا ہے؟''
''تو ماں جی!.....آپ رسید بھائی کا گھر بسانے کے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں؟'' لاکھانی بے ساختہ بول اُٹھا تھا۔
''اے خاک سوچوں.....'' سلطانہ کا منہ کڑواہٹ سے بھر گیا۔ ''ایک نہ دو.....تین تین شادیاں کر چکا ہے۔ اب اور کتنی شادیاں کرے گا؟''
''مطلب اب رسید بھائی سادی ہی نہیں کرے گا؟'' لاکھانی نے حیرانی سے پوچھا۔ ''اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ مگر کھدانہ کھواستہ (خدانخواستہ) آپ کے بعد.....''
''تیرے منہ میں خاک۔'' سلطانہ تڑپ کر بولی۔ ''میں اتنی جلدی جانے والی نہیں۔ اور جب تک میں زندہ ہوں، اس کی نئی شادی کرنے والی نہیں۔ ابھی سکون اور آشتی سے بیٹھی ہوں، مجھے کالے کتے نے کاٹا ہے کہ بیٹھے بٹھائے اپنے لئے بہو کی صورت عذاب اُٹھا لاؤں.....نہ بھائی! تُو اپنا یہ مشورہ رہنے ہی دے.....بلکہ سن! رشید کو بھی سمجھاتا بجھاتا رہا کر۔ اب بھولے سے بھی اس کے دماغ میں شادی کا خیال نہیں آنا چاہئے۔''
''ہرگج بھی نہیں آنے دوں گا۔'' لاکھانی مستعدی سے بولا۔ ''وہ ماں جی!.....اصل میں....'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ لاکھانی نے اپنی بات کا آغاز کیا۔ ''اصل میں ماں جی!.....وہ.....مجھے کچھ.....''
''دیکھ بھائی لاکھانی!'' اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہی سلطانہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''مجھ سے تو تُو اب پھوٹی کوڑی کی بھی اُمید نہ رکھنا۔ جو کچھ تھا، میں تجھے دے چکی۔ ای تو میرے پاس زہر کھانے کے بھی پیسے نہیں۔''
''ارے جہر کھائیں آپ کے دسمن۔'' لاکھانی جلدی سے بولا۔ ''ابھی تو آپ بہت عرصہ جندہ رہیں گی۔'' چائے پی کر لاکھانی بے نیل و مرام خالی ہاتھ اُٹھ گیا تھا۔ وہ پہلے سے ہی جانتا تھا کہ سلطانہ سے بلاوجہ رقم اینٹھنا اتنا آسان کام نہیں

ہے۔ چنانچہ اب اس نے کوئی وجہ تلاش کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور جلد ہی اس کے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی تھی۔
دو دن بعد سرِ شام وہ پھر سلطانہ کے پاس جا پہنچا تھا۔
''کیسے آنا ہوا؟'' سلطانہ نے حسبِ معمول سوکھے لہجے میں سوال کیا تھا۔
''ماں جی! آپ کو سنانے کے لئے ایک جبردست کھبر لایا ہوں۔'' لاکھانی نے اپنا لہجہ دھیما کر کے بھرپور سسپنس سے کہا۔'' آپ سنیں گی تو......''
''آئے ہائے......ایسی کیا خبر ہے؟'' سلطانہ نے دہل کر اس کی طرف دیکھا۔
''پتہ نہیں ماں جی!......ابھی آپ کو بتانا بھی چاہئے یا......'' لاکھانی ڈرامائی انداز میں بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔
''ارے کچھ بتائے گا بھی یا یونہی پہیلیاں بجھوائے گا؟''
لاکھانی نے چھوٹا سا منہ بنا کر اُداسی سے جواب دیا۔''افسوس یہ ہے کہ میں آپ کو جو کھبر دینے آیا ہوں، وہ کوئی اچھی کھبر نہیں ہے۔''
''اے ہائے......کیا کہہ رہا ہے؟'' سلطانہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔
''سچ کہہ رہا ہوں ماں جی!'' لاکھانی سلطانہ کی طرف پوری طرح پلٹتے ہوئے بولا۔'' کھبر ملی ہے کہ رسید بھائی پھر ایک حسینہ کے چکر میں پھنس گئے ہیں۔''
''ہیں......؟'' سلطانہ چونکی۔''کون سی حسینہ؟''
''ابھی میرے کو کیا پتہ؟'' لاکھانی نے بھولا سا منہ بنا کر جواب دیا۔''میرے ایک دوست نے، جسے میں نے رسید بھائی پر نجر (نظر) رکھنے کے لئے کہا تھا، اس نے مجھے کھبر دی ہے کہ آج کل رسید بھائی پھر ایک کھوبصورت لڑکی کے ساتھ گھومتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔''
''ہائے اللہ......'' سلطانہ نے دل تھام لیا۔''یہ خوبصورت بلا کہاں سے اُسے ٹکرا گئی؟......لاکھانی! میرے بچے! تُو ذرا پوری معلومات تو کر۔ سچ کہوں، میرا دل بیٹھا جارہا ہے۔''
''اسی لئے تو میں کہتا ہوں ماں جی! آپ کوئی اچھی اور شریف چھوکری دیکھ کر رسید بھائی کی سادی کر دیں۔ تاکہ اس روج روج (روز روز) کے چکر سے تو جان چھوٹے۔''
''ارے جب وہ وقت آئے گا، دیکھا جائے گا۔'' سلطانہ بیزاری سے ہاتھ نچا کر بولی۔''ابھی تو اُس نئی نازل شدہ مصیبت کے بارے میں سوچ۔ ہائے مجھے تو ہول اُٹھ رہے ہیں۔''
''ماں جی! اتنی پریشانی کی بات نئیں ہے۔'' لاکھانی نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔''ابھی تو کچھ کنفرم بھی نہیں ہے۔ اب میں کھود جا کر دیکھوں گا تو اصل بات پتہ چلے گی۔''
''تو تُو جاتا کیوں نہیں ہے؟'' سلطانہ نے بے تابی سے پوچھا۔''ابھی کے ابھی جا اور تمام تحقیق کر کے مجھے خبر دے۔''
''جو آپ کا حکم ماں جی!'' لاکھانی ایک دم کھڑا ہو گیا۔''میں ابھی رکسے میں جاؤں گا۔ مگر......وہ......چلیں بس سے ہی چلا جاؤں گا۔''
''نہیں، بس سے نہیں، تُو ٹیکسی میں جانا......تاکہ جلد معاملے کی تہہ تک پہنچنے میں کامیابی ہو۔ تُو ٹھہر، میں ابھی کرائے کے لئے پیسے دیتی ہوں۔'' وہ اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ اور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں پانچ سو کا نوٹ تھا۔

''لے، یہ رکھ لے۔ آج میں رشید سے کچھ اور رقم لے کر رکھ لوں گی۔ کل مجھ سے اور لے لینا۔'' وہ رسان بھرے لہجے میں بولی۔

''سکریہ ماں جی!'' لاکھانی نے مؤدب انداز میں سر جھکا کر تشکر بھرے لہجے میں کہا اور پانچ سو کا نوٹ لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

❀===❀===❀
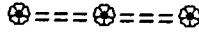
آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں چودھویں کا چاند اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ چہار سُو چاندنی کا سنہرا غبار بکھرا ہوا تھا۔ ہوا کے نرم جھونکوں کی نرم آہٹوں میں پونم کے چاند کا خمار بھی شامل تھا۔

سرمد جانے کب سے کمپیوٹر پر بیٹھے دانیال اور اظفر سے باتیں کیے جا رہے تھے۔ ارجمند بانو کی بیماری کی خبر نے اُنہیں بھی پریشان کر دیا تھا۔ اور ابھی ابھی اظفر نے انہیں اطلاع دی تھی کہ پروفیسر آفاق، فریال کو لے کر جلد ہی انگلینڈ روانہ ہونے والے ہیں۔

''تو کیا آنٹی کی طبیعت اتنی خراب ہے کہ وہ ہوائی سفر بھی نہیں کر سکتیں؟'' انہوں نے پُرتشویش لہجے میں سوال کیا تھا۔

''ہاں سرمد!......ایسا ہی کچھ ہے۔'' اظفر کے گھٹے گھٹے لہجے میں کرب اور بے بسی کی ملی جلی کیفیت بسی ہوئی تھی۔

''ان کا علاج چل رہا ہے اور......''

''اللہ تعالیٰ انہیں شفائے کاملہ عطا فرمائے۔'' اظفر کے درمیان میں جملہ ادھورا چھوڑ کے رُکتے ہی سرمد نے خلوصِ دل سے دعا کی تھی۔

''آمین۔'' اظفر نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا تھا اور سرمد نے خدا حافظ کہہ کر کمپیوٹر آف کر دیا تھا۔

کتنی ہی دیر وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھے ارجمند بانو کے بارے میں سوچتے رہے تھے۔ اظفر اور دانیال سے تو ان کی تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی تھی۔ ارجمند بانو کی طبیعت کا شروع سے ہی انہیں علم تھا۔ مگر آج یہ خبر سن کر کہ ڈاکٹرز نے انہیں سفر سے منع کر دیا تھا......وہ کتنی ہی دیر تک سر جھکائے ارجمند بانو کے بارے میں سوچتے رہے تھے۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر کمرے سے باہر آ گئے تھے۔ کشادہ بالکونی کے مرمر کے فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ انہوں نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آکاش کی کشادہ چھاتی پر دمکتا چاند کا طلائی تمغہ اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ وہ کئی لمحوں تک ماہِ کامل کی سمت دیکھتے رہے تھے۔ اور بے ساختہ ان کی سوچ کے آکاش پر ایک چاند چہرہ جگمگا گیا تھا۔ ایسا ہی دمکتا، جھلملاتا اور دلکش چہرہ تھا وہ......بھلا کس کا چہرہ تھا وہ؟......انہوں نے ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی۔ چہرہ تو یاد تھا پر شاید نام ذہن سے نکل گیا تھا۔ اس چہرے اور اس ماہِ کامل میں ضرور کوئی مماثلت اور مشابہت تھی۔ تب ہی تو چاند کو دیکھ کر انہیں وہ چہرہ یاد آ گیا تھا۔

اور پھر جانے کس طرح ان کی سوچ کی رو فروا کی سمت بہہ نکلی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں انہوں نے فروا کی دلچسپی اور توجہ کو نوٹس کیا تھا۔ شروع شروع تو وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکے تھے، پھر کچھ سمجھ میں آنے لگا تو وہ گھبرا سے گئے تھے، پریشان ہو گئے تھے۔ ابھی تو انہوں نے اس سلسلے میں کچھ سوچا بھی نہ تھا۔ ابھی تو وہ اپنے پیارے ابا جان، اپنی چہیتی دادی اماں بی اور اپنے گھر کے لئے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ اپنے لئے تو ان کے پاس کئی سوچ تھی، نہ خواب تھا اور نہ ہی کوئی پلان۔ شادی کے بارے میں تو انہوں نے کبھی بھول سے سوچا بھی نہیں تھا اور نہ ہی سوچنا چاہتے تھے۔ وہ کسی اجنبی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کر کے اپنے پیارے اہلِ خانہ کے لئے کوئی عذاب نہیں خریدنا چاہتے تھے۔ مگر......اس فروا کی آنکھیں؟......آخر ہر پل کیا باور کروانے کی کوشش کرتی رہتی تھیں۔ روزِ اوّل سے انہوں نے فروا کے ہر انداز میں ایک الگ سا انداز محسوس

کیا تھا۔ شروع شروع تو وہ سمجھے ہی نہیں تھے۔ پھر کچھ سمجھ میں آیا تو دل یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ اور جب دل کو یقین آیا، وہ حیرت زدہ ہونے کے ساتھ خوف زدہ بھی ہو گئے تھے۔

''یہ سب کیا ہے فروا؟''

''پتہ نہیں۔'' فروا نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔ ''کچھ لوگ اسے محبت کہتے ہیں۔ کچھ دیوانگی اور میں..... میں اسے زندگی کہتی ہوں۔''

''کسی شریف گھرانے کی لڑکی کو ایسی باتیں کرنا زیب دیتا ہے؟'' سرمد بوکھلائے ہوئے انداز میں بولے تھے۔

''اس میں برائی ہی کیا ہے؟'' فروا نے اسی اطمینان اور اعتماد سے جواب دیا تھا۔ ''اگر کوئی لڑکی دل لگی، فراڈ اور فلرٹ کا ارادہ رکھتی ہو تو برائی ہے۔ اگر وہ کسی کو چاہتی ہو اور اس سے شادی کی خواہش مند ہو تو اس میں برائی کیا ہے؟''

''تم..... میرا مطلب ہے مجھ سے......'' سرمد واقعی ہراساں ہو گئے تھے۔

''ہاں سرمد!'' فروا نے آگے بڑھ کر ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا۔ ''میں دل کی تمام تر گہرائیوں اور سچائیوں کے ساتھ تم سے محبت کرتی ہوں۔ تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اور اگر تم نے ٹھکرا دیا تو میں اپنی جان سے گزر جاؤں گی۔ مگر تمہارے سوا اب اس دل میں اور اس آنگن میں اور کوئی نہیں آ سکتا۔'' سرمد اس کے اس بے باکانہ اظہار پر گنگ رہ گئے تھے۔ مگر یہ دلیرانہ اظہار اس کے سچے جذبوں کا غماز تھا، جن سے نہ چاہتے ہوئے بھی سرمد متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے تھے۔

انہوں نے تو اسد سے وعدہ لیا تھا کہ وہ گھر چھوڑنے کا خیال بھی دل میں نہ لائیں، وہ کسی نہ کسی طور ابا جان اور اماں بی کو راضی کر لیں گے۔ وہ تو اسد کا مسئلہ حل کرنے کا عزم لے کر آگے بڑھے تھے۔ اس فروا نے انہیں خود ہی ایک مسئلے میں اٹکا دیا تھا۔ وہ حیرت زدہ و ششدر فروا کا چہرہ تکتے رہ گئے تھے۔ اور اگلے ہی لمحے ہراساں انداز میں واپسی کے لئے پلٹ گئے تھے۔

اور اس رات وہ پوری رات نہ سو سکے تھے۔ انہوں نے تو اپنے احساسات و جذبات کے گرد کیسی کیسی باڑیں قائم کی تھیں، حصار کھینچے تھے، بند باندھے تھے۔ مگر فروا کے ایک ہی بے باکانہ اظہار سے وہ سب باڑیں ٹوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ سارے حصار ٹوٹتے محسوس ہو رہے تھے اور بند تنکے کی طرح تیز بہاؤ پر بہتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے بعد وہ کئی دن تک ندرت خالہ کے گھر نہیں جا سکے تھے۔ جب جانے کا سوچتے تو ایک عجیب سی پریشانی لاحق ہو جاتی تھی۔ وہ فروا کی سوال کرتی آنکھوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس سوال کے جواب میں نہ انکار کر سکتے تھے اور نہ ہی اقرار کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے فروا سے فرار اختیار کئے ہوئے تھے۔

''سرمد! کیا بات ہے؟'' اس شام ڈائننگ ہال کی طرف جاتے ہوئے بے ساختہ ہی ان کا سامنا اسد سے ہو گیا تھا اور اسد بے اختیارانہ پوچھ بیٹھے تھے۔ ''کچھ پریشان لگ رہے ہو۔''

''نن..... نہیں تو۔'' وہ بری طرح نروس ہو گئے تھے۔

''کئی دنوں سے خالہ جان کی طرف بھی نہیں گئے۔ سب پوچھ رہے تھے۔'' اسد کی بات پر سرمد نے سوالیہ نگاہیں اُٹھائیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھے۔

''سب کون؟''

''سب مطلب سب ہی۔'' اسد اس سوال پر حیران ہوئے۔ ''خالہ جان، ثروت اور..... ارے ہاں، خالو جان تو خاص طور پر تمہیں پوچھ رہے تھے۔ شاید تم نے ان سے بائی پاس آپریشن کی بات کی تھی۔''

"جی....." سرمد کو فروا کا نام نہ سن کر مایوسی ہوئی تھی۔ ندرت جہاں اسد اور ثروت کی جلد از جلد شادی کے لئے مُصر تھیں اور ان کے پاس اسلم میاں کی بیماری کا زبردست بہانہ تھا۔ مگر سرمد نہیں چاہتے تھے کہ اسد گھر چھوڑ کر باپ اور دادی کا دل توڑ کر اپنی الگ دنیا بسائیں۔ اسی لئے کسی نہ کسی بہانے ندرت جہاں کو سمجھاتے بجھاتے رہے تھے۔

"اب دیکھو بیٹا! تمہارے خالو کی طبیعت تمہارے سامنے ہے۔" وہ ہر دو لمحے بعد یہی جملہ دہراتی تھیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ خدانخواستہ اب کوئی دورہ پڑا تو جان لیوا ثابت ہوگا۔"

"آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں؟" سرمد دھیمے لہجے میں گویا ہوئے۔ "اب دل کے مرض کا مکمل علاج ممکن ہے۔ اوپن ہارٹ سرجری کے ذریعے ہم خالو جان کی سرجری کروائیں گے۔"

"پر بیٹا! سنا ہے یہ سرجری تو بہت مہنگی ہوتی ہے اور....."

"آپ اس کی فکر نہ کریں۔" سرمد نے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ "تمام انتظام ہو جائے گا۔"

اور دو روز میں ہی سرمد نے اسلم احمد کی سرجری کا انتظام کروا دیا تھا۔ شہر کے سب سے اچھے اور مہنگے ہسپتال میں ان کی ہارٹ سرجری ہوئی تھی اور تمام اخراجات سرمد نے برداشت کئے تھے۔ اور جس خلوص اور توجہ سے وہ اس دوران اسلم میاں کے لئے دوڑ دھوپ کرتے رہے تھے، ان کے اس عمل سے سب ہی متاثر تھے۔ خاص طور پر فروا کے دل میں ان کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی تھی۔ ان کی ناپسندیدگی کے خیال سے اب فروا نے کھلم کھلا اور بے دھڑک اظہار گو کہ ترک کر دیا تھا مگر اس کی محبت لٹاتی خاموش نگاہیں ہر پل سرمد کا طواف کرتی رہتی تھیں۔ شروع شروع میں وہ سخت اُلجھن محسوس کرتے تھے مگر پھر رفتہ رفتہ وہ ان نگاہوں کے عادی ہوتے چلے گئے تھے۔ اب تو کبھی کبھی انہیں یہ سب اچھا لگنے لگا تھا۔

اسی آنکھ مچولی میں دو سال بیت گئے۔

سرمد نے سب سے پہلے عاتکہ بیگم کو راضی کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اماں بی! آپ ایک بار ثروت سے مل کر تو دیکھیں۔ وہ ایک بے حد اچھی اور سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔"

"ثروت کا تو پتہ نہیں، مگر وجاہت میاں، ندرت کی وجہ سے اس رشتے سے انکاری ہیں۔" عاتکہ بیگم نے دھیمے لہجے میں جواب دیا تھا۔

"آپ تو جانتی ہیں، میں خود ندرت خالہ کے کس قدر خلاف تھا۔" سرمد دھیمے لہجے میں گویا ہوئے۔ "اگر اب اتنے عرصے بعد ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تو اندازہ ہوا کہ وہ اب پہلے والی ندرت خالہ نہیں رہی ہیں۔ آپ یقین کریں، وہ بالکل بدل گئی ہیں۔ نرم لہجے میں محبت بھرے انداز میں بات کرتی ہیں۔ کسی کا برا کرنا تو دُور، برا سوچتی بھی نہیں ہیں۔ آپ ایک بار ان سے مل کر تو دیکھئے، خود آپ کو حیرت ہوگی۔ اب وہ پہلے والی ندرت خالہ رہی ہی نہیں ہیں۔ وہ بالکل بدل گئی ہیں۔ حالات نے، بڑھتی ہوئی عمر نے یا گزرے وقت نے انہیں بالکل بدل کر رکھ دیا ہے۔"

"سرمد! ایک عربی کہاوت ہے۔ کھٹائی پرانی ہونے پر بھی اپنی کھٹاس نہیں چھوڑتی۔ تو یہ سمجھ لینا کہ گزرے وقت نے ندرت کہاں کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے، قرین قیاس نہیں ہے۔ سانپ کی فطرت ڈسنا ہے۔ وہ کبھی اپنی فطرت نہیں چھوڑ سکتا۔" کئی بار کی کہی ہوئی بات وہ ایک بار پھر بولیں۔

"اماں بی!" سرمد بے بسی سے بولے۔ "آپ کیوں نہیں سمجھ رہیں..... اسد بھائی کسی بھی قیمت پر ثروت سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اور اگر ابا جان نہیں مانے تو وہ یہ گھر چھوڑ دیں گے۔"

اس بات سے تو خود عاتکہ بیگم خوف زدہ تھیں، مگر وہ بھی کیا کرتیں؟..... وجاہت مرزا کی ضد سے واقف تھیں۔ سو سرمد نے خود ہی ان سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

''یہ بات تو ہم خود انہیں کہہ چکے ہیں۔'' ساری بات سن کر وجاہت مرزا نے اطمینان بھرے لہجہ میں جواب دیا تھا۔ ''کہ اگر وہ ثروت سے رشتہ جوڑنا چاہتے ہی تو انہیں ہم سے اور اس گھر سے تمام ناطے توڑنے ہوں گے۔''

''ابا جان! آپ ایک بار ندرت خالہ سے....'' سرمد نے بے تاب لہجے میں بات کا آغاز کیا۔

''نہیں سرمد میاں!'' وجاہت مرزا نے ہاتھ اٹھا کر درمیان میں ہی ان کی بات کاٹ دی تھی۔ ''ہمیں کسی ندرت یا ثروت سے نہیں ملنا۔ نہ ہم ان کے گھر جانا چاہتے ہیں اور نہ ہی اس گھر کے دروازے ان کے لئے کھلیں گے۔ اب یہ اسد میاں کی صوابدید پر منحصر ہے......وہ کس کا انتخاب کرتے ہیں......اس گھر کا...... یا ندرت کے گھر کا۔'' وجاہت مرزا کے لہجے میں اس حد تک کٹھور پن اور سختی تھی کہ سرمد کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈک اُترتی محسوس ہوئی تھی۔ ان حالات میں جب اسد اور ثروت کے رشتے کے لالے پڑے ہوئے تھے، وہ فروا سے کوئی نیا رشتہ کس اُمید پر بنا لیتے؟ اور اس شام انہوں نے تمام رُوداد اسد کے گوش گزار کر دی تھی۔

''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔'' اسد کے لہجے میں دبے دبے غصے کے ساتھ ایک بے نام سی بے بسی بھی تھی۔ ''ابا جان کسی بھی قیمت پر نہیں مانیں گے۔''

''تت......تو اب......'' سرمد نے خائف نظروں سے اسد کی طرف دیکھا۔

''اب......میرے فیصلے کا وقت آ گیا ہے۔'' وہ بے ساختہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''آپ کا مطلب ہے......'' سرمد کے لہجے سے خوف جھلک رہا تھا۔

''ہاں......'' اسد نے پُر یقین لہجے میں جواب دیا۔

''مگر آپ جانتے ہیں......''

''سرمد! چھوڑو یہ بچوں والی باتیں۔ اسی طرح دلاسوں تسلیوں میں دو سال ضائع ہو گئے۔ ابا جان کی ناں، آج بھی پتھر کی لکیر ہے۔''

سرمد نے بے بس نگاہوں سے بھائی کی طرف دیکھا۔ مگر اسد اُس کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرتکز تھیں۔

❀===❀===❀

صبح اچھی خاصی پھوار پڑی تھی۔ پیاسی زمین سے اُٹھنے والی سوندھی خوشبو اب تک ہوا میں رچی ہوئی تھی۔ آسمان پر جمع ہوتے سیاہ بادلوں کے پرے کے پرے موسلا دھار بارش کی نشاندہی کر رہے تھے۔ گھاس کے سبز مخملیں فرش پر بارش کے ننھے قطرے، شبنمی موتیوں کی صورت بکھر رہے تھے۔ باؤنڈری والز کے ساتھ کیاریوں میں لگے پودے پھوار میں دُھل دُھلا کر نکھرے نکھرے لگ رہے تھے۔ کیاری کے کونے میں ایک گڑھے میں جمع شدہ پانی میں چڑیاں ڈبکیاں لگا رہی تھیں اور اپنے اس شغل کے دوران خوب چہچہا رہی تھیں۔

کلاس ختم ہوتے ہی فریال، نمو کا ہاتھ تھامے لان میں نکل آئی تھی۔ عموماً وہ دونوں کونے میں لگے اونچے نیم کے پیڑ تلے گھاس پر بیٹھا کرتی تھیں مگر اس وقت گھاس پر بکھری نمی کو محسوس کرتے ہوئے وہ دونوں ورانڈے کی سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گئی تھیں۔ فریال کچھ دیر کیاری کے گڑھے میں جمع شدہ پانی میں پھدکتی چڑیوں کی سمت دیکھتی رہی تھی، پھر اس نے ذرا سا گردن کو خم دے کر نمو کی طرف دیکھا تھا۔

آج صبح ہی سے نمو خاموش تھی۔ اس کے صبیح چہرے پر کرب کی عجب سی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ کئی لمحوں تک اُداس نظروں سے خلاء میں گھورتے رہنے کے بعد اس نے کاپی کھول کر ایک تہہ شدہ کاغذ نکالا تھا۔

''چھٹی کی درخواست؟'' فریال نے سوالیہ نظروں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔
''ہوں۔'' نمرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہ تمہیں کیسے پتہ؟..... میں نے تمہیں ابھی بتایا بھی نہیں۔'' نمرہ کے لہجے میں ہلکی سی حیرت تھی۔
''تمہاری خاموشی نے بتادیا تھا۔'' فریال نے فلسفیانہ انداز میں گہرا سانس لیا۔ ''جانتی ہو..... Listen اور Silent دو الفاظ ہیں۔ یہ دونوں الفاظ ایک سے حروف سے بنتے ہیں اور یہ دونوں الفاظ فرینڈ شپ میں بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ کیونکہ ایک سچا اور اچھا دوست وہی ہے کہ جو وہ سب کچھ بھی سن لیتا ہے، جب تم خاموش ہوتے ہو۔''
نمرہ نے پلکیں اٹھا کر فریال کی طرف دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔ یہ حقیقت تھی، فریال اس کی اچھی اور مہربان دوست ہی نہیں، بہنوں کی طرح محبت کرنے والی ہستی تھی۔ شریفن خالہ سے اسے ماں کا سا پیار ملا تھا تو فریال نے اسے بہنوں کی سی محبتوں سے نوازا تھا۔ ایک فریال ہی کیا، پروفیسر آفاق کے گھر کے ہر ایک فرد نے اس پر محبتیں نچھاور کی تھیں۔ ملیحہ بیگم، فریحہ اور خود آفاق صاحب بھی اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ جانے وہ بھی کیا نصیب لکھوا کر لائی تھی۔ سب چاہنے والے ایک ایک کر کے اس سے بچھڑتے جا رہے تھے۔ پہلے شریفن خالہ، پھر ملیحہ بیگم، فریحہ رخصت ہو کر سسرال سدھاریں اور اب فریال اور آفاق صاحب بھی روانگی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔
بنا کچھ کہے نمو اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ قمیض جھاڑتے ہوئے اس نے گردن گھما کر پرنسپل کے آفس کی طرف دیکھا۔
''میں ذرا یہ درخواست میڈم کو دے آؤں۔''
''ہاں چلو۔'' فریال بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔
''نمرہ علی.....!'' درخواست پر ایک نگاہ ڈال کر پرنسپل نے تنقیدی نگاہوں سے نمرہ کی طرف دیکھا۔ ''جانتی ہیں، ہفتہ بھر میں پریکٹیکل ایگزیمز ہونے والے ہیں اور آج کل زور و شور سے انہی پریکٹیکلز کی تیاری ہو رہی ہے۔ اور ایسے وقت میں آپ چھٹیوں کی درخواست دے رہی ہیں۔''
''جی..... وہ اصل میں میڈم.....'' نمرہ کی زبان لڑکھڑائی۔
''میں خود بھی چھٹیاں کرنا چاہ رہی تھی..... مگر..... گھر میں..... میرا مطلب ہے.....''
پرنسپل نے چشمہ درست کر کے گہری نظروں سے نمرہ کی طرف دیکھا۔ سر جھکائے بے بسی سے گلابی ہتھیلیاں ملتی اس معصوم اور دلکش چہرے والی لڑکی پر بے ساختہ ہی انہیں رحم اور پیار آ گیا۔
''کوئی اور طالب ہوتی تو میں ہرگز یہ درخواست قبول نہ کرتی۔'' انہوں نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''مگر مجھے آپ کی صلاحیتوں پر بھروسہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان چھٹیوں کا آپ کی شاندار کارکردگی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اسی لئے.....'' انہوں نے قلم اٹھا کر درخواست پر دستخط کر دیئے۔
''شکریہ۔'' نمو نے مشکور لہجے میں کہا اور اسی طرح سر جھکائے فریال کے ساتھ آفس سے باہر آ گئی۔ اور یونہی ساتھ ساتھ چلتی وہ دونوں وارنڈے کے آخری سرے تک چلی گئی تھیں۔
''ارجمند آنٹی کی اب طبیعت کیسی ہے؟'' وارنڈے کے آخری سرے پر واقع سیڑھیوں سے نیچے اُترتے اس نے بالکل اچانک ہی فریال سے پوچھا تھا۔
''پہلے سے اب کچھ بہتر ہیں۔'' فریال نے میکانی انداز میں جواب دیا۔
''کک..... کب..... روانگی ہے؟''

کتنا مشکل سوال تھا۔ تیز دھار خنجر کی طرح اس کے ننھے سے دل کو لہولہان کر گیا تھا۔
''ہفتہ کی رات۔'' فریال نے دور سرمئی گیٹ پر نظریں جمائے جواب دیا۔
''تم چلی جاؤ گی تو......'' نمرہ نے مایوس نظروں سے فریال کی طرف دیکھا۔ ''مگر مجھے خوشی ہے کہ......تم......اپنے گھر جا رہی ہو......ایک نئی اور خوبصورت زندگی کا آغاز کرنے کے لئے۔ اظفر بھائی بہت اچھے ہیں۔ تم ان کے ساتھ اِن شاءاللہ بہت خوش رہو گی۔'' نمرہ کے دعائیہ لہجے میں اخلاص بھری محبت اور دلی مسرت کی کھنک تھی۔
''تم یاد تو کرو گی نا؟'' فریال نے بھنویں سکیڑ کر نمرہ کی طرف دیکھا۔
''یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟'' نمرہ بے ساختہ کرب بھرے انداز میں ہنس دی۔ ''البتہ تم وہاں جا کر نئی دنیا، نئی خوشیوں میں اتنا کھو جاؤ گی......جانے مجھے کبھی بھولے بھٹکے یاد کرو......نہ کرو......''
''ہاں! یہ تو ہے۔'' ماحول کی سوگواری دور کرنے کی خاطر فریال نے اپنے مخصوص شریر لہجے میں کہا۔ ''اور ہماری دعا ہے کہ تم بھی جلد از جلد اپنی نئی دنیا اور نئی خوشیوں میں گم ہو جاؤ۔ تاکہ ہمیں یاد کرنے کے لئے تمہارے پاس بھی وقت نہ رہے۔''
''فریال! میں پڑھنا چاہتی ہوں۔'' فریال کی بات کا مفہوم سمجھتے ہوئے نمرہ نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''پڑھ لکھ کر ایک قابل ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔ تاکہ دکھی انسانیت کی خدمت کر سکوں۔ اور اپنے بھیا کے لئے......ان کے بچوں کے لئے خوشیاں خرید سکوں۔''
فریال نے حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ آج بھی ان اور اس کے بچوں کے لئے کتنے پیار اور خلوص سے سوچ رہی تھی۔ سچ ہے، بھائی کتنے ہی کیوں نہ بدل جائیں......ان کے لئے ان کی بہنوں کا پیار کبھی بھی نہیں بدل سکتا۔
''جانے سے پہلے ملنے تو آؤ گی نا؟'' فریال کو اپنی طرف یوں خالی خالی نظروں سے تکتے دیکھ کر اس نے جلدی سے سوال کیا۔
''ہاں کیوں نہیں؟'' فریال نے اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر سامنے گیٹ پر مرکوز کر دی تھیں۔ ''کل ہی پاپا کہہ رہے تھے۔''
''انکل تو واپس آئیں گے نا؟'' نمرہ نے پُراُمید لہجے میں سوال کیا۔
''ہاں بھئی۔'' فریال نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''اور تم کیا سمجھ رہی ہو کہ ایک بار جا کر میں کبھی واپس نہیں آؤں گی؟......سال دو سال بعد ضرور آیا کروں گی۔ سمجھیں؟''
''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' نمرہ نے دل سے دعا کی اور فریال کا ہاتھ پکڑ کر گیٹ سے باہر آ گئی۔

❀===❀===❀
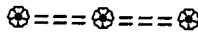
ایئرپورٹ جاتے وقت پروفیسر آفاق فریال کے ساتھ انو اور نمرہ سے ملنے آئے تھے۔
''آپ تو واپس آئیں گے نا سر؟'' انو نے سوال کیا تھا۔
''ہاں بھئی۔ اگر ارجمند بی کی طبیعت اس قدر خراب نہ ہوتی تو ہم تو سرے سے جاتے ہی نہ۔ خدا کرے وہ جلد شفا یاب ہو جائیں تو مہینے دو مہینے بعد ہم واپس لوٹ آئیں گے۔'' انہوں نے سامنے کھڑی نمرہ کی طرف دیکھا۔ گو کہ اس کے چہرے پر ملال اور آنکھوں میں کرب تھا مگر وہ اپنی بہن جیسی عزیز دوست کو مسکرا کر رخصت کرنا چاہ رہی تھی۔
''میں خوش ہوں فری! کہ تم اپنے گھر جا رہی ہو۔'' نمرہ نے فریال کو گلے لگائے ہوئے کہا۔

''میں بھی۔'' فریال نے شریر لہجے میں سرگوشی کی تھی اور بے ساختہ دونوں کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔
''اپنا خیال رکھنا۔'' پروفیسر آفاق نے نمرہ کے سر پر شفقت بھرے انداز میں ہاتھ پھیرا۔ ''میں بہت جلد لوٹ آؤں گا۔ خود کو کبھی بھی اکیلا نہ سمجھنا۔'' نمرہ کی طرف جھکتے ہوئے انہوں نے دھیمے مگر مضبوط لہجے میں کہا تھا اور نمرہ کی پلکیں آپ ہی آپ بھیگتی چلی گئی تھیں۔ کتنی دیر سے، کتنی مشکل سے ان آنسوؤں کو روک رکھا تھا۔ فریال نے آگے بڑھ کر الوداعی انداز میں اسے گلے لگایا تو آنسوؤں کا یہ ریلا بے قابو ہو کر رخساروں پر بہہ نکلا تھا اور وہ بے اختیارانہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔ فریال بھی رو رہی تھی۔ آفاق صاحب کی آنکھوں میں بھی نمی اُتر آئی تھی۔
'لو......ڈرامہ شروع....' اپنے کمرے میں بیٹھی حسنہ نے ملتے ہوئے پردے کے کونے سے باہر جھانکتے ہوئے جلے دل سے سوچا۔ 'پر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے.....آج کے بعد ان دونوں عذابوں سے نجات مل جائے گی۔'
فریال، نمرہ سے الگ ہو کر دروازے کی طرف بڑھی۔ نمرہ آنکھوں میں آنسو، کرب اور حسرت لئے اسے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور اسے بے اختیار وہ شام یاد آ گئی تھی جب انو اُس کی انگلی تھامے پروفیسر آفاق کے گھر لے گیا تھا۔ اور اس کی پہلی بار فریال سے ملاقات ہوئی تھی۔ گو کہ وہ اس وقت بہت چھوٹی تھی مگر اس پہلی ملاقات کی ننّھی منّی یادیں آج بھی اس کے ذہن کے گوشوں میں محفوظ تھیں۔ وہ گندمی رنگ کی گول مٹول سی بچی، جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں شرارت تھی، اسے بہت اچھی لگی تھی۔
''تمہارا نام کیا ہے؟'' اس نے معصومیت سے سوال کیا تھا۔
''نمرہ......نمرہ علی......'' نمو نے بااعتماد انداز میں جواب دیا۔
''اور مجھے فریال کہتے ہیں......فریال احمد۔'' اُس نے اُس کی طرف دوستانہ انداز میں ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف کروایا تھا۔
''فرینڈز......؟'' فریال نے سوال کیا تھا۔
''فرینڈز......'' نمرہ نے لحظہ بھر سوچا تھا، پھر سوالیہ نظروں سے انو کی طرف دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں سے مسکراتی آمادگی پاتے ہی اس نے بھی ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا۔
''اب اگر ہم دوست ہو ہی گئے ہیں تو......تم مجھے فری کہہ سکتی ہو۔'' فریال نے اس کا ہاتھ گرمجوشی سے دباتے ہوئے فراخدلانہ پیشکش کی تھی۔
''اور تم بھی مجھے نمو کہہ سکتی ہو۔'' نمرہ نے بھی اسی فراخدلی کا مظاہرہ کیا تھا۔
''اب ہم پکی دوست بن چکی ہیں۔'' فریال نے یاددہانی کروائی۔
''تم مجھے کبھی چھوڑ دو گی تو نہیں نا؟'' نمرہ نے یقین دہانی چاہی۔
نمرہ نے کبھی بھی اپنی ماں کو نہیں دیکھا تھا اور اُس کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی اس کا باپ بھی اسے چھوڑ گیا تھا......اور چھوڑ جانے کا تصور اس کے ننھے سے دل میں ایک خوف کی علامت بن گیا تھا۔
''نہیں......کبھی نہیں۔'' فریال نے پورے یقین سے جواب دیا تھا۔ ''پرامس......میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی۔''
مگر آج اتنے برسوں بعد وقت اُسے اس دوراہے پر لے آیا تھا، جب وہ نمرہ کو چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ حالات کا تقاضا، زمانے کا دستور اور تقدیر کا فیصلہ تھا کہ وہ اپنا وعدہ توڑنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

اِک نہ اِک روز تو رخصت کرتا
مجھ سے وہ کتنی ہی محبت کرتا

سو رخصت ہونا یقینی امر تھا۔
محبتیں جانے والوں کو روک نہیں سکتیں۔ اور نمو تو فریال کو روکنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کی دوست تھی۔ اس کی خوشیوں کی خواہاں...... جانتی تھی، آنے والے وقت کی تمام تر خوشیاں اب اظفر کے نام سے ہی وابستہ ہیں۔ اسی واسطے فریال کا اظفر کے پاس جانا لازمی و ضروری ہے۔ سو وہ اسے مسکراتے ہوئے رخصت کرنا چاہتی تھی مگر آنسو تھے کہ پلکوں کی باڑ توڑ کر رخساروں پر بہے چلے آ رہے تھے۔
نمرہ نے دُھندلائی ہوئی آنکھوں سے دروازے کے پاس تھمتی ہوئی فریال کی طرف دیکھا۔ یہ چہرہ کتنا مانوس، کتنا اپنا سا لگتا تھا۔ محبت لٹاتی یہ آنکھیں اب بچھڑنے کو تھیں۔ پیار سے سہارا دیتے یہ ہاتھ اب اس سے دور جانے کو تھے...... زندگی پھر کبھی اس چہرے کو، ان مہربان آنکھوں کو، ان شفیق ہاتھوں کو دیکھنے کی، چھونے کی مہلت دے نہ دے..... لحظہ بھر کو نمرہ کو اپنا کلیجہ شق ہوتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ دھڑکنیں تھمتی ہوئی لگی تھیں اور سانسیں رک سی گئی تھیں۔ وہ بے ساختہ لپکتی ہوئی فریال کی طرف بڑھی تھی اور کسی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح اس کے گلے میں جھول گئی تھی۔
''نمو!...... میری جان!...... میری بہن! حوصلہ کرو۔'' فریال نے بازو پھیلا کر اسے اپنی محبتوں کی پناہوں میں لے لیا تھا۔ کئی لمحے وہ ایک دوسرے کے گلے لگی یوں ہی محوِ گریہ رہی تھیں۔ پھر فریال نے ہی نرمی اور آہستگی سے اسے خود سے الگ کر دیا تھا۔ خود اس کا دل کٹا جا رہا تھا۔ جانتی تھی کہ اب کے بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں...... رابطے کی کوئی سبیل بھی نہ تھی۔ انو کے گھر میں فون تھا نہ نمو کے پاس موبائل...... اور ایسے حالات بھی نہ تھے کہ وہ فریال یعنی آفاق صاحب کے گھر جا کر یا کسی PCO سے ہی اسے فون کر لے۔ حسنہ کے گھر میں ہوتے وہ نمو کو خط لکھنے کی جسارت بھی نہ کر سکتی تھی۔ تو پھر ملاقات کیسے ہو سکتی تھی؟...... ایک طویل اور سرد جدائی کے سوا کوئی اور راستہ تھا نہ چارہ۔ وہ دونوں تقدیر کے اس سنگین فیصلے کی ستم ظریفی کو محسوس کر رہی تھیں۔ تب ہی نمرہ کی پلکوں سے آنسوؤں کی جھڑی نہیں ٹوٹ رہی تھی۔ وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔
''اچھا بس...... اب یہ آنسو بہانا بند کرو۔ اور مسکرا کر مجھے رخصت کرو۔'' چند لمحوں بعد فریال نے آنسو پونچھتے ہوئے قدرے شوخ لہجے میں کہا مگر اس کی آواز کی اُداسی اُس کے لہجے کی شوخی کا ساتھ نہ دے پائی تھی۔ نمرہ نے بے دردی سے آنکھوں کو رگڑ کر فریال کی طرف دیکھا۔ کاش وہ فریال کو روک سکتی۔ اس کا ہاتھ تھام کر ہمیشہ کے لئے اپنے پاس ٹھہرا سکتی۔ مگر ایسا کیونکر ممکن تھا۔ جانے والے کو کہاں روک سکی ہے دنیا۔
''جاؤ...... فی امان اللہ!'' نمرہ کے خشک لرزیدہ لبوں سے خفیف سی آواز نکلی۔ فریال کا گلا بھر آیا۔ وہ منہ سے کچھ نہ بول سکی۔ الوداعی انداز میں ہاتھ اٹھایا اور چہرہ موڑ کر تیزی سے دروازے سے باہر چلی گئی۔
نمرہ کی کتنی خواہش تھی کہ وہ اسے ایئرپورٹ تک چھوڑنے جا سکتی...... مگر وہ جانتی تھی کہ اس کی یہ خواہش کبھی پایۂ تکمیل تک پہنچ ہی نہیں سکتی...... سو وہ آنکھوں پر ہاتھ دھرے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ گزرتے وقت کا ہر لمحہ اسے تنہائی کے عمیق گڑھے میں گراتا جا رہا تھا۔ ایک ایک کر کے اس کے سارے چاہنے والے اسے چھوڑتے جا رہے تھے۔ اب تو دُور دُور تک کوئی نظر ہی نہیں آتا تھا۔ ہر سمت تنہائی کا بیکراں صحرا تھا۔ اور وہ تھی...... تکیے میں چہرہ چھپا کر وہ ہچک ہچک کر روئے جا رہی تھی۔
نہ چاہتے ہوئے بھی انو کو ایک دکھ کے بے نام احساس نے گھیر لیا تھا۔ آفاق صاحب نے ہر ہر قدم پر ان دونوں بہن بھائی کا بے حد خیال رکھا تھا۔ ساتھ دیا تھا۔ اگر ان کی محبت، مہربانی اور رہنمائی ساتھ نہ ہوتی تو آج انو اس مقام پر نہ ہوتا..... اب وہ پردیس سدھارے تھے تو جانے والے واپس لوٹتے بھی یا نہیں..... اب یہاں ان کا تھا ہی کون......؟

''اے میں کہتی ہوں.....تم کہاں کھو گئے؟'' انو کو یوں گم صم دیکھ کر حسنہ نے اسے ٹھوکا دیتے ہوئے ناگوار لہجے میں پوچھا۔''لو بتاؤ......ایک تو اُس نے رو رو کر گھر بھر دیا ہے اور دوسرے تم نے بھی رونی شکل بنالی۔''

''اوہ.....اصل میں.....نمو اور فریال کا ساتھی......بڑی دوستی تھی دونوں کے بیچ.....'' انو نے وضاحت کرنی چاہی۔ بڑا بے ربط سا جملہ تھا جو اس کے ذہنی خلفشار کا غماز تھا۔

''اے ہٹو! یہ دوستی ووستی کیا ہوتی ہے؟'' حسنہ منہ بنا کر ناگواری سے بولی۔''اللہ بخشے ہمارے اماں باوا کا کہنا تھا کہ بس اپنے گھر میں اپنے ہی بھائیوں سے مل کر کھیلو......اور انہی سے دوستی رکھو۔ جب کہ ہماری تو کوئی بہن بھی نہ تھی۔ مگر مجال ہے جو کسی آس پڑوس کی لڑکی سے دوستی کی ہو......اللہ رکھے ہمارے پانچ پانچ بھائی تھے اور سب کے سب ان دوستی کے چونچلوں کے خلاف۔''

''خیر......'' انو نے گہرا سانس لے کر بحث سمیٹنے کی کوشش کی۔''اب تو وہ چلی ہی گئی.....کون جانے کبھی لوٹتی بھی ہے یا......''

''اے میں تو اپنے اللہ سے چاہتی ہوں کہ اب وہ کبھی لوٹ کر نہ آئے......اے میں تو کہتی ہوں تمہارے پروفیسر صاحب بھی وہیں رہ پڑیں۔ ایک اُن کے نہ ہونے سے کون سی یونیورسٹی بند ہونے جارہی ہے۔''

انو نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے تکیہ پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ تکیہ کے نیچے ہاتھ رکھنے سے اس کے ہاتھوں سے حسنہ کا ہسپتال کارڈ ٹکرایا تھا۔ اس نے کارڈ نکال کر تاریخ پر نگاہ ڈالی۔

''کل تمہیں ہسپتال جانا ہے؟''

''ہاں۔'' حسنہ نے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے ہلکی کراہ کے ساتھ جواب دیا۔

''پہلے بتادیتیں تو آج میں چھٹی کی درخواست دے آتا۔''

''تمہیں چھٹی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' حسنہ نے جواب دیا۔''نمو کی چھٹیاں ہیں نا......میں اسی کو ساتھ لے کر چلی جاؤں گی۔''

''چلو......یہ تو اچھا ہے۔'' انو نے اطمینان بھری سانس لی۔''کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟''

''نہیں، مسئلہ کیا ہونا ہے؟......یہاں سے بس میں بیٹھیں گے، سیدھا رستہ ہے، ہسپتال پہ اُتر جائیں گے۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' انو نے اثبات میں سر ہلایا اور اطمینان بھرے انداز میں آنکھیں بند کرلیں۔

❀===❀===❀
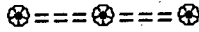
گو کہ وہ صبح بھی عام صبحوں جیسی ہی تھی۔ مگر اس لحاظ سے بہت مختلف تھی کہ آج کی صبح اسد اپنے ناگزیر فیصلے پر عمل درآمد کرنے والے تھے۔ وہ طوفان جس پر سرمد پچھلے دو سالوں سے اپنی تدبیروں، مشوروں اور محبتوں کے بند باندھتے چلے آرہے تھے، آج وہ طوفان اپنی تمام تر شوریدہ سری کے ساتھ وقوع پذیر ہونے کو تھا۔

کل رات بھی اسد نے انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ انہیں ایک ملٹی نیشنل فرم میں بہت اچھی جاب مل گئی تھی اور ساتھ ہی فرنشڈ اپارٹمنٹ اور کار......آخر ندرت جہاں بھی کب تک انتظار کرتیں۔ وہ تو کہو کہ اسد پر بے پناہ بھروسہ تھا جو انہوں نے دو سال بھی گزار لئے تھے۔ گو کہ کہنے کو پلک جھپکنے میں یہ دو سال بیت گئے تھے مگر حقیقت میں دو سال ایک مدت کا نام تھا......سات سو بیس دن......24 مہینے......بے شمار گھنٹے......ان گنت لمحے......اور وہ لمحہ لمحہ کبھی باپ کو اور کبھی بھائی کو مناتے رہے تھے......مگر نہ وجاہت مرزا ٹس سے مس ہونے کو تیار تھے اور نہ اسد اپنے موقف سے ذرہ بھر بھی ہٹنے کو۔

اسلم احمد کی اوپن ہارٹ سرجری کے بعد طبیعت بہت حد تک ٹھیک ہو گئی تھی۔ کچھ اس لئے اور کچھ سرمد کی وجہ سے ندرت جہاں نے بھی خاموشی اختیار کر لی تھی۔ وہ سرمد اور فروا کو وقت دینا چاہتی تھی۔ سرمد میں فروا کی دلچسپی سے وہ بے حد خوش تھیں۔ ایک تو یہ کہ سرمد جیسا لاکھوں میں ایک داماد ملنے والا تھا...... دُوجے وجاہت مرزا سے انتقام کا جذبہ اب بھی ان کے دل میں موجود تھا۔ گو کہ انہوں نے اپنے اوپر محبت، اخلاص اور نرمی کا ملمع چڑھا لیا تھا۔ مگر اندر سے وہ وہی نفرت اور تلخیوں سے بھری ندرت جہاں تھیں جو آج بھی وجاہت مرزا کی تباہی و بربادی کی خواہاں تھیں۔ جانتی تھیں دونوں بیٹوں کے ہاتھ سے نکل جانے پر وہ کس کس طرح نہ تڑپیں گے......اسی تڑپ کو دیکھنے کی خاطر انہوں نے اب تک انتظار کر لیا تھا۔ پر اب چند دنوں سے پھر اسلم احمد کی طبیعت گڑ بڑ چل رہی تھی اور ندرت جہاں ایک دم سے، پھر سے خدشوں میں گھِر گئی تھیں۔

''اسد بیٹا! تم اپنے خالو کی حالت دیکھ رہے ہو؟'' وہ چند دنوں میں کتنی ہی بار اسد سے یہ سوال کر چکی تھیں۔

''آپ فکر نہ کیجئے خالہ جان!......آپ تو جانتی ہیں، میں ان حالات سے بے نیاز یا لاتعلق نہیں ہوں۔'' اسد تسلی دیتے۔

''بیٹا! اب فیصلے کی گھڑی آ گئی ہے۔''

''جی خالہ جان! میرا بھی یہی خیال ہے۔'' اسد کے لہجے میں مضبوطی تھی اور ہاتھ میں اپائنٹمنٹ لیٹر آتے ہی اسد نے حتمی فیصلہ کر گزرنے کی ٹھان لی تھی۔ جانے کب سے وہ اُمید بھری نگاہوں سے سرمد کی طرف تکتے چلے آ رہے تھے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ سرمد کا ولولہ اور جذبہ ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں جلتے اُمید کے چراغ ایک ایک کر کے بجھتے جا رہے تھے اور گھور اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی اسد نے اپنا چنا ہوا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

آخر کوئی کب تک انتظار کر سکتا ہے؟ اور جبکہ یہ یقین ہو کہ انتظار بے معنی اور لاحاصل ہے۔

وجاہت مرزا کی ضدی اور خودسر طبیعت سے سب ہی واقف تھے۔ اس کے باوجود سرمد نے اپنی سی ہر کوشش کر دیکھی تھی اور ان کی ہر کوشش ناکام اور بے فیض ثابت ہوئی تھی۔ وجاہت مرزا کا ایک ہی فیصلہ تھا۔ اگر ندرت جہاں سے رشتہ جوڑیں گے تو انہیں اس گھر اور گھر والوں سے ہر رشتہ ناتہ توڑنا ہو گا۔

اور آخر کار اسد اُن کے اس فیصلے کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ وہ تو دو سال پہلے ہی گھر چھوڑ جاتے اگر سرمد بیچ میں نہ آ جاتے۔ اور ندرت جہاں کا سارا گھرانہ سرمد کو وقت دینے کے حق میں تھا۔ دراصل وہ سب ہی سمجھ رہے تھے کہ اس دوران فروا کو سرمد کے قریب آنے کا موقع ملے گا۔ اور ان سب کا یہ اندازہ کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ فروا، سرمد کی فصیلِ دل میں نقب لگانے میں کسی قدر کامیاب ہو گئی تھی۔ اُس کی محبت پاش نگاہیں، سرمد کے درِ دل پر دستک دینے میں کافی حد تک گامزن ہو گئی تھیں۔ بہت آہستگی سے ہی صحیح مگر ان کے ذہن کی پتھریلی دیواروں میں دراڑیں پڑتی جا رہی تھیں۔ سوچ کی اُونچی فصیلوں میں فروا کمند ڈالنے میں کامیاب ہوتی جا رہی تھی۔ ندرت جہاں کے گھر جانا، فروا سے ملنا، اس کی بولتی آنکھوں کا خاموشی سے سامنا کرنا..... یہ سب جو بھی اُلجھن کا باعث تھا، اب انہیں کچھ کچھ اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ اپنے دل کی بدلتی اس کیفیت کو اب تک کوئی نام نہیں دے سکے تھے مگر اتنا جان گئے تھے کہ کوئی نہ کوئی تبدیلی رونما ہو رہی ہے، جس کے سامنے وہ خود کو بے بس پاتے تھے۔

اِدھر اسد کا مسئلہ خوفناک عفریت کی طرح منہ کھولے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اپنی سی تمام تر کوششیں کر کے ناکام ہو چکے تھے۔ اب اسد کے فیصلے کے سامنے سر جھکانے کے سوا چارہ بھی کیا تھا؟

''اماں بی! میں کل صبح گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں......ہمیشہ کے لئے۔''

اسد کی آواز نے عاتکہ بیگم کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ گو کہ وہ جانتی تھیں، آخر کار یہی ہونا ہے۔ وہ کب سے اس اذیت ناک لمحے کی منتظر تھیں اور ذہنی طور پر جانے کب سے خود کو اس لمحے کے لئے تیار کر چکی تھیں۔ مگر جب یہ لمحہ سامنے آیا تو وہ سرتا پا لرز اُٹھی تھیں۔ کسی بم کی طرح یہ لمحہ اُن کے سر پر پھٹا تھا اور اُن کی روح کو چیتھڑے کر گیا تھا۔ ریزہ ریزہ کر گیا تھا۔

''کیا کہہ رہے ہو بیٹا؟'' بات سمجھ لینے کے باوجود وہ کچھ سمجھ نہیں سکی تھیں۔

''میں کل صبح......'' اسد کی آواز لڑکھڑا کر تھم گئی۔

''اسد میرے لعل!......کیا تم اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتے؟'' عاتکہ بیگم کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

''یہ کیسے ممکن ہے اماں بی!'' اسد کے لہجے میں ناگواری تلخی تھی۔ ''ایک لڑکی برسوں سے میرا انتظار کر رہی ہے...... میں کیسے اُس کی اُمیدیں توڑ دوں؟''

''بوڑھی دادی کا دل توڑ سکتے ہو...... نا تواں باپ کا مان توڑ سکتے ہو مگر......'' عاتکہ بیگم نے شکوہ بھری نگاہوں سے اپنے جواں سال پوتے کی طرف دیکھا مگر لبوں سے کچھ نہیں کہا۔ جانتی تھیں، اس چٹان پر جونک لگانا ممکن ہی نہیں۔ سو انہوں نے بے ساختہ اپنے بازو پھیلا دیئے تھے اور اسد اضطراری طور پر ان کے کھلے بازوؤں میں سمٹ آئے تھے۔ عاتکہ بیگم کے ممتا بھرے سینے سے وہ آج کتنی ہی مدت بعد لگے تھے اور کس قدر سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ عاتکہ بیگم ان کے سر پر چہرہ ٹکائے خاموشی سے آنسو بہا رہی تھیں۔ ان کی پلکوں سے موتی ٹوٹ کر اسد کے گھنے بالوں کے جنگل میں گم ہو رہے تھے۔

''اسد! کبھی ملنے تو آؤ گے نا؟'' عاتکہ بیگم نے اسد کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں تھامتے ہوئے بے بسی سے سوال کیا۔

اس سے پہلے کہ اسد کوئی جواب دیتے، وجاہت مرزا کی کرخت آواز نے کمرے کے سکوت کو تیرہ و تاخت کر دیا تھا۔

''ہرگز نہیں۔'' کتنی ہی دیر سے دروازے پر کھڑے وہ دادی اور پوتے کی باتیں سن رہے تھے۔ لحظہ بھر کو تو وہ سُن ہو گئے تھے۔ انہوں نے کب سوچا تھا کہ اسد کبھی اتنی انتہا پسندی پر بھی اُتر آئیں گے۔ وہ تو اپنے تئیں یقین کیے بیٹھے تھے کہ بالآخر اسد نے ہار مان لی ہے۔ گو کہ سرمد مسلسل انہیں سمجھانے بجھانے کی کوشش میں لگے تھے مگر ان کی ''نہ'' کو ''ہاں'' میں نہیں بدل پائے تھے اور اس کی خاموشی سے وجاہت مرزا یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ شاید باپ کی ضد کے سامنے بیٹے نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ مگر شاید وہ یہ بھول گئے تھے کہ اسد بھی انہی کی اولاد ہے۔ انہی کی طرح ضدی، ہٹ دھرم اور سرکش...... اور آج اسد کا گھر چھوڑنے کا فیصلہ...... ان کے یقین کی قناتوں کی دھجیاں بکھیر گیا تھا۔ توقع رکھنے کے باوجود وہ کبھی بھی اس بات پر یقین نہیں کر سکے تھے کہ کبھی اسد اُنہیں...... اپنی اماں بی کو...... بھائی اور گھر کو چھوڑنے کا بھی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اور آج اسد کا چٹانوں کی طرح مضبوط یہ فیصلہ گرم سیسے کی طرح وجاہت مرزا کے کانوں میں اُترا تھا تو اُن کی روح کی دیواروں تک کو ہلا گیا تھا۔ بنیادوں تک لرز جانے کے باوجود انہوں نے ترش لہجے اور تلخ آواز میں اپنا فیصلہ سنایا تھا۔

''ایک بار اس گھر کو چھوڑنے کے فیصلے پر عمل درآمد کرنے کے بعد تم سے ہمارا اور اس گھر کا ہر رشتہ، ہر تعلق ٹوٹ جائے گا۔'' وہ مضبوطی سے قدم رکھتے کمرے میں داخل ہوئے۔ ''تمہیں کبھی بھی اس گھر میں داخل ہونے یا یہاں کے کسی فرد سے ملنے کی اجازت نہیں ہوگی...... اس گھر سے ایک بار قدم نکالنے کے بعد سمجھ لینا...... ہم سب تمہارے لئے مر چکے ہیں۔''

اسد نے بے بس نگاہوں سے عاتکہ بیگم کی طرف دیکھا۔ ان کی بھیگی پلکیں اسد کا دل برمائے دے رہی تھیں۔ مگر باپ کے کٹھور پن نے ان کے دل کو کڑواہٹ سے بھر دیا تھا۔ وہ ایک دم سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا دل چاہا وہ چیخ کر کہیں کہ وہ کوئی جرم یا گناہ نہیں کرنے جا رہے۔ قانونی اور شرعی طور پر اپنی پسند کے جیون ساتھی کے انتخاب کا انہیں حق

حاصل ہے۔ مگر فطری لحاظ آڑے آ گیا اور وہ ایک لفظ کہے بِنا دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

''اسد!'' عاتکہ بیگم کی دھڑکنوں سے ہوک اُٹھی مگر لبوں تک نہ آ سکی۔ اسد نے بھی مڑ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ بس تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتے چلے گئے تھے۔ دروازے کے باہر سرمد سر جھکائے کھڑے تھے۔ وہ لحظہ بھر کو ان کے سامنے تھم گئے تھے۔

''کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے کہ ثروت سے محبت کر کے مجھ سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہے۔'' ان کے لہجے میں بے بسی کے ساتھ دبا دبا غصہ بھی تھا۔

'کاش میں نے اس سے محبت نہ کی ہوتی...... مگر محبت پر کس کا اختیار چلا ہے؟...... محبت کب کی جاتی ہے؟...... وہ تو آپ ہی آپ ہو جاتی ہے۔ دل کی زمین پر یہ فصل از خود اُگ آتی ہے...... لاکھ روکو...... لاکھ بند باندھو...... مگر یہ طوفانِ بلاخیز کسی بند باندھے سے کب تھما ہے؟' خود سرمد بھی آج کل اسی پگڈنڈی پر کھڑے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُن کا دل بے اختیارانہ فروا کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ اس کی سوال کرتی آنکھوں کو نظر انداز کرنا اب انہیں مشکل ہی نہیں، ناممکن لگنے لگا تھا۔

''کم از کم تم تو ملنے آؤ گے نا؟'' سرمد کو گم صم سا کھڑے دیکھ کر انہوں نے پُر اُمید لہجے میں سوال کیا تھا۔

وجاہت مرزا اپنا فیصلہ سنا چکے تھے، جو حتمی تھا۔ اسد کو اس گھر کے کسی بھی فرد سے ملنے اور اس گھر کے کسی بھی فرد کو ان سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ اور وہ جانتے تھے کہ سرمد باپ سے کس قدر بے پناہ اور شدید محبت کرتے ہیں اور ان کی نافرمانی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ پچھلا زمانہ ہوتا تو وہ یقیناً یقین کر لیتے کہ سرمد بھی ان کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھیں گے...... مگر پچھلے دو سالوں کی رفاقت اور محبت نے انہیں خاصا خوش فہم کر دیا تھا اور وہ اس خوش اُمیدی کا شکار ہو گئے تھے کہ کچھ بھی ہو، کم از کم سرمد ان سے لاتعلق نہیں رہ سکیں گے۔

سرمد بے بس نگاہوں سے انہیں دیکھ کر رہ گئے تھے۔ نہ اقرار کر سکے تھے نہ انکار...... خود پر سے بھی بھروسہ اُٹھتا محسوس ہو رہا تھا تو انہیں کیسے یقین دلا سکتے تھے؟

اسد تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اس گھر میں ان کی یہ آخری رات تھی۔ وجاہت مرزا اُنہیں اپنی قابل نفرت سالی کی بیٹی سے محبت کی سزا دے رہے تھے اور اسد باپ کی اس ظالمانہ ضد کے سامنے جھکنے کو تیار نہ تھے۔ وہ ثروت کی خاطر نہیں بلکہ اپنی زبان کی خاطر سب کچھ چھوڑنے کو تیار تھے۔ یہ محل نما گھر، وسیع و عریض کاروبار...... کروڑوں کی جائیداد...... دادی کی محبت اور باپ کی شفقت...... اپنی ہٹ کی خاطر وہ یہ سب تیاگ دینے کو تیار تھے مگر اپنی ضد چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔

وجاہت مرزا، اسد اور سرمد کا ایک مشترکہ اکاؤنٹ تھا۔ جسے جتنی رقم کی ضرورت ہوتی، وہ وہاں سے نکال سکتا تھا۔ جانتے تھے یہ سب کچھ ان کے انہی دونوں بیٹوں کے لئے ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اس مشترکہ اکاؤنٹ کے علاوہ بھی اسد اور سرمد کے الگ الگ اکاؤنٹ کھلوائے ہوئے تھے اور ہر ماہ ایک خطیر رقم وہ ان دونوں کے اکاؤنٹ میں، ان کے ذاتی اخراجات کے لئے جمع کروا دیتے تھے۔ ضرورت ہوتی تو وہ دونوں اپنے اسی اکاؤنٹ سے رقم نکلوا کر خرچ کرتے تھے۔ مگر آج اس گھر کو چھوڑتے وقت اسد نے نہ صرف جوائنٹ اکاؤنٹ بلکہ اپنے اس پرسنل اکاؤنٹ کی چیک بک بھی اپنے کمرے میں ہی چھوڑ دی تھی۔ اب وہ وجاہت مرزا سے ایک پیسہ بھی لینے کے حق میں نہ تھے۔ گو کہ فیصلہ ہوا تھا کہ ثروت سے شادی نہایت سادگی سے کی جائے گی۔ اس کے باوجود کچھ نہ کچھ روپوں کی ضرورت تو تھی نا...... اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے اپنے دوست اور کولیگ دانش احمد سے کچھ رقم اُدھار لے لی تھی۔ دانش، ندرت

جہاں کی نند رضوانہ بیگم کے صاحبزادے وقاص کے اکلوتے بیٹے تھے۔ اس حوالے سے ان کی اسد سے ایک رشتے داری بھی بنتی تھی۔

رضوانہ بیگم کے انتقال کے بعد وقاص احمد اپنے گھر اور اپنی ذمے داریوں میں اُلجھ گئے تھے۔ اس کے باوجود اپنی ماموں زاد بہنوں سطوت اور ندرت کی اولادوں سے وہ لاتعلق اور بے نیاز نہ تھا۔ کیونکہ وقاص کا وجاہت مرزا سے دوستی کا رشتہ تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان کے بیٹے دانش کا بھی اسد سے بچپن سے ہی گہرا یارانہ تھا۔ گو کہ ان کی ملاقات کم کم ہوتی تھی مگر جب بھی ملتے تھے، لگتا تھا کبھی الگ ہی نہ ہوئے تھے۔ اس فرم میں اسد کی ملازمت کے سلسلے میں بھی دانش نے ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ کیونکہ وہ خود بھی اسی فرم میں ایک کلیدی پوسٹ پر فائز تھے۔ دانش سے کچھ رقم اُدھار لے کر انہوں نے ندرت جہاں کو ثروت کے عروسی لباس اور دیگر ضروری اشیاء کے لئے دے دی تھی۔

سب تیاریاں مکمل تھیں۔ کل صبح اسد اپنے فلیٹ پر شفٹ ہوتے ہی شام کو چند دوستوں کی معیت میں ثروت کو بیاہنے جانے والے تھے۔

''کل شام تو کچھ وقت نکال سکو گے؟'' انہوں نے امید و بیم کی کیفیت میں سرمد سے سوال کیا تھا۔ ''کل شام کو نکاح ہے۔''

اور سرمد نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس سر جھکا لیا تھا۔ اسد اُن کے اس طرح سر جھکانے سے کوئی مطلب اخذ نہ کر سکے تھے۔ وہ آئیں گے یا نہیں؟ کچھ پتہ نہ چلا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ سرمد کو انوائٹ کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کرتے۔ مگر پچھلے دو سالوں میں وہ سرمد کے خاصے نزدیک آ گئے تھے۔ اور پھر سرمد میں فروا کی دلچسپی بھی ان سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ ان سب باتوں نے سرمد کو خود سے جوڑے رکھنے کی خواہش جگا دی تھی۔ سب کے بچھڑنے کے باوجود وہ اپنے اس اکلوتے، چہیتے، وجیہہ و شکیل بھائی سے بچھڑنا نہیں چاہتے تھے۔

''میں تمہارا انتظار کروں گا۔'' اسد نے دھیمے لہجے میں کہا تھا اور آہستگی سے قدم رکھتے گیٹ کی جانب بڑھ گئے تھے۔ وہ اپنی گاڑی یہیں چھوڑے جا رہے تھے۔ اسی لئے ارادہ تھا کہ گیٹ سے نکل کر سڑک پر پہنچ کر کوئی ٹیکسی لے کر فلیٹ پر پہنچ جائیں گے۔ وہاں آفس سے ملی ہوئی کار پہلے سے ہی موجود تھی۔ وہ سر جھکائے دھیمے قدموں سے گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے کہ بالکل اچانک نکیتا سامنے آ گئی تھی۔

''اسد بھائی......!'' اس نے گلوگیر آواز میں انہیں پکارا تھا۔ ''آپ جا رہے ہیں...... سب کو چھوڑ کر...... ہم سب کو چھوڑ کر......؟''

''اوہ نگی......!'' اسد نے اس کے سر پر شفقت بھرے انداز میں ہاتھ رکھا۔ ''بس کیا کریں؟ حالات ہی ایسے ہیں۔''

''مگر بھیا......!'' نکیتا نے باقاعدہ آنسوؤں سے رونا شروع کر دیا۔ ''آپ نے سوچا، آپ کے بعد اماں بی پر کیا گزرے گی؟...... وہ آپ کے بغیر کس طرح جی سکیں گی؟''

''ارے پگلی!...... کوئی کسی کے لئے نہیں مرتا۔'' چاہتے ہوئے بھی اسد یہ بات کہہ نہیں سکے تھے۔

''پہلے بھی اس گھر کے لوگ ہی کتنے تھے...... اب آپ بھی جا رہے ہیں۔ آپ چلے جائیں گے تو یہ گھر اور بھی سُونا ہو جائے گا۔''

''نکو...... نگی...... نکیتا......!'' اسد نے حسبِ عادت تین طریقوں سے نکیتا کا نام لے کر اس کے شانوں کو تھپتھپایا۔ ''تم فکرمند نہ ہو۔ جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم اپنا اور اماں بی کا خیال رکھنا۔'' چاہتے ہوئے بھی وہ باپ کا نام نہ لے سکے تھے۔ وجاہت مرزا ان سے خفا تھے تو وہ بھی ان سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھے۔ ان کی ایک بے جا اور بلاوجہ

کی ضد کی وجہ سے انہیں گھر سے بے گھر ہونا پڑ رہا تھا۔ اپنوں سے دُور جانا پڑ رہا تھا۔ کیا تھا اگر وہ ثروت کو اپنا لیتے...... اپنا وقت بھول گئے تھے جب اپنی پسند کی خاطر وہ عاتکہ بیگم جیسی ماں کو چھوڑنے کو تیار ہو گئے تھے۔ اور آج اسد وہی کرنے جا رہے تھے تو ان کا غصہ قابل دید تھا۔ اسد کو کیا معلوم تھا کہ وجاہت مرزا بھی یہی بات تو نہیں بھولے تھے کہ بے جا ضد کر کے انہوں نے سطوت کو شریکِ حیات بنایا تھا.... اور وقت نے ثابت کر دیا تھا کہ ان کی وہ ضد خود ان کے لئے اور ان کی معصوم ماں عاتکہ بیگم کے لئے عذاب بن گئی تھی۔ اپنے تجربے کی روشنی میں وہ اپنے چہیتے بیٹے کو اس عذاب ناک زندگی سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے مگر اسد ان کے انکار میں چھپی اصل وجہ کو سمجھنے کے لئے تیار ہی نہ تھے۔

وہ جونہی گیٹ کے قریب پہنچے، بوڑھا چوکیدار خانو بابا تیزی سے اپنے شیڈ سے نکل کر ان کے قریب چلا آیا تھا۔

''ارے اسد بابا!...... آپ اس وقت بغیر گاڑی کے کدھر جا رہے ہیں؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا تھا۔

''بس خانو بابا!...... باہر نکل کر ٹیکسی لینے کا ارادہ ہے۔'' اسد نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''کیوں...... آپ کی گاڑی خراب ہے کیا؟'' خانو بابا نے دُور پورچ میں کھڑی اُن کی نئی چمچماتی مرسڈیز کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''اگر ایسا ہے تو آپ بڑے صاحب کی دونوں گاڑیوں میں سے کوئی گاڑی لے جاؤ۔'' خانو بابا نے مشورہ دیا۔

''نہیں خانو بابا!...... آج مجھے ٹیکسی سے ہی جانا ہے۔'' اسد نے اپنا فیصلہ سنایا اور گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ خانو بابا نے آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلتے چلے گئے۔ چند قدم چلنے کے بعد ہی انہیں دور سے ایک ٹیکسی آتی دکھائی دے گئی تھی اور وہ اسے رُکنے کا اشارہ کرتے سڑک پر آ گئے تھے۔

وہ ٹیکسی سے اُتر کر جوں ہی فلیٹ پر پہنچے تھے ذرا ہی دیر بعد دانش اپنی بیوی اور والدہ نگار بیگم کے ساتھ پہنچ گئے تھے۔ نگار بیگم اور دانش کی بیوی ثوبیہ نے شام میں نکاح کی تقریب کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ اسد کے بیڈ روم کو تازہ سرخ گلابوں سے آراستہ کرنے کا کام دانش پہلے ہی ایک گل فروش ادارے کو سونپ چکا تھا۔ ثوبیہ اور نگار بیگم نے نکاح کے جوڑے، زیور کے سیٹ اور دیگر چیزوں کو سلیقے اور قرینے سے سنوار کر لے جانے کی تیاری شروع کر دی تھی۔

ندرت جہاں کے گھر کی یہ پہلی شادی تھی۔ کیا کیا ارمان تھے ان کے دل میں...... اور ان سے زیادہ ثروت کے دل میں اپنی شادی کے بے شمار خواب سجے تھے۔ اسد کی طرف سے اظہارِ محبت کے بعد سے تو اس نے بڑے بلند و بالا قسم کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔ ہیرے جواہرات کے زیورات، اطلس و کمخواب کے جوڑے، ''وجاہت منزل'' جیسی شاندار محل نما رہائش گاہ...... اور کروڑ پتی شوہر...... اسد۔

لیکن وقت نے اس کے ساتھ مذاق کیا تھا۔ اب اس کے دستِ قدرت میں صرف اسد رہ گئے تھے، جو چند گھنٹوں بعد اپنے چند دوستوں کے ساتھ آ کر نہایت سادگی کے ساتھ اسے اپنی بیوی بنا کر لے جانے والے تھے۔ باقی تمام خواب بکھر چکے تھے۔ محل نما کوٹھی کی جگہ چار کمروں کا اپارٹمنٹ، چمچماتی مرسڈیز کی جگہ آفس کی طرف سے عطا کردہ سیکنڈ ہینڈ سوزوکی...... نہ وہ جوڑے نہ وہ زیور...... نہ وہ کروڑوں کا کاروبار...... اس نے تو وجاہت منزل میں رانی بن کر راج کرنے کے سپنے دیکھے تھے۔ مگر ان سپنوں کی ادھوری تعمیر نے اسے بہت مایوس کیا تھا۔

''یہ کیا......؟ اس طرح منہ لٹکا کر کیوں بیٹھی ہو؟'' فروا نے اسے یوں سوچوں میں گم افسردہ سا دیکھا تو اس کے قریب آ کر نرم لہجے میں پوچھنے لگی۔ ''میکہ چھوڑتے ہوئے دُکھ ہو رہا ہے کیا؟''

''ارے ہٹو......'' ثروت نے بیزاری سے جواب دیا۔ ''میکے میں ایسا کیا رکھا ہے جسے چھوڑتے ہوئے دکھ ہوتا؟''

''تو پھر؟'' فروا، ثروت کی فطرت سے واقف تھی اس لئے اس کے جواب سے اسے کوئی صدمہ نہیں پہنچا تھا۔

اطمینان سے پلکیں جھپک کر پوچھ رہی تھی۔ ''یوں منہ لٹکائے کیوں بیٹھی ہو؟......دُکھ کس بات کا ہے؟''

''دُکھ اس بات کا ہے کہ جس گھر میں جارہی ہوں، وہاں بھی کچھ نہیں ہے......اس چار کمروں کے فلیٹ سے تو ہمارا یہ گھر ہی بہتر ہے......سچ میں تو آج تک وجاہت منزل کے خواب دیکھتی رہی تھی اور تعبیر......'' ثروت منہ بنا کر چپ ہو گئی تھی۔

''ثروت! کیا یہ کافی نہیں ہے کہ تم نے جسے چاہا، آج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حاصل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اور ذرا اسد بھائی کی طرف دیکھو۔ تمہاری خاطر وہ اپنا گھر بار، دادی، باپ، بھائی، دولت، جائیداد، عیش و عشرت چھوڑ کر اس چھوٹے سے فلیٹ میں آ بسے ہیں۔'' فروا نے سمجھانے والے انداز میں پُر تاثیر لہجے میں کہا۔

''اُنہی کی حماقت کو تو رو رہی ہوں۔'' ثروت نے مدبرانہ سا منہ بنا کر کہا۔ ''بتاؤ، باپ کو منا نہ سکے......سب کچھ چھوڑ چھاڑ، یوں ہاتھ جھاڑتے نکل آئے......بھلا ان کا حق نہیں ہے کیا؟''

''حق سے کسے انکار ہے؟'' فروا مسکرائی۔ ''ذرا دھیرج رکھو......تمہارے سب خواب پورے ہوں گے۔ تم وجاہت منزل پر راج کرو گی۔ اور اسد بھائی اپنے والد کا کروڑوں کا کاروبار سنبھالیں گے۔ بس ذرا صبر سے کچھ وقت کاٹ لو۔ پھر سب کچھ تمہارا ہو گا۔ ذرا سوچو، وجاہت خالو اپنی حویلی، دولت و جائیداد اور کاروبار پر سانپ بنے بھلا کب تک بیٹھے رہیں گے؟ آخر کار یہ سب کچھ ان کے دونوں بیٹوں کا ہی تو ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر......تمہارا اور میرا۔'' جملے کے آخر تک پہنچتے پہنچتے فروا کی آواز میں حرص بھری شوخی سمٹ آئی تھی جس پر ثروت بے اختیار مسکرا دی تھی۔

فروا ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ چند سالوں میں یہ سب کچھ اسد اور سرمد کو ہی تو ملنا تھا۔

''اچھا ایک بات بتاؤ۔'' ثروت کا موڈ بحال ہوتے دیکھ کر فروا نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

''پوچھو۔'' ثروت نے سوالیہ نظروں سے فروا کی طرف دیکھا۔

''اسد بھائی کی بارات کے ساتھ کیا تمہارے دیور جی بھی آ رہے ہیں؟''

''پتہ نہیں۔'' ثروت نے بے نیازی کے اظہار کے لئے کندھے اُچکائے۔ ''مجھے تو مشکل نظر آ رہا ہے......آج صبح ہی تو اسد گھر چھوڑ کر نکلے ہیں......وہاں تو صفِ ماتم بچھی ہو گی......بارات میں شرکت کی کسے فرصت ہو گی؟''

''میں کسی اور کی نہیں صرف سرمد کی بات کر رہی ہوں۔'' فروا نے ٹھنکتے لہجے میں کہا۔ ''پلیز ثروت!......تم اسد بھائی کو فون کر کے کہونا......وہ کسی بھی طرح سرمد کو اپنے ساتھ لائیں۔''

''ارے وہ بے چارے تو پہلے ہی گھر چھوڑ چکے ہیں......بھلا وہ سرمد کو کہاں سے لائیں گے؟'' ثروت نے حیرانی سے پلکیں جھپکتے ہوئے کہا۔

''تمہارا دل نہیں چاہتا کہ کم از کم ایک ہی سہی......کوئی سسرالی رشتے دار ہی بارات کے ساتھ آئے۔'' فروا نے سوالیہ نظروں سے ثروت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''توبہ کرو......'' ثروت نے کانوں کو چھوا۔ ''عقلمند لڑکیاں سسرالی رشتے داروں سے پیچھا چھڑاتی ہیں، نہ کہ ان کی آمد کی خواہاں ہوتی ہیں۔''

''اچھا چلو، سسرالی نہ سہی......تمہاری اکلوتی بہن کا ہونے والا شوہر......میرا مطلب ہے......تمہارے بہنوئی اس شادی میں شریک ہو......یہ تو تم چاہو گی نا؟''

''اگر یہ بات ہے تو بہن سے میں کہوں گی کہ ہمارے ہونے والے بہنوئی صاحب کو وہ خود ہی فون کیوں نہیں کر لیتیں؟'' ثروت نے شوخ لہجے میں کہا اور فروا سوچ میں ڈوب گئی۔

"پتہ نہیں ان کے گھر کیا چل رہا ہو.....کیسی صورتِ حال ہو......میرا اس طرح فون کرنا مناسب بھی ہو یا نہیں۔"

"ارے، تم اتنی باریک بین کب سے ہو گئیں؟" ثروت نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "وہاں جو بھی چل رہا ہو، تمہیں کیا؟......سرمد سے بات کرو......اور اسے اپنی طرف سے اس شادی میں شرکت کے لئے کہو.....اور بس۔"

ثروت کا مشورہ فروا کو پسند آیا تھا۔ گو کہ فروا بھی ثروت ہی کی طرح خود غرض، خود پسند اور شرانگیز واقع ہوئی تھی، مگر ذہانت اور دُور اندیشی میں وہ ثروت سے خاصی آگے تھی اور خصوصاً جب سے وہ سرمد پر فریفتہ ہوئی تھی، کچھ اور دانا و عقلمند ہو گئی تھی۔ وہ اپنے کسی بھی عمل سے خود کو سیلفش اور اپنی ذات سے محبت کرنے والی ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ سرمد کے سامنے خود کو بے مثال بنا کر پیش کرنے کی متمنی تھی اور اس میں وہ کسی قدر کامیاب بھی رہی تھی۔ وہ کسی بھی قیمت پر سرمد کو حاصل کرنے کی خواہاں تھی۔ انہیں کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سو وہ آہستگی سے لاؤنج میں دھرے ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

گھر میں اس وقت ان چاروں کے سوا اور کوئی موجود نہ تھا۔ شام کو ثروت کی شادی تھی مگر یہ گھر کہیں سے بھی شادی والا گھر نہیں لگ رہا تھا۔ اسلم احمد بھری دنیا میں اکیلے تھے۔ اسی طرح ندرت جہاں کے بھی کوئی لمبا چوڑا خاندان نہ تھا۔ لے دے کر ایک وقاص بیگ......جو اسد کے اکیلے پن کی وجہ سے وہاں سے بارات کے ساتھ شرکت کرنے والے تھے۔

ثروت نے فون کر کے بیوٹیشن کو گھر ہی بلا لیا تھا۔ وہ اسے اندر کمرے میں لے جا کر اس کے ہاتھ پیروں میں مہندی لگا رہی تھی۔ عصر کے بعد دُلہن بنانے کا عمل شروع کرنا تھا۔ مغرب کے بعد نکاح...... ہلکا پھلکا ڈنر اور رخصتی......اللہ اللہ خیر صلا۔

❀===❀===❀

اسد کے جانے کے بعد سرمد خاصے اپ سیٹ تھے۔ خالی خالی نظروں سے کتنی ہی دیر چھت کی طرف تکتے رہے تھے۔ شام کو اسد کی شادی تھی۔ اکلوتے بھائی کی شادی میں شریک ہونے کی کیسی شدید آرزو تھی ان کے دل میں.....کیسے کیسے ارمان بھرے تھے ان کی دھڑکنوں میں۔ مگر سب کچھ ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ باپ اور دادی کا دل دُکھا کر بھلا بھائی کی خوشی میں کیونکر شریک ہو سکتے تھے؟ حالانکہ اسد نے دمِ رخصت خاص طور پر ان سے پوچھا تھا۔

"شادی میں تو آؤ گے نا؟"

اور وہ محض سر جھکا کر رہ گئے تھے۔ انکار کر کے وہ بھائی کا دل نہیں توڑنا چاہتے تھے۔ اور اس شادی میں شریک ہو کر وہ باپ کا مان نہیں توڑ سکتے تھے۔ کس مان اور گمان سے وجاہت مرزا نے دعویٰ کیا تھا۔

"اب اس گھر کا کوئی فرد بھی تم سے کبھی بھی نہیں ملے گا...... سمجھو ہم سب تمہارے لئے مر چکے ہیں......اور جو رشتے موت کی نیند سو جاتے ہیں، وہ بھلا غمی اور خوشی میں کس طرح شریک ہو سکتے ہیں؟"

سو چاہنے کے باوجود سرمد نے اس نکاح کی تقریب میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور فیصلے کے ساتھ ہی ایک عجیب سی بے کلی اُن کے دل میں اُتر آئی تھی۔ ایک عجب طرح کا اضطراب سا جاگ اُٹھا تھا۔

وہ بستر پر لیٹ گئے تھے۔

"بھیا! چائے......" نکیتا اُن کے لئے بیڈ ٹی لئے آ موجود ہوئی تھی۔

"اماں بی جاگ گئیں کیا؟" انہوں نے نکیتا سے سوال کیا۔

"لو، کب کی......" نکیتا نے جواب دیا۔ "وہ تو فجر کی اذان کے وقت ہی جاگ جاتی ہیں۔"

"ٹھیک تو ہیں نا؟" سرمد نے بے قرار لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں ٹھیک تو ہیں...... مگر بہت اُداس اور دُکھی لگ رہی ہیں۔'' نگیتا کے لہجے میں بھی دُکھ اُتر آیا۔''اسد بھائی...... اس طرح کیسے چلے گئے؟'' ایک بے یقین سی حیرت تھی نگیتا کے لہجے میں۔ ''ایک لڑکی کی خاطر وہ گھر..... ابا جان...... اماں بی...... آپ کو اور مجھ کو...... سب کو چھوڑ گئے۔''

سرمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چائے پینے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔ مگر نگیتا کے سوالوں سے بچنے کی خاطر وہ چائے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''کیا کبھی آپ بھی اسی طرح...... کسی کی خاطر یہ گھر..... اور......'' نگیتا اپنا سوال ادھورا چھوڑ کر شکوہ بھری نظروں سے اُن کی طرف تکنے لگی تھی۔

''یہ سوال تمہارے ذہن میں کیوں آیا؟'' سرمد حیران ہوئے۔ ''بھلا میں کبھی ایسا کر سکتا ہوں؟...... کبھی بھی نہیں...... اور کسی لڑکی کے لئے تو ہرگز بھی نہیں۔'' اپنی بات کا آخری جملہ وہ محض سوچ کر رہ گئے تھے۔ اور اس سوچ کے ساتھ ہی ان کی سوچ کے پردے پر فروا کا چہرہ جگمگا اُٹھا تھا۔ اس جگمگاتے چہرے اور دمکتی آنکھوں کے سامنے وہ کبھی کبھی خود کو بے حد بے بس محسوس کرنے لگتے تھے۔ مگر اس لمحے...... ان کے اندر وہ پرانا اور محبت کے نام سے منکر سرمد انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا تھا۔ اسی لئے تو وہ شادی اور محبت کے نام سے بیزار تھے۔ جانے ان لڑکیوں کے پاس کون سی جادو کی چھڑی ہوتی ہے، جسے گھما کر وہ لڑکوں کو بالکل گھن چکر بنا دیتی ہیں...... اور بے چارے کسی کام کے قابل نہیں رہتے۔

''ناشتے میں کیا لیں گے؟'' نگیتا نے گہرا سانس لے کر نیا سوال کیا۔

''آج موڈ نہیں ہے۔'' سرمد نے چائے کا سپ لیتے ہوئے بے دلی سے جواب دیا۔ ''تم خیال سے اماں بی کو ضرور ناشتہ کروا دینا...... میں اب دوپہر کو ہی کچھ کھاؤں گا۔''

''اچھا......'' نگیتا نے چائے کی خالی پیالی اُٹھائی اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ تب ہی بالکل اچانک اُن کا موبائل گنگنا اُٹھا تھا۔ انہوں نے چونک کر موبائل کی طرف دیکھا۔ اسکرین پر فروا کا نام بلنک کر رہا تھا۔ بالکل اچانک ہی ان کے ذہن نے فیصلہ کیا کہ انہیں فروا کا فون نہیں اٹھانا چاہیے...... اب اُسے کسی رابطے، کسی واسطے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ مگر پھر دل کے کسی گوشے سے گزارش آئی تھی...... بھلا فون اُٹھانے میں کیا حرج ہے؟...... اور نہ چاہتے ہوئے بھی بے اختیار فون اُٹھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔

''یس......'' بہت لیے دیئے انداز میں انہوں نے فروا کو مخاطب کیا تھا۔

''میں فروا......'' دوسری طرف سے فروا کی جھینپی جھینپی، تھمی تھمی آواز اُبھری۔ ''وہ سرمد!...... آپ سے...... ایک بات کہنی ہے۔''

''جی...... میں سن رہا ہوں۔'' بے حد اجنبی سا انداز تھا۔

''آپ کے گھر میں تو شاید کسی کو بھی پتہ نہ ہوگا کہ آج...... آپ کے بھائی، میرا مطلب ہے اسد بھائی کا نکاح ہے۔''

''ہوں...... مجھے پتہ ہے۔'' سرمد نے اقرار کیا۔

''تت...... تو آ رہے ہیں آپ؟'' امید و بیم کے رس میں ڈوبا عجب معصوم سا انداز تھا۔ ''پلیز! آپ ضرور آیئے گا۔''

''بھلا میں کس طرح آ سکتا ہوں؟'' سرمد نے تاویل پیش کرنی چاہی۔

''آپ کے گھر میں تو کسی کو پتہ ہی نہیں ہے۔ آپ خاموشی سے آنا چاہیں تو کسی کو کیا پتہ چلے گا کہ آپ کہاں گئے ہیں...... اور ویسے بھی آپ کے اکلوتے بھائی کی شادی ہے...... اور شادی زندگی میں صرف ایک بار ہی ہوتی ہے۔''

''ہاں وہ تو ہے مگر......'' سرمد ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں گویا ہوئے۔

''اگر مگر کچھ نہیں۔ آپ آ رہے ہیں...... بس......'' فروا نے استحقاق بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ چاہیں تو اسد بھائی کے بھائی کے بجائے، ثروت کے کزن کی حیثیت سے اس شادی میں شریک ہو سکتے ہیں۔''

''بات تو ایک ہی ہے مگر......'' وہ اب بھی ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔

''پلیز سرمد!...... میری خاطر...... ذرا سی دیر کو چلے آئیے۔'' فروا کی التماس میں جانے ایسی کیا بات تھی کہ اُنہیں سینے میں اپنا دل پگھلتا ہوا محسوس ہوا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی آنے کی حامی بھر بیٹھے تھے۔

سرِ شام ہی اسد نہا دھو کر، کریم کلر کا سوٹ پہن کر تیار ہو گئے تھے۔ ان کی تیاری میں دانش برابر کے شریک تھے۔ سرخ گلابوں اور بیلے کی منہ بند کلیوں کے امتزاج سے بنا بڑا سا ہار گلے میں پڑتے ہی وہ ایک دم سے دُولہا سے لگنے لگے تھے۔

''اللہ نظرِ بد سے بچائے...... کیا روپ آیا ہے۔'' نگار بیگم نے کاجل کو اُنگلی کے سرے پر لگا کر ان کی کنپٹی پہ بالوں کے اندر سیاہ ٹیکہ لگا دیا تھا۔ دبے دبے جوش اور شرمیلی مسکراہٹ لبوں پر لئے وہ ایک دم سے مختلف اور بے حد وجیہہ سے لگ رہے تھے۔ کاش اس وقت وہ اپنے گھر میں ہوتے...... سرمد، ابا جان اور اماں بی اُن کے اطراف کھڑے ہوتے۔ کیا دھوم دھڑکا ہوتا...... لمحہ بھر کو اس سوچ نے ان کے دل کو مٹھی میں جکڑا لیکن اگلے ہی لمحے وہ سر جھٹک کر اس سوچ کی گرفت سے آزاد ہو گئے۔ اب اُنہیں صرف اور صرف آگے کی طرف ہی دیکھنا تھا۔ اور ماضی کو بھلا کر صرف مستقبل کے بارے میں سوچنا تھا۔ تب ہی اُن کا موبائل بج اُٹھا تھا۔ انہوں نے نمبر پر نگاہ ڈالتے ہی جھپٹ کر موبائل اُٹھا لیا تھا۔

''ہاں سرمد!...... بولو۔''

''میں یہاں مین روڈ پر کھڑا ہوں...... آپ کا اپارٹمنٹ کس طرف ہے؟''

''اوہ!...... تم آ رہے ہو کیا؟'' اسد کے لہجے سے مسرت جھلک رہی تھی۔ ''تم وہیں رُکو، میں دانش کو تمہیں لانے کو بھیج رہا ہوں۔''

اور کچھ ہی دیر بعد دانش، سرمد کو ساتھ لئے آ موجود ہوئے تھے اور ذرا دیر بعد وقاص بیگ، نگار بیگم، دانش، ثوبیہ اور سرمد کے ساتھ یہ چھوٹی سی بارات ثروت کے گھر کے لئے روانہ ہو گئی تھی۔

دُلہن بن کر ثروت بے طرح جچ رہی تھی۔ سرخ زرتار شرارے سوٹ اور سونے کے جگمگاتے زیور میں اس کا روپ بھی جھلملانے لگا تھا۔ لبوں پر دلکش مسکراہٹ سجائے آج وہ ہمیشہ سے زیادہ دلنشین اور پُرکشش لگ رہی تھی۔

گہرے گلابی زردوزی کے سوٹ میں ملبوس فروا نے بھی آج ہمیشہ سے زیادہ اہتمام کیا تھا۔ خاصے تیز میک اپ اور بھاری جیولری میں وہ بالکل الگ سی لگ رہی تھی۔ سرمد کی اس پر نگاہ پڑی تو لحظہ بھر کو وہ حیران ہوئے تھے۔ اتنے تیز میک اپ اور بھاری جیولری میں وہ بڑی عجیب سی لگ رہی تھی۔ سرمد نے کبھی بھی اس طرح شوخ رنگ کے لباس اور بھڑکتے میک اپ کو پسند نہیں کیا تھا۔ انہیں فروا کا یہ روپ کچھ عجیب سا لگا تھا۔ فروا انہیں دیکھ کر کھل اُٹھی تھی۔ مگر ان کے چہرے پر پھیلی حیرت بھری ناگواری نے اسے حیران کیا تھا۔ اس کا تو خیال تھا کہ سرمد اُسے اس روپ میں دیکھ کر تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

نکاح ہوا، پھر رخصتی...... اور ثروت، اسد کی کار میں بیٹھ کر اس کی دنیا میں بسنے کے لئے روانہ ہو گئی۔ سرمد خاموشی سے گھر لوٹ آئے۔

❀===❀===❀
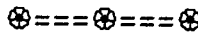
لاکھانی نے ایک من گھڑت کہانی سنا کر سلطانہ کو حقیقت میں پریشان کر دیا تھا۔ جب سے اس نے یہ خبر سنی تھی کہ

رشید پھر کسی حسینہ کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو گیا ہے، اسے لحہ بھر کو بھی چین نہ آیا تھا۔
''بیٹا لاکھانی!.....تُو نے کچھ پتہ لگایا.....کون ہے؟ کہاں ہے؟'' لاکھانی کی صورت دیکھتے ہی وہ سوالوں کی بارش کر دیتی۔
''بس ماں جی! ابھی تو اتنا ہی پتہ چلا ہے کہ وہ کوئی ماڈل ہے۔ میں پوری کوسس میں ہوں کہ جلد ہی اور معلومات بھی حاصل کرلوں۔ قسم پیدا کرنے والے کی..... میں پورے دن رکسے میں جانے کدھر کدھر مارا مارا پھرتا ہوں۔ مگر اب کے تو رسید بھائی نے بڑا پکا کام کیا ہے۔''
''آخر اُس کا ارادہ کیا ہے؟'' سلطانہ اُلجھ کر پوچھتی۔
''ابھی کیا بول سکتے ہیں کہ اُن کا ارادہ کیا ہے..... مجھے تو لگتا ہے، اب کی بار رسید بھائی سادی کے چکر میں ہیں۔'' لاکھانی نے مدبرانہ انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔
''اے نوج.....!'' سلطانہ چیخ کر بولی۔ ''میں اب تو کبھی بھی کسی ماڈل شاڈل سے اُسے شادی نہیں کرنے دوں گی۔ پہلے ایک ماڈل سے شادی رچا کر اُس کا دل نہیں بھرا..... جانے کمبخت کو یہ ناچنے گانے والیاں کہاں سے ٹکرا جاتی ہیں۔''
''تب ہی تو ماں جی! میں آپ سے بولتا ہوں..... آپ کسی اچھے گھر کی کوئی اچھی چھوکری دیکھ کر رسید بھائی کا گھر بسا دو..... اکیلا پھرتا ہے، تب ہی تو اِدھر اُدھر ٹکراتا ہے..... ابھی گھر میں ہووے کوئی بی بی..... کوئی بچہ.....''
''اے ہٹ..... بڑا آیا اس عمر میں شادی رچانے والا۔'' سلطانہ نے منہ بنا کر جواب دیا۔
''بھلا رسید بھائی کی اس وقت کیا عمر ہوگی؟'' لاکھانی نے فلسفیانہ انداز میں سوال کیا۔
''اس جاڑے میں پورے 43 برس کا ہو جائے گا۔'' سلطانہ نے ہاتھ اوپر اُٹھا کر گنتی پر خوب زور دے کر کہا۔
''ترتالیس بولے تو..... فورٹی تھری.....؟'' لاکھانی نے وضاحت چاہی۔
''اور نہیں تو کیا.... پوری تین شادیاں کر چکا ہے..... اب بولو اور اس کی کتنی شادیاں کروادوں؟''
''اماں بی! آپ برا نہ مانو تو میں ایک بات جرور کہوں گا..... ابھی رسید بھائی کی سادی کی عمر نکلی نہیں ہے..... آج کل تو مرد لوگ 60 سال، 70 سال میں بھی دوسری تیسری سادی بنا لیتے ہیں۔ اور تو اور ابھی اس دن میں نے کھمروں (خبروں) میں دیکھا تھا کہ ایک 60 سال کی بڈھی مائی نے بھی 65 سال کے بڈھے سے سادی بنا لی تھی..... اس کے بچے..... بیٹے بیٹیاں اور پوتے نواسے سادی میں سریک تھے۔''
''ہیں.....؟'' سلطانہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ ''سچ کہہ رہا ہے؟''
''لو بتاؤ..... مجھے جھوٹ بولنے کی کیا جرورت ہے؟'' لاکھانی مسکرایا۔ ''جب ای تو بولتا ہوں، اب جمانا (زمانہ) بدل گیا ہے..... اب کسی بھی عمر میں سادی کی جا سکتی ہے..... میں تو بولتا ہوں..... آپ بھی اس سلسلے میں کچھ سوچو۔''
''کیا بکتا ہے؟'' سلطانہ کے ڈپٹ کے کہنے پر لاکھانی ہوش میں آ گیا۔ بے خیالی میں وہ سلطانہ کو ہی شادی کا مشورہ دے بیٹھا تھا۔
''ماف کرنا ماں جی!..... وہ بس باتوں کی روانی میں منہ سے جانے کیا نکل گیا..... وہ اصل میں آج کل میں بہت پریسان ہوں۔''
سلطانہ نے گردن گھما کے کچن کی طرف دیکھا۔ کچن میں چھوٹو کھٹر پٹر میں مصروف تھا۔ غالباً چائے بنا رہا تھا۔
''ہاں تو ماں جی! میں کہہ رہا تھا....'' لاکھانی نے اپنی بات کا سلسلہ ایک بار پھر وہیں سے جوڑنے کی کوشش کی جہاں

سے سلطانہ کی بے نیازی کے باعث ٹوٹا تھا۔ ''مہنگائی کتنی ہے..... آپ تو جانتی ہیں...... اور روج روج (روز روز) رکسے پہ جانا...... روج پانچ سو کا کھرچہ ہے..... اب کل کی بات سن لو.....''

''بس اب رہنے دے۔'' سلطانہ بیزاری سے بولی۔ ''تُو روز مجھ سے 500 روپے لے کر جا رہا ہے۔ پورا ہفتہ گزر گیا، مگر سامنے کوئی بھی بات نہیں آئی۔ آج تک اُس منحوس ماری کا نام تک معلوم نہ ہو سکا۔''

''لو ماں جی!..... یہ بھی کوئی مسکل بات ہے؟'' لاکھانی چٹکی بنا کر بولا۔ ''اب کل ہی اس کا نام پتہ مجھ سے لے لو۔''

''اب یوں اچانک...... کل ہی کیونکر پتہ چل جائے گا؟'' سلطانہ نے مشکوک لہجے میں سوال کیا۔

''مجھے پتہ ہے نا..... کل تک جرور معلوم چل جائے گا۔'' لاکھانی پُریقین لہجے میں بولا۔ ''میں کل صبح سے ہی رسید بھائی کے پیچھے لگ جاؤں گا۔ وہ جیسے ہی اس چھوکری سے مل کر نکلیں گے، میں اُدھر پہنچ جاؤں گا اور نام پتہ لے کر ہی واپس آؤں گا۔''

''ہاں، ایسا ہو تو سکتا ہے۔'' سلطانہ نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔ ''مگر رشید کو تجھ پر شبہ ہو گیا تو؟''

''ارے ماں جی! اُنہیں مجھ پر بھلا سبہ کیسے ہو گا؟..... میں یہ سارا کام بالکل چھپ کر کروں گا..... ایک رکسہ لے کر صبح سے ہی ان کے پیچھے لگ جاؤں گا...... بے سک رکسے والا پورے دن کے مجھ سے ہجار روپے لے لیوے..... مگر میں رسید بھائی کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔''

''اچھا لے..... یہ ہزار روپے رکھ لے۔'' سلطانہ نے تکیے کے نیچے سے ٹٹول کر ہزار کا نوٹ نکالا اور لاکھانی کی طرف بڑھا کر بولی۔ ''یہ کام کل پکا ہونا چاہئے۔''

''بالکل سولڈ.....'' لاکھانی نے لپک کر نوٹ پکڑتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ''مگر ماں جی! یہ ہجار روپے تو کل کے رکسے کے ہیں۔ اور جو گجرے (گزرے) ہوئے کل کو رکسے میں پھرتا رہا ہوں..... اس کے پانچ سو۔''

''دیکھ بھئی لاکھانی! اس وقت تو میرے پاس اتنے ہی پیسے ہیں۔'' سلطانہ ہاتھ اُٹھا کر بولی۔ ''بعد کو دیکھوں گی۔''

''چلیں ماں جی!..... جیسی آپ کی کھوسی (خوشی)۔'' لاکھانی نے جلدی سے کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے کہاں چل دیا؟..... چھوٹو چائے بنا رہا ہے۔'' اُسے اُٹھتے دیکھ کر سلطانہ نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

''نہیں ماں جی!..... اس وقت تو میں جاؤں گا۔ چائے پھر کسی دن پی لوں گا۔'' وہ رشید کے گھر پہنچنے سے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

رشید نئے پروجیکٹ کے لئے پلاٹ دیکھنے گیا تھا۔ مہکار کے عشق میں گرفتار ہو کر وہ اپنے ان دونوں پروجیکٹس کا منافع ضائع کر چکا تھا۔ اب نئے پروجیکٹ کے لئے وہ کسی پارٹنر کی تلاش میں تھا تاکہ پلاٹ خرید کر نئے پلازہ کی تعمیر کا کام شروع کیا جا سکے۔

❀===❀===❀
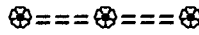
رشید اب پوری سنجیدگی اور دلجمعی کے ساتھ کاروبار کی طرف راغب ہو چکا تھا۔ مہکار کے عشق میں گرفتار ہو کر اس کے کاروبار کو جو دھچکا لگا تھا، اب وہ اس خسارے کو پورا کرنے کی تگ و دو میں لگا ہوا تھا۔ اسی لئے وہ نہ صرف پارٹنرشپ کا خواہاں تھا بلکہ کسی بھی بڑے بینک سے قرض بھی لینا چاہتا تھا۔ تاکہ ایک کثیرالمنزلہ پلازہ تعمیر کر کے، تعمیرات کی اس دنیا میں دوبارہ سے اپنے قدم جما سکے۔ اسی سلسلے میں وہ آج بینک کی اس برانچ میں آیا تھا۔ منیجر نے اسے ہیڈ آفس سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا تھا اور وہ یہ سوچ کر کرسی سے اٹھا تھا کہ ابھی فوری طور پر ہیڈ آفس کے لئے روانہ ہو جائے گا۔ منیجر بھی اس کے ساتھ کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''Wish you good luck'' منیجر نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے پُرخلوص دعا کا اظہار کیا تھا۔'' آپ کا پلان اتنا عمدہ ہے کہ ہمارا بینک یقیناً آپ کو لون دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔''

''شکریہ مسٹر سراج!'' رشید نے تشکر بھرے لہجے میں جواب دیا تھا اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتا واپسی کے لئے دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

شیشے کے شفاف اور کشادہ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ لحہ بھر کو تھم گیا تھا۔ باہر دہکتا سورج اور سلگتی دھوپ پھیلی ہوئی تھی جبکہ بینک کے اس کشادہ ہال میں اے سی کی تسکین دیتی یہ راحت افزا ٹھنڈی فضا اسے باہر کے گرم اور تپتے ماحول میں نکلنے سے روک رہی تھی۔ مگر کیا، کیا جا سکتا تھا؟ باہر نکلنا ضروری تھا۔

اور ویسے بھی اسے کون سا سڑکوں پہ مارا مارا پھرنا تھا۔ بینک کے چند قدموں کے فاصلے پر سڑک کے کنارے اپنی گاڑی تک ہی تو جانا تھا۔ سو اِس اطمینان بخش یقین کے ساتھ وہ بینک کا دروازہ کھول کے باہر نکلا تھا، تب ہی اس کی نگاہ سامنے سے گزرتی حسنہ پر جا ٹھہری تھی۔

حسنہ اس کی ماں سلطانہ کی رشتے کی بہن کی بیٹی تھی۔ مگر سلطانہ غریب رشتے داروں سے زیادہ میل ملاپ رکھنا پسند نہیں کرتی تھی۔ ویسے بھی پہلے وہ لوگ لاہور میں تھے۔ ایک بار حسنہ کی ماں اپنے تمام بچوں سمیت لاہور ان کے گھر آئی تھی......اور بالکل جوانی کے شروع کے دنوں میں، باپ کی ڈانٹ پھٹکار اور سختیوں سے عاجز ہو کر رشید ایک بار گھر چھوڑ کر کراچی بھاگ آیا تھا۔ تب اس اجنبی شہر میں اسے اپنی ماں کی وہ دُور پرے کی بہن ہی یاد آئی تھی اور وہ سیدھا حسنہ کی ماں کے گھر جا پہنچا تھا۔ اور جب تک اس کا باپ اسے منا کر واپس لاہور نہیں لے گیا تھا، وہیں رہا تھا۔ حسنہ کے بھائیوں سے اُس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ حسنہ تو اس وقت خاصی چھوٹی تھی۔ مگر اس وقت رشید نے اسے پہلی ہی نگاہ میں پہچان لیا تھا۔ مگر پہچاننے کے باوجود وہ اسے اس وقت بھی نظرانداز کر کے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا ہوتا اگر اس کے پیچھے وہ نمو کو نہ دیکھ لیتا۔

سیاہ چادر میں لپٹی پسینے میں شرابور نمو گڑیا کے سامان کا بیگ اور دواؤں کا شاپر سنبھالے تیزی سے چل رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت سے اس کے رخسار گلنار ہو گئے تھے۔ اُف! ان پر پھسلتے پسینے کے قطرے سرخ گلاب پر شبنم کا سا تصور پیش کر رہے تھے۔ پسینے میں بھیگی بالوں کی چھوٹی لٹیں پیشانی اور رخساروں سے چپکی ہوئی تھیں۔ دراز پلکوں سے سجی سمندر کی سی گہری آنکھیں دھوپ کے باعث قدرے میچی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی نازک مخروطی انگلیوں سے سجے نرم و ملائم ہاتھ سے آنکھوں کے سامنے چھجا بنائے سامنے کی سمت نظریں جمائے تیزی سے حسنہ کے پیچھے قدم بڑھائے چلی جا رہی تھی۔ نمو پر نگاہ پڑتے ہی وہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا تھا۔ لحہ بھر کو تو اسے اپنی سانس بھی رکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اتنا معصوم اور مکمل حُسن اُس نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ اگر اُسے نمو کے حسنہ کے ساتھ ہونے کا یقین نہ ہوتا تو وہ آج بھی حسنہ کو مخاطب کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتا۔ مگر ابھی چند لمحوں قبل ہی اس نے نمو کی گود سے گڑیا کو حسنہ کی گود میں منتقل ہوتے دیکھا تھا۔ پل بھر اُسے حیرت بھی ہوئی تھی کہ اتنی حسین و رعنا لڑکی بھلا حسنہ کے ساتھ کس طرح ہو سکتی ہے؟ مگر اُس کے اس سوال اور دل و ذہن میں سر اُٹھاتے ہر سوال کا جواب حسنہ ہی دے سکتی تھی۔ اور حسنہ تیزی سے قدم اُٹھاتی آگے کی سمت بڑھی جا رہی تھی۔ تب ہی رشید نے بے ساختہ اُسے آواز دے ڈالی تھی۔

''اے حسنہ! ذرا رُکو تو۔''

اپنا نام سن کر حسنہ ایک دم ٹھٹک کر رک گئی اور حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ ادھیڑ عمر کے سانولے، توندیل اور گنجے رشید کو وہ بالکل ہی نہ پہچان سکی تھی۔

''آپ نے مجھے مخاطب کیا تھا؟'' اس نے استعجاب بھرے لہجے میں سوال کیا۔
''ارے ہاں بھئی حسنہ!'' نمو کو حسنہ کے ساتھ ہی رُکتے دیکھ کر رشید کی اپنائیت میں اور اضافہ ہوا تھا۔ ''مجھے نہیں پہچانا؟''
حسنہ نے آنکھیں مچ مچا کر ایک بار اُسے پھر پہچاننے کی کوشش کی اور اپنی اس کوشش میں بری طرح ناکام رہی تھی۔
''ارے بھئی...... یہ میں ہوں۔ عبدالرشید۔'' آخر رشید کو اپنا تعارف کروانا پڑا تھا۔ ''تمہاری لاہور والی سلطانہ خالہ کا بیٹا...... رشید۔''
''رشید۔'' حسنہ نے منہ ہی منہ میں اُس کا نام دوہرا کر اُسے یاد کرنے کی کوشش کی پھر دوبارہ سے اس کی جانب دیکھا۔
''ارے یاد نہیں، کئی سال پہلے میں پورے مہینے تمہارے گھر رہا تھا...... یاد آیا؟''
''ارے ہاں......'' حسنہ کی آنکھوں سے آشنائی چھلکی۔ ''یاد آیا...... تم سلطانہ خالہ کے لڑکے، رشید بھائی ہو۔''
''شکر ہے تمہیں یاد تو آیا۔'' رشید نے کن اکھیوں سے نمو کی طرف دیکھتے ہوئے مسرت کا اظہار کیا۔ ''یہاں کہاں؟...... کہاں جا رہی ہو؟''
''ادھر ڈسپنسری آئی تھی۔'' حسنہ نے آنکھ کے اشارے سے پچھلی جانب واقع ڈسپنسری کی عمارت کی طرف اشارہ کیا اور گڑیا کی آڑ میں اپنے بڑھے ہوئے پیٹ کو چھپانے کی کوشش کی۔ ''اب گھر جا رہی تھی۔''
''تو چلو...... میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔'' رشید نے ایک قدم آگے بڑھا کر دائیں جانب کھڑی اپنی چمچماتی گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔
''یہ گاڑی تمہاری...... میرا مطلب آپ کی ہے؟'' حسنہ کی آنکھیں ایک دم سے ہی حیرت بھری مسرت سے چمک اُٹھیں۔
''ہوں۔'' رشید نے سرسری انداز میں سر ہلایا۔ ''آؤ چلو۔ تمہیں چھوڑ دوں گا۔''
''ارے...... آپ کہاں تکلیف کریں گے؟...... ہم لوگ جیسے آئے تھے، ویسے ہی چلے جائیں گے۔'' حسنہ نے کن اکھیوں سے شاندار گاڑی کا جائزہ لیتے ہوئے تکلف کا مظاہرہ کیا۔
''ارے تکلیف کیسی......؟'' رشید نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اپنوں کے لئے کچھ کرنے میں بھلا کہیں تکلیف ہوتی ہے؟...... یہ تکلف چھوڑو...... آؤ چلو۔''
حسنہ نے نمو کی طرف دیکھا۔ نمو کے چہرے پر ناگواری کے آثار خاصے نمایاں تھے۔ اپنے چہرے اور جسم پر چبھتی رشید کی حریص اور غلیظ نظریں اسے بری طرح کھل رہی تھیں۔ مگر کچھ عادتاً اور کچھ حسنہ کی وجہ سے وہ چپ کھڑی بیزاری سے سامنے کی طرف تکے جا رہی تھی۔
''ہم بس سے چلے جائیں گے۔'' حسنہ نے اپنا فیصلہ سنایا۔
''ارے اس حال میں بس میں کہاں جاتی پھرو گی؟'' رشید نے غیر محسوس طور پر اس کے بے ڈول جسم کی طرف اشارہ کیا اور آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھول دیا۔ ''ارے بھئی تمہارے بھائی کی گاڑی ہے...... اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟...... اور اس بہانے میں تمہارا گھر بھی دیکھ لوں گا۔''
''اچھا...... اب آپ اتنا کہہ رہے ہیں تو......'' حسنہ نے مسکرا کر مجبور لہجے میں کہا اور کار کے کھلے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ نمو کسی بھی صورت رشید کی گاڑی میں بیٹھنے کے حق میں نہیں تھی۔ پہلی ہی نظر میں وہ اسے بہت اوباش اور کمینہ لگا تھا۔ مگر کیا کرتی، حسنہ کے سامنے اس کی چلتی ہی کیا تھی۔
''آیئے نا۔'' اسے اپنی جگہ پر ساکت کھڑے دیکھ کر رشید نے اس کی جانب قدرے جھک کر میٹھے لہجے میں کہا۔ ''یونہی

دھوپ میں کھڑی رہیں گی تو آپ کا یہ صندلی گلابی رنگ کالا ہو جائے گا۔''

''ارے آؤ نا۔'' حسنہ نے کھڑکی سے سر نکال کر کڑی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''دیر ہو رہی ہے۔ وہاں رک کر کون سے مذاکرے کرنے لگیں؟''

حسنہ کی بات پر رشید کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی جبکہ نمو کا چہرہ احساسِ تذلیل سے کچھ اور تمتما اُٹھا تھا۔ وہ ایک لفظ بولے بنا کھلے دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ دروازے کے عین سامنے دروازہ تھامے رشید قدرے جھکا ہوا کھڑا تھا۔ نمو سمٹ کر آہستگی سے اندر داخل ہو گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی رشید نے دروازہ بند کر کے مشکور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور گھوم کے ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا تھا۔

''آپ..... یہاں، کراچی میں کہاں؟'' رشید کو بیک ویو مرر درست کرنے میں مصروف دیکھ کر حسنہ نے سوال کیا۔ ''آپ لوگ تو اُدھر لاہور میں تھے نا؟''

''ہاں۔'' رشید نے آئینہ اس طرح سیٹ کر لیا تھا کہ نمو اب اس کی نگاہوں کی رینج میں تھی۔ ''اب کئی سال سے یہیں ہوں۔ یہاں میں نے کنسٹرکشن کا کاروبار شروع کیا ہے۔''

''اچھا۔'' حسنہ نے خوشی کا اظہار کیا۔ ''کیا سلطانہ خالہ بھی یہیں ہیں؟''

''ہاں۔'' رشید نے کار اسٹارٹ کی۔ ''تم لوگوں کو بہت یاد کرتی ہیں۔'' رشید نے سفید جھوٹ بولا۔ ''مگر تم لوگ تو لگتا ہے سب رشتے ناطے بھول ہی چکے ہو۔'' اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق رشید نے سارا الزام سامنے والی پارٹی کے سر ڈالتے ہوئے ایک بھرپور نگاہ خاموش اور بیزار بیٹھی نمو پر ڈالی۔

''حسنہ! تم نے ان کا تعارف نہیں کروایا؟'' کافی دیر سے دل میں اُٹھتا سوال آخر اس کے لبوں پر آ ہی گیا تھا۔

''کون..... یہ.....؟'' حسنہ نے قدرے اچنبھے سے گردن گھما کر نمو کی طرف دیکھا۔ ''یہ میری چھوٹی نند ہے...... نمو......''

''نمو۔'' رشید نے زیر لب اس کا نام دہرایا۔ ''بہت اچھا نام ہے۔''

''نام تو نمرہ ہے۔'' حسنہ کو پہلی بار رشید کی دلچسپی کا اندازہ ہوا۔ ''پر اس کے بھیا لاڈ سے نمو کہتے ہیں..... بہت پیار کرتے ہیں وہ اسے۔''

''یہ ہیں ہی پیار کے قابل۔'' بہت ہی دھیمے لہجے میں کہا گیا یہ جملہ حسنہ کے علاوہ نمو کی سماعت تک بھی پہنچ گیا تھا۔ نمو نے غصیلے انداز میں پہلے رشید پھر حسنہ کی طرف دیکھا مگر حسنہ نے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

رشید اپنے کاروبار اور روپے پیسے کی تفصیلات بتانے لگا۔ حسنہ تو پہلے ہی اس کے بیش قیمت لباس اور شاندار گاڑی سے متاثر ہو چکی تھی اور کئی بار فخریہ نمو کو اس انداز سے دیکھ چکی تھی جیسے کہہ رہی ہو...... دیکھا میرے رشتے دار؟..... کیسے ٹھاٹھ باٹ والے ہیں۔

نمو کو ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو رشید کی اوباش نظروں کے حصار میں گھر کر بری طرح بیزار اور پریشان ہو رہی تھی۔

حسنہ کی ڈائریکشن میں چلتا آخر کار رشید اُن کے چھوٹے سے گھر کے دروازے پر آ ٹھہرا تھا۔

''اچھا یہ ہے تمہارا گھر۔'' رشید نے کار سے اُتر کر حسنہ اور خاص طور پر نمو کے لئے دروازہ وا کیا تھا۔ اور حسنہ، بچی کو سنبھالتی باہر آ گئی تھی۔ ساتھ ہی نمو نے بھی زمین پر قدم رکھ دیئے تھے۔ رشید دروازے پر جھکا اپنی جانے والی نظروں سے اسے تکے جا رہا تھا۔ نمو نے چادر سنبھال کر خود کو سمیٹ کر اس کے قریب سے گزرنا چاہا مگر جانے کس طرح رشید کا جھکا سر

بے ساختہ نمو کی پیشانی سے مس ہو گیا تھا۔

''اوہ......آپ کو چوٹ تو نہیں لگی؟'' رشید متفکر لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

نمو نے اس کی جانب قہر آلود نگاہ ڈالنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی تھی۔ بس اپنی پیشانی کو ہتھیلی سے رگڑتی تیزی سے گھر میں داخل ہو گئی تھی۔

''رشید بھائی! آیئے نا'' حسنہ نے اخلاق بھرے لہجے میں اسے اندر آنے کی دعوت دی۔ ''ایک کپ چائے تو پی جایئے۔''

''اب تم اتنا اصرار کر رہی ہو تو......'' رشید مسکراتا ہوا اس کے قریب چلا آیا۔ نمو تالا کھول کر اندر جا چکی تھی۔ دروازہ پاٹم پاٹ کھلا تھا۔ رشید، حسنہ کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔

''نمو! ذرا ایک کپ اچھی سی چائے تو بنا'' حسنہ نے سامنے پڑی چارپائی پر گڑیا کو لٹاتے ہوئے نمو کو حکم دیا۔

''ارے نہیں حسنہ!'' رشید جلدی سے بولا۔ ''اس وقت نہیں......چائے پینے میں پھر کسی وقت آؤں گا۔ اب تو تمہارا گھر دیکھ لیا ہے۔''

اس نے نگاہ گھما کر گھر کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔ پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا پھولا ہوا والٹ نکالا اور اس میں سے پانچ پانچ سو کے چار نوٹ نکال کر سامنے پلنگ پر پڑی گڑیا کے قریب ڈالتے ہوئے بولا۔

''یہ ہماری اس ننھی بھانجی کے لئے۔''

''ارے رشید بھائی!......یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' نئے کرارے نوٹ دیکھ کر حسنہ کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

''یہ تو بہت ہیں......اب آپ تکلف کر رہے ہیں۔''

''ارے تکلف کیسا؟......بہن کے گھر پہلی بار آیا ہوں......کچھ پھل مٹھائی لے کے آنا چاہئے تھا نا......چلو آئندہ سہی......کسی دن اماں کو لے کر آؤں گا۔''

''ہائے، سچی......'' حسنہ نے خوشی کا اظہار کیا۔ ''سلطانہ خالہ کو ضرور لے کر آیئے گا۔ سچ، اُنہیں دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں......''

''اچھا حسنہ!......اب چلوں گا۔'' اس نے گردن گھما کر پچھلے کمرے کی طرف دیکھا، جہاں نمو جا کر گم ہو گئی تھی۔

''یہ کیا رشید بھائی! ایک کپ چائے تو پی لیتے۔'' پانچ پانچ سو کے کرارے نوٹوں نے حسنہ کے اخلاق اور خلوص میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔

''چائے اُدھار رہی۔'' رشید شاطرانہ انداز میں مسکرایا۔ ''وعدہ رہا، تمہاری چائے پینے جلد ہی آؤں گا۔''

گڑیا کے رخساروں کو پیار بھرے انداز میں چھوتے ہوئے وہ داخلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ حسنہ اسے الوداع کہنے دروازے تک آئی تھی۔

''رشید بھائی! جلدی آیئے گا......اور ہاں، سلطانہ خالہ کو ضرور لایئے گا۔'' الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے اس نے بے حد اصرار سے کہا تھا۔ اور اس وقت تک دروازے سے چپکی کھڑی رہی تھی جب تک رشید کی گاڑی گلی کے موڑ سے مڑ کر نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی تھی۔

رشید، حسنہ کے گھر سے نکل کر مین روڈ پر آ گیا تھا۔ مگر اس کا ذہن وہیں حسنہ کے گھر میں رہ گیا تھا۔ اس پر وہ دل و جان سے فدا ہو گیا تھا۔ ان آنکھوں کی گہرائی میں وہ سر تا پیر ڈوب گیا تھا۔ اور اس چہرے کی معصومیت نے اسے بے دام خرید لیا تھا۔

بروقت فیصلہ کر لینا اس کی فطرت تھی۔ سو نمو کو دیکھتے ہی اس نے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ نمو اور اس کی عمروں میں بہت زیادہ فرق تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا مرد تھا۔ جب کہ نمو ایک اَن کھلی، اَن چھوئی کلی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید نمو کے بارے میں سوچنے کی ہمت ہی نہ کرتا۔ مگر وہ اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ اور اسے حسنہ کی فطرت کا خوب اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ حسنہ کے گھر کے اندر اس کے گھریلو حالات کا اندازہ کرنے ہی گیا تھا۔ اسے حسنہ اور اس کے میاں انور کی مالی پوزیشن کا بھی اچھی طرح ادراک ہو چکا تھا۔ اور رشید کا شاطر ذہن جانتا تھا کہ حسنہ جیسی لالچی اور حریص عورت کو اپنے حق میں کس طرح رام کیا جا سکتا ہے۔ اور اسے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ اگر اس نے حسنہ کو راضی کر لیا تو اس کا میاں انو ہی نہیں، خود نمو بھی ''نہ'' کہنے کی جسارت نہ کر سکے گی۔ سو وہ حسنہ کو جال میں پھانسنے کے راستے سوچتا گھر کی راہ پر رواں دواں تھا۔

آج کتنے ہی عرصے بعد وہ اتنی جلدی گھر واپس لوٹا تھا۔ سلطانہ نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''خیریت تو ہے؟...... آج تو بہت جلدی گھر چلے آئے۔''

''آں...... ہاں......'' رشید، نمو کے خیالوں میں کھویا ہوا سر جھکائے آگے بڑھ رہا تھا۔ ماں کی آواز پر ہڑ بڑا کر رُک گیا تھا۔ ''ہاں اماں!...... وہ آج...... اصل میں...... ہاں، وہ میں قرض کے لئے بینک گیا تھا۔'' بمشکل وہ درست جواب تک پہنچا تھا۔

''اپنی حماقتوں کی وجہ سے روپیہ نہ اُجاڑتا تو...... آج یوں قرض ادھار مانگتے پھرنے کی نوبت نہ آتی۔'' سلطانہ نے منہ ہی منہ میں ہڑ بڑا کر صلواتیں سنائیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید رشید کے منہ کا ذائقہ خراب ہو جاتا۔ مگر اس وقت تو اس کے دل و ذہن پر نمو کی موہنی صورت دمک رہی تھی۔ اور اس من موہنے چہرے کو حاصل کرنے کے لئے اماں کی رضامندی اور خوشنودی بے حد ضروری تھی۔ سو وہ مسکراتا ہوا اماں کی طرف پلٹا۔

''ارے پیاری اماں! یہ روپیہ ہوتا کس لئے ہے؟...... اُجاڑنے اور خرچ کرنے کے لئے ہی ہوتا ہے۔ اور رہا سوال بینک سے قرض لینے کا...... تو میری بھولی اماں! یہ کاروباری ٹرِک ہے۔ کتنا ہی روپیہ کیوں نہ ہو، بینک سے اور ہاؤس بلڈنگ فائنانس سے قرض لینا ہی پڑتا ہے۔''

''اچھا ہٹاؤ۔'' سلطانہ بیزاری سے بولی۔ ''مجھے کیا؟...... جیسا کرو گے، ویسا بھرو گے۔''

جب سے لاکھانی نے اسے بتایا تھا کہ رشید آج کل پھر کسی لڑکی کے چکر میں ہے، تب سے سلطانہ کا موڈ سخت خراب رہنے لگا تھا۔ خاص طور پر رشید سے بات کرتے وقت وہ خاصی تلخ ہو جایا کرتی تھی۔

''کیا بات ہے اماں!...... بہت ناراض لگ رہی ہو؟'' رشید نے حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''لگتا ہے یہ چھوٹو صحیح کام نہیں کر رہا...... تمہارے لئے کسی نئی کام کرنے والی کا بندوبست کرنا ہو گا۔''

''چل ہٹ۔'' رشید نے قریب بیٹھ کر پیار سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا تو سلطانہ بناوٹی بیزاری سے بولی۔ ''ماں کے سامنے یونہی للو پتو کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ تیری ساری حرکتوں سے واقف ہوں۔''

''ہیں......؟'' رشید نے حیرانی سے آنکھیں پھیلائیں...... ابھی تک تو میں نے کچھ کہا ہی نہیں۔ ارے ہاں......'' بالکل اچانک اسے یاد آیا۔ ''اماں! آج وہ حسنہ ملی تھی۔''

''حسنہ؟'' سلطانہ نے حسبِ عادت مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کون حسنہ؟''

''ارے وہی...... وہ تمہاری رشتے کی ایک بہن جو یہاں رہتی تھیں۔ کیا نام تھا ان کا......'' رشید نے ماتھا رگڑتے

ہوئے یاد کرنے کی کوشش کی۔ ''ہاں یاد آیا...... رضیہ خالہ۔''

''اے ہاں......'' سلطانہ نے گہرا سانس لیا۔ وہی، نیو کراچی میں جو رہتی تھی۔ اے اُس کے تو انتقال کو بھی برسوں بیت گئے۔''

''میں اس کی تھوڑی...... اس کی بیٹی حسنہ کی بات کر رہا ہوں۔'' رشید نے وضاحت کی۔ ''بینک کے سامنے مل گئی تھی۔ تمہیں بہت یاد کر رہی تھی...... کہہ رہی تھی، کسی دن سلطانہ خالہ کو ساتھ لے کر ضرور آنا۔''

''اے ہٹ، مجھے نہیں شوق مارے مارے پھرنے کا۔'' سلطانہ نے بیزاری سے جواب دیا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''غریب رشتے داروں سے کون ملے؟''

''ارے اماں! کہاں چل دیں؟..... ذرا بیٹھو تو۔'' رشید نے جلدی سے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو میں نے بات بھی شروع نہیں کی اور تم ہو کہ اُٹھ کر چل دیں۔''

''ہٹ...... مجھے کام کرنا ہے۔'' سلطانہ نے ہاتھ چھڑایا اور رشید خاموشی سے ماں کو دیکھتا رہ گیا۔ وہ نمو کو دیکھنے کے بعد اس قدر راتا ؤلا ہو رہا تھا کہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گھڑی کی چوتھائی میں اسے اپنی دنیا میں لے آئے۔ اور وہ اسی وقت اس کے بارے میں ماں کو بتانا چاہ رہا تھا۔ مگر سلطانہ کی عدم دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ لاکھانی کے ذریعے ماں تک اپنی خواہش پہنچا دے گا۔ مگر فی الوقت تو اسے وہ لائحہ عمل طے کرنا تھا، جس پر عمل پیرا ہو کر وہ حسنہ، انو اور نمو کو رضامند کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

کچھ دیر میں چھوٹو چائے لے آیا تھا۔ چائے پی کر وہ نیچے اپنے آفس میں آ بیٹھا تھا اور کچھ ہی دیر میں حسبِ توقع لاکھانی آ پہنچا تھا۔ اسے سامنے بیٹھے دیکھ کر لاکھانی اپنی جگہ ٹھٹک کر رُک گیا تھا۔ عموماً اس وقت رشید نہیں ہوتا تھا اسی لئے لاکھانی اسی وقت آتا تھا تا کہ سلطانہ کو جھوٹی سچی کہانی سنا کر دو چار سو روپے اینٹھ سکے۔ مگر آج خلافِ توقع رشید کو براجمان دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

''اے رسید بھائی!..... آپ موجود ہو؟''

''آپ حکم دیجئے تو میں واپس چلا جاؤں۔'' رشید خوش دلی سے مسکرایا۔ جب سے وہ نمو پر فریفتہ ہو کر آیا تھا، اس کے انداز و اطوار ہی بدل گئے تھے۔ وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا اور خوش باش محسوس کر رہا تھا۔

''ارے نئیں...... خدانخواستہ، میں کوئی آپ کا دُسمن تھوڑی نا ہوں؟...... آپ کو یوں بے وقت دیکھ کر کھوسی ہوئی ہے...... سچی بات بولوں...... میں تو اماں جی سے روج کہتا ہوں...... رسید بھائی کی سادی کر دو...... گھر میں آنے کی کوئی وجہ بھی تو ہووے۔''

''ارے واہ لاکھانی!'' رشید پُرجوش لہجے میں بولا۔ ''میرے دوست! میرے بھائی! تُو نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔'' اُس نے لپک کر لاکھانی کو دبوچ کر گلے سے لگا لیا۔ ''آج میں نے بھی یہی سوچا ہے۔''

''کیا......؟'' لاکھانی اُچھل پڑا۔ ''آپ نے سادی کے بارے میں سوچا؟''

''نہ سوچتا اگر شادی کے بغیر کام بن سکتا۔'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔ ''مگر حقیقت یہ ہے کہ اتنی معصوم بلبل کو پنجرے میں بند کرنے کے لئے جال بُنتا ہی پڑے گا۔''

''کک...... کون معصوم بلبل؟'' لاکھانی مزید حیران ہوا۔ اس نے تو یونہی من گھڑت کہانی سلطانہ کو سنا دی تھی۔ مگر رشید کی باتوں سے پتہ چل رہا تھا کہ یہ کہانی اب اتنی بھی غیر حقیقی نہیں تھی۔

''ہے ایک حسینہ۔'' رشید نے دُور خلاؤں میں گھورتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''حسنہ......؟'' لاکھانی نے وضاحت چاہی۔

''ارے نہیں بابا!......وہ تو اس کی بھابی ہے۔'' رشید جلدی سے بولا۔''وہ تو ایک گلاب ہے.....موگرے کی منہ بند کلی......چنبیلی کا تازہ غنچہ۔''

''ارے رسید بھائی! آپ تو ساعری کرنے لگے۔'' لاکھانی نے بے تابی سے بات آگے بڑھائی۔''اصل بات بتاؤ.....کون ہے؟......کہاں ہے؟......اور آپ کا ارادہ کیا ہے؟''

''دیکھا جائے تو ہمارے رشتے داروں میں ہی ہے...... اسی شہر میں ہے...... اور میرا ارادہ اسے اپنی مٹھی میں......اپنی آنکھوں میں اور اپنے گھر میں بند کر لینے کا ہے۔ میں اسے دنیا سے چھپا کر......اپنے دل میں بند کر کے رکھ لینا چاہتا ہوں۔''

لاکھانی حیرت سے منہ کھولے رشید کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''اچھا بیٹھو!...... میں تمہیں تفصیل سے بتاتا ہوں۔'' رشید نے اس کا ہاتھ پکڑ کر قریب دھری کرسی پر بٹھاتے ہوئے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ اور پھر کچھ دیر بعد وہ دونوں سر جوڑے اس بیل کو منڈھے چڑھانے کی ترکیبوں پر غور کر رہے تھے۔

❀===❀===❀

ثروت اور اسد کی شادی کے چار روز بعد ہی بالکل اچانک اسلم احمد کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ فروا نے فون کر کے اسد کو مطلع کیا تھا۔ اسد اس وقت آفس میں تھے۔ وہ فوری طور پر ندرت کے گھر پہنچ گئے تھے۔ اسلم احمد کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ اسد اسی وقت اسے ساتھ لے کر کارڈیو کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ مگر شاید اس کا وقت پورا ہو گیا تھا۔ ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔

دل کا دوسرا دورہ جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ یہ ڈاکٹرز کی تشخیص تھی۔ مگر یوں لگتا تھا جیسے وہ ثروت کی شادی کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ اِدھر شادی ہوئی، اُدھر اس نے رختِ سفر باندھا۔

سرمد کو اسد نے ہی فون کر کے خبر دی تھی۔

''اوہ......!'' سرمد ہل گئے تھے۔ ''یہ حادثہ کب ہوا؟''

''ابھی کوئی پون گھنٹے قبل۔'' اسد نے سنجیدہ اور رنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔''آ سکتے ہو تو آ جاؤ۔'' سرسری سا انداز تھا۔

''جی آ رہا ہوں۔'' سرمد نے یقینی لہجے میں جواب دیا اور فون بند کر دیا۔

سرمد کا خیال تھا کہ یہ اتنی بڑی خبر ہے۔ انہیں یہ خبر اماں بی کے علاوہ وجاہت مرزا کو بھی دینی چاہئے۔ اور وہ توقع کر رہے تھے کہ شاید وجاہت مرزا اس کرب و بلا کی گھڑی میں اپنی رنجش و کدورت بھلا کر ندرت کے دروازے پر جا کھڑے ہوں۔

''وہ......اماں بی!......ندرت خالہ کے شوہر......اسلم خالو کا انتقال ہو گیا ہے۔''

یہ خبر سنتے ہی عاتکہ بیگم چونک کر سیدھی ہو بیٹھی تھیں۔

''کک......کب......؟'' ان کے منہ سے گھٹی گھٹی آواز نکلی تھی۔

''ابھی......کوئی چار بجے کے قریب۔'' سرمد نے وضاحت کی۔

''اناللہ......'' عاتکہ بیگم نے آنکھیں بند کر کے منہ ہی منہ میں ان کی مغفرت کی دعا کی۔ سرمد متوقع نگاہوں سے

دادی کی طرف دیکھ رہے تھے نگران کی طرف سے کسی بھی طرح کی کوئی پیش رفت نہ دیکھ کر خود ان کو ہی پوچھنا پڑا۔
''آپ..... یا ابا جان...... جنازے میں شرکت کے لئے......''
''تم تو جانتے ہو بیٹا!'' عاتکہ بیگم نے بے بسی سے نگاہیں جھکاتے ہوئے مجبور لہجے میں جواب دیا۔ ''میری تو صحت اس قابل ہی نہیں کہ کہیں آ جاسکوں..... ہاں مگر...... جہاں تک وجاہت میاں کا تعلق ہے تو تم ان سے پوچھ لو۔''
اسلم احمد کے انتقال کی خبر سن کر بظاہر تو وجاہت مرزا کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے اسی سپاٹ چہرے کے ساتھ انہوں نے سرمد کی طرف دیکھ کر کھردرے لہجے میں کہا تھا۔
''میرے لئے تو صرف اسلم احمد ہی نہیں، اس گھرانے کا ایک ایک فرد اسی دن مر گیا تھا، جس دن تمہاری ماں کا انتقال ہوا تھا۔''
سرمد کے چہرے پر ملال بکھر گیا۔ وہ اپنے مہربان اور حلیم الطبع باپ سے اس شقی القلبی کی توقع نہیں رکھ رہے تھے۔
''مگر ابا جان!...... موت......'' انہوں نے سمجھانے کی کوشش کی۔
''جن کی زندگی نے ہمیں محض دُکھ ہی دیا ہو، اُن کی موت سے ہمیں کیا سروکار۔''
سرمد سر جھکا کر خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے اور کچھ دیر کے بعد وہ خاموشی سے نکل کر پورچ کی طرف بڑھ گئے تھے۔ پورچ میں ان کی گاڑی کے ساتھ ہی اسد کی مرسڈیز کھڑی تھی۔ ان کی جب بھی اسد کی گاڑی پر نگاہ پڑتی تھی، دل میں ایک ٹیس سی اُٹھتی تھی۔ وہ دکھ کے اس دیرینہ احساس کو محسوس کرتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔
گھر جانے کے بجائے وہ کارڈیو کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ کیونکہ اسد نے بتایا تھا، وہ ابھی وہیں ہیں۔ چنانچہ سرمد نے بھی ہسپتال جانے کا ہی فیصلہ کیا تھا۔

⊛===⊛===⊛
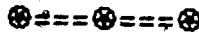
سرمئی شام کے نرم ولطیف سایوں نے پورے لندن کو اپنی آغوش میں سمیٹا ہوا تھا۔ ہوا کے نرم جھونکوں میں ایک عجیب سی سرگوشی اور سرور کا سا احساس رچا ہوا تھا۔
پروفیسر آفاق ہاتھوں میں سوٹ کیس تھامے ایئرپورٹ سے باہر نکلے تھے۔ ان کے ساتھ ہلکے گلابی سوٹ میں ملبوس فریال بھی تھی۔ گلابی دوپٹے کے پرتو نے اس کے گندمی چہرے کو بھی گلابی سا کر دیا تھا۔ آنکھوں میں سہمی ہوئی سی کیفیت اور لبوں پر اُمید بھری مسکراہٹ لئے وہ دھڑکتے دل اور لرزتے قدموں سے آفاق صاحب کے ساتھ ایئرپورٹ سے باہر آئی تھی۔ سامنے ہی عالم تاب صاحب ظفریاب اور فریحہ کے ساتھ موجود تھے۔ اظفر کو زبردستی گھر میں چھوڑا گیا تھا۔
آفاق صاحب پر نظر پڑتے ہی فریحہ لپک کر آگے بڑھی تھی اور بے ساختہ باپ کے سینے سے لگ گئی تھی۔ دو سال بعد باپ کے شفیق اور مہربان سینے سے لگی تھی۔ کتنے ہی لمحے اسی طرح بیت گئے تھے۔ پھر وہ فریال کے گلے جا لگی تھی۔ اور آفاق صاحب بہنوئی اور داماد سے ملنے لگے تھے۔
''کیسی ہو فری میری جان!'' فریحہ، فریال کو سینے سے چمٹائے پوچھ رہی تھی۔
''آپ کیسی ہیں؟'' فریال نے سرگوشی سے سوال کیا۔
''تمہارے سامنے ہوں۔'' وہ بے آواز ہنسی۔ ''خوش باش، خوشحال۔''
''خدا کرے آپ ہمیشہ ہی ایسی ہی رہیں۔'' فریال نے دل میں دعا کی اور دوپٹہ سنبھالتے الگ ہو گئی۔
''اور بیٹے! کیسے ہو؟'' عالم تاب صاحب نے فریال کے سر پر شفقت بھرے انداز سے ہاتھ رکھتے ہوئے پیار

بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''جی اللہ کا کرم ہے۔'' فریال نے نگاہیں جھکا کر جواب دیا۔ ''آپ لوگ کیسے ہیں؟ اور خاص طور پر پھوپھی جان کیسی ہیں؟''

آفاق صاحب بھی ظفریاب سے ارجمند بانو کا ہی حال دریافت کر رہے تھے۔ اسی طرح باتیں کرتے وہ لوگ پارکنگ میں آئے تھے۔ ظفریاب گاڑی آگے لے آئے تھے۔ پھر سب ہی گاڑی میں بیٹھ کے گھر کے لئے روانہ ہو گئے۔

ارجمند بانو کی خواہش تھی کہ اکلوتے اور چہیتے بھائی کو وہ ایئر پورٹ پر ریسیو کرتیں۔ مگر تھکن ہو جانے کے خدشے کے باعث بصد اصرار اُنہیں گھر رکنے پر آمادہ کیا گیا تھا۔

''ارے ارجمند بیگم! کیسی بچوں کی سی ضد کر رہی ہو؟ تمہارے بھائی جان کو ہم گھر ہی لے کے آئیں گے۔ اور اب تو وہ کافی عرصے تک یہیں رہیں گے۔ پھر یہ بے صبری کیسی؟'' عالم تاب صاحب، بیوی کا ہاتھ تھامے پیار سے سمجھا رہے تھے۔

''اور نہیں تو کیا......؟'' اظفر نے ٹکڑا لگایا۔ ''اور دیکھئے، میں بھی تو گھر پر ہی ہوں۔'' جبکہ ان کا دل ایئر پورٹ جانے کے لئے بضد و بے کل تھا۔ مگر کچھ ماں کے خیال سے اور کچھ اس خیال سے کہ شاید فریال کو اس طرح لینے جانا آفاق صاحب کو کچھ عجیب سا نہ لگے، انہوں نے ایئر پورٹ جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

مگر جونہی ہارن کی آواز سنائی دی تھی، ارجمند بانو کے ساتھ اظفر بھی بے تابانہ داخلی دروازے پر آ گئے تھے۔ سب سے پہلے ان کی نگاہیں فریال پر ہی پڑی تھیں۔ گلابی لباس میں وہ گلاب کا پھول دکھائی دے رہی تھی۔ ارجمند بانو آگے بڑھیں۔ آفاق صاحب نے شفقت بھری آغوش وا کر دی تھی۔ اور وہ ان کے سینے سے جا لگی تھیں۔ بھائی کے سینے سے باپ کی خوشبو آ رہی تھی۔ بھائیوں کے دم سے ہی تو میکہ آباد رہتا ہے...... ارجمند بانو کی پلکیں بے ساختہ بھیگتی چلی گئی تھیں۔

فریحہ نے پہلے ہی سے فریال اور اظفر کے بیڈ روم کو ڈیکوریٹ کر رکھا تھا۔ ارجمند بانو نے بہت چاؤ سے فریال کی رخصتی اور ولیمے کے لئے بیش قیمت بھاری جوڑے تیار کروائے تھے۔ فریحہ نے بہت پیار سے رخصتی کے اسی زرتار عنابی جوڑے کو فریال کو پہنا کر جیولری اور ہلکے میک اپ سے اسے آراستہ کر دیا تھا۔

آج فریال اور اظفر کی سہاگ رات تھی۔

اس رات کے لئے جواں سال دلوں میں کیسے کیسے خواب سجے ہوتے ہیں۔ اظفر پچھلے دو سالوں سے اس رات کے خواب دیکھتے چلے آئے تھے۔ آج وہ رات اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ان کے دل کی دہلیز پر دستک کناں تھی۔ زرتار عنابی دوپٹے میں چہرہ چھپائے، آنکھیں بند کئے فریال دھڑکتے دل سے ان کے قدموں کی آہٹ سن رہی تھی۔

''آداب۔'' وہ دروازہ بند کرتے اس کے قریب چلے آئے۔ ''جواب نہیں دو گی؟'' وہ قریب بیٹھتے ہوئے شریر لہجے میں پوچھ رہے تھے۔ ''اور بھئی یہ گھونگھٹ وغیرہ کیا ہے؟......ہم اجنبی تو نہیں ہیں نا۔''

پھر انہوں نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر اس کا گھونگھٹ پلٹ دیا تھا۔ ملگجی سی روشنی والے کمرے میں ایک دم سے اُجالا سا بکھر گیا تھا۔ وہ کئی لمحوں تک یک ٹک فریال کا دلکش چہرہ دیکھتے رہے تھے۔

ان کی محبت پاش نظروں کی تپش سے فریال کا چہرہ گلنار ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھوں سے چہرہ چھپانا چاہا مگر اظفر نے ہاتھوں کو چہرے تک پہنچنے سے پہلے ہی پکڑ لیا تھا۔ اور فریال نے آہستگی سے اپنی بند پلکیں کھول دی تھیں۔ سامنے اس کے خوابوں کا شہزادہ، اس کے سرتاج کے روپ میں موجود تھا۔ آج دو سال بعد اس نے یہ چہرہ دیکھا تھا۔

''کیسا لگ رہا ہوں؟'' اسے اپنی جانب یوں بے خود سا تکتے دیکھ کر اظفر نے شریر لہجے میں سرگوشی کی تھی اور فریال نے جھینپ کر پھر سے نگاہیں جھکا لی تھیں۔ ''کم آن فری!'' اظفر مسکرا کر بولے۔ ''بس بھئی۔ اب یہ شرمانا لجانا چھوڑو۔ ہم آج بھی پہلے ہی کی طرح اچھے دوست ہیں۔ جانتی ہو کہ اگر ہزبینڈ وائف میں دوستی کا رشتہ بن جائے تو ان کی ازدواجی زندگی کبھی بھی ناکام نہیں ہو سکتی...... ہاں، دوستی پر یاد آیا...... تمہاری اُس چہیتی دوست کا کیا حال ہے؟''

فریال کو بولنے پر مجبور کرنے کی خاطر بالکل اچانک ہی اظفر نے نمرہ کا ذکر چھوڑ دیا تھا اور حسب توقع نتیجہ بھی اچھا ہی آیا تھا۔ فریال ایک دم سے سیدھی ہوتی ہوئی بولی۔ ''میرے یہاں آنے سے وہ بہت اُداس اور بہت اکیلی ہو گئی ہے۔''

''اور جب آپ یہاں نہیں تھیں تو...... ہم جو اتنے اُداس اور اکیلے تھے..... وہ؟'' اظفر نے فریال کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا اور فریال نے بے اختیار پلکیں جھکا لیں۔

⊛===⊛===⊛
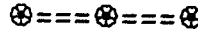
دانیال پوری توجہ اور انتہائی مہارت سے ارجمند بانو کا علاج کر رہے تھے۔ ضرورت پڑتی تو وہ اپنے ہسپتال کے سینئر ڈاکٹرز سے بھی رجوع کرتے تھے۔ حالانکہ وہ خود ایک قابل اور لائق ڈاکٹر تھے۔ ارجمند بانو، دانیال کے دوست اظفر کی ہی نہیں، خود ان کے لئے بھی ماں کا مقام رکھتی تھیں۔ اور وہ شب و روز اسی تگ و دو میں لگے تھے کہ کسی بھی طرح ان کے وجود میں پلتی بیماری کو نوچ پھینکیں۔

''دانیال! ممی ٹھیک تو ہو جائیں گی نا......؟'' اظفر اکثر بچوں کے سے ہمکتے لہجے میں سوال کرتے تھے۔

''ہاں اظفر! خدا کی ذات سے اچھی امید رکھو۔ اِن شاء اللہ! آنٹی بالکل تندرست ہو جائیں گی۔'' دانیال پُر یقین لہجے میں اظفر کو یقین دلاتے۔

جب سے پروفیسر آفاق اور فریال آئے تھے، ارجمند بانو کا چہرہ خوشی سے ہر دم کھلا کھلا دکھائی دیتا تھا۔ آفاق صاحب اور فریال کی آمد کے اگلے ہی دن انہوں نے شہر کے ایک شاندار ہوٹل میں اظفر اور فریال کی دعوتِ ولیمہ کا اہتمام کیا تھا۔ شہر کے چیدہ چیدہ لوگ اس ولیمے میں شریک ہوئے تھے۔ پستی رنگ کے مروڑی اور سلمے کے نفیس کام کے شرارے سوٹ میں فریال غضب کی حسین لگ رہی تھی۔ آج اس پر ٹوٹ کر روپ اُترا تھا۔ جو دیکھتا ''ماشاء اللہ'' کہے بنا نہ رہتا تھا۔

فریحہ بھی بہن کا شاداب اور مسرور چہرہ دیکھ کر نہال ہو رہی تھی۔ اور ارجمند بانو کی تو خوشیوں کا ٹھکانہ ہی کہاں تھا۔ رات گئے تک خوب ہلہ گلہ رہا۔ اور پھر ڈنر کے بعد سب گھر واپس لوٹ آئے۔

⊛===⊛===⊛
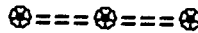
رشید جب سے نمرہ کو دیکھ کر آیا تھا، اسے گھڑی بھر کو قرار نہ تھا۔ ادھیڑ عمری کا اس کا یہ عشق اسے کسی کل چین نہ لینے دے رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تو سوچ بچار میں ہی لگا رہ جائے اور کوئی اور صیاد وہ پنچھی لے اُڑے۔ اس جانِ بہاراں، رشکِ چمن، غنچۂ دہن اور شیریں سخن پر کسی اور کی نگاہ پڑنے سے پہلے ہی وہ اس گلِ نایاب کو توڑ کر اپنے دامن میں چھپا لینا چاہتا تھا۔

پہلے اس نے سوچا اس سلسلے میں اسے سلطانہ سے مدد لینی چاہیے۔

''اماں! وہ میں نے بتایا تھا نا..... دو تین پہلے ..... وہ حسنہ ملی تھی۔''

لاؤنج میں ماں کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے اس نے سرسری سے انداز میں بات کا آغاز کیا۔

''اے کون حسنہ.....؟'' سلطانہ بیزاری سے بولی۔ ''یہ اللہ ماری ہے کون؟..... کل شام سے اسی کا ذکر کیے جا رہے ہو۔ مجھے تو نہیں یاد پڑتا کہ میں نے اسے کبھی کہیں دیکھا ہو۔''

''ارے اماں! کل تو میں نے بتایا تھا وہ تمہاری خلیری چچیری بہن رضیہ کی بیٹی ہے..... ارے وہی جو ایک بار اپنے سارے بچوں کے ساتھ وہاں لاہور آئی تھی۔''

''اے ہاں یاد آیا..... پر تُو مجھے بتا، یہ تُو بار بار اُسی کا ذکر کیوں کیے جا رہا ہے؟'' سلطانہ کے لہجے سے شک کا اظہار ہو رہا تھا۔

''بس یونہی۔'' رشید گڑگڑا کر بولا۔ ''اس کی بیٹی بہت پیاری سی ہے۔ اور وہ خود بھی بہت محبت سے ملی تھی۔ بس اسی لئے۔ اب یہاں اس شہر میں ہمارا اور کوئی عزیز رشتے دار تو ہے نہیں تو ایک..... وہی حسنہ.....''

''اے ہٹاؤ اب حسنہ کو۔ مجھے ایسے بھوکے ننگے رشتے داروں سے ناطہ نہیں جوڑنا۔ میں باز آئی ایسی رشتے داریوں سے۔''

سلطانہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ رشید اپنا سا منہ لئے اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا تھا۔ ایک بات کا اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اس سلسلے میں سلطانہ سے مدد کی امید عبث ہے۔ اب اس نے لاکھانی سے مدد لینے کا فیصلہ کیا تھا اور اتفاق تھا یا تقدیر رشید کا ساتھ دے رہی تھی کہ کچھ ہی دیر میں لاکھانی آ پہنچا تھا۔

''اے رسید بھائی! آپ.....؟'' یونہی لاکھانی، رشید کو گھر میں پا کر حیران ہوا تھا۔ ''مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ آپ اس وقت گھر میں ہوں گے۔''

'میں نے بھی اس وقت کچھ اور مانگا ہوتا تو وہ بھی مل جاتا۔' رشید نے دل میں سوچا اور مسکرا کر لاکھانی سے مخاطب ہوا۔

''اے لاکھانی بھائی! تم بڑے موقع سے آئے۔ ابھی میں تم کو ہی یاد کر رہا تھا۔''

''ایمان سے.....؟'' لاکھانی نے بے یقین لہجے میں یقین دہانی چاہی۔ ''بھلا ایسی کون سی بات ہوگئی کہ آپ کو مجھے

یاد کرنے کی ضرورت پڑی۔"

رشید، لاکھانی کا ہاتھ پکڑ کر نیچے آفس میں آبیٹھا۔

"اب بتاؤ......اس سلسلے میں تم نے کیا سوچا؟" رشید نے بے تاب لہجے میں پوچھا۔

"کس سلسلے میں؟" لاکھانی کے انداز سے بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ وہ بن رہا ہے۔ واقعی وہ ساری بات بھول چکا تھا۔

"ارے میرے باپ!......وہی نمو والا سلسلہ۔"

"ارے ہاں۔" لاکھانی کو یاد آیا۔ "وہی حسنہ کی نند......نمو......ہے نا؟"

"تو اب آگے کیا کرنا ہے؟" رشید نے سوال کیا۔

"کرنا کیا ہے؟......بس چلو سام کو اس کے گھر چلتے ہیں اور پہلا پانسہ ڈالتے ہیں۔"

"تمہارا دل کیا کہتا ہے......وہ مان جائے گی؟......میرا مطلب ہے اس کے بھائی بھابھی۔" رشید کے لہجے میں دبا دبا خوف جھانک رہا تھا۔

"ارے رسید بھائی! پہلے اس کو اچھی طرح دیکھ تو لو......بعد کو ساری باتیں ہوں گی۔" لاکھانی نے مشورہ دیا۔ "ابھی تم نے اسے ایک بار ہی تو دیکھا ہے۔"

"لاکھانی! تُو نہیں جانتا، وہ اتنی حسین ہے کہ ایک بار نہیں، بار بار، ہزار بار دیکھنے پر بھی دل نہیں بھر سکتا۔" رشید نے دل تھام کر مجنونانہ انداز میں جواب دیا۔ "بس میں تو اب اسے اپنا بنا کر اس گھر میں لے آنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں تو اس سلسلے میں ہم نے اس دن منصوبہ بنایا تو تھا۔" لاکھانی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "چلو پھر آج سام سے اس منصوبے پر عمل سروع کر دیتے ہیں۔" جملہ ادا کر کے وہ مسکرایا تھا۔ اور رشید بھی اس کے ساتھ بے اختیار مسکرا اٹھا تھا۔

اس شام رشید، لاکھانی کو لے کر حسنہ کے گھر پہنچا تھا۔ اتفاق سے آج انو ذرا جلدی آ گیا تھا۔ رشید کی بڑی سی گاڑی اور باوقار لباس سے انو بھی متاثر ہوا تھا۔ رشید اپنے ساتھ بڑا سا مٹھائی کا ڈبہ اور ڈھیر سارے پھل لے کر گیا تھا اور حسنہ اور اس کی بچی کے لئے بیش قیمت ریڈی میڈ سوٹ بھی تھے۔ اسے یوں لدا پھندا دیکھ کر حسنہ خوشی سے کِھل اُٹھی تھی۔ اس کی حریص آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

"ارے رشید بھائی! آپ......آیئے آیئے......میں تو سمجھی آپ بھول ہی گئے۔"

"بھلا تم لوگوں کو میں کس طرح بھول سکتا ہوں؟" کچن کی دہلیز پر خاموش گم سم بیٹھی نمو کی طرف دیکھ کر اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا تھا اور اپنے ہاتھ میں تھامے کپڑوں کے شاپرز پلنگ پر رکھ دیئے تھے۔ لاکھانی پہلے ہی پھل اور مٹھائی چارپائی پر رکھ چکا تھا۔ "یہ میرے دوست ہیں، مسٹر یونس لاکھانی۔" رشید نے تعارف کروایا۔ تب ہی انو کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

"اچھا ہوا تم خود آ گئے۔" حسنہ چہک کر بولی۔ "ورنہ میں خود ہی تمہیں ابھی بلانے والی تھی۔ رشید بھائی آئے ہیں......میں نے تم سے ذکر کیا تھا نا۔"

"آں.....ہاں۔" انو نے قدرے جھک کر رشید سے ہاتھ ملایا۔ "حسنہ جس دن آپ سے ملی ہے، رات دن بس آپ ہی کی تعریف کئے جا رہی ہے۔"

"بہن ہے نا، اس لئے۔" رشید نے محبت بھری نگاہ سے حسینہ کو دیکھا۔ پھر نگاہ کا زاویہ بدل کر کچن کی ڈیوڑھی پر نظر کی۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ نمو کچن کے اندر جا چکی تھی۔

"بیٹھیے رشید بھائی!" حسنہ نے جلدی سے پلنگ پر چادر بچھا دی تھی۔ "آج تو چائے پئیں گے نا؟"

''پگلی! بہنوں کے گھر کا تو پانی بھی حرام ہوتا ہے۔'' رشید نے بزرگانہ شان سے جواب دیا۔''وہ زمانے تو لد گئے۔''
انو جلدی سے بولا۔''چائے ہی نہیں، آج تو آپ رات کا کھانا بھی کھا کر ہی جائیں گے...... نمو نے کالی مسور پکائی ہے۔ مجھے یقین ہے آپ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔''
نمو کے ذکر نے رشید کی آنکھوں میں جگنو جگمگا دیئے تھے۔
''اگر آپ دونوں کا اصرار ہے تو میں ضرور کھانا کھاؤں گا۔'' رشید آرام سے بیٹھتے ہوئے بولا۔
''نمو! جلدی سے چائے کا پانی رکھ دو۔'' حسنہ نے وہیں سے ہانک لگائی۔''اجی تم ذرا مجو حلوائی کے یہاں سے گرما گرم سموسے تو لے آؤ۔''
''ہاں ابھی لے آتا ہوں۔'' انو ایک دم کھڑا ہو گیا۔
''دیکھو بھئی حسنہ! کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔'' رشید نے روکنا چاہا۔ مگر حسنہ نہ مانی اور انو کو سموسے لانے کے لئے روانہ کر دیا۔
انو کے جانے کے بعد رشید نے یونس لاکھانی کو ٹہوکا دیا تھا اور لاکھانی گلا صاف کرتے ہوئے حسنہ سے مخاطب ہوا تھا۔
''حسنہ بہن!...... رشید بھائی تو آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔''
''یہ ان کا بڑا پن ہے۔ ورنہ میں کس قابل ہوں؟'' حسنہ انکساری سے بولی۔ تب ہی بے ساختہ رشید کو کھانسی آ گئی تھی۔
''میں ابھی پانی منگواتی ہوں۔'' حسنہ نے تیزی سے کہہ کر کچن کی طرف منہ کر کے آواز لگائی تھی۔''نمو! ذرا ایک گلاس پانی تو لاؤ۔''
اور نہ چاہتے ہوئے بھی نمو کو پانی کا گلاس تھامے کچن سے باہر نکلنا پڑا۔ لاکھانی کی نظر نمو پر پڑی تو وہ اپنی جگہ حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ نمو کے بے پناہ حُسن نے اسے بھی ساکت کر دیا تھا۔ مگر نمو اور رشید کے مابین عمروں کے فرق نے اسے کچھ مایوس کیا تھا۔
''شکریہ۔'' گلاس تھام کر رشید نے گہری نظروں سے نمو کی طرف دیکھا تھا اور نمو کے حسین چہرے پر غیر محسوس سے ناگواری کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔
''یہ...... یہ......'' لاکھانی نے کچھ کہنا چاہا۔
''میری نند ہے، نمو۔'' حسنہ نے تعارف کروایا۔ رشید کی حریص نگاہیں نمو پر سے ہٹنے کے لئے تیار ہی نہیں تھیں۔ حسنہ کی عیار نگاہوں نے رشید کی آنکھوں میں نمو کے لئے پسندیدگی بھانپ لی تھی اور وہ خوب جانتی تھی کہ اس بیرر چیک کو کس طرح کیش کروایا جا سکتا ہے۔
''نمو بہن! آپ بیٹھو نا۔'' لاکھانی نے شائستہ لہجے میں نمو کو بیٹھنے کی پیشکش کی۔
''ہاں...... تم تو سارا وقت باورچی خانے میں ہی گھسی رہتی ہو۔'' حسنہ نے نمو کو مخاطب کیا۔''کبھی کسی آئے گئے کے پاس بھی بیٹھنا چاہئے۔ کیوں رشید بھائی؟''
''بالکل۔'' رشید نے نمو کو اپنی نگاہوں کی رینج میں لیتے ہوئے جلدی سے تائید کی۔''حسنہ! تم نے اس کا اصل نام کیا بتایا تھا؟'' اس نے سوال کیا۔
''نمرہ، رشید بھائی!'' حسنہ جلدی سے بولی۔
''نمرہ رشید۔'' رشید نے نمرہ رشید ملا کر اور ذرا وقفے سے ''بھائی'' کہا۔ اور بے اختیار ہنس دیا۔ اس کی بات کا

مطلب سمجھ کر نمرہ کا دل جل کر رہ گیا۔ حسنہ سمجھ کر بھی انجان بنی رشید کی ہنسی میں شامل ہوگئی تھی۔

''بھئی نمرہ! یہ کچھ بولتی وولتی نہیں ہیں؟'' رشید نے سوال کیا۔

''نمو!'' حسنہ نے قہر آلود نگاہوں سے نمو کو دیکھا مگر نمو نگاہیں اور سر جھکائے فرش کی سمت تکے جا رہی تھی۔ رشید نے گہری سانس لے کر ایک بار پھر نمو پر اپنی نظریں گاڑ دی تھیں۔

یہ گم سم سی، خاموش سی بے زبان لڑکی اپنی گلابی رنگت اور بے پناہ دلکشی سمیت اس کے دل میں کھب گئی تھی اور وہ اپنی اور اس کی عمروں کے فرق کو نظر انداز کر کے ہر قیمت پر اسے حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ کچھ ہی دیر میں انو سمو سے لے کر آ گیا تھا۔

رشید اور لاکھانی کے جانے کے بعد حسنہ، رشید کی تعریف کرتے نہیں تھک رہی تھی۔ مگر نمو ایک عجیب سی اُلجھن کا شکار ہوگئی تھی۔ پہلی نظر میں اسے حسنہ کا یہ گنجا اور توندیل رشتے دار بہت برا لگا تھا۔ اس کے دیکھنے کے انداز میں عجب سا ندیدہ پن اور گھناؤنا احساس تھا جس نے نمو کو سخت بیزار کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اتفاقاً مل گیا ہے..... اب شاید پھر کبھی زندگی میں دوبارہ ملاقات نہ ہو۔ مگر تین روز بعد ہی آج اسے پھر موجود دیکھ کر نمو پریشان ہوگئی تھی۔

اور اگلے دن صبح ہی لاکھانی پھر آ موجود ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈھیر سارے پھل اور مٹھائی تھے۔

''حسنہ بہن! میں آپ سے ایک کھاس (خاص) بات کرنے آیا ہوں۔'' اس نے آتے ہی اعلان کیا تھا۔

کل رات یہاں سے جاتے ہی رشید نے لاکھانی سے کہہ دیا تھا کہ کل صبح ہی وہ جا کر حسنہ سے شادی کی بات کرے۔

''رسید بھائی!..... رِستے داری کا معاملہ ہے..... اگر یہ بات اماں جی کریں تو.....''

''ارے یار! جب تک بات پکی نہیں ہو جاتی، اماں کو بتانا بھی نہیں ہے۔'' رشید نے جواب دیا۔

''کک..... کیوں؟'' لاکھانی حیران ہوا۔

''یار! تُو اماں کی عادت نہیں جانتا۔'' رشید نے آنکھیں نکالیں۔ ''بنتی ہوئی بات منٹوں میں بگاڑ کر رکھ دیں گے۔ اماں کو بتانا تو ہے..... مگر ذرا بات جم جانے دے..... رشتہ طے ہو جائے..... نکاح والے دن اماں کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔''

''ہاں..... یہ ٹھیک ہے۔'' لاکھانی نے تائید بھرے انداز میں سر ہلایا۔ ''تو..... پھر میں کل جاؤں؟''

''ہاں..... تُو کل جا کر حسنہ کو شیشے میں اُتار۔ اور دیکھ کس طرح معاملہ جم سکتا ہے۔''

اور آج لاکھانی، حسنہ کے گھر موجود تھا۔

''وہ حسنہ بہن! بات دراصل یہ ہے کہ.....'' لاکھانی کی زبان لڑکھڑائی۔

''ہاں بولو لاکھانی بھائی!'' چالاک حسنہ بات سنے بغیر ہی مفہوم سمجھ چکی تھی۔

''اصل میں رسید بھائی..... رسید بھائی کو تو آپ جانتی ہو، آپ کے بھائی ہیں۔ اللہ نے بہت کچھ دیا ہوا ہے۔ مگر اب تک اکیلے ہیں۔ اب وہ گھر..... بسانا چاہتے ہیں..... آپ کی نند..... نمرہ کے ساتھ۔''

''ہائے اللہ!'' حسنہ نے اتنی زور سے ہائے اللہ کہا کہ لاکھانی بے ساختہ اُچھل پڑا۔

''میں نے کچھ گلط (غلط) کہہ دیا؟'' اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''نن..... نہیں..... مگر لاکھانی بھائی!..... رشید بھائی اور نمو کی عمروں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔''

''وہ تو ہے۔ مگر یہ بھی تو دیکھو، آپ کے اور ان کے حالات میں بھی جمین آسمان کا فرک ہے..... وہ لکھوں پتی بلڈر ہیں اور.....'' لاکھانی نے رشید کی پُر زور وکالت کی۔ ''نمو وری اُدھر آرام سے جندگی بسر کرے گی..... اللہ نے رسید بھائی

کو سب کچھ دے رکھا ہے۔''

''ہاں وہ تو ہے۔'' حسنہ نے دھیمے پڑتے ہوئے جواب دیا۔''مگر نمو کا بھائی......وہ نہیں مانیں گے۔''

''آپ رسید بھائی کی بہین ہو......تو آپ کو کسی نہ کسی طرح انو کو منانا تو ہوگا۔'' لاکھانی نے پُر اُمید اور پُریقین لہجے میں کہا۔اور پھر حسنہ کے قریب کھسک کر لین دین کے موضوع پر بات کرنے لگا۔لاکھانی کی بات ختم ہونے تک حسنہ کا چہرہ ماہِ کامل کی طرح چمکنے لگا تھا۔

تمام مہربانیوں اور فراخ دلی کے باوجود انو کو رشید پسند نہیں آیا تھا۔اور خاص طور پر نمو کے ساتھ تو اس کا کوئی جوڑ ہی نہ تھا۔کہاں پھول کی پتی کی سی نازک اندام 19 سالہ نمو اور کہاں وہ گنجا توندیل سانڈ جیسا 43 سال کا ادھیڑ عمر مرد......

مگر حسنہ نے سمجھایا۔

''شادی کے خرچ کے نام پر رشید بھائی دو سے ڈھائی لاکھ روپے دینے کو تیار ہیں۔''

''دو......ڈھائی لاکھ روپے؟'' انو نے حیران نظروں سے حسنہ کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔'' حسنہ قریب کھسکتے ہوئے بولی۔''ذرا سوچو......یہ کوئی چھوٹی رقم نہیں ہے۔''

انو اب سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا......ڈھائی لاکھ نقد ایک بڑی رقم تھی۔حسنہ نے پلان کیا۔''اس رقم سے ہم اوپر کی منزل بنا کر کرائے پر اُٹھا دیں گے تو ایک مستقل آمدنی کا ذریعہ ہو جائے گا۔اور ویسے دیکھو تو، رشید میں کمی ہی کیا ہے؟ یہ بڑے عالیشان گھر میں رہتا ہے......شاندار گاڑی میں گھومتا ہے......لاکھوں میں کھیلتا ہے۔نمو رانی بن کر راج کرے گی۔''

حسنہ کی کہی گئی ہر بات درست تھی۔رشید واقعی لاکھوں میں کھیل رہا تھا۔اگر اس کے اور نمو کے عمر کے فرق کو نظر انداز کر دیا جاتا تو بظاہر اس رشتے میں کوئی قباحت نہ تھی۔اس کے باوجود انو کا دل نہیں مان رہا تھا۔جانے کسی کھٹک سی دل میں ہو رہی تھی۔

''اے جی، میں کہتی ہوں، آخر اس میں اتنی سوچ بچار کی ضرورت ہی کیا ہے؟'' میاں کو سوچ میں گم دیکھ کر حسنہ نے بیزاری سے سوال کیا۔''نصیبوں والوں کے لئے ایسے رشتے آتے ہیں۔وہ تو کہو کہ میں بہت اچھے دل کی مالک ہوں۔میری جگہ کوئی اور بھاوج ہوتی تو جل ہی جاتی کہ میری نندا تنے اچھے گھر کیوں بیاہ کر جائے۔سچ کہتی ہوں......نمو بڑی بھاگوان ہے۔رشید بھائی کس طرح چاؤ چونچلوں سے بیاہ کر لے جانا چاہ رہے ہیں......میں تو کہتی ہوں بس ہاں کہہ دو۔''

''مگر حسنہ......'' انو کے انداز میں ابھی بھی پس و پیش تھا۔

''اے میں کہتی ہوں، اتنا سا فیصلہ کرنے میں اتنے اگر مگر کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ رکھے ہمارے پانچ پانچ بھائی تھے۔جب تمہارا رشتہ گیا، مجال ہے جو کسی نے اگر مگر کی ہو......بس اللہ کا نام لے کر ہاں کر دی۔ایسا ہی ہوتا ہے....کوئی مسئلہ کشمیر تھوڑی ہے کہ کبھی فیصلہ ہی نہ ہو سکے۔''

''پھر بھی......مجھے ایک آدھ ہفتہ دو......میں کسی سے مشورہ کر لوں۔''

''اے لو......نئی بات کہی......میرے سوا اور بھی کوئی ہے تمہاری، جس سے تم صلاح مشورہ کرو گے؟'' حسنہ نے آنکھیں نکال کر انو کی طرف دیکھا اور حقیقت میں انو سہم گیا۔

''نن......نہیں......میرا یہ مطلب نہیں تھا......وہ......اگلے ہفتے پروفیسر صاحب آنے والے ہیں۔میں نے ہمیشہ ہر کام میں ان سے مشورہ کیا ہے تو......پھر بھلا اس کام میں......''

''ہیں۔'' حسنہ کی آنکھوں میں حیرت اور فکر مندی چمکی۔ ''پھر آ رہے ہیں پروفیسر صاحب؟ ایک ان کے نہ ہونے سے یہاں کون سا کام کاج رُکا ہوا تھا؟ بھلا ان کی یہاں ایسی بھی کیا ضرورت تھی کہ پھر آ رہے ہیں..... مگر ایک بات تم میری بھی کان کھول کر سن لو۔ میرے رشید بھائی سے تم اپنی بہن کا رشتہ کرو نہ کرو، مگر خبردار جو تم نے اس سڑیل بڈھے پروفیسر سے مشورہ کیا ہو..... کوئی ضرورت نہیں ہے اس سے کسی مشورے کی۔ سخت چڑ ہے مجھے اس منحوس بڈھے کی شکل سے۔''

''حسنہ.....!'' ان کو بھی پروفیسر آفاق کی شان میں حسنہ کی گستاخی ناگوار گزر رہی تھی۔ مگر وہ اسے ٹوکنے کی خود میں ہمت نہیں رکھتا تھا۔

''اچھا چلو ختم کرو اس موضوع کو۔'' چند لمحوں میں وہ سر جھکاتا ہوا بولا۔ ''بات تو نمو اور رشید کی شادی کی ہو رہی تھی..... تم خوامخواہ پروفیسر صاحب کو بیچ میں گھسیٹ لائیں۔''

''میں گھسیٹ لائی؟'' حسنہ نے آنکھیں نکالیں۔ ''ان کا ذکر شروع کس نے کیا تھا؟..... سچ کہتی ہوں، تم تو میرے سامنے ان کا نام بھی مت لیا کرو۔''

''چلو نہیں لوں گا۔'' انو نے ہتھیار ڈالتے ہوئے رسان بھرے لہجے میں جواب دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں کہتی ہوں، ایک بار ٹھنڈے دل سے پھر سوچ لو۔'' اب کے حسنہ بولی تو اس کی آواز میں ایک بے نام سے التجا تھی اور شہد کی مٹھاس۔ انو اُٹھتے اُٹھتے دوبارہ بیٹھ گیا۔

''سوچو! تم عمر بھر ڈھائی لاکھ نہ جمع کر سکو گے نہ ہمارے اوپر کے دونوں کمرے بن سکیں گے۔ کل کو گڑیا اور آنے والا نیا بچہ بڑے ہوں گے، سکول جائیں گے، اخراجات بڑھیں گے..... اگر آج ہم ان کے لئے کچھ کر سکتے ہیں تو کیوں نہ کریں؟''

''مگر اس طرح رشید سے روپے لینے.....؟'' انو کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔

''اگر اُس کی شادی کے خرچ کے نام پر کچھ روپے تم لے لو گے تو کون سی قیامت آ جائے گی۔ اور رہا سوال بڑی عمر کا تو دیکھ لو..... کتنے ہی بڑے بڑے لوگوں کی اسی طرح شادیاں ہوئی ہیں۔ وہ کون سا ہندوستان کا مشہور ہیرو تھا..... ہاں یاد آیا..... دلیپ کمار..... اس کی بیوی سائرہ بانو اس سے بائیس برس چھوٹی تھی..... اور وہ عمران خان..... کرکٹر..... اس کی گھر والی بھی تو 20، 22 سال چھوٹی تھی..... اور.....''

''اچھا، بس رہنے دو۔'' انو ہاتھ اٹھا کر بولا۔ بات واقعی اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ آخر کار اس نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دو دن بعد رشید پھر لدا پھندا آ موجود ہوا تھا۔

جب سے یہ سلسلہ شروع ہوا تھا، رشید آئے دن آ جاتا تھا۔ جب سے گھر میں اس کی آمد و رفت بڑھی تھی، نمو پریشان رہنے لگی تھی۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ اس کا سامنا رشید سے نہ ہونے پائے۔ مگر دو کمروں کے چھوٹے سے گھر میں وہ کہاں تک اس سے چھپ کر رہ سکتی تھی۔ جبکہ رشید کا کام ہی اسے گھورتے رہنا تھا۔ رشید کے جسم و جاں میں چھید کرتی نظروں سے دیکھنے پر نمو بری طرح ہراساں ہو جاتی تھی۔ اور یہ خوفزدہ ہرنی جیسی لڑکی رشید کی طلب کو اور ہوا دیتی تھی۔

رشید کو دو ایک ملاقات کے بعد ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ حسنہ جیسی لالچی عورت کو اپنی نند سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ سو جھوٹے اور فرضی محل تعمیر کر کے اس نے حسنہ کو شیشے میں اُتار لیا تھا اور اب وہ نمو کی شادی رشید سے کرنے کو تیار تھی بلکہ اس نے انو کو بھی کسی حد تک رضامند کر لیا تھا۔

ان ڈھائی سالوں میں نمرہ نے انو کے جو بدلتے رنگ دیکھے تھے، ان کے باعث اب اسے انو کے کسی بھی روّیے پر حیرت نہیں ہونی چاہئے تھی۔ پھر بھی وہ رشید کے رشتے پر انو کو غور کرتے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ جانے کیوں دل کے کسی گوشے میں یہ خوش گمانی ابھی بھی زندہ تھی کہ بھیا اس کی زندگی سے اتنا بڑا مذاق کر ہی نہیں سکتے۔ مگر جب اس نے سنا کہ ان اس رشتے کے لئے تقریباً رضامند ہو چکا ہے تو وہ سر تا پیر تک لرز اُٹھی تھی۔ فریال پردیس سدھار چکی تھی جبکہ پروفیسر آفاق کی واپسی کی خبر گرم تھی مگر وہ اب تک نہ لوٹے تھے۔ دو روز قبل ان کے گھریلو ملازم غفور کے ذریعے بھی نمو کو پتہ چلا تھا کہ شاید ہفتے کی رات کو آفاق صاحب واپس آنے والے ہیں۔ اور ابھی ہفتہ آنے میں پورے چار روز باقی تھے۔ نمو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس عالمِ کرب و اُلجھن میں کیا کرے اور کس سے مدد لے؟...... دور دور تک کوئی اپنا پرایا نظر نہ آتا تھا۔ ابھی تو وہ شادی کے حق میں ہی نہیں تھی۔ اسے انٹر کے رزلٹ کا انتظار تھا۔ رزلٹ کے بعد وہ میڈیکل میں داخلہ لینے کی متمنی تھی۔ وہ انو کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنا چاہتی تھی۔ بچپن سے ہی انو نے اس کی آنکھوں کو بھی یہی خواب دکھایا تھا کہ اسے پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بننا ہے۔ اس آرزو کی انگلی تھامے وہ آبلہ پا چلتی رہی تھی۔ اب جبکہ منزل کے قریب آنے کی امید بندھی تھی تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بھیا کوئی ایسا فیصلہ کریں گے جس سے اس کی منزل ہمیشہ کے لئے اس سے دور ہو جائے گی۔

''میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ شیرنی کی طرح پُرعزم انداز میں اُٹھی اور انو کے کمرے کی طرف چلی۔ کمرے میں انو اور حسنہ باتوں میں مصروف تھے۔

حسنہ کا سانولا چہرہ چاند کی طرح روشن تھا اور انو کی بجھی بجھی آنکھوں میں بھی دیے سے جل رہے تھے۔

''ڈھائی لاکھ...... یہ تو اچھی خاصی رقم ہوتی ہے۔ کیوں......؟'' انو خوابناک لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''اور نہیں تو کیا؟'' حسنہ نے پُروثوق لہجے میں جواب دیا۔ ''اوپر کے دونوں کمرے باورچی خانہ بنا کر بھی اچھی خاصی رقم بچ جائے گی۔ سنو جی! ان روپوں سے میں بہت سارے کپڑے لتے اور گہنے بنواؤں گی۔''

''میں نے پہلے کبھی روکا ہے جو اب روکوں گا؟'' انو لاڈ سے بولا۔ ''میں سوچ رہا ہوں حسنہ! ہم کیوں نہ کوئی کاروبار شروع کر دیں۔''

''نہیں جی۔ پہلے ان روپوں سے گھر بنوائیں گے..... کرایہ آنے لگے گا.... اس اضافی رقم کو جمع کر کے تم کوئی کام کر لینا۔ انہی پیسوں سے ہم اپنے بچوں کو انگریزی اسکول میں پڑھائیں گے۔''

پڑھنے کے نام پر بالکل اچانک انو کو نمو کے پڑھنے کے شوق کا خیال آ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے دیے ماند پڑ گئے۔ ''حسنہ! کہیں ہم غلطی تو نہیں کر رہے؟''

اس کے سوال نے نمو کے قدموں کو تقویت دی تھی۔ اس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی تھی۔

تب ہی گھر کے داخلی دروازے پر بھی دستک ہوئی تھی۔ حسنہ جلدی سے اُٹھ کر دروازے پر گئی تھی اور حسبِ توقع دروازے پر رشید کو دیکھ کر وہ خوش ہو گئی تھی۔

''آئیے آئیے رشید بھائی! ہم ابھی آپ کا ہی ذکر کر رہے تھے۔''

رشید کو لے کر چھوٹے کمرے میں چلی گئی تھی۔ انو اس وقت اپنے کمرے میں اکیلا تھا اور انو سے بات کرنے کے لئے یہ ایک اچھا وقت اور موقع تھا۔ لمحہ بھر سوچنے کے بعد نمو نے انو سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آخر یہ اس کی زندگی کا معاملہ تھا۔

''بھیا......!'' آج کتنے عرصے بعد اس نے انو کو مخاطب کیا تھا۔

''ہوں۔'' اس کی آواز پر انو نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''بھیا!...... میں آپ سے ایک بات......'' نمو کی آواز حلق میں اٹکنے لگی۔ کیسا انقلاب آ گیا تھا۔ آج چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز حلق سے نکلنے کو تیار نہ تھی۔ اور ایک وہ وقت تھا کہ انو کے گھر آتے ہی وہ چہکنے لگتی تھی۔ ایک ایک بات، ایک ایک قصہ پوری تفصیل کے ساتھ جب تک وہ انو کو سنا نہ لیتی تھی، چین نہ آتا تھا۔ اور انو بھی تو کس توجہ، دلچسپی اور شوق سے اس کی باتیں سنا کرتا تھا۔ اب نہ انو کو فرصت تھی اور نہ ہی اسے ضرورت تھی۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی وہ دونوں اجنبی سے بن گئے تھے ایک دوسرے کے لئے۔

انو نے گود میں بیٹھی گڑیا سے کھیلتے ہوئے غیر یقینی سوالیہ نگاہوں سے نمو کی طرف دیکھا۔ حسنہ باہر کے کمرے میں رشید سے شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں مصروفِ گفتگو تھی، اسی لئے نمو کو یہ وقت غنیمت لگا ورنہ حسنہ کے سامنے تو وہ زبان کھولنے کی جسارت بھی نہ کر سکتی تھی۔

''بھیا! وہ......'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بات کہاں سے شروع کرے اور اس موضوع پر کس طرح گفتگو کرے...... فطرتاً وہ شرمیلی اور معصوم سی لڑکی تھی۔ اپنی شادی کی بات کرتے ہوئے وہ بری طرح جھجک رہی تھی۔ ''وہ...... بھیا!...... میں...... رشید سے...... میرا مطلب ہے......'' اس کی شفاف پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔

''رشید......؟'' انو سیدھا ہوتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔ ''رشید اچھا لڑکا...... میرا مطلب ہے اچھا آدمی ہے۔'' انو ٹپٹا کر بولا۔ ''تمہیں خوش رکھے گا۔''

''میں پڑھنا چاہتی ہوں۔'' آنسوؤں کا گولا اس کے حلق میں پھنستا محسوس ہوا۔

''بہت پڑھ چکیں۔''

حسنہ، رشید کو رخصت کر کے شاداں و فرحاں کمرے میں داخل ہوئی اور آگے بڑھ کر نمو کو پیار سے تھامتے ہوئے میٹھے لہجے میں بولی۔ ''12 جماعتیں پڑھ لیں، کیا یہ کچھ کم ہیں؟'' اس کے لہجے میں شادی کے بعد سے آج پہلی بار نمو کے لئے مٹھاس تھی۔

''مگر...... مگر میں ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔'' حسنہ کے میٹھے لہجے سے حوصلہ پا کر نمو نے دل کی بات زبان پر لانے کی جرأت کی۔

''آ، میرے پاس آ نمو!...... میں تجھے سمجھاتی ہوں۔'' حسنہ نے نمو کا ہاتھ تھام کر اپنے قریب بٹھاتے ہوئے انو کی طرف دیکھا۔ ''تم جاؤ جی...... گڑیا کو ذرا دکان سے چیز دلا لاؤ۔ تب تک میں اپنی لاڈلی سے بات کرتی ہوں۔''

حسنہ نے آنکھ کے مخصوص اشارے سے انو کو جانے کے لئے کہا اور وہ خاموشی سے بچی کو گود میں سنبھالنے باہر کی طرف چل دیا۔

''اب بول اور کتنا پڑھنا ہے؟...... انٹر تک پڑھ لیا، کیا یہ کافی نہیں ہے؟...... کون سی تجھے نوکری کرنی ہے؟'' حسنہ نے بڑے رسان سے اس سے پوچھا۔

''بھابھی! میں نوکری کرنا چاہتی ہوں۔'' نمو نے دبے مگر پُر زور لہجے میں جواب دیا۔ ''گھر کے لئے...... بھیا کے لئے...... گڑیا کے لئے...... اور...... اور......''

حسنہ کا محبت بھرا لہجہ پا کر وہ ویسے بھی پگھل رہی تھی، بے اختیار رو پڑی۔ حسنہ نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔

''تُو اپنے بھائی سے، اپنی گڑیا سے اور مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے تو کیا میں تیری دشمن ہو سکتی ہوں؟...... میں تیرا بھلا ہی چاہوں گی۔ اس گھر میں غربت ہے...... ایک ایک چیز کے لئے ترسنا پڑتا ہے۔ اسی لئے میں نے سوچ لیا تھا کہ

تیری شادی کسی ایسے گھر میں کروں گی، جہاں روپے پیسے کی ریل پیل ہو......اور تجھے بہت سُکھ اور آرام ملے۔اور ذرا سوچ!......تُو گھر کے لئے، اپنے بھائی کے لئے محنت کر کے، نوکری کر کے روپے کمانا چاہتی ہے......تو بتا......ڈھائی لاکھ کتنے دن میں کمائے گی؟''

نمو، حسنہ کے بے تکے سوال پر اس کا چہرہ تکنے لگی تھی۔

''ہاں نمو! اگر تُو رشید سے شادی کے لئے راضی ہو جائے تو رشید ہمیں اوپر کا گھر بنانے کے لئے ڈھائی لاکھ روپے دے گا۔اوپر کے دونوں کمرے بنا کر کرائے پر اٹھانے سے تیرے بھیا کی آمدنی میں ایک مستقل اضافہ ہو جائے گا۔اور جب تُو ایک دولت مند سیٹھ کی بیگم بن جائے گی تو جس طرح چاہے گی، اپنے غریب بھائی اور اس کے بچوں کی مدد کر سکے گی۔بول......غلط کہہ رہی ہوں؟''

نمو کی سمجھ میں نہیں آیا، یہ تمام باتیں اس کے فائدے کی ہیں یا سراسر نقصان کی۔گویا اسے ڈھائی لاکھ روپوں کے عوض بیچا جا رہا تھا اور یہ توقع بھی رکھی جا رہی تھی کہ وہ بڑے گھر جا کر اپنے غریب بھائی کی مدد کرتی رہے گی۔گویا کہ ہر لحاظ سے اپنا ہی فائدہ پیشِ نظر تھا......مگر نمو تو ہمیشہ سے ہی محبت کی ماری تھی......اُس نے اس ستم کو بھی محبت کی ایک آزمائش جان کر قبول کر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔اگر اسے بیچ کر اس کا بھائی کچھ خوشحال ہو سکتا تھا تو وہ تو سو بار بکنے کو تیار ہو سکتی تھی۔سو اس نے سر جھکا لیا۔

❀===❀===❀

دن بھر کڑی دھوپ میں سلگتے شہر پر شام کی مہربان دیوی کو رحم آ گیا تھا۔اس نے اپنا سرمئی آنچل پھیلا کر پورے شہر کو اپنی پُرسکون اور ٹھنڈک بھری آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔دن بھر دھوپ کی تمازت سے بلبلاتی ہوا میں شام ڈھلتے ہی ایک تسکین آمیز احساس سمٹ آیا تھا۔

پروفیسر آفاق احمد نے ایئرپورٹ سے باہر نکل کر اپنے شہر کی مانوس فضا میں کئی گہرے گہرے سانس لے کر اپنے پھیپھڑوں کو تازہ ہوا سے لبریز کر لیا۔پھر اپنا سوٹ کیس ہاتھ میں تھامے دائیں جانب کھڑی ٹیکسیوں کی جانب بڑھ گئے۔

بے ہنگم ٹریفک کے بیچ رینگتی ٹیکسی میں بیٹھے وہ چاروں اطراف دلچسپی بھری نظروں سے تک رہے تھے۔یہ شہر ان کا تھا۔وہ اسی شہر میں پیدا ہوئے تھے۔بچپن اور جوانی اسی شہر کے آنگن میں گزار کر اب وہ بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے تھے۔بالکل اکیلے اور تنہا۔ملیحہ بیگم کے انتقال اور فریحہ اور فریال کی شادی کے بعد اب وہ بالکل اکیلے رہ گئے تھے۔ملیحہ بیگم ملکِ عدم کو سدھار گئی تھیں جبکہ دونوں بیٹیاں پردیس میں جا بسی تھیں۔فریحہ اور فریال کا خیال آتے ہی انہیں اپنے دل میں ایک عجب سی بے کلی سی محسوس ہوئی تھی۔حالانکہ وہ خوش تھے، وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو کر اور دونوں بیٹیوں کو ان کے گھر بار کا کر کے خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔کیونکہ جانتے تھے کہ ان کی دونوں بیٹیوں کو قدردان اور محبت کرنے والے نیک، باکردار شوہر ملے ہیں۔اور دونوں اپنے گھر میں بے حد خوش وخرم ہیں۔ایک احساسِ طمانیت ان کے دل کی بے کلی کو کہیں دُور بہا کر لے گیا تھا۔تب ہی بالکل اچانک ان کے خیال کی رو نمرہ کی طرف بہہ نکلی تھی۔

نمرہ بھی انہیں فریحہ اور فریال کی طرح ہی عزیز تھی۔بلکہ وہ تو انو پر بھی اسی طرح اپنی بزرگانہ شفقت لٹاتے تھے۔مگر شادی کے بعد سے انو کے روّیوں میں حیرت انگیز تبدیلی آئی تھی۔اس نے ڈین سے کہہ کر دوسرے ڈیپارٹمنٹ میں تبادلہ کروا لیا تھا۔اور یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ آفاق صاحب سے چھپتا پھرتا ہو۔جو کبھی سامنا ہو جاتا تو نظریں چرا کر نکل جانا چاہتا۔اور جو ٹھہرنا مجبوری بن جائے تو وہ بے حد لئے دیئے انداز میں گفتگو کرتا اور جلد از جلد جان چھڑا کر اپنی راہ لیتا۔جلد ہی یہ بات سامنے آ گئی تھی کہ انو کی بیوی حسنہ، آفاق صاحب سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتی۔وہ نہیں چاہتی کہ وہ دونوں اس

کے گھر آئیں۔ اور یہ کہ انو اور نمرہ ان لوگوں سے میل ملاپ رکھیں۔ حسنہ کی بیزاری اور ناپسندیدگی کی وجہ وہ کبھی سمجھ نہیں سکے تھے۔ مگر نمرہ کی وجہ سے وہ اب بھی کبھی کبھار انو کے گھر چلے جاتے تھے۔

پچھلے تین مہینوں سے وہ انگلینڈ میں تھے۔ ارجمند بانو کی خرابی طبع کے باعث فریال کو لے کر انہیں لندن جانا پڑا تھا۔ اب ارجمند کی حالت قدرے بہتر ہوگئی تھی۔ ان کی طبیعت بحال ہوتے ہی آفاق صاحب نے رختِ سفر باندھ لیا تھا۔

''بھائی جان! زندگی میں پہلی بار تو بہن کے گھر آئے ہیں۔ ایک آدھ مہینہ اور رُک یے نا۔'' ارجمند بانو نے بھائی کے شانے پر سر رکھتے ہوئے اصرار سے کہا۔

''اور نہیں تو کیا۔'' فریال نے پُرزور انداز میں سر ہلایا۔ ''پلیز بابا! ایک مہینہ تو اور رُک یے نا۔''

''اور میں تو کہتا ہوں، آفاق بھائی کو جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔'' عالم تاب صاحب بولے۔ ''وہاں آپ کا ہے ہی کون؟...... اکلوتی بہن اور دونوں بیٹیاں یہاں ہیں...... آپ کو بھی اب یہیں رک جانے کے بارے میں سوچنا چاہیئے۔''

''دیکھو عالم تاب میاں!'' آفاق صاحب نے سنجیدہ نظروں سے بہنوئی کی طرف دیکھا۔ ''آپ تو جانتے ہیں، ہم مشرقی لوگ بہن اور بیٹی کے گھر کا پانی پینا بھی پسند نہیں کرتے۔ اور آپ مجھے یہاں مستقل رہ پڑنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔''

''یہ گھر آپ کی بہن اور بیٹیوں کا تو ہے۔'' عالم تاب صاحب جلدی سے بولے۔ ''مگر ساتھ ہی یہ گھر آپ کے دو عدد جواں سال بھانجوں کا بھی ہے۔ اور ساتھ ہی اس دیرینہ دوست کا بھی۔ شاید آپ کو یاد نہیں، آپ کا بہنوئی بننے سے پہلے میں آپ کا دوست تھا اور الحمدللہ ہمارے مابین آج بھی وہ رشتہ قائم ہے۔''

پروفیسر آفاق نے آگے بڑھ کر بے ساختہ عالم تاب صاحب کو سینے سے لگا لیا تھا۔ یہ حقیقت تھی۔ پچھلے 28، 30 سالوں میں انہیں کبھی بھی عالم تاب صاحب سے ذرّہ بھر بھی شکایت نہ ہوئی تھی اور دونوں سالے بہنوئی کے نازک رشتے میں بندھ کر بھی ایک دوسرے کے بہترین دوست تھے۔

آفاق صاحب کی واپسی کی تیاری کی خبر ڈاکٹر دانیال کو ہوئی تو وہ بھی دوڑے چلے آئے۔

''یہ کیا آفاق انکل! یوں بیٹھے بٹھائے آپ نے جانے کا فیصلہ کرلیا؟''

''بیٹا! تین مہینے ہوگئے۔ اب ارجمند بانو کی طبیعت بھی بہ فضلِ الٰہی بہتر ہے۔ جس کام کے لئے میں آیا تھا، وہ کام بھی احسن طریقے سے تکمیل پا گیا۔ اب یہاں رہنے کا جواز ہی کیا ہے؟''

''میری بات مانیں تو آپ یہیں رُک جائیں۔'' دانیال نے دھیمی آواز میں مشورہ دیا۔ ''وہاں تو اب آپ بالکل اکیلے ہوں گے۔''

''دیکھو بیٹا! کہنے کو تو ہم اپنوں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور شناسا چہروں کی بھیڑ میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ پر سچائی تو یہ ہے کہ...... دنیا تنہائی کا گھر ہے۔ یہاں سب اکیلے آتے ہیں۔ جانے انجانے لوگوں کے اژدھام میں اکیلے رہ کر، آخر کار اکیلے ہی ایک انجانے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ اور جہاں تک اس شہر میں میرے اکیلے ہونے کی بات ہے...... تو بے شک میں وہاں اکیلا ہوں گا۔ مگر اجنبی اور انجانا نہیں ہوگا۔ وہ میرا شہر ہے...... میرا وطن ہے...... وہ سرزمین بہت قربانیاں دے کر ہم نے حاصل کی ہے۔ اس مٹی سے ہمیں پیار ہے۔ میں اور مجھ جیسے بے شمار لوگ اس مٹی میں مل جانا چاہتے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے...... مگر......''

''اگر مگر رہنے دو۔'' آفاق صاحب مسکرائے۔ ''اور اب تم سب مجھے جانے کی اجازت دے دو۔ سچ کہتا ہوں، میرا دل اپنے شہر اور اپنے وطن جانے کے لئے بے قرار ہے۔''

اور آج اپنے شہر اور اپنے وطن پہنچ کر انہیں قرار مل گیا تھا۔ سڑک پر رینگتا ٹریفک، فٹ پاتھ پر دوڑتے بھاگتے لوگ، جگہ جگہ ریڑھی اور خوانچے لگا کر اشیاء فروخت کرتے خوانچہ اور ریڑھی فروش، تیز رفتار ویگنیں اور بسیں جن کی چھتوں اور دروازوں سے لٹکتے لوگ، پھٹ پھٹ کی بے ہنگم آوازیں نکالتے رکشے..... سڑک کے کنارے کھڑی عمارتیں، ٹریفک سگنل کی خلاف ورزی کرتے اسکوٹر سوار..... یہ سب کچھ کتنا مانوس، کتنا اپنا لگ رہا تھا۔ بھلا اس بھیڑ میں وہ تنہا کب تھے؟..... یہ شور، یہ آوازیں..... دھواں بکھیرتی یہ بسیں، سیٹی بجاتے ٹریفک پولیس کے کانسٹیبل، ہر سگنل پر رکتی گاڑیوں کی طرف ہاتھ پھیلائے لپکتے فقیر، شیشوں کو صاف کرتے نو عمر بچے..... یہ سب ان کے اپنے تھے۔ کس قدر مانوسیت تھی، کس قدر اپنا پن تھا ہر ہر قدم پر..... ہر ہر انسان کے ساتھ۔

ایئرپورٹ سے نکلتے وقت لمحہ بھر کو سر اٹھانے والا تنہائی کا احساس کہیں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ اب وہ نہایت سنجیدگی سے نمرہ کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ وہ اپنی بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ مگر ابھی ایک بیٹی باقی تھی۔ نمو بھی انہیں فریحہ اور فریال کی طرح ہی عزیز تھی۔

ایک آدھ ہفتے میں انٹر کا رزلٹ آنے والا تھا۔

اور انہیں امید ہی نہیں، کامل یقین تھا کہ نمرہ کی اس بار بھی پوزیشن ہی آئے گی۔ وہ اسے ڈاکٹر بنا دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ انو کا بھی خواب تھا۔ مگر شاید انو کا اپنی گھرداری میں پھنس کر وہ خواب دھندلا گیا تھا۔

گیٹ غفور نے کھولا تھا۔ وہ دو روز قبل ہی اسے اپنی آمد کی اطلاع دے چکے تھے۔ وہ تو انہیں لینے کے لئے ایئرپورٹ آنے کے لئے مُصر تھا۔ مگر آفاق صاحب نے اسے منع کر دیا تھا۔ اور اس وقت گیٹ کھولتے ہی وہ آفاق صاحب سے چمٹ گیا تھا۔

''آپ آ گئے صاحب جی!..... اچھا ہوا جو آپ آ گئے۔'' وہ آبدیدہ ہو گیا۔

''ارے غفور میاں! یہ کیا حماقت ہے؟'' آفاق صاحب نے پیار بھرے انداز میں سرزنش کی۔ ''آپ تو مرد ہیں۔ بھلا کبھی مرد بھی روتے ہیں؟''

عنفوانِ شباب کی وادی میں قدم رکھتا غفور ایک دم سے جھینپ گیا تھا۔ آفاق صاحب نے شفقت بھرے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بہت چھوٹی عمر میں اس کا دادا اسے آفاق صاحب کے حوالے کر کے خود اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔ وہ بوڑھا اور بیمار شخص اس بے ماں باپ کے بچے کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھا۔ آفاق صاحب نے نہایت پیار اور اپنائیت سے غفور کی پرورش کی تھی۔ اچھا کھلایا اور اچھا پہنایا تھا۔ اور ساتھ ہی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھوایا تھا۔ اس سال غفور میٹرک کے امتحان میں شامل ہونے والا تھا۔

پورا گھر صاف ستھرا چم چم چمک رہا تھا۔ غفور نے نہایت توجہ اور جانفشانی سے گھر کا خیال رکھا تھا۔ آفاق صاحب نے تحسین آمیز نظروں سے غفور کی طرف دیکھا۔

''واہ غفور میاں! لگتا ہے آپ نے ملیحہ بیگم سے گھر کی صاف صفائی کی جو ٹریننگ لی تھی، ان دنوں میں اس کا خوب استعمال کیا ہے۔''

''نہ صاحب جی! بھلا بیگم صاحبہ کے سلیقے قرینے تک میں کہاں پہنچ سکتا ہوں؟'' غفور نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ گو کہ آفاق صاحب نے بے ساختگی میں ملیحہ بیگم کا ذکر کیا تھا مگر اس ذکر نے بلاوجہ انہیں بھی افسردہ کر دیا تھا۔ اگر آج

وہ زندہ ہوتیں تو یہ گھر اتنا اکیلا، اتنا تنہا کب ہوتا؟
''کھانا لگاؤں صاحب جی؟'' غفور نے اُداسی کے احساس کو مٹانے کے خیال سے سوال کیا۔ ''آج میں نے آپ کے پسندیدہ کھانے بنائے ہیں۔''
''بھئی واہ! کیا بات ہے۔'' آفاق صاحب بے ساختہ ہنس پڑے۔ ''اور سناؤ غفور! محلے پڑوس میں تو سب ٹھیک ہیں نا؟'' کھانے کے دوران آفاق صاحب نے برسبیل تذکرہ غفور سے سوال کیا۔
''جی اللہ کا سب کرم ہے۔'' غفور نے تشکر بھرے انداز میں سر ہلایا۔
''اور انو اور نمو کی کیا خبر ہے؟'' آفاق صاحب کے اس سوال پر غفور کے مسکراتے چہرے پر ایک بے نام سی اُداسی پھیل گئی تھی۔
''نمو بی بی کا تو پتہ نہیں۔'' اس نے دھیمی مگر سنجیدہ آواز میں جواب دیا۔ ''البتہ ابھی ایک آدھ دن پہلے انو بھائی سے ملاقات ہوئی تھی.....تو وہ بتا رہے تھے کہ انہوں نے نمو بی بی کی بات طے کر دی ہے۔''
''کیا.....؟'' آفاق صاحب حیرت زدہ رہ گئے۔ ہاتھ میں تھما نوالہ اُن کے ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ ''بات طے کر دی، کیا مطلب؟''
سمجھ کر بھی وہ اس بات کا مطلب نہیں سمجھ سکے تھے۔
''انو بھائی کی بیوی کا کوئی رشتے کا بھائی ہے.....رشید.....عبدالرشید۔ اسی سے وہ عنقریب نمو بی بی کا بیاہ کرنے جا رہے ہیں۔'' غفور نے تفصیل بتائی۔
''رشید۔'' آفاق صاحب کو یہ نام بہت مانوس سا لگا تھا۔ ذہن کے کسی خوابیدہ گوشے میں شناسائی کی کرن جاگی تھی۔ ''عبدالرشید.....کہیں وہ کنسٹرکشن والے تو نہیں؟.....رشید بلڈرز؟''
''ہاں ہاں۔'' غفور نے پُرزور انداز میں سر ہلایا۔ ''انو بھائی یہی تو بتا رہے تھے کہ ان کا کنسٹرکشن کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ رشید کنسٹرکشن کمپنی کے مالک ہیں۔ بہت بڑے بلڈر ہیں۔ خوب دولت مند ہیں۔''
''اوہ.....'' آفاق صاحب نے ہاتھ میں پکڑا ہوا نوالہ واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔ ''کیا انو نے بتایا کہ رشتہ طے ہو چکا ہے؟''
''جی وہ تو بتا رہے تھے شاید دو چار دن میں نکاح کر کے رخصتی بھی کرنے والے ہیں۔'' غفور نے وضاحت کی۔
''اوہ خدا!'' آفاق صاحب نے سر تھام لیا۔
وہ رشید کو نہ صرف جانتے تھے بلکہ اس کے ایک ایک کارنامے سے بھی واقف تھے۔ تین بار کا شادی شدہ بیالیس ترتالیس سال کا انتہائی اوباش اور بدکردار رشید، بھلا پھول سی نوعمر نمو کے قابل کب تھا؟ اور جہاں تک اس کے کاروبار کا تعلق تھا، وہ اس ڈھول کے پول سے بھی خوب واقف تھے۔ یہ کنسٹرکشن کمپنی تقریباً دیوالیہ ہو چکی تھی۔ مہکار نامی طوائف کے عشق میں گرفتار ہو کر رشید نے اپنا جما جمایا کاروبار خاک میں ملا دیا تھا۔ اب اس کے اکاؤنٹ میں چند لاکھ روپوں سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ ایک چار سو گز کا پلاٹ جس پر وہ پلازہ تعمیر کرنے کے لئے وہ پارٹنر کی تلاش میں تھا۔ وہ پلاٹ بھی اس کی ملکیت نہ تھا بلکہ اس نے اپنی فطری بددیانتی کے تحت اپنے سابقہ سلیمینگ پارٹنر رمضان اللہ ارائیں کا قبضہ کیا ہوا تھا۔ کسی حوالے سے رشید سے اس کا تعارف ہوا تھا اور رشید نے اپنی چرب زبانی سے اس سیدھے سادے شریف انسان کو شیشے میں اُتار لیا تھا۔ اس وقت اس پلاٹ کے علاوہ وہ رمضان آرائیں کے لاکھوں روپوں کا مقروض بھی تھا۔
مگر آج کل وہ لون لے کر پلاٹ پر پلازہ تعمیر کرنے کے بجائے اکاؤنٹ میں پڑی بچی کھچی رقم کو حسنہ کی خوشنودی

حاصل کرنے کے لئے پانی کی طرح بہار ہا تھا۔ اور جلد ہی اُس کی امارت کی یہ عمارت زمین بوس ہونے والی تھی۔
''کیا انو نے رشید کو دیکھا نہیں؟'' آفاق صاحب نے بے یقین لہجے میں سوال کیا۔
''تو دیکھا کیوں نہیں ہوگا۔'' غفور ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''روز تو وہ ان کے گھر آتا ہے...... ایک بار میں نے بھی دیکھا تھا۔'' غفور لحظہ بھر کو چپ ہو گیا۔ ''پر سچی بات ہے صاحب جی!...... وہ لڑکا...... اپنی نمو بی بی کے قابل نہیں ہے۔''
''لڑکا؟'' آفاق صاحب کے لہجے میں سخت احتجاج تھا۔ ''وہ چوالیس سال کا ادھیڑ عمر مرد...... بھلا لڑکا کہلانے کے قابل ہے؟'' انہوں نے بے بسی سے پیشانی رگڑی۔ اچانک ہی ان کے سر میں شدید درد شروع ہو گیا تھا۔ ''آخر اس انو کو ہو کیا گیا ہے؟''
''شاید رشید کی دولت نے ان کی آنکھیں چندھیا دی ہیں۔'' غفور نے اظہارِ خیال کیا۔
''اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے...... کل میں خود اس سے بات کروں گا۔''
اگلے دن آفاق صاحب یونیورسٹی پہنچتے ہی جوائننگ کی فارمیلیٹیز سے فراغت پاتے ہی انو کے ڈیپارٹمنٹ کی طرف گئے تھے۔ مگر پتہ چلا وہ آج یونیورسٹی آیا ہی نہیں تھا۔
آفاق صاحب کو ایک لمحے کو بھی قرار نہ تھا۔ وہ فوراً ہی انو کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ غفور نے بتایا تھا کہ انو دو چار روز میں نمو کا نکاح کر کے رخصت کرنے والا ہے۔ اس لئے لحہ بھر کی تاخیر بھی نقصان دہ ہو سکتی تھی۔ لہذا آفاق صاحب جلد از جلد انو سے رابطہ کر لینا چاہتے تھے۔
دستک کی آواز پر دروازہ نمو نے ہی کھولا تھا۔ ان پر نظر پڑتے ہی لحہ بھر کو تو وہ ساکت ہو گئی تھی۔ اس نے کب سوچا تھا کہ وہ انہیں یوں اچانک اپنے سامنے پائے گی۔
''انکل آپ....؟'' کئی لمحوں بعد اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی تھی۔ ''آپ..... آپ..... کب آئے؟'' آپ ہی آپ اس کی پلکیں بھیگ چلی تھیں۔
''کل رات ہی آیا ہوں۔'' آفاق صاحب نے ان کے سر پر شفقت بھرے انداز میں ہاتھ رکھا۔ ''تم کیسی ہو؟''
''ٹھ...... ٹھیک......'' نمو کی آواز آنسوؤں کے ریلے میں ڈوب گئی۔ مگر اس نے چہرہ پھیر کر اپنے آنسو آفاق صاحب سے چھپا لئے۔
''انو میاں کہاں ہیں؟..... آفاق صاحب نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے سوال کیا۔ ''آج یونیورسٹی تو نہیں گئے...... گھر پر ہی ہیں؟''
''نہیں...... وہ بھابی کے ساتھ...... مارکیٹ گئے ہوئے ہیں۔''
''اوہ۔'' آفاق صاحب نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔ پھر بالکل ہی اچانک ان کے دل میں خیال آیا کہ اس سلسلے میں کیوں نہ نمو سے بات کی جائے۔ کہیں ایسا تو نہیں حسنہ اور انو زبردستی دباؤ ڈال کر نمو کو اس سے شادی پر مجبور کر رہے ہوں۔ ''نمو بیٹا! میں نے ایک خبر سنی ہے۔ کیا اس میں کوئی سچائی ہے؟''
آفاق احمد کے سوال پر نمو نے بے ساختہ پلکیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور انہیں اُس کی بھنور اسی کالی آنکھوں میں کرب کا ایک طوفان سا اُٹھتا محسوس ہوا۔ پر اگلے ہی لمحے اس نے گھنی پلکوں کی چلمن سے اپنے اندر اُٹھتے اس طوفان کو ڈھانپ لیا۔
''نمو! تم جانتی ہو، میں تمہیں فریحہ اور فریال کی طرح ہی اپنی بیٹی سمجھتا ہوں۔'' چند لمحوں تک خاموش رہ کر انہوں نے تمہید کا آغاز کیا۔ ''شاید مجھے پوچھنے کا کوئی حق تو نہیں ہے..... مگر اسی اپنے پن کے ناطے سے تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ

یہ جو تمہاری شادی کی خبر ہے..... کیا درست ہے؟''

نمو نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ بلکہ اس کا جھکا سر کچھ اور جھک گیا تھا۔ آفاق صاحب جانتے تھے، وہ ایک نیک اور باحیا لڑکی ہے۔ اس سوال کا جواب دینا اس کے لئے آسان نہ ہوگا۔ تب ہی دوبارہ گویا ہوئے۔

''نمو! میں جانتا ہوں، مجھے یہ بات تم سے نہیں پوچھنی چاہئے۔ مگر میں تم سے ہی پوچھنے پر مجبور ہوں۔ مجھے بتاؤ..... رشید سے تمہاری شادی کی خبر درست ہے؟''

''جی۔'' اس نے بے حد دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ''مگر آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟''

''یہی تو افسوس کی بات ہے..... کہ میں اسے جانتا ہوں۔'' آفاق صاحب نے متاسف لہجے میں کہا۔ ''اسی لئے تو تم سے کہنے آیا ہوں کہ وہ اس قابل نہیں ہے کہ تمہاری اس سے شادی ہو۔''

نمو نے بھیگی پلکیں اُٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور پلکیں جھکا لیں۔

''جانتا ہوں، تم مجبور ہو۔'' آفاق صاحب نے اس کی آنکھوں کی تحریر پڑھ لی تھی۔ ''پر تم فکر مت کرو۔ میں خود انو سے بات کروں گا۔''

''رہنے دیجئے انکل!'' وہ بہت دھیمی آواز میں بولی۔ ''وہ نہیں مانیں گے..... آپ کی بات بھی جائے گی..... اور پھر یہ کہ..... مجھے تو اس شادی پر..... کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' اس کی لرزتی دھیمی آواز آنسوؤں کے غیر محسوس ریلے میں بہہ گئی۔

آفاق احمد نے بے ساختہ چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''تم شاید رشید کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔'' ان کے بے بس لہجے میں دبا دبا غصہ بھی تھا۔ ''وہ کمینہ انسان اس قابل نہیں ہے کہ تم جیسی کم سن اور اچھی لڑکی کا شریک حیات بنے۔''

نمو کا جھکا سر کچھ اور جھک گیا۔

''نمو! تم ایک پڑھی لکھی ذہین لڑکی ہو..... کوئی بھی تم پر زبردستی نہیں کر سکتا۔ اب زمانہ بہت بدل چکا ہے۔ اب تم اکیلی نہیں ہو..... قانون تمہارے ساتھ ہے۔ اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے کا خود تمہیں حق حاصل ہے..... تم ایک باشعور اور بالغ لڑکی ہو..... میں تمہارے ساتھ یہ ظلم نہیں ہونے دوں گا۔''

''مگر انکل.....!'' نمو گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔ ''میں بخوشی یہ ظلم سہنے کو تیار ہوں..... آپ..... آپ نہیں سمجھ سکیں گے..... بس اتنا سمجھ لیجئے..... اس فیصلے میں..... میری مرضی بھی شامل ہے۔''

'مگر کیوں نمو!..... کیوں.....؟' یہ سوال آفاق صاحب کے دل و ذہن میں ہلچل مچا کر رہ گیا مگر لبوں تک نہ آ سکا۔ وہ حالات کی سنگینی کو سمجھ رہے تھے۔ وہ کئی لمحوں تک سر جھکائے کچھ سوچتے رہے، پھر انہوں نے بے بس نگاہوں سے اس کے جھکے سر اور بھیگی پلکوں کی طرف دیکھا تھا۔ پھر گہری سانس لے کر واپسی کے لئے پلٹ گئے تھے۔

''آفاق انکل!'' نمو بے تابانہ ان کی جانب لپکی تھی اور بے ساختہ ان کے مہربان اور مشفق سینے سے جا لگی تھی۔ آج پہلی بار اُسے پتہ چلا تھا کہ باپ کے شفقت بھرے سینے سے لگ کر کیسا سکون ملتا ہے..... کیسی راحت اور تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔

''میری بچی! ایک بار پھر سوچ لو۔ تم تنہا نہیں ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' آفاق صاحب نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے دھیمی آواز میں اصرار کیا۔

''بس انکل! آپ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھئے گا'' نمو کے اس جملے نے ان کی ہر کوشش کے دروازے پر تالا

ڈال دیا تھا۔ انہوں نے رحم بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، پھر گہرا سانس لے کر بے بس لہجے میں بولے۔
''مجھے افسوس ہے کہ اس رات میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکا..... مگر زندگی کے کسی بھی موڑ پر اگر تمہیں باپ کے سے اس شخص کی ضرورت محسوس ہو تو مجھے آواز ضرور دینا۔''

نمو کا دل چاہا، ایک بار پھر ان کے سینے میں سما جائے اور پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے گزارش کرے کہ اس کنویں میں گرنے سے اسے بچالیں..... وہ رشید سے شادی نہیں کرنا چاہتی..... وہ اس سُولی پر محض اس لئے لٹکنے کے لئے تیار ہو گئی ہے..... کہ اس کی اس بے جان لاش کے بدلے..... اس کے بھائی اور بھابی کے کچھ بے رنگ خوابوں میں رنگ بھر جائے گا..... ان کی کچھ نا آسودہ خواہشیں آسودہ ہو جائیں گی..... مگر وہ یہ سب محض سوچ کر رہ گئی..... اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کر سکی۔ بھیگی بھیگی پلکوں سے انہیں سر نیہوڑائے تھکے تھکے قدموں سے واپس جاتا دیکھتی رہی۔ اور ان کے جاتے ہی وہ دیوار پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ آتے ہی آفاق صاحب نے کیسا سوال کر دیا تھا کہ وہ اپنے آگے کانٹوں میں یوں اُلجھی کہ ان سے فریال کی خیریت کے بارے میں بھی نہ پوچھ سکی۔ مگر اس کے دل کو یقین تھا کہ فریال خیر و عافیت کے ساتھ خوش و خرم ہو گی۔ البتہ اسے ارجمند بانو کی طبیعت کے بارے میں نہ پوچھنے کا ملال تھا۔ جانے وہ اب کیسی ہوں گی۔ البتہ یہ تسلی تھی، وہ ٹھیک نہ ہوتیں تو آفاق صاحب واپس کیونکر آتے۔

❀===❀===❀

کل رات نمو کی شادی کی خبر سن کر ان کے اندر جو بے چینی جاگی تھی، نمو سے مل کر اس بے چینی و بے کلی میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ نمو نے لاکھ کہا تھا کہ انو کے اس فیصلے میں خود اس کی مرضی بھی شامل ہے۔ مگر آفاق صاحب کا دل اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ رشید کی حقیقت اور اس کے کرتوتوں سے خوب اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لئے اس شادی کو روکنا چاہتے تھے۔ وہ پھول سی نازک اور شبنم کی سی پاکیزہ و معصوم نمو کو برباد ہونے سے بچانا چاہتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے اگلے دن انو سے ملنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر پتہ چلا، انو نے کئی دنوں کی چھٹی لی ہوئی ہے۔
''غالباً اس کی بہن کی شادی ہونے والی ہے۔'' انو کے ساتھی نائب قاصد نے آفاق صاحب کو اطلاع دی۔ ''اسی لئے وہ ہفتے بھر کی چھٹی پر ہے۔''
''اوہ۔'' آفاق صاحب نے گہرا سانس لیا۔
انو سے ملنے کے لئے اس کے گھر جانے کے سوا اب کوئی چارہ نہ تھا۔
سو شام کو آفاق صاحب ایک بار پھر انو کے گھر کے دروازے پر کھڑے تھے۔
دستک کی آواز پر اس بار حسنہ نے دروازہ کھولا تھا اور پروفیسر آفاق کو اپنے سامنے پا کر لمحہ بھر کو تو وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ پھر اگلے ہی لمحے اس کی حیرت نے نخوت کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ ماتھے پر بل ڈال کر اس نے ترچھی نظروں سے آفاق صاحب کی طرف دیکھا۔
''جی..... بولیے.....؟''
''وہ..... میں انور میاں سے ملنے آیا تھا۔'' آفاق صاحب سنبھل کر بولے۔
''وہ تو اس وقت مصروف ہیں۔'' حسنہ نے رُوکھے لہجے میں جواب دیا۔ ''کہیے، کیا کہنا ہے؟''
''ٹھیک ہے۔ میں کسی اور وقت آجاؤں گا۔'' آفاق صاحب جانے کے لئے پلٹے۔
''سنیے۔'' حسنہ نے انہیں آواز دی۔ ''اگر آپ ہمارے گھریلو مسئلے پر بات کرنے آئے ہیں تو کان کھول کر سن لیجیے، آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔''

''کیا مطلب.....؟'' آفاق صاحب کے اُٹھتے قدم رک گئے۔

''میں نمو کی شادی کی بات کر رہی ہوں۔'' حسنہ نے دبنگ لہجے میں کہا۔ ''ہم نے اس کا ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں رشتہ طے کر دیا ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

کائیاں حسنہ، آفاق صاحب کا پریشان چہرہ دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ ہو نہ ہو، وہ انو سے نمو کی شادی کے سلسلے میں ہی بازپرس کے لئے آئے ہیں۔

''مگر وہ جو رشید ہے......'' آفاق صاحب نے کچھ کہنا چاہا۔

''وہ میری خالہ کا بیٹا ہے۔'' حسنہ ان کی بات کاٹتے ہوئے تڑخ کر بولی۔ ''اور لاکھوں میں ایک ہے۔ یہ بڑا گھر، یہ بڑی گاڑی...... یہ بڑا کاروبار...... لاکھوں میں کھیلتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات، اس شادی میں خود نمو کی مرضی شامل ہے۔''

آخری جملہ حسنہ نے کچھ اس معنی خیز انداز میں ادا کیا تھا کہ اگر آفاق صاحب، نمو کو اتنی اچھی طرح نہ جانتے ہوتے تو یقیناً وہ بھی یہی سمجھتے کہ یہ کوئی ''لو میرج'' کا چکر ہے۔

حسنہ جیسی جاہل، منہ پھٹ اور بدزبان عورت کے منہ لگنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس لئے آفاق صاحب واپسی کے لئے مڑ گئے تھے۔

⊛===⊛===⊛

سلگتی دوپہر، سہ پہر کی جانب قدم رنجہ تھی۔ دھوپ کی حدت میں قدرے کمی آ گئی تھی۔ ہواؤں میں رچی تمازت بھی کسی قدر کم ہو گئی تھی۔

سلطانہ حسبِ عادت دوپہر کا کھانا کھا کر لاؤنج میں پڑے تخت پر پیر پھیلائے سو رہی تھی۔ تب ہی ایک کوا بالکونی کی گرل پر آ بیٹھا تھا۔ اُس کی تیز کائیں کائیں نے بالکونی سمیت لاؤنج کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔

''ہش..... ہش.....'' سلطانہ نے کسمساتے ہوئے نیند بھری آنکھوں سے کوے کی طرف دیکھ کر ہاتھ اُٹھا کر اسے بھگانا چاہا۔ مگر کوا پھدک کر کچھ اور قریب چلا آیا اور لگا زور زور سے کائیں کائیں کرنے۔

''ارے او چھوٹو!..... ذرا اس منحوس کو تو اُڑا۔ کم بخت دماغ چاٹ گیا۔'' سلطانہ نے کچن کی طرف منہ کر کے چھوٹو کو حکم دیا اور بڑبڑاتے ہوئے کروٹ بدل لی۔ چھوٹو کچن سے نکل کر بالکونی کی طرف چلا۔ اسے دیکھتے ہی کوا منڈیر پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرنے لگا تھا۔

''لگتا ہے کوئی مہمان آنے والا ہے۔'' چھوٹو کوے کو اُڑا کر لاؤنج میں آیا تو سلطانہ آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ بیٹھی تھی۔ وہ اسے مخاطب کر کے خوش دلی سے بولا۔

''اے ہٹ..... ہمارے یہاں کون مہمان آنے لگا؟'' وہ بالوں کو سمیٹ کر چھوٹا سا جُوڑا بناتے ہوئے بولی۔ ''نہ کوئی مائی کا سگا، نہ باپ کا...... سارے ایرے غیرے نتھو خیرے۔ کون اپنا بیٹھا ہے یہاں جو ہمارے گھر آئے گا۔''

''اور وہ..... جو تمہاری رشتے کی بہن رضیہ کی بیٹی ہے، حسنہ.....'' رشید تولیے سے منہ پونچھتا کمرے سے نکلا۔

''سلطانہ خالہ، سلطانہ خالہ کہتے اس کی زبان نہیں سوکھتی۔''

''ارے یہ سب منہ دیکھے کی باتیں ہیں۔'' سلطانہ نے برا سا منہ بنایا۔

رشید کو لاکھانی کا انتظار تھا۔

حسنہ کے ساتھ جمع جوڑ اور نکاح کی تاریخ رکھ لینے کے بعد آج رشید نے ماں سے تذکرہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

''السلام علیکم!'' تب ہی لاکھانی اونچی آواز میں سلام کرتا لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔

''ارے آؤ.....آؤ لاکھانی بھائی!'' رشید نے پُرجوش انداز میں اس کا استقبال کیا۔ ''آج اس وقت کیسے؟''

''میں تو روز ہی اسی وقت اماں جی کو سلام کرنے آتا ہوں۔'' لاکھانی نے چاپلوسی سے دانت نکوستے ہوئے سلطانہ کی طرف دیکھا، پھر رشید کو مخاطب ہو کر بولا۔ ''البتہ آج آپ اس وقت گھر میں کیسے دکھائی دے رہے ہو؟''

''بس اماں کو ایک خبر دینی تھی۔'' رشید، ماں کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ خبر کے نام پر سلطانہ نے چونک کر رشید کی طرف دیکھا تھا۔

''کیسی خبر؟''

''لاکھانی بھائی! تم ہی بتاؤ نا؟'' رشید نے لاکھانی کو ٹہوکا دیا۔

''اچھا اچھا.....آپ کو سرم آ رہی ہے۔'' لاکھانی بھونڈے انداز میں ہنسا۔ ''بے سک چوتھی سادی کی بات ہووے، مگر ہے تو بات سادی کی.....''

''شادی کی بات؟'' سلطانہ کا اب کے تخاطب لاکھانی تھا۔

''جی اماں جی!......آپ سے یہ کہنا تھا کہ.....اپنے رسید بھائی ایک بار پھر گھر بسانا چاہتے ہیں......اور اسی لئے......''

''کیا......؟'' سلطانہ نے درمیان میں ہی لاکھانی کی بات کاٹتے ہوئے چیختی آواز میں سوال کیا تھا۔ ''رشید پھر سے گھر بسانا چاہتا ہے......کیا مطلب؟''

''مطلب تو صاف ہے اماں جی!'' لاکھانی ہاتھ اٹھا کر قدرے حیرانی سے بولا۔ ''رسید بھائی سادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''اُس کلموہی چڑیل سے، جس کا اس سے چکر رہا تھا؟'' سلطانہ نے غصیلی آواز میں اور دل جلے انداز میں سوال کیا۔

''ارے وہ نئیں اماں جی!'' لاکھانی سٹپٹا کر بولا۔ ''وہ چکر تو کب کا ختم بھی ہو چکا.....اب کے تو رشید بھائی نے کمال ہی کر دیا۔ ایسی ہیرے جیسی دُلہن چنی ہے کہ آپ بھی دیکھو گی تو حیران ہو جاؤ گی۔''

''میں بھی تو سنوں.....وہ ہیرے جیسی ہے کون؟''

''ارے اماں! تم جانتی تو ہو......'' رشید نے دُلار سے اپنا ہاتھ ماں کے کاندھے پر رکھا۔

''کون.....وہ حسنہ؟'' سلطانہ نے منہ کھول کر سوال کیا۔

''لاحول ولاقوۃ۔'' رشید نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ''حسنہ تو شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں ہے۔ اور دوسرا ہونے والا ہے.....میں حسنہ کی نہیں، اس کے میاں انو کی بہن نمو کی بات کر رہا ہوں۔''

''حسنہ ہو یا نمو.....'' سلطانہ ہاتھ نچا کر بولی۔ ''یہ جھونپڑ پٹی کی ساری لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں.....بھر پائی میں ایسی بہو سے.....''

''ارے اماں جی!.....نمو بھین کیا لڑکی ہے.....نیک، معصوم، بے جبان.....آپ کی ایسی کھدمت کرے گی کہ آپ بھی یاد کرو گی۔ کھانا پکا کے کھلاوے گی اور رات کو پاؤں بھی دباوے گی۔''

''اے.....ایسی خدمت گزار کون مل گئی؟.....ذرا میں بھی تو دیکھوں۔'' سلطانہ نے ٹھوڑی پر اُنگلی رکھ کر طنزیہ نظروں سے لاکھانی کی طرف دیکھا۔

''یہی تو میں بول رہا ہوں۔'' لاکھانی جلدی سے بولا۔ ''جمعہ کو عصر مگرب (مغرب) کے درمیان رسید بھائی کا نکاح ہے.....آپ بھی ساتھ چلنا.....اور اس چندے آفتاب چندے ماہتاب لڑکی کو دیکھنا۔''

''ہیں......نکاح کا دن، تاریخ بھی طے ہو گیا.....اور تم لوگ مجھے اب بتا رہے ہو؟'' سلطانہ نے آنکھیں نکالیں۔
''جب سب کچھ خود ہی بالا ہی بالا کر لیا ہے تو اب نکاح کر کے رخصتی کروا کر بھی لے آؤ.....میں نہیں جانے والی۔''
''ارے اماں! تم بھی نا.....'' رشید نے بازو سلطانہ کے گرد لپیٹ کر اسے خود سے لگاتے ہوئے پیار سے کہا۔ ''دس بار تو تمہیں بتانے کی کوشش کی.....مگر تم ہو کہ موقع ہی نہیں دیتیں......اسی لئے اب بتا رہے ہیں۔ تم ساتھ نہیں چلو گی تو تمہاری بہو کیسے آئے گی؟''
''بھر پائی میں بیٹے سے بھی.....اور ان روز روز کی بہوؤں سے بھی.....شادی نہ ہوئی، کھیل تماشا ہو گیا۔ جب دیکھو شادی کے لئے اتاؤلے کھڑے ہیں۔''
''بس اماں! اب یہ آخری بار ہے۔'' رشید نے جلدی سے کہا۔ ''چاہو تو لاکھانی سے بھی گواہی لے لو۔''
''سچی اماں جی!'' لاکھانی نے حلفیہ انداز میں ہاتھ اٹھایا۔ ''رسید بھائی نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ بس یہ آکھری بار سادی ہو رہی ہے.....اور سچی بات تو یہ ہے، نمو بھین ہے ہی اتنی اچھی کہ اسے پانے کے بعد کوئی انسان کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔''
سلطانہ نے چونک کر رشید کی طرف دیکھا۔ نمو کے نام پر اس کی کچی کچی آنکھوں سے عجیب سی محبت پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ سلطانہ کا ایک دم سے ماتھا ٹھنکا۔ جو لڑکی گھر آنے سے پہلے ہی رشید کے دل و دماغ پر اس قدر حاوی تھی، گھر آنے کے بعد اس کا جادو کس قدر نہ سر چڑھ کر بولتا......سلطانہ کو خطرے کی گھنٹی بجتی سنائی دے رہی تھی۔
''بس اماں! اب تم جلدی سے بارات میں پہننے کے لئے ایک اچھا سا جوڑا سلوا لو۔'' رشید نے ماں کے سر سے اپنا سر لگاتے ہوئے لاڈ سے کہا۔
''بارات.....؟'' سلطانہ نے گھور کر دیکھا۔
''ارے ماں بارات کیا.....تم سمیت دو چار لوگ چلیں گے......ایک قاضی، دو گواہ......اور بھلا کون ہو گا؟'' رشید نے لہجے کو حتی الوسع سرسری بناتے ہوئے ماں کی تشفی کی کوشش کی۔
''اور لڑکی کے لئے کچھ تیاری نہیں کرنی؟'' سلطانہ نے نروٹھے لہجے میں سوال کیا۔
''وہ سب تو جانے کب سے حسنہ کر رہی ہے۔'' بے خیالی میں رشید کے منہ سے نکلا۔
''اچھا.....تو یوں کہہ نا کہ جانے کب سے تیاری کے نام پر حسنہ تجھے لوٹ کر کھا رہی ہے۔''
''ارے اماں! خدا کو مانو.....ایسا کچھ نہیں ہے۔'' رشید ہڑبڑا کر بولا۔ ''کہیں تم حسنہ کے سامنے یہ نہ کہہ دینا......وہ بھی پھر تمہاری بھانجی ہے......اتنا سمجھ لو۔''
''اے مجھے کچھ نہیں سمجھنا سمجھانا۔'' سلطانہ بیزاری سے ہاتھ جھٹک کر بولی۔ ''بھاڑ میں گئی حسنہ اور چولہے میں گئی بارات۔''
''تو تم بارات میں نہیں چلو گی؟'' رشید نے تیوری پر بل ڈال کر سوال کیا۔
''میری جاتی ہے جوتی۔'' سلطانہ نے تنک کر جواب دیا۔
رشید چند لمحوں تک ماں کو گھورتی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر غصیلی آواز میں بولا۔
''بارات بھی جائے گی اور دُلہن بھی آئے گی۔ تم جاؤ یا نہ جاؤ، تمہاری مرضی۔'' وہ پاؤں پٹختا اندر کمرے میں چلا گیا تھا۔ یونس لاکھانی خاموشی سے بیٹھا ماں بیٹے کی گرما گرمی سن رہا تھا۔ رشید کے اندر جاتے ہی وہ سلطانہ کی طرف متوجہ ہوا۔
''اماں جی!.....آپ اتنی ہوسیار ہو کر بھی کیسی بات کر رہی ہو؟'' اس نے نرم لہجے اور سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"آپ نہیں بھی جاؤ گی تو جو ہونا ہے، وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔ پر جرا سوچو! آپ کی آنے والی بہو کی نجر میں آپ کا کیا مقام رہ جائے گا، جب اُسے پتہ چلے گا کہ آپ اس شادی پہ کھوس (خوش) نہیں ہیں۔"

"اے آگ لگے ان روز روز کی شادیوں کو۔" سلطانہ دل جلے انداز میں بولی۔ "جب سنو شادی، جب دیکھو شادی...... مجھے نہیں جانا۔"

"آپ کی مرجی (مرضی) مگر...... میرا مسورہ تو یہ تھا کہ آپ چلتی تو اچھا تھا...... آکھر کو اس لڑکی کے ساتھ ہی گجارہ کرنا ہے...... پھر کھاندان کی بات ہے...... لڑکی تو آپ کے رستے داروں میں سے ہی ہے...... بلکہ آپ کو تو کھوس ہونا چاہئے کہ اب کے رسید بھائی نے کسی اداکارہ، ماڈل یا ایسی ویسی لڑکی کے بجائے ایک سریف گھریلو لڑکی کا انتکھاب (انتخاب) کیا ہے۔"

سلطانہ خاموشی سے جھکائے سوچ رہی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ رشید کی روز روز کی شادیوں اور آنے والی بہوؤں سے عاجز ہو چکی تھی۔ وہ رشید کے ساتھ اس طرح کی زندگی سے بے حد خوش تھی۔ اپنی اس مطمئن اور مسرور زندگی میں وہ پھر کسی آفت کی پرکالہ کو برداشت کرنے کو تیار نہ تھی اسی لئے اُس نے اپنے تئیں یہ سوچ رکھا تھا کہ اب کبھی بھی رشید کی شادی نہ ہونے دے گی۔ وہ اپنی راجدھانی میں اب کسی کی شرکت گوارا کرنے کو آمادہ نہ تھی۔ مگر اسے کیا کہئے، بدقسمتی پھر اس کے دروازے پر دستک کناں تھی۔ لاکھ احتیاطی تدابیر اور روک تھام کے باوجود رشید پھر کسی کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا تھا۔ بات بھی طے ہو گئی تھی۔ بس نکاح کی تقریب اور رخصتی باقی تھی۔ سلطانہ اپنی اوقات سے واقف تھی۔

یہ درست تھا کہ رشید اس سے محبت کرتا تھا، اس کے آرام و آسائش کا خیال رکھتا تھا۔ مگر جہاں اس کی خواہشات کی حدیں شروع ہوتی تھیں، وہاں وہ کسی کا بھی لحاظ نہیں کرتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ جائے یا نہ جائے، رشید اپنی من مانی کر کے رہے گا۔ اور اس کے لاکھ نہ چاہنے کے باوجود آنے والی آ کے رہے گی۔ سو اس نے سوچا، عزت اسی میں ہے کہ وہ بڑی بن کر بارات کے ساتھ چلی جائے تاکہ آنے والی پر یہ احسان رکھا جا سکے کہ تجھے میں بیاہ کر لائی ہوں۔

اور دو روز بعد ہی دو گواہ، ایک مولوی، ماں اور لاکھانی کے ساتھ مختصر سی بارات لے کر رشید انو کے دروازے پر موجود تھا۔ حسنہ نے محض کوکا کولا کا تکلف کیا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ باراتیوں کو کوک بھی نہ پلاتی۔ نکاح سے قبل حسنہ نے پورے تین لاکھ کیش وصول کر لئے تھے۔

مولوی رجسٹر اور فارم ہاتھ میں لئے ایجاب و قبول کے لئے نمو کے کمرے میں داخل ہوا۔ گہرے عنابی رنگ کے سلمہ دبکے کے نازک سے کام کے سوٹ میں اس کا سوگوار چہرہ چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ رو رو کر سوجی ہوئی سرخ آنکھیں اور لرزیدہ لب اُس کی بے بسی و بے کسی کی کہانی سنا رہے تھے۔ مگر وہاں ایسا کوئی بھی نہ تھا جو اس کے درد کو سمجھ سکتا۔ اس لمحے اُسے نصیبن خالہ ٹوٹ کر یاد آئی تھیں۔ ملیحہ آنٹی، فریحہ آپی، فریال اور آفاق انکل، کوئی بھی تو اس کے قریب نہ تھا۔ اور وہ بھائی جو اُسے جان سے بھی زیادہ پیارا تھا...... اس کے قریب ہو کر بھی بے حد دُور ہو چکا تھا۔ اب وہ تنہا تھی...... صحرا میں بھٹکتے، شاخ سے ٹوٹے خشک پتے کی مانند...... ہوا کے رحم و کرم پر منزل سے دُور اور بے خبر۔

"نورِ چشمی نمرہ علی بنتِ اکبر علی! آپ کو مسمی عبدالرشید ولد عبدالمجید سے عقد، بعوض مہر شرعی قبول ہے؟" مولانا کی پاٹ دار آواز پر نمو کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا اور اس نے یکایک دروازے کے باہر سامنے صحن میں بیٹھے رشید کی طرف دیکھا تھا۔ پہلی نظر میں یہ شخص اُسے کس قدر برا لگا تھا اور آج وہ اس کی قسمت کا مالک بننے جا رہا تھا۔ بالکل اچانک ہی اُس کے ذہن کے پردے پر ایک چہرہ جگمگانے لگا۔ دو گہری اور خمار میں ڈوبی آنکھیں اور بے حد شائستہ لہجہ اور مسحور کن آواز...... یہ چہرہ، یہ آنکھیں، یہ آواز بارہا اسے ڈسٹرب کرتی رہی تھی اور اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی یہ

یادِ روزِ اوّل کی طرح تازہ تھی...... مگر آج...... اُسے اس یاد کو ہمیشہ کے لئے نسیان کے گورستان میں دفن کرنا تھا۔

مولوی صاحب نے اس کے ہاتھ میں قلم تھما دیا۔ اور اُس نے اپنے تصور میں جاگزیں چہرے کو ہمیشہ کے لئے ذہن ودل سے جھٹک کراپنی سب وفائیں، محبتیں اور حقوق رشید کے نام لکھ دیئے۔ نکاح کے بعد سلطانہ کمرے میں دلہن کو دیکھنے آئی تھی۔ اور اس معصوم، نوعمر اور حسین لڑکی کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ حسنہ کو دیکھتے ہی اسے اس کی چالا کی اور عیاری کا اندازہ ہوگیا تھا۔ اور اب نمو کو دیکھ کر اسے یقین ہوگیا تھا کہ حسنہ نے اس حسین گڑیا کو رشید کے حوالے ایسے ہی نہیں کر دیا۔ یقیناً ایک موٹی رقم وصول کی ہوگی۔

نمو کو رخصت کروا کر اپنے گھر لاتے وقت رشید بے حد خوش تھا۔

نمو پر پہلی نگاہ پڑتے ہی وہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا تھا۔ اس پل اُس نے کب سوچا تھا کہ اتنی جلد وہ حُسن کے اس خزانے کا مالک بن جائے گا...... اُس کے چہرے سے پھوٹتی خوشی دیکھ دیکھ کر سلطانہ کُڑھ رہی تھی۔ گو کہ نمو کو دیکھ کر وہ خاصی مطمئن ہوئی تھی۔ وہ نوعمر، سیدھی سادھی، معصوم سی لڑکی تھی، جسے دبا کر رکھنے میں اسے کوئی مشکل نہیں پیش آسکتی تھی۔ اس کے باوجود رشید کا دیوانہ پن اسے ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔

آج وہ بہت خوش تھا۔ اسی لئے آج اس نے ضرورت سے زیادہ چڑھائی تھی۔ رشید بہت کم عمری سے ہی شراب کا عادی ہوگیا تھا اور روز رات کو پیئے بغیر سو نہیں سکتا تھا۔ سو وہ نشے میں لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا تھا جہاں نمو اس کی راہ تک رہی تھی۔

بستر کے قریب پہنچ کر وہ کئی لمحوں تک حیران اور بے یقین نظروں سے نمو کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ ''تم جانتی ہو اس وقت تم کتنی حسین لگ رہی ہو...... تم...... میں نے بے شمار حسین چہرے دیکھے ہیں مگر تم جیسا ایک چہرہ بھی نہیں دیکھا...... تم سب سے الگ، سب سے حسین ہو۔''

اُس کے لڑکھڑاتے قدم، بہکی آواز اور منہ سے نکلتے شراب کے بھبکے...... نمو اپنی جگہ لرز کر رہ گئی۔ ''آ...... آپ نے شراب پی ہے...... آپ نشے میں ہیں؟'' اس کے منہ سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

''شراب تو روز پیتا ہوں۔'' رشید لہرا کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ''مگر اس وقت یہ نشہ شراب کا نہیں ہے...... یہ تمہارے بے پناہ حُسن کا نشہ ہے۔''

اس نے آگے بڑھ کر نمو کا ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''نمو!...... نمو! تم جانتی ہو...... تمہیں پہلی بار دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کرلیا تھا...... کہ تمہیں حاصل کرنا ہے...... اور دیکھو! آج تم میرے پاس ہو...... میرے گھر میں...... میرے بیڈ روم میں۔'' اُس نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پر دھرا لیمپ آف کر دیا تھا۔ کمرے میں سرد اور اذیت ناک اندھیرا پھیل گیا تھا جس نے نمو کے دل وجسم کے ساتھ روح کو بھی نگل لیا تھا۔

❁===❁===❁
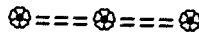
رات کی سیاہی در و دیوار پر پھیلی ہوئی تھی۔ رات کا سناٹا گھور اندھیرے کے ساتھ مل کر ایک عجب سا احساس جگا رہا تھا۔ وجاہت صاحب کے کشادہ اور پُرآسائش بیڈ روم میں پھیلی نائٹ بلب کی سبز خوابیدہ روشنی، تاریکی کے احساس کو گھٹانے کے بجائے مزید بڑھا رہی تھی۔ پچھلی دیوار پہ قدرے بلندی پر نصب اسپلٹ بے آواز ٹھنڈک کی لپٹیں کمرے کی خاموش فضا میں پھیلا رہا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر آویزاں قیمتی، خوش رنگ پردے ساکت تھے اور ہر سمت ایک افسردہ اور بے کل سی خاموشی لرزیدہ تھی۔

اسد کو گھر چھوڑ کر گئے کئی مہینے بیت چکے تھے۔اس کا اس طرح گھر والوں کو چھوڑ کے جانا کسی سانحہ سے کم نہ تھا۔ لاکھ اختلافات کے باوجود وجاہت مرزا کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اسد اتنا بڑھ قدم بھی اٹھا سکتے ہیں۔اسد کا اس طرح سے گھر چھوڑ کر چلے جانا، ان کے دل کو ریزہ ریزہ کر گیا تھا۔مگر انہوں نے کسی پر بھی اپنے دل کی اس کیفیت کا اظہار نہ ہونے دیا تھا اور نہایت مضبوطی اور سختی سے اپنے موقف پر ڈٹے رہے تھے۔اور اسد کا یہ غیر یقینی اور غیر متوقع فیصلہ بھی انہیں اپنی جگہ سے ہلا نہ سکا تھا۔گو کہ عاتکہ بیگم ذہنی طور پر اس حادثے کے لئے تیار تھیں۔وہ اسد کی ضدی طبیعت اور ہٹ دھرمی سے خوب واقف تھیں اس کے باوجود اسد کے جانے کے بعد وہ ٹوٹ سی گئی تھیں۔یہ سچ تھا کہ اسد کی نسبت سرمد ان کے زیادہ قریب تھے مگر رشتہ تو اسد سے بھی تھا۔مگر وہ کرتی بھی کیا؟.....نہ بیٹے پہ اختیار تھا، نہ پوتے کو سمجھا سکتی تھیں۔سو خاموشی کا زہر پی کر انہوں نے اپنے دل کو مار لیا تھا۔

وجاہت مرزا نے گو کہ کسی پہ ظاہر نہ ہونے دیا تھا، مگر حقیقت یہی تھی کہ وہ اندر سے ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ایک جواں سال بیٹے کی جدائی کا غم تھا، جسے شاید وہ اپنی ہٹ دھرمی کے باعث سہہ بھی لیتے......گر دوسرا دکھ انہیں اندر سے کرچی کرچی کر گیا تھا اور وہ تھا انا کی شکست کا دکھ۔انہیں پوری دنیا میں سب سے زیادہ ندرت جہاں سے نفرت تھی.....اور آج اسی ندرت جہاں سے جنگ میں انہوں نے شکست فاش پائی تھی اور اپنا جواں سال فرمانبردار بیٹا کھو دیا تھا۔ندرت جہاں جیت گئی تھی۔اور وہ بری طرح ہار گئے تھے۔اس ہار نے ان کے اندر کے متکبر اور ضدی انسان کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔یہ شکست رفتہ رفتہ انہیں گھن کی طرح چاٹ رہی تھی۔اور دو روز قبل ان پر فالج کا شدید اٹیک ہوا تھا۔

وجاہت مرزا ہمیشہ سے ہی قابلِ رشد صحت کے مالک تھے۔مگر سطوت جہاں سے شادی اور ازدواجی مسائل میں گھر کر ان کی صحت خاصی متاثر ہوئی تھی۔ماں کی بے قدری اور بے زبانی اور اپنی بے بسی و بے کسی پر ان کا دل بہت کڑھتا تھا۔وہ ندرت جہاں کو اپنی تمام پریشانیوں کی جڑ ماننے کے باوجود اسے اپنے گھر آنے سے نہیں روک سکتے تھے۔ اور جب ہی وہ سطوت جہاں سے مل کر جاتی تھی۔گھر میں ایک طوفان سر اٹھاتا تھا جو عاتکہ بیگم اور ان کا بچا کھچا سکون بھی بہا کر لے جاتا تھا۔ان باتوں نے ان کی صحت پر بے حد منفی اثر ڈالا تھا۔پھر سطوت جہاں کی حادثاتی موت نے انہیں سر تا پا لرزا کر رکھ دیا تھا۔لاکھ اختلافات تھے مگر تھیں تو وہ ان کی شریکِ حیات، ان کے بیٹوں کی ماں۔اور انہوں نے انہیں دل کی تمام تر گہرائیوں اور سچائیوں کے ساتھ چاہا تھا۔سطوت جہا کی اچانک موت، وجاہت مرزا کے لئے کسی جانکاہ حادثے سے کم نہ تھی۔مگر کم عمر بچوں اور بوڑھی ماں کی خاطر انہوں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔مگر ہائی بلڈ پریشر کے مریض ہو کر رہ گئے تھے۔

اور اب اسد کی روانگی کی صورت میں ان کی زندگی کا یہ دوسرا حادثہ رونما ہوا تھا۔سطوت بیگم دنیا چھوڑ گئی تھیں۔اور اسد گھر تیاگ گئے تھے۔

وجاہت مرزا کے لئے یہ دونوں باتیں ایک ہی معنویت کی حامل تھیں۔اور ان دونوں جانے والوں کا دُکھ ایک سے انداز میں ان کے دل پر اثر انداز ہوا تھا۔اور بظاہر وہ سطوت جہاں کا بھی دکھ جھیل گئے تھے اور اسد کا بھی۔

مگر اندر اندر یہ دونوں دُکھ انہیں دیمک کی طرح چاٹ رہے تھے۔

اور دو روز قبل ان پر فالج کا شدید اٹیک ہوا تھا۔

اتفاق سے سرمد اس وقت گھر میں ہی موجود تھے، جب نکیتا بھاگتی ہوئی ان کے پاس آئی تھی۔

''سرمد بھیا!......ابا جان......ابا جان......'' مارے گھبراہٹ کے اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، ہاتھ پیر لرز رہے تھے۔وہ نکیتا کی کیفیت دیکھ کر گھبرا گئے تھے۔

''کیا ہوا نگو؟...... کیا ہوا؟'' وہ ہڑبڑا کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ''کیا ہوا ابا جان کو؟''
''اُن...... اُن کی طبیعت...... جانے کیا ہوا انہیں...... جلدی چلئے۔'' نگیتا، سرمد کا ہاتھ پکڑ کر وجاہت مرزا کی خواب گاہ کی طرف کھینچتے ہوئے بولی۔ ''میں ان کے کمرے میں شام کی چائے لے کے گئی تھی...... اور...... وہ......''
وجاہت مرزا کے بیڈ روم کی طرف تقریباً بھاگتے ہوئے جاتے ہوئے نگیتا نے چڑھی ہوئی سانسوں کے درمیان بتانے کی کوشش کی تھی۔ مگر سرمد شاید کچھ نہیں سن رہے تھے۔ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے باپ کے کمرے میں داخل ہوئے تھے اور وہاں انہوں نے جو منظر دیکھا تھا، اس نے لمحہ بھر کو انہیں سُن کر کے رکھ دیا تھا۔
اور اگلے آدھے گھنٹے میں وہ ایمبولینس میں باپ کو لئے شہر کے سب سے بڑے ہسپتال پہنچ چکے تھے۔ اور ہسپتال پہنچتے ہی ڈاکٹرز اپنی سی کوششوں میں لگ گئے تھے۔
عاتکہ بیگم کو انہوں نے سرسری سے انداز میں محض بلڈ پریشر ہائی ہو جانے کی خبر دی تھی۔
''سب ٹھیک ہے نا سرمد؟'' عاتکہ بیگم نے سینے پر ہاتھ رکھ کر بے تابانہ لہجے میں پوچھا تھا۔ ''یہ نگیتا بھی کچھ نہیں بتا رہی...... میرا دل بہت گھبرا رہا ہے بیٹا!''
سرمد نے نگیتا کو بھی سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ اماں بی کو کچھ نہ بتائے۔ جانتے تھے، اکلوتے بیٹے کی بیماری کی خبر ان کا بوڑھا زخم خوردہ دل نہ سہہ سکے گا۔ اس لئے ہسپتال سے فون کر کے مطمئن انداز میں انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔
''آپ اطمینان رکھیے اماں بی!...... بابا جان بالکل خیریت سے ہیں۔ اور ہم شام تک...... یا کل دوپہر تک گھر آ جائیں گے۔''
''سرمد!..... وجاہت میاں خیریت سے تو ہیں نا؟'' عاتکہ بیگم کے لہجے میں خدشات لرز رہے تھے۔ ''خدا انہیں اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ میرا دل بہت بے چین ہے بیٹا! مجھ سے کچھ نہ چھپانا۔''
''نہیں ماں بی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' جھوٹ بولنا کتنا مشکل کام ہے، آج سرمد کو احساس ہو رہا تھا۔ ''ابا جان ٹھیک ہیں...... بس آپ ان کے لئے دعائیں کریں۔ انہیں آپ کی دعاؤں کی بے حد ضرورت ہے۔''
سرمد نے فون بند کر دیا تھا۔ اسی لئے وہ عاتکہ بیگم کی سسکیاں نہیں سن سکے تھے۔ کیونکہ خود ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ آنسوؤں کا گولا گلے میں اٹک گیا تھا۔
اب تک وہ ہمیشہ ہی وجاہت مرزا کو انتہا پسند اور ضدی گردانتے آئے تھے۔
پسند کی شادی ہر بالغ اور باشعور انسان کا شرعی اور انسانی حق ہے...... کیا ہوتا اگر وہ اسد کی پسند کو تسلیم کر کے ثروت سے انہیں شادی کی اجازت دے دیتے۔ مگر آج ان کی یہ حالت دیکھ کر ان کا دل پہلی بار اسد اور ثروت کی طرف سے بدزبان ہو رہا تھا۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا......
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا......

کون سی قیامت آ جاتی اگر اسد، باپ کے حکم کے سامنے سر جھکا دیتے؟
ثروت ہم سفر نہ بھی بنتی تو زندگی کا سفر تو چلتا ہی رہتا۔ کم از کم ان کے گھر کا سکون تو برباد نہ ہوتا۔ اور اماں بی اور وجاہت مرزا کے دل و دماغ کی یہ کیفیت تو نہ ہوتی۔ آج وجاہت مرزا کو بے حس و حرکت بستر پر پڑے دیکھ کر وہ سمجھ سکتے تھے کہ اسد کے گھر چھوڑ جانے کے حادثے کو ان کے دل نے کس قدر باریکی سے قبول کیا تھا۔ بظاہر مضبوط، ہٹ دھرم اور متکبر نظر آنے والے وجاہت مرزا اندر سے اس طرح ٹوٹ پھوٹ چکے تھے کہ بیماری کا ایک معمولی سا ریلا ان کے وجود

جنبش کرنے کی توانائی تک بہا کر لے گیا تھا۔ اور اب وہ اپاہج کی صورت بستر پر پڑے تھے۔ چلنے پھرنے کے علاوہ بات کرنے کی صلاحیت بھی مفقود ہو کر رہ گئی تھی۔

''ڈاکٹر! ابا جان ٹھیک تو ہو جائیں گے؟'' یہ سوال وہ کم و بیش پچاس بار کر چکے تھے۔ اور وجاہت مرزا کے دیرینہ واقف کار اور فیملی ڈاکٹر، سرجن سرفراز، ہر بار اُنہیں پُرتشویش لہجے میں تشفی دے چکے تھے۔

''اللہ سے اچھی اُمید رکھیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا..... بہتر ہو گا، آپ اسد میاں کو بھی بلوا لیجئے۔'' ڈاکٹر سرفراز کے مشورے سے قبل بھی کئی بار سرمد کو اسد کا خیال آیا تھا۔ مگر لاکھ روشن خیال اور حقیقت پسند ہونے کے باوجود جانے کیسے اور کہاں سے ان کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا تھا کہ وجاہت مرزا کی اس حالت کے دراصل اسد ہی ذمے دار ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ اسد اگر آئے تو شاید وجاہت مرزا یہ بات پسند نہیں کریں گے۔ مگر ڈاکٹر کے کہنے پر انہوں نے اسد سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''اسد بھائی!'' بھائی کی آواز سنتے ہی آپ سے آپ اُن کی آواز بھرّا گئی تھی۔

''کیا ہوا سرمد؟'' اسد بے قرار ہو کر پوچھ رہے تھے۔ ''سب ٹھیک تو ہے؟..... اماں بی، ابا جان؟''

''ابا جان.....'' سرمد کی آواز نمی میں ڈوب گئی۔

''کیا ہوا ابا جان کو؟'' اسد لرز اُٹھے۔ ''وہ خیریت سے تو ہیں نا؟''

''وہ..... آغا خان ہسپتال میں ہیں۔'' سرمد کے لئے کس قدر مشکل تھا، باپ کی حالت کو ایکسپلین کرنا۔

''اوہ..... میں ابھی آتا ہوں۔'' اسد نے عجلت میں کہہ کر فون رکھ دیا تھا۔

''کیا ہوا.....؟'' ثروت گہری نظروں سے میاں کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی۔ اور سامنے لاؤنج میں بیٹھی ندرت جہاں بھی تمام گفتگو سن رہی تھیں۔ اسد کی یکطرفہ گفتگو پوری طرح تو سمجھ میں نہ آ سکی تھی، البتہ یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وجاہت مرزا بیمار ہیں اور غالباً ہسپتال میں ہیں۔

''ابا جان کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔'' اسد نے جواب دیا۔ ان کے لہجے میں گھبراہٹ عیاں تھی۔

''تو.....؟'' ثروت کے لہجے میں ایک دم سے نخوت اُتر آئی تھی۔

اسد سے محبت کا تعلق قائم ہوتے ہی اس نے ''وجاہت منزل'' میں راج کرنے کے خواب دیکھے تھے۔ محل نما گھر، درجنوں بیش قیمت گاڑیاں، نوکر چاکر، شاہانہ زندگی..... اور ان خوابوں کے خزانے پر وجاہت مرزا ناگ بن کر بیٹھ گئے تھے۔ اُس کے ان انمول و نایاب خوابوں کی تعبیر، یہ چار کمروں کا اپارٹمنٹ اور سیکنڈ ہینڈ گاڑی کی شکل میں سامنے آئی تھی۔ جب جب وہ کرب کی منزل سے گزرتی، اس کے دل میں وجاہت مرزا کے لئے شدید نفرت کروٹیں بدلنے لگتی تھی۔ اور اس پل ان کی بیماری کی خبر سن کر اس کے دل کو یک گونہ خوشی ملی تھی۔ وہ اس شخص کو اذیت اور کرب میں دیکھنا چاہتی تھی، جس نے اپنی ایک بے جا ضد کی وجہ سے اس سے زندگی کی ساری راحتیں اور مسرتیں چھین لی تھیں اور وہ بھی اپنی ذات سے انہیں کوئی خوشی ہیں دینا چاہتی تھی۔ اسی لئے اسد کو ہسپتال جانے کے لئے تیار دیکھ کر اس نے منہ بنا کر کہا تھا۔

''وہ ہسپتال میں ہیں تو اچھی بات ہے..... طبیعت خراب ہو تو ہسپتال جانا ہی پڑتا ہے۔ مگر آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''ہسپتال۔'' اسد نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ انہیں ثروت کا طنزیہ انداز پسند نہیں آیا تھا۔

''مگر آپ جانتے تو ہیں، وہ آپ کی صورت سے بیزار ہیں۔'' ثروت نے پینترا بدل کر کہا۔ ''آپ کو دیکھ کر ان کی طبیعت مزید بگڑ گئی تو.....؟''

''یہ تو ہے۔'' فروا کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ کئی لمحوں سے دروازے میں کھڑی بہن اور بہنوئی کی بات سن رہی تھی

اور ثروت کی بات کا مفہوم بھی سمجھ رہی تھی۔ وہ خود بھی ثروت سے کم منتقم مزاج نہیں تھی۔ مگر وہ ماں اور بہن سے کچھ زیادہ سمجھ دار تھی۔ اور چونکہ وہ ابھی پوری طرح سرمد کو حاصل نہ کر سکی تھی، اس لئے بھی سمجھ داری کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔

''لیکن ثروت! سوچو تو..... خالو جان ہسپتال میں ہیں۔ اس کا مطلب ہے، طبیعت کچھ زیادہ ہی تشویش ناک ہے۔''

''ہاں، سرمد بتا رہے تھے، پیرالائنز اٹیک ہوا ہے۔'' اسد جلدی سے بولے۔

''تو ایسے میں اسد بھائی کا جانا بے حد ضروری ہے۔'' فروا نے اپنا فیصلہ سنایا۔ ''اس خوف سے کہ خالو جان، اسد بھائی کا آنا پسند نہیں کریں گے..... تو انہیں ان کے سامنے پڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو سرمد کے لئے جا رہے ہیں۔''

بات ثروت کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تم کہو تو میں بھی ساتھ چلوں؟''

''نن..... نہیں۔ ابھی تو میں اکیلا ہی جانا چاہ رہا ہوں۔'' اسد نے شکر گزار نگاہوں سے فروا کی طرف دیکھا۔ ''تھینک یو فروا!''

''شکریہ کیسا؟'' فروا ان کے قریب آئی۔ ''ہم سب آپ کے اپنے ہیں اسد بھائی!'' اس نے اسد کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''یہ الگ بات ہے، خالو جان ہمیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے..... ہم سب آپ سے..... اور آپ کے گھر والوں سے محبت کرتے ہیں..... آپ سب کو اپنا سمجھتے ہیں۔'' فروا نے بڑے سلیقے سے بہنوئی کو ان کے باپ کے ظالمانہ روّیے کی نہ صرف یاد دلا دی تھی بلکہ ان کے ذہن میں اس یاد کی تلخی جگا کر، لمحے بھر پہلے ان کے دل میں اُٹھتی باپ کی محبت کی شیرینی کو بھی کڑواہٹ سے بھر دیا تھا۔

اسد نے فروا کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ تیزی سے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اسد کے گھر سے جانے کے بعد فروا نے مسکراتی نظروں سے بہن کی طرف دیکھا تھا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ ابھی اسے سرمد کو بھی فون کر کے، ان کے اس مشکل وقت میں خود کو ان کے ساتھ ہونے کا یقین دلانا تھا۔ ایک عیش و آرام سے بھری شاندار زندگی اور ایک آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے پورے شوہر کے حصول کی خاطر کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ وہ سرمد سے کہنے کے لئے پُر اثر ڈائیلاگ سوچتی ان کا نمبر ملانے لگی۔

❀===❀===❀
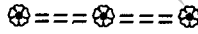
شادی کو تقریباً ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ رشید، نمو کو ایک خطیر رقم خرچ کر کے بہت ارمانوں سے بیاہ کر لایا تھا۔ اسی لئے شروع کے دنوں میں تو اس نے نمو کے بہت چاؤ چونچلے کئے تھے۔ اسے دیکھ کر جیتا تھا، اس کی ایک ایک ادا پر مرتا تھا۔ اور سلطانہ کے لئے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ ایک تو اسے یہ بات تکلیف دیتی تھی کہ ایک دُبلی پتلی، سوکھی سڑی لڑکی کی خاطر حسنہ نے رشید سے پورے تین لاکھ اینٹھ لئے تھے۔ اور اس نقد رقم کے علاوہ تحفے تحائف اور پھل مٹھائی کے بہانے رشید کے ہزاروں روپے جو لٹائے، سو الگ..... اسی لئے سلطانہ نے یہ شرط عائد کر دی تھی کہ شادی کے بعد نمو کا اپنے بھائی بھاوج سے کوئی رشتہ تعلق نہ ہوگا۔ کوئی آنا جانا، ملنا ملانا نہیں ہوگا۔ خود حسنہ بھی یہی چاہتی تھی۔ اللہ اللہ کر کے تو اُس کے اس اکلوتے سسرالی رشتے سے جان چھوٹی تھی۔ اب وہ پھر اسے ہتھیلی کی پھانس نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اور اچھی طرح جانتی تھی کہ رشید کی محبت اور دیوانگی چار دن کی چاندنی ہے۔ اور اس سے پہلے کہ جب یہ چاندنی راتیں، اماوت میں بدلیں اور انو اپنی بہن کے دکھ تکلیف دیکھ کر پسیجے، بہتر یہی ہے کہ پہلے سے ہی ہر رابطہ تعلق توڑ دیا جائے۔ اور اس نے

رشید سے یہ طے کرلیا تھا کہ اب نمو کا انو سے یا انو کے گھر سے کوئی رشتہ نہیں۔ وہ نمو کی قیمت ادا کر کے اسے لے جا رہا ہے۔ اب وہ اس کی زرخرید چیز ہے۔ وہ جو چاہے اس سے سلوک کرے، مگر بھولے سے بھی اس گھر کا رخ نہ کرے۔

''آپ بس یہ سمجھئے کہ نمو ہمارے لیئے اور ہم نمو کے لیئے مر چکے ہیں۔'' یہ جملہ سن کر سلطانہ نے سُکھ بھرا سانس لیا تھا۔ خود رشید کو بھی حسنہ کی یہ تجویز پسند آئی تھی۔ کیونکہ اس سے قبل بھی سسرالی رشتے داروں کی آمد ورفت سے اس کی کچھ اچھی یادیں وابستہ نہیں تھیں۔ زیبا کی ماں قمرن نے تو نہ صرف اس کا بلکہ اس کی ماں کا بھی ناطقہ بند کر دیا تھا اور اس کے باپ نے اسے عدالت میں گھسیٹنے کی کسر نہ چھوڑی تھی۔ جبکہ اس کے بعد والیوں نے تو اسے کوڑی کوڑی کا محتاج کر دیا تھا۔ مگر رشید، نمو کی طرف سے بہت ہوپ فل تھا..... یہ معصوم اور بے ریا سی لڑکی اسے اپنی باقی سابقہ بیویوں سے الگ اور منفرد لگتی تھی۔ اسی لیئے وہ دل و جان سے اس پر فدا تھا۔ مگر سلطانہ کو اس کا یہ واری صدقے اور وارفتہ وفدا ہونا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ اپنے اکلوتے چہیتے بیٹے کو ''جورو کا غلام'' بنتے کیسے دیکھ سکتی تھی؟

دوسری طرف نمو ہمیشہ کی بے زبان اور خدمت گزار۔ رشید کے ساتھ، سلطانہ بھی اس کے لئے بے حد قابلِ احترام تھی۔ وہ اس کے بھی ہر حکم پر سر جھکائے جاتی۔ رشید کو اس کی یہ بے زبانی بے حد پسند تھی۔ مگر سلطانہ اُسے ''گھنّی'' کا خطاب دیتی تھی اور جب موقع ملتا، رشید کے کان بھرنے بیٹھ جاتی۔

''اتنی کم عمر اور خوبصورت لڑکی..... اس کے بھائی نے تجھ جیسے ادھیڑ عمر مرد کے ساتھ بیاہ دی۔ مجھے تو کچھ دال میں کالا لگتا ہے۔''

''ارے اماں! اب تو تم جان بھی چکی ہو۔ تین لاکھ روپے دیئے ہیں میں نے ٹھنا ٹھن، تب یہ خزانہ میرے ہاتھ لگا ہے۔'' رشید خوش دلی سے جواب دیا۔

''آئے، کاہے کا خزانہ؟'' سلطانہ منہ بناتی۔ ''سوکھی سڑی کم بخت ماری تجھے جانے کہاں سے خوبصورت لگتی ہے۔''

''ارے اماں! تم بھی نا..... سیاست دانوں کی طرح، پل کے پل بیان بدل لیتی ہو۔'' رشید ہنسا۔ ''ابھی کہہ رہی تھیں کہ اتنی خوب صورت کم عمر لڑکی اس کے بھائی نے تیرے ساتھ کیسے بیاہ دی..... اب کہہ رہی ہو..... سوکھی سڑی، کم بخت ماری۔''

سلطانہ نے کھسیا کر اِدھر اُدھر دیکھا، پھر پینترا بدل کر بولی۔

''تُو تو نرا پاگل ہے۔ تجھے دنیا کی خبر ہی نہیں۔ وہ جو ہوتی ہیں نا بازاری عورتیں، وہ دنیا کے سامنے کھلی کتاب ہوتی ہیں۔ سب کو پتہ ہوتا ہے کہ وہ کیا ہیں اور کیا کیا کرتی ہیں..... وہ کون تھی؟..... ہاں، یاد آیا..... مہکار..... صاف پتہ تھا، تجھ سے شادی نہیں کرے گی۔''

''یہ تم سے کس نے کہا؟'' رشید ٹھنک کر بولا۔ ''میں نے اس سے کبھی شادی کے بارے میں نہیں سوچا۔ ''میں ایک بار کہتا تو وہ سو بار شادی کرنے کو تیار ہو جاتی۔''

''یہ تجھ سے کس نے کہا؟'' سلطانہ نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔

''چلو، شرط لگاتی ہو؟'' رشید ضدی لہجے میں بولا۔ ''تم اب کہو تو میں اس سے اب شادی کر کے دکھا دوں؟''

''سچ کہہ رہا ہے تُو؟'' سلطانہ نے مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ارے اماں! اب کہاں؟'' رشید نے نظر گھما کر کچن میں کام کرتے نمو کی طرف دیکھا۔ ''اس معصوم کلی کے سامنے اُس سو لوگوں کے سونگھے ہوئے باسی پھول کی قیمت ہی کیا ہے؟''

''یہی تو میں کہہ رہی تھی۔'' سلطانہ اپنے موضوع کی طرف آتے ہوئے بولی۔ ''کہ ان پھولوں کا سب کو پتہ ہوتا ہے

کہ کس کس کے گلے کا ہار بنتے ہیں۔ مگر ان گھریلو لڑکیوں کا تو کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ شریف زادیاں بھی گھر میں بیٹھی، دروازے کے ٹاٹ سے جانے کس کس سے آنکھ مٹکا کرتی رہتی ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" رشید ماں کی بات نہیں سمجھ سکا تھا۔

"مطلب صاف ظاہر ہے۔" سلطانہ نے مستند انداز میں کندھے اُچکا کر دونوں ہاتھ سامنے کی طرف پھیلاتے ہوئے کہا۔ "غریب محلوں میں رہنے والی یہ غریب لڑکیاں اگر قسمت سے اچھی صورت کی مالک ہوں تو اپنی اس اچھی صورت کا خوب فائدہ اُٹھاتی ہیں...... محلے کے سارے لڑکے بالوں، ادھیڑ بوڑھوں کو اپنی زلف گرہ گیر کا دیوانہ بنا کر رکھتی ہیں۔ اب تجھے کیا پتہ کہ وہاں، اس کے اپنے گھر میں اس معصوم کلی پہ کتنے بھنورے منڈلاتے پھرتے تھے۔"

سلطانہ نے آنکھ کے اشارے سے باورچی خانے کی طرف اشارہ کر کے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ماں کی یہ بات رشید کو سخت ناگوار گزری تھی۔ نمو اپنے کسی بھی انداز سے اس قسم کی لڑکی نہیں لگتی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ ماں کی اس کڑوی بات کے جواب میں کوئی تلخ سا جواب دیتا، نمو ہاتھ میں ٹرے لئے کچن سے نکل کر لاؤنج میں داخل ہوتی دکھائی دی تھی۔ ٹرے میں بھاپ اُڑاتی چائے کے مگ رکھے تھے۔ نمو کو دیکھ کر رشید خاموش ہو گیا تھا۔

"چائے تم کیوں لائی ہو؟...... چھوٹو کہاں ہے؟" رشید نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"وہ...... چھوٹو......" نمو نے نگاہیں جھکا کر کچھ کہنا چاہا۔ مگر سلطانہ نے اچک کر اس کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے جواب دیا۔

"اُسے میں نے نیچے دفتر میں کام کے لئے بھیج دیا ہے۔ کئی دنوں سے تمہارا منیجر کہہ رہا تھا کہ اوپر کے کام کے لئے کسی چپڑاسی کی ضرورت ہے۔ اب یہاں اوپر تو ایسا کوئی خاص کام ہوتا نہیں۔ میں نے اسے ہی نیچے بھیج دیا۔ اب تم کہاں نیچے کے لئے دوسرا کام والا رکھتے پھرتے۔ پہلے ہی اتنا خرچ ہو چکا ہے۔"

"مگر اماں......" رشید نے احتجاجاً کچھ کہنا چاہا۔

"ٹھیک تو کہہ رہی ہیں اماں۔" نمو نے درمیان میں بھی رسان بھرے لہجے میں رشید کے احتجاج کو روک دیا۔ "بھلا یہاں ایسا کون سا زیادہ کام ہے؟...... میں سب کر لوں گی۔ رہا سودا سلف لانے کا سوال تو وہ اماں، چوکیدار سے منگوا لیتی ہیں۔ چھوٹو کی ایسی کچھ خاص ضرورت ہے ہی نہیں۔" وہ خاموشی سے کچن کی طرف لوٹ گئی تھی۔

"دیکھا تُو نے...... کیسے تیری بات کو رد کر گئی۔" سلطانہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "اور تُو کہتا ہے، وہ بولنا ہی نہیں جانتی۔"

"تو ایسا غلط کیا کہا اُس نے اماں؟" رشید حیرانی سے بولا۔

"تجھے تو اس کا کچھ غلط، غلط نظر نہیں آتا۔" سلطانہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "یہ بھولی صورت والے بہت خطرناک ہوتے ہیں...... ان کا ڈسا پانی نہیں مانگتا۔ رشید! آنکھیں کھلی رکھ۔ پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ اور تُو ٹھہرا پانچویں فیل۔"

رشید ایک دم سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ تمام جاہل مردوں کی طرح رشید کو بھی نمو کا کالج میں پڑھنا بہت کھٹکتا تھا۔ آج کل میں اس کے انٹر کا رزلٹ آنے والا تھا۔ اس کے بعد وہ انٹر پاس کہلاتی۔ جبکہ وہ پانچویں بھی پاس نہ کر سکا تھا۔ یہ بات اس کے دل کو تکلیف دیتی تھی۔ اور اسی بات کو بنیاد بنا کر سلطانہ نے اس کے دل میں نمو کے خلاف زہر بھرنا شروع کیا تھا۔ شروع شروع میں تو اس نے ماں کی باتوں پر کان نہیں دھرے تھے، مگر دھیرے دھیرے وہ ماں کی باتیں سننے پر مجبور ہو گیا تھا۔

نمرہ کا انٹر کا رزلٹ آ گیا تھا اور اس نے پورے صوبے میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔

اس خوشی پر وہ ٹوٹ کر روئی تھی۔

اور اُس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر پہلی بار رشید کی تیوری پر بل پڑ گئے۔
''یہ رونا دھونا کس لئے؟'' رشید کی آواز میں کچھ ایسا تھا کہ نمو بری طرح سہم گئی تھی۔''
''جواب دو۔'' رشید کی آواز میں تلخی کے ساتھ اب سختی بھی آ گئی تھی۔
''اے، اپنی قسمت کو رو رہی ہو گی۔'' سلطانہ نے جلتی پر تیل ڈالنا ضروری سمجھا۔ ''پڑھی لکھی ہے نا..... انٹر پاس..... فرسٹ ڈویژن..... سیکنڈ پوزیشن..... اور تُو ٹھہرا نرا جاہل۔ کسی پڑھے لکھے، ڈاکٹر، انجینئر کی تمنا ہو گی اس کے دل میں ..... اور تُو پلے پڑ گیا۔ اب روئے گی نہیں تو اور کیا کرے گی؟''
ماں کی بات سن کر رشید ایک دم سے بھڑک اٹھا۔
''کیا یہ بات درست ہے؟'' اس نے آنکھیں سکیڑ کر اُجڈ لہجے میں نمو سے پوچھا۔
''نن..... نہیں..... ایسا تو نہیں ہے۔'' سہمی ہوئی نمو بری طرح خوف زدہ ہو گئی تھی۔ گو کہ اب شادی کے شروع کے دنوں والا شیریں روّیہ، رشید نے تبدیل کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی اب تک نمو نے اس کا یہ خوفناک چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس کا دل سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا۔
''ارے ایسا ہی ہے۔'' سلطانہ نے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتے ہوئے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''تُو جوتیاں سیدھی کرتا رہ..... یہ تو رکھے گی تجھے جوتی پہ..... قیمتی جو ہے۔ تین لاکھ دے کر جو لایا ہے تُو اسے۔''
اس طرح کی دل جلانے والی باتیں تو اس کی فطرت کا خاصہ تھیں۔ وہ ہمیشہ ہی وقت بے وقت رشید کے کان بھرتی ہی رہتی تھی۔ مگر اس نے شاذ و نادر ہی ماں کی باتوں کو قابلِ توجہ سمجھا تھا۔ مگر آج اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ سلطانہ کو پہلے سے ہی اس بات کا اندازہ تھا کہ تعلیم والی بات رشید کو کھٹکتی ہے۔ سو اب اُس نے اس بات کو سہارا بنا کر ہر وقت رشید کو یہ یقین دلانا شروع کر دیا تھا کہ پڑھی لکھی لڑکی کو دبا کر رکھنا چاہئے۔ ورنہ وہ کسی دن بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔
اوّل تو رشید شادی کے یہ کھیل کھیلتے تھک چکا تھا۔ اب وہ گھر بسا کر رہنا چاہتا تھا۔ دوسرے نمو کی خوبصورتی ہی نہیں، اُس کی بے زبانی اور معصومیت بھی اسے بے حد پسند تھی۔ تیسرے اُس نے تین لاکھ روپے نقد ادا کر کے یہ مال خریدا تھا، اس لئے بھی اسے نمو بے حد عزیز تھی۔ ان تینوں وجوہ کی بنا پر وہ نمو کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔
کسی بھی مرد کے لئے یہ بات ناقابلِ برداشت ہوتی ہے کہ اس کی بیوی اسے حقیر اور جاہل سمجھے یا قابلیت اور تعلیم میں اس سے زیادہ ہو۔ حالانکہ نمو کے تو کسی بھی عمل اور بات سے اس کی اہلیت، قابلیت یا رشید سے زیادہ تعلیم یافتہ ہونے کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ مگر سلطانہ نے رشید کے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ نمو اُس سے کہیں زیادہ قابل، تعلیم یافتہ، خوب صورت اور کم عمر ہے۔ اگر اُسے دبا کر نہ رکھا گیا تو کسی بھی دن یہ چڑیا پھُر سے اُڑ جائے گی۔ سو اُس نے ماں کا مشورہ قبول کر لیا تھا۔ اور اب اُسے خوب دبا کر..... اور جوتیوں میں رکھنے کی پالیسی پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اُسے جوتیوں میں لے آیا۔
وہ پیار محبت، وہ دیوانگی و ارفتگی..... سب خیال و خواب ہو گئے۔
زندگی دہکتا ہوا الاؤ بن گئی تھی۔
سلطانہ کی ہر وقت کی چخ چخ، طعنے تشنے، کوسنے، بد دعائیں، اس پر رشید کا بہیمانہ روّیہ، گالم گلوچ کے ساتھ اب اس نے نمو پر ہاتھ بھی اُٹھانا شروع کر دیا تھا۔
''رسید بھائی! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟'' یونس لاکھانی، نمو جیسی معصوم اور بے زبان لڑکی پر ظلم ہوتے دیکھتا تو چپ نہ رہ سکتا۔ ''کتنے پیار سے اسے آپ اپنی گھر والی بنا کر لائے تھے۔ اب اتنا جُلم (ظلم) آپ کس طرح کر سکتے ہیں؟..... جرا یہ تو

سوچیں، وہ آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔''

❀===❀===❀
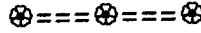
کئی دنوں سے موسم اسی طرح کا ہو رہا تھا۔

چاروں اور سے گھر گھر کے خوب سیاہ بادل جمع ہوتے۔ نیلا آسمان کالا پڑ جاتا..... یوں محسوس ہوتا کہ اب موسلا دھار بارش ہوئی کہ تب ہوئی۔ پر جانے کہاں سے ہوا کے خنک اور نرم جھونکے آتے اور بادل بن برسے ہی ہواؤں کے دوش پر کسی اور جانب نکل جاتے۔ گو کہ پانی کی بوند تک نہ برسی تھی مگر ہواؤں اور بادلوں کی اس آنکھ مچولی سے کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوا تھا کہ شہر کا موسم بے حد خوشگوار اور سہانا ہو گیا تھا۔ آگ برساتا سورج کا گولا، نیلے آسمان پر بدمست ہاتھیوں کی طرح ڈولتے سیاہ بادلوں کی اوٹ میں روپوش رہتا۔ تپتی دھوپ اور سلگتی ہواؤں کے گرم تھپیڑے، گھنگھور گھٹاؤں کے سانولے پرتو میں کہیں گم ہو چکے تھے۔ ہر سمت سلونا سا احساس بکھرا رہتا۔ ہواؤں کے نرم جھونکوں میں عجب طمانیت اور تسکین سی رچی محسوس ہوتی اور نیلگوں آکاش پر مٹرگشت کرتے اودے، سیاہ و سفید بادل برسات کی اُمید بندھائے رکھتے۔

موسم کی خوشگواری کا اثر رشید کے مزاج پر بھی ہوا تھا۔ وہ خاصا خوش باش اور چونچال دکھائی دے رہا تھا۔ اس چونچالی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے بصد مشکل رمضان آرائیں کو ایک بار پھر پارٹنرشپ کے لئے آمادہ کر لیا تھا۔ اور وہ سادہ اور کھرا انسان ایک بار پھر اپنی عمر بھر کی کمائی رشید کے پروجیکٹ میں لگانے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔

اس وقت رشید اپنی نئی نکور چمچماتی گاڑی میں پلاٹ کی طرف جا رہا تھا۔ فرنٹ سیٹ پر یونس لاکھانی خاموش بیٹھا خالی خالی نظروں سے سامنے کی جانب تکے جا رہا تھا۔ ایک آدھ بار اس نے نمرہ کی ہمدردی میں کچھ کہنا چاہا تو اُس کی اس بات سے سلطانہ بدک گئی تھی اور اس نے اس کا اپنے گھر میں داخلہ بند کر دیا تھا۔ خود رشید کو بھی اس کا نمو کے حق میں بولنا پسند نہیں تھا۔ سو اب اس نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔ ویسے بھی نمو سے اُسے کیا مل سکتا تھا؟ جبکہ رشید اور سلطانہ کی جی حضوری کے طفیل وہ کچھ نہ کچھ رقم نکلوانے میں بہر حال کامیاب ہو ہی جاتا تھا۔ اس کی خاموشی سے اوب کر رشید نے ریڈیو کھول دیا تھا۔

''اور لیجئے اب پیش ہے مہکار کی آواز میں یہ خوبصورت غزل۔''

اناؤنسر کے اعلان پر رشید نے چونک کر لاکھانی کی طرف دیکھا تھا۔

''وہ تو ہیروئن بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ یہ گلوکارہ کب سے بن گئی؟'' رشید کی آواز میں استعجاب کے ساتھ ہلکا سا طنز بھی تھا۔

''آپ تو جانتے ہیں کہ کھدا (خدا) نے اُسے گجب (غضب) کا گلا دیا ہے۔ آج کل ریڈیو ٹی وی کے لئے گا بھی رہی ہے۔'' لاکھانی نے سرسری سے انداز میں جواب دے کر توجہ ریڈیو کی طرف مبذول کر دی۔ ہلکے میوزک کے بعد اب مہکار کی مسحور کن آواز جادو جگا رہی تھی۔

''میرے شوق دا نہیں اعتبار تینوں...... آجا دیکھ میرا انتظار آجا۔''

''آپ کو بلا رہی ہے۔'' رشید کی محویت دیکھتے ہوئے لاکھانی نے اُسے کہنی سے ٹہوکا دیتے ہوئے شریر لہجے میں کہا۔ پھر ذرا رک کر سنجیدگی سے بولا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ آپ کو وہ بہت یاد کرتی ہے۔''

''اچھا......'' رشید نے چونک کر لاکھانی کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں کیسے پتہ؟''

''آپ تو جانتے ہو نا کہ میں کبھی کبھار اُدھر چلا جاتا ہوں۔ جب بھی آپ کا جکر آتا ہے.....آہ بھر کر رہ جاتی ہے۔''

لاکھانی نے پُرتاثیر انداز میں بتایا۔

''وہ تو ہیروئن بننے والی تھی۔اُس پروجیکٹ کا کیا بنا؟'' خود کو ٹھکرائے جانے کا وقت یاد آتے ہی رشید کے لہجے میں آپ سے آپ تلخی گھل گئی۔''وہ جو موٹا مرغا ان دونوں بہنوں نے مل کر پھانسا تھا، کٹا نہیں کیا؟''

''اپنی پھلم (فلم) انڈسٹری کی جو حالت ہے، وہ آپ سے چھپی تو نہیں۔'' لاکھانی افسردہ لہجے میں بولا۔''پھلم سیٹ پر جانے سے پہلے ہی پروڈیوسر قلاش ہوگیا۔کچھ ڈائریکٹر وغیرہ مل کر کھا گئے، کچھ مہکار اور گلبہار نے کاٹ لیا۔اور آپ تو جانتے ہیں، اس طرح کے مُرگے پھنسانے سے جندگی تو نہیں گجرتی.....اس کے لئے تو ایک مستقل مُرگا چاہئے ہوتا ہے۔'' لاکھانی ایک آنکھ دبا کر معنی خیز انداز میں بولا۔''مستقل مُرگا بولے تو......گھر والا۔''

''گھر والا.....؟'' اب کے رشید بھی ہنسا۔''ایسی عورتیں شادی کب کرتی ہیں۔انہیں نہ گھر چاہئے ہوتا ہے نہ گھر والا۔''

''نئیں نئیں۔'' لاکھانی نے ہاتھ اٹھا کر احتجاج بھرے لہجے میں کہا۔''آپ مہکار کو غلط سمجھ رہے ہو.....اس کا باپ ایک سریف آدمی تھا۔ہیروئن بننے کے سوق میں وہ یہاں تک آئی۔'' لاکھانی نے ہاتھ کے اشارے سے ریڈیو کی طرف توجہ دلائی اور رشید ایک بار پھر مہکار کی لوچ دار آواز کے سحر میں کھو گیا۔

''ہاں، گاتی تو اچھا ہے۔'' رشید کو تعریف کرنی ہی پڑی۔

''مجھے ایک آدھ دن میں ادھر جانا ہے۔'' رشید کو پگھلتے دیکھ کر لاکھانی نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔''آپ بولو تو میں آپ کی طرف سے سلام بولوں؟''

''لاکھانی! تُو بھی نا......بہت حرامی ہے۔'' رشید نے ہنستے ہوئے لاکھانی کے کندھے پر ہاتھ مارا اور لاکھانی بھی کھی کھی کر کے ہنسنے لگا۔

دلال اور اور بکاؤ مال کا جو رشتہ ہوتا ہے، لاکھانی اور مہکار کے بیچ وہی رشتہ تھا۔آج کل پورے ملک کے جو حالات چل رہے تھے، ان کا اثر مہکار جیسی عورتوں پر بھی پڑا تھا۔اسے اب یقین ہو چلا تھا کہ ہیروئن بننے کا اس کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔جس پروڈیوسر کی امید میں اس نے رشید کو دھتکارا تھا، وہ پروڈیوسر ڈھول کا پول ہی نکلا۔اس کے پاس اتنا ہی سرمایہ تھا جسے مہکار اور ڈائریکٹر رحمان نے مل کر کچھ ہی عرصے میں لوٹ لیا تھا۔اور فلم سیٹ پر بھی نہ جاسکی۔لوٹے ہوئے مال میں برکت کب ہوتی ہے؟ اس لئے جلد ہی مہکار ایک بار پھر ادھر اُدھر دیکھنے پر مجبور ہوگئی تھی۔گزرتے وقت کے ساتھ اب اس کی رعنائی و خوبصورتی بھی متاثر ہو رہی تھی۔اب وہ سنجیدگی سے کسی آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے پورے کی تلاش میں تھی۔لاکھانی سے ملاقات ہوئی تو اسے بھی اس نے یہی کہا تھا۔

''ایسا لگتا ہے، سارا ملک ہی کنگال ہوگیا ہے۔آج کل ریڈیو، ٹی وی اور اسٹیج پر گانا گا کر گزارہ کر رہی ہوں۔تُو کوئی موٹی اسامی ڈھونڈ نا۔''

اور لاکھانی نے وعدہ کر لیا تھا۔مگر وعدہ کرتے وقت اس کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی رشید کا خیال تک نہ تھا۔مگر اس وقت رشید کی مہکار کی آواز پر سر دُھنتے دیکھ کر بالکل اچانک ہی اس کے ذہن میں یہ خیال جاگا تھا کہ کیوں نہ رشید کو ایک بار پھر مہکار سے بھڑا دیا جائے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اسے معلوم تھا کہ رمضان آرائیں نے ایک خطیر رقم رشید کے اکاؤنٹ میں منتقل کی ہے اور لک سے بھی ایک بڑا لون ملنے والا ہے۔اس وقت رشید بلا مبالغہ کروڑوں کا مالک تھا۔اس کی کروڑوں کی یہ ملکیت مہکار کو شق تو کیا، شادی پر بھی آمادہ کرسکتی تھی۔

دوسری وجہ سلطانہ تھی۔

لاکھانی کو درحقیقت سادہ لوح اور معصوم نمرہ سے ہمدردی تھی۔ اس بے زبان پر سلطانہ جس جس انداز میں ظلم ڈھاتی تھی، لاکھانی کو دیکھ کر واقعی افسوس ہوتا تھا۔ اور جب سے اسے نمرہ کے امید سے ہونے کا پتہ چلا تھا تو اسے اس سے اور بھی زیادہ ہمدردی ہوگئی تھی۔ اس حال میں وہ رات دن کولہو کے بیل کی طرح کام میں جتی رہتی۔ رات کو سلطانہ کے پیر دباتی۔ اس پر سلطانہ، رشید کے کان بھر کر اسے اس سے نہ صرف گالیاں دلواتی بلکہ اسے نمرہ پر ہاتھ اُٹھانے پر بھی مجبور کرتی۔ باقی پورے دن اس کا اپنا نشریاتی پروگرام تو چلتا ہی رہتا تھا۔

''تیرے بے غیرت بھائی کو تیری قیمت وصول کرتے شرم نہیں آئی؟''

میرا بیٹا تجھے خرید کر لایا ہے.....زر خرید لونڈی ہے تُو.....چل میرے پاؤں دبا۔''

''اری کھنی! کبھی منہ سے بھی کچھ پھوٹا کر۔ ہر وقت چپ کا روزہ رکھے رہتی ہے۔ مظلوم، معصوم بن کر مجھ سے میرا بیٹا چھیننا چاہتی ہے.....مگر میں یہ کبھی بھی نہیں ہونے دوں گی۔''

ایک آدھ بار لاکھانی نے رشید کو سمجھانے کی کوشش کی تو یہ بات سلطانہ کو سخت ناگوار گزری تھی اور اس نے ایک دن کھڑے کھڑے اسے گھر سے نکال باہر کیا تھا۔ حالانکہ دیکھا جاتا تو لاکھانی جیسے لوگوں کی عزت ہوتی ہی کیا ہے؟ مگر جانے کیوں سلطانہ کے اس روّیے سے لاکھانی کو اپنی بے حد بے عزتی محسوس ہوئی تی۔ مگر اس وقت اس نے کسی انتقامی کارروائی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ مگر ابھی اس پل رشید کو مہکار کے نام پر از سر نو نرم پڑتے دیکھ کر ایک دم ہی رشید کے دل میں سلطانہ سے انتقام لینے کا خیال بیدار ہوا تھا۔ اگر مہکار کسی طور پر رشید کی زندگی کا حصہ بن سکتی تو اس جیسی تیز طرار اور قتالہ سلطانہ کا وہ حشر کرتی کہ سلطانہ اپنی ساری اکڑفوں بھول جاتی۔ سلطانہ، نمو جیسی پاکباز، معصوم اور بے زبان بہو کے قابل ہی نہ تھی۔ اس کی سزا کے لئے تو کسی مہکار جیسی عورت کا ہونا ہی ضروری تھا۔ سو لاکھانی نے اسی وقت تہیہ کر لیا تھا کہ کسی بھی طرح وہ رشید اور مہکار کا ٹوٹا ہوا رشتہ از سر نو استوار کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔

ادھر یونس لاکھانی دل ہی دل میں اپنے منصوبے باندھ رہا تھا۔ دوسری طرف رشید خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے مہکار کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ وہ فطرتاً حُسن پرست واقع ہوا تھا۔ پہلی بار ڈائریکٹر ایس رحمان کے آفس میں اس نے مہکار کو دیکھا تھا اور پہلی ہی نظر میں وہ اس پر فریفتہ ہوگیا تھا۔ مگر اس نے مہکار سے کبھی بھی شادی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ خود مہکار کی جانب سے بھی اس قسم کی کسی خواہش کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں کے مابین محض ضرورت کا رشتہ تھا۔ اور جوں جوں ضرورت پوری ہوتی گئی، رشتے میں آپ سے آپ دراڑ پڑتی گئی۔ رشید کی پتلی مالی حالت نے گلبہار کو رشتہ سے بدظن کر دیا تھا اور حُسنِ اتفاق سے انہی دنوں ان دونوں بہنوں کو ایک اور پروڈیوسر ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس مالدار آسامی کے مل جانے سے رشید کی رہی سہی قدر بھی جاتی رہی تھی۔ اور آخر کار یہ رشتہ کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گیا تھا۔ جس کا رشید کو بھی ذرّہ بھر ملال نہیں تھا۔ بلکہ اسے اس فلیٹ کے بچ جانے کی خوشی تھی جو وہ بظاہر مہکار کے نام کر چکا تھا۔ رشتہ ختم ہوتے ہی اس نے وہ فائل بھی ختم کر دی تھی جس میں مہکار کے نام کے اپارٹمنٹ کے کاغذات تھے۔ مہکار سے تعلق ختم ہونے کے بعد رشید نے آنکھیں کھول کر اپنے حالات اور مالی پوزیشن کا جائزہ لیا تھا۔ مہکار کے عشق نے اسے تقریباً قلاش کر دیا تھا۔ سو وہ از سر نو کاروبار جمانے کی فکر میں لگ گیا تھا۔ اب اس نے عشق معاشقے کے نام سے توبہ کر لی تھی۔ مگر اسے کیا پتہ تھا کہ ایک نئی واردات اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اسی دوران جب وہ لون کے لئے ایک بینک کی برانچ سے نکل رہا تھا تو اس کی نظر حسنہ اور اس کے ساتھ نمو پر پڑی تھی۔ اور ہمیشہ کی طرح اس بار بھی حُسن کے اس شاہکار نے رشید کے دل پر کچھ طرح وار کیا تھا کہ وہ اپنی جگہ تھم سا گیا تھا۔ مگر اس بار فرق یہ تھا کہ وہ محض عشق اور دل لگی کے بجائے شادی کے لئے بے چین و مضطرب ہوگیا تھا۔ اور تین لاکھ نقد حسنہ کی نذر کر کے آخر کار وہ نمرہ کو اپنی

شریک زندگی بنانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ نمو کو پا کر وہ بے حد خوش تھا۔ نمو کی سادگی، محبت اور خدمت شاید اُسے راہِ راست پر لا کر ایک نارمل زندگی گزارنے کے قابل بنا دیتی اگر درمیان میں سلطانہ نہ ہوتی۔

رشید کا نئی نویلی، نوخیز، دل نواز دُلہن پر صدقے واری ہونا اور آگے پیچھے پھرنا سلطانہ کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ حسبِ عادت روایتی ساسوں کی طرح نمرہ کو اپنی اُنگلیوں پر نچانا اور گھٹنے کے نیچے دبا کر رکھنا چاہتی تھی۔ اگر رشید یونہی اس کی ناز برداریوں میں لگا رہتا تو وہ بھلا اپنے مشن میں کس طرح کامیاب ہوسکتی تھی؟ سو اس نے نہایت سلیقے اور باریک بینی سے نمو کو رشید کے دل سے اُتارنے کی مہم کا آغاز کر دیا تھا۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس میں بے حد کامیاب بھی رہی تھی۔

نمرہ کی انٹر میں پوزیشن، سلطانہ کے لئے ایک ایسا مہرہ ثابت ہوئی تھی جسے وہ بڑی چالاکی سے ہر ہر موقع پر استعمال کر رہی تھی۔ رشید چار جماعتوں سے آگے نہیں پڑھ سکا تھا۔ اسی لئے نمرہ کی بارہویں جماعت میں اعلیٰ نمبروں سے کامیابی اس کے لئے خفت اور شرمندگی کا باعث بن گئی تھی اور سلطانہ نے اُس کے اس کمزور پہلو کو خوب سلیقے سے پکڑ لیا تھا۔ ہر ہر بات پر کہتی۔

''ارے تجھے وہ گردانتی ہی کیا ہے؟...... وہ ٹھہری ایف اے پاس، اور تُو نرا انگوٹھا چھاپ۔ بے چارہ چوتھی فیل..... تجھے وہ کچھ کیوں سمجھنے لگی؟''

یہ سچائی رشید کے دل کو شدید تکلیف دیتی تھی۔ سب ہی جاہل اور اجڈ مردوں کی طرح بیوی کی اہلیت اور قابلیت اس کے لئے انا اور عزت کا مسئلہ بن گئی تھی۔ سو سلطانہ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اس نے نمرہ کے تعلیم کے بھوت کو اُتارنے کے لئے اسے اپنی جوتی پر رکھ لیا تھا۔ بات بات پر گالم گلوچ، چیخم دھاڑم اور اکثر بنا بات کے مار پٹائی...... اس لمحے وہ یہ بھی نہ سوچتا کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ زندہ دہکتا ہوا الاؤ بن کر رہ گئی تھی۔

بھیا اور حسنہ نے تو کبھی پلٹ کر خبر بھی نہ لی تھی۔ نہ کبھی رشید نے ہی اسے ان کے گھر لے جانے کے بارے میں سوچا۔ اور اس کی تو اپنی کوئی سوچ تھی ہی نہیں۔ اس نے تو خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ ہاں کبھی کبھی دل میں ایک ٹیس سی، ایک اُمید کا غبار سا اُٹھتا، کاش! کبھی بھولے بھٹکے ہی بھیا اس طرف آ جائیں اور اس کی دید کی پیاسی نظروں کو قرار مل جائے۔ مگر اسے کیا خبر تھی کہ حسنہ نے رشید سے اس کا سودا کرتے وقت یہ شرط منوالی تھی کہ شادی کے بعد نمو ان کے لئے اور وہ نمو کے لئے گویا مر چکے۔ ان سے کسی بھی طرح کا کوئی رابطہ یا تعلق نہ رکھا جائے۔ خود رشید بھی یہی چاہتا تھا۔ اسے کون سی رشتے داریاں نبھانے کا شوق تھا۔ پر نمو اس معاہدے سے بے خبر تھی۔ کبھی کبھی تو اُس کا دل بھیا کو دیکھنے اور اس سے ملنے کو بے طرح تڑپ اُٹھتا تھا۔ مگر وہ دل پر پتھر رکھ کر صبر کا دامن تھام لیتی۔ اور جب سے اسے پتہ چلا تھا کہ اس کے وجود میں ایک اور وجود انگڑائیاں لے رہا ہے تو ایک عجب سے اُمید بھرے احساس نے اسے چاروں اطراف سے گھیر لیا تھا۔ اب اُسے نہ سلطانہ کے طعنوں سے شکایت تھی، نہ رشید کی گالیوں اور مار پٹائی سے کوئی شکوہ تھا۔ اب اُس کی پوری توجہ اس بچے کی طرف تھی جو اُس کی کوکھ میں پل رہا تھا۔ اب وہی اس کا سہارا تھا، اس کا مستقبل تھا۔ اور بے نیند آنکھوں کا درخشاں خواب تھا وہ...... اس کے مضطرب دل میں تسکین کا احساس تھا وہ...... پر سلطانہ کو ابھی تک اس ''واردات'' کی خبر نہ ہوئی تھی۔ لیکن جونہی اسے نمو کی بدلتی کیفیات سے اس امر کا اندازہ ہوا، اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کس مشکل سے اس نے رشید کو قابو کیا تھا۔ اب صاحبِ اولاد ہو کر بہت ممکن تھا کہ وہ دوبارہ سے ہاتھ سے نکل جاتا۔ گو کہ وہ جانتی تھی، رشید کو اولاد سے ایسی کوئی خاص رغبت نہیں ہے۔ اس سے قبل اس کی پہلی بیٹی کا جو حشر ہوا تھا، وہ سب سلطانہ کی آنکھوں کے سامنے ہی ہوا تھا۔ بلکہ خود سلطانہ نے اس بچی کی موت کے سلسلے میں ایک ظالمانہ کردا،

مگر رشید نے کسی ری ایکشن کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ شاید اس کے دل میں اولاد کے لئے کوئی جگہ ہی نہ تھی۔ اس کے باوجود نمرہ کے امید سے ہونے کی خبر نے سلطانہ کو خائف کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی، جس طرح نمو، رشید کی دوسری بیویوں سے مختلف ہے، اسی طرح اس کا بچہ بھی منفرد ہی ہوگا۔ اور اگر اس بچے کی وجہ سے رشید ایک بار پھر نمرہ کی طرف راغب ملتفت ہو گیا تو اس کا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا اور وہ جتی ہوئی بازی پھر سے ہار جائے گی۔ اور شاید اب کے یہ ہار اس کی زندگی کی آخری اور بدترین شکست ثابت ہو۔ یہ سوچ ہی سلطانہ کے لئے اذیت ناک اور پریشان کُن تھی۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنا بڑھاپا خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ سو وہ ایک نئے عزم سے خم ٹھونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور نہایت عیاری اور انتہائی کمینگی سے ایک گھناؤنا وار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس دوپہر نمرہ اس کے اور رشید کے کپڑے دھونے کے بعد بالٹی میں ڈال کر چھت پر پھیلانے کے لئے سیڑھیوں کی طرف بڑھی ہی تھی کہ بری طرح چکرا کر رہ گئی تھی۔ اگر اس نے دیوار کا سہارا نہ لے لیا ہوتا تو یقیناً گر گئی ہوتی۔ سامنے تخت پر براجمان سلطانہ گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''اے کیا ہوا؟...... تُو چکرا کیوں گئی؟'' سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی سلطانہ نے انجان بن کر سوال کیا۔

''کچھ نہیں اماں!...... وہ...... بس ایسے ہی......'' نمرہ نے ماتھے پر پھوٹ آنے والا پسینہ دوپٹے کے پلّو سے پونچھا اور دوبارہ سے بالٹی سنبھالی۔

''چھوڑو بھابی!...... بالٹی مجھے دے دو۔ میں اوپر جا کر کپڑے پھیلا دیتا ہوں۔'' سیڑھیوں سے اوپر آتے چھوٹو نے سچویشن سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگائی تھی اور لپک کر نمو کے ہاتھ سے کپڑوں سے بھری بالٹی تھام لی تھی۔

''آئے ہائے...... آج تو بھابی پہ بڑا پیار آ رہا ہے...... خیر تو ہے؟'' سلطانہ نے ناک پر اُنگلی رکھتے ہوئے چھوٹو کی طرف دیکھا۔

''پیار کیوں نہیں آئے گا؟'' چھوٹو فخریہ انداز میں سینہ پھلا کر بولا۔ ''میں چاچا جو بننے والا ہوں۔ تم بھی خوش ہو جاؤ۔ تم بھی دادی بن جاؤ گی پھوکٹ میں۔'' چھوٹو بالٹی اُٹھائے تیزی سے زینہ چڑھتا اوپر چلا گیا تھا۔

''کیا......؟'' سلطانہ نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت بھرے انداز میں نمرہ کی طرف دیکھا۔ ''یہ چھوٹو کیا کہہ رہا ہے؟''

''وہ اماں!...... اصل میں...... انہوں نے ہی اسے بتایا تھا۔'' نمرہ نظریں جھکا کر جھینپے ہوئے انداز میں بولی۔ ''کہ وہ چاچا بننے والا ہے۔''

''مطلب تُو اُمید سے ہے؟'' سلطانہ نے بے یقین لہجے میں سوال کیا۔

''جی...... وہ......'' سلطانہ کے انداز پر نمرہ کو حیرت ہوئی تھی۔

''کیا کہہ رہی ہے تُو بدبخت!'' سلطانہ ایک دم ہی چیخ اُٹھی تھی۔ ''سچ بتا! کیا تو ماں بننے والی ہے؟''

''جی مگر......'' نمرہ ہراساں ہو گئی۔

''میرے خدا!...... مجھے یہ دن بھی دیکھنا تھا۔'' سلطانہ نے دونوں ہاتھوں سے سر پیٹتے ہوئے دُہائی دی۔ ''اری کرم جلی!...... بدبخت!...... یہ تُو نے کیا، کیا؟'' پھر اُس نے لپک کر نمرہ کو شانوں سے دبوچتے ہوئے خونخوار لہجے میں پوچھا۔

''بول! تُو نے یہ گناہ کہاں سے کمایا؟''

''کیا مطلب؟'' نمرہ حیرت زدہ رہ گئی۔

''اری تجھے رشید کی عمر کا پتہ ہے...... وہ پورے چھیالیس برس کا ہو چکا ہے...... چار کم پچاس کا۔ بھلا اس عمر میں وہ باپ بن سکتا ہے؟...... بول تُو پاپ کی یہ گٹھڑی کہاں سے لائی؟''

لمحہ بھر کو تو نمرہ سمجھ بھی نہ سکی کہ سلطانہ کیا کہہ رہی ہے۔ اور جب بات اس کی سمجھ میں آئی تو اس کا چہرہ فرطِ جذبات سے سرخ ہو گیا۔

''کچھ احساس ہے آپ کو......؟'' اس ڈیڑھ سالہ شادی شدہ زندگی میں پہلی بار وہ تن کر سلطانہ کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ ''آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

یہ تو اس کے ہونے والے بچے کے ساتھ کھلا ظلم تھا۔ اس سے باپ کا نام چھین کر اسے گالی دی جا رہی تھی۔ وہ سلطانہ کے پست اور غلیظ ذہن کی اس گھناؤنی اور گھٹیا سازش کو اپنے بچے کے خلاف کسی بھی طرح کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ وہ اپنی ذات پہ ڈھائے گئے ہر ظلم کو سہہ سکتی تھی مگر اپنے بچے کے لئے وہ عافیت اور حفاظت کی دیوار بن جانا چاہتی تھی۔

''اری میں جو کہہ رہی ہوں، درست کہہ رہی ہوں۔'' سلطانہ چیخ کر بولی۔ ''اری حرام زادی! آوارہ!..... کس کی کالک میرے بیٹے کے منہ پر مل رہی ہے؟...... ارے کوئی بلاؤ رشید کو...... ارے کیا غضب ہو رہا ہے یہ......'' سلطانہ نے باقاعدہ واویلا اور بین کرنا شروع کر دیا تھا۔

''آپ پاگل تو نہیں ہو گئیں؟...... کیا کہہ رہی ہیں؟'' نمرہ نے اس کے شور و غل کے درمیان اپنا مؤقف بیان کرنے کی کوشش کی۔ ''آپ کو ایسی بات کہتے شرم آنی چاہیے۔ آپ جانتی ہیں، یہ رشید کی اولاد ہے...... آپ کے بیٹے کی اولاد ہے...... پھر آپ یہ سب......''

''اری بس رہنے دے۔'' سلطانہ نے بازو اوپر کر کے لہرائے۔ ''اری تجھے تو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تُو قتامہ گھر بسانے والی نہیں...... کیسی بھولی صورت ہے اور کرتوت دیکھو...... جانے کہاں سے منہ کالا کر کے آئی ہے اور کہہ رہی ہے کہ یہ رشید کی اولاد ہے...... آپ کے بیٹے کی اولاد ہے...... ہونہہ۔''

سلطانہ نے آخری جملہ نمرہ کے انداز میں اس کی نقل اُتارتے ہوئے ادا کیا تھا۔ نمرہ حیران، پریشان یہ سارا ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے؟ کیا کرے؟ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ چہرہ اس قبیح الزام پر غصے سے تمتما رہا تھا اور ہاتھ پیر بے کسی و بے بسی کے باعث بے دم سے ہوئے جا رہے تھے۔

چھوٹو گیلے کپڑے چھت پر بندھی الگنی پر پھیلا کر خالی بالٹی لئے نیچے اُترا تو یہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔ وہ حیران نظروں سے کبھی چیختی دھاڑتی سلطانہ کی طرف دیکھ رہا تھا، کبھی بے بسی و بے کسی کی تصویر بنی دیوار سے ٹکی نمرہ کو..... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چند منٹوں میں آخر ماجرہ کیا ہو گیا؟ ''چھوٹو! دیکھ نیچے آفس میں رشید ہے کیا؟'' سلطانہ نے چھوٹو پر نظر پڑتے ہی ڈپٹتے لہجے میں کہا۔ ''اگر ہے تو اسے فوراً بلا کر لا۔''

''مگر...... وہ کیوں ماں جی؟'' چھوٹو نے سوال کیا۔

''جو تجھ سے کہا جا رہا ہے، وہ کر۔'' سلطانہ چیخ کر بولی۔ ''جا...... رشید کو بلا لا۔''

رشید جونہی اوپر آیا تو سلطانہ اُسے گھسیٹ کر کمرے میں لے گئی۔ اور جب رشید کمرے سے باہر آیا تو بالکل بدلا ہوا رشید تھا۔

''نمرہ! اماں جو کہہ رہی ہیں، کیا صحیح ہے؟'' اُس نے کھولتے لہجے میں نمرہ سے سوال کیا۔

''کیا کہہ رہی ہیں وہ؟'' نمرہ نے پہلی بار رشید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

''یہی کہ تیرے پیٹ میں حرامی بچہ ہے......'' رشید اُس کے اس طرح اعتماد سے دیکھنے پر غضب ناک ہو کر بولا۔

''میں نے آج تک کبھی بھولے سے بھی گھر سے باہر پاؤں نہیں نکالا۔ پورے وقت گھر میں تمہارے اور تمہاری ماں

کی نظروں کے سامنے رہتی ہوں۔ نہ کسی سے ملنے جاتی ہوں، نہ کوئی مجھ سے ملنے آتا ہے۔ تم خود سوچو..... پھر بھلا یہ بچہ حرامی کس طرح ہو سکتا ہے؟...... یہ تمہاری جائز اولاد ہے رشید!..... خدارا اسے گالی نہ دو۔'' نمرہ بے ساختہ رو پڑی۔

لمحے بھر کو رشید بھی سوچ میں ڈوب گیا۔

بات تو اس کی صحیح تھی۔ ویسے بھی رشید کو انسانوں کا خوب اندازہ تھا۔ زمانے کے سرد و گرم کا چشیدہ، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے عمر رسیدہ رشید کم از کم اتنا تو بھانپ ہی سکتا تھا کہ نمرہ جیسی کم عمر، معصوم اور پاکباز لڑکی بدکردار ہو ہی نہیں سکتی۔ سو چند لمحوں تک وہ نمرہ کی بھیگی پلکیں اور اُترا ہوا چہرہ تکتا رہا، پھر خاموشی سے باہر چلا گیا۔

اپنا اتنا بڑا وار خالی جاتے دیکھ کر سلطانہ بلبلا اُٹھی۔ اس نے تو سوچا تھا کہ اتنی بڑی بات سن کر رشید، نمرہ کو چوٹی سے پکڑ کر گھر سے باہر پھینک دے گا۔ خیر نمرہ سے تو اسے یہ امید نہیں تھی کہ اتنا بڑا الزام سن کر وہ غصے سے آگ بگولا ہو کر خود ہی گھر چھوڑ جائے گی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی، نمرہ کے پاس اس گھر کے سوا اور کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ ہر قیمت پر نمرہ سے یہ آخری ٹھکانہ بھی چھین لینا چاہتی تھی۔ اور آج اسے پوری توقع تھی کہ رشید، نمرہ کو دھکے مار کے گھر سے نکال دے گا۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ نہ وہ چیخا چلایا، نہ نمرہ پہ ہاتھ اُٹھایا۔ بلکہ خود ہی سر جھکا کر گھر سے باہر چلا گیا تھا۔

'خیر کوئی بات نہیں۔' سلطانہ نے خود کو ڈھارس بندھائی۔ 'آج نہ سہی، ایک نہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا..... نمرہ کو اس گھر سے نکال باہر نہ کیا تو میرا نام بھی سلطانہ نہیں۔'

اسی لمحے سے سلطانہ نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا کہ نمرہ کو کسی بھی طرح سے اس گھر سے نکال کر دم لے گی۔ سو رات دن رشید کے کان بھرنے لگی۔ ہر انداز اور طریقے سے اسے باور کروانے لگی کہ نمرہ کے وجود میں پلنے والا بچہ ناجائز ہے۔ اور رشید کو نمرہ کی اس حرکت کی سزا دینی چاہئے۔

پتھر پر بھی بوند بوند پانی ٹپکتا رہے تو آخر کار اس میں چھید ہو جاتا ہے۔ رشید تو پھر مرد تھا۔ کان کا کچا، ایک بے پڑھا لکھا بے شعور مرد، جس نے سلطانہ جیسی بدفطرت عورت کی کوکھ سے جنم لیا تھا اور اسی کی گود میں کھیل کر بڑا ہوا تھا۔ سلطانہ کو رشید کی عادات و فطرت سے خوب آگاہی تھی۔ اسے ہر وہ انداز معلوم تھا، جس سے رشید کا دل نمرہ کی طرف سے میلا کیا جا سکتا تھا اور کسی طرح اُسے اپنا ہم خیال بنایا جا سکتا تھا۔

اور ویسے بھی آج کل رشید، مہکار کی مہکتی محفلوں میں وقت گزار رہا تھا۔ اس دوپہر ریڈیو پر مہکار کی آواز سننے کے بعد اس کے دل میں عجب سی بے کلی جاگ اُٹھی تھی۔ یونس لاکھانی نے اس کے اضطراب کو اور ہوا دی تھی اور اگلے ہی دن وہ مہکار سے جا کر ملا تھا۔

''سچ کہہ رہا ہے تُو لاکھانی؟'' مہکار سے زیادہ گلبہار کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''رسید کے اکاؤنٹ میں کسی رمضان آرائیں نے ایک کروڑ جمع کروایا ہے۔ اور بینک سے جو لون ملنے والا ہے، وہ الگ۔'' لاکھانی نے لہک کر جواب دیا۔

''مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔'' گلبہار نے سوالیہ نظروں سے خاموش بیٹھی مہکار کی طرف دیکھا۔ ''تُو بول مہک! تجھے لاکھانی کی بات کا اعتبار ہے؟''

''اعتبار کئے بنا چارہ ہی کیا ہے؟'' مہکار بے بس انداز میں مسکرائی۔ ''اور ویسے بھی ہاتھ کنگن کو آرسی کیا اور پڑھے لکھے کو فارسی کیا..... اُسے آنے تو دو..... دو چار ملاقاتوں میں خود ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔''

''اس پچھلے پروڈیوسر شوکت الہ آبادی کے ساتھ رہ کر تُو نے اور کچھ حاصل کیا ہو یا نہ کیا ہو، یہ گاڑھی اور بامحاورہ اُردو بولنی تجھے ضرور آ گئی ہے۔'' اس تمام عرصے میں گلبہار پہلی بار مسکرائی۔

''تے ہور کی کریئے۔'' مہکار بھی بے ساختہ مسکرا اُٹھی۔ ''رِسک تو لینا ہی ہوگا۔''
''نہ جی..... کوئی رِسک ہے۔'' لاکھانی جلدی سے بولا۔ ''سچ کہہ رہا ہوں، پانچوں گھی میں ہیں، سر کڑاہی میں.....''
''لے..... بس اسی گل دی کمی سی کہ ایہہ وی بامحاورہ بولی بولن لگ جاوے۔'' گلبہار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''چل ٹھیک ہے..... تُو کسی طرح کل اسے لے آ۔ باقی بعد میں دیکھیں گے..... اور ہاں.....'' اُٹھتے اُٹھتے گلبہار نے ایک بار پھر بیٹھتے ہوئے تنقیدی نظروں سے پہلے مہکار، پھر لاکھانی کی طرف دیکھا۔ ''اب کے تم دونوں بالکل صاف دل کر کے دھندے میں ہاتھ ڈالو..... بیچ میں کوئی رنجش، کوئی چپقلش اور غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔''
''لے، میں نے تو پہلے وی کدی کچھ نہیں کہا۔'' مہکار احتجاج بھرے انداز میں گویا ہوئی۔ ''پہلے وی اس لاکھانی نوں فلیٹ کا سپ ڈس گیا تھا..... ایسی ہائے لگی اس کی کہ فلیٹ تو ایک طرف، اس کی فائل بھی دیکھنے کو نہیں ملی۔''
اس سے پہلے کہ لاکھانی اپنے دفاع اور مہکار کے جواب میں کچھ کہتا، گلبہار نے ہاتھ اٹھا کر بات درمیان میں ہی روک دی۔
''اچھا بس اب دفع کر اس فلیٹ کے ذکر نوں۔ جو بیت گئی، سو بیت گئی۔ نئی شروعات میں پرانے سیاپے ڈالنے کا فائدہ؟..... حیاتی رہی تو ایک فلیٹ کیا، تُو پورا پروجیکٹ اپنے نام لگوا لینا۔ کیوں لاکھانی!'' گلبہار نے حوصلہ طلب نظروں سے لاکھانی کی طرف دیکھا۔
''ہاں ہاں، کیوں نہیں؟'' لاکھانی، گلبہار کی حمایت پر خاصا شکر گزار دکھائی دے رہا تھا۔ ''اوپر والے نے چاہا تو اب کے وارے نیارے ہوں گے۔ مہکار کی ساری سکایتیں دُور ہو جائیں گی۔''
''چل تے فیر یہ طے ہو گیا۔'' گلبہار نے بحث سمیٹتے ہوئے فیصلہ کُن انداز میں دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے اعلان کیا۔ ''اب یہ بتا، تُو رشید کو لے کر کب آئے گا؟''
''آج سام کو ہی میں اسے لے آتا ہوں۔ جب ایک کام کرنا ہی ہے تو دیر کیسی؟''
اور اسی شام لاکھانی، رشید کو لئے مہکار کے گھر جا پہنچا تھا۔
''سو بسم اللہ جی..... رُوٹھے ہوئے پروہنے آئے ہیں..... اَج تو ہمارے گھر کی تقدیر جاگ اُٹھی۔'' گلبہار نے خوشامدی انداز میں مسکرا کر ان دونوں کا استقبال کیا تھا۔ گلبہار پر نظر پڑتے ہی رشید کو اس کا گزشتہ سرد اور تلخ روّیہ یاد آ گیا تھا۔ مگر لاکھانی نے اُسے کہنی مار کر شانت رہنے کا اشارہ کیا تھا۔
''تجھے گلبہار سے کیا لینا؟'' راستے بھر وہ اسے یہی سمجھاتا آیا تھا۔ ''تیرا تعلق تو مہکار سے ہے۔ وہ کل بھی تجھ پہ فدا تھی، آج بھی تیری راہ دیکھ رہی ہے۔''
رشید، لاکھانی کے ساتھ قدم بڑھاتا ڈرائنگ روم میں جا داخل ہوا تھا۔ تب ہی سولہ سنگھار کیے ناز و ادا سے لہراتی، بل کھاتی مہکار کمرے میں داخل ہوئی تھی۔
''میں صدقے جاؤں..... آج سرکار راستہ بھول کر اِدھر کیسے آ گئے؟''
رشید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس یک ٹک اس کی جانب تکتا رہا تھا۔ گو کہ ان اڑھائی تین سالوں نے مہکار پر خاصا اثر کیا تھا، اس کے باوجود اب بھی وہ خاصی دلکش اور پُرکشش دکھائی دے رہی تھی۔
''آپ کھڑے کیوں ہیں؟..... بیٹھئے نا۔'' رشید کو اپنی جگہ پر گم صم سا کھڑا دیکھ کر مہکار نے اِٹھلا کر کہا اور آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر صوفے پر بٹھا دیا۔
اور اس رات، رات گئے جب رشید واپس اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا تو اس کا مہکار اور گلبہار سے سارا شکوہ دُھل

چکا تھا۔ مہکار کی مہکتی قربت نے برسوں کی دُوری لمحوں میں دُور کر دی تھی اور اس کا دل صاف ہو گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر مہکار کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا تھا۔

اور جب سے رشید کا مہکار سے ناطہ جڑا تھا، نمرہ سے اس کا تعلق برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ سلطانہ اس کے ساتھ کس طرح کے ظلم و ستم روا رکھے ہوئے ہے۔ رات دن کس کس طرح اس کی زندگی اجیرن کی ہوئی ہے، اب رشید کو اس کی ذرّہ بھر پروانہ تھی۔ سلطانہ، رشید کے اس پرانے معاشقے کے ازسرِنو استوار ہونے کے حادثے سے بے خبر تھی۔ مگر نمرہ میں اس کی ختم ہوتی دلچسپی کو وہ بڑی شدت سے محسوس کر رہی تھی اور اُس کے روّیے کو وہ اپنے سکھانے پڑھانے کا کمال سمجھ رہی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ لوہا گرم ہو رہا ہے۔ کسی بھی دن ایک کاری ضرب لگا کر اس ناطے کو ہمیشہ کے لئے توڑا جا سکتا ہے۔ سو اب اس کو فیصلے کی اس گھڑی کا انتظار تھا۔

اور جلد ہی اُس کا انتظار ختم ہو گیا۔

رشید ہمیشہ ہی شراب پیتا تھا، مگر آج کل وہ اکثر نشے میں دُھت رہنے لگا تھا۔ اسی شام وہ نشے میں لڑکھڑاتا ہوا گھر میں داخل ہوا تو سلطانہ نے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق دہائیاں دینی شروع کر دیں۔

''ارے تُو تو نکل جاتا ہے گھر سے، پھر نشے میں ڈوبا گھر میں گھستا ہے..... اور مجھے اس پاپن کے ساتھ گھر میں قید کر رکھا ہے۔''

''کون پاپن؟'' رشید نے حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔

''ارے یہی بدبخت گناہگار۔ جان کس کی کالک ہمارے خاندان کے منہ پر ملنے جا رہی ہے۔'' سلطانہ نے کچن کے دروازے پر کھڑی ڈری سہمی نمرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تجھ سے سچ کہتی ہوں رشید! اس کا حرام کا بچہ میں اپنے گھر میں برداشت نہیں کروں گی۔ اگر تُو نے اس کا کوئی انتظام نہیں کیا تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی..... قصہ ہی ختم۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو اماں!'' رشید نے سلطانہ کو بانہوں میں بھرتے ہوئے پیار کیا۔ ''زہر کھائیں تمہارے دشمن۔ یہ گھر تمہارا ہے۔ تم رہو گی اس گھر میں۔''

''نہ بابا!..... میں اس بدکردار، آوارہ کے ساتھ نہیں رہنے والی۔'' سلطانہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''میں نے تو سوچا ہے، کل ہی لاہور کے لئے روانہ ہو جاؤں گی۔ اب تو اس گھر میں یہ رہے گی یا میں۔''

''میں نے کہا نا، تم رہو گی۔'' رشید نے زور دے کر کہا۔ پھر اس نے پلٹ کر نمو کی طرف دیکھا۔ ''اماں! اگر تم نہیں چاہتیں کہ یہ اس گھر میں رہے تو..... تم اسے نکال کیوں نہیں دیتیں؟''

''ارے میں کیسے نکالوں؟'' سلطانہ جلدی سے بولی۔ ''یہ کام تو تیرا ہے۔ تین لفظ بول اور پھینک آ اسے اس کے بھائی کے گھر۔''

''بھائی کے گھر.....؟'' رشید نے سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔

''اور نہیں تو کیا۔'' سلطانہ تیزی سے بولی۔ ''اس کے بدذات بھائی سے اپنے تین لاکھ روپے بھی تو نکلوانے ہیں۔ اس آوارہ، بدچلن کی خاطر اتنی بڑی رقم اُس حسنہ نے تجھ سے اینٹھ لی۔ تیری تو عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔''

''ہوں۔'' رشید نے تائید بھرے انداز میں سر ہلایا۔

''اب کیا سوچ رہا ہے؟..... مار اس کے منہ پر طلاق کا جوتا..... اور نکال پھینک اسے گھر سے۔ ہمیں نہیں چاہئے حرام کی اولاد..... ہاں نہیں تو۔''

''حرام کی اولاد......'' رشید کی نشے سے گلابی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا نمرہ کی طرف بڑھا۔ ''آوارہ.....بدچلن......کسی اور کا بچہ میرے نام لگا رہی ہے۔''

''خدا کے لئے رشید!.....ایسا مت کیجئے۔'' نمرہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑائی۔ ''اپنے بچے کو گالی مت دیجئے......یہ آپ کا بچہ ہے۔''

''بس.....بہت سن چکا تیری بکواس۔'' رشید خوفناک آواز میں دھاڑا۔ ''اماں ٹھیک کہتی ہے۔ تجھ جیسی معمولی لڑکی کی خاطر بلاوجہ میں نے تین لاکھ روپے لٹا دیئے......اب مجھے میری رقم واپس چاہئے۔''

''رشید!.....آپ.....'' نمرہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ نشے میں چُور رشید کو کس طرح سمجھائے۔

''نکل.....چل نکل اس گھر سے۔'' رشید نے بازو سے پکڑ کر نمرہ کو سیڑھیوں کی طرف دھکیلا۔ ''تجھ جیسی بدچلن عورت مجھے اپنے گھر میں نہیں رکھنی۔ نکل، دفع ہو میرے گھر سے۔''

''رشید! میں آپ کی بیوی ہوں.....آپ کے ہونے والے بچے کی ماں......پلیز میرے ساتھ ایسا سلوک مت کیجئے......میں کہاں جاؤں گی؟'' نمرہ نے گڑگڑاتے ہوئے رشید کے ہاتھ تھام لئے۔

''تُو جہنم میں جا......مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔'' رشید نے اسے دھکا دیا۔

''نہیں رشید! نہیں......'' نمو، رشید کے قدموں میں جھک گئی۔ ''آپ نشے میں ہیں۔ آپ کو پتہ نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں، کیا کر رہے ہیں......خدارا سمجھنے کی کوشش کیجئے۔''

''نن.....نہیں۔'' رشید نے انگلی اُٹھا کر نفی میں ہلائی۔ ''اب میں کچھ نہیں سنوں گا اور کچھ نہیں سمجھوں گا...... کیوں اماں؟''

''ارے یہ بدذات ایسے تھوڑی جائے گی؟......اس کے منہ پر دو ہاتھ لگا......طلاق کے تین بول بول۔ اور ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا لے جا۔ پھینک آ اس کے بھائی کے گھر پر۔''

''نہیں اماں!.....خدا کے لئے ایسا مت کہئے۔'' نمرہ نے سلطانہ کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ ''مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ بس اس گھر کے ایک کونے میں پڑا رہنے دیجئے۔''

''نہیں۔ اب تُو اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔'' رشید جھومتا ہوا نمرہ کی طرف بڑھا۔ ''میں آج روز روز کی یہ جھک جھک ختم کر دوں گا۔ تیری بدچلنی کی یہ کہانی آج ختم......یہ بچہ.....تو سب......سب ختم۔''

پھر اُس نے انگلی اٹھا کر نمرہ کی طرف اشارہ کیا۔

''بہت چاہ سے میں تجھے بیاہ کر لایا تھا......حماقت کی......تُو اس قابل نہیں تھی......اس لئے آج میں یہ ناطہ توڑتا ہوں۔''

''نہیں۔'' نمرہ چیختی ہوئی آگے بڑھی۔ ''رشید! خدا کے لئے.....''

''میں آج......بلکہ ابھی......میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔''

''نہیں.....نہیں......'' نمرہ ساری جان سے لرز اُٹھی تھی۔

''میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔'' رشید ایک بار پھر دھاڑا۔

''نہیں۔'' نمرہ دیوار سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ رشید کا تیسری بار ادا کیا گیا جملہ اس کے آنسوؤں کے ریلے میں بہہ گیا تھا۔ جس رشتے کو بنائے رکھنے کی خاطر وہ پچھلے دو سالوں سے ہر ستم، ہر ظلم خاموشی سے سہے جا رہی تھی، سلطانہ اور رشید کا دل جیتنے کی خاطر اس نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔ خدمت، محبت، وفا، چاہت، ہر ہر انداز سے اُس نے

اَن چاہے رشتے کو قائم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ سلطانہ کے طعنے سہے تھے۔ رشید کی گالیاں اور مار سہی تھی۔ اپنے بچے پر ناجائز ہونے کا الزام سہا تھا کیا کیا نہ جتن کیئے تھے۔ مگر پھر بھی وہ رشتہ قائم نہ رکھ سکی تھی۔ رشید کے منہ سے نکلے تین لفظوں کی تلوار نے ہر تعلق، ہر ناطہ قطع کر دیا تھا۔ رشید ہی کیا، اس کے دل و جان کے دھاگے کاٹ کر رکھ دیئے تھے۔ اس کے جسم و روح کا رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ وہ بے جان پتھر کی سی مورت کی صورت اپنی جگہ ساکت کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے رشید کی سمت تکے جا رہی تھی۔ چند لمحوں پہلے تک یہ شخص اس کے دل، جسم اور روح کا مالک تھا۔ اور تین لفظوں کی ادائیگی کے بعد وہ اب اس کے لئے اجنبی ہو گیا تھا۔ سلطانہ کے مکروہ چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ آخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی۔

''ارے منہ کیا تک رہا ہے؟..... چوٹی سے پکڑ کر اسے اس کے بھائی کے گھر پھینک آ...... خس کم جہاں پاک۔''

سلطانہ اپنی کامیابی پر بے حد خوش تھی۔ رشید اسے کھینچتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے لایا تھا۔ اسے گاڑی کے قریب دھکیل کر وہ چابی لینے دوبارہ اوپر چلا گیا تھا۔ نمرہ بے حس و حرکت زمین پر بیٹھی تھی۔ رشید اسے طلاق دے چکا تھا۔ اس گھر سے اور اس سے اس کا ہر رشتہ ختم ہو چکا تھا۔ دیکھا جاتا تو اس طلاق پر ملال کے بجائے اسے خوشی ہونی چاہئے تھی۔ اس شادی نے اسے کون سی خوشی دی تھی جو اس شادی کے ختم ہونے کا غم کرتی۔ مگر غم تھا کہ لہو کے ساتھ اس کے رگ و پے میں سرائیت کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں رشید گاڑی کی چابی لئے نیچے اُترا، گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیلا اور گاڑی دوڑاتا ہوا انو کے گھر کی طرف چلا۔

حسنہ کو اس کے حالات کی لمحہ لمحہ کی خبر تھی۔ اور اس کی بدتر زندگی پر وہ بے حد خوش تھی۔ اسے تو پہلے ہی سے اندازہ تھا کہ رشید جیسے حُسن پرست اور عاشق فطرت شخص کے ساتھ شادی کا آخر کار یہی انجام ہونا تھا۔ اسی لئے پہلے ہی دن سے اس نے انو کے کان میں یہ بات ڈالنی شروع کر دی تھی کہ نمو جیسی پڑھی لکھی اور آزاد خیال لڑکی کا کسی بھی گھر میں گزارہ ہونا مشکل ہے۔

''ہماری اماں کچھ غلط تو نہیں کہتی تھیں کہ پڑھائی لکھائی عورت کا دماغ خراب کر دیتی ہیں۔'' حسنہ فلسفیانہ انداز میں کہتی۔

''اللہ رکھے ہم پانچ پانچ بھائیوں کے ہوتے، پانچویں سے آگے نہ پڑھ سکے...... بھائیوں نے کہا بس پانچ جماعتیں بہت ہیں۔ یہ تمہاری تو عقل پر پتھر پڑے ہوئے تھے...... ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے اُسے...... میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود اسے کالج میں داخل کروا دیا۔ کالج یونیورسٹی کی پڑھی لکھی لڑکیاں بھلا سسرال میں گزارہ کر سکتی ہیں؟..... دیکھنا کسی دن میاں کے منہ پر جوتا مار کر آ موجود ہو گی تمہارے دروازے پر۔''

اور آج وہ دن آ گیا تھا۔

رشید نے اسے کھینچ کر گاڑی سے نکالا۔

سامنے انو کا گھر تھا۔ اوپر کی منزل تعمیر ہو چکی تھی۔ غالباً کرائے دار بھی آ چکے تھے۔

دروازہ کھلا۔ انو ہکا بکا سامنے کھڑا تھا۔ پیچھے حسنہ گود میں بچہ لئے موجود تھی۔

''یہ تمہاری بہن آوارہ.....'' رشید نے بازو سے گھسیٹ کر نمو کو سامنے کیا۔ ''اس کے پیٹ میں جانے کس کا بچہ ہے..... میں نے اسے تین طلاق دے دی ہے..... اسے سنبھالو۔'' اس نے بے دردی سے نمو کو انو کی طرف دھکیلا۔ ''اور میرے تین لاکھ روپے ایک ہفتے میں لوٹا دو۔ سمجھے؟''

رشید نشے میں ٹوٹے جملوں اور لڑکھڑاتے لہجے میں اپنا مؤقف بیان کر کے رخصت ہو چکا تھا۔ اور وہ کوئی جرم کئے بنا ہی سر جھکائے مجرم بنی کھڑی تھی۔ ہراساں اور لرزیدہ۔

''دیکھا..... دیکھا تم نے؟'' حسنہ، انو کو ایک طرف ہٹاتی آگے بڑھی۔ انو اب تک آنکھیں پھاڑے منہ کھولے حیرت و بے یقینی کی تصویر بنا سچویشن کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رشید، نمرہ پر بدچلنی کا الزام لگا کر اس کی کوکھ میں پلتے بچے کو اپنا ماننے سے انکار کر کے، اسے طلاق دے کر انو کے دروازے پر پھینک دیا تھا۔ بات تو بڑی واضح تھی۔ پھر بھی انو سمجھنے سے قاصر تھا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' اس نے منہ ہی منہ میں بدبدا کر حسنہ سے سوال کیا تھا۔

''یہ سب تمہارے بے جا لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔'' حسنہ دانت کچکچا کر بولی۔ ''اور پڑھاؤ کالج میں..... کیسا نام روشن کیا ہے اس نے بھائی کا..... پوچھو..... اس سے پوچھو، کس سے منہ کالا کیا اس نے جو ہیرے جیسے میاں نے اس کے منہ پر طلاق کی کالک مل کر اسے گھر سے نکالا ہے۔''

حسنہ نے آگے بڑھ کر نمرہ کا بازو پکڑ کر زور زور سے ہلاتے ہوئے انو کو مخاطب کر کے کہا۔

''ذرا اس کے کرتوت تو دیکھو..... اور کیسی معصوم صورت بنائے کھڑی ہے۔'' پھر وہ تیزی سے پلٹی اور انو کو دھکیلتی ہوئی بولی۔ ''ارے میں کہتی ہوں، تمہیں کیوں سانپ سونگھ گیا؟..... بولتے کچھ کیوں نہیں؟''

انو کو جیسے ہوش آ گیا۔ وہ سحر زدہ سا نمو کی طرف بڑھا جو ہاتھوں سے چہرہ چھپائے سسک سسک کر رو رہی تھی۔

''نمو!..... نمو! یہ سب کیا ہے؟'' انو کی آواز میں حیرت کے ساتھ بے بسی بھی تھی۔

''بھیا!..... بھیا!'' اس سے پہلے کہ نمو تڑپ کر انو کے سینے سے جا لگتی، حسنہ بیچ میں آ گئی۔

''میں بتاتی ہوں یہ سب کیا ہے۔'' وہ کھولتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''یہ بدذات لڑکی میاں کے گھر سے اپنی ناک کٹوا کر، جوتے کھا کر واپس آ گئی ہے۔ ارے قسمت سے اسے محلوں کا راجہ ملا تھا..... مگر یہ بدبخت وہاں بھی نہ رہ سکی..... پھر آ گئی اس در پر..... میری قسمت کو رونے..... مگر دیکھو جی! میں صاف کہتی ہوں، اب یہ یہاں نہیں رہ سکتی۔ اسے اسی وقت نکالو یہاں سے۔''

پھر وہ خود ہی آگے بڑھی اور نمو کو دھکیلتے ہوئے بولی۔

''چل نکل یہاں سے..... اب تیرا اس گھر سے یا ہم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

''بھابی.....!'' نمرہ نے ہراساں لہجے میں دہائی دی۔ ''ایسا مت کہو بھابی!..... میرا بھیا کے سوا اور ہے ہی کون؟''

''مر گیا تیرے لئے تیرا بھیا'' حسنہ نے شعلہ بار نظروں سے اسے گھورتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔ ''چل دفع ہو یہاں سے۔'' اس نے نمو کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف گھسیٹا۔

''بھابی! ایسا مت کرو۔ میں کہاں جاؤں گی بھابی!'' نمو بے بسی و بے کسی سے گڑگڑائی۔

''کہیں بھی جا..... مگر اب اس گھر میں تیرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ نکل یہاں سے۔'' حسنہ نے باقاعدہ اسے دھکا دے کر باہر کی طرف دھکیلا۔

''بھیا!..... بھیا!'' نمو نے رحم طلب نگاہوں سے انو کی طرف دیکھا۔

''ٹھہرو حسنہ!'' انو آگے بڑھا۔

''تم بیچ میں مت بولو جی۔'' حسنہ نے پلٹ کر غصیلی نظروں سے انو کو دیکھا۔

''مگر..... یہ یہاں.....؟'' انو نے کچھ کہنا چاہا مگر حسنہ نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''نہیں۔ یہ اب یہاں نہیں رہ سکتی۔''

''مگر تم.....سمجھنے کی کوشش کرو۔'' انو دبے لہجے میں گویا ہوا۔''یہ یہاں نہیں رہے گی تو کہاں جائے گی؟''

''سمجھنے کی کوشش تو تم کرو میاں.....!'' حسنہ تیزی سے میاں کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو ہوتی ہوئی بولی۔ اس کا لہجہ خاصا دھیما اور سمجھانے والا تھا۔''ابھی سنا نہیں تھا؟ رشید تین لاکھ روپوں کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اگر یہ یہاں رہی تو وہ ہمارے سینے پر سوار ہو کر ہمارے حلق سے اپنے روپے نکلوا لے گا۔ سوچو! کہاں سے دیں گے اتنا روپیہ؟''

انو کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ بہن کی ہمدردی میں جاگتا بے نام سا احساس پھر سے بے حسی کے پردے میں گم ہوتا محسوس ہوا۔ اس نے تو یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ نمو کے ساتھ ہمدردی اتنی مہنگی بھی پڑ سکتی ہے.....اسے جھاگ کی طرح بیٹھتے دیکھ کر حسنہ نے اور زیادہ پُر تاثیر انداز سے بات آگے بڑھائی۔

''اور.....اگر یہ یہاں نہیں ہو گی تو اُلٹا ہم اس سے پوچھیں گے کہ نمو کہاں ہے؟.....وہ روپے مانگے گا تو اس سے کہیں گے کہ ہماری چیز لوٹا دے اور اپنا روپیہ لے جا۔ کیوں؟''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' انو نے تائید بھرے انداز میں کہا۔ دماغ حسنہ کی بات سے قائل ہو گیا تھا۔ مگر دل اب بھی نمو کی طرف متوجہ تھا۔

''مگر......یہ نمو......اس کا......''

''تم اس کی فکر نہ کرو۔ تم اندر چلو۔ میں اس کا انتظام کرتی ہوں۔'' حسنہ نے انو کو رسانیت سے اندر دھکیلتے ہوئے دھیمے مگر پُر عزم لہجے میں کہا اور انو نہ چاہتے ہوئے بھی اندر کی طرف مڑ گیا۔

''بھیا.....'' نمو کے دل سے نکلنے والی صدا لبوں تک آنے سے پہلے ہی دم توڑ گئی تھی۔ اس نے بے یقین نظروں سے انو کو اندر جاتے دیکھا، جس کی گود میں کھیل کر وہ بڑی ہوئی تھی۔ جس کی انگلی تھام کر اس نے چلنا سیکھا تھا۔ جس کی خوشی کی خاطر اس نے رشید جیسے انسان سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آج وہی بھائی اسے حالات کے بھنور میں ڈوبنے کے لئے اکیلا چھوڑ گیا تھا۔ انو کا حسنہ سے شادی کے بعد جس انداز میں روّیہ بدلا تھا اور نمو کی رشید سے شادی کر دینے کے بعد پچھلے دو سالوں میں اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نمو کی خبر نہ لی تھی۔ اس سے بھی نمو کو اس کی بے حسی اور بے رخی کا اندازہ ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر اس کے سینے میں بہن کا جو دل تھا، وہ بھائی سے نا اُمید اور مایوس ہونے کو تیار ہی نہ تھا۔ یہ عورت کا دل بھی عجیب ہوتا ہے۔ ہمیشہ کسی نہ کسی مرد کے لئے دھڑکتا رہتا ہے۔ امید اور آس لگائے رکھتا ہے۔ جبکہ مرد اسے ہر روپ میں دھوکا ہی دیتا ہے۔ خواہ باپ ہو، شوہر یا بھائی.....جبکہ ظلم اور دکھ درد کے سوا اس کے پاس عورت کے لئے ہوتا ہی کیا ہے؟

حسنہ نے گود میں اٹھائے بچے کو کونے میں پڑی چارپائی پر لٹا دیا تھا اور اب وہ آستینیں چڑھا کر نمرہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ نمرہ نے اشکبار آنکھوں سے آخری بار گھر کے اندر دیکھا۔ انو کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ غالباً وہ کمرے میں جا چکا تھا۔ جس سے رشتہ تھا، اُمید تھی، وہی دامن چھڑا کر جا چکا تھا۔ تو پھر حسنہ سے اسے کیا لینا تھا، جب اپنا خون ہی یوں نظر چرا کر چلا گیا تو وہ اس عورت سے جس سے اس کا کوئی رشتہ بھی نہ تھا، کیا اُمید رکھتی؟ کیا سوال کرتی؟ سو اُس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے بھیگے رخسار پونچھے اور اپنے بکھرے وجود کو سمیٹ کر باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ بِنا ایک لفظ کہے۔ گلی کے آخری سرے پر کھڑے نیم کے گھنے پیڑ تلے وہ دم بھر کو رُکی تھی۔

اس پیڑ سے اس کا برسوں پرانا ناطہ تھا۔ اس کی گھنی چھاؤں میں کھیل کُود کر اس کا بچپن گزرا تھا۔ زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں اس پیڑ نے ہمیشہ ہی اسے ممتا بھرا سایہ مہیا کیا تھا۔ کتنا اپنا، کتنا پیارا لگتا تھا اسے یہ پیڑ.....مگر شاید آج وہ

اُ ری ہار اس پیڑ کے تنے سے ٹک کر کھڑی تھی۔ آج اس پیڑ سے بھی شاید ہمیشہ کے لئے ناطہ ٹوٹنے والا تھا۔ ایک ایک
ے سارے ہی رشتے ٹوٹتے جا رہے تھے۔ حالات کے اس گرداب میں وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ مردوں کے اس
معاشرے میں کوئی عورت، مرد کے سہارے کے بغیر کیونکر زندہ رہ سکتی تھی؟ مگر اس کی زندگی سے ہر مرد نے ناطہ توڑ لیا تھا۔
اس کے شوہر رشید نے، اس کے بھائی انو نے...... اب وہ بالکل اکیلی تھی۔ اس کے پاس نہ چھت تھی، نہ چہار دیواری اور
نہ چادر...... رشید نے اس سے چھت اور چہار دیواری اور انو نے چادر چھین لی تھی سو وہ بے نام ونشان اور بے شناخت
ہو گئی تھی۔ اب وہ نہ کسی کی بیوی تھی نہ کسی کی بہن۔ رشتوں نے اس کے چہرے سے اپنے ناموں کے لیبل اُتار لئے
تھے۔ اب وہ صرف ایک عورت تھی...... ایک ٹھکرائی ہوئی، بے مایہ اور حرماں نصیب عورت...... جس کا کوئی گھر تھا نہ
ٹھکانہ...... نہ کوئی اپنا تھا نہ پرایا...... نہ کوئی منزل تھی، نہ کوئی راستہ..... پھر وہ جاتی تو کہاں جاتی؟ یوں تنہا ہو کر زندہ رہنے
کا اسے تجربہ ہی کیا تھا؟ اور یوں زندہ رہنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

ہاں، موت ہی اس کی منزل تھی۔ اس نے پورے یقین سے سوچا تھا۔ اس طرح زندہ رہنے سے ہزار درجہ بہتر ہے
کہ موت کو گلے لگا لیا جائے۔ ریلوے ٹریک یہاں سے زیادہ دُور نہ تھا۔ رات کی تاریکی میں آنے والی کوئی بھی ٹرین اُس
کی زندگی کی یہ بے مصرف اور بے معنی شمع خاموشی سے، رازداری سے گُل کر سکتی تھی۔ سو پورے عزم کے ساتھ وہ پلٹی تھی۔
تب ہی نیم کے سال خوردہ پیڑ کی ایک خشک ٹہنی اس کے پیٹ میں چبھ گئی تھی۔ اور بالکل اچانک ہی اسے اپنے پیٹ میں
ایک ہلچل سی جاگتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ اپنوں کی سنگ دلی و بے رحمی اور اپنی ذات کی بے بسی و بے کسی کے چکر میں یوں گم
ہوئی تھی کہ اپنے وجود میں پلتے اس وجود کو بھول ہی گئی تھی۔ سو وہ ننھی سی جان، جو ابھی تخلیق کے مراحل میں وجود کی بھول
بھلیوں میں گم تھی، نیست سے ہیئت کی منزل کی طرف محوِ سفر تھی، وہ ننھی سی کونپل جس نے زمین کی کوکھ سے ابھی اپنا سر بھی
نہ اُبھارا تھا، وہ اپنے ساتھ اسے بھی فنا کی پنہائیوں میں غرق کرنے جا رہی تھی۔ اس کا وہ بچہ جو ابھی اس کی گود میں بھی نہ
آیا تھا، وہ اسے قبر کی آغوش میں دینے جا رہی تھی۔ وہ بچہ...... جس کا باپ اسے اپنا نام دینے کو تیار نہ تھا...... اس کا ماموں
اس کی ماں کو پناہ دینے پر آمادہ نہ تھا...... اور اس کی ماں اس کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھی۔

دنیا کا ہر رشتہ بودا اور چھوٹا ہو سکتا ہے...... مگر ماں کا رشتہ...... یہ رشتہ بھی کبھی جھوٹا اور چھوٹا ہو سکتا ہے؟..... مگر کیسی ماں
تھی وہ...... جو حالات کے سامنے سر جھکا کر اپنے بچے کو موت کی آگ میں جھونکنے جا رہی تھی۔ اپنی آنکھوں کے سب
سے انوکھے اور مسحور کن خواب کو وہ اپنے ہی ہاتھوں نوچنے جا رہی تھی۔ اپنے مستقبل کی امید کا خود ہی گلا گھونٹنے چلی تھی۔

'یہ تُو کیا کرنے جا رہی ہے نمو؟...... تُو اب اکیلی نہیں ہے...... تیرے ساتھ کوئی اور بھی ہے...... ایک لڑکی ہونے کے
ناطے تُو کمزور ہو سکتی ہے مگر ایک ماں کے رشتے سے تُو بہت مضبوط ہے۔ تُو اپنے بچے کے لئے ایک آہنی حصار ہے......
ایک سیسہ پلائی دیوار ہے...... بھلا تجھے ٹوٹ کر بکھرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ تجھے زندہ رہنا ہے نمو!...... اپنی خاطر نہ
سہی، اپنے ہونے والے بچے کی خاطر...... کیونکہ ماں زندگی دیتی ہے...... زندگی لیتی نہیں ہے۔'

ایک نئے ولولے نے اس کے شکستہ وجود میں ایک بے نام سی طاقت بھر دی تھی۔ اس کے لڑکھڑاتے قدم اور لرزیدہ
جسم ٹھہر سا گیا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اپنی بھیگی پلکیں جھپک کر چاروں طرف دیکھا اور ایک نئے حوصلے سے اس نے
اپنے قدم آگے بڑھا دیئے۔

چھوٹی چھوٹی نیم دراز گلیوں سے گزرتی کھیل کے مستطیل میدان کو عبور کرتی وہ متوسط طبقے کی اس کالونی میں داخل
ہو گئی تھی، جہاں تارکول کی شفاف سڑکوں کے دونوں جانب بنگلہ نما کشادہ اور خوش نما گھر ایستادہ تھے۔ کئی راستوں سے
گزرتی آخر وہ ایک گھر کے سامنے آ ٹھہری تھی۔

''زندگی میں کبھی ضرورت پڑے تو مجھے آواز ضرور دینا۔'' ایک مشفق اور مانوس آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی اور اس کی نظریں مرمر کے گرے ستون پر آویزاں نیم پلیٹ پر مرکوز تھیں۔ پلر کے اوپر چوکور فانوس میں کم پاور کے بلب روشن تھے اور مدھم زرد اُجالے میں ''پروفیسر آفاق صدیقی'' کا نام زریں حروف میں جگمگا رہا تھا۔ نمو نے ہاتھ بڑھا کر اپنی سرد اور بے جان اُنگلی ڈور بل کے بٹن پر رکھ دی تھی اور اس وقت تک بٹن دباتی رہی، جب تک کہ بند گیٹ کے اس پار تیز قدموں کی چاپ نہیں سنائی دی تھی۔

''کک.... کون ہے؟'' گیٹ کے اس پار غفور کی لڑکپن اور عنفوانِ شباب کی منزلوں کی ملی جلی کیفیت سے مزین آواز اُبھری تھی۔

''مم..... میں.....؟'' نمو ایک دم سے ہراساں ہوگئی تھی۔

''کیا..... بتائیے کون ہے؟'' اُس کی شناخت تو چھن گئی تھی۔ اب نہ وہ رشید کی بیوی تھی نہ انو کی بہن..... کون تھی وہ؟...... پر بہت جلد اُسے ایک نئی، پائیدار اور قابلِ فخر شناخت ملنے والی تھی۔ ایک انوکھی پہچان۔ غالباً غفور نے گیٹ کی درز سے اسے دیکھا تھا اور دیکھ کر کھٹاک سے گیٹ کھول دیا تھا۔ ''آپ کون؟''

گیٹ کے پلر پر آویزاں لیمپ کی مدھم روشنی میں وہ پہلی نگاہ میں اسے پہچان نہیں سکا تھا۔

''مم..... میں نمو.....'' نمرہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنا تعارف کیونکر کروائے۔ اس کے پریشان بکھرے بال، ہراساں ودھواں دھواں چہرے، ملگجے لباس اور اُجڑے وجود میں آخر کئی لمحوں بعد وہ اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

''ارے نمو آپی! آپ..... اس وقت..... اور اس حال میں؟''

''غفور! کون ہے بھئی؟'' وارنڈے سے پروفیسر آفاق کی آواز سنائی دی۔

''یہ..... یہ.....'' غفور بوکھلائے ہوئے انداز میں ہکلا کر رہ گیا۔ ''نمو..... نمو آپی.....''

''نمو.....'' یہ نام سن کر لحظہ بھر کو آفاق صاحب سُن رہ گئے تھے۔ پھر وہ سرمئی ماربل کے ستونوں سے گھرے وارنڈے کی سیڑھیوں کے تین قدمچے تیزی سے اُترتے گیٹ اور وارنڈے کے درمیان واقع چھوٹے سے قطعہ گھاس کو روندتے گیٹ پر آموجود ہوئے تھے۔ سامنے نمو کھڑی تھی۔

اس کی بھیگی پلکوں، بکھرے بالوں، اُترے چہرے اور میلے لباس نے لحظہ بھر میں ساری داستان سنادی تھی۔ چپل سے محروم اس کے گرد آلود پیر اپنی کہانی آپ سنا رہے تھے۔

''اوہ نمو بٹیا! تم ہو.....'' وہ خوش دلی سے بولے۔ ''آؤ آؤ..... اندر آؤ.....'' وہ اسے بازو سے تھام کر لاؤنج میں لے آئے تھے۔

''غفور! ہماری بیٹی کے لئے اچھی سی چائے تو بناؤ۔'' غفور کو چائے کے لئے کہہ کر وہ نمو کی طرف متوجہ ہوئے۔

''نمو بیٹا! یہ کونے میں باتھ رُوم ہے۔ پہلے تم منہ ہاتھ دھو کے فریش ہولو..... تب تک میں غفور سے کھانے کے لئے کہتا ہوں۔''

''انکل.....!'' اُنہیں پلٹتے دیکھ کر نمو نے اُنہیں بازو سے تھام لیا تھا۔ ''آپ مجھ سے کچھ پوچھیں گے نہیں..... کہ میں..... یہاں.....''

''نہیں۔'' آفاق صاحب نے نرم لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

''تم یہاں آئی ہو..... بس اتنا ہی کافی ہے۔'' انہوں نے نمو کو بازوؤں سے تھام کر اپنے سامنے کرلیا۔ بیاہی بیٹی

بیٹی جب اپنے باپ کے گھر آتی ہے تو ان کے سر پر آنچل اور آنکھوں میں خوشیاں ہوتی ہیں..... جب کسی بیٹی کے چہرے پر آنسوؤں کے نشان اور پیروں میں چپل نہ ہو تو باپ کو خود ہی سب کچھ سمجھ لینا چاہئے..... پوچھنے کی ضرورت کیا ہے؟......
"تمہارے باپ کا گھر ہے۔ مجھے خوشی ہے تم یہاں آئی ہو۔"

نمو نے حیران نظروں سے اس چہرے کی طرف دیکھا، جس سے اس کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ مگر آج وہ اسے دنیا میں سب سے زیادہ اپنا لگ رہا تھا۔ اس نے بے ساختہ اپنا سر ان کے سینے پر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جانے کب سے رُکے آنسو تسلسل اور تواتر سے بہے جا رہے تھے۔ آفاق صاحب نے بھی اُسے روکنے کی یا چپ کروانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ بھی اسے جی بھر کر رو لینے دینا چاہتے تھے تاکہ دل کا بوجھ اور ذہن کا غبار نکل جائے۔ خوب جی بھر کے رو لینے کے بعد وہ آنچل سے آنسو پونچھتی الگ ہو گئی تھی۔

"جاؤ منہ ہاتھ دھو لو۔" آفاق صاحب نے شفقت بھرے لہجے میں کہا تھا اور فریال نے کمرے سے اس کی پرانی سلیپر لا کر باتھ روم کے دروازے پر رکھ دی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ دروازے پر آئی تو چپل دیکھ کر ایک بار پھر اس کا دل بھر آیا تھا۔ اس نے خاموشی سے چپل میں پاؤں ڈال دیئے تھے۔ غفور چائے لے آیا تھا۔

"اب غفور میاں!...... جلدی سے کھانے کا انتظام کرو۔" چائے کا مگ نمو کے سامنے رکھتے ہوئے آفاق صاحب نے غفور کو حکم دیا اور نمو نے خاموشی سے بھاپ اُڑاتی چائے کا مگ اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

وجاہت منزل کے وسیع و کشادہ احاطے میں اُترتی سرمئی شام میں ایک عجب سی اُداسی و مایوسی رچی ہوئی تھی۔ دبے پاؤں چلتے ہوا کے نرم جھونکوں میں ایک بے نام سا ملال گھلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ہر سمت کرب انگیز سناٹا اور موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ شام ہو جانے کے باوجود عاتکہ بیگم ٹیرس پر دھری کین کی کرسیوں میں سے اپنی مخصوص کرسی پر آ کر نہ بیٹھی تھیں۔ جب سے وجاہت مرزا علیل ہوئے تھے، عاتکہ بیگم کی یہ روٹین بھی تبدیل ہو گئی تھی۔ اب وہ سرِ شام ٹیرس پر آ کر نہ بیٹھتی تھیں۔ اب نکیتا چائے کا کپ ان کے کمرے میں ہی پہنچا دیتی تھی۔ سرمد گھر پر ہوتے تو اکثر وہ بھی شام کی چائے اپنے گھر میں ہی پیتے، یا کبھی باپ کے کمرے میں۔ اور جب دل زیادہ ہی بوجھل ہوتا تو دادی کے کمرے میں چلے آتے تھے۔

نکیتا چائے کا کپ لئے عاتکہ بیگم کے کمرے میں داخل ہوئی تو سرد ملگجے اندھیرے نے اس کا سواگت کیا تھا اور چائے کا کپ میز پر رکھ کر کھڑکیوں سے پردے سرکانے لگی تھیں۔ وکٹورین طرز کے لمبوترے دریچے کھلتے ہی کمرہ سرمئی اُجالے سے بھر گیا۔ ہوا کے سبک رو نم جھونکے بھی جھجکتے ہوئے کمرے میں آ داخل ہوئے تھے۔

"اماں بی! چائے۔" عاتکہ بیگم کو چائے کی طرف متوجہ نہ پا کر نکیتا کو ان کی توجہ چائے کی طرف کروانی پڑی۔
"جلدی سے پی لیجئے۔ ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

"آں..... ہاں....." وہ چونک کر سیدھی ہوتی ہوئی بولیں۔ "سرمد میاں کہاں ہیں؟..... ابا جان کے کمرے میں ہیں؟"

نکیتا نے سر جھکا کر افسردہ لہجے میں جواب دیا اور اس کے لہجے میں افسردگی عاتکہ بیگم کے دل کو چھو سا لیا۔ ان کی آنکھوں سے جھانکتی اُداسی کچھ اور گہری ہو گئی۔ اس شام وجاہت مرزا پر فالج کا شدید حملہ ہوا تھا۔ دایاں حصہ مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ بولنے کی صلاحیت بھی مفقود ہو گئی تھی۔ بولنے کی کوشش کرتے ٹوٹے پھوٹے لفظ ہونٹوں پر آ کر دم توڑ دیتے اور بے بسی آنسوؤں کی صورت ان کی آنکھوں کی گہری جھیل میں تیرنے لگتی۔ شروع کے چار مہینوں تک ہاسپٹل میں رکھنے کے بعد اپنے فیملی ڈاکٹر رحمان صاحب کے کہنے پر آخر سرمد، وجاہت مرزا کو گھر لے آئے تھے۔ گھر میں ہی ان کے بیڈ

روم کے ساتھ ایک فزیشن روم بنا دیا گیا تھا جس میں ہمہ وقت ایک ڈاکٹر اور میل نرس موجود رہتا تھا۔ ایک فل ٹائم فزیو تھراپسٹ کی خدمات بھی حاصل کر لی گئی تھیں اور دو فی میل نرسیں گھنٹوں ان کی دیکھ بھال اور خدمت کے لئے موجود رہتیں۔ ڈاکٹر رحمان بھی بلاناغہ انہیں دیکھنے گھر آتے تھے۔

سرمد آفس و کاروبار کی ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہو کر بھاگے ہوئے گھر پہنچتے تھے اور اپنا زیادہ تر وقت باپ کے کمرے میں ہی گزارتے۔ اپنے ہاتھ سے انہیں دوا پلاتے، ان کے بے جان گھٹنوں پر روغن ملتے اور سر دباتے رہتے۔ اسد تو صرف ایک بار ہسپتال آئے تھے۔ ہوش میں آنے کے بعد وجاہت مرزا کی نظر جونہی اسد پر پڑی تھی، دوبارہ سے ان کی حالت بگڑ گئی تھی۔ اسی لئے ڈاکٹر رحمان نے اسد کو مشورہ دیا تھا کہ بہتر ہوگا کہ وجاہت مرزا کے سامنے آنے کی کوشش نہ کریں۔ رحمان صاحب نہ صرف ان کے فیملی ڈاکٹر تھے بلکہ وجاہت مرزا کے بہت اچھے دوست بھی تھے، اسی ناطے وہ گھر کے تمام حالات سے خوب واقف تھے۔ اسد گو کہ باپ کی اس حالت سے خاصے فکرمند اور پریشان تھے مگر باپ کی خفگی سے خاصے خائف بھی تھے، اسی لئے ہسپتال آنے کے باوجود پھر دوبارہ انہوں نے وجاہت مرزا کے سامنے آنے کی ہمت نہ کی تھی۔

دو چار دن تو سرمد نے وجاہت مرزا کی بیماری کو عاتکہ بیگم سے چھپائے رکھا تھا۔ مگر کب تک؟ یہ مرض تو جانے کے لئے آیا ہی نہ تھا۔ تو وہ کب تک ماں سے بیٹے کی حالت چھپا سکتے تھے؟ آخر اُنہیں دادی سے سب حال بیان کرنا پڑا تھا۔ مگر عاتکہ بیگم نے اس موقع پر حیرت انگیز تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ نہ روئی چلائی تھیں، نہ چیخی تڑپی تھیں۔ بس خاموشی سے سب کچھ سہہ گئی تھیں۔ آنکھوں میں آئے آنسو اندر ہی اندر پی گئی تھیں۔ انہیں ادراک تھا کہ اگر وہ خود ہمت ہار دیں گی تو سرمد کی ہمت کون بندھائے گا۔ اس سارے قصے میں وہ کس قدر تنہا اور اکیلے ہو گئے تھے، عاتکہ بیگم کو اس بات کا شدت سے احساس تھا۔ وسیع و عریض کاروبار کی ذمے داری، باپ کے علاج معالجے کا اہتمام، گھر اور دادی کی دیکھ بھال، سب ہی کچھ تو سرمد کے کاندھوں پر آ گیا تھا اور وہ زبان پر حرفِ شکایت لائے بنا پوری تندہی اور جانفشانی سے اپنی تمام ذمے داریاں نبھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دادی کی پرسش حالی کے بعد باپ کی تیمارداری، اپنے ہاتھوں سے انہیں کھانا کھلا کر اپنے کمرے میں جاتے اور رات گئے تک فائلوں میں سر کھپاتے۔ ایسے میں نگینا کو ان پر کبھی رحم آتا تھا تو کبھی بے طرح پیار۔ اور وہ کافی کا گرما گرم کپ لئے ان کے کمرے میں جا پہنچتی۔

''بھیا!..... کافی۔''

''ارے تم نے میرا نام کب سے بدل دیا؟'' ان کے وجیہہ چہرے پر تھکن سے پُور مسکراہٹ بکھر جاتی۔ اور نگینا یک ٹک انہیں دیکھے جاتی۔ کتنے اچھے تھے وہ...... ہر لحاظ سے مکمل اور پرفیکٹ...... شکل و صورت، حُسن و وجاہت میں یکتا، اخلاق و کردار میں لاثانی، حتیٰ کہ گھر کے نوکر چاکروں سے بھی محبت کرتے تھے۔ اور نگینا تو اُنہیں سگی بہن کی طرح عزیز تھی۔ خود نگینا کے دل میں ان کے لئے بے پناہ پیار تھا۔ وجاہت مرزا کی بیماری کے بعد سرمد نے جس طرح باپ کا دن رات خیال رکھا تھا، گھر اور کاروبار کی ذمے داریاں سنبھالی تھیں، ان کے اس انداز نے نگینا کے دل میں ان کے لئے اور عزت اور محبت بڑھا دی تھی۔

تب ہی بیڈ کے سرہانے رکھا ان کا موبائل بج اُٹھا تھا۔

''بھیا! آپ کا فون۔'' نگینا نے لپک کر موبائل ان کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔

''آں، ہاں.....'' سرمد نے کافی کا مگ ٹیبل پر رکھ کر موبائل تھام لیا تھا۔

''کیسے ہیں؟'' دوسری طرف سے فردا کی آواز اُبھری تھی۔

''سچ کہوں، وجاہت خالو کی بیماری نے تو آپ کو ہم سے چھین ہی لیا ہے۔'' فروا کی کھنکتی آواز میں اُداسی کے ساتھ شکوے کا عنصر بھی خاصا نمایاں تھا۔

ذمے داریاں بڑھ گئی تھیں۔ آفس کے کاموں سے وقت بچتا تو سرمد کی کوشش ہوتی کہ سارا وقت دادی اور باپ کی صحبت اور خدمت میں گزاریں۔ اسی لئے اب اسد کے گھر کم کم ہی جانا ہوتا تھا۔ ویسے یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وہ غیر محسوس طور پر اسد اور ثروت کو وجاہت مرزا کی اس حالت کا ذمہ دار محسوس کرنے لگے تھے۔ اور اس حقیقت کے ادراک نے خود بخود انہیں اس گھر سے دُور کر دیا تھا۔ مگر فروا کے لئے پسندیدگی اور بے نام سی اُنسیت کا احساس اپنی جگہ پر قائم تھا۔ اسی لئے جب بھی موقع ملتا یا فروا اصرار کر کے بلاتی تو وہ خالہ کے گھر چلے جاتے تھے۔ سرمد، فروا کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوگئے تھے۔ نکیتا نے کافی کا خالی مگ اُٹھایا اور خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

اب نکیتا اتنی بھی چھوٹی نہ تھی کہ فروا کے انٹرسٹ کو نہ سمجھ سکتی۔ مگر وہ اس ناطے سے خوش نہیں تھی۔ فروا کی بہن ثروت کی وجہ سے وجاہت مرزا اس حال کو پہنچے تھے۔ اب وہ سرمد پر ڈورے ڈال رہی تھی۔ وہ معمولی شکل وصورت کی چالاک عیار سی لڑکی تو کسی بھی طور سرمد جیسے شاندار، جوان اور اعلیٰ ترین انسان کے لائق نہ تھی۔

'بھیا کے لئے تو کوئی بہت ہی اچھی لڑکی ہونی چاہیے۔' وہ سرمد کو دیکھتی تو اکثر سوچا کرتی تھی۔ کوئی بہت منفرد و نایاب لڑکی جو شکل وصورت میں بھی یکتا نہ ہو بلکہ اس کا دل بھی بھیا کی طرح ہیرے کا ہو...... سونے جیسا ہو..... کہاں ہو گی وہ لڑکی؟...... وہ آسمان کی طرف دیکھ کر سوچا کرتی۔ پر اُسے یقین تھا کہ بھیا کو ایسی لڑکی ایک نہ ایک دن ضرور ملے گی..... کتنی خوش نصیب ہوگی وہ لڑکی، جو سرمد بھیا کی شریکِ زندگی بنے گی۔

''اے نِگی!..... کدھر سوچوں میں گم رہتی ہے؟'' چوکیدار خانو بابا کی آواز پر وہ چونک کر سیدھی ہوگئی تھی۔

''کیا ہے خانو بابا.....؟''

''صاب کا دوست آیا ہے..... اندر لے کے جاؤ۔'' خانو نے بتایا۔

''کون سے دوست آئے ہیں؟'' نکیتا نے سوال کیا۔

''صاحب کا کلاس فیلو اور بچپن کا دوست..... پروفیسر صاب آیا ہے۔''

''آفاق انکل آئے ہیں؟'' نکیتا ایک دم سے خوش ہوگئی تھی اور تیزی سے باہر کی طرف لپکی تھی۔ سامنے کوریڈور کی سیڑھیوں پر پروفیسر آفاق کھڑے تھے۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اُترتی آفاق صاحب کے قریب چلی گئی۔

''آداب انکل!''

''اوہو..... نکو بیٹا! کیسی ہو؟'' آفاق صاحب نے مشفق لہجے میں سوال کیا۔

''ٹھیک۔'' نکو نے مختصر جواب دیا۔

ہسپتال کے بعد سے اب آئے ہیں۔ پتہ ہے ابا جان آپ کا کتنا انتظار کرتے ہیں۔'' انہیں ساتھ لئے وجاہت مرزا کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے نکو شکایتی لہجے میں انہیں بتا رہی تھی۔ اور وہ خاموشی سے سر جھکائے ان کے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ تب ہی سامنے راہداری کے آخری سرے پر واقع کمرے کا دروازہ بالکل اچانک ہی کھلا تھا۔ اور پروفیسر آفاق اپنی جگہ تھم کر رہ گئے تھے۔ ان کی نگاہیں سامنے کی طرف جمی ہوئی تھیں۔

❁===❁===❁

اونچے اور سڈول مرمر کے ستونوں سے گھری راہداری کے آخری سرے پر واقع دروازے کے بیچوں بیچ اماں بی کھڑی تھیں۔ ساگوان کے اونچے اور کشادہ منقش دروازے کو انہوں نے اپنے ہاتھ سے تھام رکھا تھا جبکہ بائیں ہاتھ میں

چاندی کی موٹھ والی لاٹھی تھمی ہوئی تھی۔ وجاہت مرزا کی طبیعت کی خرابی کے بعد سے گویا عاتکہ بیگم مٹی کے تودے کی طرح ڈھے سی گئی تھیں اور اب چلنے پھرنے کی خاطر لاٹھی کا سہارا لینے لگی تھیں۔

پروفیسر آفاق اپنی نوجوانی کے دور سے اس وِلا میں آتے رہے تھے۔ انہوں نے عاتکہ بیگم کے عروج کا دور دیکھا تھا۔ ان کا رکھ رکھاؤ اور شان وشوکت دیکھی تھی۔ کس طرح سر اٹھا کر باوقار انداز میں چلا کرتی تھیں۔ وہ مغرور یا متکبر خاتون نہیں تھیں مگر ایک عجب سی نخوت اور تن تنا ان کے ہم رکاب رہتا تھا۔ مگر آج اُنہیں خمیدہ کمر اور لاٹھی کے سہارے کھڑے دیکھ کر آفاق صاحب حیرت زدہ بھی ہوئے تھے اور افسردہ بھی۔ وہ تیزی سے قدم بڑھاتے عاتکہ بیگم کے قریب جا پہنچے تھے۔

''آداب اماں بی!'' انہوں نے قدرے جھک کر آداب پیش کیا۔

''اوہ.....آفاق میاں......'' عاتکہ بیگم کے رنجیدہ وسنجیدہ چہرے پر مانوسیت بھری مسکراہٹ جاگی۔ ''جیتے رہیے۔''

''شکریہ اماں بی!.....آپ کیسی ہیں؟'' آفاق صاحب نے ان کا دوسا ہاتھ تھام لیا۔ وہ بھی غالباً وجاہت مرزا کے کمرے کی طرف ہی جانے کے لئے راہ داری میں نکلی تھیں۔ اب آفاق صاحب کا ہاتھ تھامے دوسرے ہاتھ سے لاٹھی سنبھالے اسے مضبوطی سے زمین پر ٹیکتے وجاہت مرزا کے کمرے کی طرف دھیمے قدموں سے بڑھ رہی تھیں۔

''بہت دنوں بعد آئے.....سب خیریت تو ہے؟'' چلتے چلتے عاتکہ بیگم نے سوال کیا۔

''اللہ کا کرم ہے۔'' آفاق صاحب نے ممنون انداز میں سر جھکا کر جواب دیا۔ ''آپ بتائیے کیسی ہیں؟''

''تمہارے سامنے ہیں۔'' چلتے چلتے لحظہ بھر کو وہ رُکیں۔ ''خدا وجاہت میاں کو صحت دے دے تو ہم پھر سے جی اُٹھیں گے۔ اب تو کبھی کبھی یوں لگتا ہے ہم زندہ ہی نہیں ہیں۔'' ان کی دھیمی اور مغموم آواز آنسوؤں کی نمی میں کہیں گم ہوگئی۔

آفاق صاحب کو اپنے دل میں تکلیف کا ایک عجب سا احساس جاگتا محسوس ہوا۔ وہ ہر کسی کی مدد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ مگر اس لمحہ، اس پل کس قدر مجبور تھے وہ کہ اپنے عزیز دوست اور ان کی بوڑھی ماں کے لئے کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ خاموشی سے سر جھکائے وجاہت مرزا کے کمرے میں داخل ہوگئے تھے۔

انہیں دیکھ کر وجاہت مرزا کی بجھی ہوئی آنکھوں میں ایک مسرت بھری کرن سی جاگی تھی اور اگلے ہی لمحے پھر راکھ سی اُڑنے لگی تھی۔

''کیسے ہو وجیہہ!'' آفاق صاحب نے ان کے شانے پر پیار بھرے انداز میں ہاتھ رکھا۔

''ٹھ.....ٹھیک۔'' ان کے لب لرزنے پر الفاظ نہ برآمد ہو سکے لیکن آفاق مرزا سمجھ گئے تھے۔

سامنے دھری دوسری کرسی پر عاتکہ بیگم بیٹھ چکی تھیں۔

ذرا ہی دیر میں نکیتا گرم گرم بھاپ اُڑاتی چائے لے آئی تھی۔ ساتھ ہی کچھ سامانِ خورونوش بھی تھا۔

''ارے بیٹی! اس کی کیا ضرورت تھی؟'' اس افسردہ ماحول میں یہ خاطر مدارات اُنہیں چبھ رہی تھی، وہ جز بز ہوتے ہوئے بولے۔ ''بھلا چائے پینے کا یہ کون سا وقت ہے؟''

''چائے ہی تو ایک ایسی شے ہے کہ جسے کسی بھی وقت پیا جا سکتا ہے۔'' نکیتا نے مسکرا کر فلسفہ بگھارا۔ اور اس کی بات پر وجاہت مرزا کے خشک لبوں پر بے نام سی مسکراہٹ لرزی تو عاتکہ بیگم بھی بے ساختہ مسکرا اُٹھیں۔

''اتنے دنوں بعد آئے ہو......اب کھانا کھا کر ہی جانا۔'' انہوں نے محبت بھرے لہجے میں اصرار سے کہا۔

''اپنی کوتاہی کا مجھے احساس ہے۔'' آفاق صاحب نے ندامت بھرے انداز میں سر جھکا کر کہا۔ ''لیکن اب آپ کو

شکایت نہیں ہوگی۔اب میں اکثر آتا رہوں گا۔“

”اوہ......آفاق انکل آئے ہیں۔“ سرمد کمرے میں داخل ہوئے تو آفاق صاحب پر نظر پڑتے ہی ان کے چہرے پر مسرور مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

آفاق صاحب نے نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ان کے وجیہہ چہرے پر اُداسیوں کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔کاروبار کی ذمے داریوں اور باپ کی بیماری نے اُنہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔اس پل وہ بے حد تھکے ہوئے، بے حد افسردہ دل لگ رہے تھے۔

نکیتا لپک کر سرمد کے لئے بھی چائے لے آئی تھی۔

آفاق صاحب کی آمد سے وجاہت مرزا کے چہرے پر جو روشنی بکھری تھی، وہ عاتکہ بیگم اور سرمد دونوں ہی کے لئے مسرت آمیز تھی۔اور خود آفاق صاحب بھی اس بات کو محسوس کر رہے تھے کہ وجاہت مرزا انہیں دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔

عاتکہ بیگم کے اصرار اور وجاہت مرزا کی دل جوئی کی خاطر وہ رات دیر تک رُکے تھے اور رات کا کھانا کھا کر ہی واپس ہوئے تھے۔

واپسی میں تمام راستے وہ یہی سوچتے رہے تھے کہ وجاہت مرزا کے لئے ایسا کیا، کیا جائے کہ ان کی بیماری میں کمی ہو اور وہ روبہ صحت ہوسکیں۔

⊛===⊛===⊛

ادھ کھلے دریچے کے اُس پار سرمئی شام اُتر رہی تھی۔ کمرے میں ملگجا سا اندھیرا اور مسحور کُن خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ خوشبو مہکار کے ریشمی لباس سے اُٹھ رہی تھی۔ سرخ جدید ڈیزائن کے حریری لباس میں آج وہ ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔

''آج تو بہت اچھی لگ رہی ہو؟'' رشید نے تحسین بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''سب آپ کی نظروں کا کمال ہے۔'' مہکار نے ناز بھرے انداز میں کہا۔ ''ویسے جناب کی تعریف کا شکریہ۔ جانتے ہو، عورت سب سے زیادہ اس مرد کی زبان سے تعریف سُن کر خوش ہوتی ہے جسے وہ پسند کرتی ہے..... اور جسے دل سے چاہتی ہے۔''

''اچھا.....'' رشید مسکرایا۔ ''تو گویا تم تعریف سن کر خوش ہوئیں؟''

''ظاہر ہے۔'' مہکار نخرے سے بولی۔

''یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم مجھے پسند کرتی ہو۔'' رشید اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''مگر یہ نہیں پتہ کہ چاہتی بھی ہو یا.....''

''سچ کہوں..... مجھے آپ سے اب عشق ہوتا جا رہا ہے۔'' مہکار نے شرمانے کی کوشش کی اور اپنی کوشش میں خاصی کامیاب بھی رہی۔

''اچھا.....'' رشید کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''اور جانتے ہو، عشق کی آخری منزل کیا ہے؟'' مہکار نے ترچھی نظروں سے رشید کی طرف دیکھا۔

''کیا؟'' رشید نے بھنویں اُچکا کر سوال کیا۔

''شادی۔'' مہکار نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔

''شادی.....؟'' رشید اُچھل پڑا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو؟''

''آپ کیا چاہتے ہیں؟'' مہکار کو اس کا یوں اُچھلنا اچھا نہیں لگا تھا۔

''صرف اور صرف تمہیں۔'' اس کے لہجے کے روٹھے پن کو محسوس کر کے رشید نے مسکرا کر جواب دیا۔

''تو بس..... بندہ جسے چاہتا ہے، اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے نا؟'' مہکار کے رُوٹھنے میں اضافہ ہوا۔ ''میں بھی آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں...... ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔'' مہکار نے اپنا سر رشید کے سینے پر ٹکا دیا۔

اُس کے ریشمیں بالوں سے اُٹھتی جانفزا خوشبو رشید کو دیوانہ بنانے کے لئے کافی تھی۔ اُس نے بازو پھیلا کر اسے اپنی پناہ میں لے لیا۔ مگر فوری طور پر اس کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔

بار بار شادی کر کے وہ اس نام سے متنفر ہو چکا تھا۔ لیکن مہکار جیسی عورت خود اپنے منہ سے شادی کی بات کرے تو

رشید کے دل کی دھڑکنوں کا بڑھ جانا قرینِ قیاس تھا۔

مرد لاکھ شادی کے نام سے گھبرائیں، کان پکڑیں۔ مگر جب کوئی حسین عورت ان سے شادی کے لئے کہتی ہے تو ان کا دل ایک فخریہ انداز سے دھڑک اُٹھتا ہے۔ خود پر ناز محسوس ہوتا ہے۔ رشید بھی اس وقت خود کو ہواؤں میں اُڑتا محسوس کر رہا تھا۔

لیکن وہ فوری طور پر کوئی جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ جب مہکار سی مہکتی عورت اس کے گلے کا ہار بنی ہو تو انکار کی گنجائش ہی کہاں تھی؟..... مگر اقرار سے پہلے وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ حالانکہ دیکھا جاتا تو اس کے اقرار کی راہ میں بھی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ وہ بے زبان گائے جیسی نمرہ جو اُس کی بیوی تھی۔ اُس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ البتہ اسے سلطانہ سے تھوڑا خوف تھا۔ کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ مہکار اور سلطانہ کا باہم نباہ خاصا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔

''اچھا تو چلیں کہیں باہر چل کر ڈنر کرتے ہیں۔'' مہکار مسکراتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

ڈنر سے واپس آ کر وہ دیر تک مہکار کی خواب گاہ میں شباب و شراب سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ اور دو بجے کے قریب لڑکھڑاتے قدموں سے گھر کے لئے روانہ ہوا تھا۔

چوکیدار نے گیٹ کھولا تھا اور وہ گاڑی پارک کر کے جھومتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تھا۔

جب سے مہکار سے تعلقات اُستوار ہوئے تھے، اُس نے اسی طرح رات گئے گھر آنے کا معمول بنا لیا تھا۔ وہ جب بھی گھر لوٹتا، نمرہ کو سلطانہ کے پیر دباتا ہوا پاتا تھا۔ آج بھی وہ یہی کام کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ فوراً ہی اس کی جانب چلی آئی تھی۔

''آپ آ گئے.....؟'' نمرہ کا سوال تھا۔

''اندھی ہے..... نظر نہیں آتا؟'' رشید نے ڈپٹ کر لڑکھڑاتے لہجے میں جواب دیا اور کھڑے کھڑے جھول گیا۔ نمرہ نے لپک کر اسے تھام لیا تھا اور اسی طرح اسے تھامے اس کے کمرے کی طرف چل دی تھی۔ اس کے بیڈ پر دھپ سے بیٹھ جانے کے بعد اس نے ہمیشہ کی طرح سوال کیا تھا۔

''کھانا لے آؤں؟''

''رات کے 2 بجے پوچھ رہی ہے، کھانا لے آؤں..... تُو پڑھی لکھی ہے یا نری جاہل؟'' پھر وہ آڑا ترچھا بیڈ پر گر گیا تھا۔ نمرہ نے حسبِ معمول اُس کے جوتے اُتارے تھے اور اندر سے اس کے کپڑے لے آئی تھی۔

''کپڑے بدل لیجئے۔'' اس نے اس کے گھٹنوں کو چھو کر دھیمی آواز سے کہا۔

''دفع کر۔'' رشید نے بزور سے گھٹنا جھٹکا۔ اور نمرہ کپڑے ایک جانب رکھ کر رشید کے پاؤں دبانے بیٹھ گئی تھی۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔

پیر دباتے دباتے اچانک ہی اسے نیند کا جھونکا آیا تھا اور اس کا سر رشید کے گھٹنے سے جا ٹکرایا تھا۔ رشید نے ایک دم سے پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔ پھر نمرہ پر نظر پڑتے ہی اسے سمجھ آ گئی تھی کہ کیا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے سیدھی ٹانگ کھینچ کر نمرہ کے پیروں پر جمائی تھی اور نمرہ نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔

''سونا ہے تو کہیں اور جا کر سو مر۔'' وہ غصے سے بولا۔

''اوہ..... سوری.....'' نمرہ نے جلدی سے کہا اور ذرا سا کھسک کر رشید کے پیروں کی طرف گٹھڑی سی ہو کر پڑ گئی۔

وہ عموماً اسی طرح رشید کے بیڈ کے پیروں کی طرف پڑ کر سو جایا کرتی تھی۔

صبح اُٹھ کر رشید اپنے پاؤں سے اسے ٹھوکر مار کر جگاتا تھا۔

''جاؤ.....چائے لے آؤ۔''

وہ جونہی اوپر پہنچا تھا، حسبِ معمول اُس نے سلطانہ کو مرغی کی طرح پھُولی ہوئی دیکھا تھا۔ صاف ظاہر تھا، وہ سخت خفا ہے۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

اور اس سے اگلی شام وہ واقعہ ہو گیا تھا، جب ماں کے کہنے میں آ کر رشید نے نمرہ کو طلاق کے تین بول پتھر کی طرح کھینچ مارے تھے اور اسے گھسیٹتا ہوا گاڑی میں ڈال کے اُس کے بھائی کے دروازے پر پھینک آیا تھا۔

اور اب رات بیتنے کے بعد جب اس نے حسبِ عادت اپنے پیروں سے نمرہ کو ٹٹولا تھا تو وہ جگہ خالی تھی۔

''کہاں مر گئی ہے؟.....چائے لے آ۔'' وہ تیز آواز میں پکار کر بولا تھا۔ اور چند ہی لمحوں بعد سلطانہ چائے کا کپ تھامے اندر داخل ہوئی تھی۔

''لے میرے لعل! چائے پی لے۔''

ماں کی آواز پر اس نے نگاہیں ترچھی کر کے اس کی جانب دیکھا۔

''یہ تم کیوں چائے لائی ہو؟.....وہ کہاں مری ہوئی ہے؟''

''اب وہ کہاں؟'' سلطانہ نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ تو دفعان ہو گئی۔ خس کم جہاں پاک۔''

''کہاں دفعان ہو گئی؟'' رشید رات کی تمام باتیں یکسر فراموش کر بیٹھا تھا۔

''ارے تُو ہی تو اُسے پھینک کر آیا ہے اس کے بھائی کے دروازے پر۔'' سلطانہ نے قدرے حیران لہجے میں جتایا۔ ''طلاق دے کر۔''

''طلاق.....؟'' رشید چونک کر سیدھا ہوا۔ ''میں نے دی طلاق؟''

''اب میاں تُو تھا تو طلاق بھی دینے کا حق تجھے ہی تھا۔'' سلطانہ کندھے اُچکا کر لطف لیتے ہوئے بولی۔ ''مجھے یہ اختیار ہوتا تو میں کب کا اسے چلتا کر دیتی۔ کم بخت ماری..... گھُنّی میسنی۔''

''اوہ.....'' ایک بے نا سازیاں کا احساس رشید کے پتھر دل میں رینگا تھا۔ ''اب چھوڑ بھی.....لے، چائے پی۔'' سلطانہ ہاتھ جھٹک کر بولی اور رشید سر جھٹک کر چائے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیا بولتے او رسید بھائی!.....آپ نے بھائی کو.....میرا مطلب ہے نمرہ کو طلاق دے دی؟'' لاکھانی، رشید سے ملنے آیا تو سلطانہ نے ہی فخریہ اُسے یہ خوشخبری سنائی تھی اور وہ تصدیق کے لئے بھاگا ہوا رشید کے پاس آیا تھا۔

''آپ نے سچی میں اُسے طلاق دے دی؟'' اس کے لہجے میں بے یقینی بے حد نمایاں تھی۔

''میں تو نشے میں تھا۔'' رشید انگڑائی لے کر بے بسی سے مسکرایا۔ ''طلاق دے دی۔ اب سچی ہوئی کہ نہیں، مجھے پتہ نہیں۔''

''تو.....وہ کِدر ہے؟.....میرا مطلب ہے نمرہ بھابی.....گھر میں تو نہیں ہے۔''

''اُسے رات کو ہی میں اس کے بھائی کے گھر چھوڑ آیا تھا۔'' رشید نے وضاحت کی۔

''وہ بھی نسے میں؟'' لاکھانی نے ہاتھ گھما کر سوال کیا۔

''ہاں یار!.....اچھا اب چھوڑ یہ قصہ۔ یہ بتا، مہکار کے پاس کب چلنا ہے؟.....میں سوچ رہا تھا.....''

لاکھانی نے افسردہ نظروں سے اُس سنگ دل مرد کی طرف دیکھا، جس نے ایک معصوم اور بے زبان عورت کو اس وقت طلاق دے کر گھر سے نکال دیا تھا، جب وہ کوکھ میں اس کا بچہ اُٹھائے پھر رہی تھی۔

''اے لاکھانی! تُو کیوں منہ لٹکائے بیٹھا ہے؟'' سلطانہ سڑ سڑ جوتی گھسیٹتی کمرے میں داخل ہوئی۔ ''تیری میا گزر

گئی کیا؟''

لاکھانی نے منہ سے کچھ نہیں کہا، بس سلگتی نظروں سے اس سنگ دل بڑھیا کی طرف دیکھا، جس نے ایک معصوم لڑکی کی زندگی برباد کر دی تھی۔

''اماں! ذرا چائے تو پلاؤ۔'' رشید نے گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کاہلی سے فرمائش کی۔

''اے..... ذرا چھوٹو تو آ لے۔'' سلطانہ نے کمر پر ہاتھ رکھ کر تھکے لہجے میں کہا۔''وہ آئے تو کسی کام والی کو بلواؤں۔ اُس کم بخت کے جانے سے یہ نقصان ہوا ہے کہ اب کام والیوں کے نخرے دیکھنے پڑیں گے۔'' سلطانہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی باہر چلی گئی تھی۔

''تو پھر.....؟'' سلطانہ کے جانے کے کئی لمحوں بعد لاکھانی نے گہرا سانس لے کر رشید کی طرف دیکھا تھا۔''تم بتا رہے تھے، مہکار نے ازخود (ازخود) سادی کی بات کی؟'' لاکھانی نے موضوع بدلا۔

''ارے ہاں یار!'' رشید اُچھل کر سیدھا ہوتا ہوا بولا۔''اب میں سوچ رہا ہوں کہ.....''

''اب تو میدان بھی صاف ہو گیا ہے۔'' اس کے رکتے ہی لاکھانی نے مسکرا کر کہا۔ اس کے لہجے میں چھپی ہلکا سا طنز اور تلخی رشید محسوس نہ کر سکا تھا۔

''نہیں خیر..... نمرہ کے ہونے سے ایسا کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔'' رشید نے سوچتی ہوئی نظروں سے لاکھانی کی طرف دیکھا۔''لیکن دیکھا جائے تو..... اب اور بھی اچھا ہو گیا ہے۔ اُس کی منحوس صورت ہر پل سامنے رہتی تو.....''

''اچھا..... تو اب کیا سوچا ہے؟'' لاکھانی، نمرہ کی برائی نظر انداز کرتا ہوا بولا۔

''اب سوچ رہا ہوں کہ جب ویکنسی خالی ہو ہی گئی ہے تو مہکار کو کیوں نہ موقع دیا جائے۔'' رشید مسکرایا۔

''بالکل۔'' لاکھانی نے پُر زور انداز میں تائید کی۔''پر اماں جی کو کون منائے گا؟'' لاکھانی نے ہاتھ سے باہر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''اُنہیں منانے کی کیا ضرورت ہے؟..... میں کوئی گناہ کرنے جا رہا ہوں؟'' رشید ناگواری سے بولا۔

''پر اماں جی کو بتانا تو ہو گا۔'' لاکھانی نے آنکھیں پھیلا کر سوال کیا۔

''جب وقت آئے گا، بتا دوں گا۔'' رشید مسلسل اس تذکرے سے اب اوب گیا تھا، ہاتھ اونچے کر کے انگڑائی لیتا ہوا بولا۔''ذرا دیکھنا یار! چھوٹو آیا کہ نہیں۔ صبح کی چائے کی ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ بس.....''

اُس نے منہ کھول کر بڑی سی جماہی لی اور لاکھانی اُٹھ کر کچن کی طرف چل دیا۔ اس وقت اُسے بھی چائے کی بڑی طلب محسوس ہو رہی تھی۔

❂===❂===❂
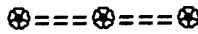
الیکٹرک پول پر بیٹھا کوا زور زور سے کائیں کائیں کیے جا رہا تھا۔

انو کی بڑی بیٹی گڑیا دلچسپی سے کوّے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جونہی وہ جھکولا لے کر اُڑا، گڑیا بھاگ کر باپ کے پیروں سے لپٹ گئی تھی۔

اور بالکل بھی اچانک انو کو نمو کا خیال آ گیا تھا۔

جب وہ اتنی بڑی تھی تو بالکل اسی طرح اس کے پیروں سے لپٹ جایا کرتی تھی۔ اُس رات جب رشید اُس کے دروازے پر دھکیل گیا تھا اور حسنہ کے کہنے پر اس نے بھی اس کی طرف سے رُخ موڑ لیا تھا..... پھر اس کے بعد سے اسے کوئی خبر نہ تھی۔ نمو کتنی دیر دروازے پر رکی رہی تھی اور کب کسی طرف نکل گئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا، نمو کہاں ہے؟ کس حال

میں ہے......اس کی بھی اسے خبر نہ تھی۔
ایک بار اسے غفور راستے میں مل گیا تھا۔اس نے اس سے کچھ سن گن لینے کی کوشش کی تھی۔
''پروفیسر صاحب تو ٹھیک ہی نا؟''
''جی انو بھیا!'' غفور نے سر ہلایا۔''لندن جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔'''' غفور نے بے پَر کی چھوڑی۔
''اچھا.....'' انو حیران ہوا''بات بھی صحیح ہے۔گھر میں اکیلے پریشان ہوتے ہوں گے.....سوچا ہوگا کہ بیٹیوں سے مل آؤں۔''
''جی.....'' غفور نے اثبات میں سر ہلایا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔
'یہ بیٹیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔' انو نے گود میں اٹھائی ہوئی گڑیا کی طرف دیکھا اور اس کے دل میں ایک بے نام سی ٹیس سب اُٹھی۔نمو کو بھی تو اس نے بیٹیوں کی طرح ہی پالا تھا۔اولاد کی طرح گود میں کھلایا تھا۔کس قدر چاہا تھا اس نے اپنی اس چہیتی بہن کو، جو اسے ماں کو کھو کر حاصل ہوئی تھی۔پر وہ ایک بار بھی اس سے ملنے اس کے سسرال نہیں گیا تھا۔وہ کس حال میں ہے، کبھی خبر تک نہ لی تھی۔
اور جب تقدیر اسے اس کے دروازے پر لے آئی تھی تو اس نے اس پر اپنے گھر کا اور اپنے دل کا دروازہ بند کر لیا تھا۔
جانے اب کہاں ہوگی وہ.....؟ اب رو رو کر یہ سوال اُس کے دل میں اٹھتا تھا۔
''لو چائے پیو۔'' حسنہ نے چائے کا مگ اس کے سامنے رکھا اور غور سے اس کے اُترے چہرے کی طرف دیکھا۔''یہ منہ پہ بارہ کیوں بج رہے ہیں؟''
''دراصل حسنہ! میں سوچ رہا تھا.....کہ اس دن کے بعد رشید نے تو مڑ کر دیکھا ہی نہیں.....تو ہم کیوں نہ نمو کو تلاش کر کے واپس گھر لے آئیں۔''
''پاگل ہوئے ہو کیا؟'' حسنہ نے ہاتھ جھٹک کر اس کی طرف دیکھا۔''اسی کو کہتے ہیں آ بیل مجھے مار.....اچھی بھلی جان چھوٹ گئی ہے.....پھر ڈھونڈ کر عذاب کو گلے لگا لو..... یہاں اپنے ہی بچوں کا پورا نہیں پڑتا، اب اس کا بچہ بھی پالو.....خبردار جو آگے سے ایسی بات سوچی بھی تو۔بیاہ کے بعد لڑکیوں کا میکے سے ہر تعلق ٹوٹ جاتا ہے.....اللہ رکھے ہمارے پانچ پانچ بھائی ہیں۔کبھی دیکھا کسی کو اس طرح کا چونچلا کرتے۔''
انو خاموش ہو گیا تھا۔بہرحال اس بات سے وہ مطمئن تھا کہ رشید نے اپنی رقم کی واپسی کے لئے کوئی تقاضہ نہیں کیا تھا.....یہی کیا کم غنیمت تھا۔

❀===❀===❀
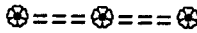
دُور مشرقی پہاڑیوں کی اوٹ سے صبح کاذب کا دُھندلا سا اُجالا پھوٹ رہا تھا۔ہوا کے نرم جھونکوں میں ایک تسکین آمیز سا احساس رچا ہوا تھا۔ورانڈے کے اس پار مختصر سے لان کے آخری سرے پر مولسری کے اونچے اور گھنے پیڑ کی شاخوں پہ آنکھیں موندے بیٹھی چڑیاں ایک ایک کر کے جاگتی جا رہی تھیں۔اور ان کی مدھم چہچہاہٹ فضا میں ایک مدھر سا سرور گھول رہی تھی۔
دبے پاؤں آگے بڑھتے لمحوں کے ساتھ ہی دُور کسی مسجد سے اذان کی روح پرور آواز بلند ہوئی تھی اور نمرہ نے بے ساختہ آنکھیں کھول دی تھیں۔پہلے تو اسے پتہ ہی نہ چلا تھا کہ وہ کہاں ہے۔کئی لمحوں تک خالی خالی نظروں سے وہ اس نئے اور اجنبی منظر کو دیکھتی رہی تھی۔پھر دھیرے دھیرے اسے سب یاد آتا چلا گیا تھا۔سلطانہ کے اُکسانے پر رشید کا اسے

طلاق دینا اور کھینچتے ہوئے انو کے دروازے پر پھینک جانا، انو کی بے رُخی اور بے اعتنائی اور حسنہ کی سنگ دلی اور بے حسی۔ وہ کتنے ہی طوفانوں سے گزر آئی تھی اور حیرت کی بات تھی کہ اب بھی زندہ تھی۔ اس نے غیر محسوس طریقے سے اپنے وجود میں پلتے وجود کو محسوس کر کے دیکھا۔ وہ اسی کی خاطر زندہ تھی اور اسے زندہ سلامت دیکھنے کی متمنی تھی۔

محلے کی مسجد سے اذان کی نسبتاً اُونچی آواز گونجی۔ وہ کلمہ پڑھتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ پھر فریال کی چپلوں کو پہنتی واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ وضو کر کے اس نے جائے نماز بچھالی تھی۔ نمازِ فجر کی ادائیگی کے بعد وہ دیر تک تلاوتِ کلام اللہ کرتی رہی تھی۔

نماز و تلاوت کے بعد وہ باہر لاؤنج میں نکل آئی تھی۔ آفاق صاحب بھی نماز پڑھ کر مسجد سے آ چکے تھے۔ نمرہ نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا۔

''جیتی رہو..... خوشیاں دیکھو۔'' انہوں نے شفقت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''آؤ بیٹھو۔''

رات کھانے کے بعد آفاق صاحب نے اس کی ذہنی کیفیت کے پیشِ نظر اُسے گرم دودھ کے ساتھ ایک نیند کی ٹیبلٹ بھی دے دی تھی۔ یہی وجہ تھی شاید کہ وہ بستر پر لیٹتے ہی گہری نیند سو گئی تھی۔ اور اب پُرسکون نیند سے جاگنے، نماز اور تلاوتِ قرآن پاک کے بعد وہ خود کو خاصا بہتر محسوس کر رہی تھی۔ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی آفاق صاحب کے سامنے دھرے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ آفاق صاحب جلدی ناشتہ کرنے کے عادی تھے، اسی لئے ان کے بیٹھتے ہی غفور ناشتہ لے آیا تھا۔

''بھئی غفور میاں! ہم اکیلے ناشتہ کیسے کر سکتے ہیں؟'' وہ ناشتے کی طرف دیکھتے ہوئے غفور سے مخاطب ہوئے۔ ''ہماری بیٹی کے لئے بھی ناشتہ لے آؤ، تو ہم باپ بیٹی ایک ساتھ ہی ناشتہ کریں گے۔''

''جی اچھا۔'' غفور تیزی سے پلٹا۔ ''ہم ابھی لے آتے ہیں۔''

''ہماری نمو بٹیا کے لئے پراٹھا بنانا۔ اور وہ بھی اصلی گھی میں..... ہماری بٹیا کو ابھی ان سب چیزوں کی ضرورت ہے۔''

نمرہ اُداس نظروں اور افسردہ سماعت سے آفاق صاحب کی مشفق چاہت کو دیکھ اور سن رہی تھی۔ کیا کوئی غیر بھی اتنا اپنا ہو سکتا ہے؟..... اس نے حیرت بھری بے یقینی سے سوچا تھا۔ جب اپنا..... اپنا ماں جایا اتنا غیر ہو سکتا ہے تو پھر......

انو کا خیال آنسوؤں کا گولا بن کر اس کے حلق میں اٹک گیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں غفور اس کے لئے بھی ناشتہ لے آیا تھا۔ آفاق صاحب نے بہت پیار سے اور اصرار سے اسے ہر چیز کھانے پر مجبور کیا تھا۔ ناشتے کے بعد غفور گرما گرم خوشبودار، خوش ذائقہ چائے لے آیا تھا۔

''آپ کے کپڑے نکال دیئے ہیں۔'' چائے کے مگ میز پر رکھتے ہوئے غفور نے اطلاع دی تھی۔

''غفور میاں! آج ہم یونیورسٹی نہیں جا رہے۔'' آفاق صاحب نے مسکرا کر کہا۔ ''آج ہم اپنی نمرہ بیٹی کی آمد کی خوشی میں چھٹی کر رہے ہیں۔ آپ ایسا کیجئے کہ ناشتے کے بعد مارکیٹ چلے جایئے اور کچھ سودا سلف لے آیئے۔ تب تک ہم اپنی بٹیا سے گفت و شنید کرتے ہیں۔''

''جی بہتر۔'' غفور نے حیران لہجے میں کہا۔ آفاق صاحب شاذ و نادر ہی یونیورسٹی سے چھٹی کرتے تھے۔ ملیحہ بیگم کے انتقال اور فریحہ کی شادی کے علاوہ اُس نے نہیں دیکھا تھا کہ آفاق صاحب نے کبھی چھٹی کی تھی۔

غفور کے جانے کے بعد آفاق صاحب، نمرہ کو اپنے ساتھ لئے اپنی اسٹڈی میں آ بیٹھے تھے۔ تین اطراف الماریوں میں کتابیں ترتیب سے لگی ہوئی تھیں۔ دروازے کے ساتھ لمبوتری کھڑکی کے نیچے ایک چھوٹی رائٹنگ ٹیبل رکھی تھی۔ اسٹڈی کے فرش پر درمیان میں ایک گول خوشنما مخملیں رگ بچھا تھا۔ کمرہ خوب روشن اور ہوادار تھا۔ اور اندر ایک عجیب سی

تسکین آمیز خاموشی بکھری ہوئی تھی۔ آفاق صاحب میز کی پچھلی جانب دھری اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ چکے تھے۔ جبکہ نمرہ میز کے سامنے دھری دو عدد سیاہ چرمی کرسیوں میں سے ایک پر ٹک گئی تھی۔

''آرام سے بیٹھو بیٹی!'' آفاق صاحب نے دھیمے لہجے میں کہا اور باہم دونوں ہاتھ ملا کر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ ان کے بازو کرسی کے آرمز پر ٹکے تھے اور ہاتھوں کی اُنگلیاں باہم اُلجھی ہوئی تھیں جو ان کے ذہنی خلفشار کا غماز تھیں۔

کئی لمحوں تک گہری سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد انہوں نے دھیمی مگر نرم آواز میں نمرہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''بیٹی! میں چاہتا ہوں کہ اب تم مجھے حالات کے بارے میں آگاہ کرو۔'' وہ رشید کے بارے میں جس قدر جانتے تھے، اس کی روشنی میں انہیں صاف اندازہ ہو چکا تھا کہ حسب عادت رشید نے شادی کا یہ جوا بھی گلے سے اُتار پھینکا ہے۔ مگر اس کی بدترین فطرت کے پیش نظر ان کے لئے اصل حقائق کا جاننا بے حد ضروری تھا۔

نمرہ نے یکبارگی نگاہیں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا تھا، پھر نگاہیں جھکا لی تھیں۔ آپ سے آپ اس کی پلکوں پر نمی اُتر آئی تھی اور لہجہ بھیگ سا گیا تھا۔ اس نے رُکتے، ٹھہرتے، سہمے ہوئے انداز میں ساری کہانی من وعن ان کے گوش گزار کر دی تھی۔

''اوہ......'' ساری بپتا سننے کے بعد آفاق صاحب نے ایک جھرجھری سی لی تھی۔ رشید اور اس کی کمین فطرت ماں سلطانہ سے تو اسی طرح کے سلوک کی توقع کی جا سکتی تھی۔ مگر انو جیسے چاہنے والے بھائی کا روّیہ حیرت انگیز ہی نہیں، افسوس ناک بھی تھا۔ ماں باپ کس کے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ بہنوں کا تو میکہ ہی بھائی کا گھر ہوتا ہے۔ بھائی تو وہ چھتنار اور گھنا پیڑ ہوتا ہے جس کے سائے میں بہنیں سکون سے بیٹھ سکتی ہیں۔ اس کے مضبوط تنے سے لپٹ کر رو سکتی ہیں۔ بھائی تو بہنوں کے لئے فخر، خوشی اور ناز کا استعارہ ہوتے ہیں۔ بھلا انو کیسا بھائی تھا کہ دو سال تک اس نے اس کی خبر تک نہ لی۔ اور جب وہ برباد ہو کر اس کے دروازے پر آئی تو اس نے اس کا سہارا بننے کے بجائے اسے دھتکار دیا۔ گھر میں داخل ہونے کی اجازت تک نہ دی۔

نمرہ ایک بار پھر آنچل میں منہ چھپا کر سسکیوں کے گرداب میں ڈوب چکی تھی۔ آفاق صاحب اپنی جگہ سے اُٹھے، کچن سے ایک گلاس پانی لئے وہ نمرہ کے پاس آ ٹھہرے۔

''لو بیٹا!..... پانی پی لو۔''

نمرہ نے آنچل سے رخسار رگڑ کر پانی کا گلاس تھام لیا۔ خاصی دیر رو لینے اور پانی پی لینے کے بعد اب وہ کسی قدر پُرسکون دکھائی دے رہی تھی۔

''خدا کو حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسند طلاق ہے۔'' کئی لمحوں تک گہری سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد آفاق صاحب دھیمے لہجے میں گویا ہوئے۔ ''مگر کبھی کبھی یہ تم جیسی مظلوم لڑکیوں کے لئے نجات دہندہ بن جاتی ہے۔ دیکھا جائے تو رشید نے تمہیں طلاق دے کر تم پر ایک احسان ہی کیا ہے۔''

''مگر انکل!..... آگے.....'' نمرہ نے گھٹی گھٹی آواز میں کچھ کہنا چاہا مگر جملہ پورا نہ کر سکی۔ ایک بار پھر اس کی آواز آنسوؤں کے ریلے میں بہہ گئی تھی۔

''بیٹی! آگے کی آگے سوچیں گے۔'' آفاق نے قدرے شوخ لہجے میں کہہ کر ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کی۔ ''فی الحال ہمیں اس آنے والے بچے کے بارے میں سوچنا ہے اور بس..... تمہیں بھی کچھ اور سوچنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارے باپ کا گھر ہے۔ تم میرے لئے فریحہ اور فریال سے کم نہیں۔ سو آرام اور اطمینان سے رہو..... کھاؤ پیو،

خوش رہنے کی کوشش کرو اور اس آنے والے مہمان کا استقبال کرنے کی تیاری کرو۔"
تب ہی غفور لوٹ آیا تھا۔
"صاحب جی! چائے بناؤں کیا؟" اس نے اسٹڈی میں جھانک کر سوال کیا تھا۔
"چائے؟" آفاق صاحب نے سوالیہ نظروں سے نمرہ کی طرف دیکھا، پھر خود ہی نفی میں سر ہلا کر بولے۔ "نہیں بھائی! چائے نہیں..... بلکہ تم ہماری بیٹی کے لئے مینگو شیک بنا لاؤ۔"
"جی ابھی لایا۔" غفور فوراً ہی پلٹ گیا تھا۔
"ارے ہاں، یاد آیا....." آفاق صاحب نے ہاتھ اُٹھا کر غفور کو رکنے کا اشارہ کیا اور وہ میکانکی انداز میں اپنی جگہ پر تھم گیا۔
"غفور! تم نے اپنی ایک بیوہ پھوپھی کا ذکر کیا تھا..... جو کسی نوکری وغیرہ کی تلاش میں تھیں۔ کیا ہوا اُن کا؟"
"کچھ بھی نہیں ہوا صاحب جی!" غفور افسردگی سے نفی میں سر ہلاتا ہوا بولا۔ "بے چاری اکیلی ہیں اور سخت مسائل کا شکار ہیں۔ میں نے تو آپ سے بھی کہا تھا کہ ان کے لئے کوئی نوکری چاکری تلاش کر دیں۔"
"تم فوراً اُنہیں بلا لو۔ سمجھو اُن کی نوکری ہو گئی۔" آفاق صاحب مسکرا کر بولے۔
"جی۔" غفور نے بے یقین نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ "عظمت بوا کی نوکری ہو گئی..مگر کہاں؟"
"ارے بھئی اسی گھر میں......اور کہاں؟" آفاق صاحب بے ساختہ ہلکی آواز میں ہنس پڑے۔ "اب دیکھو، تم گھر کی صفائی ستھرائی کرتے ہو اور کچن سنبھالتے ہو.....اب جبکہ نمرہ بٹیا ہمارے ساتھ رہیں گی تو انہیں سنبھالنے اور ان کی دیکھ بھال کے لئے کسی سمجھ دار خاتون کا ہونا بھی تو ضروری ہے۔"
"جی صاحب جی!" غفور نے تائید بھرے انداز میں مسرور لہجے میں زور زور سے سر ہلایا۔
"تو بس ابھی جاؤ اور عظمت بی کو لے آؤ۔ آج سے وہ یہیں رہیں گی۔ اس طرح ان کی نوکری اور گھر کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ اور نمرہ کے ساتھ ان کی سنگت نمرہ کے لئے اور آنے والے بچے کے لئے بے حد خوشگوار ثابت ہو گی۔"
"جی بالکل۔" غفور نے پُر زور انداز میں سر ہلایا۔ "عظمت بوا بے حد اچھی خاتون ہیں۔ گو کہ بے اولاد ہیں، مگر بے حد اچھی ماں ہیں۔ بہت محبت کرنے والی اور خیال رکھنے والی۔"
"تو بس پھر دیر کس بات کی ہے؟ جاؤ اور انہیں لے آؤ۔"
عظمت بی، غفور کی رشتے کی پھوپھی تھیں۔ بے اولاد تھیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد بالکل تنہا رہ گئی تھیں۔ کوئی قریبی عزیز رشتے دار بھی نہ تھا، اس لئے سخت مشکل اور مسائل کا شکار تھیں۔ وہ ایک اچھے دل اور اچھی فطرت کی خاتون تھیں۔
کچھ ہی دیر میں غفور جا کر انہیں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔
مناسب قد کاٹھ اور ادھیڑ عمر کی عظمت بی، آفاق صاحب کو ہی نہیں، نمرہ کو بھی بے حد اچھی لگی تھیں۔
"عظمت بی! یہ ہماری بیٹی ہیں..... آپ کو ان کا خیال رکھنا ہے۔ آج سے اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھئے.....آج سے آپ بھی نمرہ اور غفور کی طرح اس گھر کا ایک فرد ہیں۔"
"بہت بہت شکریہ صاحب جی!" اس مہربانی پر عظمت بی کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی تھی۔ "مجھ بدنصیب بیوہ پر آپ کی یہ کرم نوازی ہے.....آپ کے بڑے پن کی دلیل ہے۔"
"ارے نہیں بھئی عظمت بی!" آفاق صاحب کسمسا کر بولے۔ "اب آپ کی ضرورت پڑی تو آپ کو بلوا لیا۔ ورنہ کیسی کرم نوازی.....کہاں کی مہربانی؟"

آفاق صاحب کو بہر حال یونیورسٹی جانا تھا اور غفور ٹھہرا نوعمر اور لاابالی لڑکا۔ نمرہ کی خاطر کسی باشعور اور دانا خاتون کا گھر میں ہونا بے حد ضروری تھا۔ نمو خود کم عمر اور ناتجربہ کار تھی......اور پہلا پہلا بچہ تھا......اسی لئے آفاق صاحب بے حد فکر مند تھے۔ مگر عظمت بی کی آمد نے ان کی ساری فکر اور پریشانی دور کر دی تھی۔

نمرہ کا آٹھواں مہینہ چل رہا تھا۔ مگر اب تک ڈلیوری کے لئے کسی ہسپتال میں نام تک نہ لکھوایا گیا تھا۔ چنانچہ اگلے ہی دن آفاق صاحب نے اپنے ایک کولیگ رضوانی کی مسز سے کہہ کر جو خود بھی ایک گائنا کالوجسٹ تھیں کے کلینک میں نمرہ کا نام درج کروا دیا تھا۔

''اوہ، پروفیسر صاحب! آپ کی بیٹی بہت پیاری ہے۔'' اگلے دن جب آفاق صاحب، نمرہ کو چیک اپ کے لئے ڈاکٹر سعیدہ رضوانی کے کلینک لے گئے تو وہ نمرہ کو دیکھ کر بے ساختہ کہہ اُٹھی تھیں۔

''شکریہ۔'' آفاق صاحب نے تشکر بھرے انداز میں سر ہلایا تھا اور ڈاکٹر سعیدہ رضوانی، نمرہ کا ہاتھ تھامے چیک اپ روم میں چلی گئی تھیں۔

زندگی ایک دھارے پر آ گئی تھی۔ ایک سبک رو ندی کی طرح بہتی چلی جا رہی تھی۔ آفاق صاحب، نمرہ کو اپنے ساتھ ناشتہ کرواتے، پھر یونیورسٹی چلے جاتے۔ غفور سودا سلف لاتا اور عظمت بی، دن رات نمرہ کی سیوا اور دیکھ بھال میں لگی رہتیں۔ اکثر غفور کے کام کاج میں بھی ہاتھ بٹاتیں۔ وہ یہاں بہت خوش تھی۔ دنوں میں ان کے چہرے پر طمانیت بھری دلکشی آ گئی تھی۔ نمرہ بھی خود کو یہاں بے حد محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ کبھی انو اور ماضی کی یاد دل جلاتی تو وہ آنے والے بچے کے بارے میں سوچنے لگتی۔ روز شام کو فریال کا فون آ جاتا تھا۔ تمام حالات جاننے کے بعد فریال اور فریحہ بہت دُکھی ہوئی تھیں۔ مگر اس بات پر خوش تھیں کہ اب نمو کا اُس جاہل رشید سے ہمیشہ کے لئے پیچھا چھوٹ گیا تھا۔

''سنو! ایک خوش خبری ہے۔'' اُس شام فریال نے فون کیا تو نمو کی آواز سنتے ہی خوشی سے لبریز آواز میں گویا ہوئی۔

''سناؤں؟''

''ہاں فری! پلیز......سناؤ نا۔'' نمرہ نے بے تاب لہجے میں سوال کیا۔

''مابدولت بھی ٹھیک نو ماہ بعد ماں بننے والی ہیں۔'' فریال نے شوخ لہجے میں سرگوشی کی تو پہلے تو نمرہ سمجھ ہی نہ سکی مگر جب بات سمجھ آئی تو وہ خوشی سے چیخ اُٹھی تھی۔

''سچ فری؟''

''ہاں۔ بالکل سچ۔'' فریال ہلکا سا ہنسی۔ ''مگر تمہیں ابھی اور اسی وقت ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

''کیسا وعدہ؟'' نمرہ حیران ہوئی۔

''یہی کہ اگر تمہارے لڑکا ہوا اور میرے گھر لڑکی ہوئی، تو تم میری بیٹی کو اپنی بہو بناؤ گی۔''

''ارے......ابھی سے؟'' نمرہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ ''پاگل ہوئی ہو؟ ابھی تو بچے دنیا میں بھی نہیں آئے......اور تم ہو کہ انہیں ابھی سے دنیا کے بکھیڑوں میں اُلجھانے پر تُلی ہو۔''

شادی کے تذکرے پر خود بخود اس کا دل افسردہ ہو گیا تھا۔ کیا رکھا تھا شادی میں؟......بھلا شادی سے اسے کیا حاصل ہوا تھا؟......ذلت، نفرت، بات بات پر جوتا، لات، غلیظ گالیاں، لعن طعن اور آخر میں طلاق کا طوق......اور کوکھ میں پلتا ہوا یہ معصوم اور بدنصیب بچہ......آج وہ غیروں کے گھر پڑی تھی۔ آفاق صاحب لاکھ محبت کرنے والے، رحم دل انسان تھے۔ مگر تھے تو غیر ہی۔ آنے والا کل اس کے لئے کیا لانے والا ہے، وہ بالکل بے خبر تھی۔ اس شادی نے ہی تو اس سے اس کا ماضی، حال اور مستقبل چھین لیا تھا۔ اسے تنہا اور بے سہارا کر دیا تھا۔ کہتے ہیں، شادی کے بعد لڑکی کو نیا گھر ملتا ہے......اور

...ب اپنا پرانا ٹھکانہ بھی کھو چکی تھی۔
''کیا سوچنے لگیں؟'' خاموشی کا وقفہ بڑھا تو فریال نے بے کلی سے پہلو بدلتے ہوئے سوال کیا۔ ''اگر تم جہیز کی لسٹ کے بارے میں سوچ رہی ہو تو سمجھ لو..... میں بالکل بھی جہیز نہیں دوں گی۔ جہیز ہمارے مذہب، ملک وملت اور ثقافت کے خلاف ہے۔''
''ارے بابا! میں جہیز کے بارے میں نہیں سوچ رہی تھی۔'' نمرہ خیالوں کی وادی سے نکل کر بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔ ''پہلے تو تم بہت بہت مبارک قبول کرو۔ خداوند کریم ہمارے بچوں کو بہ خیر و عافیت زندہ سلامت دنیا میں لائے..... اس کے بعد ہی کچھ سوچیں گے۔''
''مجھے بھی ایک بات کہنی ہے۔'' پیچھے سے فریحہ کی آواز سنائی دی تھی اور اس نے جھپٹ کر فری کے ہاتھ سے ریسیور چھین لیا تھا۔
''آداب آپی!'' اس کی آواز سنتے ہی نمو نے بے حد ادب اور محبت سے آداب پیش کیا تھا۔
''جیتی رہو۔ خوش رہو۔'' فریحہ نے بزرگوں کی طرح دعا دی تھی پھر سرگوشی میں بولی تھی۔ ''نمو! اگر بیٹا ہوا تو اس کا نام آفتاب رکھنا..... ہم اسے پیار سے ''تابی'' کہیں گے..... اچھا نام ہے نا؟''
''جج..... جی۔'' نمو نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ وہ جانتی تھی کہ فریحہ کو یہ نام بہت پسند تھا۔ اگر اس کے یہاں بیٹا ہوتا تو وہ یہی نام رکھتی۔ مگر بدقسمتی سے شادی کے چار سال گزرنے کے باوجود اس کی گود خالی تھی..... سو اُس نے اپنے بچے کے لئے منتخب شدہ نام اس کے بچے کے لئے تجویز کر دیا تھا۔ اس میں اس کی بے بسی بھی شامل تھی اور محبت بھی۔ فریحہ کے دکھ پر نمرہ کا دل بھی دکھ کر رہ گیا تھا۔
'میرے پیارے اللہ! فریحہ آپی کی گود میں بھی ایک پیارا سا بچہ دے دے۔' اس نے دل ہی دل میں بے حد خلوص سے دعا کی تھی۔

❀===❀===❀

دُور مشرق کی اور اونچی اونچی عمارتوں کے اس پار صبح کاذب کا سنہرا سا دھندلکا پھوٹ رہا تھا۔ بادِ نسیم کے مدھر جھونکے فضا میں اٹکھیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ خاموش فضا میں بیدار ہوتے پرندوں کی میٹھی چہچہاہٹ ایک عجیب سی نغمگی بھر رہی تھی۔ ادھ کھلی کھڑکی سے چھن کر آتا اُجالا کمرے کی فضا میں عجب خوابناک سا تاثر بیدار کر رہا تھا۔
رشید بیڈ پر آڑا ترچھا پڑا تھا۔ اُس نے کسمسا کر کروٹ بدلی اور نیند میں ڈوبی آواز میں بولا۔
''نمو!..... ذرا جلدی سے چائے لے آ۔''
سلطانہ کی ابھی ابھی آنکھ کھلی تھی اور وہ بالوں کو ہاتھوں سے سمیٹتی واش روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔ واش روم سے نکل کر وہ ورانڈے میں چلی آئی تھی۔ رشید کے بیڈروم کا دروازہ ادھ کھلا ہوا تھا اور وہ بستر پر اُلٹا پڑا بڑبڑا رہا تھا۔
''نمو!..... نمرہ..... بہری ہو گئی ہے کیا؟..... کہہ رہا ہوں جلدی سے چائے لے آ۔''
''ہیں۔'' سلطانہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رشید کے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کی، پھر ادھ کھلا دروازہ دھکیلتی اندر داخل ہو گئی۔
''اے میں کہتی ہوں، اُس منحوس کو اس گھر سے دفعان ہوئے دو مہینے ہونے کو آئے اور ایک تُو ہے کہ اب تک اُسی کا نام الاپے جا رہا ہے..... پاگل تو نہیں ہو گیا ہے؟''
''اوہ.....'' رشید نے بے ساختہ آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے اس کی ماں سلطانہ چہرے پر خشونت اور آنکھوں

میں غصہ لئے کھڑی تھی۔ جب سے نمرہ گئی تھی، چھوٹو اور ماسی کے ہونے کے باوجود بہت سے کام اسے کرنے پڑتے تھے جس کے باعث اس کا مزاج بہت خراب رہنے لگا تھا۔

رشید نے خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ نمرہ کو گھر سے گئے دو مہینے سے اوپر کا عرصہ گزر چکا تھا، مگر اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ یہیں کہیں موجود ہے۔ اپنے ہاتھوں سے وہ اسے گھسیٹتا ہوا گھر سے باہر لے گیا تھا اور اس کے بھائی کے دروازے پر پھینک آیا تھا۔ اس کے باوجود ہر صبح جب اس کی آنکھ کھلتی تھی تو وہ بے خیالی میں اسے پکارے بنا نہیں رہ پاتا تھا۔

''یہ سب کیا ہے لاکھانی؟'' رشید پریشان سا لاکھانی کے سامنے بیٹھا تھا۔ ''ہر صبح ایسا کیوں لگتا ہے کہ وہ بدبخت موجود ہے..... یہیں کہیں موجود ہے۔''

''اس کی صرف ایک وجہ ہے۔'' لاکھانی نے فلسفیانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''گھر کا کھالی (خالی) پن آپ کے دل میں وحشت پیدا کر رہا ہے۔ آپ کو چاہئے کہ آپ پہلی فرصت میں اپنے گھر کا کھالی پن دور کرلو۔''

''کیا مطلب؟'' سمجھ کر بھی رشید کچھ نہ سمجھا تھا۔

''ارے رسید بھائی!..... تم بھی نا.....'' لاکھانی سر ہلا کر بولا۔ ''بات صاف ہے..... میں آپ کو سادی کے لئے کہہ رہا ہوں۔ بس پھٹا پھٹ سہرا سجا لو..... نئی دُلہن گھر آجائے گی تو یہ پاگل پن آپ سے کھتم ہو جائے گا..... ورنہ.....''

''ورنہ کیا؟'' رشید نے چونک کر سوال کیا۔

''اب آگے میں کیا بولوں؟'' لاکھانی سر کھجاتا ہوا ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ ''مناسب یہی ہے کہ آپ اپنا گھر بسالو..... آپ تو کھوس نصیب ہو کہ نہ تلاس کرنے کی جرورت ہے، نہ کوئی پاپڑ بیلنے پڑیں گے..... وہ کھوسبو کا جھونکا آپ سے آپ، آپ کے گھر آنے کے لئے بے قرار ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' رشید کے پریشان چہرے پر تسکین آمیز مسکراہٹ بکھر گئی۔

بڑھتی عمر، کاروباری مسائل اور اوپر سے اکیلا پن..... وہ واقعی بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ اس پہ لاکھانی نے بھی جلتی پہ تیل کا کام کیا تھا۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ رشید اس قتالہ سے شادی کر لے۔ کیونکہ وہ جانتا تھا، سلطانہ جیسی شیطان صفت عورت کو مہکار جیسی عورت ہی ٹھیک کر سکتی ہے۔ اس کے دل میں کہیں یہ دکھ موجود تھا کہ سلطانہ اور رشید نے نمرہ جیسی بے زبان، بے ضرر اور معصوم لڑکی کے ساتھ بہت ظلم کیا تھا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ ان دونوں کو اور خاص طور پر سلطانہ کو اس کے کئے کی سزا ملے اور مہکار، سلطانہ کے لئے کسی سزا سے ہرگز کم نہ تھی۔

اسی لئے اب اس کی حتی الوسع کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح اسے مہکار سے شادی کے لئے آمادہ و تیار کرے۔ دوسری طرف کامیابی کی صورت میں اسے مہکار اور اس کی بہن گلبہار سے انعام کی بھی اُمید تھی۔ ابھی پچھلے ہفتے وہ جب مہکار کے گھر گیا تھا تو گلبہار بہت محبت سے اس سے ملی تھی۔

''لے..... تُو اب کی بار اتنی دیر سے کیوں آیا؟'' وہ شکوہ بھرے لہجے میں بولی۔ ''میں نے جب تجھ سے کہہ رکھا ہے کہ تُو ہفتے دس دن میں ضرور چکر لگا لیا کر..... پر تُو ہے کہ.....''

''اصل میں آج کل میں رسید کے ساتھ جیادہ ہوتا ہوں۔'' لاکھانی نے دھیمی آواز میں وضاحت کی۔ ''وہ بے چارہ بالکل اکیلا ہو گیا ہے۔''

''لے..... پیسے والا ہے..... کاروبار، گھر، گاڑی سب ہی کچھ تو ہے اس کے پاس۔ دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتا؟'' گلبہار تحریک بھرے لہجے میں بولی۔

''ہوں۔آج کل میں اسے یہی سمجھا رہا ہوں۔'' لاکھانی نے گلبہار کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''میں نے تو اسے شادی کے لئے آمادہ بھی کرلیا ہے۔'' مہکار مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے آتے ہی چہار سُو ایک بھینی سی مہک پھیل گئی تھی۔

''میں نے تجھے لکھ واری سمجھایا ہے کہ رات میں خوشبو نہیں لگاتے.....رب نہ کرے، بھوت پریت چمٹ جاتے ہیں۔'' گلبہار نے مہکار کی طرف تنبیہی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''لو اور سنو......'' مہکار مضحکہ اُڑانے والے انداز میں ہنسی۔''نہ آپا! تُو مجھے یہ بتا.....اس رشید سے بڑا بھوت پریت اور کون ہوگا؟''

اس کی بات پہ لاکھانی بھی بے ساختہ ہنس پڑا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی گلبہار کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

''اچھا لاکھانی! مجھے تُو یہ بتا.....کہ تُو نے جو بتایا تھا کہ رشید کے اکاؤنٹ میں سعودی عرب سے اس کے پارٹنر کی طرف سے 10 کروڑ کی رقم آئی ہے......'' گلبہار سانس لینے کو رُکی۔لاکھانی سانس روکے اُس کی بات سن رہا تھا۔

''سچ بتانا.....کیا واقعی وہ رقم رشید کے اکاؤنٹ میں آئی ہے؟''

''لے آپا گلبہار!.....میں بھلا جھوٹ کیوں بولنے لگا؟'' لاکھانی دیانت دارانہ انداز میں یوں سر ہلا کر بولا جیسے اس سے بڑا سچا اس رُوئے زمین پر دوسرا کوئی موجود ہی نہیں۔

''اس کے پاس ایک کمرشل پلاٹ بھی ہے.....جس پہ بلڈنگ بنانے کے لئے ہی اس نے رمضان آرائیں سے اتنی بڑی رقم اُدھار لی ہے۔بولے تو پارٹنر سپ پہ۔''

لاکھانی کی بات سن کر گلبہار کی آنکھوں میں ایک شیطانی چمک جاگی تھی۔

''بتا تو.....اندازاً کتنے کا ہوگا وہ پلاٹ؟''

''ابھی تو جمین کی قیمت آسمان سے باتیں کرنے لگی ہے۔کچھ نہیں، کچھ نہیں تو بھی وہ پلاٹ پانچ کروڑ سے کم کا نہیں۔''

''ہائے نہیں۔'' گلبہار نے دل تھام لیا۔''مجھے یہ گنجا تو ندیل رشید اتنا دولت مند تو نہیں دکھائی دیتا۔''

''آپ کو دکھائی نہیں دیتا تو میری جبان پر بھروسہ کرلو۔'' لاکھانی دوٹوک لہجے میں بولا۔''ادھر سے آپ جور لگاؤ، ادھر سے میں اس پر دباؤ ڈالتا ہوں.....اس سونے کی چڑیا کو کدھر اور اُڑ کر جانے نہیں دینا چاہئے۔''

''کہہ تو تُو ٹھیک رہا ہے۔'' مہکار، لاکھانی کے قریب بیٹھتے ہوئے دھیمی اور پُرسوچ آواز میں بولی۔''تُو یہ کوشش کر کہ وہ، وہ پلاٹ میرے نام لگا دے.....باقی روپیہ نکلوانا تو میرا کام ہے۔''

''چلو، رسید نے پلاٹ آپ کے نام لگا دیا۔'' لاکھانی یوں ہاتھ ہلا کر بولا کہ جیسے کہہ رہا ہو، چلو پلاٹ تمہارا ہوا۔''پھر......اس کھدمت کے صلے میں مجھے کیا ملے گا؟''

''لاکھانی! سچی تُو بڑا احرامی ہے۔'' مہکار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔''کوئی موقع خالی جانے نہیں دیتا۔''

پھر کافی دیر تک وہ تینوں سر جوڑے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرتے رہے تھے۔

وہاں سے اُٹھ کر لاکھانی سید ھا رشید کے پاس چلا آیا تھا۔

''رسید بھائی! آپ نے کیا سوچا؟'' اس نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا تھا۔''سچی بات تو یہ رسید بھائی!.....میں نے جندگی میں پہلی بار مہکار کو کسی پہ مرتے دیکھا ہے.....قسم اوپر والے کی.....وہ آپ سے

دل سے محبت کرنے لگی ہے۔''

''پتہ نہیں کیوں، میرا دل نہیں مانتا۔'' رشید خود کم گھاگ نہیں تھا۔

''ارے رسید بھائی! اب آگے کتنا وقت باقی بچا ہے...... جندگی کے یہ دو دن اس کی مہکتی جلفوں (زلفوں) کے سائے میں گجار لو...... ایک نیا ڈائریکٹر اُسے فلم کی آفر کرنے کی سوچ رہا تھا۔ اُس نے فلم سائن کر لی نا..... تو بس تم ہاتھ ملتے ہی رہ جاؤ گے۔''

''اب اُسے کون سا ڈائریکٹر مل گیا؟'' رشید قدرے چونکتے ہوئے بولا۔ ''میرا نہیں خیال کہ اب کوئی اُسے فلم میں ہیروئن لے گا۔''

''ارے رسید بھائی! آپ اس بات کو چھوڑو..... اس سہر میں بڑے بڑے بگڑے رئیس پڑے ہیں...... اور یہ مت کہو...... مہکار میں اب بھی ایک بات ہے۔''

''ہاں، کچھ بات تو ہے۔'' رشید، مہکار کا چہرہ اور سراپا تصور میں لا کر معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولا۔ ''چلو دیکھتے ہیں..... وہ ڈائریکٹر کی ہیروئن بنتی ہے...... یا ہماری بیگم۔''

''پہلے والی بات ہوتی تو ساید وہ ہیروئن بننا پسند کرتی۔'' لاکھانی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''مگر اب کی بار تو آپ نے اُس پر کھدا (خدا) جانے کون سا جادو کر دیا ہے کہ وہ تو ڈائریکٹر سے ملاقات کے لئے بھی تیار نہیں ہے..... لاکھ گلبہار جور (زور) دے رہی ہے مگر وہ کہتی ہے کہ بس اب اسے صرف اور صرف اپنے رسید کی سریکِ حیات بننا ہے۔''

''کیا واقعی؟'' رشید چونک اُٹھا۔

''ہاں نا۔'' لاکھانی نے پُر یقین انداز میں سر ہلایا۔ ''مگر گلبہار بھی ایک ہی دھندے والی ہے۔ اس نے بھی سرط لگا دی ہے کہ مہکار جس سے بھی سادی کرے گی، اسے اس کے نام ایک گھر یا پلاٹ لکھنا ہو گا۔''

''گھر یا پلاٹ؟'' رشید حیرت سے بولا۔ ''مگر یار! میرے پاس تو یہ کچھ بھی نہیں..... نہ گھر ہے اور نہ پلاٹ۔''

''ارے رسید بھائی! تم بھی نا.....'' لاکھانی سر ہلا کر بولا۔ ''پتہ نہیں یہ کروڑوں کا کاروبار تم کیسے چلاتے ہو؟..... سچی اندر سے بہت سیدھے ہو۔''

''کیا مطلب؟'' رشید نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

''مطلب یہ کہ...... سادی کے بعد مہکار آپ کی ہو جائے گی تو اُس کی ہر چیج (چیز) بھی آپ ہی کی ہو گی۔ اپنا جو..... وہ پلاجے والا پلاٹ ہے نا..... وہ اس کے نام لگا دو۔ بعد میں اپنے نام ٹرانسفر کر لینا۔ اپنی گھر والی سے آدمی جو چاہے، لے سکتا ہے۔''

لاکھانی کے معاملے کی سنگینی کو کم کرنے کی خاطر، شریر انداز میں ایک آنکھ دبا کر معنی خیز لہجے میں کچھ اس طرح کہا کہ وہ بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

''ارے لاکھانی! اب اُس سے کیا لینا دینا؟..... ہم دونوں تو برسوں سے ایک دوسرے کو اپنا سب کچھ دے چکے ہیں۔''

''تو پھر پلاٹ اُس کے نام کرنے میں کیا پریسانی ہے؟''

لاکھانی کے سوال پر وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''لاکھانی! وہ پلاٹ دس کروڑ کا ہے.... اسی بنیاد پر میرے ایک دوست نے مجھے دس کروڑ روپے دیئے ہیں تاکہ مساوی مالیت کی پارٹنرشپ پر اس پلاٹ پر ایک پلازہ تعمیر کیا جائے۔ اب وہ پلاٹ اگر میں مہکار کے نام لگا دوں گا تو..... پلازہ کیسے بنے گا؟''

''وہ پلاٹ دس کروڑ کا ہے؟'' لاکھانی حیرت سے بولا۔

''اور نہیں تو کیا۔'' رشید ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''جو فلیٹ کل سات آٹھ لاکھ کے بکتے تھے، آج 25 سے 35 لاکھ کے بک رہے ہیں۔ اسی حساب سے تم پلاٹ کی قیمت کا بھی یقین کرلو۔''

''ہاں، آپ کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہو۔'' لاکھانی نے قائل ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ مہکار کا کھواب سرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔'' ذرا توقف سے لاکھانی نے سرد آہ بھر کر کہا تو رشید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ لاکھانی چند لمحوں تک اس کے سوال کا انتظار کرتا رہا، پھر اسے خاموش پا کر وہ خود بھی نفی میں سر ہلاتا ہوا بولا۔

''بس کیا کہیں...... بے چاری مہکار...... بدقسمت ہی ہے...... ہیروئن بننا چاہتی تھی، بن نہ سکی۔ اتنی کھوبصورت آواج کی مالک ہے، پر مسہور سنگر نہ بن سکی۔ اب..... آپ کے عسق میں گوڈے گوڈے ڈوبی ہوئی ہے...... مگر آپ کی سریکِ حیات نہ بن سکے گی۔''

''مجھ سے عشق ہے تو پلاٹ کی کون سی شرط ہے؟..... عشق والے دولت جائیداد کہاں دیکھتے ہیں؟'' رشید بھنویں سکیڑ کر سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''بالکل صحیح۔'' لاکھانی تائید بھرے انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ''وہ گریب تو آپ کے عسق کی وجہ سے ڈائریکٹر کی آفر لینے کو تیار نہیں۔ مگر وہ اس گلبہار کا کیا کرے...... جس نے اس کی سادی کی یہی سرط رکھ چھوڑی ہے۔''

رشید جواب میں کچھ نہ بولا۔ گہری نظروں سے لاکھانی کی طرف تکتا رہا۔

''اچھا ابھی چھوڑو رسید بھائی! وہ سادی نہیں کرتی تو نہ کرے۔ آپ کے لئے چھوکریوں کی کمی تو نہیں۔ میں آپ کے لئے کوئی اور چھوکری دیکھتا ہوں..... جوان اور کچا۔''

''چھوڑ یار لاکھانی!'' رشید نے تھکن بھرے انداز میں سانس لی۔ ''جوان اور کچا چھوکری بھی دیکھ لی۔'' اس کا اشارہ نمرہ کی طرف تھا۔ ''نہ بھائی!..... اب کسی تلاش اور جستجو کی نہ ہمت ہے نہ وقت ہے۔ خالی گھر مجھے کھانے کو آتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد مہکار اس گھر میں خوشبو بکھیرنے کے لئے آموجود ہو۔''

''مگر رسید بھائی! اُس کی بہن کی سرط.....؟''

''چلو دیکھتے ہیں...... کچھ کرتے ہیں..... اب اوکھلی میں سر دیا ہے تو......'' وہ دھیمی آواز میں ہنسا۔

''سچ کہوں رسید بھائی!'' اسے نیم رضامند ہوتے دیکھ کر لاکھانی خوش دلی سے ہنستا ہوا بولا۔ ''آپ کو بھی جرور بہ جرور اس کھوسبو کے جھونکے سے پیار ہوگیا ہے...... ہے نا؟''

چاپلوسانہ انداز میں اس نے تصدیق چاہی تو رشید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''نہیں یار!..... ہم جیسے لوگ پیار محبت کرنا جانتے ہی نہیں۔ کتنی ماہ لقائیں، کتنی ماہ جبینیں زندگی میں آئیں مگر کبھی کسی سے پیار نہ ہوسکا۔''

''بہن نمرہ سے بھی نہیں؟'' بالکل اچانک بے ساختہ لاکھانی پوچھ بیٹھا تھا۔ اور اس غیر متوقع سوال پر رشید نے حیرت بھیر نظروں سے لاکھانی کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی زندگی میں داخل ہونے والی تمام ہی لڑکیوں اور عورتوں سے وہ سب سے الگ تھی۔ سب سے حسین، کم عمر اور نیک و صالح...... مگر اس نے اور اس کی ماں نے اس معصوم پر بدچلنی کا الزام لگایا تھا۔ اسے اس کی تمام تر محبتوں، خدمت گزاریوں اور وفاؤں کا بدترین صلہ دیا تھا۔ اس بات کا اسے کوئی پچھتاوا تھا، نہ زیاں کا احساس تھا۔ ہاں اکثر صبح جب وہ اُٹھتا تو بے ساختہ نمو کو آوازیں دے جاتا۔

'یہ کیا ہے؟' وہ خود سے حیران ہو کر پوچھتا۔ 'کیا میں اُس کی کمی محسوس کر رہا ہوں؟..... کیا میں اس سے محبت کرنے لگا تھا؟'

'نہیں.....' وہ خود کو سمجھانے والے انداز میں خود سے کہتا۔ 'یہ محبت نہیں، محض عادت ہے۔ مجھے اس کی عادت ہو گئی تھی۔ وہ تھی بھی اتنی چالاک اور عیار کہ دنوں میں اس نے میرا ہر کام اپنے ہاتھ میں لے کر مجھے اپنا عادی بنا دیا تھا۔ اب اس کی عادت اسی طرح ختم ہو سکتی ہے کہ کوئی اور عورت اس کی جگہ لے لے۔

اگر یہ پریشانی نہ ہوتی تو شاید وہ ابھی اتنی جلدی شادی کے لئے آمادہ بھی نہ ہوتا۔ مگر اب وہ شادی کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اور حسب عادت اس بار بھی اس نے سلطانہ کو اپنے اس فیصلے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔

❀===❀===❀
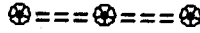
پروفیسر آفاق کے مکان کی پچھلی جانب واقع چھوٹے سے لان میں شام سہج سہج قدم دھرتی اُتر رہی تھی۔ غفور نے باہر کھلنے والی کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ شام کی تازہ اور نرم ہوا کمروں میں سرسراتی پھر رہی تھی۔ لان میں کھلے رنگ برنگے پھولوں کی خوشبو ہواؤں میں رچی ہوئی تھی۔ یہ مشکبار ہوائیں سانسوں کے ساتھ پھیپھڑوں میں اُترتی ایک عجب سا تازگی اور سرشاری کا احساس جگا رہی تھیں۔

''لو بٹیا!...... جوس پی لو۔'' عظمت بی ایک طشتری میں کانچ کا گلاس دھرے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ گلاس میں تازہ موسمیوں کا رس تھا۔

''ارے عظمت بی!...... بھلا یہ جوس کا کون سا وقت ہے؟'' وہ کسمسا کر بولی۔ ''ایسا ہی تھا تو آپ ایک کپ چائے پلا دیتیں۔''

''چائے بھی پلا دیں گے۔ پہلے یہ پی لو...... تمہیں اور اس ننھی جان کو اس کی بے حد ضرورت ہے۔''

جب عظمت بی، نمو سے اس طرح لاڈ بھرا اصرار کر کے اسے کچھ کھلاتی پلاتیں تو بے ساختہ اسے شریفن خالہ کا خیال آ جاتا تھا۔ وہ تو یوں بھائی کے پاس انڈیا گئیں کہ پلٹ کر دیکھا تک نہیں تھا۔ مگر نمو نے ہر خوشی اور ہر غم کے موقع پر انہیں یاد کیا تھا۔ دیکھا جاتا تو اس کی زندگی میں خوشیاں تو آئی ہی نہیں تھیں...... غم ہی غم تھے۔ اور ہر بار جب بھی اس کی پلک نم ہوتی، جب بھی دل عالم اضطراب میں تڑپتا، جب بھی لبوں پر آہیں مچلتیں اُسے شریفن خالہ یاد آتی تھیں۔ اور اب کچھ دنوں سے عظمت بی کو دیکھ کر اور ان کی محبت دیکھ کر اسے بے اختیار اور بے طرح شریفن خالہ یاد آ جاتی تھیں۔

اس نے خاموشی سے جوس کا گلاس اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

''آج رات کے کھانے میں ہم تمہارے لئے کلیجی پکا رہے ہیں۔'' عظمتُ بی جوس کا خالی گلاس اٹھاتے ہوئے دُلار سے بولیں۔ ''اُس روز ڈاکٹر کہہ رہی تھی نا کہ خون کی کمی ہے...... کلیجی کھائیے...... سو اب میں نے سوچا ہے کہ دن میں ایک وقت تمہیں کلیجی ضرور کھلائیں گے، سمجھی۔''

''ارے عظمت بوا!...... کلیجی کھانے کے لئے سب سے بہتر وقت صبح کا ہوتا ہے۔'' غفور کمرے میں داخل ہوتا ہوا بولا۔ ''اور وہ بھی بس توے پہ ڈالا، تھوڑا چھنن منن کیا، اُلٹا پلٹا..... اور کچا ادھ کچا کھا لیا۔ اس سے خون بنتا ہے۔ تمہاری طرح خوب مرچ مصالحے اور تیل والے کلیجی کے قورمے سے کچھ نہیں ہونے والا۔''

''اچھا، اب تُو بتائے گا کہ مجھے کھانا کس طرح پکانا چاہئے۔'' عظمت بوا ہونٹوں کے گوشوں میں مسکراہٹ دبا کر مصنوعی غصے سے بولیں۔ تب ہی آفاق صاحب کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔

''ارے عظمت بی! اچھی بات کوئی بھی بتائے، اسے پلّے سے باندھ لینا چاہئے۔'' وہ قریب دھری آرام دہ کرسی

پر بیٹھتے ہوئے دھیرج بھرے لہجے میں بولے۔ ''یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ کون بتا رہا ہے.....بس یہ دیکھنا چاہئے کہ کیا بتا رہا ہے۔''

''جی.....سو تو ہے۔'' آفاق صاحب کو سامنے پا کر عظمت بی کی تیزی طراری ہمیشہ ہی غائب ہو جاتی تھی۔ اور وہ بری طرح کنفیوز سی لگنے لگتی تھیں۔ آفاق صاحب نے اُس بے سہارا عورت کو گھر اور سہارا دے کر جو احسان کیا تھا، شاید اس احسان کا یہی احساس ان کے دل ونظر اور زبان کو جکڑ لیتا تھا اور وہ مارے گڑبڑاہٹ کے بات کرنا ہی بھول جاتی تھیں۔

''کیسی ہے ہماری بٹیا؟'' وہ نمو کی طرف متوجہ ہوئے جو لاؤنج کے داہنی جانب دھری نیچی سی چوکی پہ گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھی تھی اور بڑی سی چادر میں خود کو اچھی طرح لپیٹا ہوا تھا۔

''ٹھیک۔'' وہ مختصراً جواب دے کر، نگاہیں جھکا کر ناخن سے گاؤ تکیہ پر کڑھے گلاب کے پھول کو کُھرچنے لگی تھی۔ اُس کی اضطراری کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے آفاق صاحب قدرے سراسیمگی سے بولے تھے۔

''نمو بٹیا!......طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''جی.....ابھی تک تو......'' وہ بمشکل بول سکی۔

اس کے جواب پر آفاق صاحب بے ساختہ عظمت بی کی طرف پلٹے تھے۔ ان کی سوالیہ نگاہوں کو اپنی جانب لگے دیکھ کر وہ دھیمے لہجے میں جواب دہ ہوئیں۔

''ہاں، دوپہر سے بٹیا کی طبیعت کچھ اُلٹ پلٹ ہے۔ آپ ایمبولینس کے لئے کہہ رکھیے۔ ہوسکتا ہے، رات کو ہسپتال جانا پڑے۔''

''اوہ...'' آفاق صاحب نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔ پھر توقف سے بولے۔ ''ایمبولینس میں کیوں؟.....گھر میں گاڑی تو موجود ہے۔ گاڑی میں چلنا مشکل ہوگا کیا؟''

''نن.....نہیں۔'' عظمت بوا گڑبڑا کر بولیں۔ ''میں نے تو ایمبولینس کا یوں بول دیا تھا کہ جانے کب جانا پڑ جائے۔ آپ کہاں تکلیف کریں گے؟ غفور فون کر کے ایمبولینس منگوا لے گا اور ہم بٹیا کے ساتھ غفور کو لے کر ہسپتال چلے جائیں گے۔''

''نہیں عظمت بی!'' آفاق صاحب پُریقین لہجے میں بولے۔ ''ہماری بچی ہسپتال جائے گی تو ہم بھلا کس طرح سو سکیں گے؟ کیسی بے آرامی؟ ہم خود اپنی بیٹی کے ساتھ ہسپتال جائیں گے۔ بھلا آپ نے یہ بات سوچی کیسے؟''

''ارے میاں جی! ہم نے کب سوچی؟......یہی نمو بٹیا ہم سے کہہ رہی تھیں۔'' آفاق صاحب کی بے نام سی ناخوشگواری کو محسوس کرتے ہوئے وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔ ''بٹیا کی ہی ضد تھی کہ رات برات جانا پڑا تو آپ انکل کو زحمت نہیں دیں گی......لو اب بتاؤ......ہم بلاوجہ ہی برے بن گئے۔

تب ہی لاؤنج کے کونے میں دھرا فون بج اٹھا تھا۔

آفاق صاحب تیزی سے فون کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''نمرہ فریحہ اور فریال کے کمرے میں سوتی تھی۔ کمرے میں آمنے سامنے دو سنگل بیڈ رکھے تھے۔ ایک پر نمرہ سوتی تھی۔ جب عظمت بی آئیں تو انہیں کہا گیا کہ وہ دوسرے بیڈ پر سو جایا کریں۔

''نہیں میاں جی!'' انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ ''ہم عمر بھر زمین پر سوتے رہے ہیں۔ زمین پر سونے میں بڑا ثواب ہے۔ ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی زمین پر ہی سوتے تھے۔ اسی لئے ہم بھی ہمیشہ ہی

زمین پر سوئے ہیں۔ آپ کی اجازت ہو تو نمرہ بی بی کے بستر کے سامنے زمین پر ہم اپنا بستر لگا لیا کریں۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔'' آفاق صاحب نے ہتھیار ڈالتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔ اور تب سے عظمت بی، نمرہ کے بیڈ کے بالکل ساتھ داہنی جانب زمین پہ توشک بچھا کر سوتی تھیں۔ اس کا یہ فائدہ تھا کہ نمرہ ہلکی سی ''سی'' بھی کرتی تھی تو عظمت بی کو خبر ہو جاتی تھی اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتی تھیں۔

دوپہر سے ہی نمرہ کی طبیعت گڑبڑ چل رہی تھی۔

ڈاکٹر نے آج کل کی ہی ڈیٹ دی تھی، اس لئے عظمت بی بہت چوکنا ہو گئی تھیں۔ رات کو بستر پر لیٹتے ہی نمرہ کے پیٹ میں اُٹھتی ہلکی ہلکی درد کی لہریں ایک دم سے تیز ہو گئی تھیں۔ کافی دیر تک وہ درد کو برداشت کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ مگر جب درد نا قابل برداشت ہو گیا تو اس نے عظمت بی کو پکارا تھا۔

''عظمت بوا.....!''

''ہاں...... ہاں...... کیا ہوا؟'' اُس کی آواز میں اذیت کو محسوس کرتے ہوئے عظمت بی خود بھی وحشت زدہ ہو گئی تھیں اور لپک کر اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھیں۔ اس کی صندلی پیشانی پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے اور بڑی بڑی غزالی آنکھوں سے اذیت کا اظہار ہو رہا تھا۔

''ہم..... ابھی میاں جی کو بتاتے ہیں۔'' وہ لپکتی ہوئی باہر نکلی تھیں۔ سامنے ہی غفور لاؤنج میں سونے کی تیاری کر رہا تھا۔

''اے غفور..... ذرا لپک کے میاں جی کے پاس جا اور انہیں بول گاڑی نکالیں۔''

''ایں.....'' عظمت بی کی بات سن کر غفور حیرت سے منہ کھول کر بولا۔ ''گاڑی؟..... اور اس وقت؟..... کہیں جانا ہے کیا؟''

''ہاں ہاں...... نمرہ بی بی کو ہسپتال لے کے جانا ہے۔ ان کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔'' عظمت بی عجلت میں بولیں۔ ''جا میرا بچہ! جلدی سے میاں جی کو بتا۔ جب تک وہ گاڑی نکالتے ہیں، میں بٹیا کو تیار کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرے کی طرف پلٹ گئی تھیں۔

ایک چھوٹا سوٹ کیس انہوں نے پہلے ہی تیار کر لیا تھا۔ جلدی جلدی نمرہ کے بال سمیٹ کر ہیئر بینڈ میں کس کر اسے چادر اوڑھا کر وہ اسے سہارا دیئے باہر لے آئی تھیں۔ غفور نے لپک کر سوٹ کیس اٹھایا تھا اور وہ تینوں ساتھ ساتھ چلتے بیرونی برآمدے تک آئے تھے۔ گو کہ نمرہ کے پیٹ میں درد کی شدید لہریں اُٹھ رہی تھیں مگر وہ برداشت کرنے کی حتی الوسع کوشش کر رہی تھی۔ وہ تو زندگی کا کتنا کرب سہہ چکی تھی اور برداشت کر چکی تھی۔ مگر جانے یہ کیسا درد تھا، برداشت ہی نہ ہو رہا تھا۔

آفاق صاحب گاڑی نکال چکے تھے۔ عظمت بی نے نمرہ کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے میں مدد دی اور خود بھی وہیں سمٹ کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے نمرہ کے کاندھوں سے ہاتھ گزار کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

غفور ڈگی میں سوٹ کیس رکھ چکا تھا۔

''غفور میاں! آپ گھر میں ہی رہیں گے۔'' آفاق صاحب کی ہدایت پر غفور کا منہ اُتر گیا تھا۔

''جیسے ہی خوش خبری ملی، ہم آپ کو اطلاع دے دیں گے۔'' آفاق صاحب نے اس کا اُترا چہرہ دیکھ کر دھیمی آواز میں مژدہ سنایا۔ ''صبح بے شک تم ناشتہ لے کے ہسپتال آ جانا۔''

''جی بہتر۔'' حسبِ عادت غفور نے اثبات میں سر ہلایا اور اندر کی طرف مڑ گیا۔ ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہتے ہوئے آفاق صاحب نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

گھر سے نکلنے سے پہلے انہوں نے اپنے دوست رضوانی صاحب کو فون کر دیا تھا۔ جب وہ لوگ ہسپتال پہنچے تو ڈاکٹر سعیدہ رضوانی پہلے سے ہی ہسپتال میں موجود تھیں۔ وہ عموماً صبح کے اوقات میں ہسپتال میں ہوتی تھیں مگر کسی بھی ایمرجنسی پر وہ کسی بھی وقت ہسپتال پہنچ جاتی تھیں۔

نمرہ کو فوری طور پر کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر سعیدہ رضوانی نے اس کا معائنہ کیا تھا اور ایک انجکشن دے کر ڈرپ لگوا دی تھی۔ ذرا ہی دیر میں نمرہ کے درد کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا، تکلیف اور اذیت بڑھتی جا رہی تھی۔ عظمت بی، نمرہ کے ساتھ تھیں۔ جبکہ آفاق صاحب باہر کوریڈور میں ٹہل رہے تھے۔

چار بجے کے قریب نمرہ کو لیبر روم میں لے جایا گیا تھا۔ ساری رات درد سہتے سہتے اس کا چہرہ ستّ گیا تھا، آنکھوں میں اذیت کا احساس منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنے شنگرفی لبوں کو موتیوں سے دانتوں میں دبائے مخروطی انگلیوں سے چرمی تکیے کو دبوچے ہوئے تھی۔ اس کی صبیح پیشانی پسینے میں شرابور تھی اور پورا وجود اذیت کے ایک لامتناہی گرداب میں جکڑا ہوا تھا۔ اندر وہ تخلیق کے کربناک مرحلے سے دوچار تھی۔ لیبر روم کے دروازے پر عظمت بی، قرآن مجید کھولے سورۂ مریم کی تلاوت میں مصروف تھیں۔

ہسپتال کے پہلو میں واقع مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو کوریڈور میں ٹہلتے آفاق صاحب نمازِ فجر کی ادائیگی کی خاطر مسجد کی سمت چل دیئے تھے۔

اُدھر اذان مکمل ہوئی تھی، ادھر لیبر روم میں نومولود بچے کے رونے کی الوہی آواز گونجنے لگی تھی۔

''اللہ! تیرا شکر ہے، تُو نے بچی کی مشکل آسان کی۔'' ...... ''ٹیاں ٹیاں'' سن کر عظمت بی نے تیزی سے کلامِ پاک بند کیا اور جزدان میں لپیٹتی، جوتیاں پاؤں میں پھنساتی، لیبر روم کی طرف لپکیں۔

''مبارک ہو...... بیٹا ہوا ہے۔'' مسز رضوانی نے انہیں دیکھتے ہی مسکرا کر کہا اور نمرہ کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ ایک نرس بچے کو نہلانے دُھلانے اندر لے گئی تھی۔ جبکہ ڈاکٹر سعیدہ رضوانی دوسری نرس اور مڈوائف کے ساتھ نمرہ کے ساتھ مصروف تھیں۔ اور ولادت کے بعد کے معاملات نمٹا رہی تھیں۔

آفاق صاحب کے مسجد سے لوٹنے تک نمرہ کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ سب کچھ نہایت عمدگی اور نارمل طریقے سے نمٹ گیا تھا۔ اس لئے چند لمحوں بعد بچے کو بھی ایک آسمانی چادر میں لپیٹ کر نمرہ کے پہلو میں لالٹایا گیا تھا۔

''میاں جی! مبارک ہو۔'' آفاق صاحب کو دیکھتے ہی عظمت بی نے خوشی سے لبریز آواز میں کہا۔ ''آپ نانا بن گئے...... اللہ نے آپ کو چاند سا نواسہ عطا کیا ہے۔''

''اوہ...... اچھا......'' آفاق صاحب کے سنجیدہ اور بردبار چہرے پر حیرت بھری مسرت پھیل گئی تھی۔ گو کہ ان کی دونوں بیٹیاں، فریحہ اور فریال شادی شدہ تھیں۔ مگر اب تک وہ نانا بننے کی خوشی سے محروم ہی تھے۔ آج نمرہ کے توسط سے انہیں یہ خوشی ملی تھی تو ان کا دل خوشی کے احساس سے بے ساختہ دھڑک اُٹھا تھا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھے تھے۔

''مبارک ہو آفاق بھائی! آپ نانا بن گئے۔'' ڈاکٹر سعیدہ ابھی ابھی نمرہ کو دیکھنے کمرے میں آئی تیں۔ آفاق صاحب کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر مسکرا کر بولیں۔ ''آپ ہی کا انتظار ہو رہا تھا کہ آپ آئیں تو بچے کے کان میں اذان دلائی جائے۔''

''کک...... کہاں ہے بچہ؟'' آفاق صاحب مسرور و مضطرب سے آگے بڑھے۔

عظمت بی نے گول گوتھنا سا ننھا سا بچہ گود میں اٹھا کر ان کی طرف بڑھایا۔

''ماشاءاللہ!'' بچے کے چاند چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ بے ساختہ کہہ اُٹھے تھے۔ بچہ ہو بہو اپنی ماں کی تصویر تھا۔ چشم زدن میں انہوں نے بچے میں اُس کے بدبخت باپ رشید کی شباہت تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اس کی کوئی شباہت نہ پا کر ان کے دل میں اطمینان بھرا احساس اُترتا چلا گیا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر بے ساختہ اسے بازوؤں میں تھام کر سینے سے لگا لیا تھا۔ پھول سے نومولود کو سینے سے لگا کر انہیں کیسی الوہی خوشی نصیب ہوئی تھی۔

نمرہ آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ اس کے چہرے سے نقاہت کا اظہار ہو رہا تھا۔ مگر اس کے سُتے ہوئے زرد چہرے پر ایک اطمینان اور مسرت کا احساس بھی پھیلا ہوا تھا۔

''لو، دودھ پی لو۔'' عظمت بی نے گرم دودھ میں دیسی انڈا پھینٹ کر نمرہ کو پینے کے لئے دیا تھا۔ ''پی لو بیٹا! طاقت آئے گی۔ ابھی یہ ننھا سا بچہ دودھ مانگے گا۔'' انہوں نے نمرہ کی آنکھوں میں انکار دیکھ کر اسے سمجھاتے ہوئے کہا اور سہارا دے کر ذرا سا سر اٹھا کر گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔

تب تک آفاق صاحب، بچے کے کان میں اذان دے کر اسے کمرے میں لے آئے تھے۔

نمرہ نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا تھا۔

''جیتی رہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھے۔ ''بھئی ہمیں مبارکباد دو.... ہم نانا بن گئے۔'' وہ خوشگوار لہجے میں بولے تو نمرہ کے پپڑی زدہ لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور بالکل اچانک اسے رشید اور انو کا خیال آیا تھا۔ وہ بھی کیسے نصیب لائی تھی کہ اس پل جنہیں اس کے پاس ہونا چاہئے تھا، ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں تھا۔ اور کیسی بدنصیبی تھی کہ ان دونوں کے کبھی لوٹ آنے کی آس بھی نہیں تھی۔ اور جس سے کوئی رشتہ ناطہ نہ تھا، وہ اس کے سر پر چھتر چھایا بنا موجود تھا۔

''خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ اگر آپ نہ ہوتے تو......'' نمرہ کی پلکوں پہ نمی جمع ہونے لگی۔

''ارے کیسی بات کر رہی ہو؟'' آفاق صاحب گھبرا کر آگے بڑھے۔ ''پگلی ہو۔ بات بے بات روتی ہو۔ دیکھو! اللہ نے تمہیں کیسا پیارا، کیسا چاند سا بیٹا عطا کر دیا ہے۔ بس اب ہر بات بھول کر اس کی تربیت اور پرورش میں لگ جاؤ۔''

آفاق صاحب نے فون کے ذریعے فریحہ اور فریال کو اطلاع دے دی تھی۔ وہ دونوں نمرہ سے بات کرنے کے لئے بے چین تھیں۔ مگر آفاق صاحب نے کہہ دیا تھا کہ گھر پہنچنے کے بعد ہی وہ ان کی نمرہ سے بات کروائیں گے۔

کچھ دیر میں غفور ناشتے کے ساتھ آفاق صاحب کی ہدایت کے مطابق بڑا سا گلاب جامنوں کا ڈبہ بھی لے آیا تھا۔

❀===❀===❀

تپتی دوپہر، سہ پہر کی طرف قدم رنجہ تھی۔

ثروت دوپہر کا کھانا کھا کر بیڈ روم کے پردے کھینچ کر بیڈ پہ آ لیٹی تھی۔

اسد صبح کے نکلے شام کو کہیں جا کر لوٹتے تھے۔ اکثر ندرت جہاں اور فروا آ جاتی تھیں۔ مگر پچھلے دو دنوں سے وہ گھر میں بالکل اکیلی تھی۔ آج کل طبیعت بھی کچھ مندی چل رہی تھی..... اس لئے دوپہر کا کھانا کھا کر وہ بستر پر گر کر سو جایا کرتی تھی۔ مگر جانے کیوں آج نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔

فلیٹ کی کھڑکی کے بالکل ساتھ بجلی کے تار کھینچے ہوئے تھے۔ ایک کوا انہی تاروں پہ بیٹھا زور زور سے کائیں کائیں کئے جا رہا تھا۔ ثروت بے زاری سے اُٹھی۔ کھڑکی کھول کر کوّے کو ہشکارا اور دوبارہ سے بیڈ پر آ بیٹھی۔

یہ دو کمروں کا معمولی سا فلیٹ۔

پرانی کھٹارا گاڑی۔

اور اسد کی چند ہزار روپوں کی نوکری....

ان سب کے لئے تو اس نے اسد سے شادی نہیں کی تھی۔
اس کے تو بڑے رنگین اور اونچے خواب تھے۔
''وجاہت منزل'' اس کی منزل تھی۔ اس محل نما کوٹھی پہ حکومت کرنے کی آرزومند تھی۔ بڑی بڑی بیش قیمت گاڑیاں......نوکر چاکر، روپے پیسے کی ریل پیل۔
پروائے تقدیر......اُس کے ہاتھ کچھ بھی نہ لگا تھا۔
اب فروا اور سرمد کے رشتے سے کچھ اُمید بندھی تھی۔ مگر اُسے اس رشتے سے بھی کوئی خاص توقع باقی نہ رہی تھی۔ گو کہ فروا کو سرمد پر بے حد بھروسہ تھا۔ مگر اب کبھی کبھی اسے بھی مایوس ہونے لگتی تھی۔
سرمد نے اس سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ نہ ہی قسمیں کھائی تھیں۔ ایک سرسری سا اظہار تھا۔ حالات سازگار ہوئے، وقت نے اجازت دی......تو وہ ہمیشہ کے لئے اس کا ہاتھ تھام لیں گے۔ مگر حالات تھے کہ بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔
وقت تھا کہ ہاتھ کی گرفت سے نکلا ہی جا رہا تھا۔
پچھلے کتنے ہفتوں سے سرمد نے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا تھا۔
فروا بے تاب ہو کر فون کرتی تو اکثر وہ فون اٹھاتے ہی نہیں تھے۔ اور جو کبھی اٹھا بھی لیتے تو اپنی مصروفیات اور کام کا رونا رو کر فون بند کر دیتے۔
سچ تو یہ تھا کہ اب سرمد، باپ کی طرف سے بہت زیادہ فکرمند ہو گئے تھے۔ اور اب کبھی کبھی انہیں یہ احساس ہونے لگتا تھا کہ وجاہت مرزا کی اس حالت کے ذمہ دار کسی حد تک اسد اور ثروت بھی ہیں۔ اسی لئے انہوں نے اسد کی طرف جانا کم کر دیا تھا۔
اور جہاں تک فروا کا تعلق تھا......اب تک صحیح معنوں میں وہ اس تعلق کو کوئی نام نہ دے سکے تھے۔
فروا کا فریفتہ ہو کر دیکھنا، چاہت کا بے مہابہ اظہار......اور بے تابانہ انتظار۔ انہیں کچھ اچھا لگتا تھا...... پر اب ان سب باتوں کے تصور سے ہی وہ وحشت زدہ سے ہو جاتے تھے۔ وہ ہمیشہ سے ہی ایسے تھے۔ شاید وقتی طور پر فروا کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوئے تھے۔ اور دیکھا جاتا تو ایسا کچھ اسیر بھی نہیں ہوئے تھے۔
سر اپنی ماں سطوت جہاں کے سلوک اور اپنے والد وجاہت مرزا کی دیوانہ وار چاہت کو دیکھ کر جانے کیوں ان کے دل میں بچپن سے ہی ایک بغاوت سی پلنے لگی تھی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ عورت سے جس قدر دور رہیں، اتنا ہی بہتر ہے۔ وقتی طور پر وہ فروا کی طرف راغب تو ہو گئے تھے......مگر اب......پھر سے اپنی ڈگر پہ آ گئے تھے۔ اور اب پھر وہ نہایت سنجیدگی سے سوچنے لگے تھے کہ جیتے جی شادی کا نام بھی نہ لیں گے۔ اور اگر شادی کرنی ہی پڑی تو وہ فروا سے شادی کر کے اپنے مرتے ہوئے باپ کو مزید کوئی صدمہ دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لئے یہ سوچ کر کہ جب وہ اس راہ پہ چل نہیں سکتے تو بلاوجہ اس لڑکی کو آس کیوں دلائیں......انہوں نے اپنا دامن سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔
اور یہ بات ثروت بہت اچھی طرح سمجھ رہی تھی اور محسوس بھی کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی، فروا اس سے زیادہ دُور اندیش اور عقل مند ہے تو یقیناً اس نے بھی یہ بات محسوس کر لی ہوگی۔ مگر اب تک نہ ثروت نے اس سے کہا تھا اور نہ ہی خود فروا نے اپنے لبوں سے کسی بات کا اظہار کیا تھا۔
ثروت نے گردن گھما کر تکیہ کی طرف دیکھا۔ ابھی وہ دوبارہ سے لیٹنے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ ڈور بیل کی تیز آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔
''توبہ ہے......'' وہ بھنا کر اپنی جگہ سے اُٹھی اور آہستگی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دونوں بیڈرومز کے سامنے

ایک چھوٹا سا لاؤنج تھا۔ داہنی جانب مختصر سا ڈرائنگ روم تھا۔ اور سامنے کی جانب باہر کا دروازہ۔ ثروت نے دروازہ کھولنے سے پہلے اونچی آواز میں سوال کیا تھا۔

''باہر کون ہے؟''

''ارے آپی! دروازہ کھولو...... ہم لوگ ہیں۔'' باہر سے فروا کی آواز سنائی دی تھی۔ اور ثروت نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا تھا۔ سامنے فروا اور ندرت جہاں کھڑی تھیں۔

''توبہ ہے امی!...... اتنی دھوپ اور گرمی میں...... بھلا اس وقت گھر سے نکلنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''ہاں، واقعی دھوپ بھی تیز ہے اور گرمی بھی۔'' ندرت جہاں نے دوپٹہ اُتار کر ایک جانب رکھتے ہوئے کہا۔ وہ تینوں ثروت کے بیڈروم میں آ چکی تھیں اور ندرت جہاں دائیں جانب ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ پڑی دو کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ چکی تھیں۔ گو کہ وہ دونوں رکشے پر آئی تھیں مگر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آنے تک ان کا سانس پھول گیا تھا۔

فروا بیڈ پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی تھی۔

پنکھا چل رہا تھا، پھر بھی کمرہ خاصا گرم تھا۔

''آپی! اسد بھائی سے کہہ کر کم از کم بیڈروم میں تو اسپلٹ لگوا لو۔'' فروا نے پاس پڑے گتے سے پنکھا جھلتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

''ان کے پاس کچھ ہو گا تو اسپلٹ لگائیں گے نا۔'' ثروت نے دل جلے انداز میں جواب دیا۔ ''سچ امی! اب تو کبھی کبھی مجھے بے حد پچھتاوا ہونے لگتا ہے......''

''ذرا صبر سے کام لو۔'' ندرت جہاں نے مدبرانہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''سرمد کو قابو میں آنے دو...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''سرمد؟'' ثروت نے سر کو خم دے کر سوالیہ نظروں سے فروا کی طرف دیکھا۔ ''سرمد کی فروا جانے...... مگر جہاں تک میرا خیال ہے، مجھے تو نہیں لگتا سرمد قابو میں آ سکے گا۔ کیوں فروا؟''

فروا کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔

یہ سچ تھا کہ اب سرمد کے تیور بدلے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ پہلے وہ فون پر توجہ اور لگن سے بات کرتے اور سنتے تھے۔ مگر اب فون اُٹھانے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے تھے۔ پہلے اکثر بھائی اور بھابی سے ملنے آتے تھے، اب مہینوں گزر جاتے ادھر کا رخ بھی نہ کرتے۔

''بولو نا...... سرمد سے آخری بار تمہاری کب بات ہوئی تھی؟''

''ہاں، کافی دن ہو گئے۔'' فروا نے گہری سانس لے کر اقرار کیا۔ ''مجھے لگتا ہے، آج کل وہ بے حد مصروف ہیں۔''

''اے سب کہنے کی باتیں ہیں۔'' ثروت ہاتھ نچا کر تلخ لہجے میں بولی۔ ''دل کا معاملہ ہو تو یہ مرد ہزار مصروفیتوں میں سے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔ اسد کیسے بھاگ بھاگ کر آیا کرتے تھے۔''

''تو......'' فروا نے بھنویں سکیڑ کر ماں اور بہن کی طرف دیکھا۔ ''ان کے دوڑ دوڑ کے آنے کا بھی تو ہم لوگوں کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔''

''ہاں سو تو ہے۔'' ندرت جہاں نے گہری سانس لے کر زبان کھولی۔ ''اگر اسی طرح خالی خولی سرمد بھی ہاتھ لگ جائے تو فائدہ بھی کیا ہے؟...... اگر ثروت کی شادی اسد سے نہ ہوتی تو دوسرا جو بھی رشتہ ہوتا، وہ کم از کم اسد کی موجودہ حالت سے بہتر ہی ہوتا۔ اسد کی ممانی، رئیسہ بیگم اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے ثروت کا ہاتھ مانگ رہی تھیں۔ لو...... ذرا

دیکھو PECHS میں یہ بڑی کوٹھی ہے ان کی۔.....یہ لمبی چمکتی ہوئی کار......مگر ہماری مت پہ تو پتھر ہی پڑ گئے تھے۔''

''اچھا چھوڑیئے اب اس قصے کو۔'' ثروت بے زاری سے ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ''چائے پئیں گی کیا؟''

''اس گرمی میں چائے؟'' فروا نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

''گرمی میں ہی تو چائے پینے کا مزہ ہے۔'' ثروت مسکرائی۔ ''سنا نہیں، جس طرح لوہا لوہے کو کاٹتا ہے، اسی طرح گرمی، گرمی کو مارتی ہے۔''

''اچھا بابا!.....تمہاری تاویل مان لی۔ چلو چائے پلوادو۔'' فروا ہاتھ اونچا کر کے ہتھیار ڈالنے والے لہجے میں بولی۔

''پلوادو، مطلب؟'' ثروت آنکھیں نکال کر گویا ہوئی۔ ''تمہارے بہنوئی کے گھر میں نوکر چاکر ہیں کیا کہ میں اسی کو حکم دوں، تمہارے لئے چائے بنا لائے.....اُٹھو! جا کر چائے بناؤ۔ خود بھی پیو اور مجھے اور امی کو بھی پلاؤ۔''

''نہ بھئی۔'' فروا نے ہاتھ آگے بڑھا کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس گرمی میں ہم تو نہیں جا رہے تمہارے چھوٹے سے ڈربہ نما باورچی خانے میں چائے بنانے۔''

''دیکھا امی! یہ میرے کچن کو ڈربا کہہ رہی ہے۔'' ثروت شکایتی انداز میں ماں کی طرف مڑ کر بولی۔ ''میں بھی دیکھتی ہوں کہ اس کے گھر کا کچن کتنا بڑا ہوگا۔''

''اگر سرمد سے ہو جائے تو کہنا ہی کیا۔'' ندرت جہاں نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اگر'' کا لفظ ان کی اندرونی مایوسی کا پتہ دے رہا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ سرمد کے رویّے نے فروا کو ہی نہیں، ندرت جہاں کو بھی بے حد مایوس کیا تھا۔

''وجاہت منزل'' کا باورچی خانہ دیکھا ہے تم نے؟'' ندرت جہاں نے سوالیہ نظروں سے ثروت کی طرف دیکھا۔

''ایک نہیں دو دو باورچی خانے ہیں۔ ایک جدید قسم کا اندر ہے اور ایک بہت وسیع و عریض باہر کی طرف۔ ایک وقت میں وہاں چار دیگ اُتارے جا سکتے ہیں۔''

ماں کی بات سن کر فروا کے دل میں ٹھنڈے پڑتے جذبے ایک بار پھر انگڑائی لے کر بیدار ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

اتنا شاندار محل نما گھر.....درجنوں اعلیٰ درجے کی بیش قیمت گاڑیاں.....نوکر چاکر.....مالی، ڈرائیور.....دولت کی ریل پیل، اور اس پہ سرمد جیسے شاندار، وجیہہ و شکیل، نیک خو انسان.....یقیناً وہ لڑکی جو سرمد کی شریک زندگی ہونے کا اعزاز پاتی، وہ دنیا کی خوش نصیب ترین لڑکی ہوتی۔

فروا نے اپنا موبائل اٹھایا اور کچن کی طرف چل دی۔

''چائے بنانے جا رہی ہو کیا؟'' ثروت نے پوچھا۔

''دیکھتی ہوں۔'' فروا نے گول مول جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔ وہ کچن میں جا کر سرمد کو فون کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ لاؤنج اور کچن کے درمیان چھوٹا سا پیسج تھا۔ فروا وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی اور سرمد کا نمبر ملانے لگی تھی۔

❁===❁===❁

رشید شاید اتنی جلدی اور اتنی سخت شرائط پہ مہکار سے شادی کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوتا اگر یونس لاکھانی کی مشاورت اس کے ساتھ نہ ہوتی۔ ایک طرف لاکھانی اسے شادی کے لئے اُکسائے جاتا تو دوسری طرف مہکار اُسے اپنی سچی محبت اور دیوانگی کا یقین دلائے جاتی۔

''پتہ ہے آپ کو.....'' اس شام وہ مہکار سے ملنے گیا تو وہ اِٹھلا کر بولی تھی۔ ''وہ نیا ڈائریکٹر، آپا کے ہاتھ جوڑ رہا تھا کہ کسی طرح مہکار کو اس کی فلم میں کام کرنے کے لئے راضی کر لو۔''

''اچھا.....'' رشید نے بے یقین نظروں سے مہکار کی طرف دیکھا۔

''مجھ سے ملنے کے لئے ضد کرتا رہا۔'' مہکار نے ہاتھ ہلا کر اپنی بات جاری رکھی۔ ''پر آپ کی جان کی قسم! میں نے تو ملنے سے ہی انکار کر دیا۔ آپا گلبہار خفا ہوئی بہت۔ پر میں نے صاف کہہ دیا، اب نہ کوئی فلم، نہ ٹی وی، نہ ریڈیو.....اب تو ایک اچھی، وفادار اور محبت کرنے والی گھر والی بن کر رہنا ہے۔''

اچھی اور وفادار گھر والی کے نام پر بے ساختہ رشید کو نمرہ کا خیال آ گیا تھا اور اس کا خیال آتے ہی وہ چڑ سا گیا تھا۔

''کیا عذاب ہے یہ بھی۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''کچھ کہا تم نے؟'' مہکار نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''نن.....نہیں.....کچھ نہیں.....'' وہ جلدی سے گڑبڑا کر بولا۔ ''ہاں، تم بولو نا.....کیا کہہ رہی تھیں؟''

''میں کہہ رہی تھی.....'' مہکار اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔ ''جانو!.....آپا کی خوشی کی خاطر تم کیا اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ وہ پلاٹ وقتی طور پہ میرے نام کر دو۔''

''وقتی طور پہ؟'' رشید کچھ سمجھا نہیں تھا۔

''دیکھو جان! آپ کی مہکار کو آپ کے سوا کچھ نہیں چاہئے۔'' مہکار اس کی طرف محبت لٹاتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''جب پہلی بار آپ مجھ سے الگ ہوئے تھے نا.....تب مجھے پتہ چلا تھا کہ آپ میرے لئے کیا تھے۔ میرا کھانا پانی چھوٹ گیا تھا۔ ہفتوں روتی رہی تھی۔ اسی لئے تو گل بہار آپا اب آپ سے میری شادی کے لئے اتنی آسانی سے مان گئی ہیں۔ وہ جانتی ہی کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ بس اپنی انا کی تسکین کی خاطر انہوں نے یہ چھوٹی سی شرط لگا دی ہے۔ آپ ان کی خوشی کی خاطر وہ پلاٹ میرے نام لگا دیں.....شادی کے کچھ ہی دنوں بعد میں وہ پلاٹ آپ کو واپس کر دوں گی۔ جب آپ ہی مجھے مل جائیں گے تو مجھے بھلا سی اور چیز کی ضرورت ہی کیا رہ جائے گی۔''

لاکھانی نے بھی اس سے یہی کہا تھا کہ جب مہکار اپنی ہو جائے گی تو اس کی ہر چیز بھی اپنی ہی ہو گی۔ اور اب وہ اپنے منہ سے وہ بات کہہ رہی تھی جو لاکھانی اسے سمجھا رہا تھا۔

''چلو ٹھیک ہے۔'' آخر کار بادل نخواستہ رشید نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''او میں صدقے دلدار کے.....'' مہکار بے ساختہ اس سے لپٹ گئی تھی۔ اور رشید کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

''تو سرکار! چلئے اسی خوشی میں کچھ شاپنگ کر لی جائے۔'' مہکار کے مسکرا کر کہنے پر رشید نے کہا تھا۔

''شاپنگ.....؟ وہ کس سلسلے میں؟''

''بڑے بھولے ہو آپ.....'' مہکار اِٹھلا کر بولی۔ ''جناب! شادی کے سلسلے میں.....اور کس سلسلے میں؟''

اور رات گئے شاپنگ اور ڈنر کے بعد جب وہ گھر واپس لوٹے تھے تو رشید کے اکاؤنٹ سے کوئی سات لاکھ روپے کم ہو چکے تھے۔ مہکار نے اپنے لئے تین زیور کے سیٹوں کا جو آرڈر دیا تھا، وہ الگ تھا۔ کل ملا کر تقریباً 30 لاکھ کا اس نے زیور خریدا تھا۔

ہفتے بھر میں پلاٹ کی ٹرانسفر کا مرحلہ بھی طے پا گیا تھا۔ اب رشید کے 10 کروڑ کے پلاٹ کی مہکار مالکہ بن چکی تھی۔ جس صبح پلاٹ مہکار کے نام منتقل ہوا تھا، اسی شام رشید، مہکار سے نکاح کر کے اسے ساتھ لے کر اپنے گھر چلا آیا تھا۔

گاڑی کے رکنے کی آواز پہ سلطانہ نے غصے بھری نظروں سے سامنے دیوار پہ لگے وال کلاک کی طرف دیکھا تھا اور

پڑ لڑانے ڈپٹنے کے لئے تیار ہو بیٹھی تھی۔
''چھوٹو! ذرا دیکھ تو اسے اوپر آنے میں اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے؟'' سلطانہ نے چھوٹو کو سیڑھیوں سے نیچے جھانک کر دیکھنے کا حکم دیا اور خود بھی بڑبڑا کر بولی۔ ''کم بخت آج بھی نشے میں دھت آیا ہوگا.....گرتا پڑتا، لڑکھڑاتا اوپر چڑھ رہا ہوگا۔''
چھوٹو نے گرِل سے جھک کر نیچے دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت اور بے یقینی سے پھیل گئیں۔ رشید ایک سرخ عروسی لباس میں ملبوس، سونے کے زیورات سے لدی پھندی حسین و دلکش عورت کے ساتھ اوپر آ رہا تھا۔
''اماں جی! صاحب کے ساتھ تو کوئی نئی عورت اوپر آ رہی ہے۔''
''نئی عورت؟'' سلطانہ حیرت سے بولی۔ ''ارے بھلا اس کے ساتھ کون سی نئی عورت آ رہی ہے؟......ذرا غور سے دیکھ کم بخت!''
''ابھی آپ خود دیکھ لینا۔ وہ بس اوپر پہنچنے ہی والے ہیں۔''
سلطانہ بڑبڑا کر اپنی جگہ سے اُٹھی ہی تھی کہ رشید، مہکار کو لئے آخری سیڑھی پہ پاؤں دھرتا اوپر ورانڈے میں نمودار ہوا۔
سلطانہ نے آنکھیں پھاڑ کر خوشبوؤں میں بسی، ہار سنگھار سے سجی مہکار کی طرف دیکھا۔
''یہ کون ہے؟'' اُس کی چنگھاڑتی آواز اُبھری۔
''یہ آپ کی نئی بہو ہیں۔'' لاکھانی، رشید کے پیچھے سے نکل کر سامنے آیا۔ ''کھوسبو کا جھونکا...... بولے تو...... مہکار بیگم......!''
''ارے آگ لگے خوشبو اور بدبو کو......'' سلطانہ غصے سے بولی۔ ''میں پوچھتی ہوں رشید! تیرا دماغ تو ٹھکانے پر ہے؟.....اس بڑھاپے میں تُو اس چھمک چھلّو کو بیاہ لایا ہے......تیرے سر پہ جو یہ چار بال بچے ہیں، تُو کیوں ان کا دشمن ہوا ہے؟''
''اماں! اب جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ میں نے مہکار سے شادی کر لی ہے۔ اب یہ میری گھر والی ہے۔ میرے گھر کی مالک۔''
''میں اسے قبول نہیں کروں گی۔'' سلطانہ ضدی بچے کی طرح زور سے فرش پہ پاؤں مار کر بولی۔
''آپ قبول نہیں کرتی تو نہ کرو......رسید بھائی تو قاضی اور دو گواہوں کے سامنے اسے قبول کر کے لائے ہیں۔''
مہکار خوب لبوں اور مٹکتی آنکھوں سے اس سفید بالوں والی کراری اور تیز طرار بڑھیا کو دیکھ رہی تھی، جو پہلی ہی نظر میں اسے زہر لگی تھی۔ لاکھانی نے اسے اس کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ مگر آج اسے دیکھنے کے بعد اسے اندازہ ہوا تھا کہ لاکھانی نے تو اس کے بارے میں بہت ہی تھوڑا بتایا تھا۔
''آؤ جانی! اندر چلو۔'' رشید، مہکار کو شانوں سے تھامے اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گیا تھا۔
''جانو!......تمہارا گھر اچھا ہے......مگر چھوٹا بہت ہے۔'' مہکار کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ادا سے بولی۔
''میرا کیا......کرائے کا گھر ہے۔'' رشید نے وضاحت کی۔
''تو کیا ہم کسی بہتر جگہ پر کرائے کا گھر نہیں لے سکتے؟'' مہکار نے لاڈ سے پوچھا۔
''لے کیوں نہیں سکتے۔'' رشید شاہانہ انداز میں بولا۔ ''جہاں تم کہوگی، وہیں لے لیں گے۔''
''اوڈارلنگ! آپ بہت اچھے ہو۔'' مہکار نے لہرا کر اپنی بانہیں رشید کی گردن میں حمائل کر دی تھیں۔

اندر راز و نیاز کی باتیں ہو رہی تھیں۔ باہر سلطانہ کے دل پہ چھریاں چل رہی تھیں۔ اب وہ پچھتا رہی تھی کہ اگر اسے پتہ ہوتا کہ وہ اتنی جلدی پھر شادی کا جوا گلے میں ڈال لے گا تو بھلا اسے نمرہ کو گھر سے نکالنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس خوشبو کے جھونکے کی نسبت نمرہ تو ہزار گنا بہتر تھی۔ بے زبان، بے ضرر، خدمت گزار، نیک، معصوم۔

''اے اس حرافہ سے اس کا گزارہ ہوگا؟'' سلطانہ زہر خند لہجے میں لاکھانی سے مخاطب ہوئی جو اب تک ورانڈے کی گرِل تھامے کھڑا تھا اور سلطانہ کے سلگنے کے منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''مائنڈ یور لینگویج اماں جی!'' وہ نروٹھے لہجے میں بولا۔ ''آپ جس کو حرافہ بول رہی ہو، وہ رسید بھائی کی بیوی ہے۔''

''ارے دس بیویاں دیکھ چکی ہوں میں اس کی..... یہ طوائف زادیاں کسی کا گھر کب بساتی ہیں؟'' سلطانہ شعلہ بار لہجے میں بولی۔

''اور وہ سریف جادیاں (شریف زادیاں) جو گھر بسانا چاہتی ہیں، تو اُنہیں آپ جیسی سیطان صفت ساسیں گھر بسانے نہیں دیتیں۔''

نہ چاہتے ہوئے بھی لاکھانی یہ بات کہہ گیا تھا۔ مگر اس جملے کے ساتھ ہی اس نے واپسی کے لئے سیڑھی پہ قدم رکھ دیئے تھے۔ مگر سلطانہ نے کسی ری ایکشن کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ گم صم سی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔ سچ تو کہا تھا اس نے۔

رشید کی زندگی میں نمرہ سے پہلے بھی ایک ایسی ہی معصوم اور اچھی لڑکی آئی تھی جو کسی بھی طرح رشید کے ساتھ گھر بسا کر رہنا چاہتی تھی۔ مگر اس نے ایسا نہیں ہونے دیا تھا اور اسے گھر چھوڑ کے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اپنی نومولود بچی، سلطانہ کے حوالے کر کے چلی گئی تھی۔ اور سلطانہ نے اپنی لاپروائی اور کمینگی سے اس ننھی سی بچی کو مرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اور پھر نمرہ کو وہ اپنی دلہن بنا کر لایا تھا۔ گائے کی طرح بے زبان اور معصوم۔ خدمت کرنے کے سوا اسے کچھ اور سوجھتا ہی نہ تھا۔ روز سونے سے پہلے اس کے پاؤں دباتی تھی۔ صبح صبح چائے بنا کر اس کی خدمت میں پیش کرتی تھی۔ رشید کے جوتے لات کھا کر بھی اس کے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ مگر اس کے باوجود اس نے اسے بسنے نہ دیا تھا۔

اگلے دن رشید، مہکار کو لے کر ہنی مون کے لئے یورپ چلا گیا تھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں رمضان آرائیں کی طرف سے بھیجی گئی خطیر رقم موجود تھی، جسے مہکار ناز و انداز سے، پیار دُلار سے بڑی فراخ دلی سے خرچ کروا رہی تھی۔

جاتے وقت مہکار چھوٹو اور چوکیدار زمرد خان کی بھی چھٹی کر گئی تھی۔

''دو ہفتوں بعد ہم لوگ آئیں گے، تب ہی کام پہ آنا۔'' انہیں ایڈوانس تنخواہ دے کر اس نے رخصت کر دیا تھا۔

''اوہ...... خدا آپ کا بھلا کرے، ہم کب سے پشاور جانے کا سوچ رہا تھا۔ اب کل ہی جائے گا۔'' زمرد خان مسرور لہجے میں بولا تھا۔

''ہاں، ضرور جاؤ۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''اور ہاں، چھوٹو! خبردار جو تُو ہمارے آنے سے پہلے جو کبھی آیا تو۔'' وہ چھوٹو کو مخاطب کر کے بولی۔

''ارے نہیں بھابھی! میں پاگل ہوں جو آؤں گا؟'' چھوٹو کان پکڑتا ہوا بولا اور ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

''یہ تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟'' سلطانہ نے رشید اور مہکار کو سوٹ کیس لئے باہر نکلتے دیکھا تو حیرت سے بولی۔

''اماں! بس ذرا گھومنے پھرنے جا رہے ہیں۔'' رشید نے سوکھے منہ سے جواب دیا اور مہکار کا ہاتھ پکڑے گھر سے باہر چلا گیا۔

سلطانہ کو رشید سے اتنی بے رخی کی توقع نہ تھی۔ وہ غصے میں پیچھے لپکی مگر وہ دونوں سیڑھیاں طے کر کے گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ وہ اندر آ کر بیٹھ گئی۔

''چھوٹو!......ارے او چھوٹو!......کہاں مر گیا؟'' اس نے چوکی پہ بیٹھ کر چھوٹو کو آواز دی۔

''کیا ہے؟'' چھوٹو اپنے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھائے باہر آیا۔

''ذرا چوکیدار کو بھیج کر سبزی ترکاری منگوا لے۔ فریج خالی پڑا ہے......وہ لاٹ صاحب تو گھومنے پھرنے چلے گئے ہیں۔ جانے کب تک لوٹیں۔''

''لو......تمہیں بتا کر بھی نہیں گئے؟...... پورے 15 دنوں کے لئے یورپ گئے ہیں۔ نئی بھابی کو گھمانے لے گئے ہیں۔'' چھوٹو نے آنکھیں مٹکا مٹکا کر بتایا تو اس کا دل جل کر رہ گیا۔

''بتاؤ ذرا، مجھے بتا کر بھی نہیں گیا۔ یہ حرام زادی تو کچھ زیادہ ہی قتامہ ہے۔ ایک رات میں ہی مجھ سے میرا بیٹا چھین کر لے گئی۔'' سلطانہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی پاؤں سمیٹ کر چوکی پہ بیٹھ گئی۔

''اچھا جا......چوکیدار کو ذرا بلا لا۔'' کچھ دیر بعد وہ چھوٹو کو مخاطب کر کے بولی۔

''اماں جی! چوکیدار تو پشاور گیا۔ اب دو ہفتے بعد ہی آئے گا۔ نئی بھابی اُسے چھٹی دے گئی ہیں۔''

''کیا......؟'' چھوٹو کے جواب نے اسے چراغ پا کر دیا تھا۔ ''وہ کون ہوتی ہے نوکروں کو چھٹی دینے والی۔''

''لو بتاؤ، گھر کی مالکن ہیں وہ۔'' چھوٹو زخم پر نمک چھڑکنے کو ہاتھ نچا کر بولا۔ ''اور تو اور وہ تو مجھے بھی چھٹی دے گئی ہیں......میں بھی چلا۔''

''ارے پاگل ہوا ہے کیا؟......کہاں جا رہا ہے؟'' سلطانہ نے گھبرا کر پوچھا۔

''اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔ بھابی کے آتے ہی آ جاؤں گا۔'' چھوٹو الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتا سیڑھیوں سے نیچے اُترتا چلا گیا۔

سلطانہ حیران و پریشان سی چوکی پہ بیٹھی رہ گئی تھی۔

مہکار تو جو تھی، سو تھی۔ اسے تو رشید کے رویے پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی نہ سوچا تھا کہ چوکیدار اور نوکر کے بغیر وہ اکیلی کیونکر رہ سکے گی۔

کافی دیر تک وہ رنج و ملال اور حیرت کی کیفیت میں اپنی جگہ بیٹھی رہی تھی، پھر گھٹنے پکڑتی اپنی جگہ سے اُٹھی تھی۔ سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ مگر یہ کیا، چائے کی پتی کا ڈبہ خالی پڑا تھا۔ جبکہ رشید جاتے وقت اسے کچھ پیسے بھی دے کر نہیں گیا تھا......وہ تو کہو کہ وہ کچھ پیسے چرا بچا کر رکھا کرتی تھی، اس آڑے وقت میں وہی کام آئے۔ اس نے صندوقچی سے روپے نکالے اور گھٹنے پکڑتی بدقت تمام سیڑھیاں اُترتی محلے کی دکان کی طرف چل دی تھی۔

❁===❁===❁
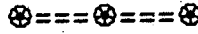
موسم سرما کا آغاز تھا۔

ہواؤں میں بھی خنکی کا احساس بڑھ گیا تھا۔

نمرہ کا بیٹا آفتاب، فریحہ کی خواہش پر نمرہ نے آفاق صاحب سے کہہ کر بچے کا نام آفتاب ہی رکھا تھا......اور سب اسے پیار سے تابی بلاتے تھے۔

تابی اب چار مہینے کا ہونے کو آیا تھا۔ وہ ایک بے حد پیارا اور معصوم سا بچہ تھا۔ سب ہی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔

اس شام نمو، تابی کو گود میں لئے بیٹھی تھی کہ آفاق صاحب ہاتھ میں ایک فائل لئے کمرے میں داخل ہوئے۔

''لو بیٹا! ذرا اسے دیکھو۔'' انہوں نے فائل نمرہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور خود تابی کے پھولے پھولے نرم رخساروں کو چھو کر اسے ہنسانے کی کوشش کرنے لگے۔

نمرہ نے فائل کھول کر دیکھا۔ اس میں بی ایس سی میں داخلے کا فارم رکھا تھا۔

''یہ فارم کس لئے؟'' اس نے حیرانی سے آفاق صاحب کی طرف دیکھا۔

''بھئی ظاہر ہے، تمہارے لئے ہے۔ منّے میاں تو ابھی سے یونیورسٹی جانے سے رہے۔ اور میں تو پہلے ہی سے ایم ایس سی، ایم فل ہوں۔'' وہ مسکراتی آواز میں بولے تو نمو قدرے حیران اور مجبور لہجے میں بولی۔

''مگر انکل!.....اب میں......بھلا کیسے پڑھوں گی؟'' اس نے پریشان نظروں سے تابی کی طرف دیکھا۔

''ارے بیٹی! جیسے سب پڑھتے ہیں، تب بھی پڑھو گی۔ بلکہ ہمیں یقین ہے تم دوسروں سے زیادہ اچھا پڑھو گی۔''

''مگر انکل!.....تابی.....اور پھر......بس شاید اب میں نہیں پڑھ سکوں گی۔''

''دیکھو نمو! تابی کی تم فکر مت کرو۔ عظمت بی اور غفور گھر میں موجود ہیں۔ جب تک تم یونیورسٹی میں ہو گی، یہ لوگ تابی کو دیکھ لیں گے۔ اور جہاں تک یہ سوال ہے کہ اب تم پڑھ نہیں سکو گی تو یہ بالکل غلط بات ہے۔ تم ایک بہت اچھی اسٹوڈنٹ رہی ہو...... پوزیشن ہولڈر...... تمہیں ضرور پڑھنا چاہئے۔ چلو ایم بی بی ایس نہ سہی، کم از کم تم بی ایس سی تو کر ہی سکتی ہو۔''

اور ایم بی بی ایس کے ذکر پر اسے بے ساختہ انو یاد آ گیا تھا۔ اس کی کتنی شدید خواہش تھی کہ نمو پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بنتی۔ نمو نے تو اس کی آرزو پوری کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ وہ خود ہی اپنی آرزو کو بھلا بیٹھا تھا۔ بیوی کے آنچل تلے بیٹھ کر وہ جان سے پیاری بہن کو یوں یکسر فراموش کر بیٹھا تھا، جیسے اس سے کوئی رشتہ ہی نہ تھا۔

نمو کی پلکوں پہ نمی اُتر آئی تھی۔

''دیکھو نمو!'' آفاق صاحب نے شفقت بھرے انداز میں اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''کسی بھی انسان کے لئے تعلیم بے حد ضروری ہے۔ اور لڑکیوں کے لئے تو خاص طور پر۔ اسی لئے میری خواہش ہے کہ تمہارا تعلیم کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے جڑ جائے۔''

اور اس طرح ایک بار پھر اس کی پڑھائی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ زندگی ایک خوشگوار نہج پر چل نکلی تھی۔

وہ صبح اٹھ کر نماز و تلاوت سے فارغ ہو کر تابی کے چھوٹے موٹے کام نمٹاتی۔ جب تک عظمی بی اس کے اور پروفیسر صاحب کے لئے ناشتہ تیار کر دیتیں۔ ناشتے کے بعد وہ فٹافٹ تیار ہو جاتی اور آفاق صاحب اسے ساتھ لئے یونیورسٹی روانہ ہو جاتے۔ نمو ایک بڑی سی چادر میں چہرہ بھی چھپا کر جاتی تھی۔ آفاق صاحب کا خیال تھا کہ انو کو بھی یہ پتہ نہیں چلنا چاہئے کہ وہ آفاق صاحب کی پناہ میں ہے۔

نمو کتابوں میں کھو کر بے حد خوش تھی۔ ایک تابی نے، دوسرے تعلیم کے ٹوٹے ہوئے سلسلے کے از سرِ نو جڑ جانے نے، نمو کے بہت سے دُکھ بھلا دیئے تھے۔ اب وہ خاصی مطمئن اور خوش رہنے لگی تھی۔

''لو بیٹا!.....تابی کو پہنا کر دیکھو، سائز پورا ہے کہ نہیں۔'' عظمت بی، اُون کے آسمانی رنگ کے نرم گرم سے موزے لئے اس کے پاس آئی تھیں۔ ''ہم نے اپنے ہاتھوں سے مُنے میاں کے لئے بنائے ہیں۔''

''اوہ عظمت بوا!...... یہ تو بے حد خوبصورت ہیں۔'' نمرہ نے حیرت بھری مسرت سے موزے ہاتھوں میں لے کر دیکھے۔ ''آپ نے کیسے بنائے؟''

''لو، اُون اور سلائیوں سے بنائے۔ اور کیسے بنائے؟'' عظمت بی خود ساختہ ہنس پڑیں۔ ''تم کہو گی تو تم کو بھی سکھا دیں گے۔ بٹیا! آج کل تو ریڈی میڈ کا زمانہ ہے.....اب اُون سلائیاں کون پکڑتا ہے؟ ورنہ ایک ہمارا زمانہ تھا، سردیاں شروع ہوتے ہی ہماری اماں بُنائی شروع کر دیتی تھیں۔ کیسے کیسے ڈیزائن ڈال کر، کیسے کیسے دیدہ زیب سویٹر، مفلر،

موزے اور خدا جانے کیا کیا بُنتی رہتی تھیں۔''
''ہماری شریفن خالہ بھی بہت اچھا سویٹر بُنتی تھیں۔'' بالکل اچانک ہی نمو کو شریفن خالہ یاد آ گئی تھیں۔ ''بھیا بتاتے تھے کہ جب میں چھوٹی تھی تو انہوں نے کئی سویٹر میرے لئے بُنے تھے۔''
''بھیا.....؟'' عظمت بی حیران ہوئیں۔ ''تمہارے کوئی بھائی بھی تھے؟''
''تھے.....؟'' نمو کے دل پہ گھونسا سا لگا۔ ''خدانخواستہ تھے کیوں؟'' وہ جلدی سے بولی۔ ''اللہ کے فضل سے اب بھی حیات ہیں۔''
''اچھا.....'' عظمت بی کی حیرت میں اضافہ ہوا۔ ''تو کہاں ہیں بھلا؟.....کبھی آئے گئے نہیں''
آفاق صاحب نے عظمت بی کو نمرہ کے بارے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ ان کے مرحوم دوست کی بیٹی ہے.....اور کچھ نامساعد حالات کی بنا پر ان کے پاس رہنے کے لئے آئی ہوئی ہے۔ آج نمرہ کے منہ سے اس کے بھائی کا ذکر سن کر وہ حیران ہوئی تھیں۔
نمرہ نے مزید کچھ نہیں کہا تھا۔ پلکیں جھپک جھپک کے آنکھوں میں آئے آنسو پینے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ یہ رشتے بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتے۔ دل توڑنے والے کیوں دل میں بسیرا کئے رہتے ہیں۔
موسمِ سرما کے رخصت ہوتے ہی بی ایس سی فرسٹ ایئر کے امتحان شروع ہو گئے تھے۔ نمرہ کو کچھ فطرتاً تعلیم سے لگاؤ تھا، کچھ آفاق صاحب کی خوشی کی خاطر وہ خوب دل لگا کر، توجہ اور محنت سے امتحان کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔
امتحان ہوتے ہی نتیجہ بھی آ گیا۔ نمرہ نے بہترین نمبروں کے ساتھ سارے پیپرز کلیئر کر لئے تھے۔ آفاق صاحب بے حد خوش تھے۔ غفور اور عظمت بوا کی بھی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔ نمرہ کی اس کامیابی میں اُن سب کا بھی حصہ تھا۔
''انکل! فری کو بتایا آپ نے؟'' نمو نے دھیمی آواز میں پوچھا تھا۔
''ارے ہم تمہاری کامیابی کی خوشی میں اتنے کھو گئے کہ تمہیں یہ بتانا ہی بھول گئے کہ فریال کی طبیعت کچھ گڑبڑ تھی۔ جب ہم نے فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ لوگ ہسپتال گئے ہوئے ہیں۔''
آفاق صاحب کے بتانے پر نمرہ ایک دم سے پریشان ہو گئی تھی۔
''آپ نے پوچھا نہیں، کیا طبیعت خراب تھی؟'' اس نے بے صبری سے پوچھا۔ ''پلیز انکل! فون کیجئے۔ پتہ تو چلے کیا ہوا ہے اسے۔''
آفاق صاحب کے فون کرنے سے پہلے ہی اظفر کا فون آ گیا تھا۔
''مبارک ہو ماموں جان! آپ ایک نواسی کے بھی نانا بن گئے ہیں۔''
''اوہ اچھا۔'' آفاق صاحب کے چہرے پہ مسرت روشنی بن کر بکھر گئی تھی۔ ''بھئی تم لوگوں کو بھی مبارک ہو۔ سب خیریت تو ہے نا؟.....میرا مطلب ہے کہ فریال اور بچی.....''
''جی خدا کے فضل و کرم سے دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔''
فون رکھ کر آفاق صاحب نے خوشی سے دمکتی نظروں سے نمرہ کی طرف دیکھا۔ ''آج کا دن کچھ زیادہ ہی بھاگوان ہے۔ پہلے تمہارا رزلٹ آیا، اب فریال کی بیٹی کی خبر آ گئی۔''
''کیا؟'' نمرہ اُچھل پڑی۔ ''فریال کے یہاں بیٹی ہوئی ہے؟''
''ہاں، ابھی اظفر کا فون آیا تھا۔ دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ شام تک ہاسپٹل سے گھر آ جائیں گے۔''
فریال کے ماں بننے کی خبر نے نمرہ کے چہرے پر مسرت کی کرنیں بکھیر دی تھیں۔ وہ جلد از جلد اس سے بات کرنے

اور اسے مبارکباد دینے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔ آفاق صاحب اس کی بے تابی کو محسوس کر رہے تھے۔ اسی لئے ذرا ہی دیر بعد انہوں نے اظفر کے موبائل پر خود ہی فون کیا تھا۔

''ماموں جان!'' دوسری طرف سے اظفر کی چہکتی آواز سنائی دی تھی جس میں ہلکی سی حیرت کی آمیزش بھی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو اس نے فون کر کے خوشخبری دی تھی۔ ''آداب!''

''جیتے رہیے۔'' آفاق صاحب مشفق لہجے میں گویا ہوئے۔ ''بھئی کیا فری بٹیا سے بات ہو سکتی ہے؟'' ان کے لہجے میں ہچکچاہٹ کا عنصر خاصا نمایاں تھا۔

''جی کیوں نہیں۔'' اظفر نے جلدی سے کہا۔ ''ابھی ابھی انہیں کمرے میں شفٹ کیا گیا ہے۔ لیجئے بات کیجئے۔'' اظفر موبائل لئے فریال کے قریب چلے آئے تھے۔

''پاپا ہی؟'' فری نے سرگوشی میں پوچھا تھا۔ اظفر کے اثبات میں سر ہلانے پر اس نے لپک کر فون تھام لیا تھا۔

''پاپا!'' ہلکی نقاہت کے ساتھ مسرت کا عنصر بھی شامل تھا۔

''بہت مبارک ہو بٹیا!'' آفاق صاحب مسرور لہجے میں بولے۔ ''ہمیشہ خوش وخرم اور آباد رہو۔''

''شکریہ پاپا!'' فریال کی آواز میں نمی اُتر آئی۔ بے ساختہ اسے ملیحہ بیگم یاد آ گئی تھیں۔ کاش وہ زندہ ہوتیں...... اور اظفر کی امی، ارجمند بانو تو شاید آج خوشی سے نہال ہوا ٹھتیں۔ پوتا یا پوتی کھلانے کی آرزو دل میں لئے وہ قبر میں جا سوئی تھیں۔

''لو، اپنی بہنا سے بات کرو۔'' اسے نم آواز کے ساتھ یکا یک خاموش ہوتے دیکھ کر آفاق صاحب سمجھ گئے تھے کہ اس خوشی کے موقع پر پیاروں کے بچھڑ جانے کا غم تازہ ہو گیا ہے۔ اسی لئے وہ اس کا دھیان بٹانے کی خاطر لہک کر بولے تھے۔ ''یہ تمہاری نمو بیگم تم سے بات کرنے کے لئے بے چین ہو رہی ہیں۔''

پھر انہوں نے موبائل سامنے بیٹھی اور حیران انداز میں پلکیں پٹ پٹاتی، نمرہ کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

''لو، اپنی فری سے بات کر لو۔''

''اوہ..... اچھا۔'' نمرہ حیرت بھری مسرت سے بولی۔ ''فری......!''

''جناب!'' دوسری طرف سے فریال کی کھنکتی آواز سنائی دی۔ نمرہ کے نام پہ وہ اپنے آنسو پی کے مسکرانے پر مجبور ہو گئی تھی۔

''فری! تمہیں، اظفر بھائی کو، فریحہ آپی اور ظفریاب بھائی کو، عالم تاب انکل کو...... سب کو ننھی پری بہت بہت مبارک ہو۔''

''تمہیں بھی مبارک ہو۔'' فریال نے دھیمے لہجے میں کہا۔ فریحہ کی شادی کو کتنے ہی برس بیت چکے تھے مگر اس کی گود اب تک خالی تھی۔ گو کہ وہ بہن کے گھر بیٹی کی پیدائش پر بے حد خوش تھی، مگر اس کی اُداس آنکھوں سے جھانکتی محرومی کی پرچھائیاں سب ہی کو اس کے دکھ پہ دکھی کر رہی تھیں۔

''دعا کرو نمو! فریحہ آپی کی بھی گود بھر جائے۔'' فریال نے کن اکھیوں سے فریحہ کی طرف دیکھتے ہوئے بے حد دھیمی آواز میں سرگوشی کی تھی۔

''اِن شاء اللہ! جلد از جلد ان کی گود میں چاند سا بیٹا ہو گا۔'' نمرہ نے پورے خلوصِ دل سے کہا تھا۔ پھر فریال کی بچی کے بارے میں پوچھنے لگی تھی۔

''بس اب یہ جیسی بھی ہے، تمہاری بہو ہے۔'' فریال نے ننھی سی گل گوتھنا سی بچی کی طرف دیکھتے ہوئے شوخ لہجے

میں کہا تھا۔ ''کہیں تم اپنا وعدہ بھول تو نہیں گئیں؟''

''ارے میں نے وعدہ کب کیا تھا؟'' نمرہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ ''کیا نام سوچا ہے؟''

''تمہارے منے میاں، آفتاب ہیں.....تو بس اس کا نام کرن......کیسا؟'' فریال نے مسرور سے لہجے میں پوچھا تو نمرہ بھی بے ساختہ خوش ہو کر بولی۔

''بہت اچھا نام ہے۔ خدا مبارک کرے۔''

آج کا دن واقعی بہت اچھا تھا۔ ایک ساتھ دو خوشیاں ملی تھیں۔ رزلٹ کے ساتھ اسے بھیا یاد آ گئے تھے۔ کاش اس خوشی میں وہ بھی شریک ہوتے۔ اور فریال کی بیٹی کی خوشخبری کے ساتھ ہی اسے بے اختیارانہ ملیحہ آنٹی یاد آ گئی تھیں۔ بھلا ایسا کیوں ہوتا ہے؟..... یہ دلوں میں رہنے والے، آنکھوں میں بسنے والے، نظروں سے دُور کیوں ہو جاتے ہیں؟.....وہ کھڑکی میں کھڑی بچھڑنے والوں کی یاد میں کھو گئی تھی۔ اتنا وقت گزرنے کے باوجود اب تک وہ انو بھیا کو ایک پل کے لئے بھی نہ بھول پائی تھی۔ اتنے قریب رہتے ہوئے بھی وہ اس سے کس قدر دور تھے۔ اس کی آنکھیں انہیں ایک نظر دیکھنے کو ترستی تھیں۔ پھر وہ شریفن خالہ تھیں۔ یوں پردیس سدھاریں کہ پھر کبھی لوٹ کر بھی نہ آئیں۔ عظمت بی کی محبت اور توجہ دیکھ کر اس کے دل میں کبھی کبھی ہوک سی اُٹھتی تھی۔ پھر وہ شخص جو بالکل اچانک اس کی زندگی میں در آیا تھا۔

رشید......اس کی معیت میں اس نے دکھ ہی دکھ سمیٹے تھے۔ اپنے دامن میں کانٹے ہی بھرے تھے......اس کے ساتھ گزاری ہوئی زندگی کسی بھیانک خواب سے کم نہ تھی۔ مگر پھر بھی وہ اکثر اس کے بارے میں سوچتی تھی۔ اور اب تو ادھر برسوں سے سوچ کے آکاش پہ سورج بن کر وہ چہرہ نہیں اُبھرا تھا، جس چہرے کو دیکھ کر پہلی بار اس کا دل دھڑکا تھا......اس کی خمار بھری آنکھوں نے اس کی سہمی ہوئی آنکھوں میں کیسی پیاس سی جگا دی تھی......اب تو اس کا نام بھی وہ بھلا بیٹھی تھی۔

تب ہی دروازے کے اُس پار قدموں کی چاپ جاگی تھی۔ پروفیسر آفاق، غفور سے کچھ کہتے گیٹ کی طرف جا رہے تھے۔

''آپ کب تک لوٹیں گے؟'' عظمت بی نے کچن کے دروازے سے جھانک کر پوچھا تھا۔

''عظمت بی! کافی دنوں بعد اپنے دوست وجاہت مرزا کی طرف جا رہے ہیں، نواسی کی مٹھائی دینے۔ کچھ دیر تو بیٹھیں گے اِن کے پاس۔'

آفاق صاحب کے جواب پر عظمت بی نے ڈائننگ ٹیبل پہ دھرے کئی مٹھائی کے ڈبوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا تھا۔ ''تو یہ مٹھائی؟''

''جی یہ مٹھائی آپ، نمرہ بٹیا اور غفور میاں مل کر پڑوس میں اور عزیز اقرباء میں بٹوا دیجئے۔ ہمارے تو لے دے کے ایک وجاہت مرزا ہی ہیں۔ سو وہاں ہم خود جا رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' عظمت بی نے مسکرا کر کہا اور جھانک کر کمرے میں نمو کو دیکھنے لگیں۔ نمو نے یادوں سے آنچل چھڑا کر سامنے بستر پر سوئے ہوئے تابی کی طرف دیکھا تھا اور آہستہ روی سے چلتی کمرے سے باہر چلی آئی تھی۔

⊛===⊛===⊛

شام کے سرمئی سائے ''وجاہت منزل'' کے وسیع و عریض احاطوں میں آہستگی سے بکھرتے جا رہے تھے۔ آج دوپہر سے ہی وجاہت مرزا کی طبیعت بگڑی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کے ساتھ عاتکہ بیگم اور سرمد بھی انہی کے کمرے میں موجود تھے۔

ابھی کچھ دیر قبل جب وہ اپنے کمرے میں تھے، تب ہی بالکل اچانک ہی ان کا موبائل بج اٹھا تھا۔ انہوں نے چونک

کر اسکرین پر چمکتے نام کی طرف دیکھا تھا۔

''فروا'' لاکھ دُوریوں اور ہزاروں شکایتوں کے باوجود یہ نام دیکھ کر رگ و پے میں ایک عجیب سا احساس بیدار ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ ابھی وہ فون اُٹھانے یا نہ اُٹھانے کا فیصلہ بھی نہ کر پائے تھے کہ نکیتا بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''بھیا جی! ابا جان کی اچانک طبیعت بگڑ گئی ہے۔ اماں بی انہی کے کمرے میں ہیں۔ آپ کو بھی فوراً بلایا ہے۔''

''اوہ......کیا ہوا ابا جان کو؟'' وہ بوکھلا کر جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے موبائل کی بجتی ہوئی گھنٹی کو اور اسکرین پر جلتے بجھتے نام کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے تیزی سے باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے۔

نکیتا نے لحظہ بھر کو مڑ کر موبائل کی طرف دیکھا تھا اور فروا کا نام پڑھتے ہی اس کی پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آئی تھیں۔

''یہ ثروت بھابی کی بہن آخر ہمارے سرمد بھیا کے ہی پیچھے کیوں پڑی ہیں؟'' اس نے ناگواری سے بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا۔ پھر ہاتھ پھیلا کر دل سے دعا کی تھی۔

''ہے بھگوان! ہمارے سرمد بھیا کے لئے جلدی سے کوئی اچھی سی دُلہن دے دے۔ تاکہ ان فروا بی بی سے جان چھوٹ جائے۔'' ''ایسی پیاری اور اچھی دُلہن دینا ہمارے سرمد بھیا کو کہ وہ آ کر اس اُجڑے محل کو پھر سے شاداب کر دیں۔''

''اری او نکیتا!'' اوپر کے کام کرنے والا لڑکا شرفو اسے ڈھونڈتا اس طرف چلا آیا تھا۔ ''چائے تیار ہے۔ بڑے صاحب کے روم میں لے جا۔ کچن میں زلیخا بوا تجھے بلا رہی ہیں۔''

''اچھا اچھا سن لیا۔'' نکیتا کو اس کے تُو تڑاخ والے انداز سے بولنے پر ہمیشہ ہی کوفت ہوتی تھی۔ کتنی ہی بار وہ اسے سمجھا چکی تھی کہ تمیز اور سلیقے سے بات کیا کرے۔ مگر وہ باز ہی نہیں آتا تھا۔

چائے کی ٹرالی دھکیلتے جب وہ وجاہت مرزا کے کمرے میں پہنچی تھی تو آفاق صاحب کو دیکھ کر اس کے چہرے پر مسرور سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

''اب کے پھر آپ کافی دنوں بعد آئے ہیں۔'' چائے کا کپ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ شکوہ کئے بنا نہ رہ سکی تھی۔ ''آپ تو جانتے ہیں پروفیسر انکل! کہ آپ کو دیکھ کر ابا جان کتنے خوش ہوتے ہیں۔''

''ہاں نکو بٹیا!.....ہمیں اپنی کوتاہی کا احساس ہے۔'' آفاق صاحب سر جھکا کر نادم سے لہجے میں بولے۔ ''بس کیا کریں؟.....کبھی اس قدر مصروفیات میں اُلجھ جاتے ہیں کہ بس......مگر اب یہ کوتاہی نہیں ہوگی۔''

ڈاکٹر باریک بینی سے معائنے کے بعد وجاہت مرزا کو انجکشن دے چکا تھا اور اب وہ آنکھیں بند کئے خاصے پُرسکون دکھائی دے رہے تھے۔

''یوں اچانک اس طرح ابا جان کی طبیعت کیوں خراب ہو جاتی ہے؟'' سرمد اُلجھے ہوئے لہجے میں ڈاکٹر سے پوچھ رہے تھے۔

''یوں لاچار ہو کر بستر پر پڑے رہنے سے رفتہ رفتہ احساسِ بے چارگی بڑھتا جاتا ہے۔ ان کی زندگی میں کسی مثبت تبدیلی کی بے حد ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر نے بے حد دھیمے لہجے میں جواب دیا تھا۔

وجاہت مرزا کا آرام دہ بیڈ کمرے کے انتہائی مغربی حصے میں تھا اور یہ لوگ اس وقت بیڈ سے ذرا فاصلے پر دائیں جانب دھرے صوفوں پر بیٹھے تھے۔ ان لوگوں کی گفت و شنید کی آوازیں وجاہت مرزا تک بہ مشکل ہی پہنچ پاتیں۔ اس کے باوجود وہ سب بے حد دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے تاکہ ان کے آرام میں خلل نہ پڑے۔

''مثبت تبدیلی؟'' سرمد نے پریشان لہجے میں سوال کیا تھا۔ ''مطلب، انہیں کسی ہوسپٹل میں شفٹ کر دیا جائے

یا...... مستقل طور پر کوئی نرس رکھ لی جائے؟''

''نرسیں تو پہلے سے ہی موجود ہیں۔'' فیملی ڈاکٹر سعید رحمان جو کہ وجاہت مرزا کے ہی نہیں بلکہ آفاق صاحب کے بھی دیرینہ دوست تھے، نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے انہیں کسی اپنے کی توجہ اور محبت کی ضرورت ہے۔ آپ سب تو ان کے گرد موجود ہی ہوتے ہیں۔ اب کسی نئے فرد کی موجودگی ان کی زندگی کی جھیل میں نئے کنکر کی تاثیر رکھے گی۔

''میں سمجھا نہیں؟'' سرمد نے حیرانی سے پلکیں جھپکیں۔

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں سعید میاں!'' اماں بی، ڈاکٹر سے مخاطب ہوئیں۔ ''اب سرمد میاں کی شادی ہو ہی جانی چاہیئے۔''

''یہ تو بہت اچھا خیال ہے۔'' آفاق صاحب مسکرا کر گویا ہوئے۔ ''آپ نے کوئی لڑکی دیکھی؟''

''یہ کام تو آفاق میاں! تم کو ہی کرنا ہوگا۔'' اماں بی مسکرائیں۔ ''بس آج سے ہی یہ کام شروع کر دو۔''

''سچی کتنا مزہ آئے گا۔'' نکیتا خوشی سے لبریز لہجے میں بولی۔ ''بھیا کی شادی پر ہم سب کامدانی کا سوٹ بنوائیں گے۔''

سرمد کبھی بے سدھ پڑے باپ کی طرف دیکھتے اور کبھی ان سب کے دمکتے چہروں کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ بھلا اس عالم پریشانی میں شادی کے ذکر کا کون سا موقع تھا۔

تب ہی وجاہت مرزا ہلکے سے کسمسائے تھے۔ سرمد تیزی سے اٹھ کر ان کے قریب چلے آئے تھے۔ انجکشن کی وجہ سے ان پہ غنودگی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ سرمد نے سینے تک اوڑھی چادر کو درست کیا تھا اور ان کے قریب دھری کرسی پہ بیٹھ کر ان کے ساکت چہرے کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

ان کے رخساروں کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں اور خمار بھری آنکھیں گڑھوں میں اُتر گئی تھیں۔ خشک بال اور پپڑی زدہ لب، ان کی بے چارگی اور بے کسی کی داستان سناتے محسوس ہوتے تھے۔ سرمد کا دل درد کے ایک نئے احساس سے بھر گیا تھا۔ وقت نے اس وجیہہ و شکیل، صحت مند و توانا شخص کو ہڈیوں کی مالا میں بدل دیا تھا۔ ان کے ویران چہرے پہ صحت سے بھری بہار لانے کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتے تھے مگر شادی.....؟

انہیں ڈاکٹر سعید رحمان کی سوچ اور مشورے پر حیرت ہوئی تھی۔

بھلا ان کی شادی اور وجاہت مرزا کی بیماری کا باہم کیا تعلق تھا؟

ایک طرح سے دیکھا جاتا تو اسد کی شادی ہی ان کی بیماری کا باعث بن گئی تھی۔ اور اب ڈاکٹر رحمان کا خیال تھا کہ اب ان کی شادی ان کی اس ٹھہری ہوئی اپاہج زندگی میں ہلچل کا سبب بن سکتی تھی۔ شادی کے ذکر پہ غیر محسوس طور پر ان کا دھیان فروا کی طرف چلا جاتا تھا۔ مگر وہ جانتے تھے کہ فروا کے آنے سے ان کی طبیعت ٹھیک ہونے کے بجائے مزید خراب ہو سکتی ہے۔

آفاق صاحب، فریال کی بیٹی کی ولادت کی خوشی میں مٹھائی لے کے آئے تھے۔ ابھی گفتگو کا آغاز ہی ہوا تھا کہ وجاہت مرزا کی طبیعت ایک دم سے ہی بگڑ گئی تھی۔ اور آفاق صاحب اس پل ڈاکٹر کے مشورے کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے اس صورت حال پہ غور کر رہے تھے۔ وجاہت مرزا بھی تو چاہتے ہوں گے، وہ اپنے بچوں کی شادی دیکھیں، بچوں کے بچے کھلائیں...... مگر یہاں اسد کی شادی ہی ان کے لئے المیہ بن گئی تھی۔ اور دُوجے یہ سرمد تھے، جو شادی نہ کرنے کا تہیہ کئے بیٹھے تھے۔

''اچھا اماں بی! اب چلوں گا۔'' کچھ دیر بعد آفاق صاحب نے مؤدب انداز میں عاتکہ بیگم سے اجازت طلب کی تھی۔
''ارے آفاق میاں! اب کھانا کھا کر ہی جانا۔'' اماں بی نے حسب عادت پیار بھرے لہجے میں کہا تھا۔
اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رکنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ مگر ان کا ذہن مسلسل ڈاکٹر کے مشورے اور وجاہت مرزا کی حالت کے بارے میں تانے بانے بُننے میں مصروف تھا۔
سرمد کی شادی سے یقیناً وجاہت مرزا کی طبیعت پر مثبت اثر پڑتا۔ اور اگر قسمت سے کوئی بہت ہی اچھی، خدمت گزار اور محبت کرنے والی بہول گئی تو یقیناً ان کی آدھی بیماری تو اس خوشی سے ہی ٹھیک ہو سکتی ہے۔
مگر ایسی اچھی، نیک، خدمت گزار اور محبت کرنے والی لڑکی ملے گی کہاں سے؟..... انہوں نے پریشانی سے سوچا تھا اور بالکل اچانک ان کی سوچ کے پردے پہ ایک چہرہ لرزا تھا..... لمحہ بھر کو تو وہ اپنی سوچ پہ خود بھی حیران رہ گئے تھے۔

⊛===⊛===⊛
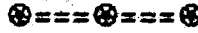
سوئٹزرلینڈ کی رومان پرور فضاؤں میں رشید اور مہکار کا ہنی مون پیریڈ بہت ہی خوشگوار انداز میں گزر رہا تھا۔ رمضان آرائیں کا کروڑوں کا اماؤنٹ جو کہ رشید کے اکاؤنٹ میں موجود تھا، مہکار کو بے حد محبت لٹانے والی، جان چھڑکنے والی بیوی بنائے ہوئے تھا۔ مہکار کے ایک ایک انداز پر رشید سو سو جان سے نثار ہو رہا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مہکار اتنی اچھی شریکِ حیات ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کی خوشی اور خوشنودی کی خاطر وہ اس کی ہر فرمائش اور ہر خواہش پہ سر تسلیم خم کر رہا تھا۔
دو ہفتے بعد جب وہ ہنی مون سے واپس لوٹے تو رشید کے اکاؤنٹ سے تقریباً ڈیڑھ کروڑ کی کمی واقع ہو چکی تھی۔ بڑے ہوٹلوں میں رہائش، گھومنے پھرنے اور شاپنگ پر خرچ کرنے کے علاوہ وہ مہکار کی فرمائش پر کئی بڑی رقموں کے چیک مہکار کے اکاؤنٹ میں بھی جمع کروا چکا تھا۔ اسی لئے مہکار بے حد خوش تھی اور ایک بے حد ستی ساوتری پتنی کا رول بے حد عمدہ طریقے سے نبھا رہی تھی۔
سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ جاگی تو سلطانہ نے غصیلی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ سامنے سے رشید اور مہکار ہنستے ہوئے سیڑھیاں چڑھتے دکھائی دیئے تھے۔ سلطانہ کے چہرے پر غصے کے سائے کچھ اور گہرے ہو گئے تھے۔
مہکار سے تو خیر تعلق ہی کیا تھا مگر اُسے رشید کے رویے پر حیرت ہی نہیں، غصہ بھی بے حد تھا۔ وہ ماں سے پوچھے بنا کچھ بتائے بنا، نوکروں کو رخصتی دے کر اس کی ہتھیلی پہ کھوٹا سکہ دھرے بنا بیوی کو لے کر گھومنے پھرنے نکل گیا تھا۔ یہ پندرہ دن سلطانہ نے جس طرح گزارے تھے، اس کا دل ہی جانتا تھا۔
جن دنوں رشید نے باپ کے مرنے کے بعد اس کا مکان، کاروبار اور دکان سب اپنی اوباشیوں کی نذر کر دیا تھا اور گھر چھوڑ کر چھوٹی موٹی چوری چکاری کے دھندے میں اُلجھ گیا تھا، ان دنوں سلطانہ ایک غریبوں کے محلے میں چھوٹے سے کرائے کے مکان میں رہنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ ان دنوں وہ بازار سے سودا سلف لانے سے لے کر کھانا پکانے اور گھر کی تمام ذمہ داریاں نبھانے تک کا ہر کام خود ہی سرانجام دیتی تھی۔
اتنے برسوں بعد مہکار اور رشید کے یوں اچانک ہنی مون پہ چلے جانے کے بعد ایک بار پھر اس کی زندگی اسی پرانی نہج پہ آ رکی تھی۔ برسوں سے حالات بہت اچھے چل رہے تھے۔ ایک آدھ نوکر تو ضرور ہی ہوتا تھا۔ اور پھر نمو نے تو اس کے کام کرنے کی عادت ہی ختم کر دی تھی۔ اور اب کچھ بڑھتی عمر کی وجہ سے بھی اس کے قویٰ پہلے جیسے نہ رہے تھے۔ چنانچہ یہ دو ہفتے اس پہ بے حد بھاری گزرے تھے اور وہ غصے میں بھری بیٹھی تھی۔

رشید اور مہکار کی صورت دیکھتے ہی وہ بھڑک اُٹھی۔

”آ گیا تُو مردود۔“

”اماں! یہ تم کس طرح بات کر رہی ہو؟“ رشید کو مہکار کے سامنے ماں کی بدتمیزی سخت ناگوار گزری تھی۔

”ارے بدذات! تجھے اتنا خیال نہیں آیا کہ بوڑھی ماں اکیلے گھر میں کیسے رہے گی۔“

”تو اُدھر لاہور میں بھی تو تم اکیلی ہی رہتی تھیں۔ اب دو چار دن اکیلی رہ لیں تو کون سی قیامت آ گئی۔“ رشید کے ترکی بہ ترکی جواب نے اس کے حوصلے کو قدرے شکستہ تو کیا مگر وہ پینترا بدل کر بولی۔

”ارے اکیلے تو رہتی۔ پر تیری یہ چمک چھلو، چھوٹو تک کی چھٹی کر گئی تھی۔ میں سارے کام کس طرح کرتی؟“ غصے کے باوجود اس کے لہجے میں بے بسی اُتر آئی تھی۔

”تو اماں! ہمارے گھر میں ہمیشہ سے تو نوکر نہیں تھے۔“ مہکار مٹکتی ہوئی بیڈروم میں چلی گئی تھی۔ وہ ماں سے جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔ ”ہمیشہ ہی تم گھر کا کام کاج کرتی رہی ہو۔ اب بلاوجہ کے فساد ڈال رہی ہو۔

”ارے میں فساد ڈال رہی ہوں؟“ سلطانہ چیخ کر بولی۔ ”یا اس بدبخت نے آ کر ہماری پُرسکون زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔“

”ڈارلنگ! اماں کو چھوڑو۔“ مہکار نے رشید کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے کے اندر کھینچ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ ”تمہاری اماں کے ساتھ مجھے رہنا ہے نا..... میں خود ہی انہیں سمجھا لوں گی۔ تم اس قضیے میں نہ پڑو۔“

”ایک تو اماں بھی نا.....“ رشید خجل سے لہجے میں بولا۔

”سچ کہوں رشید! تمہاری اماں چاہتی ہی نہیں کہ تمہارا گھر بسے۔“ مہکار کے سنجیدگی سے کہے گئے جملے پر رشید نے چونک کر مہکار کی طرف دیکھا تھا۔

شروع شروع سلطانہ نے اپنا چلتر پن دکھانے کی کوشش کی، مگر مہکار اس سے چار ہاتھ نہیں، پچاس ہاتھ آگے تھی۔ پہلے ہی دن رشید کے جاتے ہی وہ باہر نکلی۔ سلطانہ کو اپنی مخصوص چوکی پہ آڑے ترچھے انداز میں پڑے دیکھ کر اس نے پاؤں سے اسے ٹھوکر مار کر جگایا تھا۔

”کیا ہے، اب تک پوستیوں کی طرح پڑی سو رہی ہو؟...... بیٹا بنا کچھ کھائے پیئے گھر سے چلا گیا۔ تمہیں توفیق نہ ہوئی کہ کم از کم ایک کپ چائے ہی اسے بنا دیتیں۔“

”اری تیری یہ مجال، مجھے پاؤں لگا کر اٹھا رہی ہے۔“ سلطانہ اس کی باتوں کو سنی ان سنی کر کے غصے سے کھولتے لہجے میں بولی۔ ”اری او آوارہ! اپنی اوقات میں رہ۔ طوائف زادی......“

”تُو نے ٹھیک کہا۔“ مہکار مسکرا کر بولی۔ ”میں واقعی طوائف زادی ہوں..... اور تجھے اب پتہ چلے گا کہ شریف زادی اور طوائف زادی میں کیا فرق ہوتا ہے..... چل اُٹھ جا کر میرے لئے چائے بنا۔“

”تیرا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ سلطانہ نے قدرے حیرت سے کہا۔

”فوراً جا کر میرے لئے چائے بنا کر لا۔ ورنہ تیرا دماغ میں ٹھیک کر دوں گی۔“ مہکار نے سلطانہ کا بازو پکڑ کر اسے ایک جھٹکے سے کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور اس کے کھڑے ہوتے ہی اس نے اسے کچن کی طرف دھکیل دیا تھا۔ وہ اپنے ہی جھونک میں دھڑام سے زمین پر آ گری تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے گھٹنا ریزہ ریزہ ہو گیا ہو۔

رشید کے آنے پر اس نے بہت شور مچانے کی کوشش کی تھی۔ مگر مہکار نے اس کی ایک نہ چلنے دی تھی اور رشید کو ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی تھی۔

"رشید! مجھے یہاں آئے ابھی دو دن بھی نہیں گزرے ہیں۔ مگر تمہاری اماں نے میری ناک میں دم کرنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے، یہ مجھے یہاں ٹکنے ہی نہیں دیں گی۔"

"ارے نہیں جان! یہ تمہارا گھر ہے۔ تم آرام سے رہو۔ میں اماں کو سمجھا دوں گا۔"

"تم اُنہیں خاک سمجھاؤ گے؟......ارے وہ باتوں سے سمجھنے والی نہیں ہیں۔ تمہیں سختی کرنی پڑے گی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ وہ چاہتی ہی نہیں کہ تمہارا گھر بسے۔ تم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوش رہ سکو۔"

اب پورے گھر پہ مہکار کی حکومت تھی۔

رشید بے دام غلام کی طرح اس کے اشاروں پر ناچا کرتا۔

دھیرے دھیرے رشید کے اکاؤنٹ میں موجود رقم مہکار کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو رہی تھی۔ سلطانہ شور مچانے کی یا کچھ کہنے سننے کی کوشش کرتی تو رشید اسے جھڑک دیتا۔

مہکار نے اس کے دل و ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ اس کی ماں کبھی بھی اس کا گھر بسنے نہیں دے گی۔ اس لئے اگر وہ گھر بسانا چاہتا ہے تو پھر ماں کی باتوں پر توجہ نہ دے۔ غور کرنے پر اب رشید کو بھی اس بات پر یقین آچلا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نمرہ جیسی بے زبان، خدمت گزار لڑکی کو تو وہ گھر میں ٹکنے دیتی۔ مگر اس نے نمرہ سمیت اس کی کسی بھی بیوی کو اس کے گھر میں بسنے نہ دیا تھا۔ رفتہ رفتہ رشید کے دل میں ماں سے دُوری اور نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے سلطانہ کی گھر میں حیثیت نوکرانی سے بدتر ہوگئی۔ گھر کی صفائی ستھرائی سے لے کر کھانا پکانے اور کپڑے دھونے تک کی ذمہ داری اس کے بوڑھے کاندھوں پہ ڈال دی گئی تھی۔

ذرا سی کوتاہی پہ مہکار اسے سو سو باتیں سناتی۔ اور رشید بھی بدتمیزی پہ اُتر آتا۔ وہ دن رات مہکار کی خوشنودی میں لگا رہتا۔ رفتہ رفتہ وہ ماں کو تو جیسے بھول ہی گیا تھا۔ اب وہ پوری طرح مہکار کے رحم و کرم پہ تھی۔ رات دن کسی نوکرانی کی طرح گھر کے کاموں میں اُلجھی رہتی۔ اس عمر میں یہ سب کرنے کی نہ اس میں طاقت تھی نہ ہمت۔ جو تھوڑا بہت کام کسی زمانے میں وہ کرتی بھی تھی تو نمرہ کے آنے کے بعد اس کی یہ عادت بھی جاتی رہی تھی۔

مگر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق رگڑے جا رہی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پہ مہکار چیخنے چلاّنے لگتی تھی۔ وہ کئی بار اس پہ ہاتھ بھی اُٹھا چکی تھی۔ سلطانہ کی زندگی ایک سلگتا ہوا صحرا بن کر رہ گئی تھی۔

ایسے بھی اسے بے زبان اور خدمت گزار نمرہ کا خیال رُلا رُلا دیتا۔ وہ کیسی محبت اور لگن سے اس کی خدمت کیا کرتی تھی۔ اس کی لاکھ کیکینگیوں پر بھی پلٹ کر ایک لفظ نہ کہتی تھی۔ کیسی بے زبان، بے ضرر لڑکی تھی وہ۔ اس پر وہ اسے چپّی، گھنّی اور نہ جانے کن کن خطابوں سے نوازا کرتی تھی۔ مگر وہ بھیگی پلکوں اور خاموش لبوں سے اس کے سر پیر دبائے جاتی۔ اس کے سامنے ٹرے سجا کر رکھے جاتی۔ ایک آواز پہ چائے لئے دوڑی آتی۔ اس نیک خو، معصوم سیرت بہو پر اس نے کیسا ظلم کیا تھا۔ اپنے ہی بیٹے کی اولاد کو گالی بنا کر اس باکردار لڑکی کو گھر سے نکالنے کا بہانہ بنالیا تھا۔

اب رہ رہ کر پچھتاوا اس کا دل جلاتا۔

احساسِ ندامت اسے مارے ڈالتا۔

اب کبھی کبھی وہ سوچتی، کاش! نمرہ دوبارہ لوٹ کر آسکتی۔ اور زندگی ایک بار پھر اسی سبک روندی کی طرح بہنے لگتی۔

مگر اب یہ کیسے ممکن تھا؟

رشید، نمرہ کو طلاق دے چکا تھا۔

مگر اس طلاق کا کوئی گواہ نہ تھا۔ اس نکتے کو بنیاد بنا کر نمرہ کو واپس اس گھر میں لایا جا سکتا تھا......مگر اب وہ یہ کس

طرح کر سکتی تھی؟ اب تو خود رشید اس کے اختیار میں نہ تھا۔ اس کے سر پر چڑیل کی طرح مہکار مسلط تھی۔ بھلا اسے نمرہ کو واپس لانے پہ کس طرح راضی کیا جا سکتا تھا۔

''ڈارلنگ! ہم کیوں نہ کہیں اور ایک اچھا سا گھر لے لیں۔'' ایک شام مہکار نے پیار سے رشید کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''کیوں...... اس گھر میں کیا خرابی ہے؟'' رشید نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں، خرابی تو کوئی نہیں۔'' مہکار سوچتے انداز میں بولی۔ ''مگر یہاں نچلی منزل میں تمہارا آفس ہے۔ پرائیویسی نہیں ہے۔ ویسے بھی مجھے کلفٹن میں رہنے کا ہمیشہ سے شوق رہا ہے۔ جان! میرا یہ شوق پورا کر دو نا۔''

''پاگل ہوئی ہو؟...... کلفٹن میں گھر خریدنا بچوں کا کھیل ہے کیا؟'' رشید قدرے حیران ہو کر بولا۔ ''اور ویسے بھی آج کل آفس میں ہو کیا رہا ہے۔ سب کچھ ٹھپ پڑا ہوا ہے۔''

''تے، لے...... میں نے آپ کو کام سے روکا ہے؟...... آپ شوق سے اپنا کام کریں۔ مجھے بس ایک چھوٹا سا گھر خرید دیں۔ میں آپ کی اماں سے الگ رہنا چاہتی ہوں۔''

پہلے پہل رشید نے اسے ٹالنا چاہا تو مہکار نے اپنی مدد کی خاطر لاکھانی کو بلا لیا تھا۔

''لے بتا، لاکھانی!...... ذرا تُو میرے سرتاج کو سمجھا...... میں ایک گھر خریدنا چاہتی ہوں تو بھلا اس میں کیا برائی ہے؟''

''ہاں رسید بھائی! مہکار بھابی کی بات ایسی کچھ ناجائج (ناجائز) بھی نہیں ہے۔'' لاکھانی نے مہکار کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

''لاکھانی! تُو تو جانتا ہے، میرے اکاؤنٹ میں اب کتنی رقم رہ گئی ہے؟'' رشید نے لاکھانی کے قریب ہوتے ہوئے حیران و پریشان لہجے میں کہا۔ ''ادھر رمضان آرائیں کے فون پر فون آ رہے ہیں کہ پلازے کا کیا بنا...... اور ادھر یہ بچوں جیسی ضد کر رہی ہے۔''

''رسید بھائی! جد (ضد) کچھ ایسی گلط بھی نہیں ہے۔'' لاکھانی رسان بھرے انداز میں بولا۔ ''آپ کے اکاؤنٹ میں تو ماساءاللہ کروڑوں روپے پڑے ہیں۔ آپ مہکار بھابی کو ایک آدھے کروڑ کا گھر دلا دو گے تو آپ کا کیا بگڑے گا؟ اور وہ بے چاری کھس (خوش) ہو جاوے گی۔''

مہکار کو خوش کرنے کی خاطر آخر کار رشید کو 3 کروڑ کا گھر خریدنا پڑا۔ 40 لاکھ مزید گھر کی آرائش اور زیبائش پہ اُٹھ گئے تھے اور مہکار، سلطانہ کو اسی پرانے گھر میں چھوڑ کر اپنے کلفٹن والے نئے گھر میں اُٹھ گئی تھی۔

اب رشید کی پریشانی اور فکر مندی سوا ہو گئی تھی۔

ادھر رمضان آرائیں، پلازے کے آغاز کا تقاضا کر رہا تھا بصورت دیگر وہ اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ دونوں ہی کام رشید کے اختیار سے باہر تھے۔ پلازے کا پلاٹ وہ مہکار کے نام لگا چکا تھا اور تعمیر کے لئے رمضان کی بھیجی ہوئی خطیر رقم وہ مہکار کی فرمائشوں کو پورا کرنے میں لٹا چکا تھا۔ اب اس کے اکاؤنٹ میں محض ساٹھ ستر لاکھ ہی پڑے تھے۔

''لاکھانی! میں سوچ رہا ہوں کہ پلازہ کی تعمیر کا کچھ تھوڑا بہت کام تو شروع کروں۔'' اس شام وہ لاکھانی سے خاص طور پر ملنے گیا تھا۔

''ہاں نا۔ تو آپ کو روکا کس نے ہے؟ آپ کام سروع کرو۔'' لاکھانی شانِ بے نیازی سے بولا تھا۔

''مگر یار! پلاٹ تو میں مہکار کے نام لگا چکا ہوں۔'' رشید اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس وقت تُو ہی بول رہا تھا اور مہکار بھی کہ وقتی طور پر پلاٹ اس کے نام منتقل کردو...... کچھ عرصے بعد واپس لے لینا۔''

''تو لے لونا..... کس نے منع کیا؟'' لاکھانی معصومیت سے بولا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں آج مہکار سے بات کرتا ہوں۔'' رشید نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ کوئی مشکل کام نہ ہوگا۔ مگر اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب مہکار نے پلاٹ واپس دینے سے صاف انکار کردیا۔

''کیا مطلب؟'' وہ حیران ہوا۔

''مطلب صاف ظاہر ہے۔ میں پلاٹ تمہارے نام نہیں منتقل کروں گی۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''رہا سوال تعمیر کا...... پلاٹ میرے نام ہو یا تمہارے نام، اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟ تم تعمیر شروع کروادو۔''

''مہکار! اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ تعمیر کے لئے رقم موجود نہیں ہے۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''اُدھر رمضان آرائیں تقاضے پہ تقاضا کررہا ہے۔ حالانکہ کمینہ دُبئی میں مِل لگا رہا ہے...... اس کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں۔ مگر اپنے اس دس کروڑ کے لئے وہ میری جان کھا رہا ہے...... دھمکیاں دے رہا ہے کہ اگر میں نے رقم واپس نہیں کی تو وہ مجھے پولیس کے حوالے کردے گا۔''

''اچھا.....'' مہکار بہت دلچسپی سے رمضان آرائیں کے بارے میں سن رہی تھی۔ ''تو یہ تو کوئی بہت ہی بڑا بیوپاری ہوا نا۔''

''ہاں نا۔'' رشید سر جھٹک کر بولا۔ ''کروڑ پتی نہیں، ارب پتی ہے۔ مگر کمبخت کا دل اتنا چھوٹا ہے کہ دس کروڑ کے لئے مرا جارہا ہے۔''

''تو اب تم کیا چاہتے ہو؟'' مہکار نے آنکھیں سکیڑ کر رشید کی طرف دیکھا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ پلاٹ بیچ کے اس کی رقم واپس کردوں۔''

''لے تے فیر پلازے کا کیا بنے گا؟'' گلبہار نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے لقمہ دیا۔ جب سے مہکار، کلفٹن کی اس کوٹھی میں شفٹ ہوئی تھی، گلبہار بھی اس کے ساتھ رہنے آگئی تھی۔

''ابھی پلازے کا کچھ بھی نہیں بن سکتا۔'' رشید نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ''ابھی تو رمضان سے جان چھڑانی مشکل ہورہی ہے۔ پہلے اس سے جان چھوٹ جائے تو پھر کچھ اور سوچوں گا۔''

''رمضان تو اُدھر سعودیہ میں تھا نا؟'' گلبہار نے سوال کیا۔

''ہاں۔ مگر آج کل دوبئی میں ایک مِل لگا رہا ہے۔ اسی کے لئے اسے پیسے کی ضرورت ہے۔'' رشید نے جواب دیا۔ ''دو چار دن میں کراچی آنے والا ہے۔''

گلبہار نے معنی خیز نظروں سے مہکار کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بھی پُرسوچ نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نظروں کے تصادم پہ ان دونوں کی آنکھوں میں ایک حریص چمک جاگ اُٹھی تھی۔

❁===❁===❁
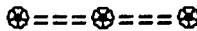
تپتی دوپہر، معتدل سہ پہر کی طرف قدم رنجہ تھی۔ ہوا کے تھپیڑوں میں رچی دھوپ کی تمازت میں کمی آچکی تھی۔

نمو نے گردن کو ذرا سا خم دے کر کھڑکیوں پہ تنے پردوں کی طرف دیکھا تھا۔ چھت پہ لگا پنکھا تیز رفتاری سے متحرک تھا اور کمرے کی فضا میں ایک تسکین آمیز ٹھنڈک پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے نمرہ کے بیڈ کے ساتھ دھرے کاٹ میں ننھا تابی بڑی تیزی سے پاؤں چلا رہا تھا۔

''ارے منے میاں! آپ تو سو رہے تھے؟'' عظمت بی نے حیرت بھری مسرت سے ننھے تابی کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔
''غوں.....غاں.....'' تابی میاں نے مسکرا کر جواب دینے کی کوشش کی تو نمرہ بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ نمرہ کو دیکھتے ہی وہ ہاتھ مار مار کر ہمکنے لگے تھے۔
''امی کے پاس آنا ہے؟'' نمرہ نے کاٹ پہ جھکتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں پوچھا تو تابی میاں اور زور زور سے ہاتھ پاؤں مارنے لگے تھے۔
''میرا بچہ جیتا رہے۔'' نمرہ کو بے ساختہ اپنے لاڈلے پر پیار آ گیا تھا۔ اس نے جھک کر تابی کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ ''بہت پڑھو، ڈاکٹر بنو، انگلینڈ سے F.R.C.S کرو۔'' اپنے آخری جملے پر وہ خود ہی لحظہ بھر کو حیران رہ گئی تھی۔
'بھلا یہ دعا میرے لبوں پہ کیوں آئی؟' اُس نے حیران سے انداز میں خود سے سوال کیا تھا۔ اس کے بھائی انو کی خواہش تھی کہ وہ خوب پڑھے اور بہت قابل ڈاکٹر بنے۔ اس نے اپنے تئیں بھائی کی خواہش کے احترام میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ مگر شاید تقدیر میں اس کا ڈاکٹر بننا لکھا ہی نہ تھا۔ انو کی خواہش اور شوق کو دیکھتے ہوئے خود اس کے دل میں بھی ڈاکٹر بننے کی آرزو جاگزیں ہو گئی تھی۔ مگر اس کی یہ آرزو تشنہ ہی رہ گئی تھی۔ مگر دل کے نہاں خانوں میں چھپی یہ تشنہ آرزو اس کے لاشعور میں آج بھی تکمیل کی خواہش لئے موجود تھی۔ سو سب ہی والدین کی طرح اس نے بھی اپنے ادھورے خواب کو اپنے بیٹے کے توسط سے پورا ہونے کا خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ جانے کب، کیسے اس کے دل میں یہ خیال جاگا تھا کہ تابی کو وہ ایک قابل اور لائق ڈاکٹر بنائے گی۔ اور آج اس پل اس کے لبوں پر عجب ہی دعا آ گئی تھی۔ وہ تابی کو انگلینڈ سے F.R.C.S کرنے کی دعا دے رہی تھی۔ اور اب اپنی اس انوکھی دعا کی ماہیت پر حیران ہو رہی تھی۔
'کہاں انگلینڈ، کہاں ایک مجبور ماں کا مظلوم بیٹا۔' اس نے یاسیت سے سوچا تھا۔ 'بھلا میری آنکھوں میں ایسے انوکھے اور کبھی نہ پورے ہونے والے خواب کیوں اُترنے لگے ہیں؟' اس نے کرب بھرے انداز میں سوچا۔
'آفاق انکل کی یہی عنایت کیا کم ہے کہ ہم دونوں کو اپنی چھت کے نیچے پناہ دی ہے۔ اپنائیت اور تحفظ دیا ہے۔' اب بھلا وہ ان سے اور زیادہ کس بات کی تمنا کر سکتی تھی۔
''ارے بٹیا! ابھی تو منے میاں کے پڑھنے پڑھانے کے لئے کافی وقت پڑا ہے۔'' عظمت بی اس کی گود سے منے کو لیتے ہوئے رسان بھرے لہجے میں بولیں۔ ''تم ابھی سے کیوں فکر مند ہو رہی ہو؟.....اور مانو اگر تابی میاں لندن پڑھنے کی خاطر گئے بھی تو پریشانی اور فکر کی کیا بات ہے؟ وہاں فریحہ اور فریال بٹیا ہیں۔ اپنا گھر ہے۔ سب اپنے ہی تو لوگ ہیں۔ مزے سے وہاں رہیں گے۔ اور جو تم ابھی نام لے رہی تھیں، وہ ڈگری لیں گے.....کیوں؟''
آخری لفظ انہوں نے مُنے کو مخاطب کر کے کہا تھا اور ایک سال کے تابی نے بے ساختہ تالی بجا کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

'ارے ہاں، وہاں تو فریحہ آپی اور فریال ہیں۔' نمرہ نے جلدی سے سوچا تھا۔ 'پھر فکر کی کیا بات ہے؟.....اور وہاں وہ ننھی پری بھی تو ہے.....کرن۔' نمرہ کے لبوں پر ممتا بھری مسکراہٹ بکھر گئی۔ پھر اچانک ہی اس کے دل میں خیال آیا تھا کہ اسے ننھی کرن کے لئے کچھ چیزیں خریدنی چاہئیں۔ کچھ کپڑے، چوڑیاں اور ڈھیر سارے کھلونے.....اس خیال کے آتے ہی وہ جلدی سے اپنی الماری کی طرف بڑھ گئی تھی۔ لاکر میں ایک درمیانی سائز کا بٹوہ رکھا تھا۔ اس نے بٹوہ نکال کر اس کی زپ کھول کر دیکھا.....اس میں کافی روپے موجود تھے۔ یہ روپے اسے آفاق صاحب دیتے رہے تھے۔
اس کے اس گھر میں آنے کے بعد پہلی تاریخ کو آفاق صاحب نے خاموشی سے اس کے تکیہ کے نیچے کچھ سو روپے رکھ دیئے تھے۔

''انکل! یہ روپے.....؟'' اس نے حیرت سے روپوں کی طرف اشارہ کر کے آفاق صاحب سے سوال کیا تھا۔
''بھئی یہ تمہاری پاکٹ منی ہے۔'' آفاق صاحب شفیق انداز میں مسکرائے تھے۔ ''یہ میں فریحہ اور فریال کو بھی دیتا تھا۔ اب ان کی جگہ تم ہو تو تم کو بھی یہ روپے قبول کرنے ہوں گے۔''
''مگر انکل!..... میں ان کا کیا کروں گی؟'' نمرہ نے جز بز ہوتے ہوئے کہا تھا۔ ''میری ہر ضرورت پوری ہو رہی ہے۔ بھلا مجھے ان روپوں کی کیا ضرورت؟''
''بھئی کچھ خریدنا..... شاپنگ کرنا..... اور اگر یہ نہیں تو جمع کرنا۔ اب یہ تمہارا پیسہ ہے۔'' آفاق صاحب نے اپنا فیصلہ سنا کر اس کے سر پہ پیار بھرے انداز میں ہاتھ رکھا تھا اور مسکراتے ہوئے باہر چلے گئے تھے۔ تب سے اب تک نہایت پابندی سے وہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو کچھ رقم اس کے تکیہ کے نیچے رکھتے چلے آ رہے تھے۔ تابی کی پیدائش کے بعد سے انہوں نے اس رقم میں اضافہ کر دیا تھا۔
''انکل! پہلے ہی سارے روپے بچ جاتے ہیں۔'' اس نے احتجاج کرنا چاہا تھا۔ ''پھر بھلا اس رقم میں اضافے کی کیا ضرورت ہے؟''
''ارے بھئی، اب اس میں ہمارے تابی میاں کی بھی پاکٹ منی شامل ہے۔'' آفاق صاحب نے ننھے تابی کے نرم رخساروں کو پیار سے چھوتے ہوئے جواب دیا تھا۔
آج وہ اس رقم سے فریال کی بیٹی کے لئے کچھ شاپنگ کرنا چاہ رہی تھی۔
''عظمت بوا!'' اس نے عظمت بی کو مخاطب کیا۔ ''میرا دل چاہ رہا ہے کہ ہم مارکیٹ میں جا کر فریال کی بیٹی کرن کے لئے کچھ تحفے خریدیں۔''
''اور نہیں تو کیا۔'' عظمت بی جلدی سے بولی تھیں۔ ''بالکل خریدنا چاہئے۔ آپ جب کہئے، ہم آپ کے ساتھ چلے چلیں گے۔''
''میں تو کہہ رہی ہوں، آج شام کو ہی چلتے ہیں۔'' نمرہ نے ایکسائیٹڈ ہوتے ہوئے کہا۔ ''اچھا آپ ذرا رُکیے...... میں ابھی انکل سے پوچھ کر آتی ہوں۔'' نمرہ نے کہا اور تیزی سے کمرے سے نکلتی چلی گئی۔
آفاق صاحب اپنی اسٹڈی میں بیٹھے کسی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔
''انکل!'' نمرہ نے بھڑے ہوئے دروازے پہ ہلکی سی دستک دے کر انہیں پکارا تھا۔ ''کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟''
''ارے آؤ بٹیا!..... آؤ'' آفاق صاحب کتاب کو میز پر اُلٹ کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔
''وہ..... دراصل میں آپ سے ایک بات کہنا چاہ رہی تھی۔'' نمرہ نے ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔
''بولو'' وہ اسے حیران نظروں سے دیکھ کر جلدی سے بولی۔
''دراصل میں..... ننھی کرن کے لئے..... کچھ کپڑے وغیرہ..... چوڑیاں اور دیگر چیزیں خریدنا چاہ رہی ہوں۔'' اس کی آواز سے خوشی چھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔ آفاق صاحب نے پوری آنکھیں کھول کر اس کے متبسم چہرے اور دمکتی آنکھوں کی طرف دیکھا۔
''بٹیا! تم نے تو میرے منہ کی بات لے لی۔'' وہ خوش ہو کر بولے۔ ''میں خود تم سے یہی کہنے والا تھا کہ غفور میاں یا عظمت بی کے ساتھ جا کر، کرن بٹیا کے لئے کچھ خریداری کر لو..... یہ دیکھو۔'' انہوں نے ایک کتاب کے نیچے دبے کئی بڑے نوٹ اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو پیسے بھی نکال کے رکھ دیئے ہیں۔''
''ان کی ضرورت نہیں انکل!'' نمرہ نے مسکراتی آواز میں جواب دیا۔ ''میرے پاس خاصی بڑی رقم موجود ہے۔''

اُس نے پھُولا ہوا بٹوہ ان کے سامنے کیا۔''اس میں موجود یہ تمام روپے آپ ہی کے دیئے ہوئے ہیں۔مگر میری خواہش ہے کہ مُنّی کرن کے لئے میں ان روپوں سے کچھ خریدوں۔انکل پلیز! منع مت کیجئے گا۔اس رقم سے خریداری کر کے مجھے بہت خوشی ہوگی۔''

آفاق صاحب نے اس کی حسین آنکھوں سے جھانکتی اُمید وبیم کی کیفیت کو دیکھا اور بے ساختہ مسکرا دیئے۔

''چلو جیسے تمہاری مرضی۔''

''او تھینک یو انکل!'' وہ مسرور اور ممنون لہجے میں ان کی شکرگزار ہوئی۔''میں آج ہی شام کو خریداری کے لئے جانا چاہ رہی ہوں۔''

''یہ تو اور اچھا ہوگا۔'' آفاق صاحب خوش دلی سے بولے۔''آج تو میں بھی گھر میں موجود ہوں۔اس طرح تو میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چل سکوں گا۔''

''یہ تو اور بھی اچھا ہوگا۔'' نمرہ نے خوش ہو کر کہا۔''میں ابھی مُنّے کو تیار کرتی ہوں۔'' وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف لپکی۔

''ارے بٹیا! اتنی گرمی میں مُنّے کو ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟'' عظمت بی نے مشورہ دیا۔''گھر میں غفور تو موجود ہے.....ویسے بھی تابی میاں، غفور کے ساتھ بہت خوش رہتے ہیں۔غفور کی بھی باچھیں کھِل جاتی ہیں۔بس مُنّے کو تو تم گھر پر غفور کے پاس ہی رہنے دو۔بلاوجہ بچہ پریشان ہوگا۔''

''اور نہیں تو کیا؟'' غفور چائے کے مگ ہاتھ میں تھامے کمرے میں داخل ہوا۔ایک مگ عظمت بی کے ہاتھ میں تھما کر اور دوسرا نمو کے سامنے رکھ کر وہ تابی کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔''ہمارے چھوٹے صاحب، ہمارے پاس رہیں گے۔ ہمارے راجہ بابو کو کسی کی نظر لگ گئی تو؟.....نہ بابا! نہ.....ہم تو اپنے چھوٹے صاحب کو ہرگز بھی نہیں جانے دیں گے۔''

''میرا خیال ہے، عظمت بی اور غفور کا خیال خاصا مناسب ہے۔'' آفاق صاحب ہاتھ میں چائے کا مگ تھامے کمرے کے دروازے پہ آٹھہرے تھے۔

''چلئے جیسے آپ سب کی مرضی۔'' نمرہ نے مسکرا کر ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔''میں ابھی دو منٹ میں تیار ہو کر آتی ہوں۔بس چائے پیتے ہی چل دیں گے۔کیوں بوا!''

''ہاں ٹھیک ہے۔تب تک ہم اپنی چادر لے آتے ہیں۔'' عظمت بی اندر کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔

کچھ ہی دیر بعد عظمت بی، نمرہ اور آفاق صاب گاڑی میں بیٹھے ایک پوش شاپنگ مال کی طرف جا رہے تھے۔ عظمت بی پہلے بھی کئی بار آفاق صاحب کے ساتھ اس مال میں آ چکی تھیں اسی لئے یہاں کے چپے چپے سے واقف تھیں۔

''میاں جی! آپ ہم دونوں کے ساتھ کہاں تھکیں گے؟.....ایسا کیجئے آپ اوپر جا کر ریسٹورنٹ میں بیٹھئے۔ہم دونوں خریداری کر کے وہیں آپ کے پاس آجائیں گے۔''

''ہاں عظمت بی! آپ کا یہ خیال برا نہیں۔کیوں نمو بیٹا؟''

''جیسا آپ پسند کریں۔'' نمو نے جلدی سے کہا۔

''ٹھیک ہے.....تو ہم ٹاپ فلور پر آپ دونوں کا انتظار کرتے ہیں۔'' وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔

''ارے بوا! اب ہم دونوں اکیلے.....کیسے.....؟'' وہ گھبرائی۔

''ارے بٹیا! یہاں ہم بہت بار آچکے ہیں۔ چلو ابھی ہم تمہیں نئے پیدا ہونے والے بچوں کے کپڑوں کی دکان پہ لے چلتے ہیں۔'' بوا فخریہ انداز میں اسے لئے ایک بڑے سے آراستہ شوروم کی طرف چل دیں۔ جس کے کشادہ شیشے کے دروازے کے اوپر ایک مشہور برانڈ کا نام کندہ تھا۔

وہ نمرہ کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوگئیں۔ نمرہ نے حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ بوا ایک ایک ونڈو میں جھانکتی پھر رہی تھیں۔ اس نے بھی دو تین چیزیں پسند کی تھیں۔ بوا پے منٹ کرنے میں مصروف تھیں۔ اس نے یونہی سرسری سے انداز میں شیشے کے دروازے کے اس پار دیکھا تھا۔

اور تب ہی بالکل اچانک اُسے اپنی سانسیں رُکتی محسوس ہوئی تھیں۔

وہ چہرہ، جسے وہ رشید سے نکاح کے بعد حرفِ غلط کی طرح اپنے ذہن کی سلیٹ سے مٹا چکی تھی...... وہی چہرہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ شیشے کی اس دیوار کے اُس پار موجود تھا۔ وہی گھنے سیاہ بال، کشادہ پیشانی اور وہی خمار میں ڈوبی آنکھیں، جنہوں نے کتنے ہی عرصے تک اسے مخمور رکھا تھا۔ وہ شخص کہ جسے دیکھ کر پہلی بار اس کا دل عجب انداز سے دھڑکا تھا۔ وہی ہستی، کہ جس سے مل کر وہ اپنی ہستی فراموش کر بیٹھی تھی۔

وہ تو ہمیشہ سے ہی بے حد حقیقت پسند لڑکی تھی۔

بھلا وہ خوابوں میں رہنے والی کب تھی؟

مگر اُس ہستی کو دیکھ کر انجانے انوکھے خواب آپ سے آپ اس کی گھنی پلکوں کی منڈیر سے آ لگے تھے۔

'بھلا، نام کیا تھا؟' اُس نے بے ساختہ سوچا تھا۔

'اب ذہن میں نہیں ہے...... کچھ نام تھا، بھلا سا......' رشید سے شادی کے بعد اس نے پوری سچائی اور دیانت داری سے اپنی زندگی کے اس پہلے سپنے کو، اس چہرے، ان آنکھوں کو اور اس دلکش نام کو اپنے دل و ذہن سے کھرچ دیا تھا۔ اور اس پل وہ پوری توجہ اور لگن سے اس مانوس اجنبی کے نام کو سوچ رہی تھی۔

''سرمد۔'' بالکل اچانک ہی اس کے دل نے یاد دلایا تھا۔ اور اس سینٹرلی اے سی شاپنگ مال کے اس برانڈ ڈ اسٹور کے اس پار پیسیج میں تیز تیز چلتے سرمد کو یکایک یوں لگا تھا کہ جیسے کسی نے ان کا نام لے کے پکارا ہو۔

وہ اب تک اس شاپ کے کشادہ ڈور سے خاصے آگے نکل کر نمرہ کی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ پر وہ جہاں کے تہاں تھم سے گئے تھے۔

''سرمد۔'' ایک کھنکتی سی نسوانی آواز پھر ان کی سماعت سے ٹکرائی تھی اور انہوں نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا۔

ابھی ذرا دیر قبل آفس سے نکل کر 'وجاہت منزل' جاتے ہوئے وہ جب اس شاپنگ مال کے سامنے سے گزر رہے تھے تو نوجوان ڈرائیور نے بالکل اچانک ہی یاد دلایا تھا۔

''آج نگو کی سالگرہ ہے نا.....؟''

''ارے اکبر! تم نے بڑے ہی اچھے وقت پہ یاد دلایا۔'' سرمد نے تعریفی لہجے میں کہہ کر مال کی طرف دیکھا تھا۔

''اب ذرا پارکنگ میں گاڑی لگالو تو میں اس کے لئے کوئی تحفہ لے لوں۔''

''جی اچھا۔'' اکبر نے دائیں جانب مڑ کر ذرا آگے جا کر گاڑی روک دی تھی اور سرمد گاڑی سے اُتر کر مال کے ٹیرس کی سیڑھیاں چڑھتے، مال کا کشادہ گلاس ڈور کھول کر مال کی یخ اور تسکین بھری فضا میں داخل ہو گئے تھے۔ ذرا آگے جا کر وہ آٹومیٹک ایلسی لیٹرز کے ذریعے فرسٹ فلور پہ چلے آئے تھے۔ ابھی وہ کسی دکان کا رخ کرنے ہی والے تھے کہ بالکل اچانک انہیں اپنے پیچھے سے ایک نسوانی آواز سنائی دی تھی اور وہ بے ساختہ مڑ کر دیکھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

''فروا......'' خود سے چند قدموں کے فاصلے پر فروا کو دیکھ کر وہ حیران ہونے کے ساتھ کچھ پریشان بھی ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہ اب کبھی بھی فروا سے نہ ملنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ گو کہ یہ فیصلہ ان کے لئے خاصا صبر آزما تھا۔ مگر وہ اپنے جان سے پیارے ابا جان کے سامنے کسی بھی چیز کو اہم گرداننے کو تیار نہ تھے۔ وہ اپنے بیمار باپ کی خوشی کی خاطر کچھ بھی کر سکتے تھے۔ ایک فروا کیا، پوری دنیا کو چھوڑ سکتے تھے۔

''ارے بابا! میں فروا ہوں۔'' فروا مسکراتی ہوئی ان کے عین سامنے آ کر ٹھہر گئی تھی۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟..... کیا میں پہچاننے میں نہیں آ رہی؟''

''نن...... نہیں...... یہ بات تو نہیں......'' انہوں نے خود کو سنبھالا۔ ''تم کو یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر......''

''مجھے خود اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا۔'' فروا نے جذبوں بھری آواز میں کہا۔ ''میں نے کب سوچا تھا کہ آپ یوں اچانک میری نظروں کے سامنے آ جائیں گے۔ سچی مجھے تو یہ سب خواب کا سا لگ رہا ہے۔''

''بھلا اس میں بے یقینی کی کیا بات ہے؟'' اب سرمد خاصے سنبھل چکے تھے، ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''اور جہاں تک خواب کا تعلق ہے..... بھلا خوابوں کا حقیقت سے کیا تعلق؟...... اب اجازت چاہوں گا۔'' انہوں نے قدم آگے کی جانب بڑھائے۔

''ارے پہلے میری بات کا جواب دیجئے۔'' فروا ٹھنکتے لہجے میں بولی۔ ''پھر آپ کو جانے دوں گی۔ ورنہ نہیں۔''

''کون سی بات؟'' سرمد نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''یہی کہ آپ نہ آتے ہیں، نہ فون اُٹھاتے ہیں...... ہر رشتہ، ہر تعلق بھلا بیٹھے ہیں۔ میں آپ کو اس قدر سنگ دل تو نہیں سمجھتی تھی۔'' فروا کی آواز میں شکوے کے ساتھ کرب بھی ہلکورے لے رہا تھا۔

''فروا! تم میرے حالات سے واقف ہو۔'' سرمد نے بے تعلق سے لہجے میں جواب دیا۔ ''اس کے باوجود شکوہ کر رہی ہو...... مجھے حیرت ہے۔''

''اچھا چلیں اب یہ گلے شکوے چھوڑیں...... میرا حلق خشک ہو رہا ہے...... اوپر چل کر کچھ پیتے ہیں۔'' فروا نے ناز بھرے انداز میں مسکرا کر کہا۔

''فروا!...... اس وقت میں ذرا جلدی میں ہوں۔'' سرمد نے عجلت بھرے انداز میں گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''وہ دراصل آج نکیتا کی برتھ ڈے ہے......''

''حد ہو گئی سرمد!'' فروا قدرے نروٹھے لہجے میں بولی۔ ''میرے مقابلے میں آپ نکیتا کو اہمیت دے رہے ہیں۔ آپ کے نزدیک میں آپ کی نوکرانی سے بھی گئی گزری ہو گئی۔''

''تم جانتی ہو، نکیتا ہم بھائیوں کے لئے چھوٹی بہن جیسی ہے...... اسے کبھی بھی نوکرانی کا درجہ نہیں دیا گیا..... خیر اب میں چلتا ہوں۔'' وہ واپسی کے لئے مڑے۔

''سرمد پلیز!'' فروا اس خوش نصیب لمحے کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ لپک کر ان کی کلائی تھامتے ہوئے بولی۔ ''اوپر تو چلئے...... چند لمحے بیٹھ کر چند باتیں کریں گے۔ اتنے دنوں بعد آپ کو دیکھا ہے...... سچ، میں بتا نہیں سکتی کہ میں کیا محسوس کر رہی ہوں۔ میں تو اس وقت کو دعا دے رہی ہوں، جس وقت میں نے اس مال میں آنے کا فیصلہ کیا تھا۔''

سہ پہر کو دھوپ کی تمازت میں کمی آتے ہی اس نے کمرے کا دروازہ کھول کر بالکونی کی طرف دیکھتے ہوئے ندرت بھابی سے کہا تھا۔

''امی! توبہ ہے۔ کس قدر گرمی ہے...... مجھے دو تین لان کے سوٹ ہی بنوا دیجئے۔''

''ابھی پیسے نہیں ہیں......'' ندرت جہاں نے حسبِ عادت ہاتھ ہلا کر جواب دیا تھا۔ ''جب پیسے آئیں گے، بنوا دوں گی۔''

''اچھا۔'' فروا نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ ''تو چلیئے کہیں چل کر ٹھنڈی ٹھنڈی آئس کریم ہی کھا لیتے ہیں۔''

''ارے بابا! مجھے کہیں نہیں جانا۔'' وہ دھپ سے چوکے پہ بیٹھ گئیں۔ ''گھر میں نہیں دانے، اماں چلیں بھُنانے۔'' وہ بڑبڑائیں۔

''اچھا چلیے اگر بھُنانے کے لئے دانے نہیں ہیں، تو پھر ویسے ہی ونڈو شاپنگ کے لئے چلتے ہیں۔'' فروا نے رسان بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ''اس تپتے تندور جیسے گھر سے نکل کر کسی ایئر کنڈیشنڈ مال میں ہی کچھ دیر گھوم پھر آتے ہیں۔ کچھ تو سکون اور آرام ملے گا۔''

''بھئی تمہیں جانا ہے تو جاؤ۔ میری بوڑھی ٹانگوں میں اب اتنی طاقت نہیں ہے کہ بلا وجہ شاپنگ سینٹروں میں گھومتی پھروں۔ نہ لینا ایک نہ دینا دو...... فضول وقت برباد کرتے پھرو۔''

''میری تو ہر بات سے اب آپ بیزار ہو جاتی ہیں۔'' فروا نے سلگتے لہجے میں کہا۔ ''میری ہر بات آپ کو بری لگنے لگی ہیں۔ ٹھیک ہے، آپ کو نہیں جانا تو مت جائیے۔ میں تو جا رہی ہوں۔''

اسے کیا پتہ تھا کہ ماں کے ساتھ زبان چلا کر وہ اس مال میں داخل ہوتے ہی اپنا گوہرِ مقصود پا لے گی۔

''فروا!..... میرے پاس ان باتوں کے لئے وقت نہیں ہے۔'' سرمد نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''بلا وجہ تم اپنا وقت برباد نہ کرو۔ اس طرح کی باتوں سے کسی کو بھی کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔''

چھپے ڈھکے لفظوں میں وہ فروا کو واپس لوٹ جانے کی ترغیب دے رہے تھے۔ وہ جان چکے تھے کہ وہ فروا کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے لہٰذا بلا وجہ اسے وہ کسی خوش فہمی میں رکھنا نہیں چاہتے تھے۔

''چلیئے جو کچھ کہنا ہے، اوپر چل کے کہیے گا...... آپ کم از کم مجھے ایک آئس کافی تو پلا سکتے ہیں؟''

''او کے۔'' آخر کار سرمد کو مجبور ہو کر ہتھیار ڈالنے ہی پڑے اور وہ مسکراتی ہوئی ان کے قدم سے قدم ملا کر لفٹ کی طرف چل دی۔

ٹاپ فلور پر لفٹ کے سامنے دُور تک آرام دہ، رنگین کرسیوں اور میزوں کا جال سا بچھا تھا۔ سیدھے ہاتھ کی جانب چھوٹی چھوٹی شاپس اشیائے خورد و نوش سے بھری پڑی تھیں۔ وہ فروا کو کونے والی ایک ٹیبل پر بٹھا کر آئس کافی کے لئے کاؤنٹر کی جانب بڑھ گئے تھے۔

تب پروفیسر آفاق نے سر گھما کر دکانوں کی لائن کی طرف دیکھا تھا۔ نمرہ اور عظمت بی، فریال کی نومولود بچی کے لئے خریداری میں مصروف تھیں اور وہ یہاں آ بیٹھے تھے۔ تب ہی انہیں کچھ پیاس محسوس ہوئی تھی۔ سوچا چل کر پانی پیا جائے۔ یہ سوچ کر انہوں نے گردن گھما کر سجی سجائی جگمگاتی چھوٹی چھوٹی شاپس کی طرف دیکھا تھا اور ان کی نظر گھومتی ہوئی سرمد پہ آ رُکی تھی۔

'سرمد.....' وہ حیران سے اپنی جگہ سے اُٹھے۔

''تم یہاں کہاں؟'' اگلے ہی لمحے وہ ان کے قریب کھڑے ان سے پوچھ رہے تھے۔ ''شاپنگ کے لئے آئے ہو؟''

''اوہ انکل! آپ؟'' سرمد ایک دم سے سٹپٹا کر بولے تھے۔ پھر انہوں نے چور نظروں سے فروا کی طرف دیکھا تھا۔ ذرا ہی فاصلے پر وہ کرسی پر بیٹھی اُنہیں اور آفاق صاحب کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

''نن..... نہیں۔ شاپنگ وغیرہ تو کیا......'' وہ نروس سے بولے۔ ''وہ ہے نا..... نگو..... آئی مین نگینا..... آج اُس کا

برتھ ڈے ہے......بس یونہی اچانک خیال آ گیا تو سوچا اس کے لئے کوئی چھوٹا موٹا تحفہ ہی لے لیا جائے۔"

"اوہ، ویری گڈ۔" پروفیسر آفاق خوش ہوئے۔ "یہ دیکھ کر واقعی خوشی ہوتی ہے......وجاہت کے گھر میں نوکروں کو بھی عزت ومحبت کے قابل سمجھا جاتا ہے......اب آپ کے ابا جان کی طبیعت کیسی ہے؟"

"آپ جیسا دیکھ کر گئے تھے، ویسے ہی ہیں۔" سرمد نے اُداسی سے جواب دیا۔ "کچھ سمجھ نہیں آتا کہ ان کے لئے کیا، کیا جائے۔"

تب ہی فروا ٹیبل سے اُٹھ کر ان دونوں کے قریب چلی آئی تھی۔

"آداب۔" اس نے آفاق صاحب کے سامنے قدرے جھکتے ہوئے انہیں آداب کیا تھا۔

"آپ......؟" آفاق صاحب نے حیران نظروں سے پہلے فروا کو، پھر سرمد کو دیکھا تھا۔ سرمد خاصے پزل ہو رہے تھے۔

"میں کون ہوں......آپ کو یہ بات سرمد ہی بتائیں گے۔" فروا انتہائی عیاری سے مسکرائی اور آفاق صاحب نے اپنی سوالیہ نظریں سرمد کی طرف مرتکز کر دیں۔

"وہ انکل!......دراصل یہ......" سرمد کو اپنی نروس نیس پہ غصہ آ رہا تھا......بہ مشکل تمام خود کو سنبھال کر بولے۔ "یہ فروا ہیں......ندرت خالہ کی چھوٹی بیٹی۔"

"یعنی اسد کی بیوی ثروت کی چھوٹی بہن؟" آفاق صاحب نے بے ساختہ چونکتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"جج......جی......" آفاق صاحب کے اس طرح کہنے پر سرمد اور کنفیوز ہو گئے تھے۔ "یہاں اچانک ہی مل گئی تھیں......تو......میں نے سوچا......"

"اوہ اچھا۔" اپنی عادت کے برخلاف آفاق صاحب نے فروا کو سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مکار آنکھوں سے چھلکتی حریص چمک نے انہیں ایک دم سے پریشان کر دیا تھا۔ وہ سرمد کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ ایک باکردار اور نیک انسان تھے۔ مگر فروا کے بارے میں وہ کوئی اچھی رائے قائم نہیں کر سکے تھے۔ ویسے بھی فروا، ثروت کی بہن اور ندرت جہاں کی بیٹی تھی۔ وہ ندرت جہاں، جس نے ہر ہر قدم پہ وجاہت مرزا کے ہنستے بستے گھر کو اپنے حسد اور بغض کے قدموں تلے بے دردی سے روندا تھا۔ اسی کے سکھانے پڑھانے کی وجہ سے سطوت جہاں کا کبھی بھی ساس اور شوہر سے اچھا رویہ نہ رہا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ وہ سرمد کو بھی نظر انداز کرنے لگی تھیں۔ ندرت جہاں کی خود ساختہ اور یک طرفہ دشمنی کی وجہ سے وجاہت مرزا کبھی سکون اور خوشی سے نہ جی سکے تھے۔ اس نے ان کا دل دُکھانے اور انہیں تکلیف پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔ خود کو ٹھکرائے جانے کا انتقام وہ اب تک لے رہی تھی۔ سطوت جہاں کی حادثاتی موت کو قتل قرار دے کر اس نے وجاہت مرزا پہ قاتل ہونے کا الزام تک لگا دیا تھا۔ انہی سب باتوں کی وجہ سے آخر وجاہت مرزا کا دل ندرت سے اس طرح پھٹا تھا کہ اب وہ اس کا نام سننے کے بھی روادار نہ تھے۔

مگر ندرت جہاں نے اسد سے ثروت کی شادی کر کے وجاہت مرزا پر ایک اور کاری وار کیا تھا......اور وہ یہ وار سہہ نہ سکے تھے۔ ان کے ہاتھ پیروں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ بات کرنے سے بھی قاصر ہو گئے تھے۔ ایک زندہ لاش کی طرح بستر پر پڑ کر رہ گئے تھے۔

اور اب لگتا تھا، ندرت نے سرمد کو بھی اپنی دوسری بیٹی فروا کی زلف کا اسیر بنا کر اپنی ہوس کے زندان میں ڈالنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ سرمد تو وجاہت مرزا اور عاتکہ بیگم کی امیدوں کی آخری کرن تھے۔ ان دنوں زندہ لاش کی سی زندگی گزارنے والے انسانوں کی رہی سہی زندگی بھی اب داؤ پہ لگنے کو تھی۔

"ایسا ہرگز بھی نہیں ہونا چاہئے۔" انہوں نے دل ہی دل میں سوچا تھا اور ایک کڑی نظر پھر فروا پہ ڈالی تھی۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" انہیں واپسی کے لئے پَر تولتے دیکھ کر سرمد نے جلدی سے کہا تھا۔ "آیئے نا۔ ہمارے ساتھ کچھ کھا پی لیجئے۔"

"ارے نہیں بیٹا!" آفاق صاحب تدبر سے مسکرائے۔ "میں ذرا نیچے جاؤں..... دیکھوں ہماری عظمت بی نے اب تک کیا کیا خرید ڈالا۔"

"کچھ دیر تو ساتھ دیجئے۔" فروا نے مسکرا کر اصرار کیا۔

"میں ذرا جلدی میں ہوں۔" انہوں نے اس بار فروا کی طرف نگاہ ڈالنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ سرمد کی طرف دیکھ کر بولے تھے اور اس سے مصافحہ کر کے واپسی کے لئے پلٹ گئے تھے۔

واپسی میں ان کا دل فکر سے بھرا ہوا تھا اور آنکھوں سے عجب سا اضطراب جھانک رہا تھا۔ وہ اپنے عزیز دوست کے ساتھ ایک بار پھر ہاتھ ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مگر سوال یہ تھا کہ وہ کر بھی کیا سکتے تھے؟

وہ نمرہ اور عظمت بی کو فرسٹ فلور پہ چھوڑ کر اوپر گئے تھے اور طے یہی پایا تھا کہ وہ دونوں شاپنگ سے فارغ ہو کر اوپر ہی پہنچ جائیں گی۔ مگر سرمد کے ساتھ فروا کو دیکھ کر وہ بے حد بد دل ہوئے تھے۔ اس لئے بنا سوچے سمجھے نیچے چلے آئے تھے۔ جلد ہی ان کی نگاہوں نے نمرہ اور عظمت بی کو تلاش کر لیا تھا۔ وہ دونو نیو بورن بے بیز کی چیزوں کے اسٹور سے باہر نکل رہی تھیں۔ دونوں کے ہاتھوں میں خاصے بڑے بڑے شاپنگ بیگز تھے۔

"ہو گئی شاپنگ؟" انہوں نے حیرت سے بیگز کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا۔

"جی۔" نمرہ مسکرائی تھی۔ مگر انہوں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی حسین مخمور آنکھیں کچھ مضطرب سی تھیں، جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہوں۔ ڈھونڈ رہی ہوں۔

"کیا خیال ہے، چلا جائے؟" انہوں نے خواتین کے ہاتھوں سے بیگز تھامتے ہوئے اجتماعی طور پر ان دونوں سے سوال کیا تھا۔

"جی چلیئے۔" نمرہ نے مسکرا کر جواب دیا تھا اور پروفیسر صاحب کے پیچھے چل دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی بوا سڑ سڑ کرتی چل رہی تھیں۔

❀===❀===❀

کراچی کے چرخِ نیل فام پہ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

پورا شہر تپتی دھوپ میں سلگتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ گرم ہوا کے تھپیڑے چہرے کو جھلسائے دے رہے تھے۔ ایسے میں رشید لون کے حصول کی خاطر ایک بینک سے دوسرے بینک کی جانب محوِ سفر تھا۔

اُس نے رمضان آرائیں کو جس قدر بھولا اور سیدھا جانا تھا، وہ اتنی ہی ٹیڑھی کھیر ثابت ہو رہا تھا۔ رمضان آرائیں نے ایک عمر سعودی عرب میں گزاری تھی۔ اب بیوی کے انتقال کے بعد وہ دوبئی میں کاروبار سیٹ کر رہا تھا۔ اس کی بڑی بیٹی کا شوہر دوبئی میں ایک بڑی کنسٹرکشن کمپنی کا مالک تھا..... اسی کے ایما پر رمضان نے سعودی عرب سے تمام کاروبار سمیٹ کر دوبئی کا رخ کیا تھا۔ ایک شوگر مل لگائی تھی۔ اور اب کنسٹرکشن میں بھی داماد کے ساتھ پیسہ لگا رہا تھا۔ اسی لئے اس نے رشید سے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کر دیا تھا۔ رمضان آرائیں کی منجھلی بیٹی کا شوہر آج کل اکاؤنٹنٹ جنرل آف سندھ کی پوسٹ پر فائز تھا۔ اسی لئے اب وہ خاصا شیر ہو رہا تھا۔ رشید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کرے تو کیا کرے؟

پلاٹ وہ مہکار کے نام کر چکا تھا۔

اور اس کے اکاؤنٹ میں موجود رمضان آرائیں کی دس کروڑ کی رقم اب محض چند لاکھ تک محدود ہوگئی تھی۔ مہکار کے زیور، کپڑوں، باہر کے ٹرپ اور مکان کی خریداری میں تقریباً تمام ہی رقم خرچ ہو چکی تھی۔ گھومنے پھرنے اور شاپنگ کے علاوہ بھی مہکار نے رشید کو شیشے میں اتار کر کئی بار بڑی بڑی رقمیں اپنے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروائی تھیں۔ مہکار سے شادی سے کچھ دنوں پہلے وہ پلاٹ پہ کنسٹرکشن کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ پھر نمرہ کو گھر بدر کرنے اور مہکار کی زلفِ گرہ گیر میں یوں اُلجھنے کہ شادی کی نوبت آ پہنچی، کے بعد سے اب تک سال سے اوپر ہونے کو آیا تھا، اُس نے تنکا تک نہ توڑا تھا۔ نہ کوئی کام نہ کاروبار..... بیٹھے بیٹھے خرچ کیا جائے تو قارون کا خزانہ بھی کم پڑ جاتا ہے۔ دس کروڑ کی آج کے دور میں اوقات ہی کیا تھی۔

ادھر رمضان آرائیں کا رقم کی واپسی کا اصرار شروع ہوگیا تھا۔

پہلے تو رشید نے اپنی ازلی عیاری سے آئیں بائیں شائیں کر کے اسے ٹالنا چاہا۔ مگر جب ایک شام اس کا اعلیٰ سرکاری افسر داماد اپنے گارڈز کے ساتھ اس کے آفس آیا تو رشید کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ وہ رمضان آرائیں کے دس کروڑ کے عوض اپنا دس کروڑ کا پلاٹ اس کے حوالے کر دیتا۔

مگر جب اس نے مہکار اور اس کی بہن گلبہار کے سامنے پلاٹ کا ذکر چھیڑا تو اسے اذیت بھری حیرت سے سابقہ پڑا تھا۔

''کون سا پلاٹ؟'' مہکار نے منہ بنا کر پوچھا تھا۔

''ارے وہی پلاٹ جس کے بارے میں ابھی کچھ دن پہلے ہم ڈسکس کر رہے تھے۔'' رشید بیزار سے لہجے میں بولا۔

''تو یہ تو طے ہو گیا تھا نا کہ آپ اس پہ پلازہ کی تعمیر کا کام شروع کرواؤ گے؟'' مہکار نے بھنویں سکیڑ کر یاد دلایا۔

''یہی تو مسئلہ ہے۔ پلازہ کی تعمیر کے لئے رقم نہیں ہے۔'' رشید بے بسی سے بولا۔

''تے کی ہویا۔ آپ کسی بینک سے لون لے لو۔'' مہکار نے نہایت ہلکے پھلکے انداز میں اسے مشورہ دیا۔ ''آپ تو پہلے بھی کئی بار بینکوں سے قرض لے چکے ہو۔''

''ہاں..... یہ تو ہے۔'' رشید نے پُرسوچ انداز میں کنپٹی کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے کسی بینک سے رابطہ کرنا چاہئے۔ ورنہ آخری صورت یہی رہ جائے گی کہ پلاٹ رمضان آرائیں کو دے کر جان چھڑائی جائے۔'' آخری جملہ رشید محض دل میں سوچ کر رہ گیا تھا۔

اگلے دن صبح سے ہی وہ مختلف بینکوں کے چکر لگانے میں مصروف ہو گیا تھا۔ صبح سے یہ وقت آ گیا تھا..... گرمی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ لُو نے پوری فضا میں پگھلتی ہوئی آگ سی پھیلا دی تھی۔ وہ پسینے سے شرابور ایک بینک سے دوسرے بینک کا درمیانی فاصلہ ناپتا پھر رہا تھا۔ اور تب ہی انکوائری کے اس بینک کی برانچ کے سامنے پہنچ کر بالکل اچانک ہی اسے وہ گرم اور تمازت سے پُر دوپہر یاد آ گئی تھی جب اس نے اسی بینک کے سامنے حسنہ کے ساتھ نمرہ کو پہلی بار دیکھا تھا۔ سیاہ چادر میں لپٹی لپٹائی معصوم اور دلکش نمرہ کے چہرے پر پہلی نگاہ پڑتے ہی وہ نگاہوں کی راہ سے اس کے دل میں اُتر گئی تھی۔ اس سے شادی کر لینے اور پھر اپنے گھر سے نکال باہر کر دینے کے باوجود..... شاید وہ اسے آج بھی اپنے دل سے نکال نہیں پایا تھا..... وہ آج بھی اس کے دل کے کسی گوشے میں سہمی ہوئی سی نم پلکیں لئے موجود تھی..... اور آج برسوں بعد اسی سڑک پر قدم رکھتے ہی اسے وہ منظر یاد آ گیا تھا..... اور نمرہ کی یاد کے ساتھ ہی ایک بے نام سا قلق اسے اپنے رگ و پے میں اُترتا محسوس ہوا تھا۔ بقول اس کی ماں کے، نمرہ نے اس سے بے وفائی کی تھی۔ اور یہ کہ اس کے وجود میں کسی اور کا گناہ پل رہا تھا۔ اس بات سے اسے تکلیف پہنچی تھی۔ اسے اس معصوم اور سادہ سی لڑکی سے اتنے بڑے گناہ

کی توقع نہ تھی۔ مگر کبھی دل سے اس نے اس کے اس گناہ کو تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔ مگر ماں کے کہنے اور کچھ نشے میں دھت ہونے کے باعث اس رات وہ اسے طلاق دے کر اپنے گھر اور اپنی دنیا سے دور پھینک آیا تھا۔ اس کے بعد اس نے کبھی اس کی خبر تک نہیں لی تھی۔

مگر آج بالکل اچانک ہی اس کی یاد نے اس کے دل میں چٹکی لی تھی اور ایک عجب سے احساسِ زیاں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

ملکی حالات کے پیشِ نظر کسی بھی بینک سے قرض ملنے کی اُمید نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہر بینک سے ٹکا سا جواب سن کر وہ اپنا سا منہ لے کر بینک سے باہر نکل آیا تھا۔ اور اب اس پل نمرہ کی یاد نے بھی اسے حد درجہ افسردہ کر دیا تھا۔ وہ مایوس اور دل گرفتہ سا گاڑی میں آ بیٹھا تھا۔

پریشان سوچوں نے اس کے دل و دماغ میں ڈیرہ ڈالا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ کس طرح رمضان کی رقم واپس کر کے اس سے اپنی جان چھڑائے۔ اب اسے اس بات کا بھی اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ مہکار کسی بھی قیمت پر وہ پلاٹ رمضان کو نہیں دے گی۔ مہکار اور لاکھانی کی باتوں میں آ کر مہکار کے نام پلاٹ لگا کر اب وہ بری طرح پچھتا رہا تھا۔ دس کروڑ کی خطیر رقم تو ضائع ہوئی ہی تھی، اب واضح ہوا تھا کہ دس کروڑ کی مالیت کا وہ پلاٹ بھی خطرے میں پڑ گیا تھا...... یہی کیا کم تھا کہ مہکار نے اسے پلاٹ کے عوض قرض لینے یا پلاٹ پہ تعمیر کی اجازت دے دی تھی۔ مگر وہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ مہکار پلاٹ بیچنے یا رمضان کی رقم کے عوض اس کے حوالے کرنے کے لئے ہرگز بھی تیار نہ ہو گی۔

انہی تمام اُلجھنوں میں اُلجھا وہ گاڑی دوڑاتا جانے کس جانب جا نکلا تھا۔

دوپہر ڈھل کر سہ پہر کی آغوش میں پڑی ہانپ رہی تھی۔ اب نہ دھوپ میں وہ تمازت تھی، نہ ہوا میں سلگتی آنچ کا سا احساس تھا۔ مگر رشید کے دل و دماغ میں انگارے سے چیخ رہے تھے، شعلے لپک رہے تھے۔ اپنے ہی خیالوں سے اُلجھتا جانے کیسے بالکل اچانک ہی وہ غلط سائیڈ پہ آ گیا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا، سامنے سے آتے ایک تیز رفتار ٹرک کی زد میں آ چکا تھا۔

ایک زوردار دھما کا ہوا تھا اور اسے کچھ ہوش نہ رہا تھا۔

اسے جب ہوش آیا تو وہ ہاسپٹل میں تھا۔ لاکھانی اس کے قریب سر جھکائے کھڑا تھا۔ اسے پلکیں کھولتے دیکھ کر وہ تیزی سے اس پہ جھکتا ہوا بولا تھا۔

''رسید بھائی! اب آپ کیسا فیل کر رہے ہو؟''

''مجھے کیا ہوا ہے لاکھانی؟'' رشید نے سر پر بندھی پٹی کو چھو کر نقاہت بھرے لہجے میں سوال کیا تھا۔

''آپ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔'' لاکھانی نے دھیمے لہجے میں اسے بتایا۔ ''اوپر والے کا کرم ہے جو آپ جندہ ہو..... ورنہ آپ کی گاڑی کا جو حسر ہوا ہے، اسے دیکھ کر تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس گاڑی میں موجود آدمی بچ بھی سکتا ہے۔''

''اوہ.....'' رشید نے کراہ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

''ابھی وہ مہکار بھابی بھی آنے والی ہے۔'' لاکھانی نے اسے اطلاع دی۔

''میں کب تک ہاسپٹل میں رہوں گا؟'' رشید نے مہکار کے ذکر کو نظر انداز کرتے ہوئے لاکھانی سے پوچھا تھا۔

''مجھے گھر لے چلو لاکھانی!...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

اس نے جونہی اُٹھنے کی کوشش کی تھی، اسے اپنی کمر کے نیچے شدید درد کی لہر سی اُٹھتی محسوس ہوئی تھی۔

''ابھی ڈاکٹر آنے والا ہے۔ وہ بولے گا تو آپ گھر چلے چلنا۔ مگر آپ کے پیڑو میں سدید چوٹ آئی ہے۔ میرا ئمیں کھیال کہ ابھی ڈاکٹر آپ کو گھر جانے کا مسورہ دے گا۔''

''ان پرائیویٹ ہسپتالوں کے ڈاکٹرز بھی کبھی کسی کو گھر جانے کا مشورہ دیتے ہیں؟'' رشید نے دل جلے انداز میں کہا۔ ''تمہیں پتہ ہے میرے اکاؤنٹ میں محض چند لاکھ روپے ہیں۔ اُدھر رمضان آرائیں کے تقاضوں سے میری جان پہ بنی ہے۔ اور اب یہ..... ہسپتال کا لمبا چوڑا بل...... یار لاکھانی!...... پلیز یار! مجھے یہاں سے گھر لے چل۔''

''ابھی بھائی کو تو آنے دو...... اور وہ ڈاکٹر آپ کو ڈسچارج کرے گا تو آپ جاؤ گے نا۔'' لاکھانی دھیمی آواز میں بولا۔ ''میرا مسورہ ہے آپ تھوڑا صبر سے کام لو...... ابھی سب ٹھیک ہو جاوے گا۔''

کچھ ہی دیر میں مہکار آ گئی تھی۔

شفون کی نفیس ساڑھی، دمکتے میک اپ اور خوشبوؤں میں بسی مہکار کے آتے ہی ہر سمت خوشبو پھیل گئی تھی۔

مہکار کا سجا سنورا روپ رشید کو ہمیشہ ہی اٹریکٹ کرتا تھا۔ مگر آج جب وہ ہزاروں پریشانیوں میں گھرا، حادثے کا شکار ہو کر بستر پر پڑا تھا، اُس کا اس چیخ مٹخ سے آنا اُسے اچھا نہیں لگا تھا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ اسے رشید کے حادثے کا ذرا سا بھی ملال ہوا تھا۔ ایسے میں بے ساختہ رشید کو وہ شام یاد آ گئی تھی۔ جب نشے کی وجہ سے گاڑی پارک کرتے ہوئے اس نے گیٹ کے پلر سے ٹکرادی تھی۔ جھٹکا لگنے کے باعث اس کا سر ڈیش بورڈ سے جا ٹکرایا تھا اور ماتھے سے لہو بہہ نکلا تھا۔

اس کا خون دیکھ کر نمرہ کس قدر متوحش ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ کیسے لپک جھپک کر اس نے اس کا زخم صاف کر کے مرہم پٹی کی تھی۔ پھر اس نے اسے گرم دودھ میں ہلدی ڈال کر پینے کے لئے دیا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ دودھ کی طرف دیکھ کر اکھڑے سے لہجے میں بولا تھا۔

''شریفن خالہ کہتی تھیں، ہلدی ملا دودھ پینے سے چوٹ کو آرام آتا ہے۔'' اس نے دھیمی آواز میں وضاحت کی تھی۔ ''پلیز! پی لیجئے۔ آپ کا اتنا خون بہہ گیا ہے۔''

''پرے کر اسے۔ مجھے یہ دادی اماں کے زمانے کے ٹوٹکے نہیں آزمانے۔'' وہ گلاس دور ہٹاتے ہوئے بیزاری سے بولا تھا۔

''تو پھر آپ ڈاکٹر کے پاس چلے جائیے۔ آپ کو چوٹ لگی ہے۔ خدانخواستہ کچھ......'' اس نے بھیگی پلکوں سے اس سے گزارش کی تھی۔

''اے بدبخت! تیرے منہ میں خاک...... خدانخواستہ تُو میرے لعل کو مارنے کی بدفال منہ سے نکال رہی ہے۔'' سلطانہ لپکتی ہوئی آگے بڑھی تھی۔

''نہیں اماں! میں تو......'' نمرہ روہانسی ہو گئی تھی۔ اور اس رات اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور تمام رات جاگ کر اس کا خیال رکھا تھا۔

''آہ......'' نمرہ کا خیال ایک سرد آہ بن کر اس کے لبوں پہ آ گیا تھا۔

نمرہ اب اُس کی دسترس سے باہر تھی مگر ماں تو اب بھی اس سے ممتا کے رشتے میں بندھی ہوئی تھی۔ جب سے مہکار نے کلفٹن میں گھر لے کر اس گھر کو خیر باد کہا تھا، وہ ایک بار بھی ماں سے ملنے نہیں گیا تھا۔ کبھی کبھار اس گھر کی نچلی منزل پر واقع اپنے آفس جاتا تو بھی وہ ماں سے ملنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔ مہکار نے اس کے دل میں ماں سے اتنی دُوریاں، اتنا فاصلہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اس کے لئے جیتے جی مر چکی تھی...... مگر آج نمرہ کے ساتھ ماں کے خیال نے ہی اسے بے چین کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ لاکھانی سے ماں کی بابت کچھ پوچھتا، ڈاکٹر آ گیا تھا۔

ڈاکٹر کے ساتھ اس کے دو جونیئر اسسٹنٹ بھی تھے۔ دو نرسیں ہاتھوں میں اس کی فائلیں تھامے ڈاکٹرز کے ہم رکاب تھیں۔

''اوہ..... ڈاکٹر.....'' ڈاکٹرز اور نرسز کو دیکھ کر رشید نے اُٹھنے کی کوشش کی تو اسے ایک بار پھر اپنی کمر کے نیچے دائیں جانب شدید درد کا احساس ہوا تھا۔

''ارے لیٹے رہیے۔ ابھی آپ اُٹھ نہیں سکتے۔'' ڈاکٹر نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے لیٹے رہنے کی تلقین کی تھی۔

''رشید صاحب! آپ بہت خوش نصیب ہیں کہ اتنے شدید حادثے کے بعد بھی آپ بالکل صحیح سلامت ہیں۔'' ڈاکٹر نے نرس کے ہاتھ سے ایک فائل لے کر اسے کھولتے ہوئے دھیمی آواز میں تمہید کا آغاز کیا۔ ''مگر آپ کے لئے ایک بری خبر ہے۔''

ڈاکٹر، رشید کے قریب بیڈ کے کونے پہ ٹکتے ہوئے نرم اور حوصلہ دینے والی آواز میں بولا۔ ''دیکھا جائے تو یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے۔ اس وقت آپ کی جو عمر ہے..... تو ظاہر ہے، آپ صاحبِ اولاد ہوں گے۔ ماشاء اللہ بچے بڑے ہوگئے ہوں گے۔''

''اِدھر ابھی بچوں کا کیا چکر؟'' لاکھانی نے جلدی سے پوچھا تھا۔

''ہاں وہی بتانے جا رہا ہوں۔'' ڈاکٹر نے ایک بار پھر کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ''رشید صاحب! اس حادثے میں آپ کے دائیں جانب کے وہ اعضاء متاثر ہوئے ہیں جن کے باعث وثوق سے کہا جا سکتا ہے..... کہ اب آپ کبھی بھی باپ نہیں بن سکتے۔''

باپ بننے کا اسے شوق ہی کب تھا؟

اس کی دوسری بیوی سے ایک بچی پیدا ہوئی تھی۔ مگر اس کے گھر لوٹ کے آنے سے پہلے ہی سلطانہ کی لاپروائی کی وجہ سے وہ بچی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئی تھی۔ پھر برسوں بعد نمرہ اُمید سے ہوئی تھی..... اُسے نہ اس بچی کے مرنے کا غم ہوا تھا، نہ نمرہ کے اُمید سے ہونے کی خوشی۔ مگر نمرہ کی خوشی اور شادمانی دیکھ کر وہ خود بھی کبھی کبھی ایک انجانی سی خوشی محسوس کرنے لگا تھا۔ مگر یہ خوشی اپنے انجام کو پہنچنے سے قبل ہی سلطانہ نے اس کے کان میں یہ پھونک دیا تھا کہ نمرہ کے پیٹ میں پلنے والا بچہ اس کا نہیں ہے..... تب نمرہ نے رو رو کر، ہاتھ جوڑ کر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''دیکھیے، میں گھر سے باہر کبھی بھی کہیں نہیں جاتی۔ یہاں گھر میں مجھ سے ملنے کوئی بھی نہیں آتا..... تو پھر بھلا یہ بچہ کسی اور کا کس طرح ہو سکتا ہے؟..... اپنے خون کو گالی مت دیجئے۔ یہ آپ ہی کا بچہ ہے۔''

اس نے اس وقت تو نمرہ کی بات سمجھ لی تھی۔ مگر زیادہ دیر وہ ماں کے اٹھائے طوفان کے سامنے نہ ٹک سکا تھا۔

مگر آج اس پل جب اسے بتایا گیا تھا کہ وہ اب باپ بننے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے..... تو اسے اپنے رگ و پے میں ایک عجیب سی وحشت دوڑتی محسوس ہوئی تھی۔ اور سماعت میں عجب سا سناٹا اُترتا محسوس ہوا تھا۔

مہکار ڈاکٹرز سے سوال جواب میں مصروف تھی۔ دیکھا جاتا تو اسے بھی رشید کی اس کمی سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ وہ کب رشید کے بچوں کی ماں بننے کے لئے مری جا رہی تھی..... مگر اس پل وہ اس کے ساتھ پیش آئے اس حادثے کے بارے میں اس انداز سے تشویش کا اظہار کر رہی تھی، جیسے اس حادثے کے بعد اب رشید کسی کام کا بھی نہیں رہا۔

دو روز میں رشید خاصا بہتر ہو گیا تھا۔

''کیا میں اب گھر جا سکتا ہوں؟'' اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے آپ کو کم از کم دو دن اور یہاں رُکنا چاہئے۔'' ڈاکٹر نے اپنا فیصلہ سنایا۔
اس دن کے بعد مہکار نہیں آئی تھی۔ البتہ لاکھانی پابندی سے آ رہا تھا۔ پہلے دن اسے ماں کا خیال آیا تھا مگر بعد میں اس نے یہ خیال جھٹک دیا تھا۔
پانچ دن ہسپتال میں گزار کے وہ گھر پہنچا تو اس کے گھر کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ گلبہار نے اس کی شکل دیکھتے ہی نفرت بھرے انداز میں ''ہونہہ'' کیا تھا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی تھی۔ وہ لاکھانی کا سہارا لئے اپنے بیڈ روم میں چلا آیا تھا۔ وہاں مہکار سنگھار میز کے سامنے بیٹھی میک اپ کرنے میں مصروف تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے بیزار سے لہجے میں کہا تھا۔
''میرا خیال تھا کہ تم یہاں آنے کے بجائے اپنی ماں کے پاس جاؤ گے۔''
''ایک سال سے میں نے اپنی ماں کی شکل نہیں دیکھی۔'' رشید اس کی بے تکی بات پر اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے نقاہت بھرے لہجے میں بولا۔ ''تو اب کس منہ سے اس کے پاس جاتا؟''
''اُس کی شکل تو تم نے اُس کے کرتوتوں کی وجہ سے نہیں دیکھی نا۔'' مہکار اُسی انداز میں بولی۔ ''مگر اس حال میں اسے ہی تمہاری دیکھ بھال کرنی چاہئے۔ آخر کو اس کے گھر کا کرایہ دیتے ہو، اس کا خرچہ دیتے ہو...... ماں ہونے کے ناطے اس کا بھی کچھ فرض بنتا ہے...... کچھ ذمے داری بنتی ہے کہ نہیں؟''
''اس وقت میں یہ سب مسائل نہیں سننا چاہتا۔'' رشید نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ مجھے ایک کپ کافی بنا دو۔''
''میں تو ایک پارٹی میں جا رہی ہوں۔'' میک اپ مکمل کر کے مہکار نے اپنے چہرے کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''تم نسیمہ سے کہہ کر کافی بنوا لینا۔'' پھر وہ اپنا پرس اُٹھا کر باہر چلی گئی تھی۔
''لاکھانی! تم نے دیکھا...... بیویاں ایسی ہوتی ہیں؟'' رشید نے غم اور غصے سے دوچار ہوتے ہوئے لاکھانی سے کہا۔ ''شوہر بستر پر پڑا ہے اور اسے پارٹی کی پڑی ہے۔''
''صبر رشید بھائی!...... صبر۔'' لاکھانی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے دھیرج رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی مہکار جیسی عورتوں سے آپ نمرہ جیسی عورتوں والی خدمت گزاری کی اُمید تو نہیں رکھ سکتے نا۔''
''تم نے ٹھیک کہا۔'' رشید نے ٹھنڈی سانس بھری۔

✪===✪===✪

ڈاکٹر کے ساتھ اس کے دو جونیئر اسسٹنٹ بھی تھے۔ دو نرسیں ہاتھوں میں اس کی فائلیں تھامے ڈاکٹرز کے ہم رکاب تھیں۔

''اوہ.....ڈاکٹر.....'' ڈاکٹرز اور نرسز کو دیکھ کر رشید نے اُٹھنے کی کوشش کی تو اسے ایک بار پھر اپنی کمر کے نیچے دائیں جانب شدید درد کا احساس ہوا تھا۔

''ارے لیٹے رہیے۔ ابھی آپ اُٹھ نہیں سکتے۔'' ڈاکٹر نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے لیٹے رہنے کی تلقین کی تھی۔

''رشید صاحب! آپ بہت خوش نصیب ہیں کہ اتنے شدید حادثے کے بعد بھی آپ بالکل صحیح سلامت ہیں۔'' ڈاکٹر نے نرس کے ہاتھ سے ایک فائل لے کر اسے کھولتے ہوئے دھیمی آواز میں تمہید کا آغاز کیا۔''مگر آپ کے لئے ایک بری خبر ہے۔''

ڈاکٹر، رشید کے قریب بیڈ کے کونے پہ ٹکتے ہوئے نرم اور حوصلہ دینے والی آواز میں بولا۔''دیکھا جائے تو یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے۔ اس وقت آپ کی جو عمر ہے.....تو ظاہر ہے، آپ صاحبِ اولاد ہوں گے۔ ماشاء اللہ بچے بڑے ہو گئے ہوں گے۔''

''اِدھر ابھی بچوں کا کیا چکر؟'' لاکھانی نے جلدی سے پوچھا تھا۔

''ہاں وہی بتانے جا رہا ہوں۔'' ڈاکٹر نے ایک بار پھر کھنکھار کر گلا صاف کیا۔''رشید صاحب! اس حادثے میں آپ کے دائیں جانب کے وہ اعضاء متاثر ہوئے ہیں جن کے باعث وثوق سے کہا جا سکتا ہے.....کہ اب آپ کبھی بھی باپ نہیں بن سکتے۔''

باپ بننے کا اسے شوق ہی کب تھا؟

اس کی دوسری بیوی سے ایک بچی پیدا ہوئی تھی۔ مگر اس کے گھر لوٹ کے آنے سے پہلے ہی سلطانہ کی لاپروائی کی وجہ سے وہ بچی اس دارِ فانی سے کُوچ کر گئی تھی۔ پھر برسوں بعد نمرہ اُمید سے ہوئی تھی.....اُسے نہ اس بچی کے مرنے کا غم ہوا تھا، نہ نمرہ کے اُمید سے ہونے کی خوشی۔ مگر نمرہ کی خوشی اور شادمانی دیکھ کر وہ خود بھی کبھی کبھی ایک انجانی سی خوشی محسوس کرنے لگا تھا۔ مگر یہ خوشی اپنے انجام کو پہنچنے سے قبل ہی سلطانہ نے اس کے کان میں یہ پھونک دیا تھا کہ نمرہ کے پیٹ میں پلنے والا بچہ اس کا نہیں ہے.....تب نمرہ نے رو رو کر، ہاتھ جوڑ کر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''دیکھیے، میں گھر سے باہر کبھی بھی کہیں نہیں جاتی۔ یہاں گھر میں مجھ سے ملنے کوئی بھی نہیں آتا.....تو پھر بھلا یہ بچہ کسی اور کا کس طرح ہو سکتا ہے؟.....اپنے خون کو گالی مت دیجئے۔ یہ آپ ہی کا بچہ ہے۔''

اس نے اس وقت تو نمرہ کی بات سمجھ لی تھی۔ مگر زیادہ دیر وہ ماں کے اٹھائے طوفان کے سامنے نہ ٹِک سکا تھا۔

مگر آج اس پل جب اسے بتایا گیا تھا کہ وہ اب باپ بننے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے.....تو اسے اپنے رگ و پے میں ایک عجیب سی وحشت دوڑتی محسوس ہوئی تھی۔ اور ساعت میں عجب سا سناٹا اُترتا محسوس ہوا تھا۔

مہکار ڈاکٹرز سے سوال جواب میں مصروف تھی۔ دیکھا جاتا تو اسے بھی رشید کی اس کمی سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ وہ کب رشید کے بچوں کی ماں بننے کے لئے مری جا رہی تھی.....مگر اس پل وہ اس کے ساتھ پیش آئے اس حادثے کے بارے میں اس انداز سے تشویش کا اظہار کر رہی تھی، جیسے اس حادثے کے بعد اب رشید کسی کام کا بھی نہیں رہا۔

دو روز میں رشید خاصا بہتر ہو گیا تھا۔

''کیا میں اب گھر جا سکتا ہوں؟'' اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے آپ کو کم از کم دو دن اور یہاں رُکنا چاہئے۔'' ڈاکٹر نے اپنا فیصلہ سنایا۔
اس دن کے بعد مہکار نہیں آئی تھی۔ البتہ لاکھانی پابندی سے آ رہا تھا۔ پہلے دن اسے ماں کا خیال آیا تھا مگر بعد میں اس نے یہ خیال جھٹک دیا تھا۔
پانچ دن ہسپتال میں گزار کے وہ گھر پہنچا تو اس کے گھر کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ گلبہار نے اس کی شکل دیکھتے ہی نفرت بھرے انداز میں ''ہونہہ'' کیا تھا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی تھی۔ وہ لاکھانی کا سہارا لئے اپنے بیڈ روم میں چلا آیا تھا۔ وہاں مہکار سنگھار میز کے سامنے بیٹھی میک اپ کرنے میں مصروف تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے بیزار سے لہجے میں کہا تھا۔
''میرا خیال تھا کہ تم یہاں آنے کے بجائے اپنی ماں کے پاس جاؤ گے۔''
''ایک سال سے میں نے اپنی ماں کی شکل نہیں دیکھی۔'' رشید اس کی بے تکی بات پر اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے نقاہت بھرے لہجے میں بولا۔ ''تو اب کس منہ سے اس کے پاس جاتا؟''
''اُس کی شکل تو تم نے اُس کے کرتوتوں کی وجہ سے نہیں دیکھی نا'' مہکار اُسی انداز میں بولی۔ ''مگر اس حال میں اسے ہی تمہاری دیکھ بھال کرنی چاہئے۔ آخر کو اس کے گھر کا کرایہ دیتے ہو، اس کا خرچہ دیتے ہو...... ماں ہونے کے ناطے اس کا بھی کچھ فرض بنتا ہے...... کچھ ذمے داری بنتی ہے کہ نہیں؟''
''اس وقت میں یہ سب مسائل نہیں سننا چاہتا۔'' رشید نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ مجھے ایک کپ کافی بنا دو۔''
''میں تو ایک پارٹی میں جا رہی ہوں۔'' میک اپ مکمل کر کے مہکار نے اپنے چہرے کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''تم نسیمہ سے کہہ کر کافی بنوا لینا۔'' پھر وہ اپنا پرس اُٹھا کر باہر چلی گئی تھی۔
''لاکھانی! تم نے دیکھا...... بیویاں ایسی ہوتی ہیں؟'' رشید نے غم اور غصے سے دوچار ہوتے ہوئے لاکھانی سے کہا۔ ''شوہر بستر پر پڑا ہے اور اسے پارٹی کی پڑی ہے۔''
''صبر رسید بھائی!...... صبر۔'' لاکھانی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے دھیرج رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی مہکار جیسی عورتوں سے آپ نمرہ جیسی عورتوں والی کھدمت گجاری کی اُمید تو نہیں رکھ سکتے نا۔''
''تم نے ٹھیک کہا۔'' رشید نے ٹھنڈی سانس بھری۔

⊛===⊛===⊛

رمضان آرائیں کراچی پہنچ چکا تھا۔
اس نے کئی بار رشید کو فون کیا تھا مگر اس کا فون بند جا رہا تھا۔ ان دنوں وہ حادثے کا شکار ہو کر ہسپتال میں پڑا تھا۔ تھک کر رمضان اس کے آفس پہنچا تھا اور وہاں سے اس کے کلفٹن والے گھر کا پتہ لے کر وہ مہکار کے گھر پہنچا تھا۔
''کوئی رمضان آرائیں صاحب آئے ہیں۔'' چوکیدار نے لاؤنج میں بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف گلبہار اور مہکار کو اطلاع دی تھی۔ ''رشید صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔''
''رمضان آرائیں؟'' مہکار نے چونک کر گلبہار کی طرف دیکھا۔
''ہائے، وہی سعودیہ والا.....؟'' گلبہار نے حیرت اور مسرت کے ملے جلے لہجے میں مہکار سے کنفرم کیا۔ اس کے لہجے سے شوق ٹپک رہا تھا۔
''میرا تو خیال ہے، وہی ہے۔'' مہکار نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''اب کیا کرنا ہے؟''
''لے، تجھے نہیں پتہ کہ کیا کرنا ہے؟'' گلبہار معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ''دوبئی، سعودیہ کا مرغا ہے......بسم اللہ کر کے حلال کرنا۔'' وہ شوخ لہجے میں کہہ کر بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔
''سچی آپا! تم بھی نا.....'' مہکار نے جلدی جلدی اپنے بالوں کو چھو کر سیٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا بولو، میں ٹھیک لگ رہی ہوں نا؟''
''ہائے ماں صدقے!'' گلبہار محبت بھرے لہجے میں بولی۔ ''تُو تو چاند کا ٹکڑا لگ رہی ہے اس وقت.....اس کلفٹن میں آ کر تو تیرے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے ہیں۔ ٹی شرٹ، جینز اور وہ کیا ہے نا ٹکی کا جوگی پہن کر جب تُو جوگنگ کے لئے نکلتی ہے نا تو پوری انگریزنی لگتی ہے۔''
''بی بی جی! باہر جو صاحب کھڑے ہیں، انہیں کیا کہنا ہے؟'' چوکیدار ان دونوں کی چہلوں سے تنگ آ کر آخر پوچھ بیٹھا تھا۔ ''وہ اُدھر گیٹ پر انتظار کر رہے ہیں۔''
''نا تو.....تُو جا کر اسے بلا لا نا اندر۔'' گلبہار ہاتھ نچا کر بولی۔ ''رشید تو ہسپتال میں پڑا ہے۔ ہم ہی اس سے مل لیتے ہیں۔''
''جی اچھا۔'' چوکیدار تیزی سے باہر کی طرف پلٹ گیا تھا۔
''اے دیکھ!'' چوکیدار کے جاتے ہی گلبہار نے مہکار کی طرف کھسکتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''اس آرائیں کو اب ہاتھ سے نکلنے نہیں دینا ہے۔ اور اس سلسلے میں تو ہمیں اُس کنجر لاکھانی کو بھی کچھ نہیں دینا ہوگا۔ یہ تو خود چل کر، خود سے ہمارے دروازے پہ آیا ہے۔ اس طرح اس کا کمیشن بھی بچا۔''
''پر آپا! ضروری تو نہیں ہے کہ یہ ہمارے قابو میں آ جائے۔'' مہکار نے متفکر لہجے میں کہا۔ ''گھاٹ گھاٹ کا پانی

پہنے ہوئے ہے۔ گھاگ آدمی ہے۔ دیکھا نہیں، اس نے رشید جیسے کائیاں آدمی کے دانتوں تلے پسینے لا دیا تھا۔''

''پر پُتر! پہلے وہ رشید کو 10 کروڑ کی وڈی رقم بھی تو دے چکا ہے۔'' گلبہار نے تدبر بھرے لہجے میں کہا۔ ''رشید بس سے 10 کروڑ نکلوا سکتا ہے، ہم تو اُسے بالکل ہی کنگ کر سکتے ہیں۔''

تب ہی بیش قیمت پردہ سرکا کر پہلے چوکیدار اور اس کے پیچھے رمضان آرائیں لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔ گل بہار نے ترچھی نظر سے اس کا سرتا پا جائزہ لیا۔ سفید کلف لگے شلوار کرتے میں وہ خاصا شریف اور مہذب انسان نظر آ رہا تھا۔ پچاس، پچپن سال کی عمر میں بھی وہ خاصا کرارا اور دم مار لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بچوں کی سی معصومیت ہلکورے لے رہی تھی۔ نک سک سے درست وہ خاصا خوبرو انسان تھا۔ گلبہار کے ساتھ مہکار کو بھی وہ اچھا لگا تھا۔

''مجھے رمضان آرائیں کہتے ہیں۔''

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اپنے سامنے دو عدد سجی بنی حسین و جمیل خواتین کو بیٹھے دیکھ کر وہ گڑبڑا سا گیا تھا، جلدی سے اپنا تعارف کروانے لگا۔

''وہ جی...... مجھے...... رشید...... میرا مطلب ہے عبدالرشید......''

''چھڈو جی، مٹی پاؤ عبدالرشید پر۔'' گل بہار ہاتھ اٹھا کر بیزاری سے بولی۔ ''آپ تشریف رکھو۔'' اُس نے مہکار کے عین مقابل دھرے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور رمضان آرائیں حیران و ہراساں سا صوفے پر ٹک گیا۔ اس کے عین سامنے مہکار اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت براجمان تھی۔

''سلام جی۔'' اس نے قدرے جھک کر ادا سے سلام پیش کیا۔

''آپ کو دیکھ کر یقین ہی نہیں آ رہا کہ آپ ہی رمضان آرائیں ہیں...... آپ تو پورے جینٹل مین ہیں۔ خوبصورت، جوان۔ اور وہ رشید تو آپ کی اتنی برائیاں کرتا تھا۔'' گلبہار نے رمضان کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ سٹپٹا کر بولا۔

''میں؟...... برائیاں؟...... کیسی برائیاں؟''

گلبہار جیسی انجان دلربا سے اپنی تعریف سن کر وہ خوش ہوا تھا مگر رشید جیسے پرانے شناسا کے برائی کرنے پر اسے دکھ پہنچا تھا۔

''وہ جی...... میں نے اس کا کیا بگاڑا؟...... اُس پہ اعتبار کیا اور اُس نے میرے اعتبار کا یہ صلہ دیا۔'' وہ فریادی لہجے میں گویا ہوا۔ پھر ذرا چونک کر بولا۔ ''پر یہ رشید ہے کہاں؟''

''ایسے لوگوں کو جہاں ہونا چاہئے، وہ وہیں ہے۔'' مہکار نے سسپنس برقرار رکھتے ہوئے گول مول انداز میں وضاحت کی۔

''ہیں جی......؟'' رمضان حیران ہوا۔ ''کیا وہ جیل میں ہے؟''

''اجی کہاں؟'' گل بہار نے ''کہاں'' کو لمبا کھینچ کر کہا۔ ''جائے گا...... جیل بھی جائے گا۔ ابھی تو ہسپتال میں پڑا ہے۔''

''اچھا جی؟'' رمضان کو ہسپتال کا سن کر صدمہ پہنچا۔ ''بیمار ہے کیا وہ؟''

''اُس کی چھڈو جی۔ تسی سناؤ...... لسی پیو گے کہ چاء؟''

''نن...... نہیں۔'' رمضان آرائیں سٹپٹا کر بولا۔ ''بس جی رشید سے ملنا تھا اور...... آپ...... آپ لوگ کون ہیں اس کے؟''

''ہائے......کچھ نہ پوچھ میریا ویرا!......گلبہار بین کرنے والے انداز میں ہاتھ لمبا کر کے تقریباً گا کر بولی۔'' یہ میری سگی بہن ہے نا......مہکار......آپ دیکھ رہے ہو نا، کتنی حسین، کتنی کم عمر ہے۔ یہ جھلّی اس کے چکر میں آ گئی۔ آپ تو جانتے ہو وہ کیسا چالاک اور عیار بندہ ہے۔ میرے پیو کی کروڑوں کی جائیداد اور کاروبار ہڑپ کر گیا۔ اب اس کوٹھی پہ اور ایک پلاٹ ہے......اس پر بھی اس کی نظر ہے۔ کیسا ظالم آدمی ہے......میری پھول سے بہن کو مار مار کر ادھ موا کر دیتا ہے۔ اس کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔''

''اچھا......؟'' رمضان نے حیران اور بے یقین نظروں سے مہکار کی طرف دیکھا۔ وہ چہرے پر بے بسی اور کرب سمیٹے سر جھکائے افسردہ سی بیٹھی تھی۔

''سو بار سوچا، مہکار سے کہوں اس سے خلع لے لے......طلاق لے لے۔''

''اچھا...'' رمضان نے ایک بار پھر حیرت سے مہکار کی طرف دیکھا۔

''بس یہ نہیں مانتی۔'' گلبہار نے قریب دھرے ٹشو پیپر باکس سے ٹشو پیپر نکال کر آنکھیں پونچھیں۔ ''جھلّی کہتی ہے، نہ باپ، نہ کوئی بھائی، نہ کوئی آگے پیچھے......ہم تنہا اور مظلوم عورتیں کس طرح اس ظالم انسان کا مقابلہ کر سکیں گی؟''

''نئیں جی نئیں......آپ کو تو اپنے حق کے لئے آواز اُٹھانی چاہئے۔ میرا مطلب ہے کوئی قدم اُٹھانا چاہئے۔'' رمضان نے براہِ راست مہکار کو مخاطب کیا۔

''اب آپ ہی بتائیے۔'' مہکار اپنی جگہ سے اٹھ کر رمضان کے قریب آ گئی۔ اس کے لباس سے اُٹھتی بھینی بھینی خوشبو رمضان کے مشامِ جان کو راحت اور تازگی بخشتی محسوس ہو رہی تھی۔

''کلّی زنانیاں کیا کر سکتی ہیں؟......اور ویسے بھی ہم جیسی شریف زادیاں کچھ کر بھی نہیں سکتیں۔ میں تو بہت ہی اکیلی ہوں رمضان صاحب!......ہاتھ تھامنے کے لئے کوئی بندہ نہیں۔ رونا چاہوں تو سر رکھ کر رونے کے لئے کوئی کندھا نہیں۔'' وہ چہرے پر ہاتھ رکھ کر بے اختیارانہ سسکیاں لینے لگی تھی۔

''دیکھیں جی۔'' رمضان اس کے ڈائیلاگ اور آنسوؤں سے بے حد متاثر لگ رہا تھا۔ ''اصل سہارا تو وہ اوپر والا ہے۔ مگر آپ مجھ کو اپنا......''

''خدا کے لئے بھائی مت کہیے گا۔'' مہکار نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر اس کا جملہ درمیان میں ہی کاٹتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھائی کی نہیں، کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جو میرے زخمی دل پر پیار کا مرہم رکھ سکے۔'' مہکار نے رمضان کے قریب کھسکتے ہوئے جذباتی انداز میں سرگوشی کی اور رمضان کا رنڈوا دل ایک نئے انداز سے دھڑک اُٹھا۔

''مگر......آپ تو......رشید کے......نکاح میں......'' رمضان ہکلایا۔

''اس کی آپ فکر مت کریں۔'' گلبہار بااعتماد انداز میں مسکرائی۔ ''وہ تو پہلے ہی دس بار طلاق کا کہہ چکا ہے۔ خوشی خوشی جان چھڑا لے گا۔ خود سے نہیں مانا تو میں اپنی بہن کو خلع دلا دوں گی۔ مگر اب اسے اس جہنم میں جلنے نہیں دوں گی۔''

''اوہ۔'' رمضان نے کسمسا کر مہکار کی طرف دیکھا۔

''جب سامنے جنت ہو تو بھلا کس کافر کا دل جہنم میں رہنے کو چاہے گا؟'' مہکار نے شرمیلی نظروں سے رمضان کی طرف دیکھتے ہوئے شرمیلی مسکراہٹ سے کہا۔ پھر خود ہی گھبرا کر بولی۔ ''پتہ نہیں، میں جھلّی کیا کیا کہے جا رہی ہوں۔ آپ کو دیکھ کر پتہ نہیں، اتنے اپنے پن کا احساس کیوں ہوا کہ میں یہ بھول ہی گئی کہ بھلا آپ کیا سوچ رہے ہوں گے۔ آپ نے ہماری باتوں کا برا تو نہیں مانا؟''

''نن......نئیں جی......برا کیا ماننا؟......سچ پوچھو تو آپ لوگوں سے مل کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔''

"تو اس خوشی میں آج رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ ہی کھائیں گے۔" گلبہار نے اعلان کیا۔
"او نہیں جی نہیں...... بلا وجہ آپ کو تکلیف ہوگی۔" رمضان جلدی سے بولا۔
"اپنوں کے لئے کچھ کر کے تکلیف نہیں، خوشی ہوتی ہے۔" مہکار نے رمضان کے کالر کو درست کرتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں سرگوشی کی۔ "آپ ہمارے ساتھ روٹی کھاؤ گے تو ہمیں اچھا لگے گا۔"
"روٹی ہی کھانی ہے تو کہیں باہر چل کر کھا لیتے ہیں۔" رمضان نے تجویز پیش کی، جسے گلبہار اور مہکار نے ہلکے سے پس و پیش کے بعد قبول کر لیا تھا۔

اگلے دو دنوں میں گلبہار اور مہکار نے مل کر رمضان کو پوری طرح جال میں پھنسا لیا تھا۔ عجب حادثہ تھا۔ قاتل قتل کر کے خوش تھا تو مقتول بھی قتل ہو کر پھولے نہ سما رہا تھا۔ تین جوان شادی شدہ بیٹیوں کی بوڑھی ماں کے مرنے کے بعد رمضان آرائیں نے تو کبھی بھولے سے بھی نہیں سوچا تھا کہ یوں اچانک سرِ راہ اُسے مہکار جیسی گلبدن، غنچہ دہن، شیریں سخن دلربا مل جائے گی۔ وہ رشید کے گھر اپنے قرض کا تقاضا کرنے پہنچا تھا، مگر یہاں آ کر وہ محبتوں کا مقروض ہو گیا تھا۔ چاہتوں کے پھولوں جیسے بوجھ تلے دب کر وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا اور خوش و خرم محسوس کر رہا تھا۔ ایک حسین نوجوان، ایک شاندار گھر کی مالکہ جس کے پاس ایک بیش قیمت پلاٹ کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ رمضان آرائیں کی جو عمر تھی، اس عمر میں ایسی طرح دار اور مال دار عورت مل جائے تو اس کا ہواؤں میں اُڑنا ایسا کچھ ناجائز بھی نہیں۔

"آپ نے رشید سے خلع کی بات کی؟" اس شام رمضان آرائیں نے قدرے شرمیلے انداز اور دبے دبے لہجے میں گلبہار سے پوچھا تھا۔ دراصل وہ جلد از جلد مہکار کو اپنے ساتھ دوبئی لے جانا چاہتا تھا۔ وہاں اس کا کاروبار اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ تو رشید سے اپنی رقم نکلوانے آیا تھا مگر ہیرے جیسی مہکار کو پا کر وہ رقم اسے بالکل بے معنی اور معمولی لگنے لگی تھی۔
"آپ پہلے اس سے اپنی رقم کی بات کر لو۔" گلبہار نے دھیمی آواز میں کہا۔ "خلع یا طلاق اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ کام تو ہونا ہی ہے۔ پہلے آپ کا کام ہو جائے تو اچھا ہے۔"
"وہ تو زخمی ہو کر ہسپتال میں پڑا ہے۔ آپ کہہ رہی تھیں، اب اُس کے پاس کوئی پائی پیسہ بھی نہیں ہے..... تو بھلا وہ میری رقم کدھر سے دے گا؟..... مٹی پاؤ جی۔"
"ہیں؟" گلبہار کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ "دس کروڑ پہ آپ مٹی ڈال دیں گے؟"
"تے ہور۔ آپ ہی بتاؤ۔ کیا، کیا جا سکتا ہے؟" رمضان بے بسی سے مسکرایا۔ "میں تو کہتا ہوں دفع کرو جی اسے بھی اور اس کے قرض کو بھی۔ آپ مہکار بیگم کی اس سے جان چھڑائیں اور آپ دونوں میرے ساتھ دوبئی چلیں۔ اُدھر میرے پاس بہ بڑا اولا ہے۔"
"چلیں جی، جیسی آپ کی خوشی۔" گلبہار مجبور سے انداز میں مسکرائی۔ "آج شام کو رشید گھر آنے والا ہے..... میں بات کروں گی اس سے۔ مگر آپ ایک مہربانی کریں۔ آپ مہکار کو اپنے ساتھ لے جایئے گا۔ وہ طلاق کے نام سے کانپ اُٹھتی ہے۔ کہتی ہے، زمانہ کیا کہے گا۔ آپ اپنے ساتھ لے جا کر اسے کچھ شاپنگ وغیرہ کروا کر اس کا دل بہلا دینا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ کملی سونے کے گہنے خرید کر بہت خوش ہوتی ہے۔"
"ایسا ہے جی تو آپ بالکل فکر ہی نہ کریں۔ میں ٹھیک پانچ بجے اسے لینے آجاؤں گا۔"
ادھر رشید، لاکھانی کے ساتھ گھر پہنچا تھا، اُدھر مہکار نوک پلک سنوار گھر سے نکل گئی تھی۔
اب رشید بالکل ٹھیک تھا۔ ہلکی پھلکی سی کمزوری تھی۔ توقع تھی کہ دو چار دن میں یہ کمزوری بھی جاتی رہے گی۔ اس کی گاڑی تو پچک کر رہ گئی تھی۔ اکاؤنٹ میں اتنا پیسہ نہیں تھا کہ وہ نئی گاڑی خرید سکتا۔ اس لئے بستر پر لیٹا حالات پر غور کرتا

رہا تھا۔
مہکار اور گلبہار کے روّیے یکسر تبدیل ہو چکے تھے۔
''تم دیکھ رہے ہو لاکھانی؟'' رشید نے شکایتی نظروں سے لاکھانی کی طرف دیکھ کر کہا تو لاکھانی جلدی سے سٹپٹا کر بولا۔
''رسید بھائی! آپ کے اب کبھی باپ نہ بن سکنے کی کھبر (خبر) نے اسے مایوس کیا ہے۔''
''ارے تو وہ کون سے بچے پیدا کرنے میں انٹرسٹڈ تھی۔'' رشید لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر بولا۔ ''اسے نہ ماں بننے کی خواہش ہے نہ میرے باپ نہ بننے کا کوئی غم...... وہ ایسی عورت ہے جو صرف اپنی ذات سے پیار کرنا جانتی ہے۔''
''پھر بھی رسید بھائی!'' لاکھانی نے زور ڈالنے والے انداز میں سر ہلایا۔
رشید چپ ہو گیا تھا۔ یہ نقص تو اب اس میں بہر حال پیدا ہو ہی چکا تھا۔ جب وہ اس وصف سے مالا مال تھا تو کبھی بھی اسے بچے کی خواہش نہیں ہوئی تھی...... مگر اب وہ اکثر بچے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔
'کیا کہہ رہا تھا وہ ڈاکٹر...... آپ صاحبِ اولاد ہوں گے۔ بلکہ اب تو بچے بھی بڑے ہو چکے ہوں گے...... کاش ایسا ہوتا......' زندگی میں پہلی بار اسے یکا یک اولاد کی پیاس محسوس ہوئی تھی۔ اور وہ اپنی اس پیاس پر خود ہی حیرت زدہ ہو گیا تھا۔
مہکار کو نکلے کافی دیر بیت چکی تھی۔
وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح ماربل کے وارنڈے میں ٹہل ٹہل کر اس کا انتظار کر رہا تھا۔
''یہ مہکار کہاں گئی ہے؟'' اس نے نوکرانی نسیمہ سے پوچھا۔
''پتہ نئیں جی...... بڑی بی بی کو پتہ ہوگا۔'' نسیمہ کے جواب پر وہ جل کر بولا۔
''میں نے تجھ سے مہکار کا پوچھا تھا...... مشورہ نہیں مانگا تھا۔
''وہ جی...... میں تو......'' وہ گڑبڑا کر بولی۔ ''ہاں، یاد آیا۔ اُس دن جو صاحب آئے تھے نا، وہ انہی کے ساتھ گئی ہیں۔''
''صاحب؟'' رشید ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ چونک کر اس نے نسیمہ کی طرف دیکھا۔ ''کون سے صاحب؟''
''وہ جی نام تو مجھے نئیں پتہ۔'' نسیمہ نے اُنگلیوں پہ آنچل لپیٹتے ہوئے کہا۔ ''وہ گیٹ والا چوکیدار ہی انہیں اندر لایا تھا۔'' آپ اسی سے پوچھ لیں۔''
''ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔'' رشید کے دل میں عجیب سی کھٹک سی جاگ اُٹھی تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں مہکار سے کون ملنے آیا تھا؟ اور یہ کہ آج بھی وہ اس بات کا لحاظ کئے بغیر کہ وہ ابھی ابھی ہسپتال سے گھر پہنچا ہے، تیار ہو کر، سج دھج کر کسی کے ساتھ گھومنے نکل گئی تھی۔
مہکار نے ہمیشہ ہی اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اب صرف اور صرف اسی کی ہے۔ اس نے بھی تہہ دل سے اس کی اس بات کا یقین کر لیا تھا اور اس سوا سالہ ازدواجی زندگی میں کبھی بھولے سے بھی اس نے مہکار پر شک نہیں کیا تھا۔ اس نے بھی اپنے کسی عمل سے اسے شک کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔
مگر آج اس پل اس کے دل میں بالکل اچانک ہی شک کا سنپولیا پھن پھیلا کر بیٹھ گیا تھا۔ اپنے شک کو دور کرنے کی خاطر وہ آہستگی سے گیٹ کی طرف چل دیا تھا۔
''سلام صاب!'' ادھیڑ عمر پٹھان چوکیدار اسے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''اب ٹھیک ہوں۔'' رشید نے رُوکھے لہجے میں جواب دے کر سوالیہ نظروں سے چوکیدار کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔''گل خان! دو تین دن پہلے کون آیا تھا؟''

''دو تین دن پہلے.....'' چوکیدار نے کنپٹی پر انگلی رکھ کر آنکھیں اوپر چڑھا کر سوچا۔''ہاں یاد آیا.....کوئی رمضان صاب آیا تھا۔''

''رمضان؟'' رشید یوں اُچھلا جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔اس کے ایکسیڈنٹ کے بعد سے رمضان کا کوئی فون نہیں آیا تھا۔وہ خود بھی حیران تھا کہ کہاں تو وہ کراچی آنے کی دھمکیاں دے رہا تھا، کہاں بالکل دم سادھ کر بیٹھ گیا۔

''تمہیں اچھی طرح یاد ہے، اس کا نام رمضان ہی تھا؟'' یقین آ جانے کے باوجود رشید نے بے یقین لہجے میں سوال کیا۔

''جی صاب! ام کو بالکل یاد ہے۔'' پٹھان سینہ تان کر پُر یقین لہجے میں بولا۔''اس کا نام رمضان آرائیں تھا۔''

اب تو شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ بچی تھی۔رشید نے پیشانی پہ پھوٹ آنے والے پسینے کو ہاتھ سے صاف کیا اور دھیمی آواز میں سوال کیا۔

''کیا وہ آج بھی یہاں آیا تھا؟''

''صاب! وہ تو اس دن کے بعد سے تقریباً روز آرہا ہے۔'' چوکیدار نے قدرے مسرور لہجے میں بتایا۔''ایک دن تو وہ چھوٹا بی بی کو شاپنگ بھی کروانے لے گیا تھا۔ایک شام کو ڈنر کے لئے بھی لے گیا تھا۔ بڑی بی بی جی بھی ساتھ گئی تھیں۔ آج بھی وہی آیا تھا۔چھوٹا بی بی صاب اس کے ساتھ گیا ہے۔''

''میرے خدا! رشید کو اپنا سر پھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ابھی وہ پوری طرح صحت مند نہیں ہوا تھا۔ڈاکٹرز نے اُسے آرام کرنے اور ٹینشن سے دُور رہنے کا مشورہ دیا تھا۔مگر وہ تھا کہ خود سے ٹینشن ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔

وہ آہستگی سے چلتا اپنے کمرے میں آ گیا۔اسے بہت نقاہت محسوس ہو رہی تھی، اسی لئے وہ کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا تھا۔

لاکھانی اسے گھر پہنچانے آیا تھا۔مہکار اُسی کے سامنے بن ٹھن کر نکلی تھی۔اُس کے انداز سے لاکھانی کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ جب سے رشید ہسپتال میں تھا، لاکھانی اس کے ساتھ تھا۔اس دوران وہ جب بھی مہکار کے گھر آیا، اس نے گلبہار اور مہکار کے روّیوں میں عجیب پراسراری سی تبدیلی محسوس کی تھی۔ وہ کوشش کے باوجود اس پراسراریت کی وجہ نہیں جان سکا تھا۔

''لاکھانی! تم دیکھ رہے ہو؟'' رشید کے شکستہ سے لہجے میں کہنے پر لاکھانی نے مجبور سے جواب دیا تھا۔

''اب اپن کیا بولوں رسید بھائی!''

کچھ دیر بعد وہ کام کا کہہ کر اور جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے رشید کے کمرے سے باہر آیا تھا۔اس کا خیال تھا کہ وہ دیکھ سکے گا کہ مہکار کس کے ساتھ جا رہی ہے۔مگر اس کے نکلنے میں شاید کچھ دیر ہو گئی تھی۔ مہکار جا چکی تھی۔

''چھوٹی بی بی کس کے ساتھ گئی ہے؟'' اس نے چوکیدار سے سوال کیا تھا۔

''کس کے ساتھ گیا ہے مطلب؟'' چوکیدار نے نسوار کی ڈبیہ کھولتے ہوئے سوال کیا۔

''میرا مطلب ہے اپنے ڈرائیور کے ساتھ...... یا کوئی لینے آیا تھا؟'' لاکھانی نے پوچھا۔

''ہاں، وہی لینے آیا تھا نا.....جس کا بی ایم ڈبلیو گاڑی ہے۔'' چوکیدار نے نسوار کا گہری نظر سے معائنہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا نام ہے؟......میرا مطلب ہے اس آدمی کا کیا نام ہے؟'' لاکھانی نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔

''ام کو یاد نہیں۔'' چوکیدار نے نسوار کی گولی بنا کر نچلا ہونٹ کھینچ کر اس کے اندر رکھتے ہوئے بے نیازی سے جواب دیا۔ ''البتہ اتنا معلوم ہے، وہ ادھر سعودیہ یا دوبئی سے آیا ہے۔ مگر تم کیوں پوچھتا ہے؟''

'اوہ......تو وہ رمضان آرائیں ہے۔' لاکھانی نے سلگتے ذہن سے سوچا۔ گلبہار، مہکار اور اس کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ رمضان کو مہکار تک پہنچانے میں لاکھانی مدد کرے گا اور ہمیشہ کی طرح اس بار بھی تینوں مل بانٹ کر کھائیں گے۔ مگر قسمت سے رمضان خود ہی مہکار تک پہنچ گیا تھا اور مہکار نے لاکھانی کو اس بزنس ڈیل سے دودھ سے مکھی کی طرح نکال پھینکا تھا۔

'کمینی اکیلے ہی سب کچھ ہڑپ کرنا چاہتی ہے۔' لاکھانی نے دل جلے انداز میں سوچا اور پاؤں پٹختا رشید کے پاس جا پہنچا۔

''رسید بھائی! آپ کا کھیال ٹھیک ہے۔'' اُس نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''مہکار کا جرور کسی اور سے چکر چل رہا ہے۔''

''تمہیں یقین ہے؟'' یقین تو خود اسے بھی تھا مگر اپنی تشفی کی خاطر اس نے بے یقین لہجے میں لاکھانی سے پوچھا۔

''کیا واقعی وہ اب بھی ایسا کر سکتی ہے؟''

''اس نے ہمیسہ ہی ایسا کیا ہے۔'' لاکھانی تدبر سے مسکرایا۔

''پہلے کی بات اور تھی۔'' رشید غصے سے بولا۔ ''پہلے وہ ایک بازاری عورت تھی۔ یہ سب کرنا ہی اس کا کام تھا۔ مگر اب وہ میری بیوی ہے.....میں نے کیا نہیں کیا اُس کے لئے..... یہ گھر، وہ پلاٹ، کروڑوں کی وہ رقم...... سب کچھ اس کے حوالے کر دیا۔ اس کی خاطر ماں کو چھوڑ دیا......اور اب......'' فرطِ اذیت سے رشید اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔

''اب اس کی نیچر یہی ہے تو کوئی کیا کرے؟'' لاکھانی نے افسردگی سے سر ہلایا۔

''مگر میں اسے یہ سب نہیں کرنے دوں گا۔'' رشید کھولتے لہجے میں بولا۔ ''میں اپنی کوٹھی کو کوٹھا نہیں بننے دوں گا۔ آج ذرا اسے آلینے دو.....دیکھو میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں۔''

''ابھی آپ پوری طرح صحت مند نئیں ہوئے ہو۔'' لاکھانی دھیمے لہجے میں بولا۔ ''آپ کو آرام کرنا چاہئے۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' رشید بیڈ سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''دل و دماغ میں درد و اذیت کے سوا کہیں اور کوئی تکلیف نہیں ہے۔''

وہ بیڈ سے اٹھ کر کھڑکی میں آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کھڑکی سے گیٹ کا کچھ حصہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر کھڑکی میں کھڑا گیٹ کو گھورتا رہا تھا، پھر تھک کر دوبارہ سے بستر پر آ بیٹھا تھا۔

وقت آہستہ روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ گھنٹے کی سُوئی نے ایک بجے سے تجاوز کیا تو رشید بے چین ہو کر کمرے سے باہر آ گیا تھا۔ لاکھانی اس کے ساتھ ہی تھا۔ گیٹ کے سامنے ایک چھوٹے ایریا میں گھاس لگی تھی۔ پھول دار پودے اور بیلیں لہرا رہی تھیں۔ وہ مضطرب سے انداز میں گھاس پہ ٹہلنے لگا۔ اُسے مہکار سے اتنی جلدی، اتنی بے وفائی کی توقع نہ تھی۔ وہ تو سمجھ بیٹھا تھا کہ مہکار اپنی تمام عادات و اطوار تیاگ کر اس کی وفادار بیوی بن گئی ہے اور اب تمام عمر اسی وفا اور چاہت سے اسی کے ساتھ گزارے گی۔ مگر اس کا رنگ تو اس قدر کچا نکلا کہ آزمائش کی پہلی دھوپ میں ہی اُتر گیا۔

تب ہی گیٹ پر ہارن کی آواز سنائی دی۔

چوکیدار نے لپک کر گیٹ کھولا تھا۔ رمضان کلف لگے کُرکُراتے کرتے شلوار سوٹ میں ملبوس تیزی سے دروازہ کھول کر باہر آیا تھا اور سامنے کی جانب سے لپک کر مہکار والے دروازے تک پہنچا تھا۔ پھر اس نے نہایت مہذب انداز میں مہکار کے لئے گاڑی کا دروازہ وا کیا تھا۔ اور مہکار خوشبوئیں لٹاتی، مسکراتی، ناز و انداز سے باہر نکلی تھی۔

''اب کب آؤ گے؟'' اس نے رمضان کے عین مقابل رک کر بے قرار لہجے میں سوال کیا تھا۔ ''سچ آپ نے ایسا جادو کیا ہے کہ اب تو آپ کے بغیر چند لمحے گزارنا بھی اوکھا لگتا ہے۔''

''کیا واقعی؟'' رمضان کی باچھیں کِھل گئیں۔ ''میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ عمر کے اس حصے میں تم جیسی حسین......''

''اب چھڈو جی۔'' مہکار نے اپنا نازک ہاتھ اس کے سینے پر رکھا اور ساتھ ہی اپنا سر بھی اس کے کشادہ سینے پہ ٹکاتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''ویسے تو کچھ بھی نہیں، یہ آپ کی نظرِ عنایت ہے۔ جو کنکر کو موتی سمجھ رہی ہے۔''

رمضان نے بے اختیارانہ اپنے بازو مہکار کے گرد لپیٹ کے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔

''مہکار......!'' رات کے مہکتے مہکتے مدھم اُجالے اور مسحور کن خاموشی میں رشید کی دھاڑتی آواز نے رومان پرور طلسم کو ایک چھناکے سے توڑ دیا تھا۔ رمضان نے گھبرا کر بازوؤں کا حصار سمیٹ لیا تھا اور مہکار سیدھی ہو گئی تھی۔

''بدکار عورت...... میرے گھر میں، میرے نکاح میں رہ کر تُو یہ سب کر رہی ہے۔'' رشید لان کی نیم تاریکی سے پورچ میں پھیلے مدھم اُجالے میں آتا ہوا بولا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت جھلک رہی تھی اور چہرے پر غصے اور دیوانگی کے آثار تھے۔ ''میں تجھے جان سے مار دوں گا۔'' وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

''پرے ہٹ۔'' مہکار نے نفرت سے اسے دور دھکیل دیا۔ ''تیرے سامنے ہی تو ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ تُو اب تمام عمر باپ نہیں بن سکتا۔ تجھ جیسے نامرد کے ساتھ رہ کر اب میں کیا کروں گی؟''

''حرام زادی......کتیا......'' نامردی کے طعنے نے رشید کے اندر کے مرد کو بلبلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ تیر کی تیزی سے آگے بڑھا اور بھرپور انداز میں مہکار کے رخسار پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔

وہ چکرا کر رمضان پہ جا گری۔

اس وقت تک گلبہار بھی آوازیں سن کر باہر آ گئی تھی۔ یہ منظر دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ وہ دھاڑتی ہوئی آگے بڑھی۔

''کمینے!......رذیل! تیری یہ مجال۔ تُو نے میری دھی رانی پر ہاتھ اُٹھایا۔ میں تیرا ہاتھ توڑ دوں گی۔''

''ایک منٹ آپا!'' مہکار رخسار سہلاتی ہوئی بولی۔ ''آپ ابھی رُکو......اس سے میں خود نمٹ لوں گی اسے یہ چانٹا بہت مہنگا پڑے گا۔'' وہ چوکیدار کی طرف پلٹ کر بولی۔ ''گل خان! اس بدذات کو اٹھا کر گیٹ سے باہر پھینک دو۔''

''کیا......؟'' رشید حیران ہوا۔ ''یہ میرا گھر ہے......''

''نا یہ تیرے پیو کا گھر ہے؟'' مہکار کمر پہ ہاتھ رکھ کر اس کی طرف مڑی۔ ''یہ میرا گھر ہے۔ میرے نام ہے۔ یہاں تیرا کچھ بھی نہیں۔ تجھ جیسے کنگلے نامرد سے اب میں ایک لفظ بھی بولنا نہیں چاہتی، دو ٹکے کے معمولی انسان! تُو اپنی اوقات بھول گیا ہے۔ اب تجھ سے میرا وکیل ہی بات کرے گا۔ تیری لنگوٹی تک نہ اُتر وا دی تو میرا نام مہکار نہیں۔''

چوکیدار جارحانہ انداز میں آگے بڑھا اور رشید کو دھکیلتے ہوئے گیٹ سے باہر کر دیا۔ لاکھانی خاموشی سے خود ہی اس کے ساتھ کوٹھی سے باہر آ گیا تھا۔

گیٹ بند ہو چکا تھا۔

رشید آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے بند گیٹ کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

''ابھی چلو۔'' لاکھانی نے گہری سانس لے کر اسے ٹہوکا دیا۔

''کہاں؟'' رشید نے خواب کے سے لہجے میں پوچھا۔ ''میرے پاس اب بچا کیا ہے؟......اپنا پلاٹ، ساری

دولت، سب کچھ میں اس بدذات عورت پر لٹا چکا..... اکاؤنٹ میں چند لاکھ روپے پڑے ہیں اور.....“

”ابھی تو اماں جی کے گھر چلو۔“ لاکھانی بولا۔

”اماں۔“ کتنے ہی عرصے بعد رشید کے لبوں پر سلطانہ کا نام آیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ سر جھکائے سلطانہ کے سامنے بیٹھا تھا۔ گو کہ وہ پچاس کے پیٹے میں تھا مگر ماں کے لئے تو وہ اب بھی معصوم اور ننھا سا بچہ تھا۔ مہکار سے شادی کے بعد رشید، ماں سے ایک دم فرنٹ ہو گیا تھا۔ سال بھر سے تو اس نے ماں کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ البتہ گھر کے کرائے اور خرچ کی مد میں ایک مناسب رقم وہ سلطانہ کے لئے پابندی سے مہیا کرتا تھا۔ اس کے باوجود سلطانہ اس سے سخت ناراض تھی اس نے اس کا بہت دل دُکھایا تھا۔ مگر آج اپنے لختِ جگر کو اپنے سامنے یوں پشیمان اور اُجڑا ہوا بیٹھا دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا تھا اور وہ اپنی ساری ناراضگیاں اور رنجشیں بھول کر آگے بڑھی اور رشید کا جھکا ہوا سر اپنے سینے میں چھپا لیا۔ اور ماں کے سینے پر سر رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ سلطانہ کی آنکھیں بھی گنگا جمنا بہار ہی تھیں۔

یہ پشیمانی کے آنسو تھے۔ پچھتاوے، محرومی اور بے بسی کے آنسو تھے۔ کافی دیر ماں بیٹا یوں ہی آنسو بہاتے رہے تھے۔ جب دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تو سلطانہ، رشید کے بالوں میں ممتا بھرے انداز میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

”رشید! میرے بچے! اب آگے کیا سوچا ہے؟“

”اب کل ہی دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔“ رشید نے اندیشوں بھری آواز میں جواب دیا۔

مہکار نے دھمکی دی تھی کہ وہ رشید کی لنگوٹی تک اُتروا لے گی۔

اور وقت نے ثابت کر دیا کہ اس کی دھمکی بے معنی نہ تھی۔ اپنا بیش قیمت پلاٹ وہ مہکار کے نام پہلے ہی کر چکا تھا۔ کوٹھی اور نئی کار مہکار کے نام سے خریدی گئی تھی۔ اور اپنے اکاؤنٹ سے ایک خطیر رقم وقفے وقفے سے وہ پہلے ہی مہکار کے اکاؤنٹ میں منتقل کر چکا تھا۔ اب اس کے اکاؤنٹ میں محض پچاس پچپن لاکھ روپے بچے تھے، جو دھیرے دھیرے وکیلوں کے چکر میں اُڑنے لگے۔ اور آخری جمع پونجی مہکار کے حق مہر کی مد میں چلی گئی۔

مہکار سے جان تو چھوٹ گئی۔ مگر اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ روزِ اوّل کی طرح بالکل قلاش اور خالی ہاتھ رہ گیا تھا۔

”یہ سب ہمارے ساتھ شاید اس لئے ہوا کہ ہم نے اس بے زبان اور نیک لڑکی پر ظلم کیا۔“ اس شام سلطانہ اس کے سامنے بیٹھی سر جھکائے دھیمی آواز میں اعترافِ جرم کر رہی تھی۔ ”میں نے اس نیک اور باکردار لڑکی پر الزام لگایا۔“

”الزام؟“ رشید نے اپنا جھکا سر چونک کر اُٹھایا اور حیرت و بے یقینی سے ماں کی طرف دیکھا۔

”ہاں بیٹا! میں بھی کم گناہ گار نہیں۔“ سلطانہ کی آواز پچھتاوؤں کی نمی میں بھیگی ہوئی تھی۔ ”جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ نمرہ تو ایک پاکباز، نیک اور صالح لڑکی تھی۔ میں نے اس پر جھوٹا الزام لگایا۔ وہ تمہارے بچے کی ہی ماں بننے والی تھی۔ مگر اسے تمہارے دل سے اُتارنے کے لئے میں اتنا گر گئی۔“

”اماں.....“ رشید نے شدتِ ضبط سے دانتوں تلے نچلا ہونٹ دبا لیا۔ ”میں نے اپنے بچے کو..... اپنا ماننے سے انکار کر دیا.....شاید اسی لئے خدا نے مجھے اب کبھی بھی باپ بننے کے لائق نہیں رکھا۔“

”میرے بچے! یہ تو اُس اوپر والے کا انعام ہے۔“ سلطانہ جلدی سے بولی۔ ”کہ اس مرض میں مبتلا کرنے سے پہلے اس نے تجھے باپ بنا دیا تھا۔ اب تُو باپ بننے کے قابل ہو یا نہ ہو..... تُو پہلے سے صاحبِ اولاد ہے۔ نمرہ کے بچے کا تُو ہی باپ ہے۔“

''میرا بچہ.....'' رشید نے کرب بھری بے بسی سے اپنا سر دیوار سے ٹیک دیا۔ اس کی آنکھوں سے ایسا درد جھانک رہا تھا کہ سلطانہ کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔

''تیرا بچہ..... تجھے ضرور ملے گا۔'' وہ حوصلہ افزا انداز میں بولی۔ ''تم حوصلہ رکھو۔ ہم دوبارہ سے نمرہ کو اور تمہارے بچے کو اس گھر میں لا سکتے ہیں۔''

رشید نے بے بس نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ ''کیسے ممکن ہے یہ؟''

''ہاں چندا! ابھی بھی ایک راستہ ہے۔'' سلطانہ یقین بھری آواز میں بولی۔

''اب نہ کوئی راستہ ہے..... نہ کوئی منزل۔'' رشید کی آواز میں حسرت ہی حسرت تھی۔

''نہیں رشید! تُو چاہے تو ہم ایک بار پھر نمرہ اور اس کے بچے کو اس گھر میں لا سکتے ہیں۔'' سلطانہ کی آواز میں اُمید ہلکورے لے رہی تھی۔

''طلاق کے بعد..... اب بھی......؟'' رشید نے بھنویں سکیڑ کر ماں کو دیکھا۔

''اس طلاق کا تم کو پتہ ہے یا مجھے..... تیسرا تو کوئی بھی گواہ نہیں ہے۔ ہم یہ مانیں گے ہی نہیں کہ تم نے اسے طلاق دی تھی۔ وہ اپنے بھائی کے گھر ہوگی۔ تم کل ہی جا کر حسنہ کو لوبھ لالچ دے کر اور اسے زور زبردستی دکھا کر گھر واپس لے آؤ۔ اب میں اور تم اسے بہت پیار سے رکھیں گے۔ دیکھنا چند دنوں میں ہی سارے زخم بھر جائیں گے۔ سارے شکوے ختم ہو جائیں گے..... سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے نمرہ جیسی اچھی، خدمت گزار، فرمانبردار بہو مل جائے گی اور تجھے اچھی بیوی اور بڑھاپے کا سہارا بچہ مل جائے گا۔''

سلطانہ کی بات میں دم تھا۔ بات قابلِ غور اور اُمید افزا تھی۔

وہ مہکار کے عشق میں مبتلا ہو کر اسے بیوی بنا کر گھر تو لے آیا تھا..... مگر کبھی بھی، ایک لمحے کو بھی وہ نمرہ کو نہ بھول پایا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ہر ہر بات اُسے یاد آئی تھی۔ اور آج وہ یہ سچائی جان گیا تھا کہ شاید زندگی میں پہلی اور آخری بار اس نے کسی سے محبت کی تھی تو وہ نمرہ سے کی تھی۔ اس بات کے ادراک کے ساتھ ہی اس کا دل ایک نئے انداز سے دھڑک اٹھا تھا۔ کبھی بھی باپ نہ بن سکنے کا دکھ اب اس احساس کے ساتھ کہ نمرہ کی گود میں موجود بچے کا وہ باپ ہے، اسے ایک انوکھی سی الوہی خوشی دے رہا تھا۔

وہ ایک نئے جذبے سے اٹھا اور حسنہ کے گھر کی طرف چل دیا۔

دستک دینے پر دروازہ حسنہ نے ہی کھولا تھا۔ اور اسے اپنے سامنے پا کر وہ کچھ حیران اور کچھ پریشان ہو گئی تھی۔

''میں اپنی بیوی کو لینے آیا ہوں۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

حسنہ نے اسے سر تا پا غور سے دیکھا اور ذرا ہی دیر میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ٹھوکریں کھا کر اب اسے نمرہ کی قدر ہوئی ہے۔

مگر نمرہ کہاں ہے؟ اس کا تو خود حسنہ کو بھی علم نہ تھا۔

''کون سی بیوی؟'' اُس نے کڑے تیوروں سے رشید کی طرف دیکھا۔

''نمرہ۔'' رشید نے اعتماد بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''اسے تو تم نے طلاق دے دی تھی۔'' حسنہ نے رُوکھے لہجے میں کہا۔

''نہیں، یہ درست نہیں ہے۔'' رشید اس سے نظریں چراتا ہوا بولا۔ ''میں نے اسے غصے میں گھر سے تو نکالا تھا مگر طلاق نہیں دی تھی۔ وہ اب بھی میری بیوی ہے..... میرے بچے کی ماں۔ میں اسے لینے آیا ہوں۔''

حسنہ نے برماتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ خوب سمجھ رہی تھی کہ وہ صاف جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے نہ صرف نمرہ کو طلاق دی تھی بلکہ اس کے پیٹ میں موجود بچے کا باپ ہونے سے بھی انکاری تھا۔ اور آج کتنی ڈھٹائی سے اپنی ان دونوں باتوں سے انحراف کر رہا تھا۔

''مگر نمرہ تو یہاں نہیں ہے۔'' حسنہ نے لاپروائی کے اظہار کے لئے کندھے اچکائے۔ ''وہ تو اُسی رات کو یہاں سے چلی گئی تھی۔ کیونکہ ہم نے ایک طلاق شدہ لڑکی کو اپنے گھر میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔''

''میں نے کہا نا، میں نے اسے طلاق نہیں دی تھی۔'' رشید قدرے تنک کر بولا۔ ''یہ ٹھیک ہے، نشے میں اور غصے میں، میں نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ مگر یہ بالکل غلط ہے کہ میں نے اسے طلاق دی تھی، یا دی ہے۔''

حسنہ گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی، منہ سے کچھ نہیں بولی تھی۔ وہ رشید کے حالات سے ہمیشہ ہی واقف رہی تھی۔ اسے حال ہی میں پتہ چلا تھا کہ رشید کی نئی بیوی اُسے کنگال کر کے واپس جا چکی ہے۔ ایسے میں نمرہ کی تلاش لازمی بات تھی۔

''وہ میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ بھلا اس وقت میں اُسے کیسے طلاق دے سکتا تھا؟'' حسنہ کو خاموش پا کر رشید نے مزید وضاحت کی۔ ''میں اپنی غلطیوں اور زیادتیوں پہ نادم ہوں۔ میں نمو سے معافی مانگ کر اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ سچ کہہ رہا ہوں، اب میں اسے رانی بنا کر رکھوں گا..... پلیز حسنہ! بتاؤ، وہ کہاں ہے؟''

''میں نے کہا نا، وہ یہاں نہیں ہے۔'' حسنہ نے رُوکھے لہجے میں کہا۔ ''رہا سوال تمہاری باتوں کا..... تو کل تم کچھ اور کہہ رہے تھے، آج کچھ اور کہہ رہے ہو۔ آج جس بچے کے باپ ہونے کا دعویٰ کر رہے ہو، کل تم اس کے باپ ہونے سے انکاری تھے اور نمو کی اسی بدکاری کو بہانہ بنا کر تم نے اسے طلاق دی تھی۔''

''اصل میں حسنہ بی!..... بس غصے میں.....'' رشید تھوڑا شرمندہ ہو کر بولا۔

''چلو، ٹھیک ہے۔'' حسنہ نے بحث سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''مگر نمرہ اب اس گھر میں نہیں ہے۔ وہ تو اسی رات یہاں سے واپس چلی گئی تھی۔ اس کے بھیا نے تو یہی سمجھا تھا کہ وہ تمہارے گھر واپس لوٹ گئی ہے۔ اگر وہ تمہارے پاس نہیں گئی تو خدا جانے وہ کہاں گئی۔'' حسنہ نے لحظہ بھر کو رک کر تنبیہ بھرے لہجے میں کہا۔ ''ایک بات کان کھول کے سن لو۔ اب کبھی بھی اسے ڈھونڈنے اس گھر میں نہ آنا۔ اس کے بھائی کو پتہ چلا کہ وہ لاپتہ ہو چکی ہے تو تمہیں اندازہ نہیں، وہ اپنی بہن سے کس قدر محبت کرتا ہے..... وہ تم پر عدالت میں مقدمہ دائر کر دے گا، تمہارے خلاف تھانے میں رپٹ لکھوا دے گا۔ بہتر یہی ہے کہ اس کے بھائی کی یہ غلط فہمی قائم رہنے دو کہ وہ اپنے شوہر کے گھر میں خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔ اس لئے میرا تم کو مشورہ ہے، اب اسے یہاں تلاش کرنے مت آنا۔ اگر وہ واقعی تمہارے پاس نہیں لوٹی تو اُسے کہیں اور ڈھونڈو۔ مل جائے تو بے شک اپنے گھر لے جاؤ۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ مگر اب کبھی بھی ادھر کا رُخ نہ کرنا۔ ورنہ تمہارے لئے بہت مشکل ہو جائے گی۔''

رشید ابھی ابھی مہکار کے سلسلے میں تھانہ، عدالت بھگتا کر بیٹھا تھا۔ دوبارہ ان چیزوں سے اُلجھنے کی نہ ہمت تھی نہ جیب میں پیسہ۔ چنانچہ حسنہ کا مشورہ اسے مناسب ہی لگا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتا واپسی کے لئے مڑ گیا۔ اور حسنہ نے اطمینان بھرا سانس لے کر دروازہ بند کر دیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ یہ باب اب ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔

❁===❁===❁
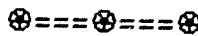
باہر سرمئی شام بکھری ہوئی تھی۔

اسٹڈی کے ادھ کھلے دریچے سے اندر داخل ہونے والی نرم ہواؤں میں باؤنڈری وال کے ساتھ کیاری میں کھلے

نو شگفتہ پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ مگر پروفیسر آفاق، ان سب باتوں سے بے نیاز کرسی کی پشت سے سر ٹکائے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ نمرہ اور عظمت بی کل خرید کر لائی گئی چیزوں کو پیک کرنے میں مصروف تھیں۔ غفور ابھی کچھ ہی دیر قبل ان کے سامنے بھاپ اُڑاتی چائے کا مگ رکھ کر گیا تھا۔ مگر وہ اپنی سوچوں میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ چائے کی طرف متوجہ ہی نہ ہو سکے تھے۔ اور اب چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ مگر ان کی سوچوں کی طغیانی میں ہنوز کوئی کمی نہ آئی تھی۔

کل سرمد کو ندرت جہاں کی بیٹی فروا کے ساتھ دیکھ کر وہ حیران ہی نہیں، پریشان بھی ہو گئے تھے۔

ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ وجاہت مرزا کے لئے کسی ایسی اپنی ہستی کی ضرورت تھی جو تن من سے، پورے اخلاص اور محبت سے ان کا خیال رکھ سکتی، ان پہ دھیان دے سکتی، ان کی خدمت کر سکتی۔ اور سب ہی کا مشترکہ فیصلہ یہ تھا کہ وہ ہستی سرمد کی دلہن ہی ہو سکتی تھی۔ آفاق صاحب نے بھی بہت بار اس بارے میں سوچا تھا۔ سرمد کی شادی نہ صرف سرمد کی زندگی کے سُونے پن کو ختم کر سکتی تھی بلکہ اماں بی اور وجاہت مرزا کی ویران زندگی میں بھی حیات نو کے گل کھلا سکتی تھی۔ لیکن اگر وہ ہستی فروا کی ہوتی تو سب ہی کچھ برعکس ہونے کا امکان تھا۔

ثروت نے اسد کی زندگی میں شامل ہو کر وجاہت مرزا کو معذور ہو کر بستر پر پڑ جانے پر مجبور کیا تھا تو اس کی بہن، جو اس سے بھی دس ہاتھ آگے تھی، بھلا اس گھر کے لئے اور گھر کے رہنے والوں کے لئے کس طرح مفید اور سودمند ثابت ہو سکتی تھی۔ فروا سے سرمد کی شادی کا مطلب تھا، وجاہت مرزا کی عبرت ناک موت۔ اور ظاہر ہے اماں بی اس عمر میں اپنے اکلوتے لختِ جگر کی موت کا صدمہ ہرگز بھی نہ سہہ سکیں گی۔ اس طرح تو سرمد کی شادی اس گھر کے لئے پیغامِ اجل بن جائے گی۔ انہوں نے پہلو بدلتے ہوئے کرب بھرے انداز میں سوچا۔

وہ اپنے عزیز دوست کی زندگی کا چراغ اس طرح گل ہوتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ نہ ہی وہ سرمد کی زندگی کو پریشانیوں اور اُلجھنوں کی نذر ہوتے برداشت کر سکتے تھے۔ وہ اس گھرانے کو، سرمد کو، وجاہت مرزا کو فروا نامی اس عفریت سے بچانا چاہتے تھے۔ مگر یہ کیونکر ممکن ہوگا؟

اس سوال کا خود ان کے پاس جواب نہ تھا۔ وہ سہ پہر سے بیٹھے اسی سوال کا جواب تلاش کر رہے تھے۔ وہ سوچ سوچ کر تھک گئے تھے مگر اب تک ان کے سامنے کوئی مثبت جواب نہیں آیا تھا۔

''انکل!'' تب ہی نمو کی مترنم آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ ''ہم نے تمام اشیاء کو گتے کے ڈبے میں ڈال کر پارسل تیار کر دیا ہے۔ آپ کہیں تو میں غفور کو بھیج کر اسے پوسٹ کروا دوں؟''

''اوہ..... نمرہ بٹیا!'' آفاق صاحب نے گہرا سانس لے کر نمرہ کے مسرور شاداب چہرے کی طرف دیکھا۔ اُس کی بے ریا آنکھیں، اُس کا بے لوث لہجہ اُس کی اندر کی سچائی اور صداقت کا غماز تھا۔ آفاق صاحب بے خود سے کئی لمحوں تک اُسے تکتے رہے تھے۔

ایسی ہی لڑکی..... بالکل ایسی ہی لڑکی وجاہت مرزا کی بیماری، اماں بی کی ویران زندگی اور سرمد کے اکیلے پن کو دور کر سکتی تھی..... اس گھر کو کسی نمرہ جیسی ہی لڑکی کی ضرورت تھی۔ اگر نمرہ کی شادی سرمد سے ہو سکتی..... تو..... مگر یہ کس طرح ممکن تھا؟

نمرہ مطلقہ اور ایک بچے کی ماں تھی۔

شاید نہیں بلکہ یقیناً سرمد اس بارے میں سوچنا بھی پسند نہیں کریں گے۔ اور پھر شاید اماں بی کو بھی ایسی بہو قبول نہیں ہو گی..... اور جہاں تک وجاہت مرزا کا تعلق تھا..... وہ بے چارے تو اظہارِ خیال کی طاقت سے ہی محروم ہو چکے تھے۔

چلنے پھرنے سے معذور، بستر پر پڑے تھے۔ اور خود نمرہ بھی شاید اتنی جلدی پھر سے اپنا گھر بسانے کے بارے میں سوچنے پر آمادہ نہ ہو۔

آفاق صاحب کو اپنی جانب اس طرح غور سے دیکھتے دیکھ کر نمرہ کو تھوڑی حیرت ہوئی تھی اور اُس نے جز بز ہو کر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو سامنے چائے کی پیالی نظر آ گئی۔

''ارے.....آپ نے چائے نہیں پی؟'' اس نے چائے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے قدرے حیرت سے پوچھا تھا۔

''ارے ہاں.....'' آفاق صاحب ''ارے'' کو ذرا کھینچ کر بولے۔ ''تب ہی تو ہمیں لگ رہا تھا کہ کوئی کام رہ گیا ہے۔ سچ بیٹی! ہم واقعی بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اب دیکھو، چائے پینا ہی بھول گئے۔ لاؤ اب پیالی پکڑا دو۔''

''اب تو یہ ٹھنڈی ہو گئی۔'' نمرہ نے چائے کی پیالی اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ دو منٹ رُکیے، میں آپ کے لئے دوسری چائے لاتی ہوں۔''

''ارے بیٹی! رہنے دو......ابھی تو ہم پارسل کوریئر کرنے جا رہے ہیں۔ واپسی پر دیکھا جائے گا۔ تم کہاں بلاوجہ تکلیف کرنے چل دیں۔''

''تکلیف کیسی؟'' نمرہ نے دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔ ''آپ جب تک فریش ہو کر آئیے۔ میں ابھی دو منٹ میں لے کر آتی ہوں۔''

چائے پی کر پروفیسر آفاق نمرہ اور عظمت بی کو ساتھ لئے فریحہ، فریال اور اس کی نومولود بچی کرن کے تحائف پارسل کرنے چل دیئے تھے۔

گاڑی کے مین روڈ پر آتے ہی نمرہ نے خالی خالی نظروں سے چہار اطراف پھیلی چہل پہل کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ امتحان کے بعد سے کلاسز آف ہو چکی تھیں۔ کل کتنے ہی دنوں بعد وہ گھر سے نکلی تھی اور اس شاپنگ مال میں بالکل اچانک ہی اس نے وہ چہرہ دیکھ لیا تھا......وہ چہرہ کہ جسے پہلی بار دیکھ کر وہ اپنی سدھ بدھ بھول گئی تھی......کتنی مشکل سے وہ نقش اپنی یادوں کی تختی سے اس نے اُتارا تھا۔ کتنا ہی وقت بیت گیا تھا۔ اب وہ پہلے والی نمو کب رہی تھی؟.....رشید اور سلطانہ کے ستم سہتے سہتے اُس کی روح تک مضطرب و مفلوج ہو گئی تھی۔ پھر طلاق کا داغ......اگر ننھے تابی کا وجود نہ ہوتا تو شاید وہ کب کا موت کو گلے لگا چکی ہوتی۔

وہ بھی تو کتنے بدل گئے تھے۔ پہلے سے اور زیادہ سنجیدہ اور بردبار لگ رہے تھے۔ وقار اور تدبر نے ان کی شخصیت کو کچھ اور نکھار دیا تھا۔

آفاق صاحب نے کب پارسل پوسٹ کیا، کب واپسی کا سفر شروع ہوا، اسے کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ وہ سوچوں میں ڈوبی، کھوئی کھوئی نظروں سے شور شرابے سے پُر راستوں پہ جانے کسے تلاش کر رہی تھی۔ تب ہی گاڑی رُک گئی تھی۔ ہلکا سا دھچکا لگنے سے اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے آگے کی جانب جھکتے ہوئے بے ساختہ سر اُٹھایا تھا۔ غالباً کوئی سگنل تھا۔ ٹریفک تھم گیا تھا.....زیبرا کراسنگ سے پیدل چلنے والے سڑک کراس کر رہے تھے۔ تب ہی ایک شخص اپنی جگہ ساکت سا ہو گیا تھا۔ اس نے حیرت اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں ڈوب کر اپنی آنکھیں پوری کھول کر پہلے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے آفاق صاحب کو دیکھا تھا، پھر اس کی حیران نظریں نمرہ کے چہرے پر ٹھہر سی گئی تھیں۔

شاید اس کی نظروں کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے نمرہ نے بھی بے اختیارانہ اس کی جانب دیکھا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔

''رشید۔'' اس کے منہ سے گھٹی گھٹی آواز نکلی تھی۔

سگنل کھل چکا تھا۔ آفاق صاحب نے گاڑی آگے بڑھادی تھی۔ گاڑی کے روانہ ہوتے ہی وہ سڑک پار کرنے کے بجائے گاڑی کے پیچھے دوڑ پڑا تھا۔

آفاق صاحب نے یکایک پلٹ کراس کی جانب دیکھا تھا۔ ملگجے کپڑوں اور اُلجھے بالوں سے اُس کی معاشی بدحالی کا پتہ چل رہا تھا۔ چمچماتی گاڑی اور تکبر سے اکڑی گردن، سیٹھوں والا انداز سب جانے کہاں کھو چکا تھا۔ آفاق صاحب نے نگاہ بھر کے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا اور ایک دم سے گاڑی کی اسپیڈ بڑھادی تھی۔ وہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ سیدھے گھر نہیں آئے تھے۔ گاڑی کو جانے کہاں کہاں گھماتے پھرے تھے اور کتنی ہی دیر بعد گھر کا رخ کیا تھا۔

نمرہ کا اب رشید سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ مگر اس کا نمرہ کو دیکھ کر گاڑی کے پیچھے دوڑنا اس بات کا پتہ دے رہا تھا کہ وہ نمرہ کو کھو کر پچھتا رہا ہے اور اب اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ یہ احساس نمرہ کے ہی نہیں، خود آفاق صاحب کے رگ وپے میں ایک بے نام سا خوف جگا گیا تھا۔

وہ رشید کی نس نس سے واقف تھے۔ اس نے نمرہ کو طلاق دے دی تھی اور اس کے وجود میں پلتے بچے کو اپنا ماننے سے انکار کرتے ہوئے اسے اپنے گھر سے نکال باہر کیا تھا۔ وہ اسے انتہائی کسمپرسی کی حالت میں ان کے دروازے پہ پھینک گیا تھا۔ اور اس پل اس کا نمرہ کو دیکھ کر گاڑی کے پیچھے بھاگنا اس بات کا بیّن ثبوت تھا کہ وہ نمرہ کو تلاش کرتا پھر رہا ہے...... اسے کھو کر پچھتا رہا ہے۔

یہ بات واقعی خوف زدہ اور متفکر کرنے والی تھی۔

رشید نے نمرہ کو طلاق دے دی تھی، مگر کوئی گواہ نہ تھا۔ کوئی تحریری ثبوت نہ تھا۔ اس کے کمینے پن کو مدِنظر رکھتے ہوئے آفتاب کی پیدائش کے فوراً بعد ہی آفاق صاحب نے اپنے ایک بیرسٹر دوست رحمان صاحب سے رابطہ کیا تھا۔ ساری بات سننے کے بعد بیرسٹر رحمان نے پُرتشویش لہجے میں کہا تھا۔

''اس جیسے شخص سے کچھ بعید نہیں۔ کل وہ اس بات سے بھی مکر سکتا ہے۔''

''تو اب کیا کرنا چاہئے؟'' آفاق صاحب نے ان سے بھی زیادہ تشویش بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔ ''شرعاً، اخلاقاً تو طلاق ہو گئی.... اب کل کلاں کو وہ اپنے اس عمل سے انکاری ہوتا ہے تو یہ نمرہ پر ظلم ہی نہیں، گناہِ کبیرہ بھی ہوگا۔''

''ہوں۔'' بیرسٹر رحمان نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا تھا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ اس مسئلے کا حل موجود ہے۔''

بیرسٹر رحمان کی خصوصی توجہ اور کوششوں سے قانون کی تمام تر باریکیوں کو مدِنظر رکھ کر باقاعدہ قانونی طریقے سے نمرہ کو خلع کی ڈگری مل گئی تھی۔ اب وہ شرعی اور مذہبی لحاظ سے ہی نہیں، قانونی طور پر بھی رشید کے شر سے آزاد ہو چکی تھی۔

گاڑی گھر پہنچتے ہی نمرہ ہراساں سی باہر نکلی تھی۔ اس کے چہرے کا اُڑا رنگ اور وحشت زدہ آنکھیں دیکھ کر غفور بھی پریشان ہو اُٹھا تھا۔

''نمرہ آپی کو کیا ہوا؟'' اس نے حیرت سے عظمت بی سے پوچھا تھا۔

''چلو اندر چلو۔ بتاتے ہیں۔'' آفاق صاحب نے رسان بھرے لہجے میں کہا تھا اور سب ورانڈا عبور کر کے لاؤنج میں آ گئے تھے۔

''نمو!'' اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھتے ہوئے آفاق صاحب نے نمرہ کے وحشت زدہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''بیٹا! اتنی متوحش ہونے کی کیا ضرورت ہے؟...... تم جانتی ہو، اب تم شرعی اور قانونی طور سے اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہو چکی ہو۔ تم آزاد ہو چکی ہو۔''

''پھ...... پھر وہ گاڑی کے پیچھے کس لئے دوڑ رہا تھا؟'' نمرہ کی پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ......

وہ.....'' نمرہ کی آواز حلق میں پھنس سی گئی۔ وہ اپنی بات پوری نہ کر سکی۔ اور اس کی وحشت زدہ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

''پگلی! بھلا رونے کی کیا بات ہے؟'' پروفیسر آفاق نے پدرانہ شفقت سے کہا۔ ''نمو بیٹی! تم اکیلی نہیں ہو۔ تمہارا باپ تمہارے ساتھ ہے۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ اب وہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ وہ ہزار کوششیں کر لے تو بھی اب وہ تمہاری خاکِ پا کو بھی نہیں پا سکتا۔ اب وہ تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ ایسی کوئی معمولی سی کوشش بھی اسے بے حد مہنگی پڑے گی۔''

عظمت بی، نمرہ کو گلے سے لگائے اس کے آنسو پونچھ رہی تھیں اور غفور، تابی کو گود میں لئے حیران و پریشان نظروں سے سب کا چہرہ تک رہا تھا۔

⊛===⊛===⊛
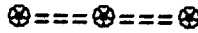
اوائل تاریخوں کا ننھا سا ہلال جانے کب جھلک دکھلا کر روپوش ہو چکا تھا۔ تاریک آسمان پر کہیں کہیں اِکا دُکا تارے ٹمٹماتے سے دکھائی دے رہے تھے۔ ٹریفک کا زور بھی کم ہو گیا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف الیکٹرک پولز پر روشن بلب بھی رات کی تاریکی چھانٹنے میں ناکام سے محسوس ہو رہے تھے۔ ہر سمت رات کے اندھیرے کے ساتھ ایک عجب سی مایوسی اور اُداسی بھی بکھری ہوئی تھی۔

رشید ماحول سے بے نیاز سر نیہوڑائے فٹ پاتھ پہ بیٹھا اپنی سوچوں میں گم تھا۔

اس شام حسنہ کے گھر سے واپسی پر وہ بے حد مایوس تھا۔ اسے یہ تو یقین آ گیا تھا کہ نمو، حسنہ کے گھر میں نہیں ہے۔ مگر کہاں ہے؟ اس سوال نے اُسے بے حد مایوس اور بد دل کیا تھا۔ اسے یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ نمو کو تلاش کرنا اب صرف اس کا ہی کام ہے۔ گلی کوچوں اور محلوں اور راستوں میں اب اُسے نمو کو ڈھونڈنا تھا۔ اور اس کے دل کو یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی وہ اسے یونہی سرِ راہ مل جائے گی۔ اسی پہلے دن کی طرح پھر وہ اسے کہیں نظر آ جائے گی۔

اور آج بالکل اچانک......

غیر متوقع طور پر وہ اُسے نظر آ گئی تھی۔

ٹریفک کے رُکتے ہی وہ سرعت سے روڈ کراس کر ہی رہا تھا کہ بالکل اچانک اس کی نگاہ دائیں جانب کھڑی سفید ٹویوٹا کی طرف اُٹھ گئی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر کے خوش شکل اور باوقار صاحب اسٹیئرنگ سنبھالے بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی رشید کو ایک عجب سی شناسائی کا احساس ہوا تھا۔ یوں لگا تھا اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ مگر کہاں؟ اس سوال کا جواب تلاش کرتے کرتے اس نے ان صاحب کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی خاتون کی طرف دیکھا تھا۔

خاتون پر نگاہ پڑتے ہی اس کی نگاہ اس چہرے پر جم سی گئی تھی۔

'نمو.....!' حیرت اور بے یقینی سے اس کے دل نے پکارا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر اس چہرے کو پہچاننے اور پرکھنے کی کوشش کی۔ وہ یقیناً نمو ہی تھی......اُس کی گم گشتہ جنت......اس کی گم شدہ محبت......

تب ہی سگنل کھل گیا تھا۔ سڑک پہ تھمی گاڑیاں ایک دم سے متحرک ہو گئی تھیں۔ نمرہ والی گاڑی کو آگے بڑھتے دیکھ کر وہ دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑا تھا۔ مگر چشم زدن میں گاڑیوں کی بھیڑ میں وہ گاڑی شامل ہو کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

وہ بے بسی سے پاؤں پٹختا سڑک عبور کر کے فٹ پاتھ پہ دھپ سے جا کر بیٹھ گیا تھا۔ نمو کو دیکھ لینے کی خوشی سے کہیں زیادہ اسے ایک بار پھر کھو دینے کا ملال تھا۔ کتنی ہی دیر وہ گم صم سا اُسی فٹ پاتھ پر بیٹھا اس شخص کے بارے میں سوچتا رہا

تھا، جس کے ساتھ نمو تھی۔
آخر تھک کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور ہارے ہوئے جواری کی طرح مایوس اور ناکام سا گھر کی جانب چل دیا تھا۔
اس کی مالی حالت بے حد پتلی ہو چکی تھی۔ اسی لئے اسے وہ بڑا مکان کہ جس کی نچلی منزل پر اس کا آفس اور اوپر رہائش تھی، چھوڑ کر ایک چھوٹے سے علاقے میں دو کمروں کے چھوٹے سے مکان میں اُٹھ آنا پڑا تھا۔
زندگی ایک بار پھر انہی ابتدائی دنوں والی نہج پر آ گئی تھی۔ اب پھر سے سلطانہ کو گھر کا سارا کام کاج اپنے ہاتھوں سے کرنا پڑتا تھا۔ عمر کے اس حصے میں یہ مشقت اس کے لئے بے حد تکلیف دہ اور پریشان کن تھی۔ ایسے میں اُسے ٹوٹ کر نمو کی یاد آئی تھی۔
رشید جب سویرے گھر سے نکلتا تو سلطانہ اُمید بھری نگاہوں سے اُسے دیکھتی۔ اور جب وہ شام کو مایوس، ناکام اور بے نیل ومرام گھر لوٹتا تو وہ اُسے سوالیہ نظروں سے یوں دیکھتی جیسے پوچھ رہی ہو......
نمو کا کچھ پتہ چلا؟
کہیں نظر آئی، کہیں ملی نمو؟
مگر آج جب رشید گھر میں داخل ہوا تو اس نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے سر میں شدید درد تھا۔ وہ سر پر دوپٹے کسے پلنگ پر اوندھی پڑی کراہ رہی تھی۔
''اماں!'' اس کے قریب آ کر رشید نے اسے آواز دی تھی۔ ''کیا ہوا؟...... یہ تم اٹھوانٹی کھٹوانٹی لئے کیوں پڑی ہو؟''
''سر میں سخت درد ہے۔'' وہ نقاہت بھری آواز میں بولی۔ ''سارا دن کام کرتے کرتے جسم ٹوٹ کر پھوڑا ہو جاتا ہے۔ اب میری یہ عمر گھر کے کام دھند نمٹانے کی نہیں رہی۔ خدا کے لئے رشید! کوئی راستہ تلاش کر۔ وہ نہیں ملتی، جہنم میں جائے...... تُو اپنے کام کاروبار پر توجہ دے۔ چار پیسے کما اور میرے لئے کام والی رکھ دے..... اب مجھ سے یہ سب نہیں ہوتا۔''
''ارے اماں! مایوس کیوں ہوتی ہو؟'' رشید نے اپنی مایوسی کو خوش دلی میں بدل کر قدرے اُمید بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ وہ نہیں ملے گی؟...... اُس کا ملنا بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے ساتھ میرا بچہ ہے۔ اور تم جانتی ہی ہو، اب دوبارہ سے میں کبھی باپ نہیں بن سکتا۔ اب تم خود سوچو! وہ بچہ میرے لئے کتنا اہم ہو گیا ہے۔ میں ہر قیمت پر اسے اور اپنے بچے کو اس گھر میں لے کر آؤں گا..... پھر کام دھندہ، کاروبار پھر سے جم جائے گا۔ تم دیکھنا اماں! اب کے تو میں نے سوچا ہے کہ اُسے واقعی رانی بنا کر رکھوں گا۔''
سلطانہ کچھ نہیں بولی تھی۔ بس اُسے ایسی نظروں سے تکتی رہی تھی جیسے اس کی دماغی صحت پر شبہ کر رہی ہو۔
''ارے میرے بچے! تُو کب سے ڈھونڈ رہا ہے اُسے۔'' وہ اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''کتنے ہی دن، کتنے ہی مہینے ہو گئے...... مگر آج تک اس کا کچھ پتہ چلا؟...... کوئی خبر ملی؟...... اُس منحوس ماری حسنہ کے حلق میں انگلی ڈال کر اپنے تین لاکھ تو نکلوا لے۔ اس کڑے وقت میں وہ روپے ہی کچھ کام آئیں۔''
''اماں! تم تو جانتی ہو، حسنہ تمہاری بھانجی ہے۔ تین لاکھ تو کیا، وہ تین پیسے بھی نہیں دے گی۔ اُلٹا اس کا میاں یعنی نمرہ کا بھائی تھانے میں جا کر ہمارے خلاف رپورٹ لکھوا آیا تو ہمیں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اس لئے اب تم ان روپوں کو تو بھول ہی جاؤ۔ ہاں البتہ ایک خوشخبری ہے۔ آج میں نے نمرہ کو دیکھا۔''
''کیا؟'' سلطانہ کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ ''کیا کہا تُو نے؟...... تُو نے آج نمرہ کو دیکھا؟...... کہاں دیکھا؟...... کیا اس کی گود میں تیرا بچہ بھی تھا؟...... کیسی لگ رہی تھی وہ؟''

ایک ہی سانس میں اس نے کتنے ہی سوال کر دیئے تھے۔
رشید کے لبوں پر کرب بھری مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ آج جو اپنائیت اور بے تابی سلطانہ کے لہجے میں تھی، نمرہ کی موجودگی میں اگر اس اپنائیت اور بے تابی کا عشرِ عشیر بھی ہوتا تو آج یہ نوبت ہی نہ آتی۔ اس کی کسی بڑی نیکی کے صلے میں تقدیر نے اسے نمرہ جیسی حسین، نیک اور فرمانبردار بیوی عطا کر دی تھی۔ خود اس نے اس کی کون سی قدر کر لی تھی۔ کاش! خود اس نے نمرہ کے مقام کو پہچانا ہوتا۔ کاش وہ اپنی جاہل ماں کی باتوں میں نہ آیا ہوتا...... کاش نمرہ کے ہوتے اس نے مہکار جیسی آوارہ عورت کے آنچل کا سہارا نہ ڈھونڈا ہوتا۔ مگر اب جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ اس کی ماں سے بھی اور خود اس سے بھی نمرہ کی بے قدری کی حماقت ہو چکی تھی۔ اب وہ اپنی اس حماقت اور غلطی کو سدھارنا چاہتا تھا۔ اب اسے کہیں سکون اور پناہ مل سکتی تھی تو وہ صرف نمرہ کے باحیا اور باوفا آنچل تلے۔ اور اب وہ ہر قیمت پر اس آنچل کی چھاؤں اور وفا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ گھر، نہ کاروبار، نہ روپیہ پیسہ اُدھار پہ زندگی کی گاڑی جیسے تیسے چل رہی تھی۔ مگر وہ جانتا تھا، نمرہ جیسی معصوم اور صابرہ لڑکی کو دولت کی چمک دمک کی ضرورت نہیں۔ وہ تو محبت بھرے دو جملوں کی خاطر اس کے پاؤں کی جوتی بنی رہی تھی۔ اتنی جلی کٹی سننے کے باوجود وہ کس دل و جان سے اس کی بدزبان اور بے رحم ماں کی خدمت کیا کرتی تھی..... کاش وہ ایک بار پھر وقت کو پلٹا سکتا۔ ایک بار پھر نمرہ کو پا سکتا۔

''جہاں تک میں جانتی ہوں، ایسا پڑھا لکھا اور گاڑی والا حسنہ یا ان کے پورے خاندان میں کوئی نہیں ہے۔'' ساری بات سننے کے بعد سلطانہ نے پُرسوچ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میری مان، ایک بار پھر تُو حسنہ کے پاس جا۔ مجھے یقین ہے اس آدمی کے بارے میں وہ ضرور کچھ نہ کچھ جانتی ہو گی۔''

ماں کی بات رشید کے دل کو لگی تھی۔ اور وہ اگلی صبح ہی حسنہ کے دروازے پہ جا پہنچا تھا۔

''تم......؟'' دروازہ کھولتے ہی اسے اپنے سامنے دیکھ کر حسنہ کی تیوری پر بل پڑ گئے تھے۔ ''رشید بھائی! تمہیں میں نے منع کیا تھا کہ اب یہاں نہ آنا۔ نمو کے بھائی کو اس کی گمشدگی کا پتہ چلا تو وہ سیدھا تھانے پہنچے گا۔''

''دیکھو حسنہ......!'' رشید نے رسان بھرے لہجے میں کچھ کہنا چاہا تھا۔

''رشید بھائی! میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ وہ اس رات کو دروازے سے ہی کہیں چلی گئی۔ گھر میں داخل ہی نہیں ہوئی۔ تو تم کس طرح سوچ سکتے ہو کہ وہ اس گھر میں موجود ہو گی؟''

''میں جانتا ہوں حسنہ! کہ وہ تمہارے گھر میں نہیں ہے۔'' رشید نے اسی دھیرج بھرے لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ کل شام میں نے اسے ایک بڑی عمر کے پڑھے لکھے اور شریف صورت انسان کے ساتھ گاڑی میں دیکھا ہے...... میں اس وقت تم سے صرف اس شخص کے بارے میں جاننے آیا ہوں...... میرا دل کہتا ہے، اسے تم ضرور جانتی ہو گی۔''

''بڑی عمر کا پڑھا لکھا، شریف صورت انسان؟'' حسنہ نے چونک کر رشید کی طرف دیکھا۔ ''پروفیسر آفاق۔'' اس نے بے ساختہ سر تھام لیا تھا۔ ''یہ بات آخر پہلے میرے دھیان میں کیوں نہیں آئی کہ نمرہ کا اس گھر کے بعد دوسرا محفوظ ٹھکانہ پروفیسر آفاق کا گھر ہی ہو سکتا ہے۔''

''پروفیسر آفاق.....'' رشید بے تابانہ انداز میں دو قدم آگے بڑھ آیا تھا۔ ''کون ہے یہ پروفیسر؟...... اور بھلا نمو سے اس کا کیا تعلق ہے؟''

''بتاتی ہوں۔'' حسنہ نے گہرا سانس لیا۔ ''مگر ایک شرط پر۔ اور وہ شرط یہ ہے کہ اب تم کبھی اس دروازے پر نہیں آؤ گے۔''

''مجھے نمو کا اتہ پتہ مل جائے...... مجھے میری نمو مل جائے...... میں وعدہ کرتا ہوں، میں تمہارے دروازے پر ہرگز

نہیں آؤں گا...... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں حسنہ!...... میری زبان پر بھروسہ کرو۔‘‘

اور حسنہ نے اسے جانتے ہوئے بھی اس کی زبان پر بھروسہ کر لیا تھا۔ اس کے سوا چارہ بھی تو نہیں تھا۔ وہ خو بھی تو یہی چاہتی تھی کہ نمو ایک بار پھر رشید جیسے اجڈ، شرابی اور کمینے انسان کے ہتھے چڑھ جائے...... سو اُس نے آفاق صاحب کے بارے میں سب کچھ بتاتے ہوئے ان کا ایڈریس بھی اسے سمجھا دیا تھا۔

رشید، حسنہ کے گھر سے روانہ ہوا تو اس کی عجیب کیفیت تھی۔ ایک طرف تو منزلِ سامنے نظر آ رہی تھی، دوسری طرف وہ کچھ مخمصے کا شکار بھی تھا۔ آفاق صاحب ایک تعلیم یافتہ، صاحبِ حیثیت انسان تھے۔ بڑی جان پہچان اور اونچی اپروچ رکھتے تھے۔ اور نمرہ کو باپ کی طرح چاہتے تھے۔ حسنہ اور انو جیسے جاہل اور لالچی لوگوں کے دامن تلے سے نمرہ کو نکال لے جانا جتنا آسان تھا، آفاق صاحب جیسے دیانت دار، تعلیم یافتہ اور متمول انسان کی پناہ سے نمرہ کو حاصل کر لینا اتنا ہی مشکل اور ناممکن تھا۔ بہر حال کوشش تو اسے کرنی ہی تھی...... اور اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر گھی سیدھی اُنگلیوں سے نہ نکلا تو وہ اُنگلیاں ٹیڑھی کرنے میں وقت نہیں لگائے گا۔ اب وہ جلد از جلد نمرہ اور اپنے بچے کو حاصل کر لینا چاہتا تھا۔

ڈور بیل کی آواز پر غفور ہی گیٹ پر آیا تھا۔ گیٹ پر رشید کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ ہونے کے ساتھ خوفزدہ بھی ہو گیا تھا۔

’’پروفیسر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔‘‘ رشید نے حتی الوسع اپنے لہجے کو شائستہ بناتے ہوئے کہا۔ ’’کیا گھر پہ موجود ہیں؟‘‘

’’آپ دو منٹ رکیئے۔ میں دیکھتا ہوں۔‘‘ غفور نے گول مول جواب دیا تھا۔ پروفیسر صاحب گھر پہ ہی موجود تھے۔ آج انہیں دیر سے یونیورسٹی جانا تھا اسی لئے وہ تابی کے ساتھ وقت گزار کر خوش ہو رہے تھے۔ مگر غفور نے رشید کو یہ نہیں بتایا تھا۔ اسے انتظار کا کہہ کر گیٹ بند کر کے وہ تیزی سے لاؤنج کی طرف گیا تھا جہاں نمرہ، تابی کو گود میں لئے بیٹھی تھی اور آفاق صاحب سامنے دھری کرسی پہ بیٹھے تابی سے توتلی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ تابی کے کسی بے معنی جواب پہ سب ہی ہنس پڑتے۔ عظمت بی قریب بیٹھی ان باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ تب ہی ڈور بیل کی آواز سنائی دی تھی۔

’’لو، اس وقت کون آ گیا؟‘‘ غفور کو تابی کی مزیدار حرکتوں کو چھوڑ کر گیٹ تک جانا خاصا ناگوار گزرا تھا۔ مگر وہ بادلِ نخواستہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ’’دیکھتا ہوں کون ہے۔‘‘

کل سرِ راہ رشید کو دیکھ کر اور اسے اپنی گاڑی کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتا دیکھ کر نمرہ خاصی اپ سیٹ ہو گئی تھی۔ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر آفاق صاحب نے اسے کچھ نارمل کیا تھا اور اس وقت تابی کو گود میں بھرے اس کے معصومانہ منہ بنانے اور شوخ کلکاریوں کو دیکھ کر وہ پہلے سے خاصی بہتر اور مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ بکھری مطمئن اور ممتا بھری مسکراہٹ دیکھ کر آفاق صاحب کو بھی بے حد اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔

تب ہی غفور گھبرایا ہوا سا لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔

’’صاحب!...... صاحب! آپ ذرا باہر آئیے۔‘‘ اس نے اپنے لہجے کو حتی الوسع نارمل رکھنے کی کوشش کی تھی اور وہ رشید کا ذکر نمرہ کے سامنے بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے اس نے آفاق صاحب کو باہر بلایا تھا۔

’’کون آیا ہے؟‘‘ آفاق صاحب نے اس کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے کے متغیر رنگ کو دیکھ کر وہ لحظہ بھر کو خود بھی پریشان ہو گئے تھے۔ مگر خود کو کمپوز کرتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اُٹھے تھے۔

’’کون ہے دروازے پر؟‘‘ عظمت بی نے بھی پوچھا تھا۔

’’کوئی نہیں۔ وہ محلہ کمیٹی کے صدر آئے ہیں۔‘‘ غفور کو فوری طور پر بہانہ سوجھ گیا تھا۔ ’’صاحب کو بلا رہے ہیں۔‘‘

’’اچھا‘‘ عظمت بی، تابی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولیں۔ ’’میلا لاجہ بیٹا...... بوا کو کا کہے گا؟...... نانی...... بولو

بیٹا!......نانی......"

"نا......نا......" تابی نے بولنے کی کوشش کی تو وہ نہال ہو کر بولیں۔

"نانی صدقے......بڑی عمر پاؤ......ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رکھو۔"

"کون ہے بھئی؟" کمرے سے نکلتے ہی آفاق صاحب نے غفور سے پوچھا تھا۔ "اور تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

"صاحب! غضب ہو گیا۔" غفور کی گھبراہٹ میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ "گیٹ پر رشید موجود ہے۔"

"رشید......" آفاق صاحب حیران ہونے کے ساتھ ایک دم سے پریشان بھی ہو گئے تھے۔ وہ یہاں کس طرح پہنچا؟......یہاں کا پتہ اسے کس نے دیا؟"

"یہ سب مجھے کیا پتہ صاحب!" غفور رونی آواز میں بولا۔ "میں تو اسے دروازے پہ دیکھ کر ہی خوف زدہ ہو گیا ہوں......اب کیا ہوگا؟"

"ہاں۔" آفاق صاحب نے گہرا سانس لے کر خود کو اعتدال پر لانے کی کوشش کی۔ "یہ تو دیکھنا پڑے گا کہ وہ کیوں آیا ہے اور کیا چاہتا ہے؟"

"صاف ظاہر ہے صاحب! کہ وہ کیا چاہتا ہے۔" غفور غصے بھرے لہجے میں بولا۔ "کل اس نے نمو آپی کو آپ کے ساتھ گاڑی میں دیکھا، آج ڈھونڈتا ڈھانڈتا یہاں پہنچ گیا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" آفاق صاحب نے غفور کی بات سے اتفاق کیا تھا۔ "خیر دیکھتے ہیں، کیا ہوتا ہے۔" وہ آہستگی سے گیٹ کی جانب بڑھے۔ غفور ان کے پیچھے تھا۔

"یس......" گیٹ کھول کر باہر نکلتے ہوئے آفاق صاحب نے اس کی طرف اجنبی نظروں سے دیکھا۔ "تم کون ہو؟ اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

"پروفیسر صاحب!" رشید نے گہری نظروں سے انہیں سر تا پا دیکھا۔ وہ اپنی زندگی میں ہزاروں دولت مند، کاروباری، سرکاری افسروں اور اپنے جیسے اوباش اور بد دیانت لوگوں سے مل چکا تھا۔ مگر آج آفاق صاحب کو اپنے سامنے پا کر اس کی عجیب سی کیفیت ہوئی تھی۔ ایک عجیب سی کمزوری اسے اپنے وجود میں پھیلتی محسوس ہوئی تھی۔

"میں......آپ سے اپنی بیوی اور بچے کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔" اس نے خود کو سنبھال کر قدرے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

"بیوی اور بچہ......؟" آفاق صاحب نے نفرین بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ "کون سی بیوی اور کیسا بچہ؟......میں سمجھا نہیں۔"

"صاحب! میں نمرہ اور اس کے بچے کی بات کر رہا ہوں" رشید کو آخر کھل کر بتانا پڑا۔ "وہ دونوں آپ کے پاس ہیں۔ آپ کے گھر میں۔"

"نمرہ اور اس کے بچے سے تمہارا کیا تعلق؟" آفاق صاحب بھنویں سکیڑ کر بولے۔ "اوّل تو وہ لوگ یہاں نہیں......اور اگر ہوں بھی تو تمہیں کیا؟"

"کیا بات کرتے ہیں سرکار!" رشید اب خود کو خاصا سنبھال چکا تھا، اعتماد سے بولا۔ "نمرہ میری بیوی ہے......اور بچہ......"

"شٹ اپ۔" اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی آفاق صاحب ڈپٹ کر بولے تھے۔ "نمرہ کبھی تمہاری بیوی تھی۔

پر اب نہیں ہے۔ تم اسے طلاق دے چکے ہو۔ اور رہا سوال بچے کا، اسے تم بہت پہلے اپنا ماننے سے انکار کر چکے ہو۔ اسی بچے کی بنا پر تم نے بیوی کو طلاق دی۔ آج تم اس بچے کو کس منہ سے اپنا کہہ رہے ہو؟''

''صاحب! غلطی ہو گئی تھی۔'' رشید نے مسمسی چہرہ بنا کر کہا۔ ''بس جاہل ماں کے سکھائے میں آ کر..... اپنے ہاتھوں اپنی جنت کھو دی..... اب آپ سے گزارش ہے، مجھے معاف کر کے..... میری بیوی اور بچہ میرے حوالے کر دیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں..... اب اسے کوئی تکلیف، کوئی دکھ نہیں دوں گا۔''

''رشید!'' آفاق صاحب نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''نمرہ سے اب تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ تم اسے طلاق دے چکے ہو..... اس لئے اب اسے اپنی بیوی کہنے کی حماقت نہ کرنا۔ اور رہا سوال بچے کا.....''

''بچے کا سوال تو بعد میں آئے گا صاحب!'' رشید کے لہجے میں خاصی تبدیلی آئی تھی۔ اس لجاجت اور رسان بھرے لہجے کی جگہ اب قدرے سخت اور جارحانہ لہجہ اپناتے ہوئے اس نے کہا۔ ''پہلا سوال میری بیوی کا ہے۔ آپ سے جس نے بھی یہ کہا کہ میں نے اس کو طلاق دی ہے، غلط کہا۔ میں نے اسے طلاق نہیں دی۔ جسے میں ایک خطیر رقم خرچ کر کے اتنی چاہ اور پیار سے اپنی دلہن بنا کر لے گیا تھا۔ بھلا میں اسے طلاق کیوں دوں گا؟..... اور ایسے وقت جب وہ میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔''

''آج کس انداز سے تم یہ بات کہہ رہے ہو، کاش! اُس وقت بھی تم نے اسی انداز سے سوچا ہوتا۔'' آفاق صاحب کرب بھرے لہجے میں بولے۔ ''تم نے اس وقت اپنے بچے کو اپنا ماننے سے انکار کر کے اس کی پاک دامنی پہ بدکاری کا داغ لگا کر اسے طلاق دے کر گھر سے نکالا جس وقت اس پوری دنیا میں کوئی اس کا مونس و غم خوار اور پرسانِ حال نہ تھا۔ تم نے ایک پل کو بھی نہ سوچا کہ اس حال میں وہ تنہا اور بے بس لڑکی کہاں جائے گی۔ اس وقت تم جس چاہ اور پیار کا دعویٰ کر رہے ہو، اگر اس کا عشرِ عشیر بھی اُس وقت تمہارے دل میں ہوتا تو تم یہ سب نہ کرتے۔

رشید کا تنتنا لحظہ بھر کو صابن کی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

اُس کا اکڑا ہوا سر جھک گیا تھا۔

''اب جو ہونا تھا، ہو چکا..... اب نہ اس بچے سے اور نہ اس کی ماں سے تمہارا کوئی رشتہ ہے..... اور نہ ہی کوئی تعلق بن سکتا ہے..... تم اسے طلاق دے کر اپنے گھر سے نکال چکے ہو..... تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ اس واقعے کو بھول جاؤ..... اب کبھی اپنی زبان پہ نمرہ کا نام بھی مت لانا۔''

''دیکھئے صاحب!'' رشید نے خود کو سنبھالتے ہوئے ایک بار پھر سر اٹھا کر آفاق صاحب کی طرف دیکھا۔ ''آپ بار بار یہ طلاق کی بات نہ کریں۔ میں نے اسے گھر سے ضرور نکالا، مگر طلاق نہیں دی۔ کوئی گواہ ہے آپ کے پاس؟''

''گواہ نہیں ہے..... مگر ثبوت ہے۔'' آفاق صاحب مضبوط لہجے میں بولے۔ ''مذہب اور قانون اتنا بے بس نہیں ہے کہ تم جیسے کمینے لوگ اسے داشتہ بنا کر استعمال کرنا شروع کر دیں۔''

''دیکھئے صاحب! میں آپ سے عزت سے پیش آ رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ.....'' رشید نے اپنے رہے سہے حوصلے کا دامن تھام کر مقدور بھر کراری آواز میں بولنے کی کوشش کی۔ مگر پروفیسر آفاق نے ہاتھ اٹھا کر اسے درمیان میں ہی روک دیا۔

''بس اب میں تم سے ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا۔ فوری طور پر یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔ اور ہاں، اگر پھر کبھی اس گھر کے آس پاس بھی دکھائی دیئے تو میں تمہیں فوری طور پر پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ سمجھے تم؟''

اس سے پہلے کہ رشید مزید کچھ کہتا، آفاق صاحب واپسی کے لئے پلٹ گئے اور ان کے اشارے پر غفور نے بڑھ کر

کھٹاک سے گیٹ بند کر دیا۔ رشید آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ کتنے ہی لمحوں تک وہ حیران پریشان سا بند گیٹ کو تکتا ہی رہا تھا۔ پھر گہرا سانس لے کر واپسی کے لئے پلٹ گیا تھا۔

مہکار سے جان چھڑانے کے دور میں اس کا قیمتی موبائل بِک چکا تھا۔ بعد میں اس نے ایک معمولی سا سیکنڈ ہینڈ موبائل لے لیا تھا۔ مگر ہفتوں سے اس میں کریڈٹ بھی نہیں تھا۔ اس نے جیب ٹٹول کر مالی پوزیشن کا اندازہ لگایا اور قریبی کریڈٹ کارڈ کی دکان پر موبائل میں بیلنس ڈلوانے کے لئے رک گیا۔

اسے اندازہ ہو گیا تھا، نمو کو پروفیسر آفاق کی پناہ سے نکالنا اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ پڑھے لکھے انسان تھے۔ قانون عدالت، سب سے واقف تھے۔ بڑے بڑے لوگوں میں ان کا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ ان کے کتنے ہی طالب علم بڑی بڑی پوسٹوں پر فائز تھے جوان کے ایک اشارے پر اس جیسے کتنے ہی سڑک چھاپوں کو برسوں کے لئے جیل کی ہوا کھلا سکتے تھے۔ سو کوئی غیر قانونی حربہ استعمال کرنے سے پہلے اس نے کسی قانون دان سے مشورہ کر لینا ضروری سمجھا تھا۔ اور اس کے نزدیک ایک ہی کام کا وکیل تھا..... اس کا پرانا مربی و مہربان، وکیل فہیم وارثی۔ سو اس نے موبائل میں بیلنس ڈلوا کر اُسی کا نمبر ملایا تھا۔

''اوہ کون..... رشید؟..... اچھا تم ہو۔'' فہیم وارثی کے لہجے سے کسی گرم جوشی کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ وہ رشید کی زندگی کے لمحے لمحے کے اُتار چڑھاؤ سے واقف تھا۔ جانتا تھا آج کل وہ قرض ادھار کے سہارے زندگی گزار رہا ہے۔

''میرا خیال تھا، تمہارا انڈر پن اور چالاکی تمہیں بہت آگے لے جا سکتی ہے۔'' وہ گہرا سانس لے کر بولا۔ ''مگر وقت نے ثابت کیا کہ میرا خیال غلط تھا۔ تم جہاں سے چلے تھے، آج پھر اسی جگہ پر آ کھڑے ہوئے ہو۔ تنہا، قلاش اور پریشان حال..... مجھے کیسے یاد کیا؟''

''وہ یار!..... اصل میں.....'' رشید اس کی کھری کھری سچائی سن کر کچھ پزل سا ہو گیا تھا۔ قدرے ہکلاتا ہوا بولا۔ ''ایک اور مسئلہ درپیش ہے۔ مجھے امید ہے تم اس کا کوئی اچھا حل بتاؤ گے۔ یہ مسئلہ حل ہو جائے تو سمجھو تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ میں تمہیں ایک بار پھر بہت آگے جا کر دکھاؤں گا۔''

''تم بھول رہے ہو رشید! اب تم کوئی نوعمر نوجوان نہیں ہو، 54 سال کے بوڑھے ہو چکے ہو۔ آگے بڑھنے کے لئے جس جذبے، ولولے اور توانائی کی ضرورت ہوتی ہے، اب وہ تم میں باقی نہیں رہی۔ اب تم اپنے انہی حالات سے سمجھوتے کی عادت ڈال لو تو اچھا ہے۔''

''اچھا یار! نصیحت چھوڑو..... میری بات سنو۔'' رشید نے زِچ ہو کر کہا اور جلدی جلدی ساری کہانی اس کے گوش گزار کر دی۔

''اوہ..... تو یہ مسئلہ ہے۔'' وکیل فہیم نے گہرا سانس لیا۔

''ہاں وارثی! بس یہ سمجھ لو، یہ میری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ نمو ہی اب میری آخری اُمید ہے..... زندہ رہنے کا آخری سہارا ہے۔''

اس کے رقت آمیز انداز میں کہنے پر فہیم کچھ دیر کے لئے گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ اس کے یوں خاموش ہونے پر رشید لجاجت بھرے انداز میں پھر گویا ہوا تھا۔

''یار وارثی!..... تم میرے دوست ہو..... میرے مربی اور مددگار..... ہر برے وقت پر تم نے میرا ہاتھ پکڑا..... اس وقت بھی مجھے تمہارے مشورے اور مدد کی ضرورت ہے۔ میں ہر قیمت پر نمو اور اس کے بچے کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''رشید.....!'' کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد فہیم وارثی نے تدبر بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''میں نے تمہاری

ساری بات سنی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تم نے نمرہ کو طلاق دے کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ اور اب اس کے پیچھے جا کر دوسری بڑی غلطی کر رہے ہو۔ بے شک اس طلاق کا کوئی گواہ نہیں ہے..... مگر خود نمرہ ایسی لڑکی نہیں ہے کہ طلاق کے باوجود وہ تمہارے ساتھ سر جھکا کر چل پڑے۔ وہ پڑھی لکھی، باشعور لڑکی ہے۔ وہ اتنے بڑے گناہ کے ارتکاب کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی..... اور اگر تم یہ سمجھو کہ تم اسے زور زبردستی سے اُٹھا لاؤ گے، تو پروفیسر آفاق کی پناہ سے تم اسے اس طرح بھی نہیں لا سکتے۔ میں نے پروفیسر آفاق کا نام سنا ہے۔ ایک آدھ اعلیٰ سرکاری تقریبات میں مجھے انہیں دیکھنے کا موقع بھی ملا ہے۔ تم انہیں کمزور یا معمولی انسان سمجھنے کی حماقت مت کرنا..... وہ ایک صاحبِ حیثیت اور باعزت انسان ہیں۔ بڑے دولت مند اور اعلیٰ سرکاری افسران سے ان کی یادِ اللہ ہے..... کتنی ہی بڑی بڑی پوسٹوں پر تو ان کے شاگرد بیٹھے ہیں..... ان سے مقابلے کی کوشش تمہیں بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔ میرا دوستانہ اور ہمدردانہ مشورہ یہی ہے کہ اب تم نمرہ کو بھول ہی جاؤ..... کیونکہ خود کردہ علاجِ نیست.....''

''مگ..... مگر یار.....!'' رشید کو خود اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ ''میرا بچہ..... اس کے پاس میرا بچہ ہے..... مجھے اپنے بچے کو تو حاصل کرنے کا حق ہے۔''

''ہاں، مگر اس کے لئے تمہیں کم از کم سات سال انتظار کرنا پڑے گا۔'' فہیم کے جواب نے رشید کی رہی سہی ہمت بھی توڑ دی تھی۔ بیلنس بھی ختم ہو گیا تھا۔ موبائل بند ہوتے ہی وہ اسے سامنے پٹخ کر زمین پہ بیٹھ گیا تھا کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح..... کسی لٹے ہوئے مسافر کی طرح۔

اسے فہیم سے اس طرح کے مشورے کی توقع نہ تھی۔

اس کا تو خیال تھا کہ فہیم کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لے گا..... مگر اس نے تو ہر راہ مسدود کر دی تھی۔ کتنی ہی دیر وہ گھٹنوں پہ سر رکھے خاموش، مایوس اور اُداس بیٹھا رہا تھا۔ ایک بات کا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ جن راستوں پر چل کر وہ نمرہ تک پہنچنا بے حد آسان سمجھ رہا تھا، وہ راستے نہ صرف مشکل ثابت ہو رہے تھے بلکہ بقول فہیم وارثی کے اب ناممکن تھے۔

کیا وہ نمرہ کو صبر کر لے؟

اپنے بچے کو فراموش کر دے؟

نمرہ اور اس کا بچہ اسی شہر میں اس کی آنکھوں کے سامنے موجود رہیں مگر اس سے کوئی تعلق، کوئی ناطہ نہ رکھیں..... یہ بات اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ تو سمجھ رہا تھا، صرف نمرہ کے ملنے کی دیر ہے۔ وہ جیسے ہی ملی، وہ اسے کان سے پکڑ کر اپنے گھر لے آئے گا اور اپنی ماں کے قدموں میں ڈال دے گا۔ اور وہ ایک بار پھر بے زبان خادمہ کی طرح اس کی اور اس کی ماں کی خدمت میں لگ جائے گی۔ کھانا پکائے گی، چائے پیش کرے گی، پاؤں دبائے گی..... رُوکھا سوکھا کھا کر، موٹا چھوٹا پہن کر بھی کبھی اُف نہیں کرے گی۔ نہ کبھی کچھ مانگے گی، نہ کبھی کوئی فرمائش کرے گی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ پھولوں کی طرح نازک، پریوں کی طرح حسین اور گائے کی طرح بے زبان۔

کافی دیر بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور شکستہ قدموں سے اپنے گھر کی طرف چل دیا تھا۔

''میں تو سمجھی تھی، تُو آج اُسے ساتھ لائے گا۔'' دروازہ کھولتے ہی سلطانہ نے آس بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ''کیوں نہیں لایا اُسے تُو؟..... میں اس کی راہ تک رہی تھی..... سچ رشید! اس کے بغیر اب گزارہ نہیں ہو سکتا..... تُو اُسے بس کسی طرح واپس لے آ۔''

''اماں! اب یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔'' رشید نے مایوسی سے سر پر ہاتھ پھیرا اور دھپ سے سامنے پڑی کھاٹ پہ بیٹھ گیا۔ ''اُس کی بے قدری اور کفرانِ نعمت کی سزا تو ملے گی نا۔''

"ہم اپنے حصے کی سزا تو بہت پہلے ہی بھگت چکے۔" سلطانہ نے ہاتھ نچا کر اکھڑ لہجے میں کہا۔ "لاکھ کا گھر خاک ہو گیا..... اُس منحوس قتامہ سے پالا پڑا..... شکر ہے کہ آخر کو اس سے نجات مل گئی..... تُو عرش سے فرش پر آ گیا..... لاکھوں کروڑوں میں کھیلتا کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا..... یہ سب سزا نہیں تو اور کیا ہے؟"

سلطانہ نے دم بھر کو رک کر سوالیہ نظروں سے رشید کی طرف دیکھا۔

"سچ رشید! میرا دل تو کہتا ہے کہ ہماری سزا کے دن اب اختتام کو پہنچنے والے ہیں۔" سلطانہ کی آواز سے اُمید جھلک رہی تھی۔ "نمو کا اتہ پتہ مل گیا۔ جلد ہی وہ واپس لوٹ آئے گی۔ وہ بڑی نیک اور بھاگوان لڑکی ہے..... مجھے یقین ہے، اس کے آتے ہی ہمارے دن پھر جائیں گے۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے اماں!..... مگر تم تو جانتی ہو کہ....." رشید نے گہرا سانس لے کر کچھ کہنا چاہا تو سلطانہ نے اسے درمیان میں ہی روک دیا تھا۔

"اچھا بس اب یہ نہ کہنا کہ اسے واپس لانا آسان نہیں ہے..... چل مان لیا، آسان نہیں ہے۔ مگر ناممکن بھی تو نہیں ہے۔" سلطانہ، رشید کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھتے ہوئے پُریقین لہجے میں کہا۔

"رشید! مجھے اُمید ہی نہیں، پورا یقین ہے کہ آج نہیں تو کل، وہ پھر سے اس گھر میں ہو گی..... ہمارے ساتھ رہے گی..... تیری بیوی بن کر، میری بہو بن کر..... تُو دیکھ لینا۔ جلد ہی ایسا ہو گا۔"

ماں کی اُمید اور یقین نے اُس کے ٹوٹے حوصلوں کو ایک بار پھر سہارا دے کر کھڑا کر دیا تھا۔

دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ بس آدمی سوچ تو لے اس کا ارادہ کیا ہے؟

اور اس پل رشید نے بھی مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر، کسی بھی حال میں نمرہ کو اس گھر میں واپس لائے گا۔ اگر وہ طلاق کا بہانہ بنا کر آنے سے انکاری ہو گی تو وہ اپنے بچے کا دعویدار بن کر اسے، اس سے چھین لے گا..... پھر تو وہ خود ہی پیچھے پیچھے آنے پر مجبور ہو جائے گی۔

وہ رات اُس نے منصوبے بناتے، ارادے باندھتے اور حوصلے مجتمع کرتے بتا دی تھی۔

اور اگلے دن اپنے منصوبے کے مطابق وہ پروفیسر آفاق سے ملنے یونیورسٹی جا پہنچا تھا۔ وہ ابھی ابھی کلاس لے کر اپنے روم میں آئے تھے کہ وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی پروفیسر آفاق کے چہرے پر ناگواری اور ناپسندیدگی کے سائے لرزنے لگے تھے۔

"پروفیسر صاحب! معافی چاہتا ہوں۔" ان کی ناگواری محسوس کر کے وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ "بہت ضروری بات تھی۔ آپ سے ملنا ضروری تھا۔ گھر آنے سے آپ نے منع کیا تھا۔ آپ کی حکم عدولی مجھے منظور نہ تھی، اسی لئے یہاں آنا پڑا۔"

"اپنی بات تم کل بھی کہہ چکے تھے۔ اور میں تمہیں جواب دے چکا تھا۔" پروفیسر آفاق تحمل بھرے لہجے میں گویا ہوئے۔ "اب ایسی کوئی بھی ضروری بات نہیں ہے کہ جس کے لئے تم یہاں آؤ۔ آج کے بعد یہاں آنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔"

"آپ نے بھی خوب ہی کہی بڑے صاحب! کہ آنے کی ضرورت نہیں ہے۔" رشید نے ہاتھ ہلا کر تمسخر اُڑانے والے لہجے میں کہا۔ "ضرورت کیسے نہیں ہے صاحب! میری بیوی، میرا بچہ آپ کے پاس موجود ہیں۔ مجھے تو آنا ہی پڑے گا۔"

"تم اُسے طلاق دے چکے ہو رشید! اب وہ تمہاری بیوی نہیں ہے۔" پروفیسر آفاق اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے دانت

پیس کر بولے۔ ''اس بات کو بھول جاؤ کہ وہ دوبارہ تمہیں حاصل ہو سکتی ہے۔''

''اگر آپ نے یہ سوچا ہے تو میری سوچ بھی سن لیجئے۔'' رشید داڑھی کھجا کر بولا۔ ''میں کسی بھی حالت اور کسی بھی قیمت پر نمرہ کو حاصل کر کے رہوں گا۔ آپ مجھے نہیں جانتے، مگر میں اسی طرح کا ہوں۔ جو ٹھان لیتا ہوں، کر کے دم لیتا ہوں۔ جو کہتا ہوں، کر کے دکھاتا ہوں۔ اگر آپ نے سیدھے طریقے سے نمرہ کو میرے حوالے نہیں کیا تو پھر مجھے اپنے طریقے استعمال کرنے پڑیں گے۔ گھی سیدھی اُنگلی سے نہ نکلے تو اُنگلی تو بہر حال ٹیڑھی کرنی ہی پڑتی ہے۔ اگر وہ خود سے میرے پاس نہیں آئی تو پھر میں اپنا بچہ چھین کے لے جاؤں گا۔ بچے کی خاطر تو اُسے میرے پاس آنا ہی پڑے گا۔''

''رشید!'' پروفیسر آفاق آگ بگولا ہو کر اپنی جگہ سے اُٹھے۔

''دھیرج پروفیسر صاحب!.....دھیرج۔'' اس نے دونوں ہاتھوں کو نیچے کی طرف ہلاتے ہوئے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے مزید کہا۔ ''ایسی بات نہیں ہے کہ میں آپ کا احسان نہیں مان رہا۔ آپ نے میری بیوی کا اس وقت ساتھ دیا، اسے اپنے گھر میں رکھا، جس وقت اس کے سگے بھائی نے بھی اس کے لئے اپنے گھر کا دروازہ نہیں کھولا.....پھر بچے کی پیدائش اور یہ سال بھر کا عرصہ.....اس سب سلسلے میں، میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اسی لئے مجھے آپ کو سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لئے کچھ وقت، کچھ مہلت ضرور دینی چاہئے.....سو میں آپ کو ایک ہفتے کا وقت دے رہا ہوں۔ صرف سات دن.....کسی بھی فیصلے پر پہنچنے کے لئے یہ سات دن بہت ہیں۔ امید ہے کہ آپ کا فیصلہ میرے ہی حق میں ہوگا..... بصورت دیگر چار دن بعد میں اپنا بچہ لے جاؤں گا۔ آپ اسے سات پردوں میں بھی چھپا لیں، پھر بھی میں اُسے ڈھونڈ لوں گا۔ اپنے گھر کے گرد فصیل کھڑی کر لیں یا خندق کھدوالیں.....کچھ بھی کر لیں.....مگر آپ مجھے اپنا بچہ لے جانے سے روک نہیں سکیں گے.....اور ہاں، یاد رکھیے گا.....یہ دھمکی نہیں ہے، یہ ایک باپ کا فیصلہ ہے۔''

''تم غلط سمجھ رہے ہو.....نمرہ اور اُس کا بچہ.....'' آفاق صاحب نے کچھ کہنا چاہا۔

''یہ مت کہئے گا کہ وہ دونوں آپ کے گھر میں نہیں ہیں۔'' اس نے درمیان میں ہی بات اچک لی۔ ''کم از کم آپ جیسے صاحبِ علم شخص سے مجھے جھوٹ کی اُمید نہیں ہے۔ اب چار دن بعد ملاقات ہوگی.....چلتا ہوں۔''

وہ جس تیزی سے اندر آیا تھا، اسی تیزی سے واپس چلا گیا تھا۔ اور پروفیسر آفاق حیران و پریشان سے ہلتے ہوئے پردے کو ہی دیکھتے رہ گئے تھے۔

وہ رشید کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس کی دھمکی کو محض مجذوب کی بڑ سمجھ کر نظر انداز کر دینا دانش مندی نہیں تھی۔ نمرہ کے لئے ثابت کیا جا سکتا تھا کہ وہ اب اس کی بیوی نہیں ہے.....مگر بچہ تو بہر حال اُسی کا تھا۔ اگر وہ کسی بھی طرح بچے کو اُٹھا کر لے جائے تو نمرہ تو جیتے جی مر جائے گی۔ اور ماں سے جدا ہو کر سلطانہ اور رشید جیسے سفاک لگوں کے ہاتھ میں پہنچ کر بچہ بھی کیونکر جی سکے گا۔ آفاق صاحب کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک خوف کی سرد سی لہر اُترتی محسوس ہوئی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نمرہ اور مُنّے کی حفاظت کے لئے انہیں کیا قدم اٹھانا چاہئے۔

کل شام ہی رشید کے گھر آنے جانے کے بعد جب وہ متفکر بیٹھے تھے تو غفور نے مشورہ دیا تھا۔

''صاحب جی! آپ رشید کے خلاف تھانے میں رپورٹ کیوں نہیں لکھوا دیتے؟''

مگر وہ ابھی یہ سب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ابھی وہ اپنے طور پر یہ گتھی سلجھانا چاہتے تھے۔ کافی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد ایک خیال ان کے ذہن میں آیا تھا۔ گو کہ اس خیال کو عملی جامہ پہنچانا اتنا آسان نہیں تھا.....خاص طور پر نمرہ کے لئے یہ فیصلہ کرنا شاید بہت ہی مشکل ہوتا.....مگر اُنہیں یقین تھا کہ وہ آخر کار نمرہ کو اس فیصلے کے لئے آمادہ کر لیں گے۔ مگر پہلے انہیں ظفریاب اور فریحہ سے بات کرنی تھی۔ ان کا فیصلہ جانے بغیر وہ اپنے اس خیال کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا

سکتے تھے۔

❀===❀===❀
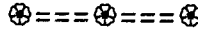
نیلے آکاش کے شفاف سینے پر سورج کا سنہری گولا کسی طلائی تمغے کی طرح جگمگا رہا تھا۔ سورج کی تمازت بھری نارنجی شعاعوں نے پورے لندن کو گرمایا ہوا تھا۔ ہر شخص موسم کی رعنائی و دلکشی میں کھویا شاداں و فرحاں دکھائی دے رہا تھا۔ آج کتنے ہی ہفتوں بعد بادل چھٹے تھے اور نیلگوں شفاف آسمان دمکتے سورج کو آغوش میں لئے کھِلا کھِلا اور شاداب دکھائی دے رہا تھا۔ دھوپ کی نرم تمازت نے ٹھٹھرے ہوئے شہر کو تسکین بھری حلاوت بخشی تھی۔

فریال نے کھڑکی کے پردے سرکا دیئے تھے اور کمرے میں کافی آگے تک دھوپ در آئی تھی۔ ہر شے تیز روشنی میں نہا گئی تھی۔ کارٹ میں لیٹی ننھی کرن نے دھوپ کے باعث مچ مچا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

''بھئی آج تو موسم واقعی بے حد اچھا ہے۔'' اظفر کندھے پر تولیہ ڈالے واش روم سے باہر آئے تو کھڑکی کے اُس پار سنہری دھوپ بکھری دیکھ کر ان کے چہرے پر روپہلی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ ''کیا خیال ہے فری! آج آفس جانے کے بجائے کہیں آؤٹنگ پہ نہ چلا جائے؟''

''جی نہیں۔'' فریال نے بیڈ کی چادر درست کرتے ہوئے تیکھی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ''کل ہی ظفریاب بھائی کہہ رہے تھے، جب سے کرن آئی ہے، آپ بہت چھٹیاں کرنے لگے ہیں۔''

''ارے بھئی! ہم اکیلے چھٹی تھوڑی نا کریں گے؟ ظفریاب بھائی اور فریحہ بھابی کو بھی ساتھ لے کے چلیں گے۔ بلکہ ایسا کرتے ہیں کہ دانیال کو بھی بلا لیتے ہیں۔ سب مل کر پکنک پر چلتے ہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟''

''اس سے پہلے کہ فریال کوئی جواب دیتی، فون کی گھنٹی بج اُٹھی تھی۔

''ذرا دیکھو، کس کا فون ہے؟'' اظفر دریچے کے اس پار بکھری، نکھری صبح کی طرف تکتے ہوئے بولے تھے اور فریال نے آگے بڑھ کر ریسیور کان سے لگا کر ماؤتھ پیس میں ''ہیلو'' کہا تھا۔

''ارے ہماری فری بیٹیا ہے؟'' دوسری طرف سے پروفیسر آفاق کی آواز سن کر وہ ایک دم سے کھل اُٹھی تھی۔

''پاپا!......کیسے ہیں پاپا؟......سب لوگ کیسے ہیں؟......نمو اور تابی دونوں ٹھیک ہیں نا؟......غفور اور عظمت بوا بھی خیریت سے ہیں نا؟''

''ارے بھئی، سانس تو لے لو۔'' آفاق صاحب اس کے عجلت میں سب کا پوچھنے پر بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔

''سب لوگ ٹھیک ہیں۔'' وہ لحظہ بھر کو تھمے۔ ''اظفر میاں کہاں ہیں؟ مجھے ان سے ایک ضروری مسئلے پر مشورہ کرنا ہے۔'' پروفیسر صاحب کا لہجہ ایک دم سے بوجھل اور گمبھیر ہو گیا تھا۔

''پاپا! سب خیریت تو ہے نا؟'' اُن کے لہجے کی گمبھیرتا کو محسوس کر کے فریال نے ہراساں سے لہجے میں پوچھا تھا۔ ''نمرہ اور مُنا تو ٹھیک ہیں نا؟''

''مُنے کے ہی سلسلے میں بات کرنی ہے۔'' آفاق صاحب نے اپنے لہجے کو سرسری بنانے کی کوشش کی۔ ''کہاں ہیں اظفر میاں؟ ذرا اُنہیں فون دو۔''

''جی اچھا'' اُس نے سعادت مندی سے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ اس دوران اظفر خود ہی اس کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے ریسیور ان کی طرف بڑھا دیا۔

''السلام علیکم ماموں جان!'' فون کان سے لگاتے ہی وہ جوش بھرے انداز میں بولے تھے۔ ''کہیے، کیسے ہیں؟''

''اللہ کا کرم ہے۔'' آفاق صاحب دھیمے لہجے میں گویا ہوئے۔ ''اظفر میاں! اس وقت میں نے ایک خاص مسئلے پر

ڈسکس کرنے کے لئے فون کیا ہے۔''

''فرمائیے ماموں جان!'' آفاق صاحب کے لہجے کی سنجیدگی اور فکر مندی نے اظفر کو بھی سنجیدہ اور متفکر کر دیا تھا۔ ''کوئی پریشانی کی بات ہے کیا؟''

''کہہ بھی سکتے ہیں۔'' آفاق صاحب نے گہرا سانس لے کر کہا اور پھر دھیمے لہجے میں رشید کی آمد اور بچے کو چھین کر لے جانے کی دھمکی کے بارے میں انہوں نے سب کچھ کہہ سنایا۔

''اوہ......'' ساری بات سن کر اظفر نے بھی گہرا سانس لیا۔ ''یہ تو واقعی خاصی تشویش ناک بات ہے۔ نمرہ کو وہ بے شک طلاق دے چکا ہے، مگر تابی کا تو وہ بہرحال باپ ہے۔ مگر صاف ظاہر ہے، وہ یہ سب کچھ بچے کے لئے نہیں، نمرہ کو حاصل کرنے کے لئے کر رہا ہے۔ اور وہ کمینہ انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

''ہاں۔'' آفاق صاحب نے تائید بھرے انداز میں سر ہلایا۔ ''میں اس کے کمینے پن سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ اسی لئے اس کی دھمکی سے خاصا پریشان ہو گیا ہوں۔ اگر وہ کسی بھی طرح بچے کو لے جانے میں کامیاب ہو گیا تو بچے کی زندگی تو برباد ہو گی ہی، خود نمرہ بھی زندہ نہ بچ سکے گی۔ تابی ہی تو اس کی زندگی اور اس کی خوشیو کا واحد بہانہ ہے۔''

''یہ تو ہے۔'' اظفر نے تائید کی۔ چند لمحوں تک سوچنے کے بعد انہوں نے متفکر انداز میں سوال کیا تھا۔ ''تو اس سلسلے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''ایک خیال میرے ذہن میں آیا ہے... اگر ظفریاب میاں ساتھ دیں تو بات بن سکتی ہے۔''

آفاق صاحب کی پُرسوچ اور ہچکچاہٹ بھری آواز پر اظفر نے چونک کر جلدی سے پوچھا تھا۔ ''فرمائیے! آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''فریحہ اور ظفریاب شادی کے اتنے سال گزرنے کے باوجود اب تک لاولد ہیں۔'' آفاق صاحب نے بے حد دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔ ''اگر وہ دونوں اپنی زندگی کی اس کمی کو وسیلہ بنا کر تابی کو اڈوپٹ کر لیں تو..... صرف کچھ عرصہ کے لئے...... اس طرح کم وقت میں تابی کو وہاں بلایا جا سکتا ہے۔ اس طرح وہ اس شہر سے ہی نہیں، اس ملک سے بھی باہر چلا جائے گا۔ پھر میں نمرہ کا پاسپورٹ بنوا کر وزٹ ویزا پر اُسے بھی تم لوگوں کے پاس بھیج دوں گا۔ اس کے بعد میں اُس بدطینت انسان سے اچھی طرح نمٹ سکوں گا۔''

''آپ نے بہت اچھی بات سوچی ہے۔'' اظفر نے ساری بات سن کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ ''مگر اس سلسلے میں نمرہ کا کیا کہنا ہے؟..... ان کے ویزہ لگنے اور یہاں تابی کے پاس آنے میں وقت بھی لگ سکتا ہے...... کیا اتنا عرصہ وہ اپنے شیر خوار بچے سے دُور رہنا منظور کر یں گی؟''

''میری ابھی نمرہ سے بات نہیں ہوئی۔'' آفاق صاحب نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ پہلے تم لوگوں کی رائے لے لوں، پھر نمرہ سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔ کیونکہ میں اُسے جانتا ہوں، وہ ایک باشعور اور دُور اندیش بچی ہے۔ خدا نے اُسے صبر کی دولت سے نوازا ہے۔ میرے سمجھانے پر وہ یقیناً مان جائے گی۔ صرف چند مہینوں کی ہی تو بات ہے۔ پھر وہ خود بھی اپنے بچے کے پاس ہو گی۔ رشید جیسے خبیث باپ اور سلطانہ جیسی ظالم دادی کی تحویل میں دینے کے بجائے وہ تابی کو تم لوگوں کی شفقت بھری چھاؤں میں بھیجنے کے لئے بہرحال تیار ہو جائے گی۔''

''آپ بالکل درست سوچ رہے ہیں۔'' ساری بات سن کر اظفرؔ نے متفق ہونے والے لہجے میں کہا۔ ''اگر نمرہ، تابی کو کچھ مہینوں کے لئے ہی سہی خود سے جدا کرنے کی ہمت کر سکتی ہیں تو بھلا یہاں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟..... آپ .مائیے اس سلسلے میں ہمیں کیا کرنا ہے؟''

''تم ذرا ظفریاب میاں کو بلاؤ۔ اس وقت تو گھر میں ہی ہوں گے۔''
آفاق صاحب کے کہنے پر اظفر فون فریال کے ہاتھ میں دے کر تیزی سے ظفریاب کے کمرے کی طرف چلے گئے تھے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر فریال نے بھی ساری باتیں ان سے پوچھ لی تھیں۔
''بچے کے لئے تو یہ بہت اچھا ہوگا کہ وہ رشید کی دسترس سے دور ہو جائے گا۔'' فریال نے ساری بات سن کر متفکر لہجے میں کہا۔ ''مگر نمرہ کا کیا بنے گا؟ وہ بچے کے بغیر کس طرح رہ سکے گی؟ مانا کہ وہ مان جائے گی۔ مگر وہ جس اذیت سے گزرے گی، اسے میں محسوس کرسکتی ہوں۔ کیونکہ میں بھی ایک ماں ہوں۔'' فریال کے لہجے میں گھلے دکھ نے آفاق صاحب کو بھی دکھی کر دیا تھا۔
''میں بھی یہ بات محسوس کرسکتا ہوں۔'' وہ افسردہ لہجے میں گویا ہوئے۔ ''مگر ہمیں نمرہ کو یہ باور کرانا ہی ہوگا کہ بچے کو ہمیشہ کے لئے کھو دینے سے بہتر ہے کہ اسے کچھ عرصہ کے لئے خود سے جدا کر دیا جائے۔ اور پھر یہ جدائی زیادہ عرصے پر محیط نہیں ہوگی۔ میں مُنے کو روانہ کرتے ہی نمرہ کے پاسپورٹ اور ویزا کے لئے کوشش میں لگ جاؤں گا۔ اللہ کی ذات سے امید ہے کہ میری کوششیں بارآور ثابت ہوں گی۔ اور جلد ہی وہ خود بھی اس بچے کے پاس جا پہنچے گی۔''
''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' فریال نے ساری بات سن کر دل سے دعا کی۔ ''کاش! ہم لوگوں نے اس بارے میں پہلے ہی سے سوچ لیا ہوتا۔''
''میرے ذہن میں کبھی بھی یہ اندیشہ نہیں تھا کہ رشید کبھی واپس بھی آ سکتا ہے۔ اور اس طرح نمرہ اور مُنے کا طلب گار ہو سکتا ہے..... ورنہ تو میں نے بہت پہلے ان دونوں کو تم لوگوں کے پاس بھیج دیا ہوتا۔''
''دیر آید درست آید۔'' فریال نے باپ کی افسردگی اور پچھتاوے کو دور کرنے کی خاطر مسکرا کر کہا۔ ''اب بھی ایسا کچھ بگڑا نہیں ہے۔ اِن شاء اللہ! مُنا جلد ہی ہمارے پاس ہوگا۔ اور پھر کچھ ہی دنوں میں نمرہ بھی یہاں آ جائے گی۔''
''اِن شاء اللہ!'' آفاق صاحب پُر جوش لہجے میں بولے۔ ''بلکہ بیٹا! میں تو یہ کہوں گا جب وہ تمہارے پاس آئے تو تم اسے دوسری شادی کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کرنا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟ اس کے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ بھلا یوں اکیلے آخر وہ کب تک زندگی گزارے گی؟''
''آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں پاپا!'' فریال مسرور لہجے میں بولی۔ ''خدا کرے کہ وہ ہماری بات مان لے...... میں دعا گو ہوں کہ ایک بار پھر اس کا گھر بس جائے۔ خدا کرے اس بار کوئی بہت ہی اچھا انسان اس کا شریکِ سفر بنے۔''
''آمین۔'' آفاق صاحب نے دل کی عمیق گہرائیوں سے کہا اور اگلے ہی لمحے فون پر ظفریاب آ گئے تھے۔
کچھ ہی دیر میں تمام معاملات طے پا گئے تھے۔
ظفریاب نے اپنے وکیل کو فون کرکے اڈوپٹیشن کے کاغذات تیار کرنے کو کہہ دیا تھا۔ اگلے دو دنوں میں یہ کاغذات، بچے کا ویزہ اور ہوائی جہاز کا ٹکٹ آفاق صاحب کے پاس پہنچ جانے تھے۔
سب کچھ طے ہو جانے کے بعد مطمئن ہو کر آفاق صاحب نے فون بند کر دیا تھا۔ اب انہیں نمرہ کو سمجھانے اور منانے کا مرحلہ درپیش تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ ساری باتیں سن کر نمرہ کس قدر دُکھی ہوگی۔
جبکہ فریحہ کے لئے یہ خبر حیران کُن ہی نہیں، مسرور کُن بھی تھی۔
''ظفر! مجھے یقین ہی نہیں آ رہا کہ ہم تابی کو اڈوپٹ کر رہے ہیں۔ آپ کبھی بھی کسی بچے کو گود لینے کے حق میں نہیں تھے..... اب آپ خود ہی ننھے تابی کو گود لے رہے ہیں۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے۔''
''فریحہ! ہم تابی کو ہمیشہ کے لئے گود نہیں لے رہے۔'' ظفریاب نے وضاحت کی۔ ''نمرہ کے حالات کے پیش

نظر ہم وقتی طور پر بچے کو پناہ میں لے رہے ہیں۔ کچھ عرصے میں اس کی ماں یہاں آ کر اپنی امانت ہم سے واپس لے لے گی۔"

"یہ تو اچھا ہی ہوگا۔" فریحہ نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "ایسے حالات نہ ہوتے تو وہ خود اپنے بچے کو خود سے جدا نہ کرتی۔ مگر کچھ ہی عرصہ کے لئے سہی، ہمارا تابی، ہمارا آفتاب ہماری آغوش میں چمکنے کے لئے آ رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں، مجھے آفتاب سے کتنی محبت ہے......اور یہ کہ یہ نام بھی میں نے ہی اس کا رکھا ہے۔"

"جانتا ہوں۔" ظفریاب مسکرائے۔ "اب باتیں ختم کرو اور آفتاب کے استقبال کی تیاریاں شروع کر دو۔"

فریحہ، تابی کے استقبال کی تیاریوں میں لگ گئی تھی۔ اتنے عرصے میں پہلی بار ظفریاب اُسے اس قدر خوش اور پُرجوش دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں حیران ہو رہے تھے۔

اگلے دو دن ظفریاب، اظفر اور دانیال بے حد مصروف رہے تھے۔

ان کی کوششوں سے ہفتوں کا کام دنوں میں ہو گیا تھا۔ تمام دستاویزات تیار ہو گئی تھیں اور تابی کا ویزہ بھی لگ گیا تھا۔

"ظفر!" تمام کاغذات کو ریئر کرنے کی تیاری کرتے دیکھ کر فریحہ نے ظفریاب سے کہا تھا۔ "کیوں نہ ہم خود پاکستان جا کر مُنے کو اپنے ساتھ لے آئیں۔"

ظفریاب نے چونک کر فریحہ کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی مسرت و انبساط سے چمکتی آنکھوں میں عجیب سی بے تابی تھی۔ وہ جلد از جلد ننھے تابی کو اپنی سُونی آغوش میں سمیٹ لینے کی متمنی تھی۔ اُس کی خوشی اور بے تابی دیکھ کر ظفریاب کے دل میں ایک بے نام سے دُکھ اور خوف کا احساس جاگ رہا تھا۔

"بولو نا.....کیا ہم پاکستان جا سکتے ہیں؟" انہیں خاموشی سے سوچوں میں گم دیکھ کر فریحہ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ پوچھا تھا۔

"ہاں کیوں نہیں۔" ظفریاب سوچوں کی دلدل سے نکلتے ہوئے بولے۔ "اس میں کوئی قباحت نہیں کہ ہم لوگ خود پاکستان جا کر تابی کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ اس طرح تمہاری نمو اور پاپا سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ مگر فریحہ! ایک بات میری سن لو...... یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں..... ہم قانونی طور پر بچے کو گود تو لے رہے ہیں، مگر ابھی ایسا کچھ نہیں ہوا کہ بچہ ہمیشہ ہی ہمارے پاس رہے گا۔ توقع یہی ہے کہ جیسے ہی وہاں کے حالات درست ہوئے اور رشید کی طرف سے خوف جاتا رہا تو ہمیں بچے کو اس کی ماں کے پاس واپس بھیجنا ہوگا..... یا وہ خود یہاں آ کر ہم سے اپنا بچہ واپس لے لے گی۔ ہم تابی کو ہمیشہ کے لئے گود نہیں لے رہے، بلکہ نمو کی پریشانی اور مصیبت کے پیش نظر بچے کو کچھ عرصے کے لئے محفوظ پناہ دے رہے ہیں۔"

"جانتی ہوں۔" فریحہ کی دمکتی آنکھیں افسردگی اور مایوسی کے گھور اندھیروں میں کہیں کھو سی گئی تھیں۔ "پھر کیوں آپ بار بار یہ تذکرہ کر کے مجھے یہ احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جب خدا نے ہی میری گود خالی رکھی ہے.....تو..... کسی بچے کو گود لینے سے، یہ گود ہمیشہ کے لئے کس طرح بھر سکتی ہے؟"

فریحہ کے لہجے کا کرب ظفریاب اپنے دل میں محسوس کر رہے تھے۔ اسی لئے آج تک وہ کسی بھی بچے کو گود لینے کے لئے تیار نہیں ہوئے تھے۔ مگر جب آفاق صاحب نے ساری صورتِ حال بتا کر اُن سے مدد کی درخواست کی تھی تو وہ انکار نہیں کر سکے تھے۔ اس پل انہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ فریحہ اس سلسلے میں اس قدر جذباتیت کا مظاہرہ کرے گی۔

"اب اتنی مایوسی کی بھی ضرورت نہیں۔" وہ مسکرا کر اس کی دل جوئی کو بولے۔ "کچھ عرصہ کے لئے ہی سہی، ہمارے پاس ایک ننھا مہمان آ رہا ہے۔ ہمیں پوری محبت اور بھرپور مسرت کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرنا ہوگا۔ بلکہ خود جا کر اسے

ساتھ لانا ہوگا۔ میں ابھی فون کرکے اپنی سیٹیں بھی کنفرم کروالیتا ہوں۔''

فریال نے سنا تو خوشی سے بولی۔

''پاپا اور ممو آپ دونوں کو یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔''

اور ٹھیک چار روز بعد فریحہ اور ظفریاب، آفاق صاحب اور ممو کے درمیان تھے۔ نمو کے ساتھ آفاق صاحب کے لئے بھی ان دونوں کی یوں اچانک آمد حیرت بھری مسرت کا باعث تھی۔ صرف ایک رات یہاں گزار کر اگلی صبح وہ ننھے تابی کو لے کر روانہ ہونے والے تھے۔

یہ رات نمو کے لئے بہت صبر آزما تھی۔

جس بچے کی خاطر وہ اب تک زندہ تھی، آج اس بچے کو اسی کی بقا کی خاطر کسی اور کے حوالے کرنے پر مجبور تھی۔ مگر یہ بات اس کے لئے باعثِ تسکین واطمینان تھی کہ اس کا بچہ بے حد محبت کرنے والے ہاتھوں میں جا رہا تھا۔ اسے فریحہ پر ہی نہیں، اس پورے گھرانے پر اندھا اعتماد تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید وہ اپنی جان دے دیتی مگر اپنے لختِ جگر کو خود سے جدا نہ کرتی۔ اُس نے تابی کو فریحہ اور ظفریاب کی گود میں دینے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اپنے اس فیصلے پر وہ خوش اور مطمئن تھی۔ مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتی جو اپنے جیتے کے بچھڑنے کے تصور سے ہی مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگتا تھا۔

گو کہ وہ جانتی تھی کہ یہ جدائی وقتی ہے، مگر پھر بھی جدائی تو جدائی ہی تھی۔

''نمرہ بیٹا! بالکل فکرمند نہ ہونا۔ ہم نے تمہارا پاسپورٹ بننے کے لئے دے دیا ہے۔ پاسپورٹ آتے ہی تمہارا ویزہ اپلائی کردیں گے...... پھر دیکھنا، دیکھتے ہی دیکھتے تم خود اپنے تابی کے پاس ہوگی۔''

آفاق صاحب نے اس کی آنکھوں میں بکھری اُداسی اور مایوسی کو دیکھتے ہوئے پُر جوش لہجے میں کہہ کر اس کے ملال کو کم کرنے کی کوشش کی تھی اور نمو نے خاموشی سے تابی کو فریحہ کی گود میں ڈال دیا تھا۔

''آپی! میرا بچہ آپ کی امانت میں ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے، آپ اسے کبھی بھی میری کمی محسوس نہیں ہونے دیں گی۔''

فریحہ نے گول مٹول، پیارے سے تابی کو ممتا کی تمام تر شدتوں کے ساتھ سینے سے چپٹا لیا تھا۔ تابی کی گود میں آتے ہی سینے سے لگتے ہی اسے اپنی ذات کی تکمیل کا یقین ہو رہا تھا۔ برسوں سے تڑپتے دل کو کیسا قرار آ گیا تھا۔ چراغ مانگنے کا ہی سہی پر اس کی محرومی کے اندھیروں میں روشنیاں بکھر گئی تھیں۔

وہ بچہ کہ جس کے گود میں آتے ہی نمرہ کو نئی زندگی مل گئی تھی، اس بچے کو فریحہ کی گود میں دے کر وہ خالی خالی نظروں سے اپنی گود کو دیکھ رہی تھی..... یہ زبردستی کا سودا نہیں تھا۔ پروفیسر آفاق تو خود اس فیصلے کے بعد افسردہ تھے۔ ویزے اور دیگر کاغذی کارروائیوں میں بہت زیادہ وقت لگنے کا امکان نہ ہوتا تو وہ مُنے کے ساتھ نمرہ کو بھی پردیس بھیج دیتے۔ مگر اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

رشید نے صرف ایک ہفتے کا وقت دیا تھا۔

اور وہ جانتے تھے رشید، نمرہ کو حاصل کرنے کے لئے لمحہ لمحہ گن کر گزار رہا تھا۔ وہ تابی کو رشید کی کسی سازش کا شکار نہیں ہونے دینا چاہتے تھے...... اسی لئے انہوں نے نمرہ کے سامنے یہ رائے رکھی تھی۔

''نمو بیٹی! اگر تم چاہو، تمہارا دل مانے تو ہم مُنے کو لندن فریحہ اور فریال کے پاس بھیج سکتے ہیں۔''

''وہ کس طرح؟'' نمو نے چونک کر پوچھا تھا۔

فریحہ اور ظفریاب اب تک اولاد کی نعمت سے محروم ہیں۔ اگر وہ تابی کو گود لے لیں تو ہم آسانی سے اور لیگل طریقے سے

مُنّے کو وہاں بھیج کر رشید کے ہتھکنڈوں اور پنچ سے دُور بھیج سکتے ہیں۔"

نمرہ کے حسین چہرے پر ملال بھری سوچ کے سائے بکھر گئے تھے۔

"بیٹی! یہ صرف ایک رائے ہے..... میں جانتا ہوں، ایک ماں کے لئے اپنے بچے کو خود سے جدا کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا..... اسی لئے، آخری فیصلہ تمہارا ہی ہوگا۔"

"انکل.....!" کئی لمحوں تک سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد نمرہ نے پُرعزم انداز میں سر اٹھا کر پروفیسر آفاق کی طرف دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔ "انکل! اپنے بچے کو ہمیشہ کے لئے کھو دینے سے بہتر ہے کہ میں کچھ عرصہ کے لئے، اپنے ہاتھوں سے اسے محفوظ ہاتھوں میں سونپ دوں۔ میں رشید کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ کسی بھی طرح مجھ سے یہ بچہ چھین کر لے جائے گا..... اُسے اُس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جس بچے کو دنیا میں آنے سے پہلے ہی وہ اپنا ماننے سے انکار کر چکا ہے، اب وہ اس بچے کے لئے صرف اس لئے بے چین ہے تاکہ مجھے مجبور کر سکے اور اسے تکلیف دے کر مجھے تکلیف دے سکے۔ میں ہر طرح کی تکلیف اُٹھانے کے لئے تیار ہوں..... مگر اپنے لعل کو اُن جیسے ظالموں کے حوالے کرنے کو تیار نہیں۔ اس لئے آپ نے جو سوچا ہے، وہی میرا بھی فیصلہ ہے۔"

تابی کو فریحہ اور ظفریاب کے حوالے کر دینے کا اس کا اپنا فیصلہ تھا اور اسے اپنے اس فیصلے پر کوئی پریشانی یا بے اطمینانی نہیں تھی۔ مگر مُنّے کو فریحہ کی آغوش میں ڈالتے سے جانے کیوں اس کی روح تک تڑپ اُٹھی تھی۔ روم روم میں ایک انجانا سا زہر سرایت کرتا محسوس ہوا تھا۔

وہ رات سب ہی نے آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔

پو پھٹنے کے ساتھ ہی سب ایئرپورٹ کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ ننھا تابی، پروفیسر آفاق کی گود میں تھا۔ جب سے وہ اس دنیا میں آیا تھا، ان کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ وہ گھر میں ہوتے تو زیادہ وقت تابی کے ساتھ کھیلنے میں گزارتے تھے۔ جب وہ اپنی لڑکھڑاتی زبان میں "نانا..... نانا" کہنے کی کوشش کرتا تو وہ خوشی سے نہال ہو اُٹھتے تھے۔ اور آج اس پل وہ اپنی زندگی کی اس خوشی کو فریحہ کی آغوش میں دے رہے تھے۔ تابی نے اُن کی طرف دیکھا تھا، پھر کسمسا کر اپنا سر فریحہ کے سینے پر ٹکا دیا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے آنکھیں بند کر کے نیند کی آغوش میں کھو گیا تھا۔

ایئرپورٹ سے واپسی پر نمرہ کو کسی خالی پن اور کچھ کھو دینے کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی ممتا کو زہر جدائی پلا کر اپنے لختِ جگر کو نئی زندگی دے دی تھی۔ اس نے رشید اور سلطانہ کے بے رحم چنگل سے اپنے ننھے شہزادے کو بچا لیا تھا۔ اس نے آج رشید کو شکست دے دی تھی۔ فضا میں پنکھ پھیلائے پرواز کرتا جہاز لمحہ بہ لمحہ مُنّے کو رشید کی پنچ سے دُور لے جا رہا تھا۔ اب رشید کچھ بھی کر لیتا پر اس کے مُنّے کو اس سے چھین نہیں سکتا تھا۔

آفاق صاحب نے ڈرائیو کرتے ہوئے گردن کو ہلکا سا خم دے کر نمرہ کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر ملال کے ساتھ حوصلے اور صبر کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ وہ مُنّے سے جدا ہو کر ملول تو تھی مگر اسے رشید کے چنگل سے محفوظ کر دینے پر مسرور بھی تھی۔

⊛===⊛===⊛
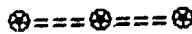
نیلگوں آکاش پر سنہرا چاند اپنے کامل روپ کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔ چہار سُو چاندنی کا افسوں بکھرا ہوا تھا۔

"وجاہت منزل" کے وسیع احاطے میں ہوا کے نرم جھونکے سرسراتے پھر رہے تھے۔ ایسے میں عاتکہ بیگم اُداس سی دریچے میں کھڑی چاند کی اور تک رہی تھیں۔ چودھویں کا چاند ہمیشہ ہی ان کے لئے بے حد پُرکشش رہا تھا۔ کبھی جو اُن کے سرسبز لان

میں چاندنی بکھرتی تو وہ سحرزدہ سی سبزے پہ چہل قدمی کر کے کیسی انوکھی الوہی خوشی محسوس کرتی تھیں۔اور آج احاطے کی کچی زمین پہ چاندنی گرد میں اٹی محسوس ہو رہی تھی۔

تب ہی کونے میں موجود اسٹینڈ پر دھرے فون کی گھنٹی بج اُٹھی تھی۔فون لاؤنج میں تھا۔مگر جب نکیتا کسی کام سے اِدھر اُدھر ہوتی تو فون اُٹھا کر ان کے کمرے میں رکھ جاتی تھی۔عاتکہ بیگم نے افسردہ نظروں سے فون کی طرف دیکھا، پھر آہستگی سے دریچے سے ہٹ کر فون کی طرف بڑھ گئیں۔

''کیا سرمد سے بات ہو سکتی ہے؟'' ریسیور کان سے لگاتے ہی ایک اجنبی اور قدرے کرخت نسوانی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

''آپ کون؟'' وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی تھیں۔

''اگر سرمد گھر میں ہیں تو.....اُن سے کہئے کہ فروا کا فون ہے۔''

فروا کے سپاٹ جواب پر وہ چونک اُٹھی تھیں۔

''فروا.....کون؟'' انہوں نے خائف سے لہجے میں سوال کیا تھا۔''کہیں ندرت جہاں کی بیٹی.....فروا جہاں تو نہیں؟'' وہ جملہ پورا کئے بغیر ہی خاموش ہو گئی تھیں۔

''معلوم نہیں آپ کون ہیں جو سوال پہ سوال کئے جا رہی ہیں۔'' فروا نے قدرے غصے اور اکھڑ پن سے کہا تھا۔''جی، آپ درست سمجھیں۔میں ندرت جہاں کی بیٹی، ثروت جہاں کی بہن فروا ہوں۔اور کچھ......؟''

عاتکہ بیگم پوری جان سے لرز اُٹھی تھیں۔زبان تالو سے جا لگی تھی۔کچھ بھی نہ بول سکیں۔ریسیور سائیڈ پہ رکھ کر انہوں نے نکیتا کو آواز دینے کی کوشش کی تھی۔

''جی اماں جی!'' نکیتا ان کے کمرے کی طرف ہی آ رہی تھی، آواز سنتے ہی لپک کر اندر داخل ہوئی تھی۔

''سرمد سے کہہ دو ان کے لئے فون ہے۔'' ان کی آواز کی شکستگی کو نکیتا نے بھی محسوس کیا تھا۔ایک ناقابل بیان دکھ نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ان کی امیدوں کی ہر کشتی ندرت جہاں کے بھنور میں ہی کیوں جا پھنستی تھی؟.....ان کی خوشی کا ہر پرندہ ندرت جہاں کے بچھائے جال میں ہی جا پھنستا تھا۔وہ کتنی ہی دیر ملول و رنجور سی بیٹھی حالات کی ستم ظریفی پہ غور کرتی رہی تھیں۔ان کی جہاں دیدہ نظروں نے فروا کو دیکھے بنا اُس کے ارادوں کو بھانپ لیا تھا۔اُس کے لہجے کی نخوت اُس کی سوچ کی غماز تھی۔وہ لحظہ بھر میں جان گئی تھیں کہ ان کی آخری پونجی بھی ندرت جہاں کے ہاتھوں لٹنے کو تیار ہے۔

وہ لاٹھی کا سہارا لیتی، آہستہ روی سے چلتی راہ داری میں نکل آئی تھیں۔سرمد کب کے فون پہ بات کرنے کے بعد اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔لاؤنج میں دھرا فون، خاموش نظروں سے ان کی بے تابی کو دیکھ رہا تھا۔وہ آہستگی سے چلتی، وجاہت مرزا کے کمرے میں چلی آئی تھیں۔

وجاہت مرزا تکیے پہ سر دھرے، آنکھیں بند کئے ساکت پڑے تھے۔آنکھوں کے گرد سیہ حلقے اور چہرے پہ کھنڈی زردی ان کی لاغری اور نقاہت کا پتہ دے رہی تھی۔فالج کے حملے کے تحت وقتی طور پر ان کا بایاں حصہ مفلوج ہوا تھا۔وہ بولنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو گئے تھے۔مگر بروقت مؤثر علاج کے باعث یہ دونوں تکالیف رفع ہو چکی تھیں۔مگر وہ اب بھی چلنے اور بولنے سے معذور تھے۔لندن اور امریکہ سے بلوائے گئے اسپیشلسٹ اور مقامی ماہرینِ امراض کا بھی یہی کہنا تھا کہ وہ نقاہت اور ذاتی وجوہ کی بنا پر بولنے اور چلنے سے قاصر ہیں۔خود ڈاکٹر رحمان کی بھی یہی رائے تھی کہ ایسا نہیں ہے کہ وہ بول یا چل نہیں سکتے۔مگر وہ خود یہ سب کرنے سے گریزاں تھے۔ان کے دل و ذہن میں اس قدر مایوسی اور قنوطیت تھی کہ وہ زندہ رہ کر بھی مُردوں کی سی زندگی اپنائے ہوئے تھے۔اور اس کا صرف ایک ہی علاج تھا، ان کی مایوس اور خوشی سے محروم زندگی میں

کسی بھی طرح خوشی وطمانیت کا احساس جگایا جاتا......ان کے تنہا اور آزردہ دل کو اپنے پن اور اُلفت کی پوروں سے چھو کر زندگی کی حدت اور تمازت دی جاتی۔ مگر سوال یہ تھا، یہ سب کیسے ہوتا؟

ڈاکٹر رحمان کا خیال تھا کہ سرمد کی شادی، وجاہت مرزا کے لئے ایک بہت بڑی خوشی ثابت ہوسکتی تھی۔

خود عاتکہ بیگم نے نہ چاہتے ہوئے بھی سرمد کی شادی کے کتنے سپنے بُن لئے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تو شادی کے نام سے ہی متنفر تھے۔ مگر وہ جانتی تھیں کہ ان کی نم آنکھیں سرمد سے بہت کچھ منوا سکتی ہیں......مگر اس سے قبل کہ وہ سرمد کے لئے کسی لڑکی کا انتخاب کرتیں، آج بالکل اچانک اتفاقی طور پر ان کی سماعت سے فروا کا نام ٹکرا گیا تھا۔

فروا......ندرت جہاں کی بیٹی......ثروت کی بہن۔

ایک بار پھر طوفان اُن کے اُجڑے آشیانے کی طرف قدم رنجہ تھے......خزاں اُن کے ویرانے پر ایک بار پھر دستک دینے کو تھی۔

وہ کتنی ہی دیر اُداس اور ملول سی بیٹھی وجاہت مرزا کا زرد اور مدقوق چہرہ تکتی رہی تھیں، پھر آہستگی سے اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

وہ پوری رات ان کی آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ بہت سوچنے اور غور کرنے کے بعد انہوں نے پروفیسر آفاق سے اس سلسلے میں بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

''اماں بی!'' پروفیسر آفاق فون پہ ان کی آواز سن کر حیرت بھری مسرت سے بولے تھے۔ ''آداب!......کیسی ہیں اماں بی؟''

''آفاق بیٹے! کیا تم شام کو میرے پاس آسکتے ہو؟''

''جی ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔'' آفاق صاحب جلدی سے بولے۔ ''سب ٹھیک تو ہے نا؟....وجاہت کی طبیعت کیسی ہے؟''

''اللہ کا کرم ہے۔'' اماں بی نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ''تم آؤ گے تو پھر بات ہوگی۔''

آج کل آفاق صاحب، رشید کی وجہ سے خاصے اُلجھے ہوئے تھے۔ تابی کو رشید کی دسترس سے دُور بھیج کر انہیں کچھ اطمینان تو ہوا تھا مگر نمرہ کی اُداسی اور تنہائی ہر پل ان کا دل دُکھاتی رہتی۔ کل رات کو بھی جب وہ اپنے کمرے کی طرف جارہے تھے تو انہوں نے نمرہ کو ملول و رنجور سا کھڑکی سے چاند کی طرف تکتے دیکھا تھا۔

گھر کی فضا بھی عجیب ویران سی ہوگئی تھی۔

ہر سمت ملال سا بکھرا ہوا تھا۔ گھر میں سب ہی لوگ تو موجود تھے۔ صرف ایک تابی کے نہ ہونے سے پورا گھر سناٹوں سے بھر گیا تھا۔ پچھلے چار دنوں میں نمرہ کو کتنی ہی بار یہ شعر یاد آیا تھا۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اِک شخص پورے شہر کو ویران کر گیا

ننھے تابی کے جانے سے تو اُس کی گود سُونی ہوئی تھی۔ مگر جانے کیوں پورا گھر، پورا شہر، پوری دنیا خالی خالی لگنے لگی تھی۔

دل تو اُس کا اُداس تھا......مگر سارا شہر سائیں سائیں کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ حالانکہ یہ خود اسی کا فیصلہ تھا۔

بہت سوچ سمجھ کر اس نے تابی کو خود سے جدا کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اپنے اس فیصلے پر وہ ناخوش یا غیر مطمئن نہیں تھی اس نے خود کو غمِ جدائی دے کر اپنے چہیتے کو عمر بھر کے غموں سے بچا لیا تھا۔ اسے یقین تھا، فریحہ اسے ماں کی کمی کبھی بھی محسوس نہ ہونے دے گی۔ اس گھر میں وہ خوش وشاد مان اور حفاظتوں کی چھاؤں میں پلے گا......اس نے خود کو دکھ دے کر مُنے کو ہزاروں

دکھوں سے بچالیا تھا۔ مُنے کی زندگی کو تحفظ اور خوشیوں سے بھر دیا تھا۔ یہ سب کچھ جان کر اور مان کر بھی دل تھا کہ مانتا ہی نہ تھا۔ اس کا دل ہی نہیں، گھر کے در و دیوار بھی سُونے ہو گئے تھے۔ عظمت بی، غفور، آفاق صاحب سب ہی اپنی اپنی جگہ اُداس تھے۔ مگر سب ہی یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کوئی انہونی نہیں ہوئی ہے..... ہر چیز اپنی جگہ پر موجود ہے..... سب کچھ نارمل ہے۔

نمرہ کی اُداسی کے علاوہ رشید کی پریشانی بھی ان کے لئے فکر و تردّد کا باعث بنی ہوئی تھی۔ گو کہ تابی، رشید کی دسترس سے دور ہو گیا تھا۔ مگر نمرہ تو ابھی اسی گھر میں موجود تھی اور ...... اور اس کا اصل ٹارگٹ نمرہ ہی تھی۔ وہ ہر حال میں، ہر قیمت پر کسی بھی طریقے سے نمرہ کو حاصل کرنے کا خواہاں تھا۔ اور وہ ایک باپ ہونے کے ناطے کسی بھی طور اپنی بے زبان بیٹی کو اس ظالم کے چنگل سے بچانے کے لئے کوشاں تھے۔

یونیورسٹی سے اُٹھنے کے بعد وہ پہلے گھر گئے تھے۔ کچھ دیر نمرہ کے ساتھ گزار کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''کہیں جا رہے ہیں کیا؟'' غفور نے قدرے حیرت سے پوچھا تھا۔ کیونکہ آفاق صاحب یونیورسٹی سے آنے کے بعد شاذ و نادر ہی گھر سے نکلا کرتے تھے۔

''ہاں، وجاہت منزل جا رہا ہوں۔'' آفاق صاحب نے جواب دیا۔ ''اماں بی نے فون کر کے بلایا ہے۔ خدا کرے سب خیر خیریت ہو۔''

''ان شاء اللہ! سب ٹھیک ہوگا۔'' غفور نے جواب دیا۔ اور آفاق صاحب گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

ہارن کی آواز پر چوکیدار خانو نے گیٹ کھولا تھا۔ ان پر نظر پڑتے ہی ادھیڑ عمر چوکیدار کی باچھیں کھل گئی تھیں۔

''سلام صاحب!'' اس نے ہاتھ اٹھا کر سلام پیش کیا تھا۔

''وعلیکم السلام!'' پروفیسر آفاق نے مسکرا کر جواب دیا تھا اور گاڑی اندر لے گئے تھے۔

ابھی کچھ دیر پہلے ہی سرمد گھر پہنچے تھے۔

تھکے تھکے قدموں سے وہ برآمدے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھے ہی تھے کہ انہیں اپنے پیچھے پورچ میں کسی کار کے رُکنے کی آواز سنائی دی تھی۔ انہوں نے چونک کر، پلٹ کر دیکھا تھا۔ پروفیسر آفاق گاڑی کی چابی ہاتھ میں تھامے انہی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''سلام انکل!'' سرمد نے شائستہ اور محبت بھرے لہجے میں سلام کیا تھا اور پروفیسر آفاق کے لبوں پر مشفقانہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

''وجیہہ اب کیسے ہیں؟'' سلام کا جواب دے کر آفاق صاحب نے اپنے دوست کی خیریت معلوم کی تھی۔

''جیسے تھے، ویسے ہی ہیں۔'' سرمد نے بجھے بجھے لہجے میں جواب دیا۔ ''بلکہ اب تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ افاقہ کے بجائے دن بہ دن مرض میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ کمزوری اور نقاہت انتہا کو پہنچ گئی ہے۔''

''ہاں، یہ تو ہیں۔'' پروفیسر آفاق نے متفکر لہجے میں سرمد کی بات کی تائید کی۔ ''اُس روز ڈاکٹر رحمان سے میری بات ہوئی تھی۔'' برآمدے کی سیڑھیاں طے کر کے راہ داری میں دائیں جانب بڑھتے ہوئے آفاق صاحب نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''ان کا کہنا ہے کہ وجاہت کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ مگر ان کے اندر جینے کی اُمنگ ختم ہو گئی ہے۔ کسی بھی چیز سے رغبت باقی نہیں رہی۔ سانس لینے کی حد تک زندہ ہیں۔ ورنہ زندگی کی کوئی اُمنگ، کوئی ترنگ، کوئی خوشی موجود نہیں۔''

''جی، ایسا ہی ہے۔'' سرمد نے کرب بھرے انداز میں سر جھکا لیا۔

''سرمد بھیا!'' نکیتا لپکتی ہوئی آگے بڑھی تھی۔ ''سلام پروفیسر انکل!'' آفاق صاحب پر نظر پڑتے ہی اس نے مؤدب انداز میں جھک کر سلام کیا تھا۔

''جیتی رہو۔'' آفاق صاحب نے مسکرا کر مشفق انداز میں جواب دیا۔ ''کیسی ہو بٹیا؟''

''میں تو ٹھیک ہوں۔ بس ابا جان کسی طرح ٹھیک ہو جائیں۔ میں تو رات دن بھگوان سے یہی پراتھنا کرتی ہوں۔''

''بس تم دعا کرتی رہو۔ دیکھنا، اِن شاءاللہ! جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔'' آفاق صاحب پُریقین لہجے میں بولے اور وجاہت مرزا کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

خلافِ معمول آج عاتکہ بیگم وجاہت مرزا کے کمرے میں موجود نہیں تھیں۔

''اماں بی کہاں ہیں؟'' انہوں نے وجاہت مرزا کی دیکھ بھال کرنے والی نرس، ریٹا سے پوچھا۔

''غالباً وہ اپنے کمرے میں ہوں گی۔'' ریٹا نے دھیمی آواز میں جواب دیا تھا۔ سرمد اُن سے اجازت لے کر چینج کرنے کے لئے اپنے کمرے کی طرف جا چکے تھے۔ چنانچہ آفاق صاحب نے اماں بی کے کمرے میں جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

ابھی انہوں نے اماں بی کے دروازے پر دستک کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دروازہ کھٹ سے کھل گیا تھا۔

''ارے پروفیسر انکل۔'' نکیتا کی مسکراتی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ ''اچھا ہوا آپ خود ہی چلے آئے۔ ورنہ ابھی میں آپ کو بلانے کے لئے ہی آرہی تھی۔''

پروفیسر آفاق مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

ہمیشہ کی طرح کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ساگوان کی کشادہ مسہری پہ عاتکہ بیگم تکیوں کے سہارے افسردہ دل گرفتہ سی بیٹھی تھیں۔

''اماں بی! آپ ٹھیک تو ہیں؟'' ان کی بجھی آنکھیں اور اُترا چہرہ دیکھ کر آفاق صاحب بے تابانہ ان کی جانب لپکے تھے۔

''آؤ بیٹھو۔'' اماں بی نے ان کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے سامنے دھری کرسی کی طرف اشارہ کیا، پھر پلٹ کر نکیتا کی طرف دیکھا۔

''نکو بٹیا!...... جاؤ، زلیخا سے کہو چائے یہیں بھیج دے۔ آج ہم اپنے بیٹے کے ساتھ اپنے کمرے میں ہی چائے پئیں گے۔''

''جی بہتر۔'' نکیتا نے جھک کر جواب دیا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ اس دوران آفاق صاحب کرسی پر بیٹھ چکے تھے اور سوالیہ نظروں سے عاتکہ بیگم کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''آفاق میاں!'' کئی لمحوں تک سوچوں میں کھوئے رہنے کے بعد عاتکہ بیگم نے دھیمی اور پُرسوچ آواز میں انہیں پکارا تھا۔ ''آج ہم نے آپ کو اپنی ایک پریشانی شیئر کرنے کے لئے بلایا ہے۔''

''فرمایئے اماں بی!'' آفاق صاحب جلدی سے بولے۔ ''میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''بیٹا!'' عاتکہ بیگم حیران و پریشان لہجے میں گویا ہوئیں۔ ''کل فروا کا سرمد کے لئے فون آیا تھا۔''

''فروا......؟'' آفاق صاحب نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں۔'' عاتکہ بیگم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ثروت کی چھوٹی بہن ہے۔ ندرت جہاں کی چھوٹی بیٹی...... وہ تو کل میں نے اتفاق سے فون اٹھا لیا۔ اس کے لب و لہجے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ سلسلہ کافی عرصے سے جاری ہے۔''

''اوہ......'' آفاق صاحب کے لب تشویش بھرے انداز میں سمٹ گئے۔ انہوں نے تو سرمد کو فروا کے ساتھ شاپنگ

مال میں دیکھا تھا۔ ایک لمحے کو ان کا دل چاہا وہ عاتکہ بیگم کو یہ بات بھی بتا دیں۔ اگرا گلے ہی لمحے انہوں نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا۔ وہ ان کی پریشانی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

''ہم نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ تم سے یہ مشورہ کر سکیں کہ کیا ہمیں سرمد سے اس سلسلے میں بات کرنی چاہئے؟''

''آپ کیا بات کریں گی؟'' آفاق صاحب نے سر اٹھا کر اماں بی کے متفکر چہرے کی طرف دیکھا۔ ''کیا ان سے فروا اور ان کے تعلقات کے بارے میں پوچھیں گی؟''

''نہیں۔'' عاتکہ بیگم نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہم ان سے کہیں گے کہ اگر انہیں فروا پسند ہے تو وہ اس سے شادی کر لیں۔''

''کیا.....؟'' آفاق صاحب اُچھل پڑے۔ ''اماں بی! آپ جانتی ہیں نا فروا، ندرت جہاں کی بیٹی ہے..... وہ ندرت جہاں جس نے کبھی وجاہت کو چین کا سانس نہیں لینے دیا۔ ثروت کی اسد سے شادی کی بنا پر ہی آج وجاہت مُردوں کی صورت بستر پر پڑے ہیں۔''

''ہاں، جانتے ہیں۔'' عاتکہ بیگم کے بے بس لہجے میں صدیوں کی مسافت کی تھکن نمایاں تھی۔ ''مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم کسی کو بھی روکنے اور اپنی مرضی پہ چلانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ وجاہت کو سطوت سے شادی سے روکا، وہ نہ مانے۔ وجاہت کو ثروت اور اسد کی شادی میں رکاوٹ بننے سے روکنا چاہا..... انہوں نے اب بھی ہماری بات نہ مانی۔ اسد کو روکنا چاہا، وہ بھی نہیں رُکے۔ مگر اب ہم چاہتے ہیں کہ ہم بالکل نہ روکیں۔ ہم خود سے سرمد سے کہنا چاہتے ہیں کہ شاید اس رشتے پر وجاہت کو اعتراض ہوتا مگر وہ تو اب دنیا و مافیہا سے بے خبر بستر پر پڑے ہیں۔ اس لئے وہ کسی کی بھی پروا کئے بغیر جائیں اور فروا کو اپنی دُلہن بنا کر اس گھر میں لے آئیں..... ان کی تنہائی، خاموشی اور گھر میں بکھرے سناٹے ہمیں زندہ درگور کئے جاتے ہیں۔''

''اماں بی!'' آفاق صاحب کرسی سے اُٹھ کر عاتکہ بیگم کے قریب بیڈ پر آ ٹکے تھے۔ انہوں نے محبت بھرے انداز میں انہیں شانوں سے تھام کر دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ ''آپ اس سلسلے میں جلد بازی نہ کریں۔ سرمد کو میں جس حد تک جانتا ہوں، اس حوالے سے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا فروا سے اس طرح کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ ہاں، البتہ فروا کی طرف سے کسی بھی کوشش کا امکان ہو سکتا ہے۔ اس لئے آپ کچھ توقف کیجئے۔ فروا سے سرمد کی شادی کا مطلب، وجاہت منزل کے تابوت میں آخری کیل لگانا ہوگا۔''

کتنی ہی دیر آفاق صاحب، عاتکہ بیگم کے قریب بیٹھے انہیں سمجھاتے اور حوصلہ دیتے رہے۔ یہ انہی کی باتوں کا اثر تھا کہ جب نکیتا چائے کی ٹرالی دھکیلتی کمرے میں داخل ہوئی تو وہ خاصی حد تک مطمئن اور خوش دکھائی دے رہے تھے۔

چائے پی کر آفاق صاحب واپسی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی باتوں، دلیلوں اور تعدیلوں سے عاتکہ بیگم کو تو مطمئن کر دیا تھا..... مگر خود اور زیادہ فکر مند ہو گئے تھے۔

ایک طرف نمرہ اور رشید کا مسئلہ تھا۔

رشید کی دی ہوئی وقت کی مہلت ختم ہو چکی تھی۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ ایک ہفتے میں اگر انہوں نے اس کی بیوی اور بچہ اس کے حوالے نہیں کیا تو وہ کسی بھی طرح اپنا بچہ اور بیوی ان کی پناہ سے چھین کر لے جائے گا۔ بچے کو تو انہوں نے اس کے کریہہ عزائم سے بہت دُور بھیج دیا تھا..... مگر نمرہ ابھی اسی گھر میں موجود تھی۔

اور وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے، رشید کا اصل ہدف نمرہ ہی ہے۔

''وجاہت صاحب کی طرف سب خیریت تو ہے نا؟'' گیٹ بند کرتے ہوئے غفور نے سوال کیا تھا۔

''ہاں۔ سب ٹھیک ہے۔'' آفاق صاحب گاڑی سے باہر آتے ہوئے گویا ہوئے۔ ''نمرہ کہاں ہے؟''

''بوااور نمو آپی اندر لاؤنج میں بیٹھی ہیں۔'' غفور نے جواب دیا۔ ''آپ ہی کا انتظار ہو رہا تھا۔ کھانا لگادوں؟''
''ہاں لگا دو۔'' آفاق صاحب نے بے دلی سے جواب دیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔
''میں سوچ رہی ہوں کہ آپ کی اسٹڈی کی صفائی کی جائے۔'' کھانے کے دوران نمرہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو آفاق صاحب اپنی سوچوں کی دنیا سے نکل کر چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔
''Good....'' آفاق صاحب مسکرائے۔ ''بہت اچھا سوچ رہی ہیں یہ آپ۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ سوچ آپ کے ذہن میں آئی کیوں؟''
نمرہ کو ہمیشہ سے ہی گھر داری کے تمام امور کا شوق رہا تھا۔ شاید یہ شریفن خالہ کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ سینے، پرونے، کاڑھنے، پکانے سے لے کر گھر کی تزئین و آرائش ہمیشہ سے ہی نمرہ کا شوق رہا تھا۔ بے حد اچھی طالبہ ہونے کے ساتھ وہ ایک بہت ہی اچھی گھریلو لڑکی بھی تھی۔
''بس خود کو مصروف رکھنے کے لئے...... سوچا آپ کی اسٹڈی اور گھر کے دیگر کمروں کی تزئین و آرائش پہ کام کیا جائے۔'' نمرہ نے سر جھکا کر بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔
''بھئی بہت ہی عمدہ خیال ہے۔'' ماحول میں پھیلی افسردگی کو دور کرنے کی خاطر آفاق صاحب قدرے شوخ لہجے میں بولے۔ ''غفور میاں کو تو ہم نے کبھی یہ اجازت نہیں دی کہ وہ ہماری کتابوں کے ساتھ اٹھا پٹخ کریں۔ البتہ ہم تم پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ تمہیں پوری اجازت ہے..... اسٹڈی ہی کیا، تم پورے گھر کو اٹھا پٹخ سکتی ہو۔''
ان کی بات پہ سب ہی کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔
کھانے کے بعد چائے کا دور چلا تھا اور چائے کے بعد سب ہی اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے تھے۔
نمرہ اور عظمت بی ایک ہی کمرے میں سوتی تھیں۔ نمرہ کے بیڈ کے ساتھ ہی تابی کا خالی جھولا دھرا تھا۔ کمرے کے باہر اندرونی برآمدے میں پڑی چوکی پر غفور سوتا تھا...... جبکہ برآمدے میں کھلنے والے دو دروازوں میں سے ایک دروازہ آفاق صاحب کے بیڈ روم کا تھا۔
آج آفاق صاحب خود کو خاصا بے چین اور مضطرب محسوس کر رہے تھے۔ کتنی ہی دیر وہ بستر پر کروٹیں بدلتے رہے تھے۔ پھر جانے کب نیند کی آغوش میں چلے گئے تھے۔
کوئی آہٹ ہوئی تھی، یا کہیں سے کُنڈا کھلنے کی آواز آئی تھی جو کچھ بھی تھا، آفاق صاحب کی کھٹ سے آنکھ کھل گئی تھی۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ ہر سمت سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ وہ ایک دم سے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ تکیے کے نیچے سے انہوں نے پستول نکال لیا تھا۔ وہ جونہی برآمدے میں آئے تو دیکھا غفور بھی اُٹھ بیٹھا تھا۔
''کیا ہوا؟'' انہوں نے اشارے سے سوال کیا۔
''کوئی ہے۔'' غفور نے بھی اشارے سے ہی جواب دیا تھا۔ آفاق صاحب پستول والا ہاتھ آگے کئے، پرچ میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھے۔ غفور ان کے پیچھے تھا۔ جونہی وہ بیرونی برآمدے میں نکلے، انہوں نے دیکھا کہ ایک چھوٹے قد کا گھٹے ہوئے جسم کا آدمی مولسری کے پیڑ تلے کھڑا تھا۔ اس کی نظر جونہی آفاق صاحب کے پستول پر پڑی، وہ ایک دم سے الرٹ ہو گیا تھا۔ اس نے تیر کی سی تیزی سے گیٹ کی طرف جست لگائی تھی۔ گیٹ میں اندر کی طرف سے رات کو تالا لگا دیا جاتا تھا۔ مگر سائیڈ کا چھوٹا گیٹ ایسے ہی بند کر دیا جاتا تھا۔ اس چھوٹے گیٹ کی کُنڈی اُتری ہوئی تھی۔ غالباً وہ پہلے ہی گیٹ کھول کر اپنے جانے کا راستہ کھول چکا تھا۔ اور اسی کُنڈی کے کھولنے کی آواز پہ ہی آفاق صاحب کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ تیزی سے لپکتا ہوا گیٹ تک آیا اور اس نے آناً فاناً گیٹ کھول کر باہر چھلانگ لگا

دی۔ غفور تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ گیٹ سے باہر نکل کر دیکھنے پر اسے ایک سایہ گلی کا موڑ مڑ کر تاریکی میں گم ہوتا دکھائی دیا تھا۔

''بھاگ گیا صاحب!'' غفور نے آفاق صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''گیٹ بند کردو۔'' آفاق صاحب نے اشارے سے کہا اور آہستگی سے اندر کی طرف مڑ گئے۔ عظمت بی اور نمرہ گہری نیند سوئی ہوئی تھیں۔ ہر چیز اپنی جگہ پر جوں کی توں موجود تھی۔

کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ آفاق صاحب اپنے کمرے کی طرف مڑتے ہوئے دھیمے لہجے میں گویا ہوئے۔ ''بلاوجہ خواتین پریشان ہوں گی۔''

''آپ تھانے میں رپورٹ نہیں کروائیں گے؟'' غفور نے سوال کیا۔ ''صاف ظاہر ہے، یہ رشید کا بھیجا ہوا گرگا ہے۔ آج اسے شاید موقع نہیں مل سکا۔ مگر کل کلاں...... وہ کوئی نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔'' غفور کی دھیمی آواز سے دبا دبا غصہ نمایاں تھا۔

''ہاں، اس سلسلے میں غور کرنا ضروری ہے۔'' آفاق صاحب نے متفکر لہجے میں کہا۔ ''خیر اب تم سو جاؤ۔ میں دیکھتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔''

آفاق صاحب آہستگی سے اپنے بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔ پستول دوبارہ سے انہوں نے تکیہ کے نیچے رکھ دیا تھا۔ وہ تھانے، عدالت اور اخبار و میڈیا کے چکر سے بچنا چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے، نمرہ کا نام لوگوں کے سامنے آئے اور وہ مفت کی رُسوائی کا نشانہ بنے۔ اسی لئے انہوں نے خاموشی سے مُنے کو رشید کی پہنچ سے دُور بھیج دیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ چند ماہ کے بچے سے ایک ماں کا دُور رہنا کتنا صبر آزما ہوگا۔

اب انہیں نمرہ کے بارے میں سوچنا تھا۔

ڈی آئی جی اکمل خان سے اُن کی اچھی یاد اللہ تھی، اس لئے انہوں نے اسی وقت فیصلہ کیا تھا کہ کل یونیورسٹی پہنچتے ہی وہ اکمل خان سے مشورہ کریں گے۔ وہ دوبارہ سے تکیہ پر سر رکھ کر لیٹ گئے تھے۔ مگر اب نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ان کی سماعت سے فجر کی اذان کی آواز ٹکرائی تھی اور وہ کلمۂ طیب پڑھتے ہوئے دوبارہ سے اُٹھ بیٹھے تھے۔

رات کے واقعے سے عظمت بی اور نمرہ دونوں ہی بے خبر تھیں۔ اور صبح ہوتے ہی نماز و تلاوت سے فارغ ہوتے ہی نمرہ اسٹڈی کی صفائی اور نئے سرے سے ترتیب و تزئین کے لئے کمر بستہ ہوگئی تھی۔ اُسے پُرجوش اور مصروف دیکھ کر آفاق صاحب کو ایک بے نام سی خوشی اور تسکین کا احساس ہو رہا تھا۔

''غفور میاں! ہمارے آنے تک خواتین کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر، آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔'' یونیورسٹی کے لئے روانہ ہوتے وقت آفاق صاحب نے دھیمی آواز میں غفور کو ہدایت دی تھی۔

''آپ تھانے میں رپورٹ کریں گے نا؟'' غفور رات کے واقعے سے خاصا سہما ہوا تھا۔

''یونیورسٹی پہنچتے ہی ڈی آئی جی اکمل خان سے مشورہ کروں گا۔'' آفاق صاحب نے غفور کی تشفی کے لئے اسے بتانا ضروری سمجھا تھا۔

''ارے ہاں۔ ڈی آئی جی صاحب تو آپ کے دوست ہیں۔'' غفور ایک دم خوش ہو کر بولا۔ ''فریال بی بی کی شادی میں بھی آئے تھے۔''

''ارے غفور میاں! یہ پولیس والے کسی کے دوست نہیں ہوتے۔'' آفاق صاحب خوشگوار انداز میں مسکرائے۔ ''مگر

تم فکر مت کرو۔ یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ اِن شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘

⊛===⊛===⊛
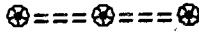
’’کیا کہہ رہا ہے اے ٹھنگے؟‘‘ رشید حیران نظروں سے گٹھے ہوئے جسم کے ٹھنگنے قد کے شخص کو تک رہا تھا۔

’’سچ کہہ رہا ہوں استاد!‘‘ واجد عرف ٹھنگنے نے آنکھیں پھیلا کر پُر زور لہجے میں کہا۔ ’’میں نے اچھی طرح پورے گھر کو دیکھا.....ایک ایک کمرہ چھان لیا۔ پرے گھر میں کہیں بھی کوئی بچہ نہیں تھا۔‘‘

’’یہ کیسے ممکن ہے؟‘‘ رشید نے بے یقین نظروں سے ٹھنگنے کی طرف دیکھا۔ ’’سال سوا سال کا یا آٹھ دس مہینے کا ایک بچہ اس گھر میں ضرور ہونا چاہئے.....کوئی کارٹ یا جھولا وغیرہ تھا؟‘‘

’’ہاں، ایک جھولا تھا تو۔‘‘ ٹھنگنے نے سر کھجاتے ہوئے یاد کیا۔ ’’مگر وہ جھولا خالی پڑا تھا۔ سامنے کی جانب دو عورتیں سو رہی تھیں۔ اندر والے کمرے میں پروفیسر تھا.....اور باہر برآمدے میں ایک اٹھارہ اُنیس سال کا لڑکا سویا پڑا تھا۔‘‘

’’ان دونوں عورتوں میں.....ایک عورت.....بہت بہت زیادہ حسین تھی؟‘‘ رشید نے بے تاب لہجے میں سوال کیا۔ اس کی آواز سے اشتیاق جھلک رہا تھا۔

’’پتہ نہیں استاد! کمرے میں خاصا اندھیرا تھا۔ اور میں جلدی میں تھا۔ تم نے تو کہا تھا، صرف بچے کو لانا ہے۔ میں بچے کو ڈھونڈنے میں لگا تھا۔ اس لئے عورتوں پہ توجہ نہیں دے سکا۔‘‘

ٹھنگنے کے جواب سے رشید کو خاصی مایوسی ہوئی تھی۔ حسنہ کے کہنے کے مطابق پروفیسر کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور دونوں بیٹیاں بیاہ کر پردیس جا بسی تھیں۔ گھر میں صرف ایک نوکر غفور تھا..... یا پھر نمرہ کو ہونا چاہئے۔ پھر یہ دوسری عورت کون تھی؟.....اور اگر ان دونوں عورتوں میں سے ایک نمرہ تھی تو پھر بچہ کہاں تھا؟.....اتنا چھوٹا بچہ تو کہیں بھیجا ہی نہیں جا سکتا۔ پھر یہ سب کیا تھا؟

رشید بری طرح اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ اب اُسے حسنہ کے بیان پر بھی شبہ ہونے لگا تھا۔ مگر اس نے خود اپنی آنکھوں سے نمرہ کو پروفیسر آفاق کے ساتھ گاڑی میں دیکھا تھا۔ اور پروفیسر نے نمرہ کے نہ ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نمرہ، پروفیسر کے گھر میں ہی تھی۔ مگر سوال یہ تھا کہ پھر بچہ کہاں تھا؟

کتنی مشکل سے اُس نے ٹھنگنے کو تلاش کیا تھا۔ چھوٹی موٹی چوری چکاری کا عادی یہ معمولی سا غنڈہ رشید کے اُن دنوں کا جاننے والا تھا، جن دنوں وہ خود بھی یہی سارے کام کیا کرتا تھا۔ ٹھنگنے کو تلاش کرنے کے بعد بہت مشکل سے اُس نے اسے اس بات پر راضی کیا تھا کہ وہ پروفیسر کے گھر میں داخل ہو کر بچے کو اُٹھا لائے۔ ٹھگنا اس کام کے لئے تیار نہیں تھا۔

’’استاد! پروفیسر پڑھا لکھا آدمی ہے.....میں پکڑا گیا تو آسانی سے بچ نہیں سکوں گا۔‘‘

’’تُو اس کی فکر مت کر۔‘‘ رشید نے اسے دلاسہ دیا تھا۔ ’’میں نے سب انتظام کر لیا ہے۔ وہ میرا اپنا بچہ ہے۔ میں تو اُلٹا پروفیسر پر کیس ٹھونک دوں گا، اپنے بچے اور بیوی کو حبسِ بے جا میں رکھنے کا۔‘‘

کسی طرح سمجھا بجھا کر اس نے ٹھنگنے کو اس کام کے لئے آمادہ کر لیا تھا۔ ٹھگنا ہمت کر کے پروفیسر آفاق کے گھر میں کود گیا تھا۔ خاموشی اور آہستگی کے ساتھ اُس نے پورا گھر دیکھ ڈالا تھا۔ مگر جس بچے کو لے جانے کے لئے وہ اس گھر میں آیا تھا، وہ بچہ اسے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ چنانچہ وہ واپسی کے لئے مڑ گیا تھا۔ بڑے گیٹ میں اندر کی طرف تالا لگا تھا۔ چھوٹا گیٹ جو عام طور پر آمد و رفت کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، محض اُس میں کُنڈی لگی تھی۔ اُس نے جونہی کُنڈی کھولی، ہلکی سی آواز ہوئی تھی۔ اور شاید یہی آواز سن کر برآمدے میں لیٹا لڑکا جاگ اُٹھا تھا۔ ساتھ ہی پروفیسر صاحب بھی باہر آ گئے تھے۔

''استاد!..... پروفیسر کے ہاتھ میں پستول تھی۔'' ٹھگنے نے خوف زدہ لہجے میں بتایا۔

''پستول؟'' رشید بھی حیران ہوا۔

''ہاں استاد!.....اوپر والے نے کرم کر دیا......ورنہ آج تو سچی میرے بچے یتیم ہو جاتے۔''

بچوں کے ذکر پر ایک بار پھر رشید اپنے بچے کے خیال میں گم ہو گیا تھا۔

'کیا واقعی نمرہ کے گھر کوئی بچہ ہوا تھا؟..... یا ہونے سے پہلے ہی.....'

وہ اس سے آگے کچھ نہیں سوچ سکا۔ سچ تو یہ تھا کہ اسے بچے سے ایسی کوئی خاص رغبت تھی ہی نہیں۔ وہ تو بچے کو سیڑھی بنا کر نمرہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اب یہ سیڑھی موجود نہیں تھی.....اب اُسے ڈائریکٹ نمرہ تک پہنچنا تھا۔ سو وہ تیار ہو کر یونیورسٹی کے لئے روانہ ہو گیا۔ آج اُس نے پروفیسر صاحب سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''سلام پروفیسر صاحب!'' گاڑی سے باہر نکلتے ہی پروفیسر آفاق نے رشید کو اپنے سامنے کھڑے پایا تھا۔ انہیں تھوڑی حیرت ہوئی۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ وہ رات کی کارروائی کے بعد اتنی جلدی ان کے سامنے آ کھڑا ہو گا۔

''پہلا سوال تو آپ سے میں یہ کروں گا کہ میرا بچہ آپ نے کہاں چھپا دیا ہے؟''

آفاق صاحب کو اُس کے اس سوال پہ بھی حیرت ہوئی تھی۔ اُس کی دیدہ دلیری اُنہیں بے نام سی پریشانی میں مبتلا کر رہی تھی۔

''تو گویا تم اس بات کا اقرار کر رہے ہو کہ رات کو میرے گھر بھیجا گیا اُچکا تمہاری ہی طرف سے بھیجا گیا تھا۔'' آفاق صاحب نے خود کو سنبھال کر کہا۔ ''اور جانتے ہو، اس حرکت کی کیا سزا ہو سکتی ہے؟''

''اور یقیناً آپ بھی یہ جانتے ہوں گے کہ کسی شریف اور غریب انسان کی بیوی کو زبردستی اپنے قبضے میں رکھنے کی کیا سزا ہو سکتی ہے۔'' رشید نے گھبرائے بنا بھرپور اعتماد سے جواب دیا تھا۔ ''میری جوان اور حسین بیوی کو آپ نے اپنے گھر میں قید کر کے رکھا ہوا ہے.....کیا رشتہ ہے آپ کا اُس سے؟''

رشید کا سوال حیران کُن ہی نہیں، پریشان کُن بھی تھا۔

ہمارا قانون بھی عجیب ہے۔ رشید نے اپنی بیوی کو اس وقت طلاق دے کر گھر سے نکال دیا، جب وہ اُمید سے تھی۔ کوئی قانون اُس سے یہ سوال نہیں کر سکتا کہ تُو نے ایسا کیوں کیا۔ نہ اس کے لئے کوئی سزا تھی۔

انو، نمو کا سگا بھائی تھا۔ مگر اُس نے اس بے کسی اور پریشانی کے وقت جب نمو بھری دنیا میں تنہا تھی، ساتھ نہیں دیا۔ اپنے گھر میں پناہ نہیں دی اور اسے زمانے کی ٹھوکریں کھانے کے لئے اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ کوئی قانون اس وقت اس سگے بھائی سے یہ سوال نہیں کر سکتا تھا کہ اس مشکل اور مصیبت کے وقت اس مجبور اور بے کس عورت کا تیرے سوا اور کوئی سہارا نہیں ہے۔ نہ اس کے لئے کوئی سزا تھی۔ مگر اب.....جبکہ آفاق صاحب نے نمو کو سہارا دیا تھا، پناہ دی تھی تو اس وقت قانون یہ سوال کرنے کا پورا پورا حق رکھتا تھا کہ ایک غیر لڑکی کو آپ اپنے گھر میں رکھنے والے کون ہیں؟ اور اس جرم کی سزا بھی تھی۔ اُن پہ اغوا اور حبسِ بے جا کا کیس بن سکتا تھا۔

عجیب تھی یہ دنیا۔

اور اس دنیا کے قانون بھی عجیب ہی تھے۔

''پروفیسر صاب! میں جانتا ہوں، آپ کی نیت بری نہیں۔ ایک طرح سے میں آپ کا احسان مند بھی ہوں کہ آپ نے میری بیوی اور بچے کو پناہ دی۔ بچے کے ساتھ کیا بنا؟ یہ میں ابھی سوال نہیں کروں گا۔ البتہ میری بیوی آپ کے گھر میں موجود ہے۔ میں آپ کو تین دن کا وقت دیتا ہوں افہام و تفہیم سے یہ معاملہ حل ہو جائے تو بہتر ہے۔ آپ عزت

والے آدمی ہیں۔ آپ کا نام اخباروں میں اُچھلے، میڈیا میں آئے...... آپ ہرگز یہ پسند نہیں کریں گے۔ اور آپ یہ بھی نہیں چاہیں گے کہ نمرہ رُسوا ہو۔ اس لئے میں تین دن آپ کو دے رہا ہوں۔ آپ سوچ لیجئے۔ اُمید ہے کہ سوچ بچار کے بعد آپ کا فیصلہ میرے ہی حق میں ہوگا...... تین دن بعد میں اپنی بیوی کو لینے آپ کے گھر آؤں گا۔ اگر آپ نے اسے میرے ساتھ روانہ نہیں کیا تو ہر بات کے ذمے دار آپ خود ہوں گے۔ میرے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں، میرے پاس اب کھونے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے...... صرف پانے کی اُمید ہے...... حاصل کرنے کا یقین ہے۔ میں اپنی جان داؤ پہ لگا کر بھی نمرہ کو حاصل کروں گا۔ کیونکہ اب یہ میری انا کا مسئلہ ہے...... میری ضد ہے...... اور میری ماں کہتی ہے، میں بچپن سے ہی بے حد ضدی اور ہٹیلا ہوں۔''

رشید الوداعی انداز میں دو اُنگلیاں اُٹھا کر رخصت ہو چکا تھا۔ مگر آفاق صاحب اپنی جگہ گم صم سے کھڑے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ رشید جیسے ٹٹ پونجیے سے نمٹنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ مگر وہ اپنا اور نمرہ کا نام سرِ راہ اُچھالنا نہیں چاہتے تھے۔ باپ اور بیٹی کے پاکیزہ رشتے پہ کوئی الزام برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے اس وقت سب سے ضروری بات یہ تھی کہ نمرہ کو فوری طور پر ان کے گھر سے دُور کر دیا جاتا۔ مگر سوال یہ تھا کہ وہ نمرہ کو اپنے گھر سے نکال کر کہاں بھیجیں؟ کسی ہوسٹل، کسی دارالامان یا کسی دوست رشتے دار کے گھر؟...... وہ آہستگی سے چلتے اپنے کمرے تک چلے آئے تھے۔ وہ سکون سے بیٹھ کر کچھ سوچنا چاہتے تھے۔ وہ وزٹ ویزے پر نمرہ کو لندن روانہ کرنے کا پہلے ہی فیصلہ کر چکے تھے۔ مگر ویزہ وغیرہ لگنے میں ایک سے ڈیڑھ مہینہ لگ سکتا تھا۔ اس دوران وہ نمرہ کو اپنے گھر سے نکال کر کسی محفوظ مقام پہ رکھنا چاہتے تھے۔ ان تمام باتوں پر غور کرنے سے پہلے انہوں نے ڈی آئی جی اکمل خان خان سے بھی مشورہ کر لینا ضروری سمجھا تھا۔

''پروفیسر آفاق!...... کیا واقعی یہ تم ہی ہو؟'' نمبر ملتے ہی دوسری طرف سے اکمل خان کی حیرت بھری مسرت میں ڈوبی آواز سنائی دی تھی۔ ''اوہ میرے دوست! کہاں ہو یار؟...... آج اتنی مدت بعد تمہاری آواز سنائی دی ہے۔''

''خان! مجھے ایک بے حد ضروری مسئلے پر ڈسکس کرنا ہے۔'' آفاق صاحب اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے مدعا پر آ گئے تھے۔ ''ایک بہت ہی اہم مسئلہ درپیش ہے۔ اور مجھے تمہارے مشورے اور مدد کی ضرورت ہے۔''

''کہو، مسئلہ کیا ہے؟'' اکمل خان، آفاق صاحب کے سنجیدہ لہجے سے مترشح گمبھیرتا کو محسوس کر کے اسی سنجیدگی سے بولا اور آفاق صاحب نے بنا کم و کاست ساری کہانی اسے کہہ سنائی دی۔

''ہوں......'' ساری کہانی سن کر اکمل خان نے پُرسوچ انداز میں ہنکارہ بھرا تھا۔ ''تم درست انداز میں سوچ رہے ہو۔ نمرہ کو تمہیں کچھ عرصے کے لئے اپنے گھر سے دُور کرنا ہوگا۔''

''میں نے اسے اس کی بہنوں کے پاس لندن بھیجنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مگر فارمیلٹیز پوری ہونے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ اس دوران سمجھ نہیں آ رہا اسے کہاں رکھوں؟'' آفاق صاحب پُرسوچ انداز میں گویا ہوئے۔

''رشید کے خلاف کارروائی کے دوران اسے تمہارے گھر میں نہیں ہونا چاہئے۔'' اکمل خان نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''کہیں بھی رکھو، مگر اپنے گھر سے دور کر دو۔ اور اگر رکھنے کا مسئلہ ہے...... تو میرے گھر بھیج دو۔ کچھ ہی دنوں کی تو بات ہے...... ذرا نہ ہچکچانا۔ یہ گھر تمہارے دوست کا گھر ہے۔''

''اگر نمرہ کو کسی دوست کے گھر بھیجنا ہے تو......'' آفاق صاحب ایک دم سے چونک کر سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ''نمرہ کے لئے سب سے محفوظ پناہ گاہ وجاہت مرزا کا گھر ہو سکتا تھا۔ وہاں عاتکہ بیگم جیسی مشفق اور مدبر خاتون موجود تھیں جو نمرہ کے لئے بہترین سہارا ثابت ہو سکتی تھیں۔ اور محض چند ہفتوں کی ہی بات تھی۔ ویزہ لگتے ہی وہ اسے لندن روانہ کر دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس طرح اُس کی اپنے شیر خوار بچے سے جدائی بھی ختم ہو سکتی تھی۔

''چلو، یہ مسئلہ سمجھو حل ہو گیا۔ اب آگے......؟'' آفاق صاحب نے سوال کیا۔

''آگے کا تمام معاملہ تم مجھ پہ چھوڑ دو۔'' اکمل خان نے اپنی گھنی مونچھوں کو مروڑتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ اس قابل بھی نہیں رہ سکے گا کہ کبھی اپنی زبان سے نمرہ کا نام بھی لے سکے۔ تم یہ سب باتیں چھوڑو۔ بس چند دنوں کے لئے نمرہ کو کہیں اور منتقل کر دو۔ اصل میں تم ایک شریف اور عزت دار انسان ہو۔ ایسا نہ ہوتا تو اس بات کی بھی ضرورت نہ ہوتی۔ دراصل میں نہیں چاہتا کہ رشید، نمرہ کو تمہارے گھر میں موجودگی کو کوئی اور رنگ دے۔ تم تو جانتے ہی ہو، آج کل میڈیا کا دور ہے..... گھڑی بھر میں منہ سے بات نکلتی ہے اور کوٹھوں چڑھ جاتی ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ نمرہ اور تمہارا نام لوگوں کے سامنے غلط انداز میں اُچھالا جائے۔ اور اس کا ایک معمولی سا حل ہے کہ کچھ دنوں کے لئے نمرہ کو اپنے گھر سے دُور کر دو۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''ہاں۔'' آفاق صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں پہلے سے ہی اسی انداز میں سوچ رہا تھا۔ میں شام تک تمہیں صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہوں۔ اب اجازت چاہوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اکمل خان نے اخلاص بھرے لہجے میں کہا۔ ''اور ہاں، زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ رشید تو کوئی چیز ہی نہیں۔ کیا پِدّی اور کیا پِدّی کا شوربہ۔ ہم نے تو بڑے بڑے سورما، بڑے بڑے طرم خان ٹھیک کر دیئے ہیں..... بالکل بے فکر ہو جاؤ۔''

''او کے۔'' آفاق صاحب دھیمے سے مسکرائے۔ ''بہت شکریہ۔''

فون بند کر کے وہ دونوں کہنیوں کو میز پہ ٹکائے دونوں ہاتھوں کو باہم پھنسائے کتنی ہی دیر سوچوں میں ڈوبے رہے تھے۔ نمرہ کو وقتی طور پر انہوں نے وجاہت منزل بھیجنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ جانتے تھے، اماں بی یا کسی سے بھی کہے سنے بنا بھی وہ نمرہ کو لے جا کر وہاں چھوڑ سکتے تھے۔ مگر وہ اس بات سے گریزاں تھے۔ وہ نمرہ کو وہاں لے جانے سے پہلے اماں بی سے بات کر کے ان کی منظوری لینا ضروری سمجھتے تھے۔ سو اسی مقصد کے تحت وہ اپنے کمرے سے نکل کر پارکنگ کی طرف بڑھ گئے۔ وہ ابھی، اسی وقت اماں بی سے مل کر اس مسئلے پر گفت و شنید کرنا چاہتے تھے۔

پروفیسر آفاق کو خلافِ معمول اور خلافِ توقع اس وقت اپنے سامنے پا کر عاتکہ بیگم حیران بھی ہوئی تھیں اور مسرور بھی۔ مگر ان کا متفکر چہرہ اور متوحش آنکھیں دیکھ کر وہ ایک دم سے پریشان ہو اٹھی تھیں۔

''آفاق میاں! سب ٹھیک تو ہے نا؟'' انہوں نے فکروں میں گھری آواز میں سوال کیا تھا۔ ''بچیاں تو خیریت سے ہیں نا؟''

''جی۔ فریحہ اور فریال تو ٹھیک ہیں۔'' آفاق صاحب نے سر جھکا کر دھیمے لہجے میں جواب دیا تھا۔ ''مگر نمرہ کے سلسلے میں، میں بے حد فکر مند ہوں۔''

''نمرہ؟'' اماں بی نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ''کون نمرہ؟''

اور آفاق صاحب نے گمبھیر آواز اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں نمرہ کے بارے میں سب کچھ انہیں کہہ سنایا تھا۔

''ہائے بے چاری بچی۔'' نمرہ کی بے بسی اور مظلومیت پہ عاتکہ بیگم کی پلکیں نم ہو گئی تھیں۔ ''اتنی سی عمر میں کیا کچھ سہہ گئی..... اپنے ننھے سے بچے سے بھی جدا ہونا پڑا..... مگر وہ کمینہ اب بھی جونک کی طرح اس کی جان کو چمٹا ہوا ہے..... آفاق میاں! تم ابھی، اسی وقت جاؤ اور نمرہ کو یہاں لے آؤ۔ مہینہ پندرہ دن نہیں، جب تک وہ چاہے اس گھر میں رہ سکتی ہے۔ اس گھر میں اسے کبھی کوئی تکلیف، کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ مجھے تو یہ سوچ کر افسوس ہو رہا ہے کہ اگر تمہیں پہلے یہ خیال آ جاتا تو اسے اپنے ننھے سے بچے سے جدا ہی نہ ہونا پڑتا۔ دونوں ماں بیٹا آرام سے اس گھر میں رہتے۔ اور وہ

بد بخت رشید کبھی انہیں ڈھونڈ نہ پاتا۔

''جی اماں بی!'' آفاق صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔انہیں ملول دیکھ کر عاتکہ بیگم جلدی سے بولیں۔

''خیر......جو ہونا تھا، ہو چکا۔اوپر والے کی یہی مرضی تھی۔لندن بھی اب ایسا کون سا دور رہا ہے......حالات بہتر ہوتے ہی بچے کو پھر بلوایا جا سکتا ہے۔''

''جی اماں بی!'' آفاق صاحب نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔

''بس بیٹا! اب تم دیر نہ کرو۔جا کر جلدی سے نمرہ کو یہاں سے آؤ۔اس کے بعد اُس رشید کی ایسی خبر لینا کہ وہ ہمیشہ کے لئے اس معصوم بچی کا نام لینا ہی بھول جائے۔''

''جی اماں بی!'' آفاق صاحب اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔پہلے اکمل خان سے، پھر عاتکہ بیگم سے بات کر کے انہیں بڑی تقویت ہوئی تھی۔خاص طور پر اس پل اماں بی کی محبت اور معاونت نے انہیں بہت حوصلہ دیا تھا۔وہ دل سے عاتکہ بیگم کے شکر گزار ہوتے اپنے گھر کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔

''نگو!'' عاتکہ بیگم نے آفاق صاحب کے جانے کے بعد نگو کو بلایا تھا۔

''جی اماں بی؟'' نگو جلدی سے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

''دیکھو! اکبر سے کہہ کر ہمارے ساتھ والا کمرہ صاف کروا دو۔'' اماں بی نے سوچتی نظروں سے نکیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''اور ہاں، باتھ روم میں تولیہ، صابن اور ٹوتھ پیسٹ وغیرہ بھی رکھوا دینا۔''

''کوئی مہمان آنے والا ہے کیا اماں بی؟'' نکیتا نے پُر شوق لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں، نمرہ آ رہی ہے۔'' اپنے لہجے کے اشتیاق اور اپنے پن پہ وہ خود بھی حیران ہوئی تھیں۔یا تو اس نام میں ہی کچھ ایسا تھا یا اس کے درد بھرے حالات جان کر انہیں نمرہ سے بے حد ہمدردی اور اپنائیت محسوس ہو رہی تھی۔انہیں ایسا لگ رہا تھا، کوئی انجانی اجنبی لڑکی نہیں بلکہ کوئی بہت ہی اپنی، بہت ہی پیاری ہستی ان سے ملنے اور ان کے پاس رہنے کے لئے آ رہی ہے۔

عاتکہ بیگم کو مسرور و مگن دیکھ کر نکیتا کو بھی خوشی ہو رہی تھی۔اتنی بڑی وسیع و عریض لق و دق کوٹھی میں رہنے والے تھے ہی کتنے؟......اب نمرہ کے آنے کا سن کر اسے بھی بے حد اچھا لگ رہا تھا۔

''بھگوان کرے، نمرہ آپی بہت ہی اچھی ہوں۔میں تو ان سے بہت بہت باتیں کروں گی۔''

عاتکہ بیگم کے بیڈ روم سے ملحقہ کمرہ کھلوا کر صفائی کرواتے ہوئے نکیتا دل میں سوچ رہی تھی۔'وہ یقیناً بہت اچھی ہوں گی......ان کا تعلق پروفیسر انکل سے ہے۔وہ بری ہو ہی نہیں سکتیں۔''

گھر میں ہونے والی اس تحریک اور ہلچل سے بے خبر سرمد اپنے آفس میں عجب اُلجھے ہوئے سے بیٹھے تھے۔اس دن فروا نے گھر فون کیا تھا اور اتفاق سے فون اماں بی نے اٹھا لیا تھا۔انہوں نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا تھا، مگر ان کے چہرے پہ پھیلی اُداسی اور آنکھوں سے جھانکتی مایوسی نے انہیں بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔صورت حال سے انہوں نے بارہا فروا کو آگاہ کیا تھا۔ان حالات میں وہ فروا کو کوئی بھی آس اور اُمید دلانے کی پوزیشن میں نہیں تھے اور نہ ہی وہ اُسے دھوکے میں رکھنا چاہتے تھے۔یہ سچ تھا کہ کبھی وہ اپنے دل میں اس کے لئے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ایک بار تو وہ یہ وعدہ بھی کر بیٹھے تھے کہ کبھی انہوں نے شادی کے بارے میں سوچا تو ان کا پہلا انتخاب فروا ہی ہو گی......مگر پھر وجاہت مرزا کی بگڑتی حالت اور اماں بی کی نم پلکیں اُن کی اس سوچ کو ریزہ ریزہ کرنے کا باعث بن گئی تھیں......شاید اب بھی ان کے دل کے نہاں خانوں میں کہیں فروا کے لئے کوئی میٹھا سا احساس موجود ہو......مگر بظاہر وہ حالات کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

اور انہوں نے اپنے تئیں فروا سے ہر تعلق، ہر ناطہ توڑ دیا تھا...... مگر ایک فروا تھی..... خوابوں کی نگری سے باہر آنے کو تیار ہی نہیں تھی۔

اس روز شاپنگ سینٹر میں مل گئی تھی۔ اتفاق سے آفاق صاحب بھی وہیں موجود تھے۔ یہ سوچ کر وہ اب تک شرمندہ تھے کہ جانے آفاق انکل نے کیا سوچا ہوگا اور کیا سمجھا ہوگا...... اور پھر اُس شام اماں بی کے فروا کے فون ریسیو کرنے پر بھی وہ متفکر ہوئے تھے۔ جانے اماں بی کیا سمجھ رہی ہوں گی اور بلاوجہ دُکھی ہو رہی ہوں گی۔ انہیں عاتکہ بیگم اور وجاہت مرزا سے زیادہ دنیا میں کوئی بھی عزیز نہ تھا۔ وہ اپنی ان دونوں عزیز ہستیوں کو خوش و خرم اور شاداں و فرحاں دیکھنے کے خواہاں تھے اور ان دونوں کی خوشی کی خاطر وہ کچھ بھی کر گزرنے کے لئے تیار تھے۔

ابا جان اور اماں بی کی خاطر ایک فروا تو کیا، وہ پوری دنیا سے ناطہ توڑ سکتے تھے..... دل کا ایک بے نام سا تعلق تو کیا، وہ جسم و جان کا رشتہ بھی توڑ سکتے تھے۔ مگر شاید وہ اپنی اس والہانہ محبت کے اظہار سے قاصر تھے۔ پروفیسر آفاق اور ڈاکٹر رحمان کا خیال تھا کہ ایک وہ ہی تھے جو اس گھر میں خوشی کے دیپ جلا سکتے تھے..... اُمیدوں کے رنگ برسا سکتے تھے..... مگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ یہ سب کس طرح کر سکتے ہیں۔

اسی کشمکش میں اُلجھے، اسی ادھیڑ بُن میں مبتلا وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ آج وہ روزمرہ سے کچھ جلدی ہی گھر جانے کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔

❀===❀===❀

آفاق صاحب کے یونیورسٹی کے لئے روانہ ہوتے ہی نمرہ اُن کی اسٹڈی میں آ گئی تھی۔ یہ ایک لمبوترا اور کم چوڑا کمرہ تھا۔ سامنے کی طرف ایک دروازہ تھا اور پچھلی اور دائیں جانب کی دیواروں پر ایک ایک کشادہ کھڑکی تھی۔ پچھلی طرف والی کھڑکی الماریوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ فرش پہ ایک پرانا قالین بچھا تھا اور سامنے والی کھڑکی پردے سے محروم تھی۔ الماریاں، میز اور کرسیاں گو کہ مضبوط اور ٹھیک ٹھاک حالت میں تھیں..... مگر مدتوں سے ان پہ پالش نہیں ہوئی تھی۔ قالین کے وسط میں بچھا رگ پرانا اور بدرنگ ہو گیا تھا۔

نمرہ نے غفور اور عظمت بی کی مدد سے سب سے پہلے الماریوں کی ترتیب بدلی تھی اور الماری کے پیچھے چھپی کھڑکی کو بھی الماری کی قید سے آزاد کروا لیا تھا۔ چھت، دیواروں اور فرش کی اچھی طرح صفائی کر کے اس نے تمام الماریوں اور فرنیچر پہ پالش کی تھی..... مُنّے کی پیدائش کے بعد آفاق صاحب نے اس کے کمرے کے لئے ہلکے آسمانی رنگ کے ریشمی پردے بنوائے تھے۔ مگر وہ پردے ابھی تک استعمال نہیں ہوئے تھے۔ نمرہ نے اس وقت وہ پردے اسٹڈی کی کھڑکیوں اور دروازوں پہ ڈال دیئے تھے۔ الماریوں میں دھری کافی کتابوں کی جلد شکستہ اور بدرنگ ہو گئی تھی۔ نمرہ نے غفور کو بھیج کر چکنا کاغذ منگوا کر پرانی اور شکستہ کتابوں پہ کور چڑھا کر، دیدہ زیب انداز میں اُن کے نام تحریر کر کے ان کتابوں کو الماری میں ترتیب سے لگا دیا تھا۔

فرش کے پرانے اور بدرنگ کارپٹ کو ہٹا کر اس نے ہلکے سرمئی ٹائلز سے بہترین فرش کو دھو دھلا کر چمکا دیا تھا۔ پردوں کا ہم رنگ نیا رگ جو اُس کے کمرے کے لئے منگوایا گیا تھا، اس نے اسٹڈی کے وسط میں بچھا دیا تھا۔ دروازے کے ساتھ ایک بڑا بلوریں واز جس میں آسمانی اور آتشی گلابی گلاب سجے تھے اور آفاق صاحب کی میز پہ پردوں اور رگ سے ہم رنگ چند ڈیکوریشن پیسز رکھے تھے۔ جن سے کمرہ بے حد سجا ہوا اور دیدہ زیب لگنے لگا تھا۔

''سچ بٹیا! لگ ہی نہیں رہا کہ یہ وہی پرانا والا پڑھنے کا کمرہ ہے۔'' عظمت بی نے کمرے پہ ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے حیرت بھری مسرت سے کہا تو نمرہ کے چہرے پہ مسرور سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''سچ نمو آپی! آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔صاحب بھی دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔'' غفور کے کہنے پر نمرہ نے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''غفور! میں نے اکیلے کچھ بھی نہیں کیا۔صبح سے آپ دونوں بھی تو میرے ساتھ لگے تھے۔خاص طور پر فرنیچر کی ترتیب بدلنے، فرنیچر پر پالش کرنے اور بار بار بازار جا کر کاغذ، پھول اور یہ ڈیکوریشن پیس تو تم ہی لائے تھے نا.....تو دیکھا جائے تو اس کمرے کی ڈیکوریشن میں ہم سب کا ہی حصہ ہے۔اور سب سے زیادہ تمہارا۔''

غفور کے نوجوان اور دلکش چہرے پہ ممنون و مشکور سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔تب ہی ڈور بیل بج اُٹھی تھی۔غفور تیزی سے باہر کی طرف لپکا تھا۔توقع کے عین مطابق آفاق صاحب ہی آئے تھے۔

''نمرہ کہاں ہے؟'' دروازہ کھول کر کار سے باہر نکلتے ہوئے انہوں نے غفور سے پوچھا تھا۔

''اسٹڈی میں ہیں۔'' غفور نے جوش کو دباتے ہوئے جلدی سے کہا تھا اور تب ہی آفاق صاحب کو یاد آیا تھا کہ آج نمرہ نے مصروف رہنے کی غرض سے اسٹڈی کی صفائی ستھرائی کے کام کا ذمہ لیا تھا۔

وہ غفور کے ساتھ تیزی سے چلتے وزانڈا عبور کر کے اسٹڈی کی سمت بڑھ گئے تھے۔اور اسٹڈی کے دروازے پہ لہراتا آسمانی حریری پردہ سرکا کر جونہی وہ کمرے میں داخل ہوئے تھے تو ایک لمحے کو اپنی جگہ ٹھٹک کر رک گئے تھے۔دونوں کھڑکیوں کے کھل جانے کے باعث کمرہ ہوا اور روشنی سے معمور تھا۔نئی پالش شدہ الماریاں اور الماریوں میں ترتیب سے رکھی پردوں کی ہم رنگ جلد والی کتابیں، کمرے کے وسط میں دمکتے فرش پہ نیا نکور رگ اور دروازے کے ساتھ آسمانی رنگ کے ایک بڑے واز میں آسمانی اور گلابی گلاب اور ان کی رائٹنگ ٹیبل پہ سجے ڈیکوریشن پیس......کمرے کی لُک ہی تبدیل ہو چکی تھی۔سب کچھ نیا اور بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔

''نمو بیٹی!......میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ کمرہ اتنا دیدہ زیب، روشن، ہوادار اور آرام دہ بھی ہو سکتا ہے۔''

کئی لمحوں تک ہر چیز کو حیرت اور تحسین سے تکنے کے بعد آخر آفاق صاحب کی تعریف بھری آواز سنائی دی۔''سچ، لگ رہا ہے کہ کسی اٹالین انٹیریئر ڈیکوریٹر نے اس اسٹڈی کی ڈیکوریشن کی ہے۔''

''شکریہ انکل!'' نمرہ کے حسین لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔''آپ غلو سے کام لے رہے ہیں۔ورنہ ایسا بھی کیا ہوا ہے؟.....ایک ذرا ترتیب ہی تو بدلی ہے۔''

''لو بتاؤ..... کہہ رہی ہیں، ایسا بھی کیا ہوا ہے۔'' عظمت بی آگے بڑھ کر جذباتی انداز میں گویا ہوئیں۔''سچ کہتی ہوں، اس پرانے سال خوردہ کمرے کو آپ نے سجا بنا کر نیا نکور ہی نہیں، جنت کی طرح خوبصورت بھی بنا دیا ہے۔''

''لگتا ہے نمو! تم نے انٹیریئر ڈیکوریشن کا کوئی کورس وغیرہ بھی کیا ہوا ہے۔ایسا ہے کیا؟'' آفاق صاحب کے پوچھنے پر نمرہ مسکرا کر بولی تھی۔

''نہیں انکل!.....بس خود سے ہی شوق تھا......کچھ کتابوں اور رسالوں وغیرہ میں چھپنے والے آرٹیکلز دیکھ کر.....بس یہ تھوڑا بہت کر لیا۔''

اسے بچپن سے ہی گھر کو سجانے سنوارنے کا شوق تھا۔وہ اپنے چھوٹے سے گھر کو بھی خوب سجا بنا کر رکھتی تھی۔شریفن خالہ اُس کے اس شوق کو دیکھ کر خوش ہو کر کہا کرتی تھیں۔

''دیکھنا، میری لاڈلی جس گھر جائے گی، اسے جنت بنا دے گی۔''

پھر حسنہ دُلہن بن کر گھر آ گئی تھی۔دیکھتے ہی دیکھتے ہر چیز پہ اس کا اختیار ہو گیا تھا۔تب نمرہ اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ہر کام حسنہ کی مرضی اور حکم کے مطابق کرنا پڑتا تھا۔شادی کے بعد جب وہ رشید کے گھر گئی تھی تو اس نے

اپنے شوق اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر گھر کو سجانے سنوارنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس گھر پہ سلطانہ کی حکومت تھی اور نمرہ کو گھر میں اس قدر دلچسپی لیتے دیکھ کر اسے ڈر ہوا کہ کہیں وہ اس سے اس کی حکومت نہ چھین لے۔ چنانچہ وہاں بھی اس کا شوق دل ہی دل میں گھُٹ کر رہ گیا تھا..... آفاق صاحب کے گھر میں آنے کے بعد وہ اپنے ہی مسائل میں گرفتار رہی۔ پھر مُنا دنیا میں آ گیا..... اور اب مُنے کے جانے کے بعد، اس نے سوچا تھا کہ کونے میں منہ چھپائے آنسو بہانے یا درد والم کی تصویر بنے رہنے کے بجائے خود کو مصروف رکھا جائے..... اور اس مقصد کی خاطر آج اُس نے عظمت بی اور غفور کی مدد سے اس کمرے کی آرائش و زیبائش کا کام کیا تھا۔ اور اس پل آفاق صاحب، عظمت بی اور غفور کے منہ سے تعریفیں سن کر وہ حیرت بھری مسرت میں مبتلا تھی۔

''بھئی اس کمرے کی پرفیکٹ ڈیکوریشن دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ تمہیں کسی تربیت اور ٹریننگ کی ضرورت نہیں۔'' آفاق صاحب نے کمرے پہ ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے مسرور لہجے میں کہا۔ ''مگر اس کے باوجود ابھی ہم نے سوچا ہے کہ جب تم لندن جاؤ گی تو وہاں تمہیں انٹیریئر ڈیکوریشن کے کچھ کورسز ضرور کرنے چاہئیں۔ اس کے بعد تم یہ کاروبار بھی شروع کر سکتی ہو..... مجھے یقین ہے کہ تم بے حد کامیاب رہو گی۔''

''اس کاروبار میں پھر غفور اور عظمت بی کو بھی میرے ساتھ شامل ہونا پڑے گا۔'' نمرہ دلنشین انداز میں مسکرائی۔ ''کیونکہ کمرے کی اس ترتیب اور آرائش میں ان دونوں کا بھی بھرپور حصہ ہے۔''

''اس خوشی میں گرما گرم چائے ہو جائے..... کیوں صاحب جی؟'' مسرت کے رنگوں کے پیچھے رینگتی فکر اور پریشانی کی پرچھائیاں غفور کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھیں، اسی لئے اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں بالکل۔'' آفاق صاحب نے ہاتھ اٹھا کر غفور کے خیال کی تائید کی تھی۔ ''غفور میاں! ہماری اور ہماری بٹیا کی چائے تم یہیں لے آؤ۔ اور ذرا جلدی کرنا..... کیونکہ چائے پیتے ہی ہمیں نکلنا ہے۔''

''آپ کو کہیں جانا ہے؟'' غفور نے بے ساختہ سوال کیا تھا۔

''ذرا وجاہت منزل تک جانا ہے۔'' آفاق صاحب نے جواب دیا۔ پھر وہ عظمت بی سے مخاطب ہوئے۔ ''عظمت بی! ایک سوٹ کیس میں آپ اپنے اور نمرہ کے کپڑے وغیرہ پیک کر لیجئے۔''

عظمت بی اور نمرہ نے ایک ساتھ چونک کر آفاق صاحب کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ ''کیا ہمیں بھی کہیں جانا ہے؟'' عظمت بی نے خاموش لبوں سے سوال کیا تھا۔

''ہاں۔'' آفاق صاحب نے کھلی کھڑکی کے اس پار دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ دونوں میرے ساتھ وجاہت منزل جا رہی ہیں۔'' وہ دم لینے کو دم بھر کو رُکے، پھر نگاہ اُٹھا کر اُن دونوں کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کُن لہجے میں بولے۔ ''آپ دونوں کچھ عرصے وہاں رہنا ہو گا..... اس وقت تک جب تک رشید کے مسئلے کا قرار واقعی حل تلاش نہ کر لیا جائے۔ میں نہیں چاہتا، نمرہ کی یہاں موجود اُس کے کسی جھوٹے افسانے کا عنوان بنے..... آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا؟'' انہوں نے عظمت بی سے پوچھا اور عظمت بی نے پُرزور انداز میں اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

''بالکل سمجھ رہی ہوں میاں صاحب! آپ نے درست فیصلہ کیا۔ اللہ آپ کو آپ کے ارادوں میں کامیاب کرے۔''

''تم کیا کہتی ہو بٹیا؟'' آفاق صاحب نے خاموش کھڑی نمرہ کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں؟''

''ہرگز بھی نہیں۔'' نمرہ نے پُرزور لہجے میں کہا۔ ''آپ میرے بڑے ہیں۔ میرے بزرگ ہیں۔ آپ جو مناسب سمجھیں کریں۔ بھلا مجھے اعتراض کیونکر ہو سکتا ہے؟''

''جیتی رہو بیٹی!'' آفاق صاحب پُرطمانیت انداز میں اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھتے ہوئے مسرور سے لہجے میں گویا

ہوئے۔ ''مجھے تمہاری سعادت مندی سے یہی اُمید تھی......اسی لئے پہلے ہی اپنے تئیں فیصلہ کرلیا تھا۔ کیونکہ قرینِ قیاس یہی ہے کہ مُنّے کو نہ پا کر رشید، کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق تمہیں پریشان کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور اس گھر میں تمہاری موجودگی پہ اعتراض کے علاوہ الزام تراشی سے بھی باز نہ آئے گا۔ میری تو خواہش تھی کہ تمہیں فوری طور پر لندن روانہ کر دیا جاتا۔ مگر ویزہ اور پاسپورٹ وغیرہ میں کچھ وقت لگنے کا امکان ہے۔ چنانچہ میں نے سوچا، اس عرصے میں تم وجاہت مرزا کے گھر رہ لو۔ تم جانتی تو ہو نا اُنہیں؟''

آفاق صاحب نے اچانک ہی اس سے سوال کیا تھا اور نمرہ نے جلدی سے سٹپٹائے ہوئے انداز میں اثبات میں سر جھکا دیا تھا۔

وجاہت مرزا، آفاق صاحب کے دیرینہ اور عزیز دوستوں میں سرفہرست تھے۔ ایک بار اسے انہیں دیکھنے اور ان سے ملنے کا موقع بھی ملا تھا۔ اسے دیکھ کر ان کی بڑی بڑی بے ریا آنکھوں میں کیسی اپنائیت اور محبت بھری جوت جل اُٹھی تھی۔ اب تو وہ برسوں سے صاحبِ فراش تھے۔ کہیں آ جا نہیں سکتے تھے......خود آفاق صاحب ہی اکثر جا کر اُن سے مل آتے تھے۔ وہ اب تو اکثر ہی ان کے لئے فکرمند اور متردد رہتے تھے۔ کبھی کبھار سرمد کا بھی ذکر آ جاتا تھا۔

سرمد، وجاہت مرزا کے چھوٹے بیٹے تھے۔

اُس شام شاپنگ مال میں اُس نے برسوں کے بعد سرمد کو دیکھا تھا۔

اور اس پل یہ جان کر کہ اسے کچھ عرصہ وجاہت منزل یعنی سرمد کے گھر میں رہنا ہوگا، اسے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر وہ چاہتی بھی تو سرمد کے گھر جانے سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے ہی یہ سوچ کر اسے شرمندگی اور افسردگی ہو رہی تھی کہ اس کی وجہ سے بلاوجہ ہی آفاق صاحب گوناگوں پریشانیوں کا شکار ہو گئے تھے۔ اسی کی خاطر وہ رشید جیسے لفنگے اور دوکوڑی کے انسان کے مقابل آنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ رشید سے محفوظ رکھنے کی خاطر انہوں نے مُنّے کو لندن بھیج دیا تھا۔ اور اب وہ اس کی حفاظت کی خاطر یہ اقدام کر رہے تھے۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' آفاق صاحب نے اس کے سنجیدہ اور رنجیدہ چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہی کہ میری وجہ سے آپ کو کیسی کیسی مشکلوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی آواز بھرّا گئی تھی۔

''ایسی باتیں کبھی نہ سوچنا۔'' آفاق صاحب نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے مابین کوئی رشتہ نہیں ہے..... مگر تم جانتی ہو، تم مجھے میری فریحہ اور فریال کی طرح ..... یا شاید ان دونوں سے بھی زیادہ عزیز ہو۔ تمہاری حفاظت اور خوشی کی خاطر میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ کیسی مشکل؟ کہاں کی پریشانی؟''

غفور چائے کے دو مگ ان دونوں کے سامنے رکھ گیا تھا۔ اس کے بعد خاموشی سے چائے پی گئی۔ اس دوران عظمت بی نے سوٹ کیس تیار کر لیا تھا۔ عظمت بی کو نمرہ کے ساتھ جانے کی تیاری کرتے دیکھ کر غفور مسمسی سی شکل بنا کر بولا۔

''عظمت بوا تو نمو آپی کے ساتھ جا رہی ہیں..... یہاں میں اکیلا کیا کروں گا؟''

''کیا مطلب؟'' آفاق صاحب نے چشمے کے عدسوں سے جھانکتے ہوئے شوخ لہجے میں اس سے سوال کیا۔ ''آپ کا نمرہ کے ساتھ جانے کا کیا کام؟''

''وہ.....انٹر کے امتحان ہونے والے ہیں نا.....'' غفور نے جلدی سے جواز پیش کیا۔ ''آپی نے کہا تھا، اسٹڈی میں جب بھی مشکل پیش آئی، وہ میری مدد کریں گی۔''

''ٹھیک ہے.....آپ کو جب بھی مشکل ہوگی، ہم آپ کو نمرہ کے پاس لے چلیں گے.....ٹھیک؟''

''جی۔'' غفور نے سر ہلایا۔ ''جیسی آپ کی مرضی...... میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ نمو آپی کے جانے سے گھر بھائیں بھائیں کرنے لگے گا۔''

غفور کے لہجے کی افسردگی کو محسوس کر کے آفاق صاحب نے رات کے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تھا۔

''غفور میاں! تم جانتے ہونا..... کہ نمرہ بٹیا کو کس وجہ سے اس گھر سے دُور بھیجا جا رہا ہے۔''

''جی۔'' غفور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ ''معافی چاہتا ہوں.....وہ.....اصل میں.....''

''بس، اب خوشی خوشی اپنی آپی کو رخصت کرو..... جلد ہی اِن شاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

آفاق صاحب اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ نمرہ پہلے ہی تیار ہونے کے لئے کمرے سے باہر جا چکی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ نمرہ اور عظمت بی کے ساتھ برآمدے سے نکل کر کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ غفور پہلے ہی سوٹ کیس اور بوا کا بستر ڈگی میں رکھ چکا تھا۔

''آپی! آپ بالکل بھی گھبرایئے گا مت۔'' نمرہ کے لئے پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے سرگوشی میں نمرہ سے کہا تھا۔ ''میں جلد ہی آپ سے ملنے وجاہت منزل آؤں گا۔''

''ضرور۔'' نمرہ حوصلے سے مسکرائی تھی۔ ''امتحان سر پہ کھڑے ہیں۔ پڑھائی پہ توجہ دینا..... جو سمجھ میں نہ آئے، انکل سے پوچھ لینا یا وہاں میرے پاس آ کر سمجھ لینا۔''

''جی ضرور۔'' غفور کو اپنی پلکیں نم ہوتی محسوس ہوئیں تو وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ عظمت بی بی خاموش تھیں۔ اس گھر میں اُنہیں جو عزت، محبت اور خوشی ملی تھی، وہ مرتے دم تک نہیں بھول سکتی تھیں۔ آفاق صاحب ہمیشہ ہی ان سے گھر کی اور خاندان کی بزرگ کی حیثیت سے پیش آتے تھے۔ غفور تو خیر اُن کا بھتیجا تھا ہی، مگر نمرہ نے ان سے جس محبت و احترام کا رویہ رکھا تھا، اس نے ان کے دل میں نمو کے لئے بیٹی کا سا پیار جگا دیا تھا۔ وہ نمرہ کی خاطر یہ گھر تو کیا، یہ دنیا بھی بخوشی چھوڑنے کے لئے تیار ہو سکتی تھیں۔

آفاق صاحب کی گاڑی مختلف راستوں سے ہوتی، شہر کے پوش علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ کشادہ ستھری سڑکوں کی دونوں جانب کئی کئی ہزار گز پہ محیط وسیع و عریض کوٹھیاں سر اٹھائے خاموش کھڑی تھیں۔ نمرہ نے یہ شاندار علاقہ آج پہلی بار دیکھا تھا..... وہ چادر میں چہرہ چھپائے حیران نظروں سے چاروں اور تکے جا رہی تھی۔ تب ہی آفاق صاحب کی گاڑی ایک وسیع و عریض اور پُرشکوہ کوٹھی کے سامنے آ رُکی تھی۔

بڑے سے گیٹ کے چھوٹے سے موکھے سے چوکیدار نے جھانک کر باہر دیکھا تھا اور آفاق صاحب کو پہچان کر گیٹ وا کر دیا تھا اور وہ گاڑی اندر لئے چلے گئے تھے۔

گاڑی سے باہر آ کر نمرہ نے حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھا تھا۔ اونچی اور مضبوط فصیل جیسی باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ سرو کے بلند قامت پیڑ کھڑے تھے۔ اکثر پیڑ خزاں رسیدہ اور ٹنڈ منڈ تھے۔ ذرا سی توجہ اور دیکھ بھال سے یہ سرو قامت سرو کے پیڑ پھر سے تروتازہ اور زندہ ہو سکتے تھے۔ مرمر کے ٹائلز سے مزین پورچ کے دونوں جانب، کوٹھی کے آس پاس وسیع احاطہ خشک اور بے آب و گیاہ پڑا تھا۔ خشک زمین پہ اُگے خود رو اِکا دُکا پودے اس بات کا پتہ دے رہے تھے کہ کبھی اس احاطے پہ مرغزار اور سبزہ زار لہلہاتے ہوں گے..... نمرہ نے اس طرف سے نظریں ہٹا کر عمارت کی طرف دیکھا۔ گو کہ عمارت بھی بے توجہی کا شکار تھی۔ لگتا تھا برسوں سے رنگ و روغن نہیں کیا گیا۔ اس کے باوجود عمارت شاندار اور پُرشکوہ تھی۔ اور اس میں رہنے والوں کی عظمت، شان و شوکت اور امارت و ثروت کا پتہ دے رہی تھی۔

''چلو بیٹی!.....اندر چلو۔'' اُسے یوں سر اٹھائے حیران و پریشان نظروں سے چاروں اور تکتے دیکھ کر آفاق صاحب نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر اسے سامنے کی جانب برآمدے کی سیڑھیوں کی طرف متوجہ کیا تھا۔

''جی۔'' وہ جلدی سے ان کے ساتھ چل پڑی۔ عظمت بی ان دونوں کے پیچھے آ رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ سب برآمدے میں پہنچے تو سامنے سے نکیتا کو آتے دیکھا تھا۔ چودہ پندرہ سال کی یہ الہڑسی لڑکی، آاق صاحب اور اُن کے ساتھ موجود نمرہ اور عظمت بی کو دیکھ کر اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے ان سب کی جانب لپکی تھی۔

''سلام پروفیسر انکل!'' اس نے ماتھے کی جانب ہاتھ لے جاتے ہوئے سلام کیا تھا۔ پھر دلچسپی بھری نظروں سے نقاب میں چھپی نمرہ کی طرف دیکھا تھا۔

''اماں بی کہاں ہیں؟'' اس کے سلام کا جواب دے کر آفاق صاحب نے پوچھا تھا۔

''اماں بی، ابا جان کے کمرے میں ہیں۔'' نکیتا نے جواب دیا تھا۔

''آؤ بیٹی! وہیں چلتے ہیں۔'' نکیتا کا جاب سن کر آفاق صاحب نے عاتکہ بیگم کے کمرے میں جانے کا ارادہ ملتوی کر کے وجاہت مرزا کے کمرے کا رخ کر لیا تھا۔

دائیں جانب ایک کشادہ ڈرائنگ روم تھا، اس سے ملحقہ ایک بڑا کھانے کا کمرہ تھا۔ کھانے کے کمرے کے ساتھ ہی سامنے کی طرف ایک جدید طرز کا کچن تھا..... جس میں چھ کرسیوں کے ساتھ ایک کھانے کی ٹیبل بھی رکھی ہوئی تھی۔ اور اسی کچن کی پچھلی جانب ایک اور بڑا سا باورچی خانہ تھا۔ جس میں ایک وقت میں چار دیگ اُتارنے کی گنجائش تھی۔

جدید کچن کے ساتھ ہی ایک لاؤنج تھا۔ لاؤنج کے سامنے اور دائیں جانب دو راہ داریاں تھیں۔ دونوں راہداریوں میں کئی کشادہ بیڈرومز کے دروازے کھلتے تھے۔ سامنے والی راہ داری کے اختتام پر ایک اور چھوٹا ہال تھا جس میں اوپر کی منزل کی سیڑھیاں جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ دوسری منزل پہ بھی کئی نشست گاہیں، خواب گاہیں اور راہ داریاں تھیں۔ ایک وسیع و عریض کتب خانہ بھی تھا جس میں ہزاروں کی تعداد میں قیمتی کتب اور دستی نسخے موجود تھے۔

ایک زمانے میں یہ شاندار گھر خوب صورتی، آرائش و آسائش کا گہوارہ تھا۔ عاتکہ بیگم نے ملکوں ملکوں کی اشیائے آرائش سے اُسے سجایا اور سنوارا تھا..... مگر آج برسوں کی بے توجہی کے بعد یہ شاندار گھر بے رونق اور اُجڑا ہوا سا دکھائی دیتا تھا۔

آفاق صاحب نمرہ اور عظمت بی کو ساتھ لئے بائیں جانب والی راہ داری میں مڑ گئے تھے۔ اس راہ داری میں کئی دروازے کھلتے تھے۔ مگر دائیں جانب کا پہلا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یہی وجاہت مرزا کا کمرہ تھا۔

آہٹ پہ عاتکہ بیگم نے پلٹ کر دیکھا تھا۔

سامنے آفاق صاحب کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ چادر میں لپٹی نمرہ تھی۔ اس کے دو قدم پیچھے عظمت بی اور ان کے ساتھ ہی نکیتا کھڑی تھی۔ آفاق صاحب کے سلام پر عاتکہ بیگم نے خلوص بھرے لہجے میں جواب دے کر تجسس بھری نظروں سے نمرہ کی طرف دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ اب تک دبیز نقاب میں چھپا ہوا تھا۔

''بٹیا! نقاب تو اُٹھاؤ۔'' عظمت بوا نے دھیرے سے کہنی سے ٹھوکا مار کر نمرہ کو نقاب اُٹھانے کا اشارہ کیا تھا۔

''اوہ اچھا.....'' نمرہ نے گھبرائی ہوئی نظروں سے پہلے عظمت بوا کو اور پھر سامنے بیٹھی عاتکہ بیگم کو دیکھا تھا۔ سفید بالوں کا جُوڑا اُن کی گردن پہ ٹکا تھا۔ اُن کی سفید رنگت، سیاہ غزال آنکھیں، عنابی نرم لب، کتابی چہرہ اور باوقار سراپا اُن کی شاندار شخصیت کا آئینہ دار تھا۔ عاتکہ بیگم بھی آنکھوں میں شوق اور دلچسپی لئے اس کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ اس نے آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر چہرے سے نقاب اٹھا دیا تھا۔ کمرے کی نیم تاریک فضا یکایک جگمگا اُٹھی تھی۔ عاتکہ بیگم کے ساتھ نکیتا

بھی نمرہ کے دلکش و رعنا، صبیح و دمکتے چہرے کو حیرت اور تحسین سے تک رہی تھی۔
عاتکہ بیگم اس عمر میں بھی حسین خاتون تھیں، مگر جوانی میں تو وہ بے مثال حُسن کی مالک تھیں۔ اُنہیں حُسن سے پیار تھا۔ وہ حسین چیزیں پسند کرتی تھیں۔ اُن کے شوہر وراثت مرزا بھی ایک خوبرو انسان تھے۔ پھر اکلوتے بیٹا یوجاہت بھی لاکھوں میں ایک تھے..... انہوں نے اپنی حُسن پسندی کی تسکین کی خاطر ہی یہ خوبصورت عمارت ''وجاہت منزل'' بنوائی تھی۔ اس کے چاروں طرف انواع و اقسام کے حسین گل بُوٹے لگوائے تھے۔ اعلیٰ درجے کے فرنیچر، بیش قیمت قالین و پردے اور رنگ رنگ کی اشیائے زیبائش سے اس محل نما کوٹھی کی تزئین و آرائش کی تھی۔ وجاہت مرزا کی پسند، سطوت جہاں بھی حُسن و رعنائی میں یکتا تھیں۔ خدا نے دونوں پوتے اسد اور سرمد بھی وجیہہ و شکیل عطا کئے تھے۔ غرض روزِ اوّل سے ان کے گرد حُسن ہی حُسن بکھرا ہوا تھا..... مگر آج ان کی آنکھوں نے حُسن کی جس دیوی کو دیکھا تھا..... تو آنکھیں حیرت و تحسین سے پھیل گئی تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر نمرہ کو تکتی رہی تھیں۔

''سلام بیگم صاحبہ!'' انہیں اپنی جانب یوں یک ٹک تکتے دیکھ کر نمرہ نے جزبز ہوتے ہوئے گھبرا کر اُنہیں سلام کیا تھا۔

''یہاں آؤ میرے پاس۔'' عاتکہ بیگم نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے نرم اور مہربان لہجے میں اسے قریب بلایا تھا اور وہ آہستگی سے چلتی ان کے قریب جا ٹھہری تھی۔

''بیگم صاحبہ نہیں..... سرمد اور نکیتا کی طرح تم بھی مجھے اماں بی کہو گی، سمجھیں؟'' انہوں نے نمرہ کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے ممتا بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ان کے وجود سے ممتا اور چاہت کی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ اپنے پن کا احساس جاگتا محسوس ہو رہا تھا۔ ان کے قریب جا کر نمرہ کو کیسی اپنائیت اور اُلفت کا احساس ہوا تھا۔ یہ اجنبی انجانا چہرہ کیسا اپنا اور مہربان محسوس ہو رہا تھا۔

آفاق صاحب، وجاہت مرزا کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ تکیہ پر سر دھرے آنکھیں موندے لیٹے تھے۔ آفاق صاحب کی آواز پر انہوں نے نقاہت بھرے انداز میں آنکھیں کھول کر ان کی جانب دیکھا تھا۔

''دیکھو، نمرہ آئی ہے۔'' پروفیسر آفاق نے نمرہ کا ہاتھ تھام کر ان کے سامنے کرتے ہوئے کہا تھا۔ نمرہ حیران اور بے یقین نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ فریحہ کے نکاح والے دن اس نے انہیں دیکھا تھا۔ کیسی پُر رونق آنکھیں اور شاداب چہرہ تھا۔ کس پیار بھرے انداز میں انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ آج وہ دلکش و شاداب چہرہ ہڈیوں میں ڈھل گیا تھا۔ وہ زندگی سے بھرپور غزال آنکھیں گڑھوں میں اُتر گئی تھیں اور لب قوتِ گویائی کھو چکے تھے۔

''تم نے اسے پہچانا؟'' آفاق صاحب، وجاہت مرزا سے پوچھ رہے تھے۔
وجاہت مرزا نے نظروں کو ذرا سا ترچھا کر کے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا، پھر یک ٹک کئی لمحوں تک دیکھتے ہی رہے تھے۔ پھر ان کی بجھی ہوئی آنکھوں میں یکایک شناسا سی جوت جگی تھی..... اور برسوں سے ساکت لب تھرائے تھے۔ اُن کے پپڑی زدہ خشک لبوں پر آشنا، مہربان مسکراہٹ کی کرن چمکی تھی..... اور بیڈ پر پڑے ساکت ہاتھ میں جنبش ہوئی تھی۔؟..... غالباً وہ ہاتھ اٹھا کر پہلے کی طرح اس کے سر پر رکھنے کے خواہاں تھے مگر نقاہت کے باعث ایسا نہ کر سکے تھے۔ نمرہ نے بے ساختہ آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اُن کے لرزتے ہاتھ پہ رکھ دیا تھا۔ اُن کے مدقوق اور زرد چہرے پر کیسی انبساط بھری کیفیت بکھر گئی تھی۔

نکیتا اور اماں بی کے علاوہ خود آفاق صاحب کے لئے بھی وجاہت مرزا کی بدلتی کیفیات حیرت بھری مسرت کا باعث تھیں۔ آج کتنی مدت بعد انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی تھی اور خود سے ہاتھ کو متحرک کیا تھا۔

''آفاق میاں!.....تم نے دیکھا.....دیکھا تم نے.....'' عاتکہ بیگم کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے تھے۔ ''یہ بچی..... یہ بچی میرے لئے.....اس گھر کے لئے کتنی بھاگوان ہے..... کتنی مبارک ہے کہ آج، کتنے ہی عرصے بعد میرے لعل نے ہاتھ کو جنبش دی.....اس کی آنکھوں میں اپنائیت جاگی، لبوں پہ مسکراہٹ بکھری.....جیتی رہو میری بچی!.......ہمیشہ خوش رہو۔''

عاتکہ بیگم نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بے ساختہ نمرہ کو سینے سے لگا لیا تھا اور ان کے سینے سے لگ کر اس نے خود کو کیسی ممتا بھری خوشبو کے حصار میں پایا تھا۔

ابھی چند لمحوں پہلے ہی وہ اُس کا چہرہ دیکھ کر سوچ رہی تھیں۔کیسی پیاری صورت ہے.....مگر قسمت کتنی بری ہے......پیدا ہوتے ہی ماں مر گئی۔ذرا بڑی ہوئی تو باپ داغ یتیمی دے کر دنیا سے رخصت ہو گیا..... بیوی کے آتے ہی جان چھڑکنے والا بھائی، اجنبی بن گیا.....شادی ہوئی تو شوہر اتنا بے قدرا اور ظالم ملا کہ اُس نے اُس وقت اُسے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا، جب وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔

اس بے بسی و بے کسی کے عالم میں بھی بھائی نے ساتھ نہ دیا۔ایسے میں آفاق صاحب نے اس کی مدد کی تھی۔ پناہ اور محبت دی تھی۔اللہ نے اولاد سے نوازا مگر یہاں بھی اس کی بدنصیبی کام کر گئی۔اسے اپنے شیر خوار بچے سے جدا ہونا پڑا تھا۔آفاق صاحب کے گھر میں بھی اُسے سکون سے رہنا نصیب نہ ہوا تھا اور اس وقت وہ پناہ کی تلاش میں ان کے سامنے کھڑی تھی۔

مگر اس وقت وجاہت مرزا کے چہرے پر مسرت اور ہونٹوں پر بے نام سا تبسم دیکھ کر وہ دل میں سوچ رہی تھیں، یہ بدنصیب لڑکی ان کے لئے، ان کے گھر کے لئے کتنی بخت آور ہے..... کتنی بھاگوان ہے.....

''نکیتا! مہمانوں کے لئے چائے لے آؤ۔'' عاتکہ بیگم نے نمرہ کو خود سے الگ کر کے اپنے ساتھ والے صوفے پر بٹھاتے ہوئے نکیتا سے کہا تھا۔نکیتا تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔عظمت بی اب تک کھڑی تھیں۔

''آپ بھی بیٹھئے عظمت بی!'' عاتکہ بیگم نے سامنے دھری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا تو عظمت بی بھی سمٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔

چائے کے بعد آفاق صاحت رخصت ہو گئے تھے اور عاتکہ بیگم، نمرہ کو اپنے ساتھ والے کمرے میں لے آئی تھیں۔

'کیسی صابرہ اور معصوم بچی ہے۔' عاتکہ بیگم اس کے چہرے کو تکتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔'نہ آنکھوں میں کوئی شکایت، نہ ہونٹوں پہ کوئی گلہ.....' اُنہیں بے ساختہ نمرہ پر پیار آ گیا تھا۔

''نکو! نمرہ بٹیا کا کمرہ ٹھیک کروا دیا تھا نا؟'' اچانک ہی اُنہیں یاد آیا تھا۔

''جی اماں بی!'' نکو نے جلدی سے جواب دیا۔''نمرہ آپی کا سامان اور عظمت بی کا بستر بھی کمرے میں رکھوا دیا تھا۔''

''بستر؟'' عاتکہ بیگم حیران ہوئیں۔

''وہ دراصل میں زمین پہ سونے کی عادی ہوں تو اپنی توشک، تکیہ، چادر ساتھ ہی لے کے چلتی ہوں۔'' عظمت بی قدرے خجل سے لہجے میں بولیں تو عاتکہ بیگم بے ساختہ مسکرا اُٹھیں۔

''سرمد کا فون آیا؟.....کب تک پہنچیں گے؟'' عاتکہ بیگم کے سوال پہ نکیتا نے اسی تیزی سے جواب دیا تھا۔

''بھیا کا فون آیا تھا.....رات کو کھانے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔ہالینڈ سے کوئی ڈیلی گیشن آیا ہوا ہے، میریٹ میں ڈنر رکھا ہے......کہہ رہے تھے، آنے میں شاید زیادہ دیر ہو جائے۔اس لئے اماں بی سے کہنا، کھانا کھا کر سو جائیں......میرا انتظار نہ کریں۔''

''ٹھیک ہے بھئی۔'' عاتکہ بیگم نے بے بس انداز میں ٹھنڈی سانس لی۔''ریٹا سے کہو، وجیہہ میاں کو کھانا کھلا دے۔ پھر ہم لوگ بھی کھا ہی لیں گے۔''

سرمد کے نام پر نمرہ اپنے اندر جاگتی ہلچل پہ حیران ہو رہی تھی۔ ایک عجب سی، غیر محسوس سی سنسناہٹ اُسے اپنے رگ و پے میں سرائیت ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد نگو نے وجاہت مرزا کے کمرے سے واپس آ کر بجھے ہوئے لہجے میں پیغام دیا تھا۔

''اماں بی! ریٹا سسٹر نے کہلوایا ہے، ابا جان کچھ کھانے کو تیار نہیں ہیں۔ اور خالی پیٹ وہ دوا کیونکر دے گی؟......وہ سخت پریشان ہے۔''

''ہاں، یہ تو روز کا معمول ہے۔'' عاتکہ بیگم نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس لی۔ ''وجیہہ میاں بھی بچوں کی طرح ضدی ہو گئے ہیں۔ کبھی کھانا نہ کھانے کی ضد پکڑ لیتے ہیں تو کبھی دوا نہ کھانے کی......اور وہ بے چارے کریں بھی تو کیا؟...... برسوں سے بستر پہ پڑے مریضوں والی غذائیں اور ڈھیروں ڈھیر دوائیں کھاتے کھاتے آخر کو عاجز آ چکے ہیں۔''

''اماں بی! اگر آپ اجازت دیں تو......'' اُنہیں اُداسی سے منہ لٹکائے بیٹھے دیکھ کر نمرہ نے ہمت کر کے ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ''تو میں انہیں کچھ کھلانے کی کوشش کر کے دیکھوں؟''

''تم......؟'' اماں بی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''ہاں، شاید تمہارے ہاتھ سے وہ کچھ کھا لیں گے۔ مگر بٹیا! تم ابھی تو آئی ہو، دن بھر کی تھکی ہوئی ہو گی۔ تم جا کر آرام کرو۔ میں جا کر دیکھتی ہوں۔''

''میں بالکل تھکی ہوئی نہیں ہوں۔'' نمرہ نے آگے بڑھ کر انہیں اُٹھنے میں مدد کرتے ہوئے کہا۔ ''اور مجھے انہیں کھانا کھلانے میں کوئی تکلیف نہیں ہو گی...... مریضوں کو کھانا کھلانے کا مجھے خاصا تجربہ ہے...... بالکل شروع میں انو بھیا کئی ہفتے بیمار رہے تھے۔ شیفن خالہ کے ساتھ مل کر میں نے ہی اُن کی دیکھ بھال اور تیمارداری کی تھی......اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھلے چنگے ہو گئے تھے۔''

نمرہ کے اُمید اور یقین سے دمکتے چہرے کو دیکھ کر عاتکہ بیگم کے ہونٹوں پر بھی حوصلہ افزا مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ وہ نمرہ کو ساتھ لئے وجاہت مرزا کے کمرے کی طرف آ گئی تھیں۔

سامنے وجاہت مرزا تکیے پر سر دھرے، آنکھیں بند کئے پڑے تھے۔ ادھیڑ عمر کی کرسچین نرس، مس ریٹا، سامنے ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے ایک تپائی پر کھانے کی ٹرے رکھی تھی۔

''میم! ہم سارا کوشش کر کے دیکھا، سر کھانے کو نہیں ریڈی ہوتا۔'' عاتکہ بیگم کو دیکھتے ہی نرس اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے شکایتی لہجے میں بولی تھی۔

''چلو، اب ہماری بیٹی کوشش کرنے آئی ہے۔ شاید اس کے ہاتھ سے کھا لیں۔'' عاتکہ بیگم نے اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھتے ہوئے حوصلہ افزا نظروں سے نمرہ کی طرف دیکھا اور نمرہ آہستگی سے نرس کے قریب چلی آئی۔

''ویلکم میم!'' ریٹا دوستانہ انداز میں مسکرائی۔ پھر اُس نے سُوپ کا پیالہ اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ سُوپ سر کو پلانا ہے۔''

''اس طرح لیٹے لیٹے یہ کس طرح پئیں گے؟'' نمرہ نے حیرانی سے کہا۔ اُس کی نقرئی گھنٹیوں کی سی آواز سن کر وجاہت مرزا نے اپنی آنکھیں پٹ سے کھول دی تھیں۔ اس نے سر کی ہلکی جنبش سے انہیں سلام کیا تھا اور ایک قدم اور آگے بڑھ آئی تھی۔

''کیا انہیں تھوڑا سا سرا ٹھا کر بٹھایا نہیں جا سکتا؟'' نمرہ نے ریٹا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کیوں نہیں بٹھایا جاسکتا۔'' ریٹا جلدی سے بولی۔ ''پر یہ بیٹھنے کو نہیں مانگتا.....کوشش کر کے دیکھی، پر سر نہیں بیٹھتا۔ اسی طرح لیٹے لیٹے کھلانا پڑتا۔''

''چلئے تو آج ایک کوشش اور کر دیکھتے ہیں۔'' نمرہ نے وجاہت مرزا کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے نرم لہجے اور شیریں آواز میں کہا۔

''اگر آپ تھوڑا سا بیٹھ سکیں.....تو.....'' نمرہ نے ان کے شانے کے نیچے ہاتھ رکھ کر دھیمی آواز میں گزارش کی۔ اور سب ہی نے دیکھا، وجاہت مرزا نے بغیر کسی مدافعت کے بیٹھنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔

نمرہ نے ریٹا کی مدد سے انہیں تھوڑا سا سرا اوپر کر کے تکیوں کے سہارے بٹھا دیا تھا۔ پھر وہ گرم سُوپ کا پیالہ لئے ان کے قریب جا بیٹھی تھی۔ ''میرے ہاتھ سے تو کھائیں گے نا؟'' وجاہت مرزا کی آنکھوں میں آمادگی دیکھ کر اس نے پیار بھرے انداز میں انہیں سُوپ پلانا شروع کیا تھا۔ عام طور پر وہ دو چار چمچوں سے زیادہ کچھ بھی کھا پی نہیں سکتے تھے۔ مگر آج انہوں نے تقریباً پورا پیالہ سُوپ کا پی لیا تھا۔ سُوپ کے بعد انہوں نے خاموشی سے دوا بھی کھا لی تھی۔

''تھینک یو سر!'' انہیں دوبارہ سے لٹاتے وقت نمرہ نے تشکر بھرے لہجے میں کہا تو ان کی آنکھوں میں ہلکی سی خفگی جاگی تھی۔

''سرمد اور نکیتا، انہیں ابا جان کہتے ہیں۔ تمہیں بھی یہی کہنا ہوگا۔'' عاتکہ بیگم نے وجاہت مرزا کی آنکھوں کی خفگی کا مطلب بھانپ کر پیار بھرے لہجے میں نمرہ کو تنبیہ کی تھی۔ ''اب تم ہمیشہ ابا جان ہی کہنا۔''

''جی ضرور۔'' نمرہ نے مسرور سے لہجے میں جواب دیا تھا۔ اور نیپکن سے وجاہت مرزا کے ہونٹوں کو صاف کرنے لگی تھی۔ تب ہی اس کی نگاہ اُن کے خشک اُلجھے ہوئے بالوں کی طرف گئی تھی۔

''کوئی تیل یا ہیئر ٹانک ہے کیا؟'' اُس نے ریٹا سے پوچھا تھا۔

''جی آلمنڈ آئل موجود ہے۔'' ریٹا کے جواب پر نمرہ، عاتکہ بیگم کی طرف مڑی تھی۔

''اماں بی! اگر آپ اجازت دیں تو میں ابا جان کے بالوں میں تیل لگا دوں؟''

اس کے ابا جان کہنے پر وجاہت مرزا کی بجھی آنکھوں میں مسرور سی جوت جگی تھی۔ اُن کی خوشی کو دیکھتے ہوئے عاتکہ بیگم نے بھی نمرہ کو تیل لگانے کی اجازت دے دی تھی۔

تیل لگانا نمرہ کو شریفن خالہ نے سکھایا تھا۔ سب ہی اُس کے اس ہنر کے متعارف تھے۔ رشید کی ماں سلطانہ اُس کے کسی بھی کام کو نہیں سراہتی تھی۔ مگر وہ جب اس کے سر میں تیل لگاتی تو وہ سرگوشی میں چھوٹو سے کہتی تھی۔

''کمبخت کے ہاتھوں میں جادو ہے.....آپ سے آپ آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں۔''

اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ نمرہ نے بادام کے تیل سے وجاہت مرزا کے خشک اور اُجاڑ بالوں میں ایسی مالش کی کہ چند ہی لمحوں میں وہ گہری نیند سو چکے تھے۔ ریٹا اُن کی نیند کی گولیاں اور پانی لینے آئی تو اُنہیں یوں بے خبر سوتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''ٹیبلٹ لئے بنا سو گئے؟'' اُس نے حیران سے لہجے میں کہا۔ ''یہ تو میریکل ہو گیا......ورنہ اکثر تو سر نیند کی ٹیبلٹ لے کر بھی نہیں سو پاتے۔''

عاتکہ بیگم نے مشکور نظروں سے نمرہ کی طرف دیکھا۔ یہ معصوم اور حسین لڑکی ان کے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر آئی تھی۔ پھر انہوں نے محبت بھری نظروں سے وجاہت مرزا کی طرف دیکھا۔ جانے کتنی مدت بعد آج انہوں نے پورا پیالہ سُوپ پیا تھا۔ اور اس پل تکیے پر سر دھرے سکون سے سو رہے تھے۔ ان کے چہرے پر برسوں کی مسافت کے بعد منزل پہ

پہنچ جانے والی آسودگی تھی۔

''جیتی رہو میری بچی!'' عاتکہ بیگم نے بے ساختہ نمرہ کو گلے سے لگا لیا تھا۔

پھر وہ نمرہ کو ساتھ لئے اپنے کمرے میں چلی آئی تھیں۔

''نمرہ بٹیا! تمہارے آنے سے وجیہہ میاں کے روّیوں میں تبدیلی حیران کُن ہے۔'' وہ نمرہ کے شانے پر ہاتھ دھیرے حیرت بھری مسرت سے کہہ رہی تھیں۔ ''میں تمہاری بے حد شکر گزار ہوں۔''

''شکر گزاری کیسی اماں بی!'' نمرہ نے جلدی سے کہا۔ ''آپ ہی نے تو کہا کہ میں بھی انہیں ابا جان کہوں.....اور جب وہ میرے والد جیسے ہوئے تو ان کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔''

''جیتی رہو.....خوش رہو۔'' عاتکہ بیگم نے دل سے دعا دی۔ ''رات بہت ہو گئی ہے۔ اب اپنے کمرے میں جا کر تم بھی آرام کرلو۔''

عاتکہ بیگم کے کہنے پر نکیتا اُسے ساتھ لئے، برابر والے کمرے میں چلی آئی تھی۔ نکیتا نے سوٹ کیس سے کپڑے نکال کر وارڈروب میں لگا دیئے تھے۔ جبکہ عظمت بی کا بستر سامنے کارپٹ پہ بچھا دیا تھا۔

''بوا.....! اتنا بڑا، کشادہ بیڈ ہے۔ آپ اوپر کیوں نہیں سوتیں؟'' نمرہ کے کہنے پر عظمت بی معذرت خواہانہ لہجے میں بولیں۔

''بس بٹیا! نیچے سونے کی عادت ہے۔ ہمارے نبی پاک ﷺ بھی زمین پر ہی سوتے تھے.....ہم بھی مرتے دم تک زمین پر ہی سونا چاہتے ہیں۔''

نکیتا پلکیں جھپک جھپک کر ان دونوں کی جانب دیکھ رہی تھی۔ تب ہی نمرہ نے اسے مخاطب کر کے کہا تھا۔

''ارے نکو! وہاں کیوں کھڑی ہو؟..... یہاں آؤ، میرے پاس بیٹھو۔''

اور نکیتا جلدی سے اس کے قریب چلی آئی تھی۔ چودہ پندرہ سال کی یہ شفاف آنکھوں اور معصوم چہرے والی محبت کرنے والی لڑکی اسے بہت اچھی لگی تھی۔ جبکہ نکیتا تو اُس کے حُسنِ بے مثال کو دیکھ کر حیرت زدہ ہی رہ گئی تھی۔

''پڑھتی ہو؟'' نمرہ نے پوچھا تھا۔

''جی۔ اس سال میٹرک کا امتحان دوں گی۔'' نکو نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''ویری گڈ۔'' نمرہ ایک دم سے خوش ہو گئی تھی۔ ''خوب دل لگا کر پڑھنا۔ تعلیم بے حد ضروری ہے۔ خاص طور پر لڑکیوں کے لئے۔''

''جی۔ سرمد بھیا بھی یہی کہتے ہیں۔'' نکو معصومیت سے بولی تو لحظہ بھر کو نمرہ سٹپٹا کر چپ ہو گئی تھی۔

''سچی آپی! آپ کا آنا تو اس وجاہت منزل کے لئے بہت ہی بھاگوان ثابت ہوا ہے۔'' اسے خاموش ہوتا دیکھ کر نکیتا جلدی سے بولی۔ ''مجھے یقین ہے کہ اب ابا جان جلد ہی بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' انہیں یوں لاغر و ناتواں بستر پر پڑے دیکھ کر اُسے دلی صدمہ ہوا تھا اور وہ دل سے چاہ رہی تھی، وہ پہلے جیسے سرخ و سفید، صحت مند و توانا، ہنستے مسکراتے انسان بن جائیں۔

''نکو!.....اس کوٹھی میں تو کتنے ہی کمرے موجود ہوں گے۔ پھر ابا جان.....اُس اندرونی چھوٹے سے کمرے میں کیوں ہیں؟.....وہاں نہ ہوا کا صحیح گزر ہے اور نہ ہی روشنی اور دھوپ آتی ہو گی۔''

نمرہ کے کہنے پہ نکو نے سر ہلا کر کہا تھا۔

''ابا جان کا بیڈروم تو اس کوٹھی کا سب سے اچھا کمرہ تھا۔ مگر جب بیگم صاحبہ، سطوت بیگم کا انتقال ہوا، وہ اس کمرے

میں شفٹ ہو گئے تھے۔ مگر آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ انہیں کسی ہوادار اور روشن کمرے میں منتقل کر دینا چاہئے۔ آپ کل اماں بی سے بات کیجئے گا۔''

''ہاں ضرور۔'' نمرہ نے مسکرا کر کہا۔ ''اب تم جاؤ...... کافی دیر ہو گئی ہے۔ اب جا کر سو جاؤ۔''

''سچی آپی! آپ کو چھوڑ کر جانے کو دل نہیں کر رہا۔ اگر آپ اجازت دیں تو...... یہیں آپ کے ساتھ سو جاؤں۔''

''ارے کیوں نہیں۔'' نمرہ نے خوش دلی سے کہا۔ ''مگر دیکھو اماں بی کو اس بات پہ کوئی اعتراض نہ ہو۔''

''ارے اماں بی تو بہت اچھی ہیں۔'' نکیتا خوش ہو کر بولی تھی۔ ''وہ بچوں کی کسی بھی بات پر کبھی بھی کوئی اعتراض نہیں کرتیں۔ بچوں کی خوشی میں خوش رہتی ہیں۔''

نمرہ کو بے ساختہ یاد آیا تھا...... ابھی کچھ ہی دیر قبل جب اماں بی کے کمرے میں دستر خوان لگا کر کھانا کھایا جا رہا تھا تو وہ کس قدر پیار اور اصرار سے سب کو کھلا رہی تھیں۔

''آپ تو کچھ کھائیے اماں بی!'' نمرہ نے دھیمی آواز میں کہا تو وہ بے ساختہ بولی تھیں۔

''ارے بٹیا! اب ہمارا کھانا پینا کیا...... بس اپنے بچوں کو کھلا پلا کر خوش ہو لیتے ہیں۔''

عظمت بوا بستر پر لیٹتے ہی سو جانے کی عادی تھیں۔ ذرا ہی دیر میں نکیتا بھی نیند کی وادی میں اُتر گئی تھی۔ مگر نمرہ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دُور تھی۔

رشید کی کسی حرکت کی وجہ سے ہی آفاق صاحب نے اسے گھر سے کہیں اور منتقل کرنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ رہی تھی، اسی لئے خاموشی سے سر جھکا کر یہاں چلی آئی تھی۔ ورنہ تو وہ آفاق صاحب کو رشید کے مقابل تنہا چھوڑنے کے حق میں نہیں تھی۔ مگر وہ ان کی بات نہ مان کر ان کے لئے مزید مشکلات بھی کھڑی کرنا نہیں چاہتی تھی، اس لئے چپ کر کے ''وجاہت منزل'' چلی آئی تھی۔ مگر یہاں آ کر وہ ایک عجیب سا اطمینان اور بے نام سا انبساط محسوس کر رہی تھی۔ اماں بی کی ممتا بھری آغوش اور وجاہت مرزا کی خاموش نظروں نے اسے عجب سا سہارا دیا تھا۔ ایک اپنے پن کا احساس دلایا تھا۔ سب کچھ جانا پہچانا اور اپنا اپنا سا لگ رہا تھا۔ اجنبیت اور انجانے پن کا احساس تک موجود نہ تھا۔

دھیرے دھیرے اس کی پلکیں بھی مندھنے لگی تھیں۔ تب ہی ہارن کی آواز سنائی دی تھی، گیٹ کھلا تھا اور کوئی گاڑی اندر چلی آئی تھی۔ رات کی خاموشی اور سناٹے کی وجہ سے سب کچھ واضح اور صاف سنائی دے رہا تھا۔ بھلا اس وقت کون آیا ہوگا؟ اس نے غنودگی بھرے ذہن سے سوچا تھا...... اور نیند کی آغوش میں پوری طرح سمٹ گئی تھی۔

سرمد برآمدے کی سیڑھیاں طے کرتے لاؤنج میں آئے تھے۔

''اماں بی سو گئیں؟'' سامنے کھڑے اکبر سے انہوں نے پوچھا اور اس کا جواب سنے بنا، وجاہت مرزا کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

وجاہت مرزا تکیے پر سر دھرے بے خبر سو رہے تھے۔ جبکہ مس ریٹا ان کے قریب دھری کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک پہ اس نے کتاب سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ اگلے ہی لمحے سرمد اندر داخل ہوئے تھے۔

''کیسی ہیں مس ریٹا؟'' انہوں نے ریٹا کے سلام پر نرم آواز میں اس کی خیریت معلوم کی تھی۔ ''ابا جان کیسے ہیں؟''

''آج تو بہت بہتر ہیں۔'' ریٹا نے جلدی سے کہا۔

''کھانا آرام سے کھا لیا تھا؟'' وہ جانتے تھے وجاہت مرزا کچھ بھی کھانے میں بہت مشکل کرتے تھے۔

''آج تو میریکل ہو گیا۔'' ریٹا حیران لہجے میں بولی۔ ''آج تو سر نے سُوپ کا پورا باؤل پیا۔ تھوڑا اُٹھ کر بھی

بیٹھا.....اور بنا نیند کا ٹیبلٹ لئے سو گیا۔“

”واقعی؟“ سرمد حیران اور بے یقین لہجے میں بولے۔

”یہی نہیں۔شام کو مسکرایا بھی۔اور ہاتھ کو جنبش بھی دیا۔“

”او گاڈ!.....کیا واقعی ایسا ہی ہوا؟......مگر یہ سب کیسے ہوا؟“

”اُس فرشتہ صفت لیڈی کی وجہ سے۔“ ریٹا نے باہر کی طرف اشاہ کرتے ہوئے کہا۔”آفاق صاحب کا مہمان لیڈی ادھر اپنے گھر آیا ہے......اسی کی وجہ سے سر میں چینج آیا......وہ کچھ دن ادھر رہا تو مجھے یقین ہے کہ سرمد بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کون ہے وہ لیڈی؟“ سرمد کا دل اشتیاق اور تشکر سے بھر گیا تھا۔وجاہت مرزا کو پُرسکون اور آسودہ انداز میں سوتے دیکھ کر ان کی روح تک جھوم اُٹھی تھی۔

”اب آپ بھی ریسٹ کریں سر۔“ ریٹا نے دھیمی آواز میں انہیں مشورہ دیا تھا اور وہ اسے گڈ نائٹ کہتے کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہے تھے،ایک اجنبی،انجانی خاتون کے آنے سے ابا جان کی حالت میں ایک دم سے بہتری کے آثار شروع ہو گئے ہیں۔بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟

شاید اماں بی کی دعائیں رنگ لا رہی ہیں۔

ڈاکٹرز بھی تو مسلسل تگ و دو میں لگے ہیں۔شاید اللہ تعالیٰ کو رحم آ گیا ہو۔

اور اماں بی کہتی ہیں،کبھی کسی کے قدم بھی بہت مبارک ثابت ہوتے ہیں۔شاید اس خاتون کا آنا اس گھر کے لئے......ابا جان کے لئے......ہم سب کے لئے واقعی مبارک ثابت ہوا ہو۔

’خدا کرے ابا جان کی حالت میں سدھار اور بہتری کا یہ سلسلہ مسلسل چلتا ہی رہے اور آخر کار وہ بالکل صحت مند اور توانا ہو جائیں۔‘

سرمد دل ہی دل میں دعا کرتے اپنے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ان کے پہنچنے کے ذرا دیر بعد ہی اکبر کمرے میں آ موجود ہوا تھا۔

”صاحب جی!کھانا لگا دوں؟“

”نہیں اکبر!کھانا تو میں کھا کر آیا ہوں۔البتہ تم میرا سفری بیگ تیار کرو۔“ سرمد نے ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے جواب دیا۔

”کہیں جا رہے ہیں کیا؟“ اکبر نے سوال کیا۔

”ہاں،کل صبح 10 بجے کی فلائٹ ہے......اسلام آباد جا رہا ہوں۔“ سرمد نے جواب دیا۔

”جی اچھا۔“ اکبر اٹیچی لینے کے لئے اسٹور کی طرف بڑھ گیا۔کچھ ہی دیر میں وہ اٹیچی لئے کمرے میں داخل ہوا۔

”کتنے دن کے لئے جا رہے ہیں؟“ اُس نے اُن کے کپڑے بیگ میں رکھتے ہوئے سوال کیا۔

”ایک ہفتے کے لئے۔“ سرمد نے سرسری سے انداز میں جواب دیا۔

”ایک ہفتے کے لئے؟“ اکبر نے چونکتے ہوئے انداز میں سر اٹھایا۔”اتنے دنوں کے لئے تو پہلے آپ کبھی بھی نہیں گئے۔“

وجاہت مرزا کا کاروبار ملک کے سب ہی بڑے شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔خاص طور پر اسلام آباد میں کئی فارم ہاؤس تھے۔فیکٹریز اور کچھ بڑے ہوٹلز میں شیئرز تھے جن کی دیکھ بھال کے لئے مہینے دو مہینے میں سرمد اسلام آباد جاتے رہتے

تھے۔ مگر ایک دو دن سے زیادہ کبھی بھی نہیں رُکتے تھے۔ مگر اس بار ایک ہفتے کا سن کر اکبر حیران ہوا تھا۔

''ہاں اکبر! بہت سے کام توجہ طلب ہیں۔ ایک فیکٹری میں کچھ نئی مشینریز لگوانی ہیں۔ ہوٹلز کا آڈٹ دیکھنا ہے..... ان تمام کاموں میں آٹھ سے دس دن تو لگ ہی جائیں گے۔ مگر میں کوشش کروں گا کہ جلد از جلد کام نمٹا کر گھر واپس لوٹ آؤں۔''

''اماں بی کو آپ نے بتا دیا؟'' اکبر نے اٹیچی کیس بند کر کے ایک سائیڈ میں کھڑا کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

''آج تو میں ابھی آیا ہوں اکبر!'' اکبر کی فکر اور پریشانی پر سرمد مسکرائے۔ ''اماں بی سے بات کرنے کا موقع ہی کہاں ملا؟ مگر تم بے فکر رہو، صبح ہوتے ہی میں انہیں بتا دوں گا۔''

''جی بہتر۔'' اکبر نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔ ''اگر آپ چائے یا کافی پینا پسند کریں تو میں لے آؤں؟''

''نہیں، شکریہ اکبر!'' واش روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔ ''بس اب میں سونا چاہوں گا۔ تم بھی جا کر آرام کرو۔''

''جی اچھا..... شب بخیر۔''

''شب بخیر۔'' سرمد نے دھیمی آواز میں جواب دیا اور چینج کرنے کے لئے باتھ روم کی طرف بڑھ گئے۔

❀===❀===❀

حسبِ عادت صبح کاذب کے وقت ہی نمرہ کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کئی لمحوں تک وہ انجانی اور حیران نظروں سے اس انجانے ماحول کو تکتی رہی تھی، پھر ایک دم سے اسے سب یاد آ گیا تھا۔ کل شام کو آفاق صاحب اسے اور عظمت بوا کو وجاہت منزل چھوڑ گئے تھے۔ اس نے نگاہ گھما کر اپنے برابر لیٹی نگو کی طرف دیکھا تھا۔ وہ گہری نیند میں ڈوبی بے خبر سو رہی تھی۔

تب خاموش فضا میں اذان کی پُرسوز آواز کا نور گھل گیا تھا۔ وہ کلمۂ طیب پڑھتے ہوئے ایک دم سے اُٹھ بیٹھی تھی۔ اس کا دل چاہا، وہ نماز کے لئے نگو کو بھی اٹھا دے۔ مگر اسے یوں بے خبر اور گہری نیند سوتے دیکھ کر اس نے اسے جگانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے واش روم کا رخ کیا تھا۔ وہ وضو کر کے باہر نکلی تو اس نے دیکھا، عظمت بی اُٹھ چکی تھیں۔

''سلام عظمت بوا!...... صبح بخیر۔'' اس نے انہیں خوش دلی سے کہا تو عظمت بی بھی لمبی سی جماہی لیتے ہوئے بولیں۔

''جیتی رہو۔''

''آپ رات کو آرام سے تو سوئیں؟'' نمرہ نے عظمت بی سے پوچھا۔

''ہاں بٹیا! اللہ کا کرم ہے۔'' عظمت بی خوشگوار لہجے میں گویا ہوئیں۔ ''بہت اچھا گھر اور بہت ہی اچھے لوگ ہیں۔ خاص طور پر اماں بی تو فرشتہ سیرت خاتون ہیں۔ سچ کہتی ہوں، سب کچھ اپنا اپنا سا لگ رہا ہے۔ ان اپنائیت، محبت اور عزت دینے والے لوگوں کو اللہ خوش رکھے۔''

''آمین۔'' نمرہ نے دل سے کہا اور چھوٹی تپائی پہ دھری جائے نماز اٹھا لی۔ نماز پڑھ کر وہ باہر ٹیرس پہ نکل آئی تھی۔

باہر ہر سمت مدھم مدھم سا سنہرا اُجالا بکھرا ہوا تھا۔

نرم اور مدھر ہوائیں سرسرا رہی تھیں۔ اوس میں بھیگے سرو کے پیڑ سر جھکائے اُداس سے کھڑے تھے۔ نمرہ کو ان کی بدحالی اور اُداسی پر افسوس ہوا تھا۔

''سلام آپی!'' اپنے پیچھے سے نگو کی کھنکتی سی آواز سن کر نمرہ ایک دم سے پلٹی تھی۔

''وعلیکم السلام۔'' وہ مسکرائی۔ ''اُٹھ گئیں؟''

''جی۔'' نگو بھی مسکرائی۔

''میں نے سوچا تمہیں نماز کے لئے اُٹھاؤں۔'' نمرہ نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''مگر تم اتنی بے خبر اور اتنے سکون سے سو رہی تھیں کہ......''

''آپی! میں نماز نہیں پڑھتی۔'' نگو نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''کیوں؟'' نمرہ کو حیرت ہوئی۔

''کیونکہ میں مسلمان نہیں ہوں...... میں ہندو ہوں'' نگو نے بنا کسی پس و پیش کے وضاحت کی۔

''اوہ...... اچھا'' نمرہ کی حیرت میں اضافہ ہوا۔ ''مگر تمہارا نام...... نگو......''

''نگو تو سب پیار سے کہتے ہیں۔ ورنہ میرا نام نکیتا ہے۔''

''اچھا، میں تجھی نگینہ ہوگا۔'' نمرہ نے سرہلاتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں چھپے بے نام سے دکھ نے نکیتا کو بھی دُکھی کر دیا تھا۔

''کبھی مندر جاتی ہو؟'' نمرہ نے خود کو سنبھال کر نارمل لہجے میں پوچھا۔

''جی، کبھی کبھار...... عبداللہ شاہ غازی کے مزار کے قریب ایک مندر ہے..... اماں بی، اکبر کے ساتھ مجھے وہیں بھیجتی ہیں...... مگر آپی! سچی بات تو یہی ہے کہ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔''

نکیتا جانے کب سے یہاں تھی مگر کبھی کسی نے اس کے مذہب کے حوالے سے بات نہیں کی تھی نہ کسی نے اسے اپنا مذہب چھوڑنے کی تبلیغ کی تھی۔ اماں بی اس سلسلے میں بے حد لبرل تھیں۔ ان کا کہنا تھا، مذہب و مسلک ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے اور کسی کو بھی اس میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں۔ خود نمرہ کا بھی یہی خیال تھا۔ اس لئے وہ باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ کھڑے سرو کے پیڑوں کی جانب تکتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

''کس قدر خوب صورت اور پُرشکوہ پیڑ ہیں...... اگر ذرا سی توجہ دی جائے تو دوبارہ سے زندہ ہو سکتے ہیں۔ سرسبز و شاداب ہو سکتے ہیں۔''

''جی آپی!'' نگو نے تائید بھرے انداز میں سرہلایا ''یہاں کے پرانے نوکر بتاتے ہیں، کبھی یہ کوٹھی بے حد شاندار تھی۔ خوب سجی سنوری۔ کوٹھی کے چاروں طرف سرسبز لان تھے۔ رنگ رنگ کے پھول کھلتے تھے۔ یہ سرو کے پیڑ چوکنا دربانوں کی طرح ہر پل سر اُٹھائے کھڑے رہتے تھے۔ اس وقت یہاں میرے نانا مالی تھے..... اماں بی اور ابا جان خود گھاس اور پودوں پر توجہ دیتے تھے۔ ابا جان نے ڈھاکہ سے گھاس منگوائی تھی..... ملکوں ملکوں سے پودے منگوا کر لگوائے تھے۔ مگر اب کون توجہ دے؟ اماں بی، ابا جان کی وجہ سے اور کچھ بڑھاپے کی وجہ سے اس طرف دیکھتی ہی نہیں۔ ابا جان بستر پر پڑے ہیں۔ اور سرمد بھیا کو کاروبار سے فرصت نہیں۔ حالانکہ اب بھی دو دو مالی موجود ہیں۔ تمام وقت اِدھر اُدھر گھومتے اور خانو چوکیدار سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ دھیلے کا کام نہیں کرتے۔''

''نگو! تو کیا خیال ہے..... اماں بی سے اجازت لے کر، ان مالیوں کو بلوا کر ہم ان سے کام لینے کی کوشش نہ کریں؟'' نمرہ نے ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''ہم.....؟'' نگو نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ پھر انگلی سے نمرہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''مطلب میں اور آپ؟''

''ہاں بھئی۔'' نمرہ پُرعزم انداز میں مسکرائی۔ ''مجھے بھی پھول پودوں کا بہت شوق ہے۔ کہتے ہیں، پودے لگائے جائیں، اُن کی دیکھ بھال کی جائے تو وہ دعا دیتے ہیں۔ جس سے غم دور ہوتے ہیں۔ اور مجھے ان دنوں دعاؤں کی بہت ضرورت ہے۔'' آخر کے دو جملے اس نے دل میں کہے تھے۔ نگو اس کی بات سن کر ایک دم سے اُچھل پڑی تھی۔

''سچی آپی!...... ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہو جائے گا۔ آپ اماں بی سے بات کر لیجئے۔ میں دونوں مالیوں فضل دین اور دین محمد کو بلا لاؤں گی۔ آپ اپنی نگرانی میں کام کروائیں گی تو وہ ضرور اچھا کام کریں گے۔''

''آپ کے لئے چائے لے آؤں؟'' اکبر کی آواز پہ نمرہ نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ ابھی ابھی عاتکہ بیگم کی چائے ان کے کمرے میں پہنچا کر باہر نکلا تھا۔

''اماں بی جاگ گئیں کیا؟'' نمرہ نے سوال کے جواب میں سوال کیا۔

''جی، وہ تو بہت صبح ہی جاگ جاتی ہیں۔'' اکبر نے وضاحت کی۔ ''آپ ان کے پاس جا کر بیٹھئے۔ میں آپ کی چائے وہیں لے کے آتا ہوں۔''

اکبر کے واپسی کے لئے پلٹتے ہی نمرہ نے عاتکہ بیگم کے کمرے کا رخ کیا تھا۔ نگو اس کے ساتھ ہی تھی۔

''سلام اماں بی!'' اس کی آواز پہ دریچے میں کھڑی عاتکہ بیگم نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا اور ان کی آنکھوں میں محبت و مسرت بھری جوت جل اُٹھی تھی۔

''آؤ آؤ بٹیا!......رات تو سکون سے گزری؟......سب ٹھیک رہا نا؟''

''جی اماں بی! آپ کی محبت کے سائے میں سب کچھ ٹھیک ہے۔'' نمرہ محبت اور عقیدت بھرے انداز میں آگے بڑھی۔ عاتکہ بیگم نے پیار سے اس کے پر پر ہاتھ رکھا اور اسے ساتھ لئے بیڈ تک چلی آئیں۔ بیڈ کے سامنے دو کرسیاں دھری تھیں اور درمیان میں ایک چھوٹی میز جس پہ ابھی ابھی اکبر چائے کی ٹرے رکھ کر گیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں اکبر اس کے، نگو اور عظمت بی کے لئے بھی چائے لے آیا تھا۔ چائے کے دوران بالکل اچانک ہی نگیتا کو یاد آیا تھا۔

''آپی! آپ نے اماں بی سے کمرے کی بات کی؟''

''کمرے کی بات؟'' عاتکہ بیگم نے چونک کر پوچھا۔

''جی......وہ......'' نمرہ بات کے یوں اچانک شروع ہونے پر گڑبڑا کر جلدی سے بولی۔ ''کل میں یوں ہی نگو سے تذکرہ کر رہی تھی......کہ ابا جان کے لئے......کسی اور اچھے کمرے کا انتظام ہونا چاہئے۔ جس میں ہوا اور روشنی کا بہتر گزر ہو۔ کیونکہ صحت کے لئے یہ چیزیں بہت ضروری ہیں۔'' عاتکہ بیگم کو اپنی طرف غور سے دیکھتے دیکھ کر وہ مزید جز بز ہو کر بولی۔ ''دراصل اتنی بڑی کوٹھی ہے...... یہاں یقیناً کوئی نہ کوئی کمرہ ایسا ضرور ہوگا.....اگر اسے ابا جان کے لئے ٹھیک ٹھاک کر دیا جائے......میں نے بس، ایسا سوچا تھا۔''

''بٹیا! یہ بات تو ہم کب سے سوچ رہے ہیں۔'' عاتکہ بیگم نے کرب بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''مگر کیا کریں؟ بس سوچ کر رہ جاتے ہیں۔ یہ سب کرنے کی نہ ہمت ہے نہ طاقت۔ ایک نہیں دسیوں کمرے ایسے ہیں.....مگر مدتوں سے بند پڑے ہیں۔ انہیں کھلوا کر کون صفائی ستھرائی کروائے۔''

''اگر آپ......مجھے اس قابل سمجھیں۔'' نمرہ نے بے حد ہچکچاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو......کیونکہ میرا خیال ہے کہ ابا جان کی صحت و تندرستی کے لئے ایک روشن اور ہوادار کمرے کی بے حد ضرورت ہے۔''

''تم......؟'' اماں بی نے اشتیاق بھرے اور بے یقین لہجے میں کہا۔ ''تم یہ سب کروا لوگی؟''

''جی، کیوں نہیں......اگر آپ پسند کریں تو۔'' نمرہ نے شرمیلے انداز میں سر جھکا کر جواب دیا۔

''مگر بٹیا! تمہیں پریشانی ہوگی۔'' عاتکہ بیگم اس نازک اندام، پھولوں کی سی حسین لڑکی کو مشکل کاموں کے قابل کہاں سمجھتی تھیں۔

''ارے بیگم صاحبہ! آپ پریشانی کی فکر نہ کریں ہماری نمو بٹیا تو گھر بنانے، سنوارنے میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ آپ بے فکر ہو کر اجازت دے دیجئے ہم سب ہی ان کے ساتھ ہیں۔''

عظمت بی کے پُر جوش انداز پر عاتکہ بیگم بے ساختہ مسکرا دی تھیں۔

''اگر آپ سب کا یہی خیال ہے تو پھر ٹھیک ہے۔''

پھر انہوں نے ایک چابیوں کا گچھا اور ایک پرانی ڈائری نمرہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''نمو بٹیا! اس گچھے میں تمام کمروں کی چابیاں ہیں۔ تم جو کمرہ بھی وجاہت مرزا کے لئے مناسب سمجھو، کھلوا لو۔ اور اس ڈائری میں مختلف فرمز اور کمپنیوں کے نمبر ہیں۔ کمرے برسوں سے بند پڑے ہیں۔ صفائی ستھرائی اور رنگ و روغن کی ضرورت پڑے گی۔ تم اس ڈائری میں موجود نمبروں پر فون کر دینا۔ ان کے نمائندے آ کر سب کچھ کر دیں گے۔ تم جو

چاہو، جس طرح چاہو کرسکتی ہو۔"
نمرہ نے کچھا اور ڈائری ہاتھ میں تھام کر نگو کی طرف دیکھا۔
"یس۔" نگو نے انگوٹھا اٹھا کر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ "سچ آپی! ہم سب مل کر ابا جان کے کمرے کو ایک دم شاندار بنا دیں گے۔ اور آپ دیکھئے گا..... ابا جان اس کمرے میں جاتے ہی ایک دم سے ٹھیک ہو جائیں گے۔"
"اِن شاء اللہ!" اماں بی نے مسرور لہجے میں کہا۔
سرمد جب اماں بی کے کمرے میں داخل ہوئے تو کمرے میں اماں بی کے ساتھ صرف عظمت بوا تھیں۔ نمرہ، نگیتا اور اکبر کمرے کے انتخاب کے لئے جا چکے تھے۔ عظمت بوا کو دیکھ کر سرمد کو گمان ہوا تھا کہ شاید یہ وہی خاتون ہیں، جن کے لئے نرس ریٹا نے بتایا تھا۔ اسی لئے انہوں نے بہت محبت اور احترام سے انہیں سلام کیا تھا۔
"جیتے رہیئے۔" عظمت بی حیران نظروں سے ان کی شاندار شخصیت دیکھ رہی تھیں۔
"عظمت بی! یہ ہمارے چھوٹے پوتے ہیں۔" اماں بی نے مسرور سے لہجے میں ان کا تعارف کروایا۔ "سرمد میاں۔" آپ سے آپ ان کے لہجے میں بے نام سا فخر اُتر آیا تھا۔ "بہت نیک اور سعادت مند ہیں۔ ماشاء اللہ باپ کا سارا کاروبار انہی نے سنبھالا ہوا ہے۔"
"ماشاء اللہ!" عظمت بی جلدی سے بولیں۔ "اللہ نظر بد سے بچائے۔ دیکھنے میں بھی لاکھوں میں ایک ہیں، بالکل ہماری نمرہ بٹیا کی طرح۔"
اس وقت، بالکل اچانک نمرہ کا ذکر کر بیٹھنے پر وہ خود بھی گڑبڑا کر چپ ہو گئی تھیں۔ مگر کسی نے بھی ان کی اس بے تکی بات کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ عاتکہ بیگم پیار بھری نظروں سے سرمد کو تک رہی تھیں اور سرمد انہیں اپنے اسلام آباد جانے کے بارے میں تفصیلات بتا رہے تھے۔ عام طور پر ان کے شہر سے باہر جانے پر اماں بی متفکر ہوتی تھیں مگر آج خلافِ توقع اور خلافِ معمول انہی نے خوش دلی سے انہیں اجازت دے دی تھی۔
"غالباً یہ بھی انہی خاتون کی وجہ سے ہے۔" سرمد نے ممنون نظروں سے عظمت بی کی طرف دیکھا تھا اور جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔
عاتکہ بیگم بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ سرمد سے باتیں کرتی وجاہت مرزا کے کمرے کی طرف چل دی تھیں۔
وہ اب تک گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پہ بکھرے تسکین و راحت کے آثار ان کی اندرونی کیفیت کا اظہار کر رہے تھے۔
"رات کیسی گزری؟" سرمد نے ریٹا سے پوچھا۔
"اس سارے عرصے میں سر آج کی رات اتنی گہری اور پُرسکون نیند سوئے ہیں۔" ریٹا نے سرگوشی میں بتایا تھا۔ مبادا اس کی آواز سے وجاہت مرزا کی نیند نہ ڈسٹرب ہو جائے۔
عاتکہ بیگم اور سرمد کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ ان کا اس کمرے میں رُکنا اور بات چیت کرنا ان کی نیند خراب کرنے کا باعث بن سکتا ہے، اس لئے وہ دونوں آہستہ روی سے چلتے کمرے سے باہر آ گئے تھے۔
"پتہ نہیں سرمد! اب میرے دل کو یقین ہو چلا ہے کہ میرا بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔" کمرے سے باہر نکلتے ہی عاتکہ بیگم نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سرمد کو اپنے دل کی بات بتائی تھی۔
"جی۔" سرمد نے تائید بھرے انداز میں سر ہلایا۔ "ماشاء اللہ! آج ان کے چہرے پہ بہت رونق اور زندگی دکھائی دے رہی تھی۔"

"یہ سب اس فرشتہ سیرت کی وجہ سے ہے۔" عاتکہ بیگم نے نمرہ کے کمرے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "آفاق میاں کو خدا سلامت رکھے.....اسے یہاں وہی لائے ہیں۔ اس کے قدم اس گھر کے لئے اس قدر مبارک ثابت ہوئے ہیں کہ......"

"جی......" سرمد نے ایک بار پھر تائید کی۔ "صورت سے ہی وہ اچھی خاتون دکھائی دے رہی ہیں۔" سرمد کا اشارہ عظمت بوا کی طرف تھا۔ مگر عاتکہ بیگم نے ان کی بات نہیں سنی تھی۔ وہ اپنی ہی دُھن میں بولے جا رہی تھیں۔

"سرمد! ڈاکٹر رحمان کو اطلاع دو۔ وہ آ کر اس تبدیلی کو کنفرم کریں۔"

"جی ضرور۔" سرمد نے سعادت مندی سے سر جھکایا۔ "ڈاکٹر رحمان ایک ہیلتھ کانفرنس میں شرکت کے لئے آؤٹ آف کنٹری ہیں۔ چار پانچ روز بعد آئیں گے۔ مگر اُن کے کوڈاکٹرز کو میں ابھی فون کر دوں گا۔"

عاتکہ بیگم نے سرمد کے ساتھ ہی ناشتہ کیا تھا۔ ناشتے کے بعد تیار ہو کر سرمد ایئر پورٹ کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔

اس دوران نمرہ نے وجاہت مرزا کے لئے مغربی رخ پہ واقع ایک کشادہ، ہوادار اور روشن کمرے کا انتخاب کر لیا تھا۔ کمرے کا ایک دروازہ باہر لان کی طرف بھی کھلتا تھا۔ کمرے کی کھڑکیوں کے نیچے طویل کیاریاں تھیں جو اس وقت خشک اور ویران پڑی تھیں۔

"نگو! ہم ان کیاریوں میں رات کی رانی کے پودے لگوائیں گے۔" نمرہ نے پُرشوق لہجے میں نکیتا سے کہا تھا۔ "جب رات کو رات کی رانی پھولے گی تو پورا کمرہ خوشبو سے معمور ہو جائے گا۔"

"یہ تو بہت ہی اچھا ہو گا۔" نکیتا خوش ہو کر بولی تھی۔ "ابھی اماں بی کے پاس جاتے ہی میں دونوں مالیوں کو بلوالوں گی۔ تاکہ اماں بی انہیں کام کا حکم دے دیں۔ وہ کیاریوں کی گوڈائی، صفائی اور کھاد پانی شروع کر دیں۔ کمرہ تیار ہونے تک کیاریاں بھی پودے لگانے کے لئے تیار ہو چکی ہوں گی۔"

"ویری گڈ۔" نمرہ نے نکیتا کی دانائی پر اُسے تعریف بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "تو آؤ، اماں بی کے پاس چلتے ہیں۔"

کمرے کے انتخاب، اس کی صفائی ستھرائی اور آرائش وزیبائش کا پروگرام اور کیاریوں میں رات کی رانی لگوانے کی بات سن کر عاتکہ بیگم نہال ہو گئی تھیں۔ انہوں نے فوری طور پر دونوں مالیوں کو بلوا کر نمرہ کے ماتحت کر دیا تھا۔

"دیکھو فضلو! اور دین محمد! تم دونوں کو نمرہ بیٹی کی ہر بات ماننی ہے۔ یہ جیسا حکم دیں، فوری طور پر سرِ تسلیم خم کر لینا ہے۔ ہماری بیٹی کو آپ لوگوں سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔"

"جی اماں بی!" دونوں مالیوں نے سر جھکا کر مؤدب لہجے میں جواب دیا تھا۔ "آپ جیسا حکم دیں...... بی بی کو کوئی شکایت نہیں ہو گی۔" دونوں مالی سلام کر کے کمرے سے باہر چلے گئے تھے۔

"لگتا ہے اماں بی نے گھر کی دیکھ بھال کے لئے نئی ہاؤس کیپر رکھی ہے۔" باہر نکلتے ہی دین محمد نے تبصرہ کیا تھا۔ "لیکن کسی بھلے گھر کی لڑکی معلوم ہوتی ہے.....دیکھا نہیں، کیسی پیاری اور معصوم بچی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" فضلو نے سر ہلایا۔ "تم کیاری کی طرف جاؤ۔ میں کھرپی اور پھاوڑا وغیرہ لے کر آتا ہوں۔ آج ہی گوڈائی کر کے کھاد پانی ڈال کر پانی لگا دیں گے۔"

"ہاں، مگر میرا خیال ہے کہ سرخ اینٹوں سے کیاری کی منڈیر بھی بنانی پڑے گی۔ کوارٹروں کی طرف سرخ اینٹیں رکھی ہیں۔ تم انہیں بھی ٹرالی میں بھر کے لے آنا۔"

"اچھا۔" فضلو نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے کوارٹر کی طرف روانہ ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اینٹیں اور دیگر سامان لئے آ موجود ہوا تھا۔

''بی بی سے کہہ دو، نرسری پہ نبی بخش کو فون کر دیں گی کہ وہ ہرے بھرے، کلیوں لگے پودے تیار رکھے ایک دو دن میں کیاریاں تیار ہو جائیں گی تو ہم ان کیاریوں میں پودے لگا دیں گے...... کیوں کیا خیال ہے؟'' دین محمد نے کیاری کی سرخ اینٹوں سے منڈیر بناتے ہوئے کہا اور کیاری کی سخت بے آب وگیاہ زمین پہ کھرپی سے گوڈی کرتے ہوئے فضلو نے پُر تائیدانداز میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''بہت ہی اچھا خیال ہے۔'' برسوں بعد پہلی بار کیاری بناتے سنوارتے ہوئے ان دونوں کو ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔

مالیوں کے جاتے ہی اکبر نے نمرہ سے پوچھا تھا۔

''آپ لوگوں کا ناشتہ میز پر لگا دوں؟''

نمرہ نے سوالیہ نظروں سے عاتکہ بیگم کی طرف دیکھا تھا۔

''بٹیا! میں تو سرمد میاں کے ساتھ ناشتہ کر چکی۔'' پھر وہ اکبر سے مخاطب ہوئیں۔ ''ایسا کرو تو ان سب کا ناشتہ میز پر لگواؤ اور زلیخا سے کہنا وجاہت میاں کا ناشتہ بھی تیار کر دے۔''

''اگر آپ اجازت دیں تو آج ابا جان کے لئے میں ناشتہ تیار کروں؟'' نمرہ نے ہچکچاتے سے لہجے میں کہا تو عاتکہ بیگم نرم لہجے میں بولیں۔

''بٹیا! آخر تم کیا کیا کرو گی؟...... یہاں تو سب ہی کچھ بگڑ چکا ہے۔ کیا کیا سنوارو گی؟...... تھک جاؤ گی بیٹی!...... اسی لئے......''

''پلیز اماں بی!'' نمرہ نے گزارش کی۔ ''ابا جان کے کھانے پینے کا خیال میں رکھنا چاہتی ہوں۔ اُنہیں صاف ستھری، صحت بخش اور غذائیت سے پُر ڈائٹ کی ضرورت ہے۔ انہیں کوئی بیماری نہیں ہے۔ صرف کمزوری اور نقاہت ہے۔ اور اسے دواؤں کے ساتھ غذاؤں پر توجہ دے کر دور کیا جا سکتا ہے۔

''خدا تمہیں خوش رکھے بیٹی!'' عاتکہ بیگم نے نمرہ کو بازو سے سمیٹ کر خود سے لگاتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ پھر اکبر سے مخاطب ہو کر بولی تھیں۔ ''اکبر میاں! ہماری بیٹی کو کچن میں لے جاؤ اور زلیخا اور لطیف سے ملوا دو۔ بتا دینا، ہماری بیٹی کو ان سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔''

''جی بہتر۔'' اکبر نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''شکریہ اماں بی!'' نمرہ نے شکریہ ادا کیا تھا اور اکبر کے ساتھ کچن کے لئے روانہ ہو گئی تھی۔ نکیتا اس کے ساتھ ہی تھی۔

''ارے آپ کہاں تکلیف کریں گی بی بی جی!'' ادھیڑ عمر باورچن زلیخا نے اس کے نازک ہاتھوں اور دلکش چہرے کو دیکھتے ہوئے قدرے حیرت سے کہا تھا۔ ''آپ جو حکم کیجئے، میں تیار کر دوں گی۔ برسوں سے یہاں یہی کام کر رہی ہوں۔''

''میں جانتی ہوں زلیخا بی! آپ یقیناً بہت اچھا کھانا بنانے والی ہیں۔ رات کو میں آپ کے ہاتھ کا بنا مزیدار کھانا کھا چکی ہوں۔ مگر ابا جان کے لئے میں خود ہی کچھ بنانا چاہ رہی ہوں...... پلیز مجھے اجازت دے دیں۔''

''ارے بی بی جی! آپ تو مجھے گنہگار کر رہی ہیں۔'' زلیخا اپنی تعریف سن کر خوش بھی ہوئی تھی اور نمرہ کے میٹھے اور لجاجت بھرے لہجے سے متاثر بھی ہوئی تھی، جلدی سے بولی۔ ''میں اجازت دینے والی کون؟...... آپ حکم کیجئے...... میں اور یہ لطیف...... ہم دونوں آپ کے حکم کے غلام ہیں۔''

نمرہ نے گہری نظر سے کچن کا معائنہ کیا تھا۔ پوری کوٹھی کی طرح کچن بھی توجہ طلب تھا۔

تازہ یخنی میں گندم کا دلیہ پکاتے وقت بے ساختہ اُسے تابی کی یاد آ گئی تھی۔ وہ تابی کے لئے اسی طرح دلیہ بنایا کرتی

تھی اور وہ بہت خوش ہو کر کھاتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی بے ساختہ اس کی پلکیں نم ہو گئی تھی۔ تابی کو اس سے بچھڑے دس دن ہو گئے تھے۔ آفاق صاحب صبح شام وہاں فون کرتے تھے۔ لمحے لمحے کی خبر مل رہی تھی۔ کتنی ہی بار وہ اسے نیٹ کیمرہ پر ہنستے کھلکھلاتے دیکھ چکی تھی۔ وہ وہاں بہت خوش تھا۔ اس کے وجود سے اس گھر میں ہر سمت خوشیاں ہی خوشیاں پھیل گئی تھیں...... فریحہ، ظفریاب، فریال اور اظفر تو خوش تھے ہی، دانیال کی بھی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ روز نت نئے کھلونے لئے مُنے سے منے آموجود ہوتے تھے۔ تابی کی طرف سے نمرہ کو اب کوئی فکر اور پریشانی نہیں تھی۔ مگر دل کو قرار بھی نہیں تھا۔ وہ خود کو لاکھ گوناگوں مصروفیات میں باندھے رکھتی..... دل کو اَن گنت سوچوں میں اُلجھائے رکھتی، مبادا یادوں کو درِ دل پر دستک دینے کا موقع نہ مل سکے۔ مگر پھر بھی بالکل اچانک ہی یاد بے کلی بن کر اس کے دل کو مٹھی میں جکڑ لیتی تھی۔ اس پل بھی تابی کا خیال آتے ہی اسے اپنے اندر اور باہر کیسے سُونے پن کا احساس ہوا تھا۔ صبر اور ضبط کے بندھن ٹوٹتے محسوس ہوئے تھے۔ تابی کے جانے کے بعد سے اب تک وہ ایک بار بھی کھل کے نہ روئی تھی۔ اس پل اس کا دل چاہا تھا، وہ چیخ چیخ کر روئے۔ اپنے لختِ جگر کو آوازیں دے۔

'تابی! میرے لعل!.....کہاں ہو میرے بچے؟......ماں کی گود خالی کر کے، ماں کا دل سُونا کر کے، ماں کی دنیا ویران کر کے کیوں چلے گئے میرے لختِ جگر......!'

''آپی!'' اُس کے سرِ مژگاں موتی اٹک دیکھ کر نکیتا نے حیران اور تشویش بھرے لہجے میں اسے پکارا تھا۔ ''آپ ٹھیک تو ہیں؟''

''آں..... ہاں۔'' نمرہ ایک دم سے چونک کر سیدھی ہوئی اور اس نے ہاتھ کی پشت سے بے دردی سے آنکھوں کو مسل ڈالا تھا۔

ناشتے کی ٹرے لئے وہ جب تک وجاہت مرزا کے کمرے میں پہنچی تھی، تب تک ریٹا اُن کا منہ دُھلا کر اُنہیں تکیوں کے سہارے تھوڑا سا اُٹھا کر بٹھا چکی تھی۔

''گڈ مارننگ سسٹر ریٹا!'' نمرہ خوشگوار لہجے میں اسے مخاطب کر کے بولی تھی۔ پھر ٹرے لئے وجاہت مرزا کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''سلام ابا جان!.....صبح بخیر۔''

اس کی آواز سن کر، اس کا چہرہ دیکھ کر وجاہت مرزا کی آنکھوں کی روشنی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ذرا ہی دیر میں عاتکہ بیگم بھی وہاں آگئی تھیں۔ وجاہت مرزا کو کسی انکار اور بیزاری کے بغیر خوشی خوشی ناشتے کرتے دیکھ کر وہ خوش ہو رہی تھیں اور دل ہی دل میں نمرہ کی بے حد شکر گزار ہو رہی تھیں۔

وجاہت مرزا کو ناشتہ کروانے اور دوائیں کھلانے کے بعد نمرہ دوبارہ سے کچن میں آگئی تھی۔ اس دوران اکبر نے ٹیبل پر ان لوگوں کا ناشتہ لگا دیا تھا۔ ابھی وہ لوگ ناشتے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ اکبر نے آفاق صاحب کی آمد کی اطلاع دی تھی۔

''لو، یونیورسٹی جانے کے بجائے پروفیسر صاحب، بیٹی سے ملنے چلے آئے۔'' عظمت بی نے مسکرا کر کہا تو نمرہ بھی مسکراتی ہوئی وجاہت مرزا کے کمرے کی طرف چل دی تھی۔ جب وہ کمرے میں پہنچی تھی تو اس وقت تک عاتکہ بیگم، آفاق صاحب کے سامنے اس کی تعریفوں کے پُل باندھ چکی تھیں۔

''میں جانتا ہوں اماں بی!'' اسے دیکھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آفاق صاحب پیار بھرے لہجے میں بولے تھے۔ ''میری نمرہ بیٹی کا دل اللہ نے سونے سے بنایا ہے۔ بے حد محبت کرنے والی اور خدمت کرنے والی بچی ہے۔ خوش

نصیبوں کو ہی ایسی بیٹیاں ملتی ہیں۔"

"غفور بھیا کیسے ہیں؟" نمرہ نے بے تاب لہجے میں پوچھا تو آفاق صاحب مسکرا کر بولے۔ "وہ بھی یہاں آنے اور تم سے ملنے کے لئے بے تاب ہے۔ دیکھو، کل پرسوں اُسے بھی ساتھ لیتا آؤں گا۔"

"انکل! میں، ننگو اور عظمت بی، ابا جان کے لئے ایک کشادہ، روشن اور ہوادار کمرہ ڈیکوریٹ کر رہے ہیں۔ غفور کی مدد کے بغیر یہ کام مکمل نہیں ہوسکتا۔ پلیز آپ اسے کل صبح ہی یہاں بھیج دیجئے گا۔"

"یہ تو بہت ہی اچھا ہوگا۔" آفاق خوش ہو کر بولے۔ "ڈاکٹر رحمان بھی کئی بار یہ بات پوائنٹ آؤٹ کروا چکے ہیں کہ یہ کمرہ ایک مریض کے لئے مناسب نہیں ہے۔ اب اگر تم نے وجیہ کے لئے کمرہ تیار کرنے کا کام سنبھالا ہے تو یہ تو بہت ہی اچھا کیا ہے۔ میں کل صبح یونیورسٹی جاتے ہوئے غفور کو یہاں ڈراپ کرتا جاؤں گا......اور شام کو واپس لوٹتے وقت ساتھ لے جاؤں گا۔"

دوپہر کے کھانے سے پہلے نمرہ کے کہنے پر اکبر اور ریٹا نے وجاہت مرزا کو گرم پانی اور اینٹی سپٹک سوپ سے غسل دلایا تھا۔ غسل سے پہلے نمرہ نے اپنے ہاتھوں سے ان کے گھٹنوں، پنڈلیوں اور بازوؤں پر زیتون اور بادام کے تیل کی مالش کی تھی۔ صاف ستھرا لباس پہن کر، نکھرے نکھرے سے اب وہ آرام سے بستر پر لیٹے تھے۔

ان کی کپڑوں کی الماری اعلیٰ درجے کے بیش قیمت سوٹوں اور شیروانیوں سے بھری پڑی تھی۔ مگر اب یہ ملبوسات ان کے لئے بے کار ہو چکے تھے۔ اب وہ صرف کُرتا پاجامہ ہی پہنتے تھے۔ الماری کے ایک خانے میں کئی جوڑے کُرتے پاجامے کے پڑے تھے۔ مگر سب ہی پرانے اور بدرنگ ہو چکے تھے۔

"اماں بی! ابا جان کے لئے کچھ نئے جوڑوں کی ضرورت ہے۔ موجودہ سارے کپڑے بدرنگ اور بوسیدہ ہو چکے ہیں۔" نمرہ کے کہنے پر عاتکہ بیگم جلدی سے بولی تھیں۔

"تو بٹیا! ڈائری میں موجود باری ڈیزائنر کے نمبر پر فون کر دو۔ وہ ہمارا خاندانی ٹیلر ہے۔ تم جیسا کہو گی، ویسا لباس تیار کر کے پہنچا دے گا۔"

"اماں بی! ابا جان کے لئے میں اپنے ہاتھوں سے کُرتے سینا چاہتی ہوں۔ اُن پہ ایمبرائیڈری بھی کروں گی۔" وہ سر جھکا کر شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تو اماں بی حیرت زدہ رہ گئیں۔

"تم کپڑے سینا جانتی ہو؟.....اور کڑھائی بھی کر لیتی ہو؟"

"جی یہ سب مجھے شریفن خالہ نے سکھایا تھا۔" وہ خوشی اور فخر کے ملے جلے احساس سے بولی تو عاتکہ بیگم نے بے ساختہ اسے سینے سے لگا لیا تھا۔

اسی دوپہر وجاہت مرزا کے نئے بیڈروم پہ کام شروع ہو گیا تھا۔

ساگوان کی لکڑی کا بھاری اور دیدہ زیب فرنیچر نکال کر پچھلی جانب لان میں رکھ دیا گیا تھا۔ دیواروں اور چھت کی جھاڑ پونچھ کے بعد روغنی رنگ کا کام شروع ہو گیا تھا۔ کشادہ باتھ روم کی حالت بھی خاصی دگرگوں تھی۔ تمام نل اور شاور وغیرہ تبدیل کئے گئے تھے۔ نیا واش بیسن اور کموڈ لگایا گیا تھا۔ ٹائلز پہ پالش اور دیگر اسیسریز کی تبدیلی کے بعد واش روم ایک دم سے نیا اور چمچماتا ہوا ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی ایک کشادہ ڈرائنگ روم تھا۔ المایوں پہ وارنش اور دیواروں پہ آویزاں قد آدم بلجیم کے آئینوں کی صفائی اور پالش کے بعد ڈرائنگ روم بھی ایک دم سے نکھر گیا تھا۔ وجاہت مرزا کے تمام سوٹس اور شیروانیاں جھاڑ کر یہاں الماریوں میں لٹکا دی گئی تھیں۔ اس دوران نمرہ نے ان کے لئے کئی کُرتے پاجامے سِل سِلا کر تیار کر لئے تھے۔ اب وہ ان کے گلے اور کندھوں پر نفیس کڑھائی میں مصروف تھی۔

بیڈروم کی دیواروں پرایلش وائٹ رنگ، دروازوں اور کھڑکیوں پہ پالش اور فرش پہ دُھلائی اور پالش کے بعد پورا کمرہ نیا سا ہو گیا تھا۔ کمرے کے کونے میں لٹکا لمبوترا جاپانی فانوس گرد میں اٹکا ہوا تھا۔ اسے دُھلوا اور چمکا کر دوبارہ سے آویزاں کر دیا گیا تھا۔ پرانے اے سی کی جگہ فل سائز کا اسپلٹ لگ چکا تھا۔ فرنیچر پہ پالش ہو چکی تھی۔ بیڈ کے لئے نیا میٹرس اور سامنے دھرے صوفوں کے لئے پردوں کے ہم رنگ مخملی پوشش تیار کروالی گئی تھی۔ حریری پردوں، پردوں کے ہم رنگ سادہ کارپٹ اور کارپٹ کے وسط میں بچھا گول خوش رنگ رگ کمرے کی دلکشی میں اضافہ کر رہا تھا۔ کشادہ دریچے کے نیچے ساگوان کی لکڑی کا دیدہ زیب بیڈ دھرا تھا۔ بیڈ کے دونوں سائیڈ پہ رکھی سائیڈ ٹیبلز پہ لیمپ بہار دکھا رہے تھے۔ دائیں جانب ایک چھوٹے کیبنٹ میں وجاہت مرزا کی دوائیں رکھی تھیں۔ دائیں جانب بیڈ کے ساتھ دو آرام دہ کرسیاں دھری تھیں۔ ایک ڈاکٹر کے لئے اور ایک اماں بی کے لئے۔ بائیں جانب ایک خوبصورت مخملی صوفہ سیٹ دھرا تھا جس کے سامنے بیضوی میز پر شیشے کے خوبصورت واز میں سرخ گلاب سجے تھے۔ لان میں کھلنے والی کھڑکیوں کے نیچے کیاریوں میں رات کی رانی کے پودے لہلہا رہے تھے۔

وجاہت مرزا نئے اور آرام دہ بیڈ پر نمرہ کے ہاتھ کا سِلا نیا کُرتا پہنے مسکراتے چہرے کے ساتھ لیٹے تھے۔

''سچ آپی! کمرہ کیا ہے...... جنت کے گوشوں میں سے ایک گوشہ لگ رہا ہے۔'' غفور کے کہنے پر نمرہ بے ساختہ مسکرا دی تھی اور پیار بھرے لہجے میں بولی تھی۔

''اس سلسلے میں تمہاری محنتیں اور کاوشیں بھی کاؤنٹ ایبل ہیں غفور!''

اگلے دن ہی آفاق صاحب، غفور کو نمرہ کے پاس چھوڑ گئے تھے۔

''یہ لڑکی کون ہے آپی؟'' غفور نے کن اکھیوں سے نگیتا کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی میں نمرہ سے پوچھا تھا۔ نگیتا بھی حیران اور پسندیدہ نظروں سے غفور کو دیکھ رہی تھی۔ اونچا لمبا، چھریرے جسم کا یہ معصوم صورت لڑکا پہلی ہی نظر میں اسے بہت اچھا لگا تھا۔ غفور کی نگاہیں بھی اس کی چمکتی آنکھوں اور دمکتے چہرے پر جم سی گئی تھیں۔

نمرہ نے دونوں کا باہم تعارف کروا دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ دونوں بے تکلفی اور اپنائیت بھرے انداز میں مصروف گفتگو تھے۔ دونوں کی سوچ اور پسند و ناپسند میں حیرت انگیز ہم آہنگی و یک رنگی تھی۔ کمرے کی سجاوٹ و بناوٹ میں دونوں ایک ہی انداز سے مشورے دیتے اور کام کرتے تھے۔ نمرہ کو حیرت ہوئی۔ وہ دونوں بھی حیران ہوتے۔ وقت ملتا تو ایک دوسرے کے بارے میں بھی بات کرتے۔

''تم انٹر کے بعد کیا کرو گے؟'' نگو نے اُس شام اُس سے پوچھا تھا۔

''گریجویشن کا ارادہ ہے۔'' غفور نے بتایا۔

''پھر؟'' نگو نے پوچھا۔

''پھر ظاہر ہے، نوکری کروں گا۔'' غفور مسکرایا۔ ''صاحب کہتے ہیں، وہ مجھے کسی سرکاری ادارے میں اچھی سی ملازمت دلوا دیں گے۔''

''ابا جان کے کتنے ہی ادارے ہیں۔ فیکٹریاں اور ہوٹل ہیں۔ تم سرمد بھیا سے کہہ کر ان اداروں میں سے کسی میں نوکری کر لینا۔''

نگو کے مشورے پر غفور مسکرایا۔

''اگر تم یہ چاہتی ہو، تو چلو یہی کر لیں گے...... خوش؟''

''ہاں۔'' نگو مسکرائی۔ ''نوکری کے بعد کیا کرو گے؟''

''ابھی اتنا آگے تک سوچا نہیں۔'' غفور پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''سوچتے ہیں کہ آگے کیا کرنا ہے۔''

''ارے بدھو! آگے کیا کرنا ہے؟ پھر شادی کرنی ہے۔'' نگو کے کھلکھلا کے کہنے پر غفور یک ٹک اسے دیکھے گیا تھا۔

اس پل وہ اسے اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ اس کا دل چاہا تھا کہ اسے پوری کی پوری اٹھا کر اپنے دل میں چھپا لے۔ کچھ دور کھڑی نمرہ، غفور کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے چھلکتے اَن چھوئے، انجانے چاہت کے رنگ نمرہ کو بڑے واضح نظر آ رہے تھے۔

بہت پہلے سرمد کو دیکھ کر ایسے ہی انوکھے انجانے رنگوں نے اس کی بے رنگ دنیا میں رنگ سجائی تھی۔ اَن دیکھے، اَن چھوئے ست رنگے سپنے آپ سے آپ اس کی پلکوں کی منڈیروں پر چراغوں کی طرح جل اٹھے تھے۔ مگر یہ سب کس قدر لاحاصل اور بے معنی تھا۔ انوکھے رنگ سیاہی بن کر اس کے دل و ذہن کو اندھیروں میں دھکیل گئے تھے۔ نرالے ست رنگے شیشوں سے بنے سپنے کرچی کرچی ہو کر اس کی آنکھوں کو ہی نہیں، اس کی روح کو بھی زخمی کر گئے تھے۔ یہ یکطرفہ پسندیدگی..... محبت کا یہ پہلی نظر کا فیصلہ بھی اکثر ناسور بن کر روح سے چمٹ جاتا ہے اور غیر محسوس طریقے سے عمر بھر رستا رہتا ہے۔ مگر نمرہ کو غفور بہت عزیز تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی، اس کے پہلے پہلے جذبے بے توقیر ہوں۔ کیونکہ وہ جانتی تھی نگو اس گھر میں ایک چہیتی بیٹی کی حیثیت سے رہ رہی ہے۔ اس کے لکھوں پتی باپ بھائی اس کی شادی ایک معمولی سے گھریلو ملازم غفور سے کبھی بھی کرنا پسند نہیں کریں گے۔ اور دوسری سب سے اہم بات مذہب کی دیوار تھی۔ نگیتا ہندو تھی۔

''تم جانتے ہو غفور! نگو مسلمان نہیں ہے۔'' اس نے باتوں باتوں میں سرسری سے لہجے میں بتایا تھا۔ ''مگر بہت ہی اچھی انسان ہے۔ بے حد محبت کرنے والی۔''

''کیا کہہ رہی ہیں آپ، آپی؟'' غفور کو دھچکا لگا تھا۔ ''اس کا نام تو نگو ہے..... اور.....''

''ہاں نام سے میں بھی یہی سمجھی تھی کہ شاید اس کا نام نگینہ ہے۔ مگر اس کا نام نگیتا ہے۔ وہ ہندو ماں باپ کی بیٹی ہے۔ اور یہ اس گھر والوں کا بڑا پن ہے کہ مذہب کی دوری کے باوجود وہ ان سب کے دل کے بے حد قریب ہے۔''

غفور کو یہ سچائی جان کر صدمہ پہنچا تھا۔ اس نے تو انجانے میں جانے کیسے کیسے سپنے سجا لئے تھے۔ ایک انوکھی دنیا بسا لی تھی۔

''تم نے کبھی بتایا نہیں کہ تم......'' وہ شکوہ بھرے لہجے میں نگو سے کہہ رہا تھا۔

''تم نے کبھی پوچھا ہی کب تھا؟'' نگو معصومیت سے جوابدہ ہوئی۔

''تم کب سے یہاں ہو؟'' غفور پوچھ رہا تھا۔

''میں تو اسی گھر میں پیدا ہوئی ہوں۔'' نگو نے جواب دیا۔ ''بہت پہلے میرے نانا اس گھ میں مالی تھے۔ میری ماں ان کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ شادی کے بعد وہ میرے پتا کے ساتھ دوسرے شہر چلی گئی تھی۔ میری پیدائش کے وقت وہ دوبارہ سے یہاں آئی تھی۔ مگر میرے جنم کے ساتھ ہی اس کا دیہانت ہو گیا تھا..... ماں کے مرنے کے بعد میرے باپو کبھی لوٹ کر نہیں آئے۔ نانا نے ہی مجھے پالا پوسا۔ مگر جب میں چار سال کی تھی، نانا بھی پرلوک سدھار گئے۔ اس کے بعد اماں بی نے مجھے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ انہی نے مجھے پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے۔ وہ مجھے بالکل اپنی اولاد کی طرح چاہتی ہیں۔ اسد بھائی اور سرمد بھیا مجھے اپنی چھوٹی بہن کہتے ہی نہیں، سمجھتے بھی ہیں۔''

''نگو!..... میری بات کا غلط مطلب مت لینا۔ مگر میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں، تمہیں کبھی اس بات کا خیال نہیں آیا کہ تم ہندو ہو۔ جبکہ یہ سب مسلمان ہیں۔ تمہارے اور ان کے بیچ مذہب کی دیوار کھڑی ہے؟'' غفور نے دھیمے اور افسردہ لہجے میں کہا تو نگو پُرسوچ لہجے میں بولی۔

''غفور! میں نے کبھی بھی یہ نہیں سوچا۔ نہ ہی کبھی کسی نے مجھے یہ احساس دلایا کہ میرا اور ان کا مذہب جدا ہے۔ مذہب کے الگ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ مجھے بھی وہ سب اپنوں کی طرح ہی پیار کرتے ہیں۔''

''ہاں شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' غفور نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''کچھ رشتوں کے لئے مذہب کا الگ ہونا کچھ معنی نہیں رکھتا.....مگر ایک رشتہ ایسا بھی ہے جس کے لئے ہم مذہب ہونا ضروری ہے۔''

''بھلا وہ کون سا رشتہ ہے؟'' نگو نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

''شادی کا رشتہ۔'' غفور کے لہجے کا ملال نگو کو اپنے دل میں محسوس ہوا تھا۔

''لو بھلا، شادی کے رشتے کے لئے ہم مذہب ہونا کیوں ضروری ہے؟'' وہ آنکھیں پٹپٹا کر بولی۔ ''تم اخبا میں نہیں پڑھتے، ٹی وی پر نہیں دیکھتے، کتنے مسلمان ایکٹروں کی بیویاں ہندو ہیں اور کتنی ہی ہندو لڑکیوں نے مسلمان مردوں سے شادی کر رکھی ہے۔''

''میں ان شادیوں کو نہیں مانتا۔'' غفور نے پُر یقین لہجے میں کہا۔ ''شادی ایک مذہبی فریضہ ہے۔ جب مذہب کو ہی اُٹھا کر الگ رکھ دیا جائے تو پھر کیسی شادی؟.....کس کام کی شادی؟.....اس سے تو بہتر ہے کہ مغرب کی طرح یہ لوگ بنا شادی کے ہی ساتھ رہ لیں۔''

''ہاں، کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔'' کئی لمحوں تک پلکیں جھپکا کر غور کرنے کے بعد آخر نکیتا نے اس کی بات سے متفق ہوتے ہوئے کہا۔ ''شادی ایک مذہبی فریضہ ہے۔ اور جب پتی پتنی کے مذہب ہی الگ الگ ہوں گے تو پھر وہ ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟......بھلا پتی پتنی کیسے بن سکتے ہیں؟''

'ہاں، اسی ادراک نے تو مجھے جیتے جی مار دیا ہے۔' غفور نے سلگتی نظروں سے نکیتا کی طرف دیکھا مگر لب سے کچھ نہیں کہا۔ پہلی پہلی بار نگو کو دیکھ کر اس کا دل نئے انداز سے دھڑکا تھا۔ انجانے، اَن چھوئے خواب پلکوں پہ اُترے تھے..... مگر مذہب کی اَن مٹ ریکھا نے اس کے احساس، اس کی دھڑکن میں بسے ہر جذبے کی قوس وقزح کو سیاہ رنگ میں ڈبو دیا تھا۔ سب ہی کچھ ملیا میٹ ہو گیا تھا۔ ہر جذبہ، ہر احساس مایوسی کی آگ میں جل کر خاکستر ہو گیا تھا۔

عاتکہ بیگم نئے کمرے کی آرائش و زیبائش اور وجاہت مرزا کے اس کمرے میں منتقل ہونے سے بے حد خوش تھیں۔ خود وجاہت مرزا بھی خوش اور مطمئن دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ مسلسل مالش سے ہاتھ پیر بھی اب پہلے سے بے جان نہیں رہے تھے۔ اب وہ کافی دیر تک بیٹھ سکتے تھے اور اپنے ہاتھوں کو ہلکے ہلکے جنبش دینے لگے تھے۔ ڈاکٹر رحمان واپس لوٹے تو وجاہت مرزا کی بہتر حالت اور کمرے کی شاندار پوزیشن دیکھ کر حیران بھی ہوئے تھے اور خوش بھی۔

''اماں بی! آپ نے تو کمال کر دیا۔'' وہ خوشی سے لبریز آواز میں گویا ہوئے تھے۔

''نہیں ڈاکٹر بیٹے! یہ میرا نہیں، میری بیٹی کا کمال ہے۔'' عاتکہ بیگم نے اپنے پیچھے کھڑی نمرہ کو آگے کیا۔ نگاہیں جھکائے، لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ سجائے نمرہ اس پل اس قدر خوبصورت لگ رہی تھی کہ ڈاکٹر رحمان متعجب سے بے ساختہ بول اُٹھے تھے۔

''مبارک ہو۔ آخر سرمد نے شادی کر ہی لی۔ میں یہی تو کہتا تھا کہ یہ خوشی، وجاہت صاحب کی زندگی میں نیا اُجالا لے کر آئے گی۔ اور آنے والی لڑکی یعنی سرمد کی دُلہن، وجاہت کی بے رنگ زندگی میں خوشیوں کے رنگ گھولے گی۔ صد شکر کہ اس نے میری بات سمجھ لی۔''

ڈاکٹر رحمان کے بے ساختہ جملے، نمرہ کے رخسار پر سرخی بن کر اور عاتکہ بیگم کے لبوں پر حیران سی مسکراہٹ بن کر بکھر

گئے تھے۔

''میں آپ کے انتخاب کی داد دوں گا'' وہ اپنی ہی جھونک میں بولے چلے گئے۔ ''میں یہاں موجود نہیں تھا۔ ورنہ آپ بلاتیں یا نہ بلاتیں، میں خود سے اس شادی میں شریک ہو جاتا۔ مگر ایک بات کہوں گا۔ سرمد کی دُلہن ہیں لاکھوں میں ایک..... ہر لحاظ سے پرفیکٹ۔''

''ارے رحمان بیٹا! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔'' عاتکہ بیگم نے جلدی سے تصحیح کی۔ ''سرمد کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ ''یہ تو ہماری مہمان ہیں۔ آفاق میاں کی منہ بولی بیٹی ہیں.....اسی ناطے ہماری بھی بیٹی ہیں۔''

یہ ساری باتیں وجاہت مرزا کی سماعت سے گزر کر ان کے لبوں پر سرور بھری مسکراہٹ بن کر بکھر گئی تھیں۔

''میں ڈاکٹر صاحب کے لئے چائے لاتی ہوں۔'' نمرہ دوپٹہ درست کرتی چائے کے بہانے سے تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی اور ڈاکٹر رحمان آنکھوں میں حیرانی لئے کبھی وجاہت کے شگفتہ چہرے کو اور کبھی عاتکہ بیگم کی حیران نظروں کو تک رہے تھے۔ کئی لمحوں تک سوچوں میں گم رہنے کے بعد وہ پُرسوچ آواز میں گویا ہوئے تھے۔

''اماں بی! اگر ایسا نہیں ہے.....تو بھی، ایسا کر لینے میں کیا قباحت ہے؟ .....لڑکی خوش شکل، خوش اخلاق، خوش کردار اور خوش اطوار ہے۔ آتے ہی اس نے اس گھر کی ہی نہیں، برسوں سے بستر پہ پڑے وجاہت کی بھی حالت بدل کر رکھ دی ہے۔ آپ کو اس سے اچھی اور کون سی لڑکی مل سکتی ہے؟.....میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ پہلی فرصت میں آفاق صاحب سے بات کریں اور اس بچی کو جو مہمان بن کر آپ کے گھر آئی ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی گھر میں روک لیں۔''

عاتکہ بیگم حیران و ششدر سی رحمان صاحب کی بات سن رہی تھیں۔ اس حوالے سے تو انہیں بھولے سے بھی کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ نمرہ لاکھ، لاکھوں میں ایک تھی۔ مگر ایک طلاق یافتہ اور ایک بچے کی ماں تھی۔ وہ تو شاید اس بات کو نظر انداز کر بھی سکتی تھیں۔ مگر سرمد کا اس بارے میں کیا ردِعمل ہو سکتا تھا.....اس بارے میں وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھیں۔ ان کا اندازہ تھا کہ سرمد نہ سہی، فروا سرمد پہ دل و جان سے فدا ہے..... حُسن و رعنائی، اخلاق و کردار میں فروا کا نمرہ سے کوئی موازنہ ہی نہ تھا۔ نمرہ آسمان تھی تو فروا زمین۔ مگر اس حوالے سے فروا آگے تھی کہ وہ نہ صرف کنواری تھی بلکہ سرمد سے محبت کی دعوے دار بھی تھی۔ اور یہ کہ وہ سرمد کی خالہ کی بیٹی تھی۔ اور نمرہ ایک لاوارث، حرماں نصیب، مطلقہ، ایک بچے کی ماں۔ شاید سرمد اس کے بارے میں سوچنے کے لئے بھی آمادہ نہ ہوتے۔

وہ ملول سی اپنی مخصوص کرسی پہ بیٹھ گئی تھیں۔ آج ڈاکٹر رحمان نے انہیں ایک نئی سوچ کی راہ سجھائی تھی۔ مگر اس سوچ نے انہیں کچھ اور افسردہ کر دیا تھا۔

❀===❀===❀
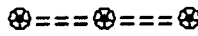
ہر سمت ملگجا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ نیچے سیڑھیوں پر ایک کم پاور کا بلب ٹمٹما رہا تھا جس کی زرد روشنی اطراف میں پھیلی تاریکی چھانٹنے میں ناکام دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سیڑھیوں کی سائیڈ دیوار پکڑتا، ایک ایک پائیدان پر ٹٹول ٹٹول کے پاؤں دھرتا اوپر چڑھ رہا تھا۔ چوتھی منزل پر سیڑھیوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ سامنے ایک مٹیالے سے رنگ کا دروازہ تھا۔ اس نے اپنی دھڑکنوں کو اعتدال پر لاتے ہوئے دروازے پر دستک دی تھی۔ اتنی اوپر چڑھ آنے کے باعث اس کی سانس پھول گئی تھی اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

وہ کئی لمحوں تک کھڑا رہ کر گہری گہری سانسیں لے کر خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ کسی قدر سانس کے بحال ہونے کے بعد اس نے دوبارہ سے دستک دی تھی۔ مگر بند دروازے کے اُس پار مکمل خاموشی تھی۔

کیا وہ درست جگہ پہ پہنچا ہے؟.....اس نے پلٹ کر نیچے جاتی سیڑھیوں کی طرف دیکھ کر سوچا تھا۔ اسی سال خوردہ

بلڈنگ کے سامنے اس نے کئی بار اسے ڈراپ کیا تھا۔ اسی بلڈنگ کی چوتھی منزل پر وہ رہتا تھا۔ مگر اتنے برسوں میں کبھی بھی اسے اس کے فلیٹ پر آنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ آج اس کی مجبوری ضرورت بن کر اسے اس کے دروازے پر لے آئی تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر پوری طاقت کے ساتھ دروازے کو تھپتھپایا تھا۔ اور اس بار دروازے کے اس پار ہلکی سی آہٹ جاگی تھی۔ کوئی آہستہ روی سے چلتا دروازے تک آیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر دستک کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ دوازہ کھل گیا تھا۔

''رسید بھائی! تم......؟'' ادھ کھلے دروازے کے اس پار کھڑے یونس لاکھانی نے حیرت اور بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ رشید کے اُلجھے بال، پریشان چہرہ اور ملگجے کپڑے، بہ زبان خود اس کی حالت کے ترجمان تھے۔

''تم نے کئی بار بتایا تو تھا کہ تم یہاں رہتے ہو۔'' رشید ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ ''مگر آج پہلی بار مجھے یہاں دیکھ کر تمہیں حیرت تو ہوئی ہوگی...... میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟''

''ارے نئیں...... بالکل بھی نئیں...... آپ اندر آؤ نا۔'' لاکھانی نے دروازے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو یوں اچانک دروازے پر دیکھ کر مجھے حیرانی تو ہوئی، مگر کھوسی بھی ہوئی ہے۔''

رشید، لاکھانی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ سامنے ایک چھوٹا سا پیج تھا۔ فرش پر دھول جمی تھی۔ ایک لمبی بینچ پڑی تھی اور سب طرف گہرا سناٹا اور روح میں اُترتا سکوت پھیلا ہوا تھا۔

''اکیلے رہتے ہو کیا؟'' ہر سمت پھیلے سکوت کو محسوس کرتے ہوئے رشید نے سوال کیا تھا۔

''نئیں..... گھروالی کی طبیعت تھوڑی کھراب تھی۔ اپنی ماں کے گھر گئی ہے..... دونوں چھوٹی چھوکریاں بھی اسی کے ساتھ گئی ہیں۔''

''اوہ۔'' رشید نے تشویش کے اظہار کے لئے ہونٹ سکیڑے۔ ''کیا طبیعت خراب ہے؟...... سب ٹھیک تو ہے نا؟ بڑی پریشانی کی کوئی بات تو نہیں ہے نا؟''

''ابھی ایسی کوئی پریسانی نئیں ہے..... اوپر والے کا کرم ہے۔'' لاکھانی نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر ایک نگاہ اوپر کی طرف دیکھا اور تشکر بھرے لہجے میں بولا۔ ''گھروالی امید سے ہے۔ لگاتار چار بیٹیوں کے بعد، الٹرا ساؤنڈ سے پتہ چلا، اس بار بیٹا ہی ہے۔ سچی رسید بھائی! وہ اوپر والا بڑا رحیم ہے۔ تہہ دل سے معافی مانگو تو وہ معاف کرنے میں دیر نہیں لگاتا۔''

رشید حیران نظروں سے لاکھانی کا دمکتا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ آج کتنے ہی عرصے بعد وہ لاکھانی سے ملا تھا۔ لاکھانی اب بھی وہی تھا، مگر اب اس کے اطوار بدل چکے تھے۔ اب وہ عورتوں کی دلالی سے رقم اینٹھ کے گھر چلانے والا دلال نہیں تھا۔ بلکہ وہ اپنے گناہوں سے تائب ہونے کے بعد ایک محنت اور ایمانداری سے روزی کمانے والا انسان بن چکا تھا۔

''لاکھانی! کچھ بدلے بدلے لگ رہے ہو؟'' رشید کے دل میں اُبھرتا سوال اس کے لبوں پر آ گیا تھا۔

''رسید بھائی! جندگی کی کڑوی گولی کھا کے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں، برائی کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوتا ہے۔ مین ہمیسہ سے ایسا نہیں تھا..... اپنی اسٹیٹ ایجنسی تھی.... پروپرٹی ڈیلر کا کام کرتا تھا...... جان کیسے مکان دکان کی بروکری کرتے کرتے کھراب عورتوں کی دلالی تک جا پہنچا...... پھر مہکار جیسی بدقماس عورت سے ملا اور میری جندگی کا رُکھ (رخ) ہی بدل گیا۔ جانتے ہو، مجھے اپنے اس برے عمل کی کیا سجا (سزا) بھگتنا پڑی؟...... میری ایک بیٹی چیچک میں مبتلا ہو کر مر گئی اور ایک کسی آوارہ لڑکے کے ساتھ گھر چھوڑ کر بھاگ گئی۔ وہ اپنا دل بہلانے کے بعد اُسے کوٹھے پر بٹھا آیا۔ مگر اس نے بالکونی سے کود کر اپنی جان دے دی۔ پے در پے ان صدموں نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں نے ہر برائی سے توبہ کر لی۔ بند

بڑی دکان کا تالا کھولا اور پھر سے اسٹیٹ ایجنسی سروع کر دی۔ اوپر والے کا بڑا کرم ہے۔ عجت (عزت) سے حق حلال کی دو وقت کی روٹی دے رہا ہے۔ اب برسوں بعد اس نے بیٹے کی آرجو (آرزو) بھی پوری کرنے کی اُمید بندھا دی ہے۔ اور کیا چاہئے؟''

لاکھانی کے اندر کا اطمینان اس کے چہرے اور آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔ ''ارے میں تو اپنی ہی باتوں میں لگ گیا۔'' لحظہ بھر بعد لاکھانی چونک کر بولا۔ ''آپ سناؤ...... آپ کیسے ہو؟...... اماں جی کیسی ہیں؟''

''میری تو خیر ہے۔'' رشید دونوں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھا کر بے نیازی کا اظہار کرتے ہوئے قدرے متفکر لہجے میں بولا۔ ''ہاں، مگر اماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔''

''ارے کیا ہوا اُنہیں؟'' لاکھانی جلدی سے بولا۔

''سردی کا ہلکا بخار تھا۔ بگڑ کر نمونیہ بن گیا۔ ہسپتال میں داخل کیا ہے۔''

''کون سے ہسپتال میں ہیں؟..... علاج تو صحیح ہو رہا ہے نا؟'' لاکھانی نے فکرمند لہجے میں سوال کیا۔

''سول ہسپتال میں ہیں۔ اب سوچ رہا ہوں، کسی پرائیویٹ ہسپتال میں لے جاؤں۔'' رشید بولتے بولتے ایک دم خاموش ہو گیا۔ ''مگر...... میری مالی حالت سے تو تم واقف ہو...... اسی لئے میں تمہارے پاس آیا تھا۔''

رشید کے ہچکچاتے لہجے نے لاکھانی کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔

''میں سمجھ گیا رسید بھائی!'' وہ ایک دم سے اٹھ کر اندر چلا گیا تھا۔ اور جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ہزار ہزار کے کچھ نوٹ تھے۔

''یہ چار ہجار روپے ہیں۔ اس وقت یہی ہیں۔'' اس نے نوٹ رشید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ایک دو روج میں، میں کچھ اور انتجام بھی کر لوں گا...... ابھی آپ یہ رکھ لو..... اور ہاں، یہ رقم واپس کرنے کی جرورت نہیں۔ یہ اماں جی کے لئے میری طرف سے معمولی تحفہ ہے۔ انہوں نے مجھے بہت نوازا ہے..... کھفا (خفا) بھی ہوتی تھیں مگر پیار بھی بہت کرتی تھیں۔''

''شکریہ لاکھانی!'' رشید نے مشکور سے انداز میں روپے پکڑ لئے تھے۔ ''تم نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ اور آج اس بے کسی اور غربت کے وقت بھی تم نے آنکھیں نہیں پھیریں۔ واقعی تم میرے سچے دوست ہو۔''

''ارے رسید بھائی! آپ کی آنکھوں میں آنسو بالکل بھی نہیں سجتے۔'' لاکھانی اسے گلے لگاتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں بولا۔ ''ابھی ساری باتیں چھوڑو۔ چلو اماں جی کے پاس چلتے ہیں۔ ابھی انہیں کسی پرائیویٹ ہسپتال میں شفٹ بھی کرنا ہے۔''

''کیا تم میرے ساتھ چل رہے ہو؟'' رشید نے حیرت بھری مسرت سے پوچھا۔

''اور نہیں تو کیا؟'' لاکھانی مسکرایا۔ ''پہلے کبھی میں نے آپ کو اکیلا چھوڑا ہے جو آج چھوڑوں گا؟...... سچا دوست وہی ہے جو مسکل اور مصیبت میں ساتھ دے۔ چلو چلتے ہیں۔''

رشید، لاکھانی کو لئے جب ہسپتال پہنچا تو سلطانہ کی حالت اور بگڑ چکی تھی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور سانس سینے میں نہیں سما رہی تھی۔

''اماں! دیکھو تم سے کون ملنے آیا ہے۔'' رشید نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

سلطانہ نے بہ دقت تمام آنکھیں کھول کر پہلے لاکھانی اور پھر رشید کی طرف دیکھا۔

''میں..... سمجھی تُو..... نمو کو لے آیا......'' اُس نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا۔ ''شاید..... میری زندگی میں...... اس

سے دوبارہ..... ملنا نہیں لکھا..... پر..... تُو مجھ سے وعدہ کر..... تُو اُسے ضرور لے آئے گا..... رشید!..... تجھے میری قسم، تُو نمو کو ضرور لے آنا..... تُو اُس کے ساتھ رہے گا..... تو میری روح کو سکون رہے گا..... ورنہ..... قبر میں بھی..... تیری ماں..... بے چین رہے گی۔"

"اماں!..... اماں.....!" سلطانہ کی بگڑتی حالت نے رشید کو ایک دم سے پریشان کر دیا تھا۔

"میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔" لاکھانی اندر کی طرف بھاگا اور رشید نے سلطانہ کو شانوں سے تھام کر کہا۔

"اماں! تمہیں کچھ نہیں ہوگا..... میں پیسے لے آیا ہوں..... میں تمہیں کسی اچھے ہسپتال میں لے کے جاؤں گا۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔"

مگر اس کا دعویٰ بے معنی ثابت ہوا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سلطانہ نے آخری ہچکی لی تھی اور اس کا سر ایک جانب کو ڈھلک گیا تھا۔

"اماں.....!" رشید اس کے بے جان سینے پر سر رکھ کر چھوٹے بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

سلطانہ کے علاج کے لیئے لائے گئے اُدھار پیسے اس کے کفن دفن میں لگ گئے تھے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے آج تک سلطانہ اُس کے ساتھ تھی۔

کئی بار عارضی جدائیاں بھی آئیں۔ ایک بار وہ اسے لاہور میں اکیلا چھوڑ کر کراچی چلا آیا تھا۔ مہکار کے بہکانے میں آ کر وہ اسے چھوڑ کر مہکار کے ساتھ نئے گھر میں شفٹ ہو گیا تھا..... کئی بار وہ اسے چھوڑ کر ملک سے باہر بھی گیا تھا۔ مگر ہر بار یہ یقین ہوتا تھا کہ آج نہیں تو کل وہ ماں سے جا ملے گا۔ مگر آج یہ کیسی جدائی تھی؟

اس کا ممتا بھرا آنچل سر سے اُترا تھا تو اکیلے پن کے گہرے احساس نے اس کے دل کو مٹھی میں بند کر لیا تھا۔

آج ماں نہیں تھی تو وہ بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا تھا۔

دیکھا جاتا تو وہ اسی ماں کی وجہ سے آج تنہا اور اُجڑا ہوا تھا۔ ورنہ ایک نہیں، اس نے چار شادیاں کی تھیں اور تقدیر سے اسے نمرہ جیسی معصوم، خدمت گزار اور وفا شعار بیوی بھی ملی تھی۔ مگر وہ اپنی ماں کی وجہ سے اس کی قدر نہیں کر سکا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ سلطانہ نے کبھی بھی اپنے اکلوتے بیٹے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وہ ہمیشہ صرف اپنے بارے میں سوچتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر رشید اپنے بیوی بچوں میں خوش و آباد ہو گیا تو شاید اس کا خیال نہیں رکھے گا۔ اسے پوری طرح اپنی طرف راغب رکھنے کی خاطر اور اسے اپنی مٹھی میں بند کر کے جینے کے لیئے اس نے رشید کو کبھی بھی کسی کا بھی بن کر رہنے نہیں دیا تھا۔ اس کی ماں اسے بسنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ پہلی بار یہ ادراک اُسے مہکار نے ہی دیا تھا۔ اور خود کو بسانے کی خاطر اس نے ماں کو اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ مگر یہاں تقدیر نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ مہکار ان عورتوں میں سے تھی ہی نہیں جو کسی ایک مرد کی بن کر رہتی ہیں۔

سو ایک بار پھر اس کا گھر اُجڑ گیا تھا۔

آج ماں اس سے دامن چھڑا کر چلی گئی تھی تو اسے پوری دنیا اُجڑی اُجڑی، ویران لگ رہی تھی۔ وہ کئی دن تک یوں ہی افسردہ، ویران سا گھر میں پڑا رہا تھا۔

"رسید بھائی! بس اب صبر کرو۔ مرنے والے کے ساتھ مرنا ممکن ہوتا تو ہر مرنے والے کے ساتھ اس کے کئی چاہنے والے بھی مر جاتے اور یہ سلسلہ کبھی بھی نہ رُکتا..... بس اوپر والے کی رجا (رضا) میں راجی ہونا ہی بندے کا فرج ہے..... اب اُٹھو..... کچھ کام دھندے کے بارے میں سوچو۔"

"لاکھانی!..... تُو نے سنا تھا نا..... اماں نے آخری کیا بات کی تھی؟" رشید نے پوری آنکھیں کھول کر لاکھانی کی

طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''میں سمجھا نہیں؟'' لاکھانی گڑبڑا کر بولا۔ ''آپ کس بات کے بارے میں بول رہے ہو؟''

''ماں نے کہا تھا.....نمو کو ضرور لے آنا۔'' رشید خود کلامی کے سے لہجے میں بولا تو لاکھانی گھبرا کر بولا۔

''ابھی رسید بھائی! میری مانو تو اس قصے کو بھلا دو۔''

رشید نے پلکیں اُٹھا کر لاکھانی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''دیکھو، اماں جانتی تھی، تم بھی جانتے ہو......اور میں بھی جانتا ہوں کہ آپ نمرہ کو طلاق دے چکے ہو۔ ابھی بچے کا کیا معلوم، دنیا میں آیا بھی کہ نہیں......تم ہی بتا رہے تھے کہ واجد ٹھگنا جب پروفیسر کے گھر میں گھسا تھا تو اسے وہاں کوئی بچہ دکھائی نہیں دیا تھا......رہا سوال نمرہ کا تو ابھی آپ کا اُس سے کوئی رستہ نہیں ہے......آپ اُسے کس طرح واپس لا سکتے ہو؟ اور پھر یہ بھی تو جروری نہیں کہ وہ پروفیسر کے گھر میں ہی ہو......خدا جانے وہ کہاں ہے، کہاں نہیں ہے؟......ابھی اس حسنہ کی جبان کا بھی تو کچھ بھروسہ نہیں ہے۔''

''لاکھانی! میں نے خود اسے پروفیسر کے ساتھ اس کی گاڑی میں دیکھا ہے۔'' رشید اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کر کے پُرزور لہجے میں بولا۔

''ابھی دیکھو! ساتھ دِکھنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہی رہتی ہے......ابھی میں آپ کے ساتھ اس گھر میں موجود ہوں......مگر میں آپ کے ساتھ رہتا تو نہیں ہوں نا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ ہوسکتا ہے، وہ پروفیسر کے گھر میں موجود نہ ہو؟'' رشید نے پُرسوچ نظروں سے لاکھانی کی طرف دیکھا۔

''اور نہیں تو کیا؟'' لاکھانی جلدی سے بولا۔ ''میں تو کہتا ہوں رسید بھائی!......بس اُسے معاف کردو۔ اُس بے چاری چھوکری کو آپ نے پہلے ہی بہت پریسان کیا ہے۔ اب اُسے اپنے طریقے سے جینے دو۔ آپ اس سچائی کو تسلیم کرلو کہ آپ نے اپنے ہاتھ سے اپنی جنت برباد کردی ہے۔ اب اس سے آپ کا کوئی رستہ نہیں ہے۔ آپ میرے ساتھ اسٹیٹ ایجنسی پہ بیٹھو۔ وہ اوپر والا، روزی روٹی کا بندوبست کرے گا۔ بس اب ساری برائیاں چھوڑ کر میری طرح سچائی کی طرف لوٹ آؤ۔''

''ایک بار لاکھانی!......ایک بار......میں اپنی ماں کی آخری خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں۔ اُسے ایک بار پھر سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ ضرور پروفیسر کے گھر میں ہے۔ میں خود اندر جا کر اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''رشید بھائی! یوں بار بار پروفیسر کے گھر میں گھسنا ایسا آسان نہیں ہے۔ اور ویسے بھی واجد ٹھگنا بتا رہا تھا کہ اس پروفیسر کے پاس پستول بھی ہے۔ اس نے گولی چلادی تو مفت میں مارے جاؤ گے۔''

''اس کے بغیر یہ زندگی رایگاں تو ہے۔'' رشید جذب کی سی کیفیت میں بولا۔ ''اس کی تلاش میں یہ جان چلی بھی جائے تو کیا ہے؟......مگر میں یہ طے کرچکا ہوں، ایک بار میں خود پروفیسر کے گھر میں گھس کر اسے تلاش کروں گا۔''

''اور اگر وہ اس گھر میں نہیں ہوئی تو؟'' لاکھانی نے پوچھا۔

''تو۔'' رشید نے پُرعزم انداز میں گہرا سانس لیا۔ ''تو میں اس شہر کا کوچہ کوچہ، قریہ قریہ چھان ماروں گا۔ کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں وہ ضرور مل جائے گی۔''

''چلو مان لیتے ہیں وہ پروفیسر کے گھر میں ہی ہوئی......تو......؟'' لاکھانی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ''تو کیا تم اُسے اس گھر سے نکال کر اپنے ساتھ لے جانے کو بچوں کا کھیل سمجھ رہے ہو؟......اس بارے میں بھی کچھ سوچا ہے تم

نے؟......وہ خود پڑھی لکھی، باشعور لڑکی ہے۔ اوپر سے پروفیسر جیسا پڑھا لکھا، کابل آدمی اُس کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ پروفیسر سے تم کس طرح مقابلہ کر سکتے ہو؟''

''اس کی تُو فکر مت کر لاکھانی!'' رشید شیطانی انداز میں مسکرایا۔ ''میں نے سب سوچ لیا ہے......اس پروفیسر کی ایسی کی تیسی۔ اس کا وہ حشر کروں گا کہ وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ اس سے یہ پروفیسر نہ چھنوا دوں تو کہنا۔ تُو جانتا ہے نا.....آج کل میڈیا کا دور ہے۔ ایک پتا بھی کھڑکتا ہے تو دس چینلز کے نمائندے کیمرے کے ساتھ آموجود ہوتے ہیں۔ میں میڈیا میں دوں گا کہ پروفیسر اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی کو بنا نکاح کے گھر میں رکھے ہوئے ہے......وہ لڑکی میری بیوی ہے۔ مگر پروفیسر اپنی غرض کی خاطر اسے میرے حوالے نہیں کر رہا۔ اور تم یہ جانتے ہی ہو لاکھانی! کہ پروفیسر ایک عزت دار انسان ہے۔ ایک دنیا میں اس کا احترام ہے۔ بڑے بڑے لوگوں میں اُٹھنا بیٹھنا ہے۔ میڈیا کو تو ایک ٹاپک ہاتھ آ جائے گا۔ وہ تو ہر وقت ایسے ہی کسی چٹ پٹے موضوع کے انتظار میں رہتے ہیں۔ بس تُو دیکھتا جا۔''

رشید کا دھماکہ دار منصوبہ سن کر لاکھانی بالکل بھی خوش نہیں ہوا تھا۔

''رسید بھائی! اب یہ سب رہنے ہی دو تو اچھا ہے۔ آپ جانتے ہو، نہ صرف پروفیسر بلکہ نمرہ بھی ایک نیک اور باکردار چھوکری ہے.....شریفوں پہ بلاوجہ کیچڑ اُچھالنا کہاں کی شرافت ہے۔''

''یہ سب باتیں چھوڑ۔ یہ بتا، تُو آج رات میرے ساتھ چل رہا ہے کہ نہیں؟'' رشید نے ہاتھ ہلا کر فیصلہ کُن انداز میں لاکھانی سے سوال کیا تو اُس نے بھی دوٹوک انداز میں نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں رسید بھائی! میرے کو اس سلسلے میں معاف ہی رکھو۔ میرا مسورہ تو یہ ہے کہ آپ بھی اس کھیل کو رہنے ہی دو تو اچھا ہے۔ نمرہ اب آپ کی جندگی سے نکل چکی ہے......اس سچائی کو مان لینے میں ہی آپ کی بھلائی ہے۔ باقی آپ کی مرجی۔''

لاکھانی الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر اپنے گھر کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔

رشید اسی طرح بیٹھا کافی دیر تک اپنے منصوبے کی جزئیات پر غور کرتا رہا تھا۔ اسے کہیں کوئی کمی یا خامی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ البتہ وہ وہاں اکیلے جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اگر لاکھانی ساتھ چلتا تو اچھا ہوتا۔ خیر.....میں واجد ٹھگنے سے بات کروں گا.....کچھ لے دے کر وہ ساتھ چلنے پر آمادہ ہو جائے گا۔

رشید نے دل ہی دل میں سوچا اور ٹھگنے سے ملنے کے لئے اس کے گھر کی طرف چل دیا۔ اب وہ جلد از جلد یہ کام نمٹا دینا چاہتا تھا۔ اس نے پروفیسر کو صرف ایک ہفتے کا ٹائم دیا تھا۔ مگر سلطانہ کی بیماری اور اس کی موت کی وجہ سے پہلے ہی بہت زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ وہ یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ پروفیسر صاحب اس کی بات کو گیدڑ بھبکی سمجھ کر نظرانداز کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس کا اصل مقصد پروفیسر کے دل میں اپنی دھاک بٹھانا نہیں بلکہ اس کے گھر سے اپنی نمرہ کو نکال لانا تھا۔ سلطانہ کی موت کے بعد اسے اب نمرہ کی کمی اور شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ اب وہ اس کی انا کا ہی نہیں، بلکہ اس کی زندگی اور موت کا مسئلہ بن گئی تھی۔

❀===❀===❀
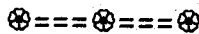
نئے کمرے میں آ کر وجاہت مرزا کی حالت میں اور سدھار آیا تھا۔ ڈاکٹر رحمان بھی بہت پُرامید ہو گئے تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر ان کی دوائیں تبدیل کر دی تھیں۔ فزیوتھراپسٹ صبح شام ہاتھوں اور پیروں کی تھراپی کر رہا تھا۔ نمرہ پوری چاہت اور توجہ سے ان کی غذا اور دوا کا خیال رکھ رہی تھی۔ ان کے ہاتھوں اور پیروں کی مالش کرتی اور دھیرے دھیرے ہاتھوں اور پیروں کو ہلانے کی مشق کرواتی اور گھنٹوں ان کے پاس بیٹھی ان سے باتیں کئے جاتی۔ اب وہ بھی بولنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے الفاظ اب بامعنی جملوں میں تبدیل ہونے لگے تھے۔ اور جب پہلی بار

انہوں نے نمرہ کے سہارے چلنے کی کوشش کی تھی تو بے اختیار ڈاکٹر رحمان تحسین بھرے لہجے میں نمرہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہہ اُٹھے تھے۔

''بیٹی! تم نے وہ کام کر دکھایا ہے جو امریکہ اور لندن کے ڈاکٹرز بھی نہیں کر سکے تھے۔ آفرین ہے تم پر۔''

''میری بچی...... میری جان.....'' عاتکہ بیگم نے بے ساختہ اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے گھر کی حالت بدل گئی تھی۔ نمرہ کے شوق اور ہمت کو دیکھتے ہوئے عاتکہ بیگم نے بھی حوصلہ پکڑا تھا اور اب وہ بھی کوٹھی کی از سرنو تزئین و آرائین میں دلچسپی لینے لگی تھیں۔ کوٹھی کے اطراف پھیلی خشک گرد آلود زمین پر گھاس لگانے کا کام شروع ہو چکا تھا۔ سرو کے پیڑوں کی کتر بیونت ہو رہی تھی۔ جگہ جگہ کیاریاں بن رہی تھیں۔ گملوں کو رنگ کیا جا رہا تھا۔ نئے پھولدار پودے لگائے جا رہے تھے۔ ''وجاہت منزل'' کے ویرانوں میں چپکے چپکے بہار اپنے قدم جما رہی تھی۔

عاتکہ بیگم نے پوری کوٹھی کے رنگ و روغن کا حکم دے دیا تھا۔ تمام کمرے جھاڑے پونچھے جا رہے تھے۔ فرنیچر پہ پالش کی جا رہی تھی۔ نئے پردے لگوائے جا رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا، برسوں سے بے دم پڑی ''وجاہت منزل'' پھر سے سانس لینے لگی ہے۔ اس کے ویران و سنسان ایوانوں، دالانوں میں پھر سے زندگی جھومنے لگی تھی۔

سرمد ہفتے کے بجائے دس دن بعد اسلام آباد سے واپس لوٹے تو یہاں کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ نئے نکور آراستہ و پیراستہ کمرے میں نئے لباس میں ملبوس، صحت مند مسکراتے چہرے کے ساتھ وجاہت مرزا نے بیٹے کا استقبال کیا تھا۔

''سرمد...... بیٹا...... کیسے ہو؟''

ایک مدت بعد ان کی سماعت سے باپ کی آواز ٹکرائی تھی۔ وہ حیرت زدہ سے آگے بڑھے تھے اور بے ساختہ وجاہت مرزا سے لپٹ گئے تھے۔

''ابا جان! آپ ٹھیک ہو گئے...... میرے خدا! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ میرے ابا جان، ہاتھوں کو حرکت دے سکتے ہیں..... بول سکتے ہیں۔''

''اور یہ سب کچھ ہماری بیٹی کی وجہ سے ہوا۔'' عاتکہ بیگم ابھی ابھی نمرہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ نکیتا بھی تھی...... نمرہ کے ہاتھوں میں وجاہت مرزا کے لئے تازہ پھلوں کے جوس کا گلاس تھا۔ وہ جونہی کچن سے نکلی تھی، راہداری میں اسے عاتکہ بیگم اور نگو مل گئی تھیں۔ وہ تینوں باتیں کرتی، ہنستی مسکراتی، وجاہت مرزا کے کمرے کی طرف چل دی تھیں۔ ان میں سے کسی کو بھی پتہ نہیں تھا کہ سرمد واپس لوٹ آئے ہیں۔ اور واپس آنے کے بعد حسبِ عادت وہ سب سے پہلے باپ سے ملنے ان کے کمرے میں آئے تھے۔ مگر یہاں ہر چیز بدلی ہوئی دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

''اللہ کے بعد ہم اپنی بیٹی کے شکرگزار ہیں کہ اس کی خدمت اور محبت کی وجہ سے آج وجاہت میاں پھر سے اپنے پیروں پہ چلنے کے قابل ہو گئے ہیں۔''

''جی اماں بی!'' سرمد پلٹے تھے۔ ''ہم بھی عظمت بی کا شکریہ ادا کرنا چاہیں گے۔''

''عظمت بی؟'' نگو حیرت بھرے انداز میں جلدی سے بولی۔ ''ان کا نام تو نمرہ ہے۔'' نکیتا نے خود کو ایک طرف کرتے ہوئے نمرہ کو آگے کیا تھا۔

''نمرہ؟'' سرمد نے حیران نظروں سے نمرہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ حیران اور متوحش نظروں سے انہی کی جانب تک رہی تھی۔ اتنے دنوں میں آج پہلی بار اس کا سرمد سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ وہ آج بھی ہمیشہ کی طرح وجیہہ و شکیل، شاندار و پُروقار لگ رہے تھے۔

اس رات نرس ریٹا نے وجاہت مرزا کی حالت میں ہلکی سی تبدیلی کی وجہ آفاق صاحب کے ساتھ آئی ''لیڈی'' کو

قرار دیا تھا۔ اور پھر اماں بی کے کمرے میں عظمت بی کو دیکھ کر انہوں نے آپ سے آپ ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ ہو نہ ہو، یہ وہی خاتون ہیں، جن کے آنے سے وجاہت مرزا کے لبوں پر برسوں بعد مسکراہٹ کی کرن چمکی تھی۔ وہ اس وقت بھی عظمت بی کے بے حد ممنون ہوئے تھے۔ اور اس وقت بھی وہ عظمت بی کا شکریہ ادا کرنا چاہ رہے تھے۔ تب انہیں یہ پتہ چلا تھا کہ اس سارے کرشمے کے پیچھے عظمت بی نہیں، نمرہ کی کرشمہ ساز شخصیت ہے۔

''نمرہ......'' یہ نام کچھ مانوس سا تھا۔ پہلے بھی یہ نام انہوں نے سنا تھا۔ یہ چاند سا چہرہ، یہ ستارہ سی روشن آنکھیں پہلے بھی ان کی نظروں سے گزری تھیں۔ یہ دلکش چہرہ، یہ نازک سراپا کتنے ہی عرصے تک ان کی سوچوں کے آکاش پہ چاند بن کر چمکتا رہا تھا۔ بار بار جھٹکنے کے باوجود یہ حسین خیال اُن کے ذہن کو جھنجوڑتا رہا تھا۔ وقت کی گرد نے شاید اس چاند چہرے کی یاد کو گہنا دیا تھا۔ مگر اس پل اسے سامنے دیکھ کر انہیں پھر سے وہ پل یاد آ گیا تھا، جب انہوں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا اور اپنے احساسات کو وہ کوئی نام نہ دے سکے تھے۔

''آپ کا شکریہ۔'' وہ خجل سے نمرہ کے سامنے جھکے۔ ہاتھ میں جوس کا گلاس تھامے وہ اپنی جگہ ساکت سی کھڑی تھی۔

''صرف شکریہ سے کام نہیں بنے گا۔'' نگو مسرور اور شوخ لہجے میں بولی۔ ''ہم دونوں اور اماں بی کو آپ کو کہیں گھمانے کے لئے لے جانا ہوگا۔''

''بھئی گھومنے تو ہم بھی چلیں گے۔'' داخلی دروازے سے آفاق صاحب کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ ابھی ابھی غفور کے ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔ غفور کی بے تاب نگاہوں نے نکیتا کے ہنستے چہرے کا احاطہ کیا تھا۔ پھر اُداسی سے جھک گئی تھیں۔

''بھئی ایسا ہے......تو......پھر ہم بھی ساتھ......چلیں گے۔'' رُک رُک کر ادا کئے گئے وجاہت مرزا کے جملے نے تو گویا پوری فضا میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی۔

اور اسی وقت پکنک کا پروگرام طے پا گیا تھا۔

''اماں بی! کیا ایسا ممکن ہے کہ اس پکنک پہ ہم اسد بھائی اور ثروت بھابی کو بھی مدعو کر سکیں؟'' عاتکہ بیگم کے گھٹنوں پہ زیتون کے تیل سے مالش کرتے ہوئے نمرہ نے جب سرسری سے انداز میں کہا تھا تو وہ بے ساختہ چونک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھیں۔ گزرے وقت کی ایک ایک بات خود انہوں نے ہی نمرہ سے کی تھی۔ اور اپنے دکھوں میں اسے شریک کر کے انہیں کتنا سکون اور سکھ ملا تھا۔ اور اسی پل نمرہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کوشش کر کے اسد اور ثروت کو بھی اس گھر کا حصہ بنائے گی۔ کیونکہ اماں بی کی آنکھوں میں اسد کے لئے موجود تڑپ اس کی آنکھوں سے چھپی نہیں رہی تھی۔

''اماں بی! اپنی پسند سے شادی کرنا کوئی ایسا گناہ تو نہیں ہے کہ معاف نہ کیا جا سکے۔'' عاتکہ بیگم کو گم صم خاموش دیکھ کر اس نے دھیمے اور نرم لہجے میں اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''انہیں اپنی خطا کی پاداش میں اس گھر سے دُور ہوئے کتنے ہی برس بیت گئے ہیں......اب اگر وہ اس گھر میں آ جائیں تو یقیناً ابا جان انہیں دیکھ کر خوش ہوں گے۔''

''کیا کہہ سکتے ہیں بٹیا!'' اُس کی آس بھری آواز پہ عاتکہ بیگم نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔ ''اسد کی خودسری کی وجہ سے بھی وجاہت میاں بیمار ہو کر پلنگ سے جا لگے تھے اور اس حال کو پہنچے تھے......اب اگر وہ دوبارہ......''

عاتکہ بیگم اپنا جملہ پورا نہ کر سکیں۔ وجاہت مرزا کے دوبارہ سے پہلی سی حالت پہ جا پہنچنے کے تصور سے ہی وہ کانپ اُٹھی تھیں۔

''نہیں اماں بی! اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' نمرہ نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ''آپ دیکھئے گا دن بہ دن ابا جان بہتر سے بہتر ہوتے جائیں گے۔ اور جلد ہی اپنا کاروبار سنبھالنے کے قابل ہو جائیں گے۔''

''آمین۔'' عاتکہ بیگم نے دل کی گہرائیوں سے کہا اور ہاتھوں کے پیالے میں نمرہ کا چہرہ لے کر اس کی دمکتی پیشانی پہ

مہر محبت ثبت کر دی۔ ''یہ سب کچھ تمہارے مبارک قدموں اور بے لوث محبت کی وجہ سے ہوا ہے۔ تمہارا یہ احسان میں مرتے دم تک نہیں بھولوں گی۔''

''اوّل تو ایسا ہے نہیں۔'' نمرہ دھیمی آواز میں بولی۔ ''لیکن اگر آپ ایسا سمجھتی ہیں......تو......میری خاطر......اسد بھائی کو معاف کر دیجئے......میں چاہتی ہوں......یہ گھر مکمل ہو جائے۔ اسد بھائی کے بغیر......یہ گھر ادھورا ہے۔ آپ کی اور ابا جان کی خوشیاں ادھوری ہیں۔''

''چندا! اسد تو میری دو آنکھوں میں سے ایک ہے۔'' عاتکہ بیگم تڑپتے لہجے میں بولیں۔ ''مگر وجاہت مرزا شاید انہیں معاف نہ کر سکیں۔ میں تو اس لئے خاموش ہوں۔''

''ابا جان کی آپ فکر مت کریں۔'' نمرہ پُرعزم لہجے میں بولی۔ ''میں کسی طرح انہیں رضامند کر لوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' عاتکہ بیگم نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ''مگر دیکھو بٹیا! زیادہ جلدی نہ کرنا۔ میں نہیں چاہتی وجاہت میاں کی طبیعت پہ کوئی منفی اثر پڑے۔''

''جی بہتر۔'' نمرہ نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا اور دروازے پہ کھڑے سرمد حیرت سے اس دلکش و رعنا لڑکی کے بارے میں سوچتے ہی رہ گئے تھے۔ وہ خود ہی حسین نہیں تھی، اس کا دل بھی حسین تھا......وہ کتنی حساس اور محبت سے لبریز تھی......وہ لوگوں کے دلوں میں چھپے دُکھ نہ صرف سمجھ لیتی تھی بلکہ انہیں دور کرنے کا حوصلہ بھی رکھتی تھی۔

یہ نازک اندام، پھولوں کی سی نرم و دلکش لڑکی کتنی مضبوط اور باحوصلہ تھی۔ اماں بی سے اس کے ماضی کے بارے میں سن کر وہ حیران بھی ہوئے تھے اور دُکھی بھی......اتنی سی عمر میں اس نے کتنے بڑے بڑے دکھ جھیل لئے تھے اور کسی بھی ماں کا سب سے بڑا دکھ اس کی تقدیر میں لکھ دیا گیا تھا۔ وہ اپنے ننھے سے شیر خوار بچے سے جدا ہونے پر مجبور ہو گئی تھی۔ شاید وہ اپنے اندر کے دکھوں سے نجات پانے کے لئے باہر کے ہزاروں کاموں میں مصروف رہتی تھی۔ اس نے پورے گھر کا نقشہ ہی بدل دیا تھا۔ سرو کے پیڑ پھر سے سرسبز و شاداب ہو گئے تھے۔ کوٹھی کے چاروں طرف گھاس کا سبز مخملیں فرش اُگ آیا تھا......پودے لہلہانے لگے تھے......پھول کھلنے اور کلیاں چٹخنے لگی تھیں۔ وجاہت مرزا کے کمرے کے دریچوں تلے کیاریوں میں رات کی رانی رات کو مہکتی تو ان کا کمرہ ہی نہیں، پورا گھر مشکبار ہو جاتا تھا۔

وجاہت مرزا کا ہی نہیں، اماں بی کا بھی وہ بے حد خیال رکھتی تھی۔ اس کی توجہ اور محبت کا ہی نتیجہ تھا کہ وجاہت مرزا پھر سے جی اُٹھے تھے اور اماں بی دوبارہ سے زندگی کی طرف لوٹ آئی تھیں۔ اب وہ خود کھڑی ہو کر کیاریوں میں پانی لگواتی تھیں اور کمروں کی ڈیکوریشن اور صفائی پہ توجہ دیتی تھی۔

دانیال نے ساری باتیں سنیں تو لحظہ بھر کو وہ بھی حیرت زدہ رہ گئے تھے۔

آج کتنے ہی دنوں بعد سرمد، دانیال سے نیٹ پر ہم کلام ہوئے تھے۔

''کیا کہہ رہے ہو سرمد؟'' دانیال بے یقین لہجے میں پوچھ رہے تھے۔ ''ابا جان نہ صرف چلنے پھرنے لگے بلکہ بات بھی کرنے لگے......یہ معجزہ اتنی جلدی بھلا کیسے ہو گیا؟''

''یہ سب اوپر والے کا کرم ہے۔'' وہ مشکور لہجے میں بولے۔ ''اور اس ہستی کی محنت و محبت کا صلہ......سچ یہ سب نمرہ کی وجہ سے ہوا ہے۔''

''نمرہ؟'' دانیال حیران ہوئے۔ ''کون نمرہ؟''

اور سرمد مختصر لفظوں میں اس کے بارے میں دانیال کو بتانے لگے تھے۔

''مجھے حیرت اور افسوس ہے کہ اتنی اچھی لڑکی کے ساتھ اتنا برا کیونکر ہوا۔'' دانیال کی بات پہ سرمد نے بھی افسوس

سے سر ہلایا تھا۔

''ہوں، یہ تو ہے...... مگر بے حد صبر کرنے والی، متحمل مزاج لڑکی ہے۔ کبھی گلہ شکوہ کرتے یا آنسو بہاتے نہیں دیکھا۔ واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔''

''ہوں....ہوں....'' دانیال کے لہجے میں ایک دم سے شرارت گھل گئی۔ ''خیر تو ہے؟..... بہت تعریف ہو رہی ہے۔''

''وہ ہے ہی قابلِ تعریف۔'' سرمد اپنی ہی رو میں کہے گئے۔ ''جس قدر وہ خود خوبصورت ہے، اسی قدر اس کا دل بھی خوبصورت ہے۔''

''اب تو بھئی نمرہ بیگم کو دیکھنے کی خواہش جاگنے لگی ہے۔'' دانیال مسکراتے لہجے میں بولے۔ ''ہم بھی تو دیکھیں اُس خوب صورت، دل والی خاتون کو کہ جس نے ہمارے دوست کا دل چرا لیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' سرمد نے ایک دم سے سٹ پٹا کر پوچھا۔

''یہی کہ اب ہمیں فروا بیگم کا مستقبل مخدوش دکھائی دے رہا ہے۔'' دانیال کے شوخ لہجے میں کہنے پر سرمد منہ بنا کر بولے۔

''دانیال! تم بھی نا، کبھی کبھی بہت فضول باتیں کرنے لگتے ہو...... ہاں یہ سچ ہے کہ میں نے کبھی فروا کے بارے میں سوچا تھا..... مگر یہ جان لینے کے بعد کہ اماں بی اور ابا جان، فروا کو کبھی قبول نہیں کریں گے......اس لئے اب میں نے اس کا نام تک اپنی سوچوں کی تختی سے مٹا دیا ہے۔''

''چلو یہ ٹھیک ہے۔'' دانیال مسکرائے۔ ''مان لیا، فروا کو ابا جان اور اماں بی قبول نہیں کریں گے۔ مگر نمرہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''اُسے تو وہ دونوں بہت پسند کرتے ہیں۔ اور وہ بھی ان دونوں سے بے حد محبت کرتی ہے۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ پر اس کا مجھ سے کیا تعلق؟'' سرمد حیران لہجے میں گویا ہوئے۔

''تعلق ہے نہیں تو کیا ہوا......بن تو سکتا ہے۔'' دانیال مضبوط لہجے میں بولے۔ ''اس گھر کو، ابا جان کو اور اماں بی کو جیسی بہو کی ضرورت تھی، نمرہ ہو بہو ویسی ہی ہے۔ تو پھر تم اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

''کیا......؟'' سرمد کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ ''اوّل تو مجھے شادی کرنی ہی نہیں ہے۔ اور دوئم نمرہ سے ہرگز بھی نہیں۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

''اس لئے کہ وہ مطلقہ اور ایک بچے کی ماں ہے؟'' دانیال نے سوال کیا۔

''یہ بات نہیں ہے دانیال!......تم جانتے تو ہو......''

''میں جانتا ہوں، تب ہی تو کہہ رہا ہوں، تمہیں ایسی لڑکی چاہئے تھی جو تمہارے ابا جان، تمہاری دادی جان اور تمہارے گھر سے محبت کر سکے۔ نیک، خدمت گزار اور محبت کرنے والی اور کچھ بھی طلب کرنے والی نہ ہو۔ اب ایک ایسی ہی لڑکی قدرت نے تمہارے گھر بھیج دی ہے تو کفرانِ نعمت کیوں کر رہے ہو؟''

''آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے ہمارے گھر نہیں آئی ہے۔'' سرمد چیخ کر بولے۔ ''آفاق انکل نے اس کے ویزے کے لئے اپلائی کر دیا ہے۔ کچھ ہی دنوں میں وہ وہاں، لندن چلی جائے گی.....اپنے بچے کے پاس۔''

''اس کا بچہ یہاں ہے؟'' دانیال نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں، ظفریاب بھائی نے ہی تو اُسے اڈوپٹ کیا ہے۔'' سرمد کی بات پہ دانیال بے ساختہ بولے تھے۔ ''اوہ.....تو وہ بے حد پیارا سا تابی، تمہاری نمرہ کا بیٹا ہے؟''

''شٹ اپ۔'' سرمد سٹپٹا کر بولے۔ ''وہ نمرہ میری کس طرح ہو سکتی ہے؟''

''چلو بابا! تم نہیں مانتے، نہ سہی۔'' دانیال نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ویسے ایک بات بتا دوں.....اب مجھے اس بے حد اچھی خاتون کا شدت سے انتظار رہے گا۔ اور اگر جلد ہی وہ یہاں نہیں آئی تو میں خود وہاں آ جاؤں گا۔''

''چلو کسی بہانے.....تم یہاں تو آؤ'' سرمد مسکرائے۔ ''کتنے عرصے سے کہہ رہا ہوں، کچھ دنوں کے لئے آ جاؤ۔ ندرت خالہ بھی تمہیں دیکھ کر خوش ہوں گی۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ کل ہی فروا اور ندرت ممانی سے بات ہوئی تھی۔ وہ بھی بہت کہہ رہی تھیں......چلو دیکھتے ہیں، کوئی راہ نکلی تو نکالتے ہیں۔''

❀===❀===❀
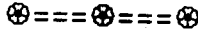
بالکونی میں جاڑوں کی گلابی دھوپ بھری ہوئی تھی۔ مگر اندر کمرے میں خاصی ٹھنڈک تھی۔ سردیاں شروع ہوتے ہی ندرت جہاں نزلہ زکام کا شکار ہو جایا کرتی تھیں۔ نوجوانی سے ہی وہ پورا موسم سر کا کھانستے تھوکتے گزارتی تھیں۔ اب تو بڑھاپے کا عالم تھا.....سو سردی کے آغاز سے ہی وہ کمبل لحاف لے کر بستر پر پڑ جاتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ سر پہ دوپٹہ باندھے، لحاف اوڑھے بستر پہ لیٹی تھیں۔ ثروت ان کے قریب بیٹھی ہاتھوں میں لوشن لگا رہی تھی۔ جبکہ فروا کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ اسد جس فرم میں کام کرتے تھے، اس کا ہیڈ آفس لاہور میں تھا۔ مہینے میں کم از کم ایک بار انہیں دو چار دن کے لئے ضرور لاہور جانا پڑتا تھا۔ ایسے میں ثروت کا اکیلا پن دور کرنے کے لئے ندرت اور فروا اسی کے اپارٹمنٹ میں چلی جاتی تھیں۔ مگر اس بار اسد لاہور گئے تو سردی کی وجہ سے ندرت نے اپنا گھر بار چھوڑ کر جانا منظور نہ کیا تھا۔ سو مجبوراً ثروت کو یہاں آ کے رہنا پڑا تھا۔

ثروت کا اس ڈھائی کمروں کے فلیٹ میں دم گھٹتا تھا۔ گو کہ اس کا فلیٹ بھی کوئی ایسا کھلا ڈلا نہ تھا مگر اس ڈربے سے تو پھر بھی بڑا تھا۔

''امی! بھئی اچھا بھلا اپنا کشادہ، کھلا گھر چھوڑ کر آپ اس کابک میں آ کر بیٹھ گئی ہیں۔'' وہ اکثر بیزاری سے کہتی تو ندرت جہاں ٹھنڈی سانس لے کر کہتیں۔

''کہتی تو تم ٹھیک ہی ہو۔ مگر اُس بڑے سے کمرے میں ہم دو ماں بیٹی کس طرح رہ سکتے تھے؟ تمہارے میاں سسرال میں رہنے کو تیار نہیں تھے۔ اب یہ فلیٹ چھوٹا ہی سہی، مگر حفاظت سے رہ تو رہے ہیں۔ اور گھر کا جو اچھا بھلا کرایہ آتا ہے، اس سے آسودگی سے گزارہ ہو رہا ہے۔''

اسلم احمد کے انتقال کے بعد ندرت جہاں نے چاہا تھا کہ اسد اپنا اپارٹمنٹ چھوڑ کر ان ماں بیٹی کے ساتھ ہی بیوی کے ساتھ رہیں۔ مگر اسد کی حمیت نے یہ گوارا نہیں کیا تھا۔ ندرت کے لاکھ سمجھانے اور ثروت کے بے حد اصرار کے باوجود وہ سسرال میں رہنے پر آمادہ نہ ہوئے تو مجبوراً ندرت جہاں کو وہ گھر کرائے پہ اُٹھا کر اس چھوٹے سے کرائے کے فلیٹ میں آنا پڑا تھا۔ یہ فلیٹ ثروت کے فلیٹ سے قریب تھا۔ مڈل کلاس شرفاء کی آبادی تھی۔ یہاں آ کر ندرت جہاں ناخوش نہیں تھیں۔ اسلم صاحب کی پنشن اور کچھ جمع پونجی کے ڈیپازٹ سے جو رقم آتی تھی، گھر کا کرایہ ان دونوں کے تقریباً برابر ہی تھا۔ اس اضافی رقم سے بے حد آسودگی اور خوشحالی سے گزر بسر کا سامان ہو گیا تھا۔

البتہ کبھی کبھی گھر کے چھوٹے ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ خاص طور پر جب بھی ثروت آتی تو ہر وقت برے برے منہ بنا کر یہی کہے جاتی۔ ''امی! بھئی اتنا چھوٹا گھر ہے.....دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔''

تب ندرت جہاں آہ بھر کر سوچتی تھیں، انہوں نے تو ہوش سنبھالتے ہی محل جیسے گھر میں شاہانہ زندگی گزارنے کے

خواب دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔ان کی دونوں بیٹیوں ثروت اور فروا کو یہ خواب ورثے میں ملے تھے۔
پہلے ندرت جہاں کی، پھر ثروت اور اب فروا کی خوابوں کی جو منزل تھی......شاید وہ منزل ان تینوں کے نصیب میں لکھی ہی نہیں تھی۔ ندرت جہاں نے کیسی کیسی کوششیں کر دیکھیں، اپنا سا پورا زور لگا لیا۔ مگر وہ وجاہت منزل کو اپنی منزل نہ بنا سکیں۔ ثروت تو اسد کی شریکِ زندگی بھی بن گئی۔ پھر بھی وجاہت منزل کے دروازے اُس پہ بند ہی رہے۔ اور اب فروا کی اُمیدیں بھی ٹھٹھرا دینے والی مایوسی کی ہواؤں سے سرد پڑتی جا رہی تھیں۔
اسد تک کسی ذریعے خبر پہنچی تھی کہ وجاہت مرزا روبہ صحت تھے۔ برسوں سے بند ان کی زبان چلنے لگی تھی۔ سہارا لے کر چلنے پھرنے بھی لگے تھے۔ قوی اُمید تھی کہ جلد ہی مکمل تندرست و توانا ہو جائیں گے......اس خبر نے ندرت جہاں کی رہی سہی اُمیدوں پر بھی اوس گرا دی تھی۔
عاتکہ بیگم کے جیتے جی اور وجاہت مرزا کے صحت مند ہونے کے بعد سرمد، فروا سے شادی کی ہمت کر سکتے، اب تو یہ بات ناممکنات میں سے لگنے لگی تھی۔
''امی! میں سوچ رہی تھی کہ آپ سے فروا کے سلسلے میں بات کروں گی۔'' ثروت نے لوشن کی شیشی سامنے دھری تپائی پر رکھتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا۔ ندرت جہاں نے پژمردگی سے آنکھیں کھول کر سوالیہ نظریں اس پر ڈالیں۔
''اس سرمد نے تو واقعی بہت ہی مایوس کیا۔'' اس نے ہاتھوں پہ آخری بار لوشن ملتے ہوئے قدرے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''میں تو کہتی ہوں، اب آپ کو فروا کے لئے کسی اور کے بارے میں سوچنا چاہیے۔''
''تم دونوں بہنوں کو ہی اس سے بہت اُمیدیں تھیں۔'' ندرت جہاں نے بیماری کے باوجود طنز کے نشتر چلانے سے گریز نہیں کیا۔
''اے اچھا ہی ہوا جو وہ ہماری اُمیدوں پہ پورا نہ اُترا۔'' ثروت خجالت مٹانے کو ہاتھ نچا کر ڈھٹائی سے بولی۔ ''اب اسد کو ہی لے لیجئے۔ ہم سب نے تو وجاہت منزل کے خواب دیکھے تھے۔ اگر چار کمروں کا کرائے کا اپارٹمنٹ اور سیکنڈ ہینڈ گاڑی ہی مقدر میں لکھی تھی تو کسی سے بھی شادی کی جا سکتی تھی۔ بلاوجہ اسد کو امتحان میں ڈالا۔ اور عاتکہ بیگم اور وجاہت خالو سے مفت کی دشمنی لی۔''
ندرت جہاں نے دل ہی دل میں ثروت کی بات سے اتفاق کیا تھا مگر منہ سے کچھ نہ بولی تھیں۔ سر پہ بندھے دوپٹے کو ہاتھ سے ٹٹول کر اس کی موجودگی کو محسوس کرنے میں مصروف ہو گئی تھیں۔
''اب سرمد بھی اسی طرح سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے، ہاتھ جھلاتے چلے آئیں تو بھئی......اُن کے آنے سے نہ آنا بھلا۔''
''ہاں، کہتی تو تم ٹھیک ہی ہو۔'' ندرت جہاں نے گہرا سانس لیا۔ اگلے ہی لمحے فروا ایک چھوٹی ٹرے میں چائے کے تین مگ دھرے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔
''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟'' چائے کی ٹرے تپائی پر رکھ کر وہ سامنے دھری پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے برسبیل تذکرہ بولی تھی۔
''تمہاری ہی بات ہو رہی تھی۔'' ثروت نے فروا کی طرف دیکھا۔ ''سرمد کی کوئی خبر ہے؟''
فروا نے اس غیر متوقع اور بے محل سوال پہ نچلا ہونٹ باہر کی طرف لٹکا کر اور کندھے اُچکا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔
''میں ابھی امی سے بھی یہی کہہ رہی تھی کہ اب تمہیں سرمد کے بجائے کسی اور کے بارے میں سوچنا چاہیے۔'' ثروت نے بھاپ اُڑاتی چائے کا مگ اُٹھاتے سرسری سے لہجے میں کہا۔
خود فروا بھی اب سرمد سے کسی حد تک مایوس ہو چکی تھی۔ کتنے ہی عرصے بعد اس روز مال میں ملے تو ان کا اجنبی سا

اندازاس کے دل میں غیر محسوس سا قلق بن کر ترازو ہو گیا تھا۔ پھر اس شام جب اس نے ان کے گھر فون کیا تھا تو فون غیر متوقع طور پر عاتکہ بیگم نے ریسیو کر لیا تھا۔ جب سرمد فون پر آئے تو ان کا لہجہ یکسر بدلا ہوا تھا۔

''فروا! تمہاری آواز سن کر اماں بی ڈسٹرب ہوئی ہیں۔ آئندہ کبھی گھر کے فون پر بات کرنے کی کوشش نہ کرنا....... سمجھیں تم؟''

کیسا سرد، کیسا انجانا اجنبی لہجہ تھا۔ اذیت کے ساتھ اُسے ہتک کا احساس بھی ہوا تھا۔ وہ تو سمجھی تھی، اُنہیں اپنی زلف کا اسیر کر لے گی...... اپنی اداؤں کے جال میں قید کر لے گی۔ شروع میں تو کچھ محسوس ہوا بھی تھا...... مگر وقت گزرنے کے ساتھ یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ اس کی زلفوں کے خم اور اداؤں کے تیر ونشتر اُس کی دادی اور والد کے خاموش احتجاج کے سامنے بے وقعت و بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ اُس کی دلکشی اور جوانی کے ناز و انداز، عاتکہ بیگم کے بڑھاپے کے داؤ پیچ کے سامنے بے بس و شکست خوردہ ہو گئے تھے۔

''چلو تمہارے مشورے پر عمل کرتے ہیں۔'' اس نے اپنی شکست خوردگی پہ شوخی کی چادر تانی۔ ''مگر یہ تو بتاؤ...... سوچیں تو کس کے بارے میں سوچیں؟''

''ارے ہاں امی!'' ثروت کو بالکل اچانک یاد آیا۔ ''دانیال کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''تمہارے گھر میں ہی تو کمپیوٹر پہ دیکھا تھا...... ماشاءاللہ اچھا خوبرو جوان ہے...... خیر سے ڈاکٹر ہے۔ روپے پیسے کی بھی کمی نہیں۔''

''وہی تو......'' اماں کی بات سن کر ثروت چہک کر بولی۔ ''خوبروئی اور وجاہت میں سرمد سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔ وجاہت خالو جتنی نہ سہی مگر اس کے پاس بھی دولت کی کمی نہیں ہے۔ اور سب سے بڑی بات، ہماری سگی پھوپھی کا بیٹا ہے۔''

''ہاں، سو تو ہے۔'' ندرت جہاں مسہری کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ چکی تھیں اور اب اطمینان سے چائے کی چسکیاں لے رہی تھیں۔

''سگی پھپھو۔'' فروا نے چائے کا مگ ٹرے میں پٹخا۔ ''زندگی بھر کبھی امی نے ان سے سیدھے منہ بات تک نہ کی۔ یاد نہیں وہ آتی تھیں تو امی چائے کو بھی نہیں پوچھتی تھیں۔''

''اے میں تو کہتی ہوں، مجھ سے نا سمجھی میں کچھ غلطیاں ہوئیں۔'' ندرت جہاں خفت مٹاتے ہوئے ہاتھ نچا کر بولیں۔ ''اب ان باتوں کو یاد کرنے سے کیا حاصل؟...... دانیال کو کچھ یاد تھوڑی ہو گا؟...... برسوں گزر گئے اس بات کو۔''

''جی۔'' فروا نے زور زور سے سر ہلاتے ہوئے ''جی'' کو خوب کھینچ کر ادا کیا۔ ''ہم ان دونوں بھائیوں سے چھوٹے تھے۔ ہمیں یاد ہے...... تو اُن لوگوں کو کیوں یاد نہیں ہو گا؟...... میں تو سوچتی ہوں کہ اگر کبھی اتفاق سے وہ کراچی آ گیا تو میں اس سے نظریں کس طرح ملا پاؤں گی؟''

''اے تم کب سے اتنی احساس کرنے والی ہو گئیں؟'' ندرت جہاں نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ''چھاج بولے تو بولے، چھلنی بھی بولی جس میں سو چھید...... اے وہ بچہ تو ایسا باظرف ہے، مجال ہے جو اُس نے بیتی باتوں کو کبھی بھولے سے بھی دہرایا ہو۔ کیسے ممانی جان، ممانی جان کہتے اس کا منہ نہیں سوکھتا...... خیریت معلوم کرنے کے لئے ہر دوسرے دن فون کرتا ہے۔ ابھی دو روز پہلے ہی تو کہہ رہا تھا، ممانی جان! آپ جب حکم کریں، میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا...... سچ کہتی ہوں، آج میں چھوٹے سے کہہ دوں تو کل وہ سچ میں دوڑا چلا آئے گا۔''

''تو امی! ایک بار اُسے آنے کا کہہ ہی دیں۔'' ثروت پُر جوش انداز میں بولی۔ ''دیکھیں شاید بات بن ہی جائے۔ کیوں فروا!...... کیا خیال ہے؟''

''خیال تو کچھ ایسا برا نہیں۔'' فروا مسکرائی۔ ''مگر سوال یہ ہے کہ کیا واقعی بقول امی کے وہ دوڑا دوڑا چلا آئے گا؟''

''لو، اُسے کس بات کی کمی ہے؟'' ثروت متاثر ہونے والے لہجے میں بولی۔ ''لاکھوں کروڑوں میں کھیلتا ہے۔ یہ بڑا ہسپتال ہے..... محل جیسا گھر..... یہ بڑی سی گاڑی۔ اور یہ سب کچھ اس کا اپنا ذاتی ہے..... باپ دادا کی دولت نہیں ہے جب چاہا کان پکڑ کے باہر کر دیا۔ کھڑے کھڑے ٹکٹ لے گا اور لو جی، چند گھنٹوں میں یہاں موجود......''

''اچھا چلو اب چائے ختم کرلو۔ ورنہ گرما گرم خیالی پلاؤ پکاتے پکاتے بے چاری چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔'' فروا اپنا مگ اُٹھا کر دوبارہ سے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے مسکرا کر بولی تو ثروت بھی اپنی چائے کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔

''اسد میاں کب آ رہے ہیں؟'' ندرت جہاں نے ثروت سے سوال کیا۔ ''آج کل تو وہاں لاہور میں بہت سردی پڑ رہی ہوگی۔''

''یہاں کون سی کم سردی پڑ رہی ہے۔'' ثروت نے اپنے گرد لپٹی اُونی شال کو دوبارہ سے لپیٹتے ہوئے کہا۔ ''اور جہاں تک ان کے آنے کا سوال ہے..... تو کل تو گئے ہیں۔ دو تین دن اور لگیں گے..... ہو سکتا ہے، جمعہ کی شام یا ہفتے کی صبح کو لوٹیں۔''

''کیا پکا رہی ہو؟'' ثروت نے فروا سے پوچھا۔

''مٹر چھیل دو تو مٹر پلاؤ بنا لوں گی۔'' فروا نے تینوں خالی مگ ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''دہی رکھا ہے۔ تم رائتہ بنا لینا۔''

''اتنی سردی میں مٹر پلاؤ..... اور وہ بھی دہی کے رائتے کے ساتھ؟'' ندرت جہاں نے حیرانی سے پوچھا۔

''امی! مٹر تو آتے ہی سردیوں میں ہیں۔'' ثروت مسکرائی۔ ''اب سردی میں ہی مٹر پلاؤ پکایا جا سکتا..... آپ رائتہ مت کھائیے گا۔''

حالانکہ اُنہیں ہلکا بخار بھی تھا..... اس کے باوجود انہوں نے خوب ڈٹ کے مٹر پلاؤ کھایا تھا۔ کھاتے وقت وہ یہ بھی بھول گئی تھیں کہ انہوں نے رائتہ کھانے سے اجتناب برتنے کا فیصلہ کیا تھا۔

کھانے کے بعد انہیں بھاری پن کا احساس ہوا تو انہوں نے فروا سے کہہ کر ہاضمے کا چورن کھا لیا تھا۔ پھر بھی بدہضمی کا سا احساس ہو رہا تھا۔

''امی! کچھ ٹہل لیجئے۔'' فروا نے مشورہ دیا۔ ''کسی مفکر کا قول ہے، رات کے کھانے کے بعد چلو۔ بے شک تمہیں کانٹوں پہ چلنا پڑے۔''

ندرت جہاں دو چار قدم چل کر دوبارہ سے بستر پر جا لیٹی تھیں۔ فروا کچن سمیٹنے چلی گئی تھی۔ جبکہ ثروت اپنے بستر پہ لیٹی اسد سے موبائل پہ حال چال معلوم کر رہی تھی۔ فروا کام نمٹا کر ماں کے برابر آ لیٹی تھی۔

جوں جوں رات گہری ہو رہی تھی، سردی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

''فروا!..... مجھے سردی لگ رہی ہے۔ ایک کمبل اور اوڑھا دو۔'' کچھ دیر بعد ندرت جہاں کی کپکپاتی ہوئی سی آواز اُبھری تھی۔

''امی! آپ ٹھیک تو ہیں؟'' فروا ایک دم سے اُٹھ بیٹھی تھی۔

''سینے پہ بوجھ سا ہے۔'' ندرت جہاں بستر سے نیچے اُتریں۔ ''ذرا واش روم جاؤں گی۔''

''چلئے، میں چلتی ہوں۔'' فروا بھی ساتھ ہی کھڑی ہوگئی تھی۔

واش روم میں داخل ہوتے ہی ندرت جہاں نے ایک بڑی سی اُلٹی کی تھی۔ ثروت بستر سے اُٹھ کر پانی لینے کو بھاگی۔

ابھی انہوں نے کُلی بھی نہیں کی تھی کہ دوسری بار اُبکائی آئی اور اس بار بھی خوب بڑی سی اُلٹی ہوئی۔ ندرت جہاں کی آنکھوں سے پانی جاری ہو گیا تھا اور زور زور سے ابکائیاں لیتے سینہ درد کر رہا تھا۔ منہ دُھلا کر اور تولیے سے پونچھ کر فروا اور ثروت انہیں بستر پہ لے آئی تھیں۔ ان کی آنکھیں جل رہی تھیں اور خوب تیز بخار ہو گیا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ندت جہاں کی طبیعت بھی خراب ہوتی جا رہی تھی۔ ثروت اور فروا پریشان ہونے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کر پا رہی تھیں۔

''آپی! ساتھ والے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹا کر ان سے مدد کے لئے کہیں کیا؟'' فروا نے ثروت سے پوچھا تھا۔

''کیسی مدد؟'' ثروت نے چونک کر سوال کیا۔

''ان سے کہتے ہیں کہ ہمیں ٹیکسی لا دیں...... امی کو ہسپتال لے چلتے ہیں۔'' فروا نے ماں کا سفید پڑتا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس وقت کوئی ٹیکسی بھی کہاں ملے گی؟'' ثروت نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے مایوسی سے کہا۔ ''اور ویسے بھی رات کے اس پہر پڑوسیوں کو بے آرام کرنے کی ضرورت نہیں۔ رات جیسے تیسے گزار کر صبح ہوتے ہی امی کو ہسپتال لے چلیں گے۔ اور ٹیکسی کے بجائے ایمبولینس منگوالیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' فروا نے متفق ہوتے ہوئے کہا اور ماں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ندرت جہاں کی بے چینی اور بخار کی کیفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ اب وہ کراہنے بھی لگی تھیں۔ فروا نے بے بس نظروں سے کھڑکی کے اس پار پھیلے گھور اندھیرے کی طرف دیکھ کر سوچا۔

'یہ رات آخر کب گزرے گی.....؟'

❀===❀===❀
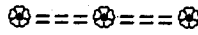
رات دبے پاؤں آگے بڑھ رہی تھی۔ متوسط طبقے کے اس صاف ستھرے علاقے میں پختہ گلیوں میں لگے الیکٹرک پول پہ ٹمٹماتے بلب ہر سمت مدھم سا اُجالا بکھیرنے میں مصروف تھے۔ سردی عروج پر تھی۔ سرد ہوا جسم کو کاٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے میں دو سائے دبے پاؤں چلتے گلی کے آخری سرے پہ واقع مکان کی پچھلی جانب کی دیوار کے قریب آ رُکے تھے۔

''رسید بھائی! ایک بار پھر سوچ لو...... میں تو کہتا ہوں اب اس قصے کو فراموس ہی کر دو۔'' لاکھانی کی سرگوشی بھری گھبرائی ہوئی آواز رشید کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

''نہیں لاکھانی! ایک آخری کوشش میں ضرور کروں گا۔'' رشید ضدی لہجے میں بولا۔ ''تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو تم مجھے چھوڑ کر جا سکتے ہو..... جو ہو گا، میں نمٹ لوں گا۔''

''میرا وہ مطلب نہیں تھا۔'' لاکھانی دھیمی آواز میں بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ سمجھانا میرا فرج تھا...... ماننا نہ ماننا آپ کی مرجی...... میں اِدھر ہی کھڑا ہوں۔ آپ جاؤ...... مگر بہت ہی احتیاط کی جرورت ہے۔''

''کسی بھی مشکل صورتِ حال میں تم باہر کے باہر نکل جانا...... تمہیں کسی پھڈے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔''

رشید نے لاکھانی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھایا اور تاریکی میں باؤنڈری وال کے ساتھ رینگ گیا۔ لاکھانی ٹہلتا ہوا آگے نکل گیا تھا۔ گھر کی پچھلی دیوار کے ساتھ نیم کا ایک تناور پیڑ کھڑا تھا۔ رشید اس کے تنے کا سہارا لیتا دیوار کے اوپر جا پہنچا تھا۔ کچھ دیر دیوار کے اوپر رک کر اس نے چوکنی نظروں سے اندر کا جائزہ لیا تھا۔ اندر نیم تاریک فضا میں خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ پھر وہ دیوار پر دونوں ہاتھ ٹکا کر اندر کی جانب لٹک گیا تھا۔ کود کے اندر جانے کے بجائے احتیاطاً اس نے لٹک

کر اندر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ آہستگی سے اس نے اپنے پاؤں زمین پر جمائے تھے۔ دیوار کے ساتھ بنی کیاری خاصی نم تھی۔ اسے اپنی چپلیں زمین میں دھنستی محسوس ہوئی تھیں۔ پھر وہ آہستگی سے پچھلی جانب بڑھا تھا۔ چھوٹے سے صحن کے اختتام پر دروازے کی گرل لگی تھی۔ اس نے ہاتھ اندر کر کے گرل کی کنڈی کھول لی تھی۔ یہ لانڈری ایریا تھا۔ کونے میں واشنگ مشین دھری تھی اور اوپر یکے بعد دیگرے کئی ڈوریاں بندھی تھیں۔

وہ دھیرے دھیرے قدم جما کر قدم رکھتا آگے بڑھا تھا۔ سامنے اندرونی ورانڈے میں چوکی پہ کوئی سویا ہوا تھا۔ ورانڈے میں دونوں جانب دو دو دروازے تھے۔ ایک دروازہ آفاق صاحب کی اسٹڈی کا اور دوسرا ٹی وی لاؤنج کا تھا۔ دائیں جانب دونوں بیڈروم کے دروازے تھے۔

رشید پہلا دروازہ بے آواز کھولتا اندر داخل ہوا۔ کمرہ خالی پڑا تھا۔ اس نے تاریک فضا میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ہر چیز کا جائزہ لیا تھا۔ ہر چیز اپنے ٹھکانے پر اَن چھوئی سی رکھی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کئی دنوں سے کوئی اس کمرے میں آیا ہی نہیں ہے۔

وہ آہستگی سے واپس پلٹا اور دوسرے دروازے کی طرف بڑھا۔ ذرا سا زور ڈالنے پر دروازہ کھل گیا تھا۔

''کون ہے؟'' اندر سے آفاق صاحب کی آواز سنائی دی تھی۔

رشید اضطراری طور پر واپسی کے لئے پلٹا تو ورانڈے میں بچھے تخت سے ٹکرا گیا تھا۔

''کون ہے؟......کون ہے؟'' تخت پہ سویا غفور ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا تھا۔ اس دوران آفاق صاحب ہاتھ میں پستول لئے تیزی سے کمرے سے باہر آئے تھے۔ رشید تیر کی سی تیزی سے صحن کی طرف لپکا۔ گرل عبور کر کے وہ بجلی کی سی سرعت سے باؤنڈری وال پر چڑھا۔ عام حالات میں وہ اتنی اونچی دیوار پہ اچک کر یوں چڑھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اس وقت کی صورتِ حال نے اس کے بدن میں بجلی بھر دی تھی۔ وہ اچھی طرح پورا کمرہ دیکھ چکا تھا۔ نمو بہرحال اس گھر میں موجود نہیں تھی۔ سو اب اس کا یہاں رکنا بے جواز تھا۔ اسی لئے وہ دیوار پہ چڑھا اور باہر کی جانب سڑک پر کود گیا۔ ایک لمحے کو تو اسے یوں لگا کہ پوری دنیا اندھیری ہو گئی ہے۔ اس کا دایاں گھٹنا پختہ سڑک پر کچھ اس طرح ٹکرایا تھا کہ اسے گھٹنا کرچی کرچی ہوتا محسوس ہوا تھا۔ اس کے حلق سے فلک شگاف چیخ نکلی تھی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا تھا۔ گلی کے آخری سرے پر کھڑے لاکھانی کو پہلے تو یہ خیال آیا کہ اسے رشید کی مدد کے لئے جانا چاہئے۔ مگر چوکیدار کو اس طرف دوڑتے اور آفاق صاحب کو گیٹ کھول کر باہر نکلتے دیکھ کر اس نے رشید کی مدد کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ وہ آہستگی سے سامنے کی جانب رینگ گیا تھا۔

آفاق صاحب اور غفور کے رشید تک پہنچنے سے پہلے چوکیدار وہاں پہنچ چکا تھا۔ آفاق صاحب نے ڈی آئی جی اکمل خان کو بھی فون کر دیا تھا۔ ذرا ہی دیر میں پولیس بھی پہنچ گئی تھی۔ گھٹنے کی چوٹ کی وجہ سے رشید بے ہوش ہو چکا تھا۔ اُسے اُٹھا کر پہلے ہسپتال لے جایا گیا تا کہ اُس کی چوٹ کا علاج ہو سکے۔

''پروفیسر! میرے یار! اب تم آرام سے سو جاؤ'' ڈی آئی جی اکمل خان فون پر آفاق صاحب سے مخاطب تھا۔ ''قدرت نے خود اسے سزا دے دی ہے۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ اس کا گھٹنا ناقابل علاج ہے۔ ہڈی ریزہ ریزہ ہو گئی ہے۔ عمر بھر اب ایک ہی ٹانگ پہ چلے گا۔ ہسپتال سے نکلے گا تو پھر میں اُسے سنبھال لوں گا۔ اب تمہیں یا نمرہ بیٹی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب آگے سب مجھ پہ چھوڑ دو۔ اس کے جرائم کی لمبی لسٹ ہے۔ دس سال سے پہلے جیل سے نہیں نکل سکتا۔''

''شکریہ خان!'' آفاق صاحب مطمئن آواز میں بولے۔ ''البتہ اس کے لنگڑے ہونے کا سن کر افسوس ہوا۔ بہرحال وہ جو اوپر والا ہے..... اس کا اپنا ایک نظام ہے..... وہ رسی ڈھیلی ضرور چھوڑتا ہے..... مگر رسی کو کھینچنا کبھی نہیں بھولتا۔''

فون رکھ کر آفاق صاحب نے اطمینان بھرا گہرا سانس لیا تھا۔ انہوں نے نمرہ کو اس ظالم اور سنگ دل انسان کے شر سے ہمیشہ کے لئے بچالیا تھا۔

❁===❁===❁
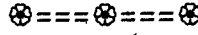
ثروت اور فروا کی شب بھر کی جاگی نیند سے محروم آنکھیں حیرت اور پریشانی سے ایک دوسرے کی جانب تک رہی تھیں۔ صبح کاذب کے ساتھ ہی ایمبولینس منگوا کر وہ دونوں ندرت جہاں کو ہسپتال لے آئی تھیں۔ تب سے اب تک ایمرجنسی میں ان کا ٹریٹ منٹ جاری تھا۔ بہتری کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ثروت کئی بار اسد کو فون کر چکی تھی۔ وہ میٹنگ میں مصروف تھے۔ ایک بار بھی بات نہیں ہو سکی تھی۔

''تم نے سرمد کو فون کیا؟'' ثروت نے فروا سے پوچھا۔

''کئی بار کر چکی ہوں۔ موبائل بند ہے اور گھر پہ بھی کوئی اٹھا نہیں رہا۔''

''سمجھ میں نہیں آرہا کیا کریں۔'' ثروت نے بے بسی سے موبائل کی طرف دیکھا۔ تب ہی موبائل کی ٹون بج اُٹھی تھی۔

''دانیال بھائی۔'' اس وقت خلاف توقع دانیال کی آواز سن کر بے ساختہ اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ ''اس وقت آپ کی آواز سن کر کتنی ڈھارس ہوئی ہے، آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''کیوں......کیا ہوا؟'' ثروت کی گلوگیر آواز انہیں ایک دم سے پریشان کر گئی تھی۔ ''سب ٹھیک تو ہے نا؟......ممانی جان کیسی ہیں؟''

''وہ ٹھیک نہیں ہیں۔'' ثروت ایک دم سے رو دی تھی۔ ''دانیال بھائی! وہ بہت بیمار ہیں۔ بے ہوش ہیں۔ ان کے ہاتھ پیر بالکل ٹھنڈے ہیں اور چہرہ سفید پڑ گیا ہے......اور ہم دونوں......میں اور فروا یہاں بالکل اکیلے ہیں۔''

''اسد کہاں ہیں؟'' دانیال نے جلدی سے پوچھا۔

''وہ اپنی کمپنی کی طرف سے لاہور گئے ہوئے ہیں۔ کوئی رابطہ بھی نہیں ہو رہا۔ فروا نے کئی بار سرمد کو بھی فون کیا۔ وہ بھی فون نہیں اٹھا رہے۔''

''ہاں۔ وہ سب لوگ فارم ہاؤس پر پکنک کے لئے گئے ہوئے ہیں۔'' دانیال نے وضاحت کی۔ ''کل رات ہی میری ان سے بات ہوئی تھی۔ بتا رہے تھے، اماں بی نے سختی سے تاکید کی ہے کہ پکنک والے دن ہر شخص اپنا فون بند رکھے گا۔''

''اوہ.....اچھا......''

''خیر تم فکر مت کرو۔ اسد سے رابطہ کرو۔ اِن شاء اللہ وہ پہنچ جائیں گے۔'' دانیال نے حوصلہ دیا۔ ''تم بالکل پریشان نہ ہو۔ اِن شاء اللہ ممانی جان بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''دانیال بھائی......!'' ثروت وحشت زدہ آواز میں بولی۔ ''اگر ایسا نہ ہوا تت.....تو......میں یوں اکیلے کیا کروں گی؟......فروا کو کیونکر سمجھاؤں گی؟''

''تم پریشان مت ہو۔'' دانیال چند لمحوں کی سوچ کے بعد سمجھانے والے انداز میں گویا ہوئے۔ ''دیکھو میں اپنے ٹریول ایجنٹ سے بات کرتا ہوں۔ پہلی اویل ایبل فلائٹ سے میں وہاں آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ خود کو ہرگز بھی اکیلا نہ سمجھنا۔ سب تمہارے ساتھ ہیں۔ میں، تمہارا بھائی تمہارے ساتھ ہوں۔''

ثروت کی آواز میں ضرور ایسی کوئی بات تھی جس نے دانیال کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی۔ وہ خود ایک قابل ڈاکٹر تھے۔ ندرت جہاں کی حالت کے بارے میں جان کر وہ خود بھی فکر مند ہو گئے تھے۔ وہ ندرت جہاں کی زندگی میں ہی ایک بار ان سے ملنے کے خواہش مند تھے۔ بچپن سے اب تک اُن کی یادوں کے پردے پہ اُن کا پھولا چہرہ اور

چڑھی تیوریاں اب تک محفوظ تھیں۔ ندرت جہاں کے برے روّیے کے باوجود ان کی والدہ ان سے محبت کرتی تھیں۔

"کچھ لوگ اپنی اوائل عمر میں ایسے ہی ہوتے ہیں۔" ممانی کے روّیے سے بد دل اور مغموم، بیٹوں کو ان کی ماں امید بھرے لہجے میں آس بندھاتے ہوئے کہتی تھیں۔ "مگر جب عمر بڑھ جاتی ہے، میچور ہو جاتے ہیں تو یہی لوگ بے حد محبت کرنے والے، با اخلاق ہو جاتے ہیں۔ ایک دن تم بھی دیکھنا، تمہاری ممانی جان تم لوگوں سے کتنی محبت کریں گی۔"

اور اب وہ دن آ گئے تھے۔ ندرت جہاں اب جب دانیال سے بات کرتی تھیں تو شہد ٹپکتا رہتا تھا۔ اُن کی امی کا کہا پورا ہو گیا تھا۔ اُن کی امی ایک بے حد اچھے دل کی خاتون تھیں۔ وہ اپنے بھائی اسلم احمد سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ ندرت جہاں کی لاکھ بے ہودگیوں کے باوجود ان سے بھی ہمدردی رکھتی تھیں۔ اور خاص طور پر اپنی دونوں بھتیجیوں ثروت اور فروا پر تو وہ جان چھڑکتی تھیں۔ اسی لئے دانیال بھی اپنے دل میں ان دونوں کے لئے بے حد نرم اور محبت بھرے گوشے رکھتے تھے۔

سرمد نے کتنی ہی بار اصرار کیا۔ خود انہوں نے کتنی ہی بار پاکستان جانے کا پروگرام بنایا۔ مگر انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ جب جانا ہو گا تو آناً فاناً ہی سب کچھ ہو جائے گا۔ اُنہیں محسوس ہوا تھا کہ اُن کی بہنوں کو اس وقت اُن کی ضرورت ہے۔ سو انہوں نے فوری طور پر کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

❀===❀===❀

نیلگوں آکاش پہ سرمئی اُودی بدلیاں اٹھکیلیاں کرتی پھر رہی تھیں۔ گرم ہواؤں کے مدھر جھونکوں میں نوخیز کلیوں کی جانفزا مہک رچی ہوئی تھی۔ حدِ نگاہ تک گھاس کا سبز مخملیں فرش بچھا تھا اور دائیں جانب واقع تالاب کا نیلگوں شفاف پانی ہلکورے لے رہا تھا۔ تالاب کی سطح پر کاسنی کنول کے پھول لہروں کے ساتھ ہچکولے لے رہے تھے۔ ہر سمت زندگی سے معمور منظر بکھرا ہوا تھا۔

آج کتنے ہی برس بعد وجاہت مرزا گھر اور ہسپتال کے علاوہ کسی اور جگہ آئے تھے۔ اُن کا یہ وسیع اور خوبصورت فارم ہاؤس بھی انہیں دیکھ کر ایک دم سے کِھل اُٹھا تھا۔ صحت مندی کی جانب تیز رفتاری سے بڑھتے وجاہت مرزا کو دیکھ کر اماں بی ہی نہیں، سرمد بھی بے حد خوش تھے۔ وہ دونوں ہی دل سے نمرہ کے ممنونِ احسان تھے۔ وجاہت مرزا ہی کی نہیں وجاہت منزل کی بھی بدلی ہوئی حالت کے پیچھے نمرہ کا سچا اور پُر خلوص جذبہ کارفرما تھا۔ اس کی شبانہ روز کوششوں سے ہی آج وہ اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے اور اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے قابل ہوئے تھے۔

آفاق صاحب اور غفور بھی اس پکنک میں شامل ہونے کے لئے خاص طور پر انوائٹ کئے گئے تھے۔ جب سے رشید کی تلوار سر سے دُور ہوئی تھی، وہ بے حد خوش اور مطمئن ہو گئے تھے۔ تمام احوال سن کر نمرہ بھی خوش ہوئی تھی۔ گو کہ اُس کی ٹانگ ٹوٹنے اور عمر بھر کے لئے لنگڑا ہو جانے کی خبر سن کر اُسے ملال ہوا تھا۔ مگر اُس کے شر سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جانے کا یقین، طمانیت کا ایک احساس بن کر اُس کے رگ و پے میں سرائیت کر گیا تھا۔

"بیٹی! اب تمہیں اپنے گھر واپس لوٹ چلنا چاہئے۔" تمام بات بتا کر آفاق صاحب نے تجویز پیش کی تھی۔ "جب تک تمہارا ویزہ نہیں لگ جاتا، اب تو آرام سے اور بے خوف ہو کر اپنے ہی گھر میں رہ سکتی ہو۔"

"آفاق میاں! یہ گھر بھی نمرہ کا اپنا ہی گھر ہے۔" رشید کے بارے میں تمام احوال جان کر عاتکہ بیگم بھی خوش ہوئی تھیں۔ نمرہ کو ساتھ لے جانے کے لئے آفاق صاحب کو پَر تولتے دیکھ کر وہ جلدی سے بولی تھیں۔ "تم تو جانتے ہو آفاق میاں! وجاہت میاں کی صحت یابی اور اس گھر کی ساری خوشیاں صرف اور صرف نمرہ کے دم قدم کی مرہونِ منت ہیں۔ اس لئے میری خواہش ہے کہ جب تک نمرہ کا باہر جانے کا انتظام نہیں ہو جاتا، اسے یہاں میرے پاس ہی رہنے دو۔ سچ اسے دیکھ کر، اسے پا کر بیٹی کی کمی دُور ہو گئی ہے۔"

آفاق صاحب خاموش ہو گئے تھے۔ یہ بات ان کے لئے باعثِ مسرت تھی کہ نمرہ کی وجہ سے وجاہت منزل میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ہر طرف خوشیاں بکھر گئی تھیں۔

''کیا نمرہ آپی واپس چلی جائیں گی؟'' نگو کے لئے یہ خبر افسوس ناک تھی۔ آفاق صاحب کے جانے کے بعد اس نے ہراساں لہجے میں عاتکہ بیگم سے پوچھا تھا۔ ''میں تو سمجھی تھی، نمرہ آپی اب ہمیشہ ہمارے ساتھ ہی رہیں گی۔''

''کاش ایسا ہوسکتا۔'' عاتکہ بیگم نے سرد آہ بھر کے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ یہ خیال کہ نمرہ کو آخر کار واپس جانا ہے، ان کے لئے بھی افسوس ناک اور تکلیف دہ تھا۔

''ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟'' نگو مُصر لہجے میں بولی۔ ''آپ پروفیسر انکل سے کہہ دیجئے، ہم انہیں یہاں سے کہیں نہیں جانے دیں گے...... ان کے آنے سے سب کچھ کتنا اچھا ہو گیا ہے...... ابا جان بھی رُو بہ صحت ہیں...... ہر طرف پھول کِھل گئے ہیں...... کوٹھی نئے سرے سے سج سنور گئی ہے...... وہ چلی جائیں گی تو...... کہیں سب کچھ پھر سے پہلے جیسا نہ ہو جائے۔''

نگو کے معصومانہ خدشات نے عاتکہ بیگم کا بھی دل دہلا دیا تھا۔ وہ جانتی تھیں اس اُجڑے دیار میں نمرہ کی وجہ سے ہی بہار آئی تھی۔ اسی لئے تو وہ اسے اب اپنے پاس سے کہیں اور جانے نہیں دینا چاہتی تھیں۔ مگر وہ اسے ہمیشہ کے لئے روک بھی کس طرح سکتی تھیں۔

''اماں بی! ایک راستہ ہے۔'' کافی دیر سوچوں میں گم رہنے کے بعد نگو نے ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ''اگر ایسا ہو جائے تو نمرہ آپی کبھی بھی اس گھر سے نہیں جاسکیں گی۔''

عاتکہ بیگم نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''اگر...... نمرہ آپی کا بیاہ...... اپنے سرمد بھیا سے کر دیا جائے تو؟''

''کاش یہ کرنا میرے اختیار میں ہوتا۔'' عاتکہ بیگم ایک بار پھر یاس بھرے لہجے میں گویا ہوئیں۔

''آپ ہی کے تو اختیار میں ہے۔'' نگو تیزی سے بولی۔ ''اگر آپ کہیں گی تو سرمد بھیا کبھی بھی انکار نہیں کر سکیں گے۔ وہ آپ کا کہنا ٹال ہی نہیں سکتے۔''

''نہیں نگو! میں نے اب کسی سے بھی کچھ نہ کہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہر ایک کی اپنی زندگی ہے۔ اور ہر ایک کو اپنی مرضی سے اپنی زندگی گزارنے کا حق ہے۔''

نگینا خاموش ہو گئی تھی۔ مگر اس نے اپنے طور پر سرمد سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور اتفاق سے اُسے اسی شام سرمد سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

سرمد، وجاہت مرزا کے بیڈ روم کے دریچوں تلے رات کی رانی کے پودوں کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے کہ نگو ان کے پاس چلی آئی تھی۔

''بھیا! آپ دیکھ رہے ہیں نا، ہر طرف کیسا گل و گلزار ہو گیا ہے۔''

''ہاں نگو!...... واقعی بہت اچھا ہو گیا ہے۔'' سرمد نے دور تک پھیلے گھاس کے فرش کو دیکھ کر تعریفی لہجے میں کہا۔

''ابھی پوری طرح گھاس اُگی نہیں ہے۔ اس کے باوجود سب کچھ بے حد اچھا لگ رہا ہے۔''

''آپ جانتے ہیں نا، یہ سب کچھ نمرہ آپی نے کیا ہے۔'' نگو نے سرمد کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اور نمرہ کا نام سنتے ہی سرمد کے چہرے پر ایک غیر محسوس سی بے کلی پھیل گئی تھی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ یہ اجنبی لڑکی ان کے دل و دماغ میں ایک عجیب سا احساس جگاتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ جب سامنے ہوتی تھی تو وہ ایک عجب سی بے چینی محسوس

کرتے تھے۔اور جب وہ سامنے نہیں ہوتی تی، تب بھی وہ بے کلی کا شکار رہتے تھے۔گو کہ وہ دل ہی دل میں اس کے بے حد شکرگزار تھے، اس کی وجہ سے وجاہت منزل کی گم گشتہ جنت ایک بار پھر حاصل ہوگئی تھی۔اماں بی بھی کیسی خوش اور شاداب رہنے لگی تھیں۔ان کی آنکھوں کی اُداسی اور وجود کی پژمردگی جانے کہاں غائب ہوگئی تھی۔اور وجاہت مرزا تو جانونئی زندگی پا گئے تھے۔رنگ و روغن اور آرائش وزیبائش کے بعد پوری کوٹھی دُلہن کی طرح سج گئی تھی۔خاک اُڑاتی خشک زمین سبزے اور پھولوں سے لالہ زار بن گئی تھی۔یہ سب کچھ نمرہ کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔

دھیرے دھیرے نمرہ نے تمام گھر والوں کے ساتھ اُن کی بھی ساری ذمے داریاں اپنے کاندھوں پہ اُٹھالی تھیں۔اُن کے کمرے کی صفائی سجاوٹ سے لے کر اُن کے لباس، اُن کے کھانے پینے اور دیگر باتوں کا بھی اب وہی دھیان رکھتی تھی۔

شروع شروع میں وہ بہت جزبز ہوتے تھے۔ایک دن اُس سے بولے بھی تھے۔

''گھر میں اتنے کام کرنے والے ہیں...... آپ کیوں بلاوجہ ہر کام اپنے ذمے لئے جا رہی ہیں؟..... میرے سارے کام اکبر کرتا ہے۔اُسے کرنے دیجئے۔''

''میں اپنی پریشان کُن سوچوں سے دامن بچانے کے لئے خود کو کام میں گم رکھنا چاہتی ہوں۔'' نمرہ نے دھیمے اور افسردہ سے لہجے میں کہا تھا۔''ابا جان، اماں بی اور آپ کے کام کر کے مجھے اچھا لگتا ہے.....خوشی ملتی ہے.....لیکن اگر آپ کو پسند نہیں تو......آئندہ......''

''نہیں نہیں۔پسند نہ کرنے کی کیا بات ہے؟'' وہ جلدی سے ٹپٹا کر بولے تھے۔اس کی افسردگی دیکھ کر اس کے دکھ پہ وہ بھی دُکھی ہو گئے تھے اور تب سے خاموشی سے انہوں نے اپنا ہر کام اس کے حوالے کر دیا تھا۔اور اس صبح اسے کیسی حیرت بھری مسرت سے سابقہ پڑا تھا، جب وہ اپنا بیگ نہ پا کر اسے بے ساختہ پکار اُٹھے تھے۔

''نمرہ! میرا بیگ کہاں ہے؟''

''یہ سامنے تو رکھا ہے۔'' نمرہ نے مسکراتے ہوئے ان کا بریف کیس ان کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔اور وہ خجل سے مسکرا دیئے تھے۔

''اور اب میں سوچ رہی ہوں کہ جب نمرہ آپی چلی جائیں گی تو......؟'' اُنہیں خیالوں میں گم دیکھ کر نگو نے دھیمے لہجے میں اپنی بات آگے بڑھائی تھی۔''تو یہ سب کیا اسی طرح رہ سکے گا؟''

''واپس چلی جائیں گی؟'' سرمد بے ساختہ چونک اُٹھے تھے۔

''جی۔'' نگو نے سر ہلایا۔''وہ جس مسئلے کی وجہ سے یہاں رُکی ہوئی تھیں، آج ہی پروفیسر انکل، اماں بی کو بتا رہے تھے کہ اللہ کے فضل سے وہ مسئلہ حل ہو چکا ہے۔اب وہ نمرہ کو اپنے گھر لے جا سکتے ہیں......بلکہ انہوں نے تو اماں بی سے نمرہ آپی کو ساتھ لے جانے کی اجازت بھی مانگی تھی۔''

''اچھا......'' سرمد کو شاک سا لگا تھا۔

''اماں بی نے چند دنوں کی مہلت مانگ لی ہے۔'' نگو افسردگی سے بولی ''مگر جلد ہی وہ مہلت ختم ہو جائے گی اور نمرہ آپی دوبارہ سے پروفیسر انکل کے گھر چلی جائیں گی۔اور جب اُن کا ویزہ لگ جائے گا تو پھر وہ لندن چلی جائیں گی......شاید ہمیشہ کے لئے۔''

سرمد نے تو یہ سب سوچا ہی نہیں تھا۔بلکہ سوچنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔مگر اس پل اس کے جانے کی خبر نے انہیں ہراساں کر دیا تھا۔ابا جان، اماں بی اور اس گھر کے لئے وہ بے حد اہم تھی۔مگر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ آخر کار اسے لوٹ کر تو جانا ہی تھا۔

''سرمد بھائی! کیا ایسا ممکن نہیں کہ انہیں ہمیشہ کے لئے یہاں اس گھر میں روک لیا جائے۔''
''بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟'' نگیتا کی بات پر سرمد چونک کر بولے تھے۔ ''اسے واپس جانا تو ہوگا۔''
''وہ کتنی پیاری ہیں نا۔ کتنی محبت اور نرمی سے بات کرتی ہیں۔'' نگو، سرمد کی بات پر توجہ دیئے بغیر اپنی ہی دُھن میں بولے گئی۔ ''آپ کو بھی اچھی لگتی ہیں نا؟''
نگیتا کے اس اچانک سوال پر وہ اچانک سٹپٹا اُٹھے تھے۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولے تھے۔
''سرمد بھائی! ایک راستہ ہے انہیں ہمیشہ کے لئے یہاں روک لینے کا۔'' نگیتا ان کے قریب ہوتے ہوئے رازدارانہ سرگوشی میں بولی۔ ''اگر آپ ان سے شادی کرلیں..... تو پھر وہ کہیں بھی نہ جاسکیں گی۔''
''کیا.....؟'' نگیتا کے سرسری سے انداز میں کہی گئی بات پر وہ اُچھل پڑے تھے اور نگیتا گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔
دانیال سے جب بھی بات ہوتی تھی، وہ بھی گھوم پھر کر اسی ٹاپک پہ آجاتے تھے۔
''سرمد! اگر وہ لڑکی ابا جان، اماں بی، گھر اور تمہارے لئے اتنی اچھی ہے تو پھر اسے ہمیشہ کے لئے اپنا بنانے میں برائی کیا ہے؟''
شروع شروع میں وہ اس بات پہ خفا ہوتے تھے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے خاموشی اختیار کرنا سیکھ لیا تھا۔ مگر آج نگیتا کی بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گئے تھے۔
پکنک کا سارا انتظام ہو چکا تھا۔ نمرہ نے اپنی نگرانی میں سارا کھانا تیار کروایا تھا اور زیادہ تر چیزیں خود ہی بنائی تھیں۔ خاص طور پر وجاہت مرزا کے لئے تو کھانا ہمیشہ ہی وہ خود ہی تیار کرتی تھی۔
آج کے دن کے لئے عاتکہ بیگم نے بڑے چاؤ سے نمرہ کے لئے صندلی رنگ کا مخمل کا سوٹ سلوایا تھا۔ اور جب وہ سوٹ پہن کر ان کے سامنے آئی تھی تو وہ کتنی ہی دیر تک حیرت سے اسے تکتی ہی رہ گئی تھیں۔ اس گھر کے پُرسکون اور محبت بھرے ماحول نے اس کے دل و ذہن پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ اور جب سے رشید کی گرفتاری کی خبر ملی تھی، اس کے دل و دماغ سے بوجھ سا ہٹ گیا تھا۔ اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ دلکش و رعنا دکھائی دینے لگی تھی۔
''اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ بہت پیاری لگ رہی ہو۔'' عاتکہ بیگم نے اس کی چودھویں کے چاند کی سی دمکتی پیشانی بے اختیارانہ چومتے ہوئے بے حد پیار سے کہا تھا۔ تب ہی سرمد تیزی سے ان کے قریب چلے آئے تھے۔
''اماں بی! سب تیار ہیں نا.....؟ سامان رکھوا دیا ہے۔ اب چلیں کیا؟''
''جی جناب! ہماری بٹیا نے سب کچھ رکھوا دیا ہے۔'' عاتکہ بیگم نے مسکراتے ہوئے اسے ہاتھ بڑھا کر اپنے پیچھے سے، سامنے کی طرف کرتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ''اور دیکھو خود بھی تیار ہے۔''
سرمد نے نگاہ اُٹھا کر اسے دیکھا تو لحظہ بھر کو نگاہ جھپکانا بھی بھول گئے۔ صندلی مخملی لباس میں وہ کسی نوشگفتہ گلاب کی طرح تر و تازہ اور شاداب لگ رہی تھی۔ آج پہلی بار انہوں نے تسلیم کیا تھا کہ وہ ملکوتی حُسن کی مالک ہے۔
کوسٹر میں بھی وہ تمام وقت غیر ارادی طور پر اسی کی جانب دیکھنے لگتے تھے۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ گڑ بڑا کر نظریں ہٹاتے اور خود کو سرزنش کرتے رہتے تھے۔ مگر نگاہیں تھیں کہ اسی کے چہرے کا طاف کرنے پہ مُصر تھیں۔ وہ اُسے جب نگاہ اُٹھا کر دیکھتے، اپنے رگ و پے میں ایک نیا، بالکل انوکھا سا احساس جاگتا محسوس کر رہے تھے۔ آج تو ان کے دھڑکتے دل کا انداز بھی نرالا تھا۔ اور وہ اپنی اس بدلتی کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پا رہے تھے۔
وجاہت مرزا کے لئے ویل چیئر ساتھ لے جائی گئی تھی تاکہ وہ زیادہ چل پھر کر تھکن کا شکار نہ ہوں۔ فارم ہاؤس کی ہریالی ور موسم کی رنگینی نے سب ہی کو ہشاش بشاش کر دیا تھا۔ البتہ غفور منہ لٹکائے سوئمنگ پول کے دوسرے کنارے پر بیٹھا تھا۔

''تم یہاں اس طرح خاموش سے کیوں بیٹھے ہو؟'' نکیتا اسے تلاش کرتی اس کے پاس چلی آئی تھی۔ ''مجھے بتائے بنا یہاں چلے آئے۔ کب سے تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔

''تمہیں مجھ سے کوئی کام نہیں کیا؟'' غفور نے اُداس لہجے میں پوچھا۔

''بغیر کام کے تم سے بات نہیں کی جاسکتی؟'' اس کے سوال کے جواب میں نکیتا نے اُلٹا سوال کر دیا تھا۔ ''میں دیکھ رہی ہوں، تم پہلے جیسے نہیں رہے ہو۔ پہلے مجھے دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ میٹھی میٹھی باتیں کرتے تھے.....اب تو بالکل بدل گئے ہو۔''

''نکیتا! اصل میں بات یہ ہے کہ میں جان گیا ہوں کہ جس راستے کی کوئی منزل نہ ہو، اس راستے پہ چلنے سے کیا حاصل؟......شاید تم اس بات کا مطلب نہ سمجھ سکو لیکن......''

''لیکن کیا؟'' نکیتا تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ''میں دیکھنے میں بے وقوف لگتی ہوں، مگر حقیقت میں اب اتنی بھی بے وقوف نہیں ہوں کہ اس بات کا مطلب بھی نہ سمجھ سکوں کہ تم بھی مجھے پسند کرتے ہو۔ اور یہ کہ تمہارے دل میں بھی میرے لئے ڈھیر ساری محبت ہے۔''

نکیتا کے شرمیلے سے انداز میں کہنے پر غفور نے چونک کر پوچھا تھا۔

''بھی......تمہاری ''بھی'' سے کیا مراد ہے؟''

''یہی کہ میں بھی تمہیں پسند کرتی ہوں'' نکیتا نے نگاہیں جھکا کر لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ سجا کر شرمیلی آواز میں کہا۔ ''میرے دل میں بھی تمہارے لئے بہت جگہ ہے۔ میں چاہتی ہوں، جب بھی میری شادی ہو، تم سے ہی ہو۔''

''شادی ہی تو نہیں ہو سکتی نگو!'' غفور نے کرب بھرے لہجے میں کہا۔

''کیوں.....شادی کیوں نہیں ہو سکتی؟'' نکیتا نے معصومیت سے پوچھا۔

''کیونکہ ہم دونوں کے مذہب الگ ہیں۔'' غفور نے وضاحت کی۔

''مجھے اس بات کا پہلے سے علم تھا۔'' نکیتا مدبرانہ انداز میں بولی۔ ''تب ہی تو میں نے نمرہ آپی سے بات کی تھی۔ انہوں نے مجھے اسلام سے متعلق بہت سی باتیں بتائیں۔ کچھ کتابیں بھی ہیں۔ ان سب کو پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اسلام ایک سچا اور کامل دین ہے......اور اللہ جسے بھی توفیق دے، اسے سچائی کی راہ چُن لینی چاہئے۔''

''کیا......؟'' غفور حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔ ''نگو! کیا تم میری خاطر اسلام قبول کر لو گی؟''

''تمہاری خاطر تو میں جان بھی دے سکتی ہوں غفور!'' نکیتا نے پوری سچائی سے کہا۔ ''مگر اسلام میں اسلام کی خاطر قبول کر رہی ہوں اور یہ ایک سچا دین ہے۔ اس لئے میں یہ دین اپنانا چاہتی ہوں۔ اور جب میں بھی مسلمان ہو جاؤں گی، تب ہم دونوں کے راستے ہی نہیں، منزل بھی ایک ہو جائے گی۔''

''اوہ نگو!......میری جان!.....میری جانِ تمنا!'' غفور نے بے ساختہ نگو کا ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

تالاب کی دوسری جانب پھولوں کے پودوں کے پیچھے کھڑے سرمد یہ منظر حیرت سے تک رہے تھے۔ ابھی ابھی نمرہ اُنہیں بلانے آئی تھی۔ وہ ان کے پیچھے کھڑی ابھی انہیں مخاطب کرنے ہی والی تھی کہ ان کی محویت کو دیکھ کر رک گئی تھی۔ وہ آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی لئے نکیتا اور غفور کو تک رہے تھے۔ نگو ان دونوں بھائیوں کو بہن کی طرح عزیز تھی۔ اور ان کی نگاہوں میں تو ابھی وہ بچی تھی۔ غفور کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ ان کے لئے حیرت کا ہی نہیں، غصے کا باعث بھی بن سکتا تھا۔ اسی لئے نمرہ نے جلدی سے مداخلت کی تھی۔

''غفور بہت اچھا لڑکا ہے۔ جس طرح بچپن سے ہی نگو کی پرورش آپ کے گھر میں ہوئی ہے، اسی طرح غفور بھی

بہت چھوٹی عمر سے آفاق انکل کے زیر سایہ ہے۔''

''اوہ.....آپ......'' سرمد چونک کر پلٹے تھے اور نمرہ کو اپنے اتنے قریب کھڑے دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔

''وہاں کھانے پہ سب آپ کا اور نگو اور غفور کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں آپ سب کو بلانے آئی تھی.....مگر یہاں.....'' نمرہ جملہ مکمل کئے بغیر خاموش ہوگئی۔

''آپ نے دیکھا...... یہ سب کیا ہے؟'' سرمد جز بز سے لہجے میں بولے۔

''یہ محبت ہے۔'' نمرہ نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

''کیا.....؟'' سرمد اُچھل پڑے۔ ''آپ کا مطلب ہے.....؟''

''جی۔'' نمرہ کا اطمینان برقرار تھا۔ ''غفور اور نکیتا ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' سرمد تیزی سے بولے۔ ''نکیتا غیر مسلم ہے۔''

''ہاں۔ مگر وہ مسلمان ہونے کو تیار ہے۔'' نمرہ کے جواب نے سرمد کو مزید حیران کر دیا تھا۔

''کیا وہ غفور کی خاطر اسلام قبول کرے گی؟''

''نہیں۔ اس نے مجھ سے اسلام کے بارے میں بہت سے سوال کئے تھے۔ اماں بی سے بھی رہنمائی حاصل کی تھی۔ کچھ کتب کا مطالعہ بھی کیا..... سو بہت سوچ سمجھ کر اس نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ ظاہر ہے اس فیصلے میں کہیں نہ کہیں غفور کی محبت کا بھی عمل دخل ہے۔ مگر اس میں برائی کیا ہے؟''

''نہیں۔'' سرمد نے اضطراری انداز میں سر جھٹکا۔ ''یہ تو خوشی کی بات ہے کہ وہ سچائی کی راہ اپنا لے۔ مگر جہاں تک غفور سے محبت اور شادی کا تعلق ہے...... تو...... ابھی وہ بہت چھوٹی ہے۔ یہ سب ابھی کیسے ممکن ہے؟''

''جی۔'' نمرہ نے سر تسلیم خم کیا۔ ''ابھی وہ پندرہ سال کی ہے۔ تین سال میں اٹھارہ کی ہو جائے گی۔ تب تک غفور بھی 23 کا ہو چکا ہوگا اور اپنا گریجویشن مکمل کر چکا ہوگا۔ شادی تو اسی وقت ہوگی۔ ابھی تو اگر اماں بی اور آپ مناسب سمجھیں گے تو نگو کے اسلام قبول کر لینے کے بعد کوئی منگنی وغیرہ کی چھوٹی سی خوشی منائی جا سکتی ہے۔ ابا جان کے لئے بھی یہ خوشی باعثِ تقویت ہوگی۔''

سرمد قائل ہو چکے تھے۔

حیران نظروں سے اُس ساحرہ لڑکی کو تک رہے تھے کہ وہ کتنے بڑے بڑے مسئلے کیسے چٹکی بجاتے حل کر لیتی تھی۔ کیسا سچائی میں گندھا متاثر کن لہجہ تھا اُس کا کہ کوئی اُس کی کوئی بات ٹال ہی نہیں سکتا تھا۔ کیسی جادو بھری آنکھیں تھیں اس کی کہ جو اُن آنکھوں میں دیکھتا تھا، اُن کے سحر میں گھر جاتا تھا۔

'تو پھر تم پہ اس کے لہجے، اس کی آنکھوں کے جادو کا اثر کیوں نہیں ہوتا سرمد؟' ان کے دل نے سرگوشی میں ان سے پوچھا تھا اور وہ خود سے نظریں چراتے جلدی سے اس طرف چل دیئے تھے جہاں وجاہت مرزا، آفاق صاحب اور اماں بی ان کے منتظر تھے۔

ذرا ہی دیر بعد نمرہ غفور اور نکیتا کے ساتھ وہاں آ پہنچی تھی۔

فوراً ہی کھانا لگا دیا گیا تھا۔ تقریباً تمام چیزیں نمرہ نے تیار کی تھیں۔ سب ہی نے تعریفیں کر کر کے کھانا کھایا تھا۔ مگر سرمد خاموش رہے تھے۔ مسلسل سوچے جا رہے تھے، کیا کہا تھا دانیال نے.....؟

یہ جو محبت ہے، یہ خود اپنا راستہ بنا لیتی ہے۔ دبے پاؤں چلتی یہ دل کی دہلیز تک جا پہنچتی ہے......اور پھر خاموش نگاہوں سے درِ دل پہ دستک دے جاتی ہے.....اور پھر سامنے والا کتنا ہی پتھر دل کیوں نہ ہو، دل کی دہلیز پہ کھڑی اس

محبت کے لئے درِ دل وا کرنے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ دستک کبھی بھی رائیگاں نہیں جاتی۔

''تو کیا کبھی میں بھی......؟'' سرمد ایک دم سے گھبرا اُٹھے تھے۔ اُنہیں اپنے دل کے کواڑوں پر بڑی واضح دستک سنائی دے رہی تھی۔

''سرمد بھائی! آپ ٹھیک ہیں نا؟'' ان کی کشادہ پیشانی پہ پھوٹتا پسینہ نگیتا کی محبت بھری نظروں سے چھپا نہ رہ سکا تھا۔ اس نے قدرے حیرانی اور پریشانی سے سوال کیا تھا۔ ''اتنی سردی میں آپ کے ماتھے پہ پسینہ؟''

''نہیں.....کچھ نہیں۔'' انہوں نے جلدی سے ہاتھ کی پشت سے ماتھے پہ آیا پسینہ پونچھ لیا تھا۔

''بھئی کھانا بہت لذیذ تھا۔ اب کوئی اچھی سی غزل ہو جائے۔'' وجاہت مرزا نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو سب ہی لوگ خوش ہو گئے۔ سب ہی جانتے تھے، وجاہت مرزا کو غزلیں سننے کا بے حد شوق تھا۔ کسی زمانے میں وہ بڑے اہتمام سے غزلوں کی محفلیں سجایا کرتے تھے اور بڑے بڑے نامی گرامی غزل گانے والے ان کی ان محفلوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ آج کتنی ہی مدت بعد انہوں نے غزل سننے کی خواہش کی تھی۔

''جی ابا جان!......نمرہ آپی کی بہت اچھی آواز ہے۔'' نگو نے جلدی سے کہا تھا۔

''جی۔ گاتی بھی بہت اچھا ہیں۔'' غفور نے ٹکڑا لگایا۔

''بھئی بات تو سچ ہے۔'' آفاق صاحب مسکرائے۔ ''نمرہ کی آواز میں نعتیں وغیرہ تو ہم نے بھی سنی ہیں......مگر کوئی گیت یا غزل سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔''

''تو لیجئے، آج ہم سنوائے دیتے ہیں۔'' عظمت بوا کب پیچھے رہنے والی تھیں۔ لپکتے لہجے میں بولیں۔ ''آج ہماری نمو بٹیا اپنے ابا جان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ضرور کوئی اچھی سی غزل سنائیں گی۔ کیوں بٹیا۔''

''عظمت بوا......'' نمرہ بری طرح کنفیوز ہو گئی تھی۔ ''آپ بھی نا......میں بھلا......پلیز......''

''ارے بٹیا! شرماؤ مت۔'' آفاق صاحب نے ہمت بندھائی۔ ''یہاں سب اپنے ہی تو ہیں۔ اور پھر یہ فرمائش بھی تمہارے ابا جان کی ہے۔ تم بھلا کس طرح ٹال سکتی ہو؟''

نمرہ نے جز بز ہوتے ہوئے کن اکھیوں سے سرمد کی طرف دیکھا تھا۔ وہ آنکھوں میں دلچسپی اور شوق لئے اُسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''نمو بٹیا! اگر کچھ سنا سکتی ہو تو......سنا دو......نہ چاہو تو کوئی بات نہیں۔'' اماں بی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا تو وہ بے ساختہ کچھ سنانے کے لئے آمادہ ہو گئی تھی۔

''ایک غزل ہے......پتہ نہیں......آپ لوگوں کو اچھی لگے یا......''

''نہیں نہیں۔ آپ سنایئے۔ ہمیں بہت اچھی لگے گی۔'' غفور اور نگو کے ایک ساتھ کہنے پر سب ہی بے اختیار مسکرا اُٹھے تھے۔

نمرہ نے ہلکے سے کھنکھار کے گلا صاف کیا تھا، پھر نگاہیں جھکا کر دھیمی آواز میں ترنم کا آغاز کیا تھا۔

کچھ عشق تھا، کچھ مجبوری تھی سو میں نے جیون وار دیا
میں کیسا زندہ آدمی تھا، اِک شخص نے مجھ کو مار دیا

آواز تھی کہ گویا ایک ساتھ بے شمار نقرئی گھنٹیاں بج اُٹھی تھیں۔

روح میں اُترتا سوز و ترنم، احساس کو چھوتا ہوا آواز کا زیر و بم۔ سب ہی دم بخود، مبہوت سے اس کا چہرہ تک رہے تھے۔ اور اس کی مترنم اور درد بھری آواز سب ہی کی سماعت سے اُتر کر دل میں سماتی جا رہی تھی۔

میرے بچوں کو اللہ رکھے، ان تازہ ہوا کے جھونکوں نے
میں خشک پیڑ خزاں کا تھا، مجھے کیسا برگ و بار دیا

اس شعر کے ساتھ ہی اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ آنکھوں میں ننھی تابی کی تصویر گھوم گئی تھی۔ اُس کی دُکھیاری زیست کی واحد خوشی، اُس کا لختِ جگر اُس سے میلوں دُور تھا۔ رشید کے گرفتار ہونے اور سلطانہ کے مرنے کے بعد اب حالات یکسر بدل چکے تھے۔ تابی کو واپس نمرہ کے پاس بلایا جاسکتا تھا۔ مگر خود نمرہ نے ہی کہا تھا...... ہم لوگ جب لندن جانے ہی والے ہیں تو تابی کو مت بلائیے۔ اس کی وجہ سے فریحہ آپی کس قدر مگن اور خوش رہنے لگی ہیں...... فریحہ کی تاریک زندگی میں مانگے کے چراغ کی روشنی وہ کچھ دن اور قائم رکھنا چاہتی تھی۔

نمرہ کے لفظوں کا دکھ سب ہی نے محسوس کیا تھا۔

مگر اُس کی دراز گھنی نم پلکیں سرمد کو اپنے دل میں چبھتی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ اپنی مسکراہٹ کے پیچھے کتنا دکھ سمیٹے ہوئے تھی۔ چہروں کی بھیڑ میں بھی وہ کس قدر تنہا تھا۔ سرمد کو اپنے دل میں اس کے لئے عجب سا ہمدردی اور اپنائیت کا احساس بیدار ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ فطرتاً ہمدرد اور دوسروں کی مشکل میں کام آنے والی نیچر کے مالک تھے۔ تو بھلا اس وقت اس ہستی کا غم کیوں محسوس نہ کرتے جس نے اُن کی دنیا میں آ کر اُن کی دنیا ہی بدل دی تھی۔ وجاہت منزل کی صورت نکھر آئی تھی۔ اماں بی کے چہرے پر ہر پل مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ اور سب سے بڑی بات، وجاہت مرزا پھر سے جی اٹھے تھے۔ اس کا یہ احسان تو وہ عمر بھر بھول نہیں سکتے تھے۔

''سرمد بھیا! کچھ آپ بھی تو سنائیے نا۔'' نگو نے شوخ لہجے میں کہا تو بے اختیار سب ہی ہنس پڑے تھے۔

''سرمد میاں تو نہیں البتہ ہمارے غفور میاں ضرور ایک اچھی سی غزل سنا سکتے ہیں۔'' آفاق صاحب کے کہنے پر سب ہی غفور کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور خاصے نخرے اور انکار کے بعد آخر نگینا کے کہنے پر وہ کچھ سنانے کے لئے آمادہ ہو گیا تھا۔

ممکن ہے سفر ہو آساں، ہم ساتھ ہی چل کے دیکھیں
کچھ تم بدل کے دیکھو، کچھ ہم بدل کے دیکھیں

غفور نے سب سے نگاہیں چرا کر نگو کی طرف دیکھا۔

جھوٹا ہی سہی یہ رشتہ، ملتے ہی رہیں ہم یونہی
حالات نہیں بدلیں گے، چہرے ہی بدل کے دیکھیں

نمرہ نے غیر اختیاری طور پر سرمد کی طرف دیکھا تھا۔ وہ خود سے بے خبر سے اُسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لحظہ بھر کو ان دونوں کی نظریں باہم ٹکرا گئی تھیں۔ نظروں کے اس تصادم سے دونوں کے ہی رگ و پے میں ایک عجب سی سنسناہٹ سی جاگ اُٹھی تھی۔ دل کی دھڑکنوں میں اچانک ہی اضافہ ہو گیا تھا۔

دل کی دہلیز پہ دیے کی صورت
کبھی تم جل کے دیکھو، کبھی ہم جل کے دیکھیں

غفور کی دھیمی، نرم اور مترنم آواز نے ایک بار پھر سرمد کو نمرہ کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ ان کی نگاہیں خاموشی کی زبان میں ازخود نمرہ سے محوِ گفتگو تھیں۔

ممکن ہے سفر ہو آسان، ہم ساتھ ہی چل کے دیکھیں

اس سے پہلے کہ نمرہ کی حیران نگاہیں کوئی جواب دیتیں، انہوں نے گھبرا کر اپنی نگاہیں جھکا لی تھیں۔ وہ اپنے دل و

نگاہ کی کیفیت پہ آپ حیران ہو رہے تھے۔

شام تک یہ خوش و خرم، شاداں و فرحاں محفل فارم ہاؤس میں سجی رہی تھی۔ شام کے سائے بکھرتے ہی سب نے واپسی کے لئے رختِ سفر باندھا تھا۔ واپسی پہ نگو اور غفور تو خوش تھے ہی مگر نمرہ بھی اپنے بجھے دل میں ایک عجب سا اُمید کا دیا ٹمٹماتا محسوس کر رہی تھی۔

سرمد کو برسوں پہلے فریحہ کے نکاح والے دن اچانک ہی اپنے سامنے دیکھ کر پہلی ہی نگاہ میں وہ دل و جان سے ان پہ فریفتہ ہو گئی تھی۔ اپنی اس کیفیت کو گو کہ وہ کوئی نام نہیں دے سکی تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ شعور کی سیڑھیاں چڑھنے کے ساتھ اُسے ادراک ہو گیا تھا کہ پہلی ہی نظر میں سرمد اس کی نگاہوں کی راہ سے اس کے دل میں سما گئے تھے۔ وہ اپنے اور سرمد کے درمیانی فاصلے سے نابلد تھی۔ فریال نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی، مگر اس سے پہلے کہ یہ جذبہ کوئی نیا روپ دھارتا، اس کی زندگی کا دھارا ہی بدل گیا تھا۔ اور آج برسوں بعد وقت کی کتنی گردشیں دیکھنے کے بعد وہ پھر سرمد کے سامنے تھی۔ اور سرمد اپنی تمام تر وجاہتوں اور رعنائیوں کے ساتھ اس کے درِ دل پہ دستک دیتے محسوس ہوتے تھے۔ مگر آج وہ اپنے اور سرمد کے مابین حائل خلیج سے اچھی طرح واقف تھی......

کہاں سرمد؟.....اور کہاں وہ.....ایک مطلقہ اور ایک بچے کی ماں۔

مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتی......دل تھا کہ مانتا ہی نہ تھا۔ بن ڈور سرمد کی جانب کھنچا ہی جاتا تھا۔ اُن کی ہی تمنا کئے جاتا تھا۔ ضدی بالک کی طرح اُسی چاند کو پانے کی ہٹ کئے جاتا تھا۔ اتنے دنوں سے وہ اس گھر میں سرمد کے آس پاس تھی۔ مگر آج اس نے سرمد کی آنکھوں میں کچھ نئے سے جذبے انگڑائی لے کر بیدار ہوتے دیکھے تھے۔ آج ان کی نگاہوں کا زاویہ کسی قدر بدلا ہوا سا لگ رہا تھا۔ ان کی بے ریا نگاہیں کتنے واضح انداز میں اس سے ہم کلام تھیں۔

''ممکن ہے سفر ہو آساں، ہم ساتھ ہی چل کے دیکھیں۔'' مگر پھر انہوں نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لی تھیں۔

صاف ظاہر تھا کہ ان کا دل ان کے دل و نگاہ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا.....وہ خود کو کنٹرول میں رکھنا چاہ رہے تھے مگر ایسا کرنا کتنا دُشوار تھا۔ نمرہ اس مشکل سے واقف تھی۔ وہ خود بھی تو ایسی ہی راہوں کی مسافر تھی۔

⊛===⊛===⊛

ہسپتال کے طویل وارنڈے کے اس پار اُجلی دھوپ بکھری ہوئی تھی۔ مگر وارڈ میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ سامنے ہی بیڈ پر ندرت جہاں آنکھیں موندے ہمیشہ کی نیند سو رہی تھیں۔ وارنڈے کے پلر پہ سر دھرے بلک بلک کر روتی فروا کو دیکھ کر ثروت سوچ رہی تھی......وہ اکیلے یہ سب کیونکر سنبھال سکے گی......ابھی کچھ دیر قبل اُس کی اسد سے بات ہوئی تھی۔ یہ خبر ان کے لئے بھی کسی شاک سے کم نہیں تھی۔

''ثرو!.....یہ سب کیسے ہو گیا؟.....ابھی دو روز قبل جب میں وہاں سے چلا تھا تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں۔''

''بس دیکھتے ہی دیکھتے چند گھنٹوں میں وہ چٹ پٹ ہو گئیں.....اسد! میں کیا کروں؟''

''ثروت! حوصلہ کرو۔ تمہیں فروا کو سنبھالنا ہے۔ میں جلد از جلد پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

ثروت سے بات کرنے کے بعد اسد نے سرمد کا نمبر ملایا تھا۔ مگر ان کا نمبر مسلسل بند جا رہا تھا۔ گھر کا نمبر بھی کوئی نہیں اٹھا رہا تھا۔ ان کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

آخر سرمد اور گھر کے دیگر لوگ کہاں ہیں؟.....فون کیوں نہیں اٹھا رہے؟......اب وہ یہ کیسے جان سکتے تھے کہ سرمد اور گھر کے دیگر سب ہی لوگ وجاہت مرزا کے فارم ہاؤس پہ پکنک کے لئے گئے ہوئے تھے۔ گھر بند تھا۔ لان میں مالی مصروف تھے اور گیٹ پہ چوکیدار موجود تھا۔ اماں بی کی تاکید کے مطابق سرمد کا ہی نہیں، آفاق صاحب کا بھی موبائل بند تھا۔

اسد کئی بار سرمد کا نمبر ملانے کے بعد مایوس ہو گئے تھے۔ پھر انہوں نے اپنے آفس میں اپنے ہم منصب دوست رفیق کو فون کیا تھا اور ساری صورتِ حال سے آگاہ کر کے بولے تھے۔

''رفیق! میری فلائٹ تین بجے کی ہے...... ادھر ثروت اور فروا ہسپتال میں ہیں۔ سرمد سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟''

''تم صبر سے فلائٹ کی روانگی کا انتظار کرو۔'' رفیق نے ساری بات سن کر ان کی خالہ اور ساس کے اچانک انتقال پر اظہارِ تعزیت کے بعد کہا۔ ''میں ابھی امی اور صبا کے ساتھ ہسپتال جا رہا ہوں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔''

''شکریہ رفیق!'' اسد تشکر بھرے لہجے میں بولے۔ ''تنویر کو بھی ساتھ لے لینا۔''

''او کے..... اب فون رکھتا ہوں۔ کچھ ہی دیر میں ہسپتال پہنچ جاؤں گا۔''

کچھ ہی دیر میں رفیق اپنی والدہ اور بیوی صبا کے ساتھ ہسپتال پہنچ گیا تھا۔ کچھ دیر میں اسد کا اسسٹنٹ تنویر بھی پہنچ گیا تھا۔

رفیق نے سب ادائیگی وغیرہ کر کے ثروت اور فروا کو اپنی والدہ اور بیوی کے ساتھ گھر روانہ کر دیا تھا۔ جبکہ خود ڈیڈ باڈی لے کر تنویر کے ساتھ ایدھی ٹرسٹ روانہ ہو گیا تھا۔

دوپہر، سہ پہر کی جانب بڑھ رہی تھی، جب دانیال کا جہاز کراچی ایئر پورٹ کے رن وے پہ دوڑتا ہوا مخصوص مقام پہ جا ٹھہرا تھا۔

وہ اپنا چھوٹا سا سفری بیگ کاندھے پہ لٹکائے ایئر پورٹ سے باہر نکلے تھے۔ وہاں لندن ایئر پورٹ سے انہوں نے سرمد اور ثروت دونوں سے ہی رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر دونوں سے ہی رابطہ نہ ہو سکا تھا۔ سرمد کے لئے تو وہ واقف تھے کہ ان کا موبائل بند ہے۔ مگر ثروت شاید ماں کی بیماری کے باعث ہسپتال میں مصروف ہونے کے باعث ان کا فون ریسیو نہ کر سکی تھی۔

'خیر اب تو میں جا ہی رہا ہوں..... چند گھنٹوں کی بات ہے۔ پھر تو ان شاء اللہ سب سامنے ہی ہوں گے۔' وہ خود کو تسلی دیتے ہوئے جہاز میں سوار ہو گئے تھے۔

ایئر پورٹ کی عمارت سے باہر نکل کر انہوں نے چاروں طرف حیران اور مسرور نظروں سے دیکھا تھا۔ یہ ان کا اپنا شہر تھا۔ وہ یہیں پیدا ہوئے تھے۔ چھوٹا سا گھر، چھوٹا سا پرائیویٹ سکول..... ان کے ماں باپ سیدھے سادے قناعت پسند انسان تھے۔ ان دنوں وہ دونوں بھائی اپنے والدین کے ساتھ اس چھوٹے سے گھر میں کتنے خوش اور مگن رہتے تھے۔ کبھی کبھار امی ان دونوں کا ہاتھ تھامے اپنے اکلوتے بھائی اسلم ماموں کے گھر جاتی تھیں۔ مگر ندرت ممانی کے روّیے سے ہمیشہ ہی وہ دُکھی اور افسردہ ہو کر ہی واپس لوٹتی تھیں۔ مگر پھر بھی کبھی وہ ممانی کے روّیے کی شکایت نہیں کرتی تھیں۔ اور کبھی بھی انہوں نے وہاں جانا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ کہتی تھیں۔ 'پانی میں لاٹھی مارنے سے جیسے پانی الگ نہیں ہوتا، اسی طرح خون کے رشتے بھی کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔'

اور آج اس شہر کے اجنبی راستے پہ کھڑے دانیال سوچ رہے تھے۔ 'امی ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ یہ خون کے رشتے کی کشش ہی تو ہے جو میں اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر یہاں اس وقت موجود ہوں۔'

اب انہیں کیا کرنا چاہئے؟..... ابھی انہوں نے یہ سوچا ہی تھا کہ اچانک ان کی نگاہ اسد پر پڑی تھی۔ وہ اپنا اٹیچی کیس گھسیٹتے ٹیکسی کی جانب بڑھتے دکھائی دیئے تھے۔

''اسد!'' وہ بے ساختہ انہیں آواز دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے، بہت پہلے سرمد نے اسد کی تصویر انہیں

دکھائی تھی۔ مگر پچھلے ایک سال سے ثروت اور اسد سے نیٹ پہ رابطہ ہونے کے بعد اکثر وہ کیمرے کے طفیل ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ کر بات کرتے رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اسد پر نظر پڑتے ہی انہوں نے انہیں پہچان لیا تھا اور اونچی آواز میں انہیں پکارا تھا۔

''اسد......!'' ان کی آواز دوبارہ سے اسد کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ وہ اپنی ہی پریشانی میں تھے۔ جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہتے تھے۔ پہلے ہی ان کی فلائٹ لاہور سے یہاں خاصی لیٹ پہنچی تھی۔ پہلی بار اپنا نام سن کر انہیں گمان ہوا تھا کہ محض ان کی سماعت کا دھوکا ہے۔ مگر جب دوسری بار کسی نے ان کا نام لے کے پکارا تو وہ بے ساختہ تھم سے گئے تھے۔ اگلے ہی لمحے کسی نے ان کے شانے پہ ہاتھ رکھا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹے تھے اور اپنے سامنے دانیال کو کھڑے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

''دانیال! کیا واقعی یہ تم ہو؟''

''جی اسد بھائی!'' دانیال مسکرائے۔ ''مگر آپ یہاں کیسے؟......اوہ یاد آیا......آپ لاہور سے آرہے ہیں؟''

''ہاں۔ تمہیں پتہ تو ہوگا۔'' وہ دانیال سے پُر تپاک انداز میں بغل گیر ہونے کے بعد افسردہ سے لہجے میں بولے تھے۔ ''ندرت خالہ جان کا آج صبح انتقال ہوگیا ہے۔''

''کیا......؟'' دانیال اُچھل پڑے ''صبح ثروت سے میری بات ہوئی تو پتہ چلا تھا کہ اچانک ہی ان کی بہت طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ مگر یہ نہیں خبر تھی کہ......وہ......''

دانیال کی آواز رندھ گئی تھی۔

اسد اُن کا شانہ تھپتھپاتے صبر کی تلقین کرتے ٹیکسی تک لے آئے تھے۔ سامان ڈگی میں رکھ کر وہ دونوں ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے۔ دونوں کے دل و ذہن بوجھل تھے۔ لبوں پہ خاموشی کی مہر تھی اور آنکھوں سے افسردگی جھانک رہی تھی۔ ٹیکسی مختلف راستوں سے ہوتی آخر ندرت جہاں کے فلیٹ والی بلڈنگ کے سامنے آرکی تھی۔

رفیق نے نیچے ٹینٹ لگوا کر کرسیاں رکھوادی تھیں۔ آس پڑوس کے مرد ٹینٹ میں اور عورتیں اوپر فلیٹ میں موجود تھیں۔

اسد، دانیال کو لئے جب فلیٹ میں داخل ہوئے تھے تو انہیں دیکھتے ہی ثروت تیزی سے ان کے سینے سے آلگی تھی اور بلک بلک کر رو دی تھی۔

''ثرو! میری جان صبر کرو۔'' اسد اسے گلوگیر آواز میں سمجھا رہے تھے۔ ندرت جہاں انہیں بھی بہت عزیز تھیں۔ ان کی اکلوتی خالہ ماں کی پرچھائیں......اُن کے سینے سے لگ کر اُنہیں اپنی ماں کی سی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ آج ان سے وہ خوشبو ہمیشہ کے لئے چھن گئی تھی۔

فروا کا رو رو کر الگ برا حال تھا......اس کی آنکھیں متورم اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ اسد کو دیکھتے ہی ایک بار پھر اس نے زور و شور سے رونا شروع کر دیا تھا۔

''فرا!......میری بہن! میری گڑیا!......صبر کرو......دیکھو......تم سے ملنے اتنی دور سے کون آیا ہے؟'' اسد اُسے سینے سے لگائے کہہ رہے تھے۔

دانیال کو اپنے سامنے دیکھ کر ثروت ہی نہیں، فروا بھی بھونچکا رہ گئی تھی۔

''کاش! آپ امی کی زندگی میں آسکتے......ثروت نے روتے ہوئے بتایا تھا۔'' وہ آپ سے ملنے کی کس قدر مشتاق تھیں۔ آپ کا کس قدر ذکر کرتی تھیں۔''

مجھے بھی بے حد ملال ہے کہ میں ان سے مل نہیں سکا۔ ان کی شفقت اور محبت کی چھاؤں میں ذرا دیر بھی بیٹھ نہ سکا۔''

دانیال کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔

ثروت کو ہی نہیں، خود فروا کو بھی دانیال کا اس طرح آ پہنچنا بہت اچھا لگا تھا۔ اپنا تو وہی ہوتا ہے جو دکھ میں ساتھ دے۔ دانیال کو دیکھتے ہی جانے کیوں فروا کو سرمد سے ایک عجب سی دُوری کا احساس ہو رہا تھا۔ ایک یہ دانیال تھے کہ سات سمندر پار سے آ پہنچے تھے۔ ایک وہ سرمد تھے کہ یہاں سات قدم پہ ہونے کے باوجود اتنے بڑے غم سے بے خبر تھے...... جنازہ تیار تھا...... وقتِ رخصت آ پہنچا تھا۔ اسد کی ہی نہیں، خود دانیال کی بھی خواہش تھی کہ سرمد کم از کم جنازے میں تو شریک ہو سکیں۔ مگر ان کا فون بند تھا اور رابطے کی کوئی صورت نہ تھی۔

''اگر فارم ہاؤس کا پتہ معلوم ہو تو کسی کو بھیجا جا سکتا ہے۔'' دانیال نے مشورہ دیا تھا۔

''فارم ہاؤس شہر سے بہت دُور ہے...... کوئی اب یہاں سے روانہ ہوا تو گھنٹوں میں وہاں پہنچے گا۔ اور ممکن ہے اس وقت تک وہ لوگ وہاں سے گھر کے لئے روانہ ہو چکے ہوں۔'' اسد کے جواب پر دانیال کو تائید بھرے انداز میں سر ہلانا پڑا تھا۔ اور یوں سرمد کے بغیر ہی ندرت جہاں سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئی تھیں۔

رات گئے ندرت جہاں کو سپرِ دِ خاک کر کے واپس لوٹے تو اسد کے ساتھ دانیال بھی بے حد ملول اور افسردہ تھے۔ ثروت اور فروا کے تو رو رو کے آنکھوں کے سوتے ہی خشک ہو چکے تھے۔ دانیال نے فروا کی طرف غور سے دیکھا تھا۔ اس کی بھیگی بھیگی پلکیں اور نم رخسار عجب سے ملال کا احساس دلا رہے تھے۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں دُکھ منجمد سا ہو کر رہ گیا تھا۔ سنجیدگی اور رنجیدگی کے پیکر میں ڈھلی یہ فروا اُس فروا سے کتنی مختلف لگ رہی تھی جس کا ذکر وہ اکثر سرمد کی زبان سے سنا کرتے تھے۔

❀===❀===❀

رات گئے گھر پہنچنے کے بعد گو کہ سرمد بہت تھک چکے تھے مگر بے حد خوش اور مطمئن تھے۔ آج برسوں بعد انہوں نے وجاہت مرزا اور عاتکہ بیگم کے ساتھ ایک خوب صورت، خوشگوار اور محبت بھرا دن گزارا تھا۔ چند مہینوں قبل وہ ایسی کسی پکنک کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے...... مگر شاید اب تقدیر کی دیوی ان پر اور ان کے گھر پر مہربان ہو گئی تھی۔

غسل لے کر وہ جونہی باتھ روم سے نکلے، ان کی نگاہ موبائل پہ پڑی تھی۔ آج صبح سے ان کا موبائل بند تھا۔ انہوں نے موبائل آن کرنے کے بجائے اسے سائیڈ ٹیبل پہ ڈال دیا تھا۔ ''اب صبح سے بند ہے تو رات بھر بھی بند رہنے دیا جائے، کیا خیال ہے؟'' وہ آئینے میں اپنے عکس سے مخاطب ہوئے۔ تولیے سے بال خشک کرتے ہوئے انہوں نے اپنے چہرے کی طرف دیکھا۔ آج وہ برسوں بعد اپنے چہرے پر ایسی مسرت، ایسی شادابی دیکھ رہے تھے۔ وہ تولیہ کرسی کی پشت پہ ڈال کر بیڈ کی طرف بڑھ گئے تھے۔

صبح فون آن کرتے ہی انہیں سب سے پہلا فون اسد کا ہی آیا تھا۔

''اسد بھائی!...... آپ کیسے ہیں؟'' سرمد نے حیرت بھری مسرت سے کہا۔

''تم نے اپنا موبائل نہیں دیکھا؟ کل میں نے تمہیں کتنی کالز کی تھیں۔'' اسد نے سرمد کی بات کو نظر انداز کرتے قدرے نروٹھے لہجے میں کہا تو سرمد قدرے شرمسار ہو کر بولے۔

''سوری بھیا! میں نے فون دیکھا ہی نہیں۔ ابھی آپ کی کال آئی تو آن کر کے آپ سے بات کرنے لگا۔ کل آپ نے اتنی کالز کیں۔ سب خیریت تو ہے نا؟''

''ندرت خالہ کا انتقال ہو گیا۔'' اسد نے گہرا سانس لے کر دھیمی آواز میں اطلاع دی۔

''کیا؟'' سرمد اُچھل پڑے تھے۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟...... وہ تو بالکل ٹھیک تھیں...... پھر یہ اچانک......''

''ہاں، سب کچھ آناً فاناً ہی ہو گیا۔'' اسد کے لہجے کی افسردگی کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ ''اور تم ان کے جنازے میں بھی

شریک نہ ہو سکے۔''

''کیا مطلب؟......تدفین ہو گئی؟''

''ہاں، کل صبح نو بجے انتقال ہوا تھا۔ مغرب کے بعد تدفین کر دی گئی۔ آخر کب تک جنازہ رکھا جاتا؟ اور کس کے انتظار میں رکھا جاتا؟'' اسد کے دکھ پر سرمد کا دل بھی دکھ سے لبریز ہو گیا تھا۔

''ثروت بھابی اور فروا تو ٹھیک ہیں نا؟'' کئی لمحوں تک کرب کے سمندر میں ڈوبے رہنے کے بعد سرمد نے رنجیدہ آواز میں کہا تھا۔ ''مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں ان کا آخری دیدار بھی نہ کر سکا۔ اس کے جنازے کو کندھا بھی نہ دے سکا۔''

''خدا کو یہی منظور تھا۔'' اسد نے اس کے دکھ کو کم کرنے کی خاطر دھیمی آواز میں کہا۔ ''ہو سکے تو اب آ جاؤ۔''

''جی ضرور۔'' سرمد جلدی سے بولے۔ ''میں ابھی اماں بی اور ابا جان کو بتاتا ہوں۔ اور اس کے فوراً بعد روانہ ہوتا ہوں۔''

فون رکھ کر وہ تیزی سے عاتکہ بیگم کے کمرے کی طرف گئے تھے۔ کمرے میں عاتکہ بیگم کے ساتھ نگو کے علاوہ نمرہ بھی موجود تھی۔ نمرہ کو دیکھ کر وہ لحظہ بھر کو ہچکچائے تھے، پھر تیزی سے بولتے چلے گئے تھے۔

''اماں بی! ایک افسوس ناک خبر ہے۔''

''خیر تو ہے بیٹا؟'' عاتکہ بیگم نے چونک کر ان کا پریشان چہرہ دیکھا تھا۔ ''ایسی کون سی خبر ہے کہ تم اس قدر ہراساں دکھائی دے رہے ہو؟''

''جی.....'' سرمد نے افسوس بھرے انداز میں سر جھکا۔ ''کل صبح نو بجے ندرت خالہ کا انتقال ہو گیا۔ ہم لوگوں کے فون بند تھے اس لئے ہمیں خبر نہ مل سکی۔''

''کیا.....؟'' عاتکہ بیگم ایک دم سے گھبرا کر بولیں۔ ''کیا کہہ رہے ہو سرمد؟''

''جی اماں بی! خالہ جان اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔'' سرمد کی آواز رندھ سی گئی تھی۔

''کب؟.....کیسے؟......یہ سب اس طرح اچانک کیسے ہو گیا؟''

''ابھی اسد بھائی کا فون آیا تھا۔ انہوں نے تفصیل تو کچھ نہیں بتائی، کہہ رہے تھے......بس اچانک ہی یہ سب ہو گیا۔ دو دن کے بخار میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئیں۔''

''انا للہ.....'' عاتکہ بیگم نے آنکھیں بند کر کے کرب بھرے لہجے میں کہا۔ اُن کی بند آنکھوں کے سامنے ندرت جہاں کا حسد اور کدورت میں ڈوبا چہرہ گھوم گیا تھا۔ ان کے دل میں وجاہت مرزا، وجاہت منزل اور خود عاتکہ بیگم کے لئے کتنی شدید نفرت تھی......انہوں نے ہر ہر قدم پہ وجاہت مرزا اور سطوت جہاں کی ازدواجی زندگی کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی اور اپنی اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب بھی رہیں۔ لیکن کبھی بھی اپنا اصل مقصد حاصل نہ کر سکیں۔ مگر حسد اور نفرت کی اس آگ میں سلگتے کبھی بھی نہ وہ خود خوش رہ سکیں اور نہ ہی انہوں نے کسی اور کو خوش رہنے دیا تھا......مگر اب وہ اس دنیا میں نہیں تھیں۔ ثروت اور فروا کو روتا بلکتا چھوڑ کر ملکِ عدم کو سدھار گئی تھیں......تو عاتکہ بیگم کو اپنے دل میں ان کے لئے ایک دکھ کا احساس جاگتا محسوس ہو رہا تھا۔''

''مجھے اسد بھائی نے بلایا ہے۔'' عاتکہ بیگم کو یوں اُداسی اور افسردگی میں گم دیکھ کر سرمد نے ہلکا سا کھنکھار کر دھیمی آواز میں کہا تھا۔ ''گو کہ تدفین تو کل شام ہی کو ہو چکی......مگر آج سوئم ہے......آپ اجازت دیں تو......''

''ہاں کیوں نہیں؟'' عاتکہ بیگم جلدی سے بولی تھیں۔ ''دونوں بچیاں اکیلی رہ گئیں......خود میرا بھی دل چاہ رہا ہے کہ پُرسے کے لئے میں بھی چلوں۔''

''آپ.....؟'' سرمد جز بز ہو کر بولے۔ ''ہو سکتا ہے ابا جان یہ بات پسند نہ کریں۔''

''نہیں۔اب ایسا بھی نہیں ہے۔'' نمرہ نے دھیمی آواز میں گفتگو میں حصہ لیا۔ وہ اتنے عرصے سے یہاں تھی۔ خود عاتکہ بیگم نے اسے اس گھر کے ایک ایک المیے سے آگاہ کیا تھا۔ تب سے نمرہ نے فیصلہ کرلیا تھا کہ جلد یا بدیر وہ وجاہت مرزا کو اپنے بڑے بیٹے اور بڑی بہو ثروت سے ملنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے گی۔

''اماں بی! ابا جان اتنی بے تحاشا محبت کرنے والے باپ ہیں۔ مجھ اجنبی اور غیر لڑکی سے وہ اتنی محبت کرتے ہیں تو سوچئے اسد بھائی سے نہیں کرتے ہوں گے؟''

''کیوں نہیں کرتے۔'' اماں بی نے کرب بھرے لہجے میں کہا۔ ''مگر اس غضب کے ضدی ہیں کہ اپنی ضد چھوڑنے کو تیار نہیں۔''

''تو کیا اسد بھائی خود سے پیش رفت نہیں کر سکتے؟'' نمرہ نے پوچھا تھا۔

''میں بلاؤں تو وہ سو بار آئے۔'' اماں بی کی پلکوں پہ نمی اُتر آئی تھی۔ ''پر کیا کروں بٹیا! خود مجھے بھی اس بات سے ڈر لگتا ہے کہ اسے دیکھ کر کہیں پھر سے وجیہ میاں کی طبیعت خراب ہوگئی تو......''

''نہیں اماں بی!......اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' نمرہ نے عاتکہ بیگم کے شانے پر پیار بھرے انداز میں ہاتھ رکھ کر حوصلہ دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''اب اِن شاء اللہ ابا جان، دن بہ دن بہتر ہی ہوتے جائیں گے۔ اب کبھی ان کی پہلے جیسی حالت نہیں ہوگی۔ اور مجھے یقین ہے کہ اسد بھائی سے مل کر، انہیں اپنے سامنے دیکھ کر ابا جان بے حد خوش ہوں گے۔''

اس طرح کے مکالمے اکثر نمرہ اور عاتکہ بیگم کے مابین چلتے رہتے تھے۔ نمرہ، وجاہت مرزا کا موڈ دیکھ کر کبھی کبھی ان کے سامنے بھی اسد کا ذکر چھیڑ دیتی تھی۔ سرمد اُس کی ان کوششوں سے بے حد مطمئن اور خوش تھے۔ وہ خود بھی تو یہی چاہتے تھے کہ جلد وہ دن آجائے جب اسد اپنی شریکِ حیات، ثروت کے ساتھ اس گھر میں واپس لوٹ آئیں۔ ان کے آنے کے بعد ہی یہ گھرانہ مکمل ہوسکتا تھا۔

اس وقت ندرت جہاں کی موت کی خبر سن کر نمرہ کو دلی دکھ ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی، ثروت اور فروا کا اماں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اور اس افسوس ناک موقع پر اس کی خواہش تھی کہ عاتکہ بیگم ہی نہیں، خود وجاہت مرزا بھی ثروت اور فروا سے تعزیت کرنے جائیں۔ کچھ بھی تھا، مگر یہ حقیقت تھی کہ ثروت اور فروا کے بزرگوں میں اب وجاہت مرزا اور عاتکہ بیگم ہی رہ گئے تھے۔

''آپ اجازت دیں تو اس سلسلے میں، میں خود ابا جان سے بات کروں؟'' نمرہ نے قدرے ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں پہلے عاتکہ بیگم، پھر سرمد کی طرف دیکھا۔

''تم بات کروگی تو مجھے امید ہے کہ اچھا ہی نتیجہ نکلے گا۔'' عاتکہ بیگم پُر اُمید لہجے میں بولیں۔ ''مگر بٹیا! پھر بھی خیال سے بات کرنا۔ پہلے وہ ندرت جہاں اور ثروت کا ذکر سنتے ہی آگ بگولا ہو جاتے تھے......اسی لئے ہم لوگوں نے ان کے سامنے یہ نام لینے ہی چھوڑ دیئے تھے......اور اگر آج......تم......''

''آپ بے فکر رہیے۔'' نمرہ نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''اب ندرت جہاں اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اور ابا جان یقیناً یہ بات جانتے ہیں کہ جو اس جہاں سے گزر گیا، اُس کا اس جہاں والوں سے ہر معاملہ ختم ہوگیا۔ اب اس کا اور اوپر والے کا معاملہ ہے......اسی لئے کہتے ہیں کہ ہم اہلِ زمین کو زیرِ زمین لوگوں کی ہر خطا معاف کر دینی چاہیے۔''

نمرہ نے جب وجاہت مرزا کو ندرت جہاں کے انتقال کی خبر دی تھی تو لحظہ بھر کو وہ بھی بھونچکا رہ گئے تھے۔ کتنی ہی دیر ان کی آنکھوں کے سامنے ندرت جہاں کا سفاک چہرہ اور ان کی کی گئی سفاکیاں لرزتی رہی تھیں۔ مگر چند لمحوں بعد ان کے چہرے کا تناؤ ایک دم سے ختم ہوگیا تھا۔

''خدا اُن کی مغفرت کرے.....تدفین کب ہے؟'' انہوں نے افسردہ انداز میں پوچھا تھا۔
''تدفین تو کل رات ہی کو ہوگئی تھی۔'' نمرہ نے بتایا۔ ''ہم سب کے فون بند تھے، اس لئے کوئی رابطہ نہ ہوسکا.....
آج سوئم ہے.....سرمد صاحب جانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ اور.....اماں بی بھی.....''
نمرہ جملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی گھبرا کر چپ ہوگئی تھی۔ وجاہت مرزا کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا تھا۔
انہوں نے کرب بھرے انداز میں آنکھیں بند کر لی تھیں اور ایک آنسو اُن کی بند آنکھ کے کونے سے نکل کر اُن کے بالوں میں جذب ہوگیا تھا۔ کئی لمحوں بعد انہوں نے آنکھیں کھول کر کہا تھا۔
''تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہمیں بھی ضرور جانا چاہئے۔''
اور جب سرمد وجاہت مرزا اور عاتکہ بیگم کے ساتھ ندرت جہاں کے ڈھائی کمروں کے فلیٹ پر پہنچے تو سب ہی ان سب کو وہاں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ سرمد کے لئے بھی دانیال کی صورت میں سرپرائز موجود تھا۔
اسد نے فون پر خاص طور پر دانیال کے بارے میں ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ سرمد کو سرپرائز دینا چاہتے تھے۔
''دانیال.....؟'' سرمد واقعی انہیں اپنے سامنے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ ''یہ تم ہی ہو نا دانیال؟''
''جی جناب!'' دانیال خفت سے مسکرا کر ان کے گلے لگ گئے تھے۔
ثروت، اماں بی کے گلے سے لگی سسکیاں لے رہی تھی۔ جبکہ فروا کچن کے دروازے میں کھڑی دکھ بھری نظروں سے سب کو دیکھ رہی تھی۔
'یہ سب لوگ اگر امی کی زندگی میں اس طرح یہاں آ جاتے تو.....وہ کس قدر خوش ہوتیں.....مگر اب ان کا آنا..... کیا معنی رکھتا ہے؟'
اسے سرمد کو بھی دیکھ کر مطلق خوشی نہیں ہوئی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ کل جنازے پہ نہ پہنچنے کی وجہ اُن کا بند موبائل تھا۔ سرمد کو خبر ملتی تو ایسا نہیں تھا کہ وہ دوڑ کر نہ آتے۔ پھر بھی جانے کیوں فروا کے دل میں ایک دراڑ سی پڑ گئی تھی۔ ایک عجب سا فاصلہ پیدا ہوگیا تھا.....جو آپ کے دُکھ میں آپ کا ساتھ نہ دے سکے، وہ بھلا آپ کے لئے کس طرح خوشیاں فراہم کرسکتا ہے؟
عاتکہ بیگم کا اصرار تھا کہ اسد اور ثروت فوراً ہی ان کے ساتھ ''وجاہت منزل'' چلیں۔ مگر ثروت کی خواہش پہ دو چار دن اور اسی فلیٹ پہ ان لوگوں کا ٹھہرنا منظور کرلیا گیا تھا۔
''مگر پھر.....فروا کا مسئلہ ہوگا۔'' اسد نے کچھ سوچ کر ہچکچاتے لہجے میں کہا تھا۔ ''خالہ جان کے بعد وہ بالکل اکیلی ہو گئی ہیں.....اگر ہم لوگ وجاہت منزل چلے جائیں گے تو.....پھر فروا.....وہ تو بالکل تنہا ہے.....اور بھلا اکیلی لڑکی کس طرح رہ سکے گی۔''
''بھلا وہ اکیلی کیوں رہے گی؟'' وجاہت مرزا نے عاتکہ بیگم کے کہنے سے پہلے ہی دوٹوک لہجے میں کہا تھا۔ ''جہاں تم لوگ رہو گے، وہ بھی وہیں رہے گی۔ اتنی بڑی ''وجاہت منزل'' میں کیا اس کے لئے جگہ نہیں ہوگی؟''
کوئی اور وقت ہوتا تو شاید فروا یہ سن کر نہال ہو اُٹھتی۔ مگر اس پل وجاہت مرزا کی یہ بات سن کر خوش ہونے کے بجائے اسے رنج ہوا تھا۔ وجاہت منزل اس کی ماں کی زندگی کی قیمت پر اس کی منزل بننے جا رہی تھی تو اسے یہ منزل قبول نہیں تھی۔
''میرا وہاں جانے کو بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا۔'' فروا نے سب کے جانے کے بعد ثروت سے کہا تھا۔ ''آپ لوگوں کو وہاں جانا ہے تو شوق سے جائیے۔ آپ کا ان سے رشتہ ہے۔ میرا ان سے کیا تعلق؟.....سب یہیں ہیں۔ اسی

فلیٹ میں رہ لوں گی۔ یہاں ہر طرف امی کی یادیں بکھری ہوئی ہیں...... میں انہی یادوں کے سہارے زندگی گزار لوں گی۔''
''ابھی تو ہم بھی یہیں ہیں۔'' ثروت نے سرسری سے لہجے میں کہا تھا۔ ''ہفتہ دس دن بعد دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔''
سرمد، دانیال کو یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیرت بھری مسرت سے دوچار ہوئے تھے۔ ندرت جہاں کے سوئم کے فاتحہ کے بعد اسد سے اجازت لے کر سرمد، دانیال کو اپنے ساتھ ''وجاہت منزل'' لے آئے تھے۔
''واؤ.....'' دانیال ''وجاہت منزل'' کی شاندار اور پُرشکوہ عمارت دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ ''یار! کیا شاندار کوٹھی ہے۔ اور عمارت کے چاروں طرف پھیلے یہ مرغزار..... یقین کرو، ایسا خوب صورت گھر میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھا۔''
''چند مہینے پہلے دیکھتے تو شاید یہ تمہیں اس قدر خوب صورت نہ لگتا۔'' سرمد نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں باور کروایا۔ ''یہ سب کچھ اسی خاتون کے کرشمہ ساز ہاتھوں کا ہنر ہے۔''
''اوہ ہاں.....'' دانیال کو ایک دم یاد آیا۔ ''کہاں ہیں وہ حُسنِ کرشمہ ساز کی مالک..... آپ کی نمرہ بیگم.....؟''
سرمد سٹپٹا کر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ سامنے سے نگو کو آتے دیکھ کر چپ ہوگئے۔ دانیال کو ساتھ لئے وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے تھے۔
کچھ ہی دیر میں اکبر کافی اور ناشتے سے سجی ٹرالی لئے آ موجود ہوا تھا۔ ایک ایک چیز سے نمرہ کی خوش سلیقگی اور خدمت شعاری کا اظہار ہو رہا تھا۔
عاتکہ بیگم اپنے کمرے میں جا چکی تھیں اور وجاہت مرزا اپنے بیڈ پر لیٹے ندرت جہاں کی اس اچانک موت کے بارے میں سوچے جا رہے تھے۔ آج کتنے ہی عرصے بعد انہوں نے اسد کو دیکھا تھا..... روتی بلکتی ثروت پہ بھی انہیں ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔ اور اس پل بستر پہ لیٹے وہ سوچ رہے تھے کہ بھلا اتنا عرصہ وہ اپنے چہیتے بیٹے اور اس کی چہیتی بیوی سے دُور کیوں رہے؟..... اپنی پسند کی شادی کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے۔ اور اگر یہ کوئی جرم ہے تو وہ خود بھی تو اس جرم کے مرتکب ہوئے تھے۔ تب کیا اماں بی نے ان کے لئے اس گھر کے دروازے بند کئے تھے؟..... کس پیار اور اپنائیت سے انہوں نے سطوت جہاں کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ اور سب کچھ ان کے حوالے کر دیا تھا۔
کافی پینے کے دوران وہ دونوں ندرت جہاں کے بارے میں بھی گفتگو کرتے رہے تھے۔ ان دونوں کو ہی ان کی یوں اچانک موت پہ بے حد رنج تھا۔
''میری ان سے اکثر فون پہ بات ہوتی رہتی تھی۔'' دانیال کہہ رہے تھے۔ ''انہیں فروا کی شادی کی بہت فکر تھی۔ کاش یہ کام ان کے سامنے ہی ہو جاتا۔''
آج کتنے ہی عرصے بعد سرمد نے فروا کو دیکھا تھا۔ وہ آج ہمیشہ والی فروا سے بالکل جدا، ایک بالکل نئی سی فروا لگ رہی تھی..... دُکھی، رنجیدہ اور افسردہ سی یہ فروا، اُس شوخ، چنچل اور باتونی فروا سے کس قدر مختلف تھی، جسے پہلے پہل دیکھ کر وہ حیران ہوئے تھے۔ پھر دھیرے دھیرے اس کی باتوں کے سحر میں گھرتے چلے گئے تھے۔ مگر پھر وجاہت مرزا کی بیماری اور حالات کی ستم ظریفی نے انہیں اس سے ایک دم دُور کر دیا تھا۔ مگر آج اسے اُداس اور تنہا دیکھ کر وہ ایک بار پھر اُس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ مگر یہ سوچ پہلی سوچ سے یکسر مختلف تھی۔
عاتکہ بیگم کے کمرے میں نگو بھی فروا ہی کی بات کر رہی تھی۔
''ابا جان نے اسد بھائی اور ثروت بھابی کے ساتھ، فروا کو اس گھر میں آنے کی دعوت دے تو دی ہے..... مگر آپ نے سوچا..... اب ان سے سرمد بھیا کو بچانا کتنا مشکل ہوگا؟''
''کس کو بچانے کی بات ہو رہی ہے؟'' نمرہ کافی کی ٹرے لئے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ عاتکہ بیگم نے نمرہ کو

ماضی کی ایک ایک بات بتا دی تھی۔ مگر جانے کیسا اتفاق تھا کہ کبھی فروا کا ذکر اس انداز سے نہیں آیا تھا۔ سرمد کی ذات میں فروا کی بے پناہ دلچسپی پہ خود عاتکہ بیگم کو بھی اتنا زیادہ یقین نہیں تھا۔ شاید اسی لئے یہ بات کبھی انہوں نے نمرہ سے نہیں کی تھی۔

''سرمد بھیا کو..... فروا بیگم سے.....'' نگو نے جلے دل سے جواب دیا تھا۔

''کیا مطلب؟'' نمرہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے معصومیت سے سوال کیا۔ ''یہ فروا تو ثروت بھابی کی چھوٹی بہن ہے نا؟''

''ہاں۔ اور اب وہ اسی گھر میں رہنے کے لئے آ رہی ہیں۔'' نگو کے لہجے سے طنز خاصا نمایاں تھا۔ ''اب دیکھئے، وہ یہاں آ کر کیا گل کھلاتی ہیں۔''

''کیوں..... ایسی بھی کیا بات ہے؟'' نمرہ کے لہجے کی حیرت برقرار تھی۔

''بس یہی تو خطرناک بات ہے۔'' نگو ہاتھ نچا کر بولی۔ ''آپ کو شاید کبھی بتایا نہیں گیا کہ یہ فروا بیگم ہمارے سرمد بھیا کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑی تھیں۔ وہ تو سرمد بھیا نے ہی جانا آنا کم کر دیا تھا تو خیر ہوئی تھی..... ورنہ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ سرمد بھیا کا پیچھا چھوڑ دیں۔ اب تو اللہ انہیں موقع دے رہا ہے..... اسی گھر میں آ کر رہیں گی تو سرمد بھیا کو پوری طرح اپنے جال میں پھنسا کر دم لیں گی۔''

نمرہ کے ہاتھ میں تھمی کافی کی ٹرے لرز کر رہ گئی تھی۔

سرمد ایک ہینڈسم اور وجیہہ نوجوان تھے۔ کتنی ہی لڑکیاں اُن پہ مرتی ہوں گی۔ مگر کوئی لڑکی یوں اُن کی چاہت کا دم بھرتی ہو گی؟..... نمرہ کے لئے یہ خبر اندوہناک تھی۔ اُسے اپنے سینے میں کوئی چیز چھن سے ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اپنی اس کیفیت پہ وہ حیران بھی تھی اور افسردہ بھی۔ بھلا سرمد سے اس کا رشتہ ہی کیا تھا؟ اور کوئی رشتہ بن سکتا، اس بات کا بھی امکان نہیں تھا۔ یہ سچ تھا کہ بن چاہے بہت سے انوکھے خواب اُس کی پلکوں پہ سج گئے تھے۔ بہت سی اُمیدیں آپ سے آپ بندھ گئی تھیں..... ورنہ تو حقیقت یہ تھی کہ نمرہ اپنی قسمت سے واقف تھی۔ اور اپنی قسمت کے لکھے پہ شاکر تھی۔ وہ تو بس اتنا چاہتی تھی کہ یہ خوب صورت گھر، وجاہت منزل اور اس خوب صورت گھر کے مکین وجاہت مرزا، اماں بی اور سرمد ہمیشہ خوش رہیں اور یہ گھر ہمیشہ آباد و شاداب رہے۔ ابا جان کی ادھوری خوشی کی تکمیل کی خاطر ہی وہ اسد اور ثروت کی بھی اس گھر میں واپسی کی متمنی تھی کیونکہ ندرت جہاں کے انتقال کے بعد اب فروا تنہا رہ گئی تھی۔ اور ظاہر ہے اس کی بہن اور بہنوئی کے سوا اس کا کوئی قریبی رشتے دار نہ تھا۔ اس لئے اگر اسد اور ثروت اس گھر میں آتے تو وہ فروا کو بھی اپنے ساتھ لے کر آتے۔ اور نگو کو ڈر تھا کہ فروا اس گھر میں آئی تو سرمد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی زلفِ گرہ گیر میں اُلجھا لے گی۔

''آپ نے دیکھا اماں بی!'' نگو نے ہلتے ہوئے پردے کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی اور رازداری سے عاتکہ بیگم سے کہا۔ ''فروا اور سرمد بھائی کی بات سن کر نمرہ آپی کے ہاتھ لرز اُٹھے تھے۔ ٹرے گرتے گرتے بچی۔ اور وہ کیسے خاموشی اور افسردگی سے کمرے سے چلی گئیں..... سچ کہتی ہوں، نمرہ آپی کے دل میں بھی کہیں نہ کہیں سرمد بھائی کے لئے نرم گوشہ ہے۔''

''ہم تو خود یہی چاہتے تھے نگو!'' عاتکہ بیگم نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''مگر شاید تقدیر کو یہ منظور نہیں میں اب سرمد کی مرضی کے خلاف سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ اگر سرمد کو فروا پسند ہے تو وہی سہی۔ میں وجاہت میاں کو بھی سمجھا لوں گی۔ اب مجھے اُمید ہے، وہ بھی مزاحمت نہیں کریں گے۔''

دروازے کے اس پار کھڑی نمرہ کی پلکوں پر آپ سے آپ نمی اُتر آئی تھی۔ وہ آہستگی سے چلتی ٹیرس کی گرل کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی۔

سرمئی شام سج سج قدم دھرتی، دھرتی پہ اُتر رہی تھی۔ شام کے سرمئی سائے گہری تاریکی بن کر نمرہ کو اپنے دل میں اُترتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ آہستگی سے چلتی کچن میں چلی آئی تھی۔ سرمد کے دیرینہ دوست دانیال آئے تھے، اسی لئے آج ڈنر پہ خصوصی اہتمام ضروری تھا۔

رات کھانے کی میز پر وجاہت مرزا بھی موجود تھے۔ دانیال نے اب تک نمرہ کو نہیں دیکھا تھا۔ ان کی منتظر نگاہیں کچن کے دروازے کی طرف لگی تھیں۔

''بھئی ہماری بٹیا کہاں ہے؟......زلیخا! نمرہ کو بلاؤ بھئی۔''

کھانا شروع کرنے سے پہلے وجاہت مرزا نے ملازمہ کو مخاطب کر کے حکم دیا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے نگاہیں جھکائے آہستگی سے قدم دھرتی نمرہ ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی تھی۔ سرمئی لباس میں اس کا صبیح چہرہ بادلوں میں چودھویں کے چاند کا منظر پیش کر رہا تھا۔ دانیال، سرمد کے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ نمرہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ اس کے آتے ہی دانیال کو لگا تھا کہ کمرے کی روشنی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے۔

''یہاں آ کر بیٹھو، میرے سامنے۔'' وجاہت مرزا نے اپنے سامنے خالی کرسی کی طرف اشارہ کر کے اسے بیٹھنے کا حکم دیا اور وہ خاموشی سے دبک کر بیٹھ گئی تھی۔

''نمرہ! ان سے ملو۔ یہ ہیں ڈاکٹر دانیال۔ لندن سے آئے ہیں۔'' عاتکہ بیگم نے تعارف کروانے کی ذمہ داری نبھائی۔ ''آفاق میاں کے بھانجوں ظفریاب اور اظفر میاں کے بھی اچھے دوست ہیں۔''

نمرہ نے ظفریاب اور اظفر کے نام پہ چونک کر نگاہیں اٹھائی تھیں۔ بڑی بڑی سیاہ ساحر آنکھیں جن میں خمار بھی تھا، ملال بھی تھا اور سوال بھی تھا......

''فریحہ آپی اور فریال کو بھی آپ جانتے ہیں۔''

ایک لمحے کو تو دانیال اُس کی مسحور کن آنکھوں کے سحر میں ڈوب سے گئے تھے۔ پھر وہ خود کو سنبھال کے بولے تھے۔

''جی یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میرا ظفریاب بھائی اور اظفر کے گھر میں بھی آنا جانا ہے۔ فریحہ بھابی، ظفریاب بھائی، ان کا اڈوپٹڈ بیٹا تابی......میں سب ہی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''تابی کیسا ہے؟'' اس کے دل میں مچلتا سوال عاتکہ بیگم کے لبوں پہ آ گیا تھا۔ ''ٹھیک تو ہے نا؟......فریحہ کے ساتھ مانوس تو ہو گیا ہے نا؟''

''جی۔'' دانیال نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہ بہت ہی پیارا اور اچھا بچہ ہے۔ لگتا ہی نہیں کہ ان کا اپنا بچہ نہیں ہے۔ سب سے بے حد گھل مل گیا ہے۔ فریحہ بھابی تو اسے دیکھ کر جیتی ہیں۔ اور ظفریاب بھائی، جو پہلے کبھی برسوں میں چھٹی نہیں کرتے تھے، اب روز چھٹی کر کے تابی کے ساتھ وقت گزار رہے ہوتے ہیں۔''

نمرہ نے پھر کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ تابی کے وہاں فریحہ اور ظفریاب کے پاس گھل مل کے، خوش باش رہنے پہ اس کا دل خوش ہونے کے بجائے ملول ہو گیا تھا۔ عجب سے اکیلے پن کے احساس نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

کھانے کے بعد دانیال واپس اسد کے گھر چلے گئے تھے۔

وقت آہستہ روی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

وجاہت مرزا کو جب نکیتا کے اسلام قبول کر لینے کی خواہش کا پتہ چلا تھا تو وہ بہت خوش ہوئے تھے۔

''بھئی نیک کام میں دیر کیسی؟'' انہوں نے مسرور لہجے میں کہا تھا اور بذاتِ خود اُسے کلمہ شہادت پڑھا کر دائرۂ اسلام میں لے آئے تھے۔ نمرہ کی خواہش پہ اس کا اسلامی نام نگینہ بانو رکھ دیا گیا تھا۔ تب ہی اس مبارک تبدیلی پہ خوش تھے۔

نگینہ عرف نگو کو اسلامی تعلیمات اور عبادت کا طریقہ سکھانے کا ذمہ نمرہ نے لیا تھا۔ اور اب تک اسے وضو کر کے نماز پڑھنا اور نماز میں پڑھی جانے والی تمام سورتیں وغیرہ اسے سکھا چکی تھی۔ اور اب قرآنِ کریم پڑھانے کا ارادہ کر رہی تھی۔

''نمرہ! کیوں نہ نگو کو قرآن پاک پڑھانے کے لئے کسی استانی جی کا انتظام کر لیا جائے؟'' عاتکہ بیگم نے رائے دی تھی۔

''جیسا آپ پسند کریں۔'' نمرہ نے حسبِ عادت سعادت مندی سے سر جھکا کر کہا تھا ''ورنہ تو میری آرزو ہے کہ نگو کو میں خود ناظرہ پڑھاؤں۔''

''چلو اگر تمہاری آرزو یہی ہے تو تم ہی یہ مبارک کام کرو۔'' عاتکہ بیگم نے مسکرا کر ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

نگو کے مسلمان ہو جانے کی خبر جب پروفیسر آفاق اور غفور کو ملی تو وہ دونوں بھی بے حد خوش ہوئے تھے۔ اور آفاق صاحب، نگینہ کے لئے ایک خوب صورت سوٹ اور مٹھائی کا ڈبہ لے کے آئے تھے۔

ندرت جہاں کے دسویں کے بعد وجاہت مرزا نے ایک بار پھر اسد اور ثروت سے گھر لوٹ آنے کی استدعا کی تھی۔ اسد بھی جلد از جلد اپنے گھر لوٹ آنا چاہتے تھے۔ مگر فروا اُس وجاہت منزل میں جانے سے گریزاں تھی جس کے دروازے اس کی ماں کے لئے بند کر دیئے گئے تھے۔

''ابا جان! ثروت کی خواہش ہے کہ پہلے کہیں فروا کا رشتہ طے ہو جائے۔''

اسد کی بات سن کر وجاہت مرزا سوچ میں گم ہو گئے تھے۔ سرمد پہلے بھی ندرت جہاں کے گھر جانے کے لئے بہت بے چین رہتے تھے۔ اور اب جب سے دانیال آئے تھے تو اب تو ان کا بہانہ بنا کر وہ اکثر آفس سے سیدھے اسد کی طرف ہی چلے جاتے تھے۔ ایک آدھ دن کے وقفے سے دانیال بھی یہاں آتے رہتے تھے۔

مگر دانیال جب ''وجاہت منزل'' آتے تھے تو ان کی تمام تر توجہ نمرہ کی طرف دیکھ کر سرمد عجب مخمصے اور پریشانی کا شکار ہو جاتے تھے۔ آنکھوں میں حیرت اور پسندیدگی لئے دانیال جب نمرہ کی طرف تکتے تھے تو سرمد کے دل میں عجب غصہ بھرا حسد جاگنے لگتا تھا۔ وہ اپنی اس کیفیت پہ خود بھی حیران ہوتے تھے۔ وہ کبھی بھی ایسے نہیں تھے۔ مگر جانے کیوں اب وہ دن بہ دن حاسد اور غصیلے ہوتے جا رہے تھے۔

اُس شام نگینہ، عاتکہ بیگم کے پاس بیٹھی کچھ سورتیں یاد کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی تھی۔ عاتکہ بیگم نے ہاتھ بڑھا کر فون اٹھا لیا تھا۔ دوسری طرف پروفیسر آفاق تھے۔

''اماں بی! آپ کو ایک خوشخبری سنانی ہے...... نمرہ کا ویزہ لگ گیا ہے۔'' سلام کے بعد پروفیسر آفاق پُر جوش لہجے میں بتا رہے تھے۔ ''اب آپ سے بس یہ گزارش کرنی تھی کہ اسے واپس گھر آنے کی اجازت دے دیجئے۔ تاکہ وہ وہاں جانے کی کچھ تیاری وغیرہ کر سکے۔''

''ہاں آفاق میاں!'' عاتکہ بیگم نے تھکن سے چُور انداز میں آہ بھری۔ ''ہم روکنا بھی چاہیں تو اُسے نہیں روک سکتے۔ جب چاہو آ کر لے جاؤ۔''

عاتکہ بیگم نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا تھا۔

''پروفیسر انکل کا فون تھا؟'' نگو سر پر دوپٹہ لپیٹے آنکھوں میں حیرت لئے عاتکہ بیگم سے پوچھ رہی تھی۔ ''کیا وہ نمرہ آپی کو واپس لے جانے کی بات کر رہے تھے؟''

''ہاں بٹیا!'' عاتکہ بیگم نے پھر یاس بھرا سانس لیا۔ ''وہ آخر ہمارے ساتھ کب تک رہے گی؟...... اس کا لندن کا ویزا لگ گیا ہے۔ اچھا ہے، اپنے بچے سے جا کر ملے...... یہاں رہ کر اسے بھلا کیا ملے گا؟''

نگو کا دل ایک دم سے اُداس ہو گیا تھا۔ سپارہ اس نے اپنی جگہ پر رکھ دیا تھا اور شکستہ سے انداز میں کمرے سے باہر آ گئی تھی۔ نمرہ کچن میں تھی اور سرمد اپنے کمرے میں..... وہ آہستگی سے سرمد کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

سرمد کمرے میں نہیں تھے۔ اکبر ان کے جوتوں پہ پالش کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے دانت نکوسے۔

''نگینہ بی بی! اب تم بھی مسلمان ہو گئی ہو...... اللہ نے بڑا کرم کیا تم پہ..... اب تو سپارہ بھی پڑھنا سیکھ رہی ہو...... یہ سب نمرہ آپی کی وجہ سے ہوا...... ہے نا؟''

''ہاں۔'' نگو ٹا لنے والے انداز میں بولی۔ ''سرمد بھیا کہاں ہیں؟''

''اُنہیں تو ابھی تھوڑی دیر پہلے بڑے مالک نے بلوایا تھا...... وہیں گئے ہیں۔'' اکبر کے بتانے پر نگو، وجاہت مرزا کے کمرے کی طرف چل دی تھی۔

کل رات ہی وجاہت مرزا کی عاتکہ بیگم سے بات ہوئی تھی۔

''اماں بی! ثروت اور اسد، فروا کی شاد کے خواہش مند ہیں۔''

''اچھی بات ہے۔'' عاتکہ بیگم نے پسندیدگی بھرے انداز میں سر ہلایا۔ ''لڑکیاں وقت پر اپنے گھر بار کی ہو جائیں، یہی اچھا ہے۔ اور اب تو ندرت جہاں بھی دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ بن ماں کی بچی جتنی جلد اپنے گھر کی ہو جائے، بہتر ہے۔''

''آپ کو فروا کیسی لگی؟'' وجاہت مرزا نے معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔ ''مجھے تو اچھی، خوش شکل اور قاعدے کی لڑکی محسوس ہوئی۔''

''ہاں۔ ایسا ہی ہے۔'' عاتکہ بیگم مسکرائیں۔ ''کیا تم بھی وہی سوچ رہے ہو، جو میں نے سوچا ہے؟''

''جی اماں بی!'' وجاہت مرزا بھی کرب بھرے انداز میں مسکرائے۔ ''ہم نے سوچا تو کچھ اور تھا..... مگر اب ہم اپنے بچوں پر اپنی سوچ مسلط کر کے انہیں بے آرام نہیں کرنا چاہتے۔ اب ہم نے سوچا ہے، وہی کریں گے جو ہمارے بچے چاہیں گے۔''

عاتکہ بیگم کی منظوری پا کر اب وہ سرمد سے بات کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

''سرمد! ثروت اور اسد اس گھر میں آنے سے قبل فروا کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔'' انہوں نے کچھ دیر خاموشی سے سرمد کا چہرہ دیکھنے کے بعد دھیمی آواز میں کہا تھا۔ ''فروا اچھی لڑکی ہے...... اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

ایک وقت تھا جب سرمد اس موضوع پر اماں بی اور وجاہت مرزا سے خود بات کرنے کے متمنی تھے۔ اور آج گردشِ وقت انہیں جب اس مقام پہ لے آئی تھی کہ خود وجاہت مرزا ان سے فروا کے بارے میں ان کی مرضی معلوم کر رہے تھے تو وہ بری طرح سٹپٹا اُٹھے تھے۔

''جی اچھی لڑکی ہے..... مگر......''

''مگر کیا؟'' وجاہت مرزا نے وضاحت چاہی۔

''جی وہ میں ابھی اس سارے معاملے میں پڑنا نہیں چاہتا۔'' باپ سے نگاہیں چراتے ہوئے انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا اور جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

کتنی حیرت کی بات تھی۔ خود تقدیر نے آج انہیں یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ اپنے ابا جان کے سامنے اپنی پسند کا نام لے دیتے مگر جانے اُن کے رگ و پے میں کیسی عجب سی بے کلی گھل گئی تھی شاید وہ دل سے کبھی بھی شادی کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ بچپن سے ہی انہوں نے سوچ رکھا تھا، کسی سے شادی نہیں کریں گے۔ اور اگر کسی وجہ سے شادی کرنی پڑی تو اس سے محبت نہیں کریں گے..... مگر اب انہیں اپنا یہ عہد نبھانا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اجنبی انجان لڑکی، ان کی دل کی دہلیز پر

دیے کی مانند ٹمٹماکر ان کے تاریک دل میں روشنی بکھیرنے پر بضد تھی۔ وہ اُلجھے اُلجھے سے کھڑکی میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ سامنے دُور تک سبز مخملیں گھاس کا فرش ہریالی لٹا رہا تھا اور پھول دار پودوں میں پھول مسکرا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دھول اُڑاتا قطعۂ زمین سبزہ زار اور مرغزار میں تبدیل ہو گیا تھا...... یہ سب نمرہ نے ہی کیا تھا......اُن کے دل کے ویرانے میں بھی اُمید کے گل اور یقین کی کلیاں اُسی نے کھلائی تھیں۔ دانیال کا نمرہ کی طرف رغبت اور محبت سے جھکاؤ ان کے لئے عجب اُلجھن اور پریشانی کا باعث تھا۔ جبکہ وہ دانیال کے سامنے پورے وثوق سے یہ کہہ چکے تھے کہ ان کا نمرہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اور وہ اس کے بارے میں کبھی بھی کچھ بھی سوچ نہیں سکتے...... مگر اس بات کے بعد سے وہ مسلسل نمرہ کے بارے میں سوچ جا رہے تھے۔ ان کے دل میں عجب سی ایک کسک جاگ اُٹھی تھی۔

دروازے پر ہلکی سی دستک پر وہ چونک کر پلٹے تھے۔ ''آ جاؤ۔''

اور اگلے ہی لمحے سر پر قرینے سے دوپٹہ جمائے نگو کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''جانتے ہیں، نمرہ آپی کا لندن کا ویزہ لگ گیا ہے۔''

''اچھا......؟'' سرمد کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ ''کب؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے پروفیسر انکل کا فون آیا تھا۔ وہ نمرہ آپی کو واپس اپنے گھر لے جانے کے لئے اماں بی سے اجازت مانگ رہے تھے۔''

''تو......؟'' سرمد نے جلدی سے پوچھا۔

''تو کیا..... اماں بی بولیں، اب ہم اس طرح اسے کب تک روک سکتے ہیں؟'' نگو نے منہ بنا کر کہا۔ ''اور انہیں اجازت دے دی کہ کل دل کسی بھی وقت آ کر نمرہ آپی کو لے جائیں۔''

سرمد کو اپنے رگ و پے میں تاریکی سی اُترتی محسوس ہوئی تھی۔ دل کی دھڑکنیں ایک دم سے مدھم پڑ گئی تھیں۔ نگو بہت غور سے ان کے چہرے کے تبدیل ہوتے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ شاید وہ کچھ کہیں گے۔ لیکن انہیں مسلسل خاموشی سے باہر کی جانب تکتے دیکھ کر نگو اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر واپسی کے لئے پلٹ گئی تھی۔

اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کس سے بات کرے۔ جب ہی اُسے سامنے سے دانیال آتے دکھائی دیئے تھے۔

''اوہ دانیال بھائی! اچھا ہوا جو آپ آ گئے۔'' اس نے دانیال کو دیکھ کر مسرور سے لہجے میں کہا تھا۔ ''مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''کہو کیا بات ہے؟'' دانیال اس کی پریشانی دیکھ کر اپنی جگہ تھم سے گئے۔

پھر وہ کتنی ہی دیر پلکیں جھپک جھپک کر اور ہاتھ جھٹک جھٹک کر دانیال سے باتیں کرتی رہی تھی۔

''اب دانیال بھیا! آپ ہی کو کچھ کرنا ہوگا...... وہ تو بس یونہی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے۔''

''تم فکر مت کرو۔'' دانیال نے اسے تسلی دی۔ ''دیکھو، میں کچھ کرتا ہوں۔'' پھر وہ سرمد کے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔

رات کھانے کی میز پر وہ سارا وقت نمرہ کی طرف متوجہ رہے تھے۔ اور سرمد اپنے دل میں عجب سی کُڑھن اور چبھن محسوس کرتے رہے تھے۔ کھانے کے بعد دانیال، سرمد کے ساتھ ان کی اسٹڈی میں چلے آئے تھے۔

''تم ابھی اور کتنے دن یہاں ہو؟'' سرمد نے پوچھا تھا۔

''بس یار! ایک ضروری کام آ پڑا ہے۔اس کے نمٹتے ہی روانہ ہو جاؤں گا۔'' دانیال معنی خیز انداز میں مسکرائے۔
''کون سا کام؟'' سرمد نے چونک کر سوال کیا۔
''امی جان کی خواہش تھی کہ میں اپنے وطن کی ہی کسی لڑکی سے شادی کروں۔اب جبکہ میں اپنے وطن میں آ ہی گیا ہوں تو سوچا، امی جان کی یہ خواہش بھی پوری کرتا چلوں۔''
''مطلب تم......شادی کا ارادہ کر چکے ہو؟'' سرمد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔
''ارادہ نہیں، میں تو فیصلہ کر چکا ہوں۔'' دانیال کامل یقین سے مسکرائے۔''لڑکی کا انتخاب بھی کر لیا۔اسے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے......صرف تمہاری منظوری کا منتظر ہوں۔''
''میری منظوری کا کیا مطلب؟'' سرمد کو اپنے پورے وجود میں ایک ناتوانی سی دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ہاتھ پاؤں بے جان ہوتے جا رہے تھے۔
''یار! آخر کو تم میرے دوست ہو۔تمہارے مشورے کے بغیر یہ کیسے ممکن ہے؟''
''اگر میں ''نہ'' کہہ دوں تو کیا تم اس لڑکی سے شادی کا فیصلہ واپس لے لو گے؟'' سرمد کے سوال پہ دانیال نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تھا۔
''مگر تم ایسا کیوں کرو گے؟'' دانیال نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔''مجھے پورا یقین ہے کہ تمہیں میرے اس فیصلے پہ کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔'' دانیال نے لحظہ بھر کو رک کر سرمد کا سپید پڑتا چہرہ دیکھا اور پھر دھیمی آواز میں گویا ہوئے۔
''شروع میں میرا خیال تھا کہ شاید تم اسے پسند کرتے ہو۔اور شاید وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے......مگر جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا، یہ دونوں ہی باتیں غلط ہیں۔شاید کسی وقتی جذبے کے تحت تم دونوں کا رجحان ایک دوسرے کی طرف ہوا ہو۔مگر گزرتے وقت نے اسے غلط ثابت کر دیا ہے۔اب نہ تمہارے دل میں اس کے لئے اور نہ اس کے دل میں تمہارے لئے کوئی جذبہ ہے......نہ کوئی رغبت، نہ کوئی تعلق۔''
''تم کس کی بات کر رہے ہو؟'' سرمد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔
''اُسی کی کہ جس سے میں بہت جلد شادی کرنے والا ہوں۔'' دانیال نے پُرعزم لہجے میں کہا۔''اور مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بے حد خوش رہیں گے۔شاید ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے ہی بنے ہیں......اس کا بھی یہی خیال ہے۔''
سرمد آنکھیں پھاڑے دانیال کی طرف تکے جا رہے تھے۔
''اور جانتے ہو وہ کون ہے؟'' دانیال کے سوال پر سرمد کو اپنا دل بند ہوتا اور سانسیں رُکتی محسوس ہوئی تھیں۔
''وہ ہے میری پیاری کزن، فروا......''
''کیا؟'' سرمد اُچھل پڑے۔''یہ سب تم فروا کے لئے کہہ رہے تھے؟''
''تو کیا تم نمرہ کے لئے سمجھ رہے تھے؟'' دانیال شوخی سے مسکرائے۔''بھلا نمرہ کے لئے میں یہ سب باتیں کہنا تو کیا، سوچ بھی کس طرح سکتا ہوں؟......کیونکہ میں جانتا ہوں، وہ تمہاری پسند ہے۔تمہاری ان انکار کرتی آنکھوں میں، میں نے اس کی تصویر دیکھی ہے......تمہارے چہرے کا بدلتا رنگ اس بات کا غماز ہے کہ تم دل کی گہرائیوں سے اس سے محبت کرنے لگے ہو۔''
سرمد نگاہیں جھکائے کسی ایسے مجرم کی طرح خاموش تھے، جسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہو۔

''سرمد! محبت کرنا کوئی جرم نہیں ہے.....اور جب سامنے نمرہ جیسی ہر لحاظ سے اچھی لڑکی موجود ہو تو کوئی اس سے محبت کئے بغیر کس طرح رہ سکتا ہے؟.....وہ ہو بہو ویسی ہے، جیسی اس گھر کو ضرورت ہے.....قدرت نے مہربان ہو کر تمہارے لئے نمرہ جیسی لاکھوں میں ایک لڑکی خود سے تمہارے در پہ بھیج دی ہے۔ اب کفرانِ نعمت مت کرو۔ اپنے دل کی آواز سنو اور آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لو۔ کیونکہ خوش بختی ایک بار ہی دروازے پہ دستک دیتی ہے.....اور اگر دروازہ کھولنے میں پس وپیش دکھایا جائے تو وہ کسی اور دروازے کی طرف چل دیتی ہے۔''

سرمد اسی طرح سر جھکائے کتنے ہی لمحے گہری سوچ میں گم رہے تھے۔ پھر انہوں نے سر اٹھا کے اور نگاہیں ترچھی کر کے دانیال کی طرف دیکھا تھا اور دانیال کے ہونٹوں پر مسرت بھری مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

❀===❀===❀
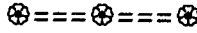
جس خاموش اور رازداری سے آفاق صاحب نمرہ اور عظمت بی کو ''وجاہت منزل'' چھوڑ کر آئے تھے، اسی خاموشی سے وہ نمرہ اور عظمت بی کو گھر واپس لے آئے تھے۔ ان دونوں کے لوٹ آنے سے غفور بہت خوش تھا۔

''آپی! بہت اچھا ہوا جو آپ واپس آ گئیں۔ سچ آپ کے اور عظمت بوا کے نہ ہونے سے گھر ایک دم سے سُونا ہو گیا تھا۔''

''یہ صرف تمہاری محبت ہے غفور! جو تم نے ہم لوگوں کی غیر موجودگی کو محسوس کیا۔'' نمرہ نے کرب بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ''ورنہ تو کسی کے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

وہ کس قدر سہمی ہوئی سی وجاہت منزل گئی تھی۔

نیا گھر، نئے لوگ، نیا ماحول۔ مگر وہ جانتی تھی، اسے وہاں کچھ ہی دن رہنا ہے۔ مگر کچھ اپنے غم کو غلط کرنے کے لئے، کچھ ان لوگوں کی اُداسی دور کرنے کی خاطر اس نے ان لوگوں میں، اس ماحول میں، اس نئے گھر میں خود کو گم کر دینے کی کوشش کی تھی۔ خود کو مصروف رکھنے کی خاطر اُس نے کئی بوجھ اپنے ناتواں کاندھوں پر اُٹھا لئے تھے۔ وہ وجاہت مرزا کی معذوری، اماں بی کی مایوسی اور وجاہت منزل کی ویرانی دُور کرنے کی خواہاں تھی۔ اُس نے اپنی سی کوشش بھی کی تھی اور خداوند کریم نے اسے اس کی کوششوں میں کامیاب بھی کیا تھا۔ مگر ان تمام کاوشوں اور کوششوں کے بیچ سرمد کا تو کہیں بھی نام نہ تھا۔ یا شاید ان تمام کوششوں اور تگ ودو کے پیچھے محض سرمد کو ہی خوش اور مطمئن کرنے کا جذبہ کارفرما تھا۔ وہ آج تک اپنے آپ کو سمجھ نہ پائی تھی۔ روزِ اوّل سے وہ اپنے اور سرمد کے بیچ حائل خلیج سے واقف تھی۔ مگر پھر بھی ہر لمحہ، ہر پل انہی کی جانب کھنچی جاتی تھی۔ جب سے اس نے سنا تھا کہ فروا، سرمد میں انٹرسٹڈ ہے، اسے ایک عجب سی مایوسی نے آ گھیرا تھا اسی دوران آفاق صاحب نے اس کا ویزہ لگنے کی خبر سنائی تھی اور جانے کی تیاری کی غرض سے اسے واپس گھر لے آئے تھے۔ مگر گھر آ کر اسے عجب سے خالی پن کا احساس ہو رہا تھا، جیسے اپنی کوئی قیمتی چیز وہ ''وجاہت منزل'' میں ہی کھو آئی ہو۔ وہ بھی عجیب مقدر لائی تھی۔ جہاں جاتی تھی، اپنے دامن میں ایک نیا دُکھ سمیٹ کے لے آتی تھی۔

آفاق صاحب کے کہنے پر عاتکہ بیگم نے نمرہ کو واپس لے جانے کی اجازت دے تو دی تھی مگر اس کے جانے کے بعد انہیں احساس ہوا تھا جیسے پورا گھر ہی ویران ہو گیا تھا..... ہر شے پر ایک اُداسی اور پژمردگی چھا گئی تھی۔ ہر شخص اپنی جگہ خاموش اور افسردہ سا تھا۔ اکبر، بشیر، زلیخا، مالی اور چوکیداروں سے لے کر نگینہ تک.....منہ لٹکائے پھر رہے تھے..... عاتکہ بیگم کو بھی ایک عجب سے قلق اور زیاں کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی بہت ہی اپنی، بہت ہی قیمتی چیز چھن گئی ہو۔

وجاہت مرزا بھی سر نیہوڑائے بیٹھے تھے۔ نہ انہوں نے توجہ سے ناشتہ کیا تھا، نہ ہی اخباروں کی طرف دیکھا تھا اور نہ ہی صبح کی واک کے لئے لان میں نکلے تھے.....زندگی کی گہما گہمی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

سرمد کی حالت ان سب سے مختلف تھی۔ انہوں نے تو کبھی نمرہ کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔ ہاں، اس کے عمل کو سراہا ضرور تھا..... اس کے شکر گزار بھی ہوئے تھے..... مگر یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ کسی دن وہ یوں اچانک واپس چلی جائے گی..... اور آج وہ جب چلی گئی تھی..... تو اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہر کام اور ہر بات پہ اُس کی کمی آخر کیوں محسوس ہو رہی تھی۔

دانیال نے فروا سے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور فروا نے بھی نہایت حقیقت پسندی سے سرمد کے خواب کو پلکوں سے نوچ کر اپنی آنکھوں میں دانیال کے سپنے سجا لئے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی، اسے سرمد سے نہیں، ان کی دولت اور جاہ و وقار سے محبت تھی۔ وہ اُن کے شاندار وِلا نما گھر میں رہنے کی متمنی تھی۔ مگر اتنے عرصے کی تگ و دو اور کوششوں کے بعد آج بھی اس کے ہاتھ خالی تھے۔ سو اُس نے نہایت دانش مندی سے حالات کا تجزیہ کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ دولت تو آنی جانی شے ہے..... اصل اہمیت محبت کی ہے۔ اور زندگی گزارنے کے لئے دولت سے کہیں زیادہ کسی بہت ہی اچھے اور محبت کرنے والے انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جہاں تک دانیال کا تعلق تھا، وہ سرمد جتنے نہ سہی مگر ان سے کچھ کم بھی نہ تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، وجیہہ و شکیل، با اخلاق و با کردار۔ اور ان سب خوبیوں کے ساتھ ان کے پاس دولت کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ جب ایسی اسم با مسمیٰ ہستی خود دامن پھیلا کر سامنے کھڑی تھی تو اب فروا اتنی بھی بے وقوف نہ تھی کہ اس سچائی کو رد کر کے سرمد کے خواب سے چمٹی رہتی۔ اس نے تو کافی دن پہلے ہی سرمد سے ناطہ توڑ کر کسی اور سے رشتہ جوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب یہ اس کی خوش بختی ہی تھی کہ اس کا رشتہ دانیال جیسے انسان سے جڑ رہا تھا۔ وہ اس نئے رشتے سے بے حد خوش تھی۔

''سرمد کا اب کیا بنے گا؟
وہ اب کس سے ناطہ جوڑیں گے؟..... کسے دُلہن بنا کر لائیں گے؟
کبھی شادی کریں گے بھی یا نہیں کریں گے؟

فروا کو اب ان تمام باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا ہمیشہ سے ہی یہ اصول رہا تھا کہ جس راہ نہیں چلنا، اس کے کوس گننا بے معنی ہے..... سو اس نے سرمد کے نام کو اپنے دل و دماغ کی تختی سے یکسر مٹا کر دانیال کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا تھا۔

دانیال اور فروا کا رشتہ طے ہونے کی خبر نے عاتکہ بیگم کو حیرت زدہ کرنے کے ساتھ بے حد خوش اور مطمئن بھی کر دیا تھا۔ ایک تو اب فروا سے سرمد کا ہمیشہ کے لئے پیچھا چھوٹ گیا تھا..... دوسرے یہ کہ جب وہ رخصت ہو کر دانیال کے ساتھ چلی جائے گی تو اسد اور ثروت واپس وجاہت منزل میں آ جائیں گے..... یہ احساس انہیں عجب سی سرخوشی اور سرور کا احساس دے رہا تھا..... اسد اور ثروت کے آ جانے سے اس گھر کا ادھورا پن دور ہو سکتا تھا..... شاید ایک بار پھر یہ گھر خوشیوں کا گہوارہ بن سکتا تھا..... مگر اس کے لئے ابھی انہیں بہت کچھ کرنا تھا۔

ابھی کل ہی پروفیسر آفاق ان سے غفور کے لئے نگینہ کا ہاتھ مانگنے آئے تھے۔

''بہت عرصے سے کوئی خوشی کی تقریب نہیں ہوئی۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم نگو اور غفور کی منگنی کی ایک چھوٹی سی تقریب کر لیتے ہیں۔'' وہ سر جھکائے آس بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ''اسی بہانے کچھ ہلا گلا ہو جائے گا۔ ویسے بھی وجاہت کی صحت یابی کے سلسلے میں بھی کوئی چھوٹی سی تقریب تو ہونی ہی چاہئے۔ تو اس بہانے ایک پنتھ دو کاج کے مصداق.....''

''ہاں آفاق میاں!..... آپ درست کہہ رہے ہیں۔'' عاتکہ بیگم نے پُر سوچ آواز میں اُن کی بات کاٹتے ہوئے کہا

تھا۔ ''یہ در و دیوار خوشی کی تقریب کے لئے ترس کر رہ گئے ہیں۔ ہم بھی چاہتے ہیں، یہاں شادیانے بجیں۔ مسرت و انبساط کے گیت گائے جائیں۔ اس ''وجاہت منزل'' کی رُوٹھی خوشیاں پھر سے اس طرف کا رخ کر لیں۔ اس کے لئے ہمیں بھی آپ سے ایک گزارش کرنی تھی۔''

''گزارش کیسی؟'' آفاق صاحب چونک کر بولے تھے۔ ''اماں بی! آپ حکم کیجئے...... بھلا آپ سوچ بھی سکتی ہیں کہ میں آپ کے حکم سے سرتابی کی جسارت بھی کر سکتا ہوں؟''

''جیتے رہیے آفاق میاں!'' عاتکہ بیگم نے بے ساختہ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ ''وجاہت میاں بھی دل سے یہی چاہتے ہیں۔'' عاتکہ بیگم نے اپنی بات ختم کر کے اُمید بھری نظروں سے آفاق صاحب کی طرف دیکھا۔ ''آفاق میاں! کیا تم اپنی بوڑھی ماں کا یہ خالی دامن خوشیوں سے بھر سکتے ہو؟''

آفاق صاحب اس سوال کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔

کچھ اپنے خدشات اور مجبوریوں کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔

یہ درست تھا کہ وہ تو جانے کب سے یہی چاہتے تھے۔ مگر جب غیر متوقع طور پر یہ سوال ان کے سامنے آیا تھا تو حیرت بھری مسرت کے ساتھ، بہت سے وسوسے، بہت سی تاویلات بھی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں۔ مگر اپنے سامنے عاتکہ بیگم کا پھیلا ہوا آنچل دیکھ کر وہ کچھ بھی نہ کر سکے تھے۔ ان کے خدشے، وسوسے، تاویلیں، مجبوریاں سب جہاں کے تہاں تھم سی گئی تھیں۔ اور انہوں نے کسی بھی فرمانبردار بیٹے کی طرح ماں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا...... اور ان کا خالی دامن خوشیوں سے بھر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

❀===❀===❀

وجاہت منزل سے واپس لوٹے کتنے ہی دن بیت گئے تھے...... مگر اب بھی اس کا دل عجب اُچاٹ سا تھا۔ کسی بھی گوشے میں، کسی بھی کام میں دل تھا کہ لگتا ہی نہ تھا۔ اپنے دل کو منا منا کر وہ تھک گئی تھی۔ دل تھا کہ مانتا ہی نہ تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ کسی کی یاد نے اُسے بے کل کیا ہوا تھا۔ کیونکہ اس گھر میں واپس آنے کے بعد سے ہی اس نے اپنے دل کی دہلیز پر ''یادوں کا داخلہ ممنوع ہے'' کا بورڈ نصب کر دیا تھا...... سوچ و خیال کے دریچے بند کر دیئے تھے...... حتیٰ کہ اس نے تو اب تابی کو بھی یاد کرنا چھوڑ دیا تھا...... سب اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے تو پھر وہ کیوں یادوں کا ماتم کرتی پھرتی...... اپنی بے خواب آنکھوں کو آنسوؤں سے بھگوتی پھرتی...... کیوں؟...... تابی، فریحہ آپی کے ساتھ خوش تھا۔ وہ کمپیوٹر پہ اسے فریحہ آپی کی گود میں ہمکتے اور کلکاریاں بھرتے دیکھتی تو شروع میں تو حیران ہوتی تھی...... ایک بے نام سا دکھ اس کے دل کو مٹھی میں جکڑ لیتا تھا۔ مگر اب وہ اس بات پر ملال کرنا بھی بھول چکی تھی کہ اس کا تابی، اس کا لختِ جگر کسی اور کی ممتا بھری گود میں جا کر اس کو بھول چکا ہے۔

نسیان ہی تو اس دنیا کی سب سے بڑی بے فکری ہے...... اور شاید ایک نایاب تسکین ہے...... اگر یادوں کے زخموں پر نسیان کی کھرنڈ نہ جمتی تو...... تو یہ رِستے زخم انسان کی جان بھی لے لیتے۔ وقت کی گرد یادوں کے نقوش مٹا دیتی ہے...... سب ہی بھول جاتے ہیں۔

وہاں، وجاہت منزل کے باسی بھی اُسے بھلا چکے تھے۔ وہ سجے سجائے کمرے، آراستہ ایوان و دالان، وہ پھولوں سے سجا باغیچہ، وہ رنگ و روشنی سے مزین در و دیوار...... اماں بی...... وجاہت مرزا...... اور وہ نگو...... سب ہی اسے فراموش کر چکے تھے۔ وہ کرب سے سوچا کرتی۔

تب ہی جب اس رات آفاق صاحب نے غفور اور نگو کی منگنی کی بات کی تھی...... تو جانے کیوں اس کے مایوس دل

میں آپ سے آپ ایک اُمید کا دیا سا جل اُٹھا تھا۔
''آپ کیا کہتی ہیں عظمت بی؟'' غفور کی پھوپھی ہونے کے ناطے آفاق صاحب نے ان سے اجازت اور مشاورت ضروری سمجھی تھی۔ ''نگو بہت اچھی لڑکی ہے.....اور یہ کہ غفور میاں کو پسند بھی ہے۔''
''ہم کیا کہہ سکتے ہیں صاحب!'' عظمت بی جلدی سے بولی تھیں۔ ''جو آپ پسند کریں۔ ویسے یہ سچ ہے کہ نگو اور غفور کا جوڑ خوب ہی رہے گا۔ چاند سورج کی جوڑی لگے گی.....بہت ہی مبارک جوڑ ہے.....آپ بسم اللہ کیجئے۔''
''واقعی یہ تو بہت ہی خوشی کی بات ہے۔'' آفاق صاحب کو اپنی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے دیکھ کر نمرہ جلدی سے مسرور لہجے میں بولی تھی۔ ''آپ کل ہی جا کر اماں بی سے بات کر لیجئے۔''
عاتکہ بیگم نے یہ رشتہ منظور کر لیا تھا۔ عظمت بی نے تیاریاں بھی شروع کر دی تھیں۔ دو دن سے وہ گھر کی صفائی ستھرائی میں لگی تھیں۔ خالی پڑا بیڈ روم اور گیسٹ روم نئے سرے سے انہوں نے دھلوا کر سجایا سنوارا تھا۔ وہ ان کی خوشی کی خاطر ہر کام میں ان کے ساتھ شامل تھی مگر اس کے دل و دماغ عجب مایوسی اور اُداسی کی گرد میں لپٹے ہوئے تھے۔
''بٹیا! دونوں کمروں کے بیڈز کی چادریں بدل کر باتھ روم میں نئے تولیے بھی رکھ دو.....تب تک ہم سامان کی لسٹ بنائے دیتے ہیں۔ غفور میاں اور صاحب مارکیٹ جا رہے ہیں۔''
نمرہ نے خاموشی سے یہ کام کر دیا تھا۔ پھر فریزر سے قیمہ نکال کر کبابوں کے لئے چولہے پر چڑھا دیا تھا عظمت بی نے پہلے ہی یخنی چولہے پر چڑھا رکھی تھی۔
''پلاؤ کے ساتھ کیا کڑاہی بھی بنا رہی ہیں؟'' غفور نے کچن میں جھانکتے ہوئے اس سے سوال کیا تھا۔
''تمہارا دل کڑاہی کھانے کو چاہ رہا ہے تو وہ بھی بن جائے گی۔'' نمرہ نے مرجھائی ہوئی مسکراہٹ سے جواب دیا تو غفور اس کے قریب چلا آیا تھا۔
''آپی! اتنی مایوس اور اُداس کیوں لگ رہی ہیں؟''
''نہیں......'' نمرہ ایک دم سے سٹپٹا کر بولی تھی۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں۔''
''غفور میاں! جلدی سے آ جاؤ۔ عظمت بی نے ایک لمبی لسٹ دی ہے۔ خریداری میں بہت وقت لگے گا۔''
آفاق صاحب کی آواز سنتے ہی غفور جلدی سے باہر کی طرف لپک گیا تھا اور نمرہ نے اطمینان بھرا گہرا سانس لیا تھا۔ ورنہ تو اگر وہ مُصر ہو جاتا تو وہ کیا جواب دیتی؟ وہ مایوس بھی تھی اور اُداس بھی.....مگر کیوں؟.....اس سوال کا جواب خود اس کے پاس بھی نہیں تھا۔ بھلا وہ غفور کو کیا جواب دیتی؟
وہ اپنے کمرے میں سر نیہوڑائے خاموشی سے بیٹھی تھی۔ تب ہی بیل کی آواز سنائی دی تھی۔
شاید کوئی آیا تھا۔
غفور دوڑتا ہوا گیٹ کی طرف گیا تھا۔ آفاق صاحب اور عظمت بوا بھی بیرونی وارنڈے کی طرف چلے گئے تھے۔ مگر وہ گم صم سی اپنے کمرے میں بیٹھی رہی تھی...... باہر کون آیا، کیا کچھ ہوا، اُسے کچھ پتہ نہیں تھا۔
پھر بے ساختہ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ فریال گود میں ننھی کرن کو لئے مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے فریحہ آپی تھیں۔ ان کی گود میں اس کا تابی تھا۔ ان کے کاندھے پر سر دھرے غالباً سویا ہوا تھا۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی تابی کو بستر پہ لٹا دیا تھا۔ ان دونوں کے پیچھے اظفر اور ظفریاب تھے۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے ان سب کو دیکھ رہی تھی۔
''ارے اُٹھو! گلے ملو...... یہ کیا ٹکر ٹکر دیکھ رہی ہو؟'' فریال اس کے قریب چلی آئی تھی۔ کرن کو اظفر کی گود میں دے

کراس نے بے اختیارانہ اسے گلے سے لگالیا تھا۔
''فری!..... یہ تم ہی ہو نا؟'' اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی بے یقینی میں ڈوبی آواز نکلی تھی۔
''ہاں بابا!..... یہ ہم سب ہیں۔ تم کوئی خواب نہیں دیکھ رہیں۔'' فریحہ آپی نے آگے بڑھ کراُسے سینے سے لگالیا تھا۔
اس کی پلکوں پہ آپ سے آپ نمی اُتر آئی تھی۔ وہ حیران سی کہہ رہی تھی۔
''اس طرح..... اچانک..... مجھے پتہ ہی نہیں چلا..... کیسے..... آپ سب یوں.....''
''ہم سب آپ کو سرپرائز دینا چاہ رہے تھے۔'' غفور نے شوخ سے لہجے میں کہا۔ ''یہ بوا کا آئیڈیا تھا کہ آپ کو پہلے سے بتایا نہ جائے..... آپ سب لوگوں کو ایک دم سے اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ جائیں گی۔''
اور واقعی نمرہ ان سب کو دیکھ کر حیران ہی نہیں، بے حد مسرور بھی ہوگئی تھی۔
تابی کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر اسے خوشی کا احساس تو ہوا تھا مگر فریحہ آپی کی آنکھوں سے جھانکتی اُداسی نے اس کی خوشی میں بھی اُداسی کا رنگ حلول کر دیا تھا۔
فریحہ آپی اُداس تھیں۔ کیونکہ جانتی تھیں کہ مانگے کی خوشی کی واپسی کا وقت آگیا تھا۔ فریحہ نے کسی سے بھی تابی کو مانگا نہیں تھا..... حالات کی ستم ظریفی کے طفیل تابی کو خود ہی اس کی گود میں ڈال دیا گیا تھا۔ اور اب جبکہ وہ تابی سے مانوس ہو چکی تھی..... اس کی چاہت اور رفاقت کی عادی ہو چکی تھی..... تو اسے باور کروایا جا رہا تھا کہ اب اسے تابی کو واپس کرنا ہے۔ اُس کی خالی گود تابی کے وجود سے بھر گئی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی، نمرہ نے اپنے دل پر ضبط کا کون سا پتھر رکھ کر ننھے سے شیر خوار بچے کو خود سے جدا کیا ہوگا..... مگر اب جب موسم ہجر اس کے دروازے پر دستک کناں تھا تو وہ، اب ضبط کا وہ پتھر، صبر کا وہ سنگِ آہن تلاش نہ کر پا رہی تھی۔ اُس کی اپنے شہر اپنے پاپا کے پاس آنے کی خوشی، مُنے سے بچھڑنے کے اس غم میں کہیں تحلیل ہوگئی تھی۔ اس کے لب تو مسکرانا ہی بھول گئے تھے۔
''فریحہ! خود کو سنبھالو۔'' ظفریاب اس کی حالت و کیفیت سے واقف تھے۔ اُسے بار بار خود کو سنبھالنے کی تلقین کرتے اور وہ بار بار یہ بھول جاتی۔
ننھا تابی، نمرہ کی گود میں کسمسایا تو بے ساختہ اس نے بازو پھیلا دیئے تھے۔
''تم سے نہیں سوئے گا..... لاؤ مجھے دو۔''
نمرہ نے حیران نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے تابی اس کی آغوش میں دے دیا تھا۔ اور واقعی منہ بسورتا تابی، فریحہ کے کندھے سے لگتے ہی آنکھیں بند کر کے گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔
رات کھانے کے بعد آفاق صاحب فریحہ، فریال اور نمرہ کو لے کر اپنی اسٹڈی میں چلے آئے تھے۔
''نمرہ بیٹیا! میں نے تمہارے لئے ایک فیصلہ کیا ہے۔'' آفاق صاحب اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھنے کے بعد میز پہ دونوں کہنیاں ٹکا کر اس کی طرف جھکتے ہوئے نرم اور دھیمے لہجے میں گویا ہوئے۔ ''تمہیں اپنی بیٹی سمجھ کر میں نے تم سے پوچھے بنا ہی یہ فیصلہ کرلیا ہے..... اس یقین کے ساتھ کہ تمہیں میرے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''
''کیسا فیصلہ؟'' آفاق صاحب کے یقین نے یہ سوال اس کے ہونٹوں تک آنے نہیں دیا تھا۔ وہ محض نگاہ اُٹھا کر رہ گئی تھی۔
''میں نے تمہاری شادی کا فیصلہ کیا ہے۔'' اس کی خاموش نگاہوں میں تحریر سوال پڑھ کر آفاق صاحب نے جواب دیا تھا۔ ''لوگ بہت اچھے ہیں۔ لڑکا بھی مناسب ہے..... اسے تابی کو بھی ساتھ رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں..... مجھے امید ہے، تم اس گھر میں بہت خوش رہوگی۔''

آفاق صاحب لحظہ بھر کو رُکے، ایک ذرا سانس لی اور پھر مدھم لہجے میں بولے۔

''اس کے باوجود تم نہ چاہو تو انکار کر سکتی ہو...... میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا...... لیکن اگر اس بوڑھے باپ پر اعتبار ہے تو...... سر جھکا دو...... مجھے خوشی ہوگی۔''

آفاق صاحب کی خوشی کی خاطر تو وہ اپنی جان بھی دے سکتی تھی۔ اُن کے فیصلے کے سامنے سر جھکانا تو بہت ہی چھوٹی سی بات تھی...... آفاق صاحب نے اس پہ اعتبار کر کے اس کی زندگی کا فیصلہ اپنے تئیں کر لیا تھا...... تو بھلا وہ ان کے اعتبار کو کس طرح ٹوٹنے دیتی؟...... دل کے لاکھ انکار کے باوجود اس نے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔

لڑکا کون ہے؟...... کیا کرتا ہے؟...... کہاں رہتا ہے؟...... یہ سب پوچھنا تو دُور کی بات، اس نے سوچنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی بس اس سلسلے میں اس کی اتنی سی خواہش تھی کہ جو کچھ بھی ہو، سادگی سے ہو...... خود آفاق صاحب بھی شادی بیاہ کے سلسلے میں سادگی کے قائل تھے۔ انہوں نے فریحہ اور فریال کی شادیوں میں بھی کوئی بے جا اصراف اور دنیا دکھانے کو دھوم دھڑکا نہیں کیا تھا۔ اسی لئے اب وہ نمرہ کے فرض سے بھی سادگی کے ساتھ عہدہ براء ہونے کے خواہش مند تھے۔

فریحہ اور فریال، نمرہ کی اس شادی میں شرکت کی خواہش مند تھیں۔ ویسے بھی فریال کو تو پاکستان آئے بھی کافی عرصہ بیت گیا تھا۔ اس لئے جب ان دونوں نے پاکستان آنے اور نمرہ کی شادی میں شریک ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو آفاق صاحب منع نہ کر سکے تھے۔ ویسے بھی اب تابی کی واپسی کا وقت آ گیا تھا۔ فریحہ، تابی کو یہاں سے خود لے کر گئی تھی اور وہ چاہتے تھے، فریحہ خود اپنے ہاتھوں سے نمرہ کا بچہ اس کے حوالے کرے۔ سو اس لئے بھی انہوں نے ان سب کو وطن آنے اور اس تقریب میں شریک ہونے کی اجازت دے دی تھی۔

نمرہ فریال اور ان سب کو دیکھ کر اپنا ہر دُکھ بھول گئی تھی۔ ننھی سی، گول مٹول کرن کو گود میں لے کر اس نے حیرت بھرے لہجے میں فریال سے کہا تھا۔

''اللہ...... فری! یہ تو بہت بہت ہی پیاری ہے۔''

''ہاں۔'' فریال مسکرائی تھی۔ ''مگر تمہارے تابی سے کم پیاری ہے...... مگر دیکھو اب کہیں رشتہ کرنے سے انکار مت کر دینا۔''

''رشتہ؟'' نمرہ نے چونک کر فریحہ کی آغوش میں سمٹے تابی کی طرف دیکھا تھا۔ ''مگر اس سلسلے میں تمہیں فریحہ آپی سے رابطہ کرنا ہوگا۔'' نمرہ کے لہجے میں ہلکی سی شوخی سمٹ آئی تھی۔ اور بے ساختہ فریحہ کی آنکھوں سے محرومی جھانکنے لگی تھی۔

''نمو! تابی تمہارا بیٹا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا حق صرف اور صرف تمہیں ہی حاصل ہے۔ بھلا کوئی مجھ سے رابطہ کر کے کیا پائے گا؟'' فریحہ کے لہجے سے چھلکتی مایوسی اور کرب کی کیفیت نے نمرہ کو حیران ہی نہیں، افسردہ بھی کر دیا تھا۔ وہ فریحہ کو خاموشی سے کمرے سے باہر نکلتے دیکھتی رہی تھی۔

''تم فریحہ آپی کی بات کا برا نہ ماننا۔'' لحظہ بھر کی خاموشی کے بعد فریال نے کسی قدر شرمندہ سے لہجے میں کہا تھا۔

''دراصل آپی، تابی سے بہت اٹیچ ہو گئی ہیں...... اب جبکہ تابی کو تمہیں واپس دینا ہوگا...... اس احساس نے انہیں بہت چڑچڑا اور دُکھی کر دیا ہے۔''

وہ جدائی کے اس کرب کے احساس سے واقف تھی۔ اپنی روح کو دولخت کر کے اس نے اپنے لختِ جگر کو خود سے دُور کیا تھا...... تابی کی یاد میں وہ کیسا کیسا نہ تڑپی تھی...... اس کے ہجر میں اُس نے کتنے آنسو بہائے تھے...... اور اب جدائی کا یہ کٹھن مرحلہ فریحہ کو درپیش تھا۔ تابی کو اس نے جنم نہیں دیا تھا۔ مگر پچھلے کتنے ہی مہینوں سے وہ اسے ماں بن کر پال رہی

تھی۔اوراب اپنے اس لے پالک بچے سے جدا ہونے کا تصور ہی اس کے لئے سوہانِ روح تھا۔
اگلے دن عصر مغرب کے درمیان نمرہ کا نکاح ہونا قرار پایا تھا۔
آفاق صاحب نے ڈنر کا اہتمام کرنا ضروری سمجھا تھا۔عظمت بی اور غفور نے کہا بھی تھا کہ زیادہ لوگ نہیں ہے..... گھر میں ہی کھانا تیار کرلیا جائے گا۔مگر آفاق صاحب نے یہ کہہ کر منع کر دیا تھا۔
''عظمت بی!ایک بہت ہی اچھے ریسٹورنٹ کے مالک ہمارے دوست ہیں۔ہم نے انہیں ہی رات کے کھانے کا آرڈر دے دیا ہے۔آپ صرف کھلانے کا کام نمٹا لیجئے گا۔''
صبح ہوتے ہی لڑکے کے گھر سے نکاح کا جوڑا اور زیورات بھجوا دیئے گئے تھے۔اور نمازِ ظہر کے بعد ہی فریال،نمرہ کو سجانے سنوارنے میں لگ گئی تھی۔عنابی رنگ کے بیش قیمت کم خواب کے غرارہ سوٹ اور یاقوت و زمرد کے طلائی زیورات میں نمرہ اس قدر حسین لگ رہی تھی کہ فریحہ اور فریال حیرت سے اسے تکے گئی تھیں۔
''سچی نمو! آج دولہا میاں کی خیر نہیں۔''فریال نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو بے ساختہ اس کی گھنیری پلکیں نرم رخساروں پہ جھک آئی تھیں۔
عصر کے کچھ ہی بعد چند لوگوں پر مشتمل بارات آ گئی تھی۔نگو کے ساتھ اماں بی کو اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔
''اماں بی!آپ؟''
''تو کیا آج بھی ہم لوگ نہ آتیں؟''نگو اُسے ستائش بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے شوخ لہجے میں بولی تھی۔''سچی آپی!بہت ہی پیاری لگ رہی ہیں۔آج تو دولہا جی کی خیر نہیں ہے۔''
عاتکہ بیگم کے پیچھے ثروت اور فروا بھی موجود تھیں۔عاتکہ بیگم نے اسے سینے سے لگا کر اس کا صدقہ اُتارا تھا۔ان کے سینے سے لگ کر اسے یک گونہ سکون کا احساس ہوا تھا۔اس کا دل چاہا تھا کہ وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رو دے.....مگر وہ اپنی اس سوچ پر عمل نہیں کر سکی تھی۔کیونکہ غفور نے نکاح کے لئے مولوی صاحب اور گواہان کی آمد کی اطلاع دی تھی۔
فریال نے آگے بڑھ کر اس کا چاند چہرہ گھونگھٹ کی اوٹ میں چھپا دیا تھا۔مولوی صاحب کے ساتھ آفاق صاحب بھی تھے۔
''نمرہ علی ولد اکبر علی!آپ کو بہ عوض شرعی مہر سرمد مرزا ولد وجاہت مرزا کے عقد میں جانا قبول ہے؟''
لحظہ بھر کو تو اُسے اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں ہوا تھا۔شاید اس کے سننے میں غلطی ہوئی ہے.....مگر مولوی صاحب دوبارہ سے اپنا جملہ دوہرا رہے تھے۔
''نمو!.....میری بچی!تم مجھے فریحہ اور فریال کی طرح عزیز ہو.....مگر کوئی بھی انسان بے حد چاہنے کے باوجود اپنی بیٹیوں کو ہمیشہ اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔اسی لئے مجھے بھی یہ فیصلہ کرنا پڑا۔میں سرمد کو جانتا ہوں.....مجھے یقین ہے تم اس کے ساتھ بہت خوش رہو گی.....اسی لئے،اب ہاں کہہ دو۔''
پروفیسر آفاق اس کے سر پر دستِ شفقت دھرے اسے ہاں کہنے کی ترغیب دے رہے تھے۔اور وہ تقدیر کی اس فسوں خیزی پہ حیران و ششدر تھی۔عجب بے خودی کی سی کیفیت میں اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔اور ہر طرف مبارک سلامت کا اِک شور سا اُٹھا تھا۔
باہر ڈرائنگ روم میں دانیال اور اسد،سرمد کو گلے لگا رہے تھے۔جبکہ آفاق صاحب،وجاہت مرزا سے بغل گیر ہو رہے تھے۔عاتکہ بیگم کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔جبکہ نگو،نمرہ کے گلے لگی سرگوشی میں کہہ رہی تھی۔

''بھابی! میں ہمیشہ سوچا کرتی تھی، سرمد بھیا اتنے اچھے ہیں۔ وہ لڑکی جوان کی دُلہن بنے گی، یقیناً بہت خوش نصیب ہوگی......مگر آج آپ کو دیکھ کر میں کہہ سکتی ہوں، سرمد بھیا بہت بھاگوان ہیں، جو آپ ان کی دلہن بنی ہیں۔''

اس رشتے کا سب ہی کو علم تھا۔ ایک وہی ناواقف وانجانی تھی۔ یہ فریال کی شرارت تھی۔ اس نے سب کو ہی منع کر دیا تھا......وہ نمرہ کو اچانک یہ خوشخبری سنا کر حیران ومسرور کر دینا چاہتی تھی......بہت پہلے جب نمرہ نے پہلی بار سرمد کو دیکھا تھا تو آپ سے آپ سرمد کے سپنے نمو کی بے خواب آنکھوں میں اُترنے لگے تھے۔ تب فریال خوف زدہ ہوگئی تھی۔ وہ نمو اور سرمد کی درمیانی خلیج سے واقف تھی۔ اس وقت اس نے کب یہ سوچا تھا کہ ایک دن سرمد بارات لے کے نمرہ کو ہمیشہ کے لئے اپنا بنانے کے لئے اس دروازے پر موجود ہوں گے۔

''بہت سنا تھا، مگر آج دیکھ بھی لیا۔'' فریال، نمرہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''کہ اگر جذبے صادق ہوں تو منزلیں خود چل کر سامنے آجاتی ہیں......خواب اگر سچائی پہ مبنی ہوں تو تعبیریں آپ بڑھ کر دامن تھام لیتی ہیں....مجھے یقین ہے، تمہاری آزمائشوں کا دوراب ختم ہوا......اب راوی پیار ہی پیار اور خوشیاں ہی خوشیاں لکھتا ہے۔''

''وجاہت منزل'' اپنی تمام تر محبتوں اور عنایتوں کے ساتھ نمرہ کے لئے نگاہیں فرشِ راہ کئے ہوئے تھی۔ نمرہ کو سرمد کی آراستہ وپیراستہ خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا تھا۔

وہ رات نمرہ کے لئے ہی نہیں، سرمد کے لئے بھی زندگی کی سب سے حسین رات بن گئی تھی۔

اگلے دن شام کو عاتکہ بیگم نے شہر کے سب سے بڑے اور مہنگے ہوٹل میں سرمد اور نمرہ ہی کے نہیں بلکہ اسد اور ثروت کے ولیمے کا بھی اہتمام کیا ہوا تھا جس میں شہر کے تمام عمائدین اور شرفاء وروٴساء شریک ہوئے تھے۔

دو روز بعد وجاہت مرزا نے بے حد چاؤ اور ارمان سے فروا کو اپنی بیٹی بنا کر دانیال کے ساتھ رخصت کیا تھا۔ اگلے ہی دن دانیال، فروا کو لے کر لندن کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنا ولیمہ لندن میں کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جس میں وجاہت مرزا اور عاتکہ بیگم کو بھی شریک ہونا لازمی قرار پایا تھا۔

جانے ایک مہینہ کیسے گزر گیا تھا، کسی کو پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ ننھا تابی اب تک فریحہ کے پاس ہی تھا۔ سرمد نے نمرہ سے کہا بھی تھا کہ وہ تابی کو اپنے ساتھ وجاہت منزل لے آئے۔ ان کے بیڈ روم میں بیڈ کے ساتھ کاٹ پہلے دن سے ہی رکھوا دیا گیا تھا۔ مگر نمرہ چاہتی تھی، فریحہ جب تک یہاں ہے، تابی اسی کے پاس رہے۔ اب ان کے جانے میں دن ہی کتنے رہ گئے تھے؟

اتوار کی صبح کی فلائٹ سے ان سب کی روانگی تھی۔ جبکہ ہفتے کی رات ڈنر پر عاتکہ بیگم نے ان سب کو مدعو کیا تھا۔ نمرہ خوشی خوشی تیاریوں میں لگی تھی۔ تب ہی اُٹھتے وقت ایک دم سے چکرا کر رہ گئی تھی۔

''بھابی! کیا ہوا؟'' نگو گھبرا کر لپکی تھی۔

''بٹیا! ٹھیک تو ہو؟'' عاتکہ بیگم ایک دم سے پریشان ہو اُٹھی تھیں۔

''کچھ بھی نہیں اماں بی! بس یونہی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آ گیا تھا۔'' نمرہ خود کو سنبھال کر قدرے شرمندہ سے لہجے میں بولی تو عاتکہ بیگم اور بھی متوحش ہوگئی تھیں۔ فوری طور پر فون کر کے انہوں نے لیڈی ڈاکٹر کو بلوا لیا تھا۔ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے سرمد اور وجاہت مرزا بھی آموجود ہوئے تھے۔

لیڈی ڈاکٹر، نمرہ کو معائنے کے لئے اندر کمرے میں لے گئی تھی۔ اس دوران پروفیسر آفاق، فریحہ، فریال اور ظفریاب واظفر سمیت آ گئے تھے۔ وہ سب ہی نمرہ کی طبیعت خراب ہونے کا سن کر فکر مند ہو گئے تھے۔

تب ہی لیڈی ڈاکٹر کمرے سے باہر نکلی تھی۔ اس کے ساتھ نگاہیں جھکائے محجوب سی نمرہ بھی تھی۔

''کیا ہوا میری بچی کو؟...... سب ٹھیک تو ہے نا؟'' عاتکہ بیگم نے ڈاکٹر پر نگاہ پڑتے ہی بے تابانہ پوچھا تھا۔ ''سب ٹھیک تو ہے نا؟''

''جی اماں جی!'' لیڈی ڈاکٹر مسکرائی۔ ''آپ کے لئے خوشخبری ہے۔ آپ پردادی بننے والی ہیں۔''

''بہت مبارک ہو نمو!'' فریال بے ساختہ نمرہ کے گلے لگ گئی تھی۔ نمرہ نے کن اکھیوں سے سرمد کی طرف دیکھا۔ وہ لبوں پہ حیرت بھری مسکراہٹ لئے اسی کی سمت دیکھ رہے تھے...... ہر طرف خوشیوں کے رنگ بکھرتے محسوس ہو رہے تھے۔ ہر چہرہ متبسم تھا...... ہر لب خنداں زن تھا...... بس ایک فریحہ کی آنکھیں تھیں جو اُداس تھی۔ کیونکہ آج اُسے اپنا تابی، نمرہ کے حوالے کرنا تھا۔ آخر جدائی کا وہ لمحہ آ ہی پہنچا تھا جس نے کئی دنوں سے فریحہ کو افسردہ کیا ہوا تھا۔

''نمو! تمہاری امانت تمہارے حوالے...... میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ ایک ایسی بانجھ عورت جو کبھی ماں نہیں بن سکتی، اسے تم نے چند مہینوں کے لئے ہی سہی مگر ماں ہونے کی خوشی سے مالا مال کر دیا تھا...... میری خالی گود میں اپنا بچہ ڈال کر میرے خالی دامن کو خوشیوں سے بھر دیا تھا...... اب یہ تمہارے حوالے......''

یہ سب باتیں کہنے کے لئے فریحہ کرب کی کتنی ہی منزلوں سے گزری تھی۔ تابی کو نمرہ کی گود میں دیتے ہی اسے لگا تھا کہ جیسے کسی نے اس کے جسم سے روح کشید کر لی ہے۔

''آپی......!'' نمرہ نے نگاہ اُٹھا کر فریحہ کی ضبطِ گریہ سے سرخ ہوتی آنکھوں کی طرف دیکھا تھا۔ وہ کبھی بھی ماں نہیں بن سکتی تھی۔ تابی کے وجود نے اس کی پیاسی ممتا کو تسکین دی تھی۔ مانگے کے اس چراغ نے اس کی تاریک دنیا میں روشنی ہی روشنی بھر دی تھی۔

''آپی! شکر گزار تو مجھے آپ کا ہونا چاہئے۔'' نمرہ نے اپنی گود میں بے چینی سے کسمساتے تابی کی طرف سوچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے اگر اس وقت اسے پناہ نہ دی ہوتی تو شاید یہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے بچھڑ جاتا۔ آپ نے اتنا عرصہ اسے اپنے پاس رکھا، اتنی محبت دی...... اب آپ ہی نہیں، یہ بھی آپ سے بہت مانوس ہو گیا ہے۔ بے شک میں نے اسے جنم دیا ہے...... مگر یہ آپ کو اپنی ماں سمجھتا ہے۔ اور اس بات کا احساس مجھے اس پہلے دن ہی ہو گیا تھا، جب یہ میری گود سے مچل کر آپ کی گود میں گیا تھا۔ اور میں نے یہ فیصلہ اسی دن کر لیا تھا کہ اب تابی میرا نہیں، آپ کا بیٹا ہے۔''

نمرہ نے تابی کو فریحہ کی گود میں دے دیا تھا۔

''مگر نمو......!'' فرطِ مسرت سے فریحہ کی آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔

''آپی! اسے مجھ سے زیادہ آپ کی ضرورت ہے۔'' نمرہ، فریحہ کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ ''اور جہاں تک میری گود خالی ہو جانے کی بات ہے تو آپ نے ابھی سنا ہے کہ اللہ نے میری گود بھرنے کی نوید دے دی ہے۔''

آخری جملہ اس نے فریحہ کے کان میں سرگوشی میں کہا تھا مگر کمرے میں موجود سب ہی لوگوں نے وہ بات سن لی تھی۔ اور سب ہی لوگوں کے لبوں پہ مسرور سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

نمرہ نے گھبرا کر سرمد کی طرف دیکھا تھا اور انہیں اپنی جانب دیکھتے دیکھ کر شرما کر نگاہیں جھکا لی تھیں۔ اس کے دل کی دہلیز پہ ہزار ہا دیے جگمگا رہے تھے۔ ان کی ضو، پروفیسر آفاق کے چہرے کو بھی جگمگا رہی تھی...... اور وہ اپنی تینوں بیٹیوں کو خوش دیکھ رہے تھے...... خود کو بھی بے حد مسرور اور خوش محسوس کر رہے تھے۔

(تمت بالخیر)